میں ضروریات سے فارغ ہو کر ناشتا کرنے بیٹھا تو اس سے رات ہونے والی ہلچل اور فائرنگ کا ذکر چھیڑ دیا۔ وہ بھرا بیٹھا تھا اور اس کی سرخ آنکھوں کو دیکھ کر پتا چل رہا تھا کہ رات بھر اس نے ایک لمحے کے لیے بھی پلک تک نہیں جھپکی۔ میرے سوال کرتے ہی اس نے بتایا کہ خانقاہ کو آگ لگانے والے شخص کے بارے میں علم ہو گیا ہے۔ وہ پنڈ کا ہی ایک معزز آدمی تھا جو کئی روز سے غائب تھا لیکن کسی نے اس بات کو اس لیے نوٹ نہیں کیا تھا کہ وہ شخص اپنے کاروبار کے سلسلے میں عموماً پنڈ سے غائب ہی رہتا تھا۔ شفقت راؤ نامی اس شخص کے بارے میں انہیں اس طرح معلوم ہوا تھا کہ شریف صاحب نے شفقت راؤ کے کزن اور سمدھی حامد راؤ کے گھر آنے والے ایک مشکوک جوڑے کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے وہاں گھریلو کام کرنے والی ایک عورت کی ڈیوٹی لگا دی تھی کہ وہ ٹوہ لے کر بتائے کہ بالکل اچانک مہمان بن کر وہاں آنے والے وہ لوگ کون تھے؟ عورت نے ان کی توقع سے بڑھ کر معلومات حاصل کر ڈالیں۔ حامد راؤ اور اس کے مہمانوں کی گفتگو سن کر اسے معلوم ہوا کہ خانقاہ کو آگ لگانے والا شخص شفقت راؤ تھا۔ یہ اطلاع پا کر پیر سائیں کے مرید چراغ پا ہو گئے اور انہوں نے حامد راؤ کے گھر دھاوا بولنے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ ان کا خیال تھا کہ بے شک حامد خاؤ بے قصور ہے لیکن اس کے گھر میں مقیم شفقت کی بیوی اور بیٹی کو نشانۂ عبرت بنا کر شفقت سے انتقام کا سلسلہ شروع کیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے رات کی تاریکی میں بہت منظم طریقے سے حامد راؤ کے گھر کا محاصرہ کیا اور اس کے سامنے اپنا مطالبہ پیش کیا لیکن حامد راؤ نے اس مطالبے کو ماننے سے انکار کر دیا۔ وہ عورتیں صرف شفقت کی بیوی اور بیٹی ہی نہیں، حامد راؤ کی بہن اور بہو بھی تھیں۔ اس انکار کے بعد نوبت گولیاں چلنے تک جا پہنچی۔ پیر سائیں کے مریدوں کو اندازہ نہیں تھا کہ ان کی فائرنگ کا اتنے منظم طریقے سے جواب دیا جائے گا۔ انہیں بالکل یوں محسوس ہوا کہ مقابل ان کی کمین گاہوں سے بخوبی واقف تھے اور تاک تاک کر انہیں نشانہ بنا رہے تھے۔ میرے میزبان کے مطابق ان کے تین آدمی ہلاک اور کئی شدید زخمی ہوئے پھر بھی کچھ ہاتھ نہ آیا اور حامد راؤ اپنے اہلِ خانہ اور مہمانوں سمیت پنڈ سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ میرے میزبان کا خیال تھا کہ حامد راؤ کے اس فرار کو کامیاب بنانے میں اس کے مہمانوں نے کلیدی کردار ادا کیا ہو گا ورنہ حامد راؤ اور اس کا بیٹا اتنے تیز لوگ نہیں ہیں کہ اتنے منظم طریقے سے مقابلہ کر پاتے۔ اس نے ملازمہ کے ذریعے معلوم ہونے والے مہمانوں کے نام بھی مجھے بتائے جنہیں سن کر میں ششدر رہ گیا۔“

روانی سے تفصیلات سناتا ہوا مشابرم خان اس مقام پر آ کر چپ ہو گیا۔ شہریار کو محسوس ہوا کہ وہ کوئی بڑا انکشاف کرنے والا ہے۔ ویسے بھی ٹالی والا سے موبائل فون پر اس نے اسے یہی پیغام دیا تھا کہ واپسی میں وہ اپنے ساتھ بہت سے سوالوں کے جوابات اور کچھ انکشافات لے کر آئے گا۔ اس نے غلط نہیں کہا تھا۔ اس کی سنائی گئی تفصیلات میں کئی اہم باتیں معلوم ہوئی تھیں۔ ان تفصیلات کو سن کر اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ خانقاہ میں جل کر مر جانے والا شخص بالا ہو گا۔ عرصے تک چودھری ... کا ساتھی۔ بیچے والا بالا جو ہاتھ پیروں سے سلامت رہا تو اپنے ہی جیسے لوگوں کی زندگیاں دوبھر کرتا رہا، زندگی کے آخری دنوں میں عبرت کا نشان بن کر رہ گیا تھا۔ اس بے ضمیر آدمی کی موت بھی بڑی بھیانک ہوئی تھی۔ یقیناً بے بسی کے عالم میں آگ کا ایندھن بنتے ہوئے اس نے وہ ساری چیخیں، آہیں اور سسکیاں سنی ہوں گی جن کا سبب اس کی ذات بنی تھی۔ شاید وہ ان دردناک لمحات میں اللہ کے آگے معافی کے لیے گڑگڑایا بھی ہو لیکن شہریار کو پورا یقین تھا کہ اس کی کوئی دعا اور التجا قبول نہیں کی گئی ہو گی اور مظلوموں کی بددعائیں بدروحوں کی طرح اس سے چمٹ کر رہ گئی ہوں گی۔

مشابرم خان کی سنائی گئی تفصیلات سے اسے یہ بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ پیر سائیں کے پکڑے جانے والے مرید کالے میاں کی کوئی کال اس کے ساتھیوں کی طرف سے کیوں وصول نہیں کی جا رہی تھی۔ خانقاہ میں آگ لگنے کے بعد وہ سب یقیناً افراتفری میں اپنی جانیں بچا کر وہاں سے نکل بھاگے ہوں گے۔ اتنے نازک لمحات میں ان میں سے کسی کو اپنے موبائل فونز کا خیال بھی نہیں رہا ہو گا اور نتیجتاً آگ نے انہیں چاٹ کر ناکارہ کر دیا ہو گا۔ ان تفصیلات میں ابھی یہ وضاحت ہونا باقی تھی کہ شفقت راؤ کون تھا اور اس نے خانقاہ کو آگ کیوں لگائی تھی؟ اگر مشابرم خان اپنی گفتگو کا آخری جملہ ادا نہ کرتا تو وہ یقیناً اس سے پہلا سوال اس سلسلے میں کرتا لیکن جس انداز میں اس نے اپنے آخری فقرے ادا کیے تھے، شہریار کو اپنے پورے وجود میں عجیب سی سنسنی دوڑتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اتنی بری طرح مضطرب ہو گیا تھا کہ زبان سوال کرنے سے بھی معذور ہو گئی اور یہ کام اس نے اپنی آنکھوں سے لیا تھا۔ مشابرم خان نے بھی اس کے صبر کا زیادہ امتحان نہیں لیا اور دھیمی آواز میں بتانے لگا۔

”ان دونوں کے نام ماہ بانو اور اسلم بتائے گئے ہیں۔ تھوڑا بہت حلیہ وغیرہ بھی جو میں معلوم کرنے میں کامیاب ہوا ہوں، اس سے بھی یہ تصدیق ہو رہی ہے کہ یہ وہی ماہ بانو اور اسلم ہیں جنہیں ہم جانتے ہیں۔“ بالآخر مشابرم خان نے دھماکا کر ہی دیا جس نے شہریار کو اندر سے ہلا کر رکھ دیا۔ ماہ بانو کی تلاش میں اس نے کیا کچھ نہیں کیا تھا۔ ڈاکوؤں کی سرکوبی کے نام پر جنگل میں کیا جانے والا آپریشن بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی لیکن اپنی ساری بھاگ دوڑ کے نتیجے میں بھی وہ ماہ بانو کی گرد تک کو بھی نہیں پا سکا اور اب ایک غیر متعلقہ قصے میں اس کا نام اس طرح سامنے آیا تھا کہ وہ ڈاکو اسلم کی ساتھی کی حیثیت سے ٹالی والا میں پائی گئی تھی اور اب وہاں بھی موجود نہیں تھی۔ وہاں سے بھی وہ کسی نامعلوم سمت میں روانہ ہو چکی تھی۔

”کیا اسلم نے اسے یرغمال بنا رکھا تھا؟“ اس کا ذہن ماہ بانو کو کسی ڈاکو کا ساتھی تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھا اس لیے اس نے یہ سوال کیا۔

”کچھ کہنا مشکل ہے۔ جو معلومات حاصل ہوئی ہیں، ان کے مطابق وہ دونوں میاں بیوی کی حیثیت سے حامد راؤ کے گھر میں موجود تھے۔“ مشابرم خان کی آواز کچھ اور بھی دھیمی ہو گئی۔ یہ بات بتاتے ہوئے اس نے شہریار کی طرف دیکھنے سے بھی گریز کیا تھا۔ وہ اتنے دنوں سے اس کے ساتھ تھا۔ ماہ بانو کے اس تک پہنچنے سے لے کر بار بار غائب اور بازیافت ہونے کا ہر واقعہ اس کے علم میں تھا۔ اس نے دیکھا تھا کہ شہریار کس طرح اس لڑکی کے تحفظ کے لیے بے چین اور فکرمند رہتا تھا۔ کافی دنوں تک ماہ بانو بلتستان میں اس کے اپنے گھر میں روپوش رہی تھی۔ شہریار کی وفاداری اور اس لڑکی کی ہمدردی میں وہ اپنے بھائی اکرم خان کو گنوا بیٹھا تھا اور صدمے سے کومے میں چلی جانے والی اس کی ماں آج بھی اسلام آباد کے ایک اسپتال میں زندگی اور موت کے درمیان اٹکی ہوئی تھی۔ شہریار اپنے جذبات کے اظہار سے لاکھ گریزاں سہی، پر عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے۔ مشابرم خان کو بھی کسی حد تک اس کی قلبی کیفیات کا اندازہ تھا اس لیے وہ اس موضوع پر بات کرتے ہوئے بہت محتاط تھا۔ شہریار کا ملازم ہونے کے ناتے اس سے وفاداری تو اپنی جگہ تھی ہی، وہ بہ حیثیت انسان بھی اسے بے پناہ پسند کرنے کی وجہ سے اس سے محبت کرتا تھا اس لیے اس کے جذبات کو ٹھیس لگنے سے خائف بھی تھا۔

”ہو سکتا ہے اسلم نے ماہ بانو کو یرغمال بنا رکھا ہو اور وہ وہی کچھ کرنے پر مجبور ہو جو اسلم اس سے کہتا ہو۔“ خاصے توقف کے بعد شہریار نے کہا۔

”شاید یہی بات ہو۔“ مشابرم خان نے اس سے اختلاف کرنا مناسب نہیں سمجھا ورنہ اسے ٹالی والا سے جو خبریں ملی تھیں، ان میں ایسی کوئی بات شامل نہیں تھی جس سے یہ اشارہ ملتا ہو کہ ماہ بانو کی حیثیت کسی یرغمالی کی سی ہو اور وہ مجبوراً اسلم کے ساتھ موجود ہو۔ اسے مبینہ طور پر اسلم کی ساتھی بتایا گیا تھا۔

”خیر جو بھی بات ہو گی، کبھی نہ کبھی سامنے آ جائے گی۔ فی الحال تم ٹالی والا پر توجہ دو اور دو چار دن بعد دوبارہ وہاں چکر لگا کر مزید سن گن لینے کی کوشش کرو۔ یہ پیر سائیں مجھے بڑا گڑبڑ آدمی معلوم ہوتا ہے۔ اللہ والوں کے مرید یوں کسی کی ماں بہن کی بے عزتی کرنے کی کوشش نہیں کرتے اور نہ ہی کسی کے گھر پر مسلح جتھے کی صورت میں حملہ کرتے ہیں۔ یہ تو کچھ مجرمانہ ذہنیت کی عکاسی ہو رہی ہے۔ تم دوبارہ وہاں جاؤ تو خاص طور پر یہ معلوم کرنے کی کوشش کرنا کہ شفقت راؤ نامی شخص نے خانقاہ میں آگ کیوں لگوائی۔ وہ گاؤں کا باشندہ تھا اور بے شک پیر سائیں کا معتقد نہ رہا ہو لیکن اس بات سے تو واقف ہو گا کہ گاؤں میں پیر سائیں کے کتنے عقیدت مند موجود ہیں اور اس کی حرکت کے ردِعمل میں کیا کچھ کر سکتے ہیں۔ کسی معزز آدمی کے اتنی خطرناک حرکت کرنے کا محرک معمولی نہیں ہوتا۔ شفقت راؤ کی حرکت کے پیچھے بھی کوئی بڑی وجہ رہی ہو گی۔ تمہیں پوری کوشش کر کے وہ وجہ معلوم کرنی ہو گی تاکہ پیر سائیں کا کردار واضح ہو سکے۔“ ماہ بانو سے متعلق ملنے والی خبر نے اسے خاصا شدید ذہنی جھٹکا لگایا تھا پھر بھی حالات کا بالکل درست تجزیہ کرتے ہوئے وہ مشابرم خان کو ہدایات دے رہا تھا۔

”ٹھیک ہے صاحب! میں اس گتھی کو سلجھانے میں اپنی پوری جان لڑا دوں گا۔“ حسبِ معمول مشابرم خان میدانِ عمل میں اترنے کے لیے دل و جان سے راضی تھا۔

”گڈ! مجھے تم سے یہی امید تھی۔“ شہریار نے اسے سراہا اور پھر کھلی فائل کی طرف متوجہ ہو گیا۔ مشابرم خان ملاقات ختم ہونے کا اشارہ پا کر باہر نکل گیا۔ اس کے چلے جانے کے بعد شہریار نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح فائل کی طرف توجہ مرکوز کر سکے لیکن ذہن منتشر ہی رہا۔ ماہ بانو کا اسلم ڈاکو کے ساتھ اس کی بیوی کی حیثیت سے پایا جانا اتنا غیر اہم واقعہ نہیں تھا جسے وہ آسانی سے نظرانداز کر سکتا۔ اسے تھوڑی ہی دیر میں اپنی کیفیت کا ادراک ہو گیا اور وہ فائل بند کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔ اتنی منتشر ذہنی کیفیت میں یہاں بیٹھنے سے بہتر

تھا کہ وہ گھر واپس چلا جائے۔ فیصلہ کر کے وہ سیٹ سے اٹھا تو واپس گھر پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ بیڈ روم میں داخل ہوتے ہی اس کا ماریا سے سامنا ہو گیا۔

”خیریت، آج اتنی جلدی کیسے واپس آ گئے؟“ اسے بے وقت گھر میں موجود پا کر اس نے سوال کیا اور پھر تیزی سے آگے بڑھ کر کوٹ اتارنے میں اس کی مدد کرنے لگی۔ اس چھوٹے سے کام کو انجام دینے میں اس کا انداز اتنا دل ربا تھا کہ وہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکا اور دل کو لگنے والی تازہ چوٹ کے باوجود اس سے بے مروتی برتنے کے بجائے آہستہ سے بولا۔ ”طبیعت کچھ بوجھل سی تھی۔ سر میں درد سا محسوس ہو رہا تھا اس لیے میں نے سوچا کہ گھر چل کر کچھ دیر آرام کر لوں۔“

”تھینک گاڈ کہ آپ کو اپنے بارے میں اس طرح سوچنے کا خیال آیا ورنہ مجھے تو لگتا ہے کہ آرام کا لفظ آپ کی ڈکشنری میں ہے ہی نہیں اور آپ نے کام کو ہی اپنا اوڑھنا بچھونا بنا رکھا ہے۔“ بیویوں والے مخصوص لب و لہجے میں خفگی کا اظہار کرتے ہوئے ماریا نے اس کی ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کر کے اسے گردن سے نکالا اور پھر اس کا بازو تھام کر بیڈ کی طرف لے گئی۔ اس سارے عمل میں وہ اس کے اتنے قریب رہی تھی کہ وہ بہ خوبی اس کے بدن سے اٹھتی دھیمی سی باڈی اسپرے کی خوشبو کو محسوس کر رہا تھا۔ دھیمی سی اس خوشبو میں کچھ ایسا جادو تھا کہ وہ مسحور سا ہونے لگا اور حسب معمول فوری طور پر لباس تبدیل کر کے فریش ہونے .... کے بجائے چپ چاپ ماریا کے اشاروں پر عمل کرنے لگا۔ بیڈ کے قریب پہنچنے پر ماریا نے اس کے دونوں شانے تھام کر اسے کنارے پر بٹھا دیا اور خود نیچے اس کے قدموں میں بیٹھ کر اس کے جوتے اتارنے لگی۔

”ارے یہ کیا کر رہی ہو؟“ اس نے تیزی سے اپنا پیر پیچھے کرتے ہوئے اسے ٹوکا۔ وہ ماریا سے یوں بھی اکثر شرمندہ رہتا تھا کہ اس کے تمام تر خلوص کے باوجود اسے وہ توجہ اور محبت نہیں دے پاتا جس کی وہ بطور بیوی حق دار تھی، اس پر سے اس کی اتنی خدمت گزاری نے تو اسے شرمندہ ہی کر کے رکھ دیا۔ اس کی شوہر پرستی کو دیکھ کر تو قطعی طور پر اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ وہ ایک کوالیفائڈ ڈاکٹر ہے جو خود بھی معاشرے میں ایک ممتاز مقام رکھتی ہے۔ شہریار جس کلاس سے تعلق رکھتا تھا، وہاں تو عورتیں عموماً ہاتھ پیر ہلانے کی عادی ہی نہیں ہوتی تھیں اور خود کچھ نہ ہونے کے باوجود اپنے باپ، بھائی یا شوہر کے عہدے کے زعم میں مبتلا خود کو اتنا اعلیٰ سمجھتی تھیں کہ معمولی سے معمولی کام کرنا بھی انہیں اپنی توہین محسوس ہوتا تھا کجا کہ شوہر کے پیروں سے جوتے اتارنے کا کام۔

”میں وہی کر رہی ہوں جس سے میرے دل کو خوشی ملتی ہے۔ آپ مجھے روک کر میری خوشی سے محروم نہ کریں۔“ اس نے ایک بار پھر اپنے ہاتھ آگے بڑھائے، اس بار شہریار نے خود کو بے بس سا پایا۔ جوتے اتارنے کے بعد ماریا اپنی نرم و ملائم انگلیوں سے آہستہ آہستہ اس کے پیروں کو سہلانے لگی۔ اس کی متحرک انگلیوں کی ہر ہر جنبش میں اتنی مشاقی تھی کہ شہریار نے اپنے پورے وجود میں سرور کی لہریں سی دوڑتی ہوئی محسوس کیں۔ اپنے کام کو جاری رکھتے ہوئے ماریا نے آہستہ سے اپنا سر اس کے گھٹنوں پر ٹکا لیا اور مخمور سے لہجے میں بولی۔ ”مجھے معلوم ہے کہ آپ نے حالات کے جبر کے تحت مجھے اپنایا ہے لیکن اس کے باوجود میرا اور آپ کا رشتہ اٹل ہے۔ میں ہمیشہ کوشش کرتی ہوں کہ ذہن سے ہر ناخوشگوار یاد کو کھرچ کر حال میں جی سکوں۔ میں نے آپ کے اور اپنے رشتے کو دل و جان سے قبول کر لیا ہے اور بیوی کی حیثیت سے اپنے سارے حقوق و فرائض ادا کرنے کی خواہش مند ہوں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ آپ بہت مصروف رہتے ہیں اور کسی عام آدمی کی طرح اپنی بیوی کو زیادہ وقت اور توجہ نہیں دے سکتے لیکن مجھے اتنا تو حق دیا کریں نا کہ قسمت سے جو تھوڑا بہت وقت مجھے مل جائے اس میں، میں اپنے اور آپ کے رشتے کو محسوس کر سکوں۔“ اس کے بے حد نرمی سے کیے شکوے نے جہاں شہریار کو شرمندہ کیا، وہیں دل میں ایک ٹیس سی بھی اٹھی۔ اسے آج تک وہ رات نہیں بھولی تھی جب وہ ماریا کے ساتھ لاہور کی طرف عازم سفر تھا اور اچانک ہی ماریا کی طبیعت خراب ہونے کی وجہ سے انہیں ایک تھرڈ کلاس سے ہوٹل میں رکنا پڑا تھا۔ اس ہوٹل کے کمرے میں اس کے ساتھ رات گزارتے ہوئے جانے اسے کیا ہوا تھا کہ عمر بھر کا زعم پارسائی جاتا رہا اور وہ ہر حد پھلانگ کر اپنی ہی نظروں میں مجرم ٹھہرا۔ اس جرم کی تلافی کے لیے اس نے ماریا سے شادی کر ڈالی لیکن ابھی تک وہ اپنے اور اس کے رشتے کو اس طرح سے قبول نہیں کر سکا تھا کہ ماریا کے ساتھ گرم جوشی سے پیش آتا۔ اس کمی کا ماریا اکثر اس سے شکوہ کرتی تھی اور وہ خود کو شرمندہ محسوس کرتا تھا۔ اس وقت بھی ایسا ہی ہوا اور وہ اپنے گھٹنوں پر ٹکے ماریا کے سر کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے نرمی سے بولا۔

”تم اتنی دل برداشتہ نہ ہوا کرو۔ میں مزاجاً ہی تھوڑا روکھا آدمی ہوں اور تم سے بطور خاص بے نیازی سے پیش نہیں آتا، نہ ہی تمہارے کسی حق سے انکاری ہوں۔ تم میری

بیوی ہو تو اس بات کو جھٹلایا جا سکتا ہے اور نہ ہی یہ ممکن ہے کہ تمہارے ہوتے کسی دوسری عورت کو یہ مقام حاصل ہو سکے۔ تمہیں مجھ پر کم از کم اتنا اعتماد ضرور کرنا چاہیے کہ جتنا بھی کم سہی مگر میں صرف تمہیں میسر ہوں اور تمہارے حقوق میں کوئی اور حصے دار نہیں ہے۔“

”میں نے کبھی آپ کے کردار پر شک کیا بھی نہیں لیکن بس کبھی کبھی یہ احساس کہ آپ نے مجبوراً مجھے اپنی زندگی میں شامل کیا ہے، اتنی شدت اختیار کر لیتا ہے کہ میں آپ کے ہر رویے کو اسی کے تناظر میں دیکھنے لگتی ہوں اور دکھی ہو جاتی ہوں۔“ اس نے اپنا سر کچھ اس انداز سے شہریار کے گھٹنوں پر ٹکا رکھا تھا کہ وہ اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن آواز کے بوجھل پن سے ظاہر تھا کہ وہ رو رہی ہے۔

”بلاوجہ خود کو اتنا ٹینس کرنا حماقت ہے۔ حد سے بڑھی ہوئی حساسیت بھی انسان کا جینا دشوار کر دیتی ہے۔ چلو شاباش اٹھو اور مجھے کوئی پین کلر دو تاکہ میں اپنے سر درد سے نجات حاصل کر سکوں۔“ اس نے ماریا کو دونوں شانوں سے تھام کر سیدھا کیا تو کچھ دیر کے لیے نظریں اس کے چہرے پر جمی ہی رہ گئیں۔ نم ناک پلکوں کے ساتھ آنکھوں میں تیرتے گلابی ڈوروں اور ناک کی سرخ پڑتی نوک نے اس کے حسن کو نیا ہی روپ دے دیا تھا۔ شہریار نے اپنا دل اس کے لیے گداز ہوتا محسوس کیا۔ وہ جیسے بھی سہی، اس کی بیوی تھی لیکن بدقسمتی سے وہ اسے خوش رکھنے میں ناکام تھا۔

”جسٹ آ منٹ۔ میں ابھی آپ کو کوئی اچھی سی میڈیسن دیتی ہوں۔“ اس کی قلبی کیفیت سے انجان ماریا بولتی ہوئی اس کے قدموں سے اٹھی اور پھرتی سے ایک دراز میں سے ٹیبلٹ نکال کر پانی کے گلاس سمیت اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ شہریار نے اس کی ہتھیلی پر دھری ٹیبلٹ اٹھا کر منہ میں رکھی اور پانی کے ساتھ نگل گیا۔

”اب آپ لیٹ جائیں۔“ ماریا نے پیار سے اسے ہدایت دی۔

”پہلے میں چینج کر لوں ورنہ مجھے قطعی نیند نہیں آئے گی۔“ شہریار نے کہا تو اس بار اس نے اس سے کوئی تعرض نہیں کیا اور خود بیڈ کے کنارے پر ٹک کر اس کا انتظار کرنے لگی۔ تھوڑی ہی دیر میں شہریار ڈھیلے ڈھالے آرام دہ کپڑوں میں ملبوس واپس آ گیا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جنہیں مردانہ وجاہت کا شاہکار قرار دیا جاتا ہے اور جو کچھ بھی پہن لیں، ان پر سج جاتا ہے۔ اگر وہ تھوڑی دیر پہلے فارمل ڈریسنگ میں بے حد وجیہہ لگ رہا تھا تو اس وقت بھی اس کی وجاہت میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ اپنی تمام تر وجاہت کے ساتھ وہ مضبوط قدموں سے چلتا ہوا بیڈ کی طرف بڑھا تو ماریا کو اس کا ہر قدم اپنے دل پر پڑتا ہوا محسوس ہوا۔ اس کی قلبی حالت سے بے خبر وہ تھکن سا آ کر بستر پر دراز ہو گیا اور ماریا بے ساختہ ہی اس کے قریب سرک آئی۔ قریب بیٹھ کر اس نے شہریار کا سر اپنے زانو پر رکھ لیا اور اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔ کچھ دوا کا اثر تھا اور کچھ ماریا کی مشاق انگلیوں کی حرکت کہ اس نے اپنے سر کا بوجھل پن کم ہوتا محسوس کیا۔ ماریا کی انگلیاں مہارت سے اس کے سر میں حرکت کرتی رہیں اور پھر ان انگلیوں نے بہت آہستگی سے آگے کا سفر شروع کر دیا۔ کنپٹیوں سے رخسار، ٹھوڑی اور گردن کا سفر طے کرتی اس کی متحرک انگلیاں بہت آہستگی سے سینے تک پہنچ گئیں اور وہاں موجود گھنے بالوں میں الجھنے لگیں۔ انگلیوں کی اس جادو اثر حرکت کے ساتھ ساتھ اس کے شاداب بدن سے اٹھتی دھیمی دھیمی مہک نے بھی آہستہ آہستہ شہریار کو اپنی گرفت میں لینا شروع کر دیا۔ ویسے بھی وہ زخم خوردہ تھا اور عورت کے فراق میں زخم خوردہ مرد کے لیے عورت سے بڑھ کر کوئی مرہم نہیں ہوتا۔ وہ بھی وقتی طور پر سہی، بہلتا جا رہا تھا اور بہلنے کے لیے بہکنا ضروری ہوتا ہے۔ وہ شراب نہیں پیتا تھا کہ اس کے نشے میں بہک جانے کا اہتمام کرتا لیکن ماریا اس وقت اس کے لیے نشے سے بھری چھلکتی بوتل ہی بنی ہوئی تھی جو بڑی فراخ دلی سے اسے فیض یاب کر رہی تھی۔ اس حسن سے فیض یاب ہوتا اس وقت وہ بڑا مسرور تھا لیکن جانے دل کے ایک گوشے میں کیسی کسک تھی جو کسی صورت پیچھا چھوڑتی ہی نہیں تھی۔ بہکنے اور بہلنے کے عمل سے گزرتے ہوئے بھی وہ اس کسک کو محسوس کر سکتا تھا۔

☆☆☆

”رب کا احسان ہے کہ اس نے ہمیں حفاظت سے یہاں تک پہنچا دیا پر آگے کچھ سوچا ہے راؤ صاحب! آگے ہم کیا کریں گے؟“ اس وقت وہ لوگ شہر میں موجود حامد راؤ کے دو کمروں کے فلیٹ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ فلیٹ دوران تعلیم مقصود کے زیر استعمال رہا تھا۔ اب بھی اس کا یا حامد راؤ کا کسی کام سے شہر آنا ہوتا تو وہ وہیں قیام کرتے تھے چنانچہ رات کے اندھیرے میں جب وہ لوگ ٹالی والا سے اپنی جانیں بچا کر فرار ہوئے تو سیدھے یہیں کا رخ کیا۔ دو کمروں کا وہ فلیٹ اتنا چھوٹا تھا کہ خواتین کا مکمل پردہ کرنا ممکن نہیں رہا تھا اس لیے حامد راؤ کی بیوی اس وقت اسلم کی موجودگی میں ہی اس سے بات کر رہی تھی۔ ویسے ان بے چاری خواتین کا

پردہ تو اسی وقت ٹوٹ گیا تھا جب وہ پاٹلی والا سے افراتفری میں فرار ہورہے تھے۔ وہ لمحات اتنے کٹھن تھے کہ کسی کو کچھ ہوش ہی نہیں رہا تھا۔۔۔ تو پھر بے چاری خوف زدہ خواتین پردے کا کیا خاک خیال رکھ پاتیں۔

"ہم کیا اور ہماری بساط کیا؟ جس رب نے جان بچانے کا احسان کیا ہے، وہ آگے کے معاملات بھی خود ہی سنوار دے گا۔" حامد راؤ نے اپنی بیوی کو تسلی دی اور پھر مقصود کی طرف متوجہ ہوگیا۔

"مقصود پتر! تھوڑی دیر میں باہر جاکر کھانے پینے کا سامان لے آنا۔ یہاں تو کچھ ہوگا نہیں اور تمہیں معلوم ہے کہ تمہاری پھپھی بھوک کی کتنی کچی ہے۔ نیند سے جاگے گی تو کھانے کے لیے شور مچا دے گی۔" حامد راؤ نے اپنی جیب سے رقم نکال کر مقصود کے حوالے کی۔ یہ تھوڑی سی رقم اتفاق سے ہی اس کی جیب میں پڑی رہ گئی تھی ورنہ وہ لوگ جتنی افراتفری میں وہاں سے نکلے تھے، کسی کو کچھ بھی ساتھ لینا یاد نہیں رہا تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ مقصود کی جیبیں بھی خالی ہوں گی اس لیے اسے رقم تھمائی تھی اور مقصود نے بنا حجت کیے جس طرح وہ رقم تھام لی تھی اس سے اس کے اندازے کی تصدیق بھی ہوگئی تھی۔ بہرحال، یہ کوئی تشویش ناک بات نہیں تھی۔ مقصود کسی وقت جاکر شفقت راؤ کے منیجر سے مل لیتا تو یہ مسئلہ منٹوں میں حل ہوجاتا۔ وہ شفقت راؤ کا داماد تھا اور اپنے داماد کو اس نے اتنی حیثیت تو دے رکھی تھی کہ اس کے مطالبے پر منیجر بے چون و چرا مطلوبہ رقم اس کے حوالے کردیتا۔

"اگر رقم کا کوئی مسئلہ ہے تو میں بھی تھوڑی بہت رقم آپ کو دے سکتا ہوں۔" اسلم کی گہری نظروں نے بھی فوراً مقصود کی خالی جیب کا اندازہ لگالیا تھا اس لیے اس نے پیشکش کی۔ حامد راؤ کے گھر سے افراتفری میں فرار ہونے کے باوجود وہ بالکل بے سروسامانی کا شکار اس لیے نہیں تھا کہ ڈیرے سے روانہ ہوتے وقت ہی اس نے اپنے پاس موجود جمع پونجی ایک چرمی تھیلے میں رکھ کر اسے لباس کے نیچے جسم سے باندھ لیا تھا اور وہ چرمی تھیلا مستقل اس کے ساتھ ساتھ ہی تھا۔ تھیلے میں خاصی معقول رقم موجود تھی۔ اگر اس نے ماہ بانو کی حفاظت کے لیے اسے صرف اپنے لیے مخصوص کرنے کا مطالبہ کرکے سردار کو منہ مانگی رقم کی پیشکش نہ کی ہوتی تو اس وقت وہ اتنی بڑی رقم کا مالک ہوتا کہ شہر کے کسی بھی حصے میں گھر خرید کر وہاں ماہ بانو کے ساتھ اپنی نئی زندگی کا آغاز کرسکتا تھا۔ بہرحال، اب بھی وہ اس لائق تو تھا ہی کہ وقتی طور پر گزارہ کرنے میں کوئی پریشانی نہیں تھی اور اس نے اپنے محسن حامد راؤ کو بہت کھلے دل سے رقم کی پیشکش کی تھی۔

"نہیں صاحب زادے! رقم کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ بچوں کے پاس رقم موجود ہے اور مزید بھی ضرورت کے مطابق منگوائی جاسکتی ہے۔ البتہ تمہاری پُرخلوص پیشکش کے لیے میں دل سے تمہارا شکر گزار ہوں۔" حامد راؤ نے بڑے سبھاؤ سے جواب دیا اور پھر اپنی بیوی کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے اس سے بولے۔

"بھلی لوک! میرا خیال ہے کہ تم دونوں بھی تھوڑی دیر جاکر آرام کرلو۔ ناشتے پانی کا مقصود بازار سے انتظام کر دے گا اس لیے اس طرف سے بے فکر رہنا۔"

"چنگی گل ہے راؤ صاحب!" حامد راؤ کی سیدھی سادی فرماں بردار بیوی نے اس کا اشارہ پاکر اٹھنے میں ذرا دیر نہ لگائی۔ ماہ بانو کو بھی اس کی پیروی کرنی پڑی۔ اسلا اور اس کی ماں تو پہلے ہی دوسرے کمرے میں تھیں چنانچہ ان دونوں کے جاتے ہی کمرے میں صرف مردانہ نفری ہی رہ گئی۔ اس پل اسلم نے محسوس کیا کہ حامد راؤ اسے کچھ جانچتی ہوئی نظروں سے گھور رہا ہے۔ وہ اس کی نظروں سے بے چینی سی محسوس کرنے لگا۔ یوں لگتا تھا کہ حامد راؤ اس سے کوئی خاص بات کرنے والا ہے لیکن جب کئی منٹ گزر جانے کے بعد بھی وہ زبان سے کچھ نہ بولا تو اسلم کی بے چینی الفاظ کا روپ دھار گئی۔

"کیا بات ہے راؤ صاحب! آپ میری طرف ایسی نظروں سے کیوں دیکھ رہے ہیں؟ کہیں مجھ سے آپ کی شان میں کوئی گستاخی تو نہیں ہوگئی؟" اس نے کچھ گھبراہٹ کے عالم میں سوال کیا۔

"تم کون ہو؟" حامد راؤ نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے نہایت سنجیدگی سے پوچھا۔

"م... میں... میں آپ کو اپنے بارے میں بتا تو چکا ہوں۔" اس نے گڑبڑا کر جواب دیا۔

"لیکن مجھے شک ہے کہ تم نے مجھے اپنے بارے میں سچ نہیں بتایا ہے۔" وہ بڑے نپے تلے انداز میں بولے۔

"لیکن کیوں؟ میں نے ایسا کیا کیا ہے؟" اس نے پست آواز میں احتجاج کیا۔

"دیکھو برخوردار! بات یہ ہے کہ بے شک میں ایک چھوٹے سے پنڈ کا رہنے والا عام سا آدمی ہوں لیکن بہرحال میں نے یہ بال دھوپ میں سفید نہیں کیے ہیں۔ میں نے زندگی کو تم سے کہیں زیادہ برتا ہے اس لیے میرا تجربہ بھی وسیع ہے۔ اور میرا تجربہ کہتا ہے کہ تم نے اپنے بارے میں ہمیں سب کچھ نہیں بتایا ہے۔ تمہاری اصلیت اب تک پردے میں ہے۔"

"میں پھر پوچھوں گا کہ آپ کس بنیاد پر ایسا کہہ رہے ہیں؟" اندر ہی اندر لرزنے کے باوجود اس نے اپنا لہجہ ذرا مضبوط کرکے سوال اٹھایا۔

"پاٹلی والا میں گزرنے والے آخری لمحات کی بنیاد پر۔ ہتھیار میرے اور مقصود کے پاس بھی تھے لیکن تم جس منظم انداز میں ہتھیار استعمال کررہے تھے، اس سے صاف ظاہر تھا کہ تمہیں ان کھلونوں سے کھیلنے کا وسیع تجربہ ہے۔ پھر تم جس بے خوفی اور بے جگری کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہمیں وہاں سے نکال لائے، وہ کسی عام شخص کے بس کی بات نہیں۔ ایسی مہارت دو ہی طرح کے لوگوں کو حاصل ہوتی ہے۔ اول قانون کے محافظ، دوئم قانون کے دشمن۔ اب تم بتاؤ کہ تمہارا تعلق کس گروہ سے ہے؟" انہوں نے نپا تلا سا تجزیہ اس کے سامنے رکھا تو وہ کتنی ہی دیر تک کچھ بولنے کے قابل نہ ہوسکا پھر نظریں جھکا کر دھیمی آواز میں پوچھا۔

"آپ کا کیا اندازہ ہے؟ آپ مجھے کس گروہ کا آدمی سمجھتے ہیں؟" اس بار حامد راؤ کے لیے فوری طور پر جواب دینا ممکن نہیں رہا اور وہ ذرا سے توقف سے گلا کھنکھارتے ہوئے بولے۔

"اگر سچ پوچھو تو عقل اور تجربہ دونوں یہی کہتے ہیں کہ جو راہ راست پر ہوتے ہیں اور قانون کے دائرے میں رہ کر کام کرتے ہیں، انہیں دوسروں سے اپنی پہچان چھپانے کی اتنی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ بہت فخر سے اپنی پہچان ظاہر کرسکتے ہیں لیکن دوسری طرف میں تمہاری روشن پیشانی اور سلجھی ہوئی طبیعت کو دیکھتا ہوں تو دل تمہیں غلط ماننے پر راضی نہیں ہوتا۔ حالانکہ تم جن حالات میں مجھ تک پہنچے ہو وہ خاصے مشکوک تھے۔" حامد راؤ کا جواب سن کر وہ دھیرے سے مسکرا دیا۔ انہوں نے اس کے بارے میں جو تجزیہ پیش کیا تھا، وہ بالکل درست تھا۔ وہ اس کے بارے میں بالکل جائز تذبذب کا شکار تھے۔ قسمت کی ستم ظریفی نے اسے ڈاکوؤں کے گروہ میں شامل کردیا تھا جہاں سے اس نے ہتھیاروں کا استعمال اور لڑنے بھڑنے کا ہنر سیکھا لیکن تھا تو وہ شریف ماں باپ کی اولاد جس نے پڑھ لکھ کر ملک کی خدمت کرنے کا خواب آنکھوں میں سجا رکھا تھا۔ حالات کی زد میں آکر اس کا یہ خواب اتنی بری طرح بکھرا کہ وہ خود بکھر کر رہ گیا اور پیشانی پر ڈاکو ہونے کا داغ سجا بیٹھا۔

"اگر تم مناسب نہیں سمجھتے یا ہمیں اپنے بارے میں نہیں بتانا چاہتے تو مت بتاؤ لیکن جھوٹ بولنے سے گریز ہی کرنا۔ تم جو بھی ہو، ہم نے تمہیں دل میں جگہ دی ہے اور اگر کبھی زندگی میں کسی مقام پر تمہارے جھوٹے ہونے کا علم ہوا تو بہت

دکھ ہوگا۔'' حامد راؤ نے یہ الفاظ کہہ کر اسے بالکل ہی بے بس کر دیا۔ اپنے ساتھ اتنا خلوص برتنے والے شخص سے کوئی جھوٹ بولنے کا سوچ کر وہ پہلے ہی تذبذب کا شکار تھا اور اب تو ذرا بھی گنجائش نہیں رہی تھی چنانچہ اپنی داستانِ حیات اختصار سے سناتا گیا۔ اس نے ماہ بانو کے ڈیرے پر پہنچائے جانے سے متعلق بھی سب کچھ بتا ڈالا اور اس کے لیے اپنی پسندیدگی بھی ظاہر کر دی البتہ اس مقام پر اس نے حامد راؤ سے ایک جھوٹ بولنا ضروری سمجھا اور وہ یہ کہ اس کی اور ماہ بانو کی ڈیرے پر شادی کر دی گئی تھی۔ یہ جھوٹ اس نے صرف اس لیے بولا تھا کہ ماہ بانو کی عزت پر کوئی حرف نہ آئے اور ان دونوں کے تعلق کے بارے میں کوئی غلط قیاس نہ کیا جا سکے۔

حامد راؤ نے اس کی داستان کا ایک ایک حرف پوری توجہ اور سنجیدگی کے ساتھ سنا اور کہیں ان کے چہرے پر ایسا کوئی تاثر نہیں ابھرا جس سے اسے گمان ہوتا کہ وہ اس کی سچائی پر شک کر رہے ہیں۔ البتہ مقصود کی آنکھوں میں ایک جہانِ حیرت بھرا ہوا تھا۔ یقینی طور پر اس کے لیے اسلم کی داستان بہت دلچسپ اور حیرت ناک ثابت ہوئی تھی۔

''تمہاری داستان بہت دل گداز ہے اسلم! ہمارے معاشرتی رسوم ورواج کی بدصورتی اور لوگوں کی بے حسی نے نہ جانے تم جیسے کتنے نوجوانوں کو برباد کیا ہے۔ تمہاری بہن کے سسرالیوں نے تمہاری حیثیت سے زیادہ جہیز مانگ کر جس کم ظرفی اور لالچ کا مظاہرہ کیا تھا اس کی وجہ سے برائی کس حد تک پھیلی، شاید خود انہیں بھی اندازہ نہ ہو۔ ایک طرف اگر تم اور تمہارا گھرانا برباد ہوا تو دوسری طرف وہ لوگ خود کون سا سکھ میں رہے۔ جوان بیٹے کے قتل نے ان کی کمر بھی تو توڑ ڈالی ہوگی اور پھر ان متاثرین کا تو کوئی شمار ہی نہیں ہے جو تمہارے ڈاکو بننے کے بعد تمہارے ہاتھوں لٹے ہوں گے۔ لٹنے والوں کی بھی اپنی اپنی داستانیں ہوں گی۔ کہیں کسی کی بیٹی کی شادی کے لیے رکھا ہوا اسباب لٹ گیا ہوگا تو کہیں کسی بیمار کے علاج کے لیے رکھی رقم۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم نے کبھی ایسی کسی رقم پر ہاتھ ڈال دیا ہو جو کسی بے سہارا جوڑے نے اپنے بڑھاپے کے لیے سنبھال کر رکھی ہو یا پھر کسی نوجوان کو اعلیٰ تعلیم کے لیے بھیجنے کے واسطے مختص ہو... اور اس کے خواب بھی تمہاری طرح بکھر گئے ہوں۔'' حامد راؤ کے الفاظ نے اسے گہری شرمندگی سے دوچار کر دیا۔ غصے اور انتقام کی آگ میں جلتے کبھی اس نے اس انداز سے تو سوچا ہی نہیں تھا۔ اپنی نظر میں تو وہ اب تک اس معاشرے سے انتقام لیتا رہا تھا جس نے اسے برباد کیا تھا لیکن اب ذرا مختلف زاویے سے دیکھ رہا تھا تو اپنا کردار مظلوم سے بڑھ کر ظالم کا نظر آ رہا تھا۔ اگر کسی نے اس پر ظلم ڈھایا تھا تو وہ بھی تو کسی سے پیچھے نہیں رہا تھا۔ خود کو برباد کرنے والے افراد کو تو وہ آسانی سے انگلیوں پر شمار کر سکتا تھا لیکن جو اس کے ہاتھوں برباد ہوئے تھے، ان کا اس کے پاس کوئی شمار کب تھا۔ ندامت کے شدید احساس سے اس کا سر جھکتا ہی چلا گیا۔

''میں نے یہ سب تمہیں شرمندہ کرنے کے لیے نہیں کہا ہے۔'' حامد راؤ اس کی کیفیت فوراً ہی بھانپ گئے۔ ''میں یہ سب اس لیے کہہ رہا ہوں کہ مجھے تمہاری داستان سن کر دلی رنج ہوا ہے اور میں پوری شدت سے اس بات پر کڑھ رہا ہوں کہ محض کسی کے لالچ کی وجہ سے کتنی بربادی ہوئی۔ تم تو خود حالات کا شکار ایک ستم رسیدہ نوجوان ہو۔ میں تم پر طنز کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا اور اب تو تم برائی کی اس دلدل سے نکل ہی آئے ہو۔ یہ تمہاری خوش قسمتی ہے کہ ایک برے ٹھکانے پر ہونے کے باوجود اللہ نے تم تک ایک ایسی عورت کو پہنچا دیا جو تمہارا ہاتھ تھام کر تمہیں اس جہنم سے نکال لائی ورنہ عورت کے لالچ اور طمع کی بھی بڑی داستانیں بکھری ہوئی ہیں۔ ماہ بانو بیٹی قابلِ تعریف ہے کہ اس نے اپنے لیے ایک مشکل لیکن سیدھی راہ کا انتخاب کیا ورنہ اگر وہ لالچ میں مبتلا ہو جاتی تو ہو سکتا تھا کہ تم اس کی خاطر پہلے سے بھی بڑی بڑی وارداتیں کرنے پر مجبور ہو جاتے۔'' حامد راؤ بہت سبھاؤ سے اسے احساسِ شرمندگی سے نکالنے لگا۔

''شکریہ راؤ صاحب! میں نے اپنے بارے میں آپ کو اتنی تلخ سچائی سے شاید اسی لیے آگاہ بھی کر دیا کہ آپ مجھے صاحبِ دل آدمی محسوس ہوئے تھے، ورنہ کوئی عام آدمی تو میرے ڈاکو ہونے کا سن کر ہی بدک جاتا۔'' اس نے رقت آمیز لہجے میں حامد راؤ کا شکریہ ادا کیا۔

''یہ بتاؤ کہ اب تمہارا کیا پروگرام ہے؟ اگر تم چاہو تو ہم تمہیں اپنے کاروبار میں شامل کر سکتے ہیں۔ ہمارے زراعت اور باغبانی سے متعلق کاروبار سے تو شاید تمہیں اتنی دلچسپی نہ ہو لیکن شفقت کے دفتر میں تمہارے مطلب کا کوئی نہ کوئی کام نکل ہی آئے گا۔ میں تمہیں وہاں کھپا دوں گا تاکہ تم اپنی بیوی کے ساتھ باعزت زندگی گزار سکو۔'' انہوں نے اس کی بات پر کوئی تبصرہ کیے بغیر اس سے اس کا پروگرام جاننا چاہا اور ساتھ ہی ایک پیشکش بھی کر دی۔

''میں آپ کا بہت ممنون ہوں راؤ صاحب کہ آپ نے مجھے اس قابل سمجھا۔ میں آپ کی اس پیشکش کو یاد رکھوں گا لیکن فی الحال مجھے اپنی ماں سے ملنے گاؤں جانا ہے۔ میری خطاؤں کی وجہ سے وہ آج تک مجھ سے ناراض ہے۔ میں اسے منانے کی کوشش میں بھی کامیاب نہیں ہو سکا لیکن اب مجھے یقین ہے کہ وہ مجھ سے ناراض نہیں رہ سکے گی۔ ماہ بانو اسے منا لے گی۔'' اسلم کی آنکھوں میں ایک اُمید سی تھی۔

''ٹھیک ہے۔ میں تمہارا انتظار کروں گا۔ میری دعائیں تمہارے ساتھ رہیں گی۔'' حامد راؤ نے جواب دیا تو اسلم کی آنکھیں جھلملا اٹھیں۔ آج جانے کتنے برسوں بعد کسی کے لبوں سے اس نے اپنے لیے دعا سنی تھی۔ ماں کی ناراضی کے بعد تو وہ اس نعمت سے بھی محروم ہو گیا تھا۔ ہو سکتا تھا کہ ماں اب بھی اس کے لیے دعائیں کرتی ہو لیکن وہ خود ان دعاؤں کو اپنے کانوں سے سن کر حاصل ہونے والی خوشی سے محروم ہو گیا تھا۔ شاید ماہ بانو کا اس کی زندگی میں چلے آنا اس کی ماں کی دعاؤں کا ہی ثمر ہو ورنہ جرم کی راہ پر قدم رکھنے کے بعد تو اسے اپنا ایسا کوئی عمل یاد نہیں تھا جس کے صلے میں وہ اتنی بڑی نعمت کا حق دار ٹھہرتا۔

''کیا سوچنے لگے اسلم بھائی؟'' اس کی خاموشی کو محسوس کر کے اب تک گفتگو میں دخل نہ دینے والے مقصود نے آہستہ سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

''کچھ نہیں، بس اپنی خوش قسمتی کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ اللہ نے اتنے برے حالات میں بھی اتنے اچھے لوگوں سے ملوا کر کتنا بڑا احسان کیا ہے۔'' اس نے دھیرے سے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''انسان اپنی نیت صاف رکھے تو اللہ خود ہی منزل آسان کر دیتا ہے۔ آپ نے برائی چھوڑنے کا سوچا تو دیکھیں اللہ نے بھی آپ کا ہاتھ تھام لیا۔ بس اب ہمیں انتظار رہے گا کہ آپ کب واپس آ کر ہمیں جوائن کرتے ہیں۔'' مقصود کے چہرے پر بھی بڑی بے ریا اور مخلص مسکراہٹ تھی۔

''اللہ کو منظور ہوا تو میں جلد تمہارے درمیان دوبارہ پہنچ جاؤں گا لیکن یہ تو بتاؤ کہ تم نے خود اپنے بارے میں کیا سوچا ہے۔ ہم لوگ جس انداز سے گاؤں سے نکلے ہیں، اس کے بعد تو کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ پیر سائیں کے معتقدین رات کے اندھیرے میں تمہارے گھر کو گھیر سکتے ہیں تو ان سے کچھ بعید نہیں کہ وہ اور کیا کچھ کر گزریں۔ پہلے تو وہ پھر بھی شفقت راؤ صاحب سے نالاں تھے اور ان کی فیکٹری کو نقصان پہنچانا چاہتے تھے لیکن اب تو تم لوگ بھی زیرِ عتاب ہو گے۔ ہماری طرف سے چلائی گئی گولیوں نے جانے ان کے کتنے آدمیوں کو زخمی یا ہلاک کیا ہوگا۔ اتفاقاً وہ لوگ تمہارے گھر اور زمینوں کو بھی تباہ نہ بنا سکتے ہیں۔ پیر سائیں کی حقیقت کچھ بھی ہو لیکن یہ طے ہے کہ گاؤں میں اس شخص کے بہت سے عقیدت مند موجود ہیں۔ اس کی سب سے بڑی مثال تمہاری گھریلو ملازمہ ہے۔ پہلے میں فوری طور پر اس عورت کا کردار سمجھ نہیں سکا تھا لیکن بعد کے حالات سے ثابت ہو گیا کہ اس عورت نے ہم لوگوں کے درمیان ہونے والی گفتگو سن لی تھی اس لیے بیماری کا بہانہ کر کے چھٹی لے کر چلی گئی۔ اس کی زبان سے یہ جان کر کہ خانقاہ کو آگ لگانے میں شفقت راؤ ملوث تھا، پیر سائیں کے معتقدین مشتعل ہو گئے ہوں گے اسی لیے انہوں نے رات کی تاریکی میں تمہارے گھر پر حملہ کر دیا۔ اگر انہیں اس حملے کا بھرپور جواب نہ ملتا تو وہ اپنے مذموم مقاصد میں کامیاب بھی ہو سکتے تھے۔ وہ تو اللہ کا شکر ہے کہ ہم سب محفوظ رہے لیکن بات پھر وہیں آ جاتی ہے کہ اب تا بلی والا میں حالات تمہارے لیے بہت مخدوش ہوں گے۔ ایسے حالات میں تم کیا کرو گے اور کس طرح اپنا کام جاری رکھو گے؟ میرا جہاں تک خیال ہے، اب تک تو وہ قانون کو بھی تمہارے خلاف متحرک کر چکے ہوں گے۔ ویسے بھی تم لوگوں نے ہی مجھے بتایا تھا کہ علاقے کا تھانے دار خود پیر سائیں کا معتقد ہے۔'' اس نے راؤ خاندان کو درپیش خطرات ان لوگوں کے سامنے رکھ دیے۔

''ان سب باتوں کا تو ہمیں بھی اندازہ ہے۔'' مقصود کے بجائے حامد راؤ نے گلا کھنکھارتے ہوئے جواب دیا۔ ''وقتی طور پر تو میں نے سوچ لیا ہے کہ اپنے بیان میں ہم یہ موقف اختیار کریں گے کہ رات گئے مسلح افراد کو اپنے گھر کو گھیرے میں لیے دیکھ کر ہمیں یہ گمان گزرا تھا کہ ڈاکوؤں نے حملہ کر دیا ہے چنانچہ ہم نے بھی جوابی کارروائی کر ڈالی اور بڑی مشکل سے اپنی جان بچا کر نکلنے میں کامیاب ہوئے۔ رہی مشتعل افراد کے ہماری املاک کو نقصان پہنچانے کی بات تو اس معاملے کو میں اتنی اہمیت نہیں دیتا۔ میں نصیب پر یقین رکھنے والا آدمی ہوں اور میرا ایمان ہے کہ جو شے میری ہے، وہ ہر حال میں مجھے ملنی ہے اور جو اللہ مجھے نہیں دینا چاہتا، وہ میں اپنا پورا زور لگا کر بھی حاصل نہیں کر سکتا۔''

''آپ کی سوچ بہت اچھی ہے۔ میں دعا کروں گا کہ جب میں اپنی ماں سے مل کر واپس آؤں تو حالات اس نہج پر ہوں کہ میں آپ لوگوں کے ساتھ کام کر سکوں۔ آپ کے ہاں ملازمت کرنے کو میں اپنی خوش نصیبی سمجھوں گا۔'' وہ حامد راؤ سے بے حد متاثر ہو چکا تھا چنانچہ پورے دل سے بولا۔ آگے

کیا ہونے والا ہے، یہ فیصلہ تو بہرحال اس تقدیر سے ہی ہونا تھا جس کا حال اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا البتہ اللہ کو ماننے والے اپنے حصے کی جدوجہد کرنے کے بعد اس پر شکر اور صبر سے کام لیتے ہیں کہ اسی میں حقیقی کامیابی کا راز پوشیدہ ہے۔

☆☆☆

مشا برم خان ایک بار پھر ٹاہلی والا میں تھا۔ شہریار نے اسے پیر سائیں کے متعلق مزید تفتیش کرنے کی ذمے داری سونپی تھی چنانچہ اس نے تاخیر مناسب نہیں سمجھی اور دوبارہ وہاں چلا آیا۔ پہلے اس کا ارادہ تھا کہ پیر سائیں سے ملاقات کا بہانہ کر کے ایک بار پھر اس کے اس مرید سے ملنے پہنچ جائے گا جس نے پچھلی بار ٹاہلی والا آنے پر اس کی میزبانی کی تھی لیکن پھر خود ہی اپنا ارادہ بدل ڈالا۔ پچھلی بار ہی اسے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کا میزبان پیر سائیں کا اندھا معتقد ہے۔ اس شخص سے اسے پیر سائیں کے متعلق جو بھی معلومات حاصل ہوتیں، وہ اتنی قابلِ اعتماد اس لیے نہیں ہو سکتی تھیں کہ عقیدت مند سچ بیانی سے زیادہ اپنے اعتقاد سے کام لیتا چنانچہ اس نے فیصلہ کیا کہ کسی ایسے شخص کو تلاش کرنے کی کوشش کرے گا جو اسے درست معلومات فراہم کر سکے۔ اس چکر میں وہ ٹاہلی والا میں ادھر ادھر گھومتا پھر رہا تھا۔ خانقاہ کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس نے دیکھ لیا تھا کہ وہاں تعمیرِ نو کا کام بڑی سرعت سے جاری ہے لیکن اس نے وہاں رکنا مناسب نہیں سمجھا اور بغیر رکے سیدھا آگے بڑھتا چلا گیا۔

ٹاہلی والا بھی دیگر دیہاتوں کی طرح ایک عام سا پنڈ تھا جہاں کچے اور نیم پختہ مکانوں کی اکثریت تھی۔ پختہ مکان بس چند ہی تھے جو یقیناً پنڈ کے صاحبِ ثروت لوگوں کی ملکیت تھے۔ ان میں سے ایک مکان چودھری شریف کا بھی تھا جہاں اس نے پچھلی بار قیام کیا تھا اور جہاں پیر سائیں نے بھی آج کل اپنا ٹھکانا بنا رکھا تھا۔ اس نے جان بوجھ کر اس طرف کا رخ نہیں کیا کہ مبادا مکان کے سامنے سے گزرتے ہوئے کسی ایسے شخص سے ٹکراؤ ہو جائے جو اس کا صورت آشنا ہو اور پچھلی بار اس کے وہاں قیام سے آگاہی رکھتا ہو۔ چودھری شریف کے مکان کی طرف جانے والے راستوں سے مختلف سمت میں چلتا ہوا وہ ایک مقام پر پہنچ کر ٹھٹک گیا۔ وہ ایک پختہ مکان تھا جسے بری طرح آتش زنی کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ مکان کی حالت دیکھ کر ہی اس بات کا اندازہ ہو رہا تھا کہ وہاں باقاعدہ منصوبہ بندی کے ساتھ آگ لگائی گئی تھی۔ مکان کی تعمیر میں استعمال ہونے والی لکڑی کا سرے سے نام و نشان ہی نہیں رہا تھا اور وہاں بغیر کھڑکیوں دروازوں کا بس ایک ڈھانچا سا کھڑا رہ گیا تھا۔ عمارت کے اس بچے کھچے [illegible] کو دیکھ کر اس بات کا تو تصور ہی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ [illegible] استعمال ہونے والے ساز و سامان میں سے کوئی شے [illegible] رہی ہو۔ اگر اتفاق سے کچھ باقی بھی رہا ہو گا تو کسی بھی [illegible] پرست کے ہاتھ لگ گیا ہو گا۔ اسے مکان کی حالت دیکھ کر اندازہ لگانے میں زیادہ دشواری نہیں ہوئی کہ مکان حامد [illegible] نامی اس شخص کی ملکیت ہے جو خانقاہ کو آگ لگانے والے شخص شفقت راؤ کا کزن اور سمدھی ہونے کے ناتے معتوب ٹھہرا تھا۔ اسی مکان میں بانو اور اسلم کی موجودگی کی بھی اطلاع ملی تھی۔ اب وہ دونوں اپنے میزبانوں سمیت جانے کہاں تھے لیکن اسے اس تباہ شدہ مکان کو دیکھ کر دلی افسوس ہو رہا تھا۔

حالات و واقعات بے شک مختلف تھے لیکن اس گھر کو دیکھ کر اسے اپنے گھر کا اجڑنا یاد آ گیا تھا۔ کئی مہینوں بعد بھی اگر وہ کبھی بھی اپنے اس چھوٹے سے گھر جایا کرتا تھا جہاں اس کی ماں اور چھوٹا بھائی اکرم خان رہتے تھے۔ اکرم خان اس کی خاطر ماہ بانو کی حفاظت کا فریضہ انجام دیتے ہوئے اپنی جان سے چلا گیا جبکہ ماں کو جوان بیٹے کی موت کا صدمہ ڈھا گیا۔ وہ آج بھی نیم مردہ حالت میں اسلام آباد کے ایک اسپتال میں داخل تھی اور وہ دل میں ان لوگوں کے لیے انتقام کی آگ لیے پھر رہا تھا جن کی وجہ سے اس کا گھر برباد ہوا تھا۔ اب ٹاہلی والا میں ایک بار پھر اس نے ایسی صورتِ حال دیکھی تھی کہ ایک نام نہاد پیر کے عقیدت مندوں نے اپنے ہی پنڈ کے رہائشی ایک عزت دار گھرانے کو بے گھر کر کے فرار ہونے پر مجبور کر دیا۔

حامد راؤ کے جلے ہوئے گھر کے سامنے سے وہ بجھی بجھی کیفیت میں آگے بڑھا اور بے خیالی میں آگے بڑھتا ہی چلا گیا۔ چلتے چلتے وہ مکانوں کی حدود سے نکل کر کھلے علاقے میں پہنچ گیا۔ یہاں دور دور تک کھیت پھیلے ہوئے تھے۔ ان ہرے بھرے کھیتوں میں ہی اس نے کافی بڑے قطعہ اراضی کو اسی حال میں دیکھا جس حال میں وہ ابھی حامد راؤ کا گھر دیکھ کر آ رہا تھا۔ دوسرے کھیتوں کی طرح یقیناً یہاں بھی کھڑی فصلیں موجود ہوں گی لیکن اب تو بس راکھ کا ڈھیر ہی رہ گیا تھا۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ صدمے میں مبتلا ہو گیا۔ وہ جانتا تھا کہ زمین کے سینے کو چیر کر اس میں سے ننھی کونپل نکلنے اور پھر اس کونپل کے پھلنے تک کے مراحل اتنی آسانی سے طے نہیں ہوتے۔ کسان اپنا خون پسینا ایک کرتا ہے تب کہیں جا کر زمین وہ رزق دیتی ہے جو انسانوں کے پیٹ کا دوزخ بھر سکے۔ فصل کے تیار ہونے تک اپنے دن

رات ایک کر دینے والا کسان اپنے بہت سے خواب اور امیدیں بھی ساتھ ساتھ ہی پروان چڑھاتا ہے۔ اگر حامد راؤ کا گھر تباہ ہوا تھا تو یہ صرف اس کا ذاتی نقصان تھا۔ صاحبِ حیثیت آدمی اس طرح کے نقصانات کو بعد میں کسی نہ کسی طرح پورا کر ہی لیتا ہے لیکن کھڑی فصلیں جلائے جانے کا مطلب تھا کہ وہ غریب مزارع بھی متاثر ہوئے ہوں گے جن کی روزی روٹی ان کھیتوں سے وابستہ ہوگی۔ اسے اندازہ تھا کہ حامد راؤ اپنے خاندان کے ساتھ جہاں کہیں بھی ہوگا، کم از کم فاقہ کشی پر مجبور نہیں ہوگا لیکن اس کے کھیتوں پر کام کرنے والے کسانوں کے گھر تو جلد یا بدیر یہی نوبت آنے والی تھی... اور یہ تو ممکن ہی نہیں تھا کہ پیر سائیں کی عقیدت کا دم بھرنے والے وہ مشتعل افراد جنھوں نے یہ کارنامہ انجام دیا تھا، اپنے عمل کی تلافی کرتے ہوئے ان غریبوں کی کفالت کا ذمہ اٹھاتے۔

اس صورتِ حال پر اس کا دل بے حد بوجھل ہو گیا اور اس بوجھل دل کے ساتھ وہ واپس پلٹنے ہی لگا تھا کہ نظر ایک بوڑھے پر پڑی۔ پھٹی ہوئی بنیان اور میلی دھوتی پہنے وہ بوڑھا دونوں ہاتھ سر پر رکھے جلے ہوئے کھیت کے درمیان اکڑوں بیٹھا ہوا تھا۔ بوڑھے سے اس کا فاصلہ اچھا خاصا تھا اس کے باوجود وہ اس کے چہرے پر لکھی حسرت و یاس کی تحریر پڑھ سکتا تھا۔ اس کے قدم بے ساختہ ہی اس بوڑھے کی طرف اٹھ گئے۔ بوڑھا اس کی آمد سے بے خبر جلے ہوئے کھیت کے منظر میں اس طرح گم تھا کہ اسے اردگرد کا کوئی ہوش ہی نہیں تھا۔ البتہ قریب جانے پر مشاہرم خان کو وہ آنسو بھی نظر آ گئے تھے جو بوڑھے کی سیل زدہ آنکھوں سے نکل کر بہتے ہوئے اس کی کھچڑی داڑھی میں گم ہوتے جا رہے تھے۔ الجھے ہوئے بالوں والی وہ داڑھی گواہ تھی کہ اس بے چارے نے اپنے شب و روز پسینا بہاتے ہوئے اتنی مصروفیت میں گزارے تھے کہ اسے اپنے وجود کی صفائی ستھرائی کی بھی مہلت نہ مل پائی ہوگی۔ وہ بنا کوئی سوال کیے بھی بوڑھے کا کھیت سے تعلق سمجھ رہا تھا چنانچہ دل میں اس کے لیے گہری ہمدردی محسوس کرتے ہوئے اپنا دایاں ہاتھ اس کے شانے پر رکھ کر آہستہ سے دبایا۔ بوڑھے کے وجود میں پہلی بار جنبش پیدا ہوئی اور اس نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا البتہ لب اب بھی خاموش ہی تھے۔

"السلام علیکم بابا!" مشاہرم خان نے خود ہی گفتگو کا سلسلہ شروع کرنے کی کوشش کی جس کے نتیجے میں وہ بوڑھے کی آواز تو نہ سن سکا البتہ اس نے سر کی جنبش سے سلام کا جواب دے دیا۔

"آپ کون ہو بابا اور اس جلے ہوئے کھیت میں کیوں بیٹھے ہو؟" مشاہرم خان نے ہمت نہ ہاری اور خود بھی بوڑھے کے سامنے پنجوں کے بل بیٹھ گیا۔

"جانے کیوں بیٹھا ہوں؟" بوڑھے کے لب کھوئے کھوئے انداز میں متحرک ہوئے۔ "سب بولتے ہیں کہ نور بخش! اب ادھر کچھ نہیں رہا۔ تو ادھر کیوں آتا ہے؟ پر میرا تو سب کچھ ادھر ہی تھا۔ لیکن ادھر نہ آؤں تو سمجھ نہیں آتا کہ کدھر جاؤں۔"

"کیا یہ کھیت تمہارے تھے بابا؟" اس نے بوڑھے نور بخش کو کریدنے کے لیے اس سے سوال کیا۔

"میرے نہیں تھے پر میرے ہی تھے۔ میں نے کسی باپ کی طرح اس کے ایک ایک بوٹے کو پروان چڑھایا تھا۔ ادھر سے مجھے اپنی روزی ملتی تھی۔ یہ فصل کٹ کر منڈی میں بکتی تو مالک مجھے میری دھی کے ویاہ کے لیے روپے دیتا۔ مالک نے مجھ سے وعدہ کیا تھا اور وہ وعدے کا بڑا پکا سچا آدمی ہے، پر ظالموں نے تو مالک کو اس کے ٹبر کے ساتھ یہاں سے بھگا ڈالا۔ اب میں کس کے سامنے جا کر ہاتھ پھیلاؤں کہ مجھے میری دھی کے ویاہ کے لیے روپے دو... اور باقی چھ اور جانیں جو گھر میں بیٹھی ہیں، ان کے پیٹ بھرنے کا بندوبست کرو۔ کوئی سننے والا ہے ہی نہیں بس اس لیے یہاں سینہ کوٹنے کے لیے آ جاتا ہوں۔ اس جلے ہوئے کھیت کو دیکھ کر مجھے ایسا لگتا ہے کہ جیسے میرے سامنے میرے جوان بیٹے کا لاشہ پڑا ہو۔" نور بخش اور بھی زیادہ شدت سے رونے لگا۔ دبلے پتلے نور بخش کا جسم ہچکیوں کے زور سے بری طرح ہل رہا تھا۔ قریب سے اسے دیکھتے مشاہرم خان کو اندازہ ہو رہا تھا کہ درحقیقت وہ اتنا بوڑھا نہیں ہے جتنا دور سے دکھائی دے رہا تھا۔ یقیناً غم والم کی شدت نے اس کے حلیے پر وہ برے اثرات مرتب کیے تھے جن کی وجہ سے وہ بہت زیادہ عمر رسیدہ محسوس ہو رہا تھا۔

"تمہارے مالک کے کھیت کیوں جلائے گئے؟ کیا وہ کوئی برا آدمی تھا اور اس کی کسی سے دشمنی تھی؟" وہ ایسے رخ سے سوالات کر رہا تھا کہ بوڑھا خود ہی حقیقت اگلتا جائے۔ اس کی یہ حکمتِ عملی کامیاب رہی اور وہ بلبلا کر بولا۔

"نہ تو میرا مالک برا آدمی تھا اور نہ ہی اس کی کسی سے دشمنی تھی۔ وہ وچارہ تو بس رشتے داری اور دوستی یاری کے چکر میں زد میں آ گیا۔ جو کچھ کیا تھا، اس کے سمدھی نے کیا تھا لیکن پاگل لوگ اس وچارے کے گھر پر چڑھ دوڑے اور اب الٹی

سیدھی کہانیاں بنا کر اسے بھی مجرم ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

"ارے کہیں تم حامد راؤ کی تو بات نہیں کر رہے؟" مشاہرم خان نے چونکنے کی اداکاری کی۔ "میں نے سنا ہے کہ حامد راؤ کے چچا زاد بھائی اور سمدھی شفقت راؤ نے خانقاہ میں آگ لگا دی تھی اور حامد راؤ نے اس کے گھر کی عورتوں کو اپنے گھر میں پناہ دے رکھی تھی اس لیے گاؤں والوں نے غصے میں اس کے گھر پر حملہ کر دیا۔"

"عورتوں کو پناہ دی تھی تو کوئی جرم تو نہیں کیا تھا۔ وہ عورتیں اس کی بھی عزت تھیں۔ اگر کسی کو شفقت راؤ سے شکایت تھی تو جا کر اسے پکڑتا، بے گناہوں کے پیچھے سب ہاتھ دھو کر کیوں پڑ گئے؟ اور سچ پوچھو تو مجھے یقین بھی نہیں ہے کہ شفقت راؤ پر لگا الزام سچا ہے۔ وہ خود وڈا چنگا آدمی ہے۔ دو برس پہلے میرا پتر بیمار پڑ گیا تھا تو اس نے اپنے خرچ پر شہر سے اس کا علاج کروایا تھا۔ وہ نیک آدمی وچارہ تو خود بڑا دکھی تھا۔ جوان پتر کی موت نے اس کا حال خراب کر دیا تھا۔ معلوم نہیں صدمے سے اس کا دماغ الٹ گیا تھا یا کچھ اور ہی چکر تھا؟ تھوڑی اڑتی پڑتی میرے کانوں میں ایسی گل پڑی تو ہے جس کو سن کر لگتا ہے کہ خانقاہ میں کچھ گڑبڑ ہے۔" نور بخش روانی میں بولنا شروع ہوا تو بولتا ہی چلا گیا۔ شاید غم و غصے کی شدت نے اس کو اتنی بری طرح متاثر کر رکھا تھا کہ وہ مشاہرم خان کے اجنبی ہونے کے باوجود بھی تسلسل سے اس کے سامنے دل کی بھڑاس نکالتا جا رہا تھا۔

"کیا چکر تھا خانقاہ میں؟" نور بخش سے ہونے والی گفتگو اتنے اہم موڑ پر آ گئی تھی کہ اسے اپنے آپ پر قابو رکھنا آسان نہیں رہا اور وہ یکدم ہی بے تابی سے پوچھ بیٹھا۔

"اوئے تم کون ہو اور مجھ سے یہ سب کچھ کیوں پوچھ رہے ہو؟" اس کی بد احتیاطی نے آخر گڑبڑ کر ہی دی اور بڑی آسانی سے سب کچھ بتاتا نور بخش چونک کر اس سے پوچھنے لگا۔

"مم... میں تمہارا ہمدرد ہوں۔" مشاہرم خان سٹپٹا گیا۔

"ہمدرد...؟ کدھر سے آئے ہو؟" بوڑھا پوری طرح بدکا ہوا تھا۔

"میری بات آرام سے سنو نور بخش بابا! میں حامد راؤ صاحب کے ہمدردوں میں سے ہوں اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ اصل میں یہاں کیا ہوا تھا۔ ہمیں خود بھی یہی شک ہے کہ خانقاہ میں کوئی غلط کام ہو رہا تھا جس کی وجہ سے شفقت راؤ نے وہاں آگ لگا دی ورنہ اس کے بارے میں ہمارے پاس بھی یہی رپورٹ ہے کہ وہ بڑا اچھا آدمی ہے۔" مشاہرم خان نے فوراً ہی خود کو سنبھال لیا اور نور بخش کے شانوں پر اپنے دونوں ہاتھوں کا دباؤ ڈال کر بہت طریقے سے رام کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

"تم پولیس والے تو نہیں ہو...؟" بوڑھے نے اسے گھورا پھر دونوں ہاتھ جوڑ کر بولا۔ "ہمیں ماپھی (معافی) دے دو صاحب! ہم بہت گریب (غریب) آدمی ہیں۔ پہلے ہی ہمارا بہت کچھ برباد ہو چکا ہے۔ اب پولیس کو گواہی اور بیان دینے کے چکر میں پڑیں گے تو بالکل ہی برباد ہو جائیں گے۔ جو پاگل لوگ ہمارے مالک جیسے بڑے آدمی کا یہ حال کر سکتے ہیں کہ اس کا مکان اور کھیت جلا دیں، وہ ہماری تو کا بوٹی کر دیں گے۔ مالک تو یہاں سے نکل کر کہیں نہ کہیں پھر بھی آرام سے رہ ہی لے گا، پر ہم اس پنڈ سے نکل کر کدھر جائیں گے؟ ہمیں تو مرنے کے لیے بھی یہاں کے سوا کہیں زمین نہیں ملے گی۔" وہ کافی خوف زدہ لگ رہا تھا۔

"تم اس بات کی فکر نہ کرو کہ تمہیں کہیں گواہی یا بیان کے لیے بلایا جائے گا۔ تم مجھے جو کچھ بتاؤ گے، وہ بس میرے اور تمہارے درمیان رہے گا۔ میں کسی کو بھی یہ نہیں بتاؤں گا کہ تم نے مجھے کچھ بتایا تھا۔" مشاہرم خان اسے یقین دہانی کروانے لگا لیکن اس کے لب خاموش ہی رہے اور وہ ایک جھٹکے سے اس کے ہاتھ اپنے شانوں سے ہٹا کر کھڑا ہونے کی کوشش کرنے لگا لیکن مشاہرم خان نے اسے اس کی کوشش میں کامیاب نہیں ہونے دیا اور مضبوطی سے اس کا بازو تھام لیا۔

"ہمیں ماپھی دے دو صاحب، ہور ادھر سے جانے دو۔" وہ گڑگڑایا۔

"نہیں۔" مشاہرم خان سختی سے بولا۔ "تمہیں مجھے سچ بتانا ہوگا۔ اگر تم نے مجھے سچ نہیں بتایا تو جو ظلم ابھی ہوا ہے وہ بار بار ہوگا۔ تم اتنے خود غرض نہ بنو کہ صرف اپنی گردن بچانے کے لیے ظالموں کے بارے میں زبان بند کر کے رکھ لو۔ پھر جب میں تمہیں اس بات کی ضمانت دے رہا ہوں کہ تمہارا نام سامنے نہیں آئے گا تو تمہیں ڈرنے کی کیا ضرورت ہے؟" نور بخش کے بازو پر اس کی گرفت اتنی سخت تھی کہ انگلیاں اس کی ہڈیوں میں گھسی جا رہی تھیں۔ نور بخش بے بس سا ہو کر دوبارہ وہاں بیٹھ گیا۔

"مجھے زیادہ کچھ معلوم نہیں ہے۔ بس میرے وڈے پتر نے اتا پتا کچھ تھوڑا سا بتایا تھا۔ اب کون جانے کے

بچے نے سچ بھی کہا تھا یا نہیں۔" وہ گویا اب بھی تذبذب کا شکار تھا۔

"تمہیں جو اور جتنا معلوم ہے مجھے بتا دو۔ باقی سچ جھوٹ معلوم کرنا میرا اپنا کام ہے۔" مشابرم خان نے اپنے لہجے کی سختی برقرار رکھی۔ نور بخش اسے پولیس کا آدمی سمجھ رہا تھا تو اس نے اس کے اندازے کی تردید کرنے کی کوشش نہیں کی تھی بلکہ کچھ پولیس والوں جیسا ہی انداز اختیار کر کے اس کے حلق سے سچ اگلوانے کی کوشش میں تھا۔

"میرے پتر ہور شفقت راؤ کے پتر صداقت میں تھوڑی دوستی تھی۔ شروع میں دونوں ادھر ہی اسکول میں پڑھتے تھے، بعد میں شفقت راؤ نے صداقت کو پڑھنے کے لیے شہر بھجوا دیا تو دونوں کا ملنا جلنا کم ہو گیا، پر صداقت وڈا اچھا بچہ تھا۔ جب بھی چھٹیوں میں پنڈ آتا تھا تو میرے پتر سے ضرور ملتا تھا۔ مجھ سے بھی دعا سلام ضرور کرتا تھا لیکن آخری بار وہ پنڈ آیا تو کسی سے ملا جلا ہی نہیں۔ فیر سنا کہ اس پر کسی آسیب کا سایہ ہو گیا ہے اور خانقاہ میں پیر سائیں اس کا علاج کر رہے ہیں۔ یہ بھی علوم ہوا کہ پیر سائیں کے علاج سے اسے فیدہ ہوا ہے، ہور اس کا آسیب چلا گیا ہے۔ انھی دنوں میرے پتر کو پنڈ سے ذرا پرے ادھر ملا جہاں سے آگے پہاڑ شروع ہو رہے ہیں۔ میرا پتر اصل میں صداقت کا پیچھا کرتا ہوا ہی ادھر گیا تھا۔ اس نے ادھر دیکھا کہ صداقت جیب سے کوئی پڑیا نکال کر اسے سگریٹ میں بھر کر پی رہا ہے۔ اسے وڈی حیرت ہوئی کہ صداقت جیسا پڑھنے لکھنے والا منڈا سگریٹ کب سے پینے لگا۔ وہ تو کبھی شوق میں بھی پان چھالیا کھانا پسند نہیں کرتا تھا۔ اس نے صداقت کو پکڑ لیا ہور سگریٹ کے بارے میں پوچھا۔ اس کے پوچھنے پر صداقت چڑنے لگا اور بولا کہ یہ جادو کی پڑیا مجھے پیر سائیں نے دی ہے اور یہ سگریٹ میں ڈال کر پینے سے ہی اپنا اصل اثر دکھاتی ہے اس لیے میں مجبوراً سگریٹ پی رہا ہوں۔ میرے پتر نے اس سے پڑیا کے بارے میں بہت سوال کیے لیکن اس نے کچھ نہیں بتایا بلکہ اپنی دوستی کا واسطہ دے کر کہا کہ یہ گل کسی کو نہیں بتانا اور یاد رکھنا کہ میرا آسیب اسی پڑیا سے قابو میں رہتا ہے۔ میرے پتر نے وعدہ کر لیا پر جب صداقت کے مرنے کی خبر ملی تو وہ چپ نہیں رہ سکا ہور میرے سامنے سارا قصہ بیان کر دیا۔ اس نے شک ظاہر کیا کہ صداقت نشہ کرنے لگا تھا، پر میں نے اس کی زبان سختی سے بند کر دی ہور سختی سے حکم دیا کہ کسی کو کچھ نہ بتائے کیونکہ مجھے علوم تھا کہ اگر اس نے کسی ایسی ویسی گل کے ساتھ پیر سائیں کا نام لیا تو پیر سائیں کے مرید اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ وہ سارے ہی وڈے جنونی ہیں۔ اتفاق داری پنڈ کے ایک لڑکے نے مذاق میں دوستوں میں پیر سائیں کو جعلی پیر کہہ دیا تھا تو بعد میں اس کے مریدوں نے لڑکے کی زبان گدی سے کھینچ لی تھی۔ میرے پتر کو بھی وہ واقعہ یاد تھا اس لیے میرے منع کرنے پر اس نے اپنی زبان بند کر لی۔ پر مجھے لگتا ہے کہ شفقت راؤ کو بھی کسی نہ کسی طرح اس معاملے کی خبر ہو گئی تھی اسی لیے اس نے خانقاہ کو آگ لگا دی۔ فیر اس کے بعد جو ہوا وہ تو آپ کو بھی علوم ہی ہے۔"

"ہوں۔" مشابرم خان نے ایک زوردار ہنکارا بھرا۔ وہ جس سرے کی تلاش میں یہاں تک آیا تھا وہ اسے مل گیا تھا اور آخر کار شہریار کے شک کے مطابق پیر سائیں کی شخصیت کے بارے میں ایک اہم انکشاف ہو ہی گیا تھا۔

"تم نے کہا تھا کہ حامد راؤ کے گھر کو آگ لگانے کے بعد اب اس کے بارے میں غلط سلط کہانیاں بنائی جا رہی ہیں۔ وہ کہانیاں کیا ہیں؟"

"پیر سائیں کے چاہنے والے اصل معاملے کو چھپانے کے چکر میں ہیں۔ انھوں نے شفقت راؤ کا ذکر ہی کہانی سے نکال دیا ہے اور کہانی یہ بنائی ہے کہ حامد راؤ نے اپنے گھر میں ڈاکوؤں کو چھپا رکھا تھا۔ پنڈ والوں کو علوم ہوا تو انھوں نے حامد راؤ کا گھر گھیر لیا ہور اس سے ڈاکوؤں کو باہر نکالنے کا مطالبہ کیا، پر حامد راؤ نے یہ گل ماننے کے بجائے نہتے لوگوں پر فائرنگ کروا دی۔ بندے مرے ہور زخمی ہوئے تو غصے میں لوگوں نے اس کے گھر اور کھیتوں کو آگ لگا دی۔ اب پولیس رپٹ میں حامد راؤ ہور اس کے گھر والے ڈاکوؤں کے ساتھی ہور قاتل بن گئے ہیں، پر میں جانتا ہوں کہ میرا مالک حامد راؤ ایسا بندہ ہی نہیں ہے کہ اس کے ڈاکوؤں سے تعلقات ہوں۔ یہ ساری چکر بازی پیر سائیں ہور اس کے مریدوں کی ہے۔" نور بخش نے بے لاگ تبصرہ کرتے کرتے اپنا سر اوپر اٹھایا تو اس کی آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں سی لہرا گئیں۔ اس کی کیفیت کو محسوس کر کے مشابرم خان نے تیزی سے پیچھے پلٹنے کی کوشش کی لیکن اس کوشش میں کامیاب ہونے سے قبل ہی اس کے سر پر قیامت ٹوٹ پڑی اور اس کا ذہن تیزی سے تاریکی کے اندھیروں میں ڈوبنے لگا۔ مکمل بے ہوشی طاری ہونے سے قبل اس کے کانوں نے جو آخری آواز سنی وہ گولی چلنے کے دھماکے کی تھی۔

یہ پرپیچ وسنسنی خیز داستان جاری ہے

تھی اس تصادم میں جبرو کی گولی کا شکار بنتی ہے۔ جبرو، اسلم کے چاقو کا شکار ہو کر اپنے انجام کو پہنچتا ہے۔ ادھر شہزاد آفتاب کی مدد کرنے کے چکر میں پولیس کے ہاتھوں دھری جاتی ہے اور اپنی آبرو کھو بیٹھتی ہے۔ وہ لوگ آفتاب کا فون نمبر پتا کر کے اس کی قیام گاہ کا پتا لگا لیتے ہیں اور چودھری سے پیسوں کے عوض اس کا پتا بتا دیتے ہیں۔ آفتاب کو شہریار کے ذریعے پتا چلتا ہے کہ اس کی بچی خیریت سے ہے۔ سفر کے دوران ماہ بانو اور اسلم کی ملاقات شفقت راؤ نامی شخص سے ہوتی ہے۔ وہ انھیں اپنے بہنوئی کا پتا سمجھا دیتا ہے اور ان کے لیے پناہ کا بندوبست کر دیتا ہے۔ ادھر چودھری افتخار حسن پہنچتا ہے اور ہیروئن کی تیاری کے لیے لیب کے قیام والے معاملات طے کر لیتا ہے۔ ماہ بانو اور اسلم، شفقت راؤ کے بتائے ہوئے گاؤں تک پہنچ جاتے ہیں۔ وہ ماہ بانو کو تھوڑا دور ایک مقام پر چھوڑ کر اس کے بہنوئی کے پاس پہنچتا ہے اور اسے شفقت کا حوالہ دے کر اس سے مدد کی درخواست کرتا ہے۔ وہ لوگ ماہ بانو کو لینے کے لیے اس مقام پر پہنچتے ہیں تو ماہ بانو کا نام و نشان نہیں ہوتا۔ تاہم ماہ بانو ایک چٹان کے پیچھے اسے سوتے ہوئے مل جاتی ہے۔ وہ لوگ حامد راؤ کے گھر آ جاتے ہیں۔ ادھر شہریار شہزادی نامی عورت سے مردہ بچے کی ہڈیاں وصول کرنے والے شخص سے تفتیش کرتا ہے اور کافی کچھ اگلوانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ مراد شاہ کو ماں کے انتقال کی خبر ملتی ہے تو وہ چودھری سے اس بارے میں استفسار کرتا ہے مگر چودھری بڑی چالاکی سے اسے سمجھانے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور اپنے آپ کو دکھی ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اسلم اور ماہ بانو ایک ہی کمرے میں رات گزارتے ہیں۔ صبح ان کی روانگی کا پروگرام ہوتا ہے تاہم اسلم کو ماہ بانو کی موجودگی میں کچھ بے چینی سی محسوس ہوتی ہے تو وہ رات کو اٹھ کر چھت پر چلا جاتا ہے۔ وہ ڈاڑھی والے سے ہاتھ ملانے کھڑا ہوتا ہے کہ اچانک اسے کچھ انسانی سائے نظر آتے ہیں جو حامد راؤ کے مکان کو گھیرے میں لینے کی کوشش کر رہے ہوتے ہیں۔ گھیرا ڈالنے والے لوگ حامد راؤ سے کہتے ہیں کہ شفقت راؤ کی بیوی اور بیٹی کو ان کے حوالے کر دیا جائے۔ یہ بات سن کر حامد راؤ گولی چلا دیتا ہے اور پھر وہاں دوبدو مقابلہ شروع ہو جاتا ہے۔ تاہم وہ سب دشمنوں کا گھیرا توڑ کر فرار ہو جاتے ہیں اور حامد راؤ کے شہر میں واقع فلیٹ میں آ جاتے ہیں۔ حامد راؤ، اسلم کے بارے میں جان جاتا ہے تاہم وہ اس کی کہانی سن کر اسے اچھی زندگی گزارنے کے لیے نوکری کی پیشکش کرتا ہے۔ ادھر مشاہرم خان شہریار کو خانقاہ کی رپورٹ دیتا ہے اور اس گاؤں میں ہونے والے مقابلے کی خبر دینے کے ساتھ وہاں اسلم اور ماہ بانو کی موجودگی اور پھر فرار کا بتاتا ہے۔ شہریار کی خبر سن کر چونک جاتا ہے۔ بہرحال وہ مشاہرم خان کو وہاں نائی والا جا کر تحقیقات کرنے کا حکم دیتا ہے۔ مشاہرم خان وہاں پہنچ کر ایک بوڑھے شخص سے معلومات حاصل کرتا ہے۔ بات چیت کے دوران اچانک اس کے سر پر قیامت ٹوٹ پڑتی ہے۔ اس کا ذہن تاریکی میں ڈوبنے لگتا ہے۔ بے ہوشی طاری ہونے سے قبل اس کے کان جو آواز سنتے ہیں، وہ گولی چلنے کے دھماکے کی ہوتی ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمایئے

"ایک بار اور سوچ لو ماہ بانو! میرے خیال میں تو تمہارا اکیلے وہاں جانا ٹھیک نہیں ہے نہ ہی میں اپنی بچت کے لیے تمہیں خطرے میں ڈالتے ہوئے خود کو مطمئن محسوس کر رہا ہوں۔ اگر تم اپنی ضد چھوڑ دو تو ہم دونوں ایک ساتھ ہی چلتے ہیں۔ وہاں جو بھی اور جیسے بھی حالات پیش آئیں گے، ہم مل کر ان کا سامنا کر لیں گے۔ کم از کم ایک دوسرے کے حالات کی طرف سے بے خبری تو نہیں ہوگی۔ ابھی تم اکیلی وہاں جاؤ گی تو میں یہاں بیٹھا پریشان ہی ہوتا رہوں گا کہ نہ جانے تمہارے ساتھ وہاں کیا پیش آ رہا ہوگا۔"

سر سے پیر تک چادر اوڑھے ماہ بانو باہر نکلنے کے لیے بالکل تیار تھی جب کمرے میں بے چینی سے اِدھر اُدھر ٹہلتا ہوا اسلم اس کے مقابل آ کھڑا ہوا اور لجاجت سے بولا۔ وہ دونوں حامد راؤ اور اس کے اہلِ خانہ سے رخصت ہو کر آج ہی جیکب آباد پہنچے تھے اور ایک چھوٹے سے ہوٹل میں کمرا کرائے پر لے لیا تھا۔ یہاں سے انھیں دوپہر کے کھانے کے بعد اسلم کے گاؤں روانہ ہونا تھا لیکن کھانے سے قبل ہی ماہ بانو نے تجویز پیش کی کہ وہ اکیلی اسلم کے گاؤں جا کر اس کی ماں کو منانے کا فریضہ انجام دینا چاہتی ہے۔ اس کا استدلال تھا کہ گاؤں میں اسلم کے لیے خطرات تھے اس لیے اس کا وہاں نہ جانا ہی مناسب تھا۔

اسلم نے اس کی یہ تجویز فوری طور پر مسترد کر دی لیکن ماہ بانو نے اسے اپنی قسم دے کر مجبور کر دیا۔ اب صورتِ حال یہ تھی کہ ماہ بانو روانگی کے لیے تیار تھی اور اسلم کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کیا کرے۔ ایک طرف وہ اس کی دی ہوئی قسم نہیں توڑ سکتا تھا تو دوسری طرف اسے اکیلے بھیجنے پر بھی دل کو راضی نہیں کر پا رہا تھا۔ اپنی اس جذباتی کشمکش میں اس سے کھانا بھی ٹھیک طرح سے نہیں کھایا گیا۔ ماہ بانو اس کے اضطراب کو اچھی طرح محسوس کر رہی تھی لیکن بظاہر انجان بنی ہوئی تھی۔ اب اسلم نے بالکل نکلتے وقت گفتگو چھیڑ دی تو ماہ بانو کو بھی اپنی خاموشی کو توڑنا پڑا۔

"دیکھو اسلم! ضد میں نہیں تم کر رہے ہو۔ تمہیں یہ بات سمجھنی چاہیے کہ میری اکیلی ذات کے لیے تمہارے گاؤں میں کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔ میں خود کو دور دراز کی کوئی رشتے دار ظاہر کرتی ہوئی تمہاری ماں تک پہنچ جاؤں گی اور انھیں منانے کی کوشش کروں گی۔ مجھے یقین ہے کہ میرے منانے پر خالہ جی اپنی ناراضی بھول جائیں گی۔ اس کے بعد یہ میری ذمے داری ہے کہ میں انھیں کیسے گاؤں سے لے کر یہاں تک آتی ہوں۔ تم یقین رکھو کہ یہ سب کرنے میں مجھے کوئی خاص دشواری پیش نہیں آئے گی۔ اگر تم ساتھ چلے تو ہم وہاں قدم رکھتے ہی مشکلات میں گھر جائیں گے۔ تمہارے دشمن پہلے

مرحلے پر ہی تمہیں گھیرنے اور مارنے کی کوشش کریں گے اور میں تمہارے ساتھ ہونے کی وجہ سے خود بہ خود ہی ان کی زد میں آ جاؤں گی۔ اس لیے میرا خیال ہے کہ اپنے اور میرے تحفظ کے لیے تمہیں میرے ساتھ چلنے سے گریز کرنا چاہیے۔"

"کیا مطلب ہے تمہاری اس بات کا؟ کیا تمہارے خیال میں، میں تمہاری حفاظت کرنے کا اہل نہیں ہوں؟ کوئی آنکھ اٹھا کر دیکھے تو تمہاری طرف۔ اگر کسی نے تمہیں رتی برابر نقصان پہنچانے کی کوشش کی تو میں اس کی لاش گرا دوں گا۔" اسلم گویا بپھر سا گیا۔

"میں جانتی ہوں کہ تم ایسا کر سکتے ہو۔ تمہارے لیے کسی کی لاش گرانا کوئی مشکل کام نہیں ہے لیکن یہ سوچا ہے کہ ایسی کسی حرکت کا انجام کیا ہوگا؟ تم پہلے ہی پولیس کو مطلوب ہو، کوئی اور الٹا سیدھا واقعہ پیش آ گیا تو وہ لوگ ایک بار پھر تمہاری بُو پر لگ جائیں گے۔ اس کے بعد تمہارا ٹھکانا کہاں ہوگا؟ یا تو تم لوہے کی سلاخوں کے پیچھے کر دیے جاؤ گے یا پھر بھاگ کر ایک بار پھر ڈاکو لٹیروں کے کسی گروہ میں شامل ہو جاؤ گے۔ اور میں...... میں ایک بار پھر بے آسرا ہو جاؤں گی۔" کاٹ دار لہجے میں تیز تیز یہ سب کہتے ہوئے ماہ بانو کا سانس پھول گیا تھا اور آنکھوں میں در آنے والی نمی سی نمی سے ظاہر تھا کہ وہ بیک وقت غم و غصے کا شکار ہو گئی ہے۔ اسلم نے اس کی یہ کیفیت دیکھی تو فوراً ہی پسپائی اختیار کر لی۔

"آئی ایم ویری سوری ماہ بانو! میں نے یہ سب نہیں سوچا تھا۔ میں تم سے جو بھی مطالبہ کر رہا تھا اپنے وسوسوں کی وجہ سے کر رہا تھا۔ میں تمہیں اکیلے گاؤں بھیجتے ہوئے ڈر رہا تھا لیکن تم واقعی درست کہہ رہی ہو۔ میرے ساتھ جانے سے واقعی خطرہ بہت زیادہ بڑھ جائے گا۔ لہٰذا بہتری اسی میں ہے کہ تم اپنے منصوبے پر عمل کرو۔" مجبوراً ہی سہی، اسلم کو اسے اجازت دینی پڑی کہ مصلحت کا تقاضا یہی تھا۔

"ٹھیک ہے تو پھر میں چلتی ہوں۔ تم یہاں سکون سے بیٹھ کر میرے کامیاب لوٹنے کی دعا کرنا۔" اسلم کے پسپائی اختیار کرتے ہی اس نے اپنا لہجہ نرم کر لیا اور ویسی ہی مسکراہٹ کے ساتھ دروازے کی طرف بڑھی۔

"ماہ بانو......!" ابھی وہ دروازے تک نہیں پہنچی تھی کہ اسلم کی پکار نے اسے مڑ کر دیکھنے پر مجبور کر دیا۔ اس کے رکتے ہی اسلم نے قدم بڑھا کر درمیانی فاصلہ طے کیا اور ایک ہی اسے اپنی بانہوں کے حصار میں لے کر سینے کے ساتھ بھینچ لیا۔ اس کی اس بے ساختہ حرکت پر ماہ بانو پوری جان سے لرز اٹھی۔ اسے اسلم کے قریب رہتے کافی عرصہ گزر چکا تھا لیکن ایسی جسارت اس نے پہلے کبھی نہیں کی تھی۔ وہ اتنی سختی سے اسے اپنے ساتھ بھینچ کر کھڑا تھا کہ وہ حرکت بھی کرنے سے قاصر تھی۔ لیکن اس کا کنوارا جسم ایک مرد کی اتنی قربت کی وجہ سے بید مجنوں کی طرح لرز رہا تھا اور کمال یہ تھا کہ وہ اسلم کو خود سے دور دھکیلنے کی بھی ہمت نہیں کر پا رہی تھی۔ ایسا شاید اس لیے تھا کہ وہ اس کے جذبات کی نوعیت کو صحیح طور پر سمجھ رہی تھی۔ وہ ایک محبت کرنے والے کا وہ بے ساختہ اظہار تھا جو اسے کسی مشکل میں پڑتے دیکھ کر ساری دنیا سے چھپا لینے کا خواہش مند تھا لیکن مجبوری یہ تھی کہ وہ اسے روک بھی نہیں سکتا تھا۔

اسلم کی قربت میں لرزتی کانپتی ماہ بانو اس وقت اسے یہ رعایت دینے پر مجبور پا رہی تھی اور شاید یہ اس کی خاموشی کا ہی نتیجہ تھا کہ اسلم نے ایک جسارت اور کر ڈالی۔ اس کے دہکتے ہونٹوں کا پُرجوش سا بوسہ ماہ بانو کے گلابی نرم رخسار پر ثبت ہوا تو اسے ایسا لگا کہ اس کا رخسار جل اٹھا ہو۔ وہ اسلم کے سینے پر دونوں ہاتھوں کا دباؤ ڈال کر اسے دھکیلتی ہوئی پیچھے ہٹی تو وہ بھی گویا ہوش میں آ گیا اور اپنی بے خودی پر شرمندگی سی محسوس کرنے لگا۔ لیکن ماہ بانو اس کا شرمندہ چہرہ دیکھنے کے لیے وہاں رکی نہیں بلکہ تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی باہر نکل گئی۔ اسلم اسے گاڑی میں بٹھانے اس کے ساتھ جانا چاہ رہا تھا لیکن جو گستاخی کر چکا تھا، اس کے بعد اسے جرأت نہ ہو سکی کہ ماہ بانو کا سامنا کر سکے۔ وہ جہاں کا تہاں کھڑا رہ گیا جبکہ ماہ بانو بغیر رکے تیزی سے آگے بڑھتی چلی گئی۔

ٹکٹ اسلم اسے پہلے ہی لا کر دے چکا تھا۔ وہ بس اڈے پر پہنچی تو اپنی مطلوبہ بس کے بارے میں معلوم کر کے اس میں سوار ہو گئی۔ بس کی نشستیں ابھی پوری طرح پُر نہیں ہوئی تھیں۔ اسے کھڑکی کے ساتھ جو سیٹ ملی، اس کے برابر میں فی الحال کوئی دوسرا مسافر موجود نہیں تھا۔ وہ تقریباً گرنے والے انداز میں نشست پر ڈھیر ہو گئی اور آنکھیں بند کر کے دایاں ہاتھ اپنے سینے پر رکھ لیا۔ دل ابھی بھی اس شدت سے دھڑک رہا تھا جیسے وہ ابھی تک اسلم کی بانہوں میں جکڑی ہوئی ہو۔ اس نے وہاں بیٹھے بیٹھے اپنا دیانت دارانہ تجزیہ کیا۔ شرم و حیا کے تقاضے اپنی جگہ تھے لیکن یہ سچ تھا کہ اسے اسلم کی جسارت بہت زیادہ ناگوار نہیں گزری تھی۔ البتہ دل میں ایک خلش سی ضرور تھی اور اس خلش کو تو شاید زندگی بھر اس کے ساتھ ہی رہنا تھا۔ شہریار سے مایوس ہو کر اسلم کی محبت کی شدت کے سامنے سر جھکا دینے کے باوجود وہ اس حقیقت کو تو کبھی بھی نہیں جھٹلا سکتی تھی کہ اس کا دل شہریار کا اسیر ہے۔ دل میں گھر کرنے والی وہ پہلی پہلی محبت اتنی معمولی نہیں تھی کہ کسی

دوسری محبت کے مل جانے پر اس کے رنگ ماند پڑ جاتے۔ شہریار اب بھی پوری آب و تاب سے اس کے دل میں موجود تھا۔ ہاں البتہ اتنا ضرور ہوا تھا کہ وہ اسلم کے خلوص کے سامنے ہتھیار ڈال کر اسے بھی اپنی زندگی میں جگہ دینے پر راضی ہو گئی تھی۔ شاید اس رضامندی کے پیچھے کچھ ہاتھ اس کی مجبوریوں کا بھی تھا۔ وہ اپنے اس رشتے کو کھو چکی تھی جس سے اسے تحفظ ملنے کی امید ہوتی۔ ایک طرف اسے دل سے لگا کر پالنے پوسنے والے بے اولاد ماں باپ دنیا سے چلے گئے تو دوسری طرف اسے دنیا میں لانے کے ذمے دار اس کے ماں باپ خود تباہ حال تھے۔ ماں اکلوتے بیٹے کی موت کے غم میں پاگل ہو گئی تھی تو باپ بھی بس زندگی کو گھسیٹنے پر مجبور تھا۔ وہ دو کمزور اور بوڑھے وجود جو اپنی زندگی کے دن پورے کرنے کے لیے دوسروں کی مدد کے محتاج تھے، بھلا اس کا سائبان کیسے بنتے؟ اور وہ لاکھ بہادر اور باہمت سہی، تھی تو بہرحال ایک لڑکی ہی جو کسی محفوظ چھت کے نیچے سکون سے زندگی گزارنے کی خواہش مند ہوتی ہے۔

اسلم کے سلسلے میں خود کو راضی کرنے کے لیے اس کے پاس ایک مضبوط دلیل یہ بھی تھی کہ اپنی قربانی کے ذریعے وہ اسلم جیسے انسان کو برائی کی دلدل سے نکال کر ایک بڑا کارنامہ انجام دے سکتی ہے۔ اسے یقین تھا کہ اگر ایک انسان کی زندگی کو بچانا بہت بڑی نیکی تھی تو انسان کی انسانیت کو بچا لینا اس سے بھی بڑا کارِ ثواب تھا۔ اسلم کی محبت کو قبول کر کے اگر اس نے اپنے لیے ایک پناہ گاہ کا بندوبست کیا تھا تو اسے بھی اس کے اصل کی طرف لا کر نئی زندگی دے دی تھی۔ لین دین کے اس سودے میں اگرچہ دونوں ہی کو مکمل آسودگی ملنے کا امکان نہیں تھا...... ایک فریق جانتا تھا کہ وہ جسے قبول کر رہا ہے، اس سے محبت نہیں کرتا اور دوسرا واقف تھا کہ جو اسے قبول کر رہا ہے، اسے اپنی تمام تر محبت دینے کے باوجود پوری طرح پانے سے قاصر رہے گا۔ دونوں کے درمیان یہ حقائق اپنی جگہ تھے لیکن یہ اطمینان بھی تھا کہ انہوں نے ایک دوسرے سے جھوٹ نہیں بولا ہے۔ ماہ بانو، شہریار کا نام لیے بغیر اسلم کو بتا چکی تھی کہ وہ کسی اور کی محبت کی اسیر ہے اور اسلم نے بڑی عالی ظرفی سے اس بات کو نظرانداز کر دیا تھا۔

"اوی ذرا ادھر ہو کر میرے کو جگہ تو دینا۔" وہ اپنے خیالات میں نہ جانے کتنی دیر تک غلطاں و پیچاں رہتی کہ ایک ناشناسا آواز نے اسے آنکھیں کھولنے پر مجبور کر دیا۔ وہ پچیس چھبیس سال کی قدرے فربہ سانولی سی عورت تھی جس نے سندھی کڑھائی والا ڈھیلا ڈھالا شلوار قمیص پہن رکھا تھا اور سر پر بھی اسی طرح کی کڑھی ہوئی بڑی سی چادر موجود تھی۔ گود میں تقریباً پانچ چھ ماہ کا ایک کمزور سا بچہ بھی تھا۔ نشست پر کھسک کر اس کے لیے جگہ بناتے ہوئے ماہ بانو نے اپنا جائزہ مکمل کر ڈالا۔ عورت فوراً ہی خالی جگہ پر بیٹھ گئی اور بچے کو گھٹنوں پر بٹھانے کے بعد اپنے دوسرے ہاتھ میں موجود چھوٹی سی پوٹلی اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔

"اوی! یہ تم پکڑ لو تو وڈی مہربانی ہو گی۔ اس میں روٹی ہے ورنہ میں نیچے پیروں کے پاس رکھ لیتی۔" اس کی استدعا پر ماہ بانو نے خاموشی سے پوٹلی لے کر اپنی گود میں رکھ لی۔ خود اس کے اپنے پاس تو ایک شولڈر بیگ کے سوا کوئی سامان تھا بھی نہیں جو اسے پوٹلی تھامنے میں مشکل پیش آتی۔ قدرے میلے سے کپڑے کی اس پوٹلی میں سے آم کے اچار کی خوشبو آ رہی تھی۔ پوٹلی گود میں رکھ کر وہ کھڑکی کی طرف متوجہ ہو گئی۔ باہر اجنبی چہرے والے لوگ بکھرے ہوئے تھے۔ بہت دور سامنے ایک چہرہ ایسا نظر آیا جس پر اسلم کا گمان گزرا لیکن گمان یقین میں بدلتا، اس سے قبل ہی بس حرکت میں آ گئی اور تیزی سے آگے بڑھتی چلی گئی۔ اس نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے رخ پھیر لیا۔ برابر میں بیٹھی عورت اپنے بچے میں مگن تھی اور پوری بس کے منظر میں اس کے لیے کہیں ایسی کوئی کشش نہیں تھی کہ وہ خود کو اس ماحول میں شامل کر سکے۔ چنانچہ پشت گاہ سے سر ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔ نیند نہ بھی آتی تو وہ آنکھیں موند کر کچھ دیر سکون سے بیٹھ تو سکتی تھی۔

☆☆☆

بے ہوشی کا دورانیہ نہ جانے کتنا طویل تھا۔ اسے ہوش آیا تو اس نے خود کو ایک چار دیواری میں قید پایا۔ اونچی دیواروں والے اس کمرے میں آمد و رفت کے لیے صرف ایک دروازہ موجود تھا جو یقینی طور پر باہر سے بند تھا۔ دروازے کے علاوہ کمرے میں کسی کھڑکی کا نام و نشان موجود نہیں تھا، البتہ عقبی دیوار پر کافی بلندی پر ایک ہوادان ضرور نظر آ رہا تھا۔ لکڑی کے فریم والے اس ہوادان میں اتنی گنجائش موجود تھی کہ ایک آدمی آرام سے گزر سکتا تھا لیکن وہ جتنی بلندی پر تھا، وہاں تک کسی سیڑھی وغیرہ کی مدد کے بغیر رسائی ممکن نہیں تھی اور اس خالی کمرے میں ایسی کسی شے کا ہونا تو ایک طرف، استعمال کی معمولی سے معمولی شے بھی موجود نہیں تھی۔ یہاں تک کہ اسے بھی کسی جانور کی طرح کمرے کے ننگے فرش پر لا کر ڈال دیا گیا تھا۔ بے ہوشی کے دورانیے میں ٹھنڈے فرش پر پڑے رہنے کی وجہ سے اس کا جسم اکڑ سا گیا تھا لیکن ظاہر ہے اسے اس طرح یہاں لانے والے اس کے بہی خواہ تو

نہیں کہ ان سے کوئی اچھی امید کی جا سکتی۔ انہوں نے تو انتہائی بے دردی سے یہاں قید کیا تھا کہ پانی کا کوئی برتن تک کمرے میں رکھنا گوارا نہیں کیا تھا۔

وہ کچھ دیر تک فرش پر ہی بیٹھا اردگرد کا جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ حالات کا بھی تجزیہ کرتا رہا۔ غالب امکان یہی تھا کہ اس وقت وہ پیر سائیں کے مریدوں کی قید میں تھا جنہوں نے اسے حامد راؤ کے مزارع کے ساتھ ٹہلتے دیکھ کر بے ہوش کر کے اغوا کر لیا تھا۔ ہو سکتا تھا کہ انہوں نے اسے اور مزارع کے درمیان ہونے والی گفت و شنید کا کچھ حصہ بھی سن لیا ہو اور اسے اپنی سلامتی کے لیے خطرہ سمجھ کر یہاں اٹھا لائے ہوں۔ اس پر بہرحال عقب سے وار کیا گیا تھا اس لیے وہ کوئی بات یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا۔

خود پر گزرے حالات کا سوچتے سوچتے اسے یکدم ہی مزارع کی وہ آواز یاد آئی جو اس نے بے ہوش ہونے سے پہلے سنی تھی۔ وہ بے ساختہ ہی مضطرب سا ہو کر اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا اور دروازے کی طرف قدم بڑھائے۔ حسب توقع دروازہ باہر سے بند تھا۔ عالم اضطراب میں اس نے دروازہ پیٹ ڈالا۔ اس کے لیے یہ احساس ہی سوہان روح تھا کہ اس کی وجہ سے وہ غریب مزارع کسی نقصان سے دوچار ہو گیا ہو۔

"کیا گل ہے؟ کیوں دروازہ توڑنے پر تلے ہوئے ہو؟" اس کی مسلسل دستک کے جواب میں باہر سے کسی نے درشت لہجے میں پوچھا۔

"دروازہ کھولو۔ مجھے تم لوگوں سے بات کرنی ہے۔" اس نے جھنجلا کر جواب دیا۔

"صبر کرو، ابھی وڈا صاحب آئے گا تو خود تم سے گل کرے گا۔" باہر سے اسی لہجے میں جواب دیا گیا۔

"تمہارا وڈا صاحب معلوم نہیں کب آئے گا۔ مجھے حاجت محسوس ہو رہی ہے، تم دروازہ کھولو۔" اسے گمان ہوا کہ وہ جس جگہ موجود ہے، وہاں اس نگران کے سوا کوئی اور شخص موجود نہیں ہے اس لیے باہر نکلنے کے لیے بہانہ گھڑا۔ اسے امید تھی کہ اگر وہ باہر نکلنے میں کامیاب ہو گیا تو اکیلے آدمی کو آسانی سے قابو میں کر لے گا۔

"دروازہ کھولنے کی اجازت نہیں ہے۔ اگر تم سے برداشت نہیں ہو رہا تو کمرے کے کسی کونے میں فراغت حاصل کر لو۔ بعد میں ہم تم ہی سے صفائی کروا لیں گے۔" باہر سے بڑی بے حیائی کے ساتھ مشورہ دیا گیا جسے سن کر اس کا پہاڑی خون جوش مارنے لگا اور غصے کے عالم میں اس نے اپنے مضبوط کندھوں سے دروازے پر ضربات لگانا شروع کر دیں۔

"آرام سے بیٹھو ورنہ تمہارا بُرا انجام ہو گا۔" باہر موجود شخص غرایا لیکن اس نے اس کے حکم کی تعمیل ضروری نہیں سمجھی۔ ویسے ہی چند ضربات کے بعد اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ دروازہ بہت زیادہ مضبوط نہیں ہے اور تھوڑی سی محنت سے اسے توڑا جا سکتا ہے۔ پھر اسے باہر موجود نگران کے اکیلے ہونے کا بھی گمان تھا چنانچہ پیچھے ہٹ کر دوڑتا ہوا آیا اور پوری قوت سے دروازے کو ایک اور ٹکر ماری۔ اس کے حساب سے یہ ٹکر فیصلہ کن تھی لیکن جب رد عمل میں اس کا جسم پوری قوت سے اڑتا ہوا واپس کمرے کے فرش پر گرا تو ہر اندازہ دھرا کا دھرا رہ گیا۔ گرنے کے بعد وہ ابھی سنبھل کر اٹھ بھی نہیں پایا تھا کہ کئی مسلح افراد دندناتے ہوئے اندر گھس آئے اور اسے بُری طرح زدوکوب کرنے لگے۔ مارنے کے لیے وہ ہاتھوں پیروں کے ساتھ ساتھ اپنے ہتھیار کے بٹوں اور دستوں کا بھی استعمال کر رہے تھے اور جسم کے ہر حصے پر بلاتخصیص ضربات لگا رہے تھے۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ جب اس نے دروازے پر فیصلہ کن ضرب لگانے کے خیال سے جست لگائی تھی عین اسی وقت ان لوگوں نے بھی کمرے میں داخل ہونے کے لیے دروازہ کھولا تھا، چنانچہ رد عمل میں وہ دروازے کی ٹکر کھا کر پیچھے کی طرف الٹ گیا اور اب وہ لوگ اسے سنبھلنے کا ذرا بھی موقع نہیں دے رہے تھے۔

آخرکار جب وہ بالکل ادھ موا ہو کر فرش پر گر پڑا تو ان کے مشین کی طرح مسلسل چلتے ہاتھ بھی خودکار انداز میں رک گئے۔ وہ اسے اتنا مار چکے تھے کہ وہ فوری طور پر خود کو سیدھا کرنے کی سکت بھی اپنے اندر نہیں پا رہا تھا چنانچہ الٹا پڑا ہی ہانپتا رہا۔

"امید ہے کہ تمہارے سارے کل پرزے اپنی جگہ ٹھیک بیٹھ گئے ہوں گے اور اب تم کوئی الٹی سیدھی حرکت کیے بغیر آرام سے میرے سوالوں کے جواب دیتے جاؤ گے۔" وہ اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا کہ قدموں کی چاپ کے ساتھ ہی ایک کرخت آواز سنائی دی۔ اس نے اپنی گردن گھما کر بولنے والے کی طرف دیکھا۔ وہ پستہ قامت کا سانولی رنگت والا پکی عمر کا آدمی تھا جس نے اپنے موٹے ہونٹوں پر بڑی بڑی مونچھیں رکھ چھوڑی تھیں۔ بوسکی کی قمیص پر چوخانے والے تہبند میں ملبوس اس آدمی کو دیکھ کر دل میں کوئی اچھا تاثر نہیں ابھر رہا تھا۔ مشا برم خان اسے کوئی جواب دیے بغیر یک ٹک گھورتا رہا۔ اس کی یہ جسارت آنے والے کو اچھی نہیں لگی اور وہ اکڑ کر چلتا ہوا اس کے اتنے قریب آ کھڑا ہوا کہ اس کے

نوک دار کھسوں کی نوک مشابرم خان کی ناک کو چھونے لگی۔ اس سے قبل کہ مشابرم خان کچھ سمجھ پاتا، اس نے پوری قوت سے اس کی ناک پر ٹھوکر دے ماری۔ تکلیف کی شدت سے اس کی چیخ نکل گئی مگر پھر اس نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے پستہ قامت نووارد کی طرف دیکھا۔

”کون ہو تم اور مجھ سے کیا چاہتے ہو؟“ اپنی ناک سے نکلنے والے خون کو نظر انداز کرتے ہوئے اس نے نووارد سے پوچھا۔

”سوال تم نہیں، میں کروں گا۔ چلو شاباش اب سیدھی طرح بتاتے چلے جاؤ کہ تم کون ہو اور کس کے لیے کام کر رہے ہو؟ تمہارے یہاں آنے کا کیا مقصد ہے؟“ اس نے پے در پے کئی سوالات کر ڈالے۔

”میرا نام مشابرم خان ہے۔ میں یہاں کسی بُری نیت سے نہیں آیا تھا۔ میرا ایک مسئلہ تھا جس کے حل کے لیے میں پیر سائیں کی شہرت سن کر یہاں آیا تھا۔ میرا یہاں کا دوسرا چکر ہے۔ پہلے خانقاہ میں آگ لگنے اور دوسرے مسائل میں گھرے ہونے کی وجہ سے میری پیر سائیں سے ملاقات نہیں ہو سکی تھی اس لیے میں دوبارہ یہاں آیا ہوں۔ تم چاہو تو تمہارے گاؤں کا ہی ایک بندہ میری بات کی تصدیق کر سکتا ہے۔“ وہ اپنی خالی جیبیں دیکھ چکا تھا اس لیے جانتا تھا کہ وہ لوگ اس کے بنیادی کوائف سے تو اچھی طرح واقف تھے چنانچہ نام وغیرہ کے سلسلے میں کسی غلط بیانی سے کام نہیں لیا۔

”پیر سائیں سے مسئلہ حل کروانے آئے تھے تو ادھر جلے ہوئے کھیت میں بیٹھ کر نور بخش سے انٹرویو کیوں کر رہے تھے؟“ پستہ قامت نے کڑے لہجے میں اس سے پوچھا۔

”میں دوسری بار ہی یہاں آیا ہوں اس لیے راستہ ٹھیک سے یاد نہیں تھا اور میں بھٹک کر کھیتوں کی طرف نکل گیا۔ وہاں ایک جلے ہوئے کھیت میں نور بخش اداس بیٹھا نظر آیا تو ہمدردی میں اس سے دو چار باتیں کرنے بیٹھ گیا۔“ اس نے بڑی سادہ سی وضاحت پیش کی۔

”لگتا ہے تو سیدھی طرح سے زبان نہیں کھولے گا۔ مجھے تجھے بتانا ہی پڑے گا کہ تو جب ہمارے پنڈ میں داخل ہوا تھا تب سے ہی ہمارے آدمیوں کی نظر میں ہے۔ تو پیر سائیں سے ہی ملنا چاہتا تھا تو جب خانقاہ کی طرف گیا تھا، تب ہی وہاں سے کوئی بندہ پکڑ سکتا تھا کہ وہ تجھے پیر سائیں تک پہنچا دے لیکن تو تو وہاں سے کنی کترا کر نکل گیا اور سیدھا حامد راؤ کے گھر کا رخ کیا۔ وہاں سے تو کھیتوں میں پہنچ کر نور بخش سے پوچھ تاچھ کرنے بیٹھ گیا اور معصوم ایسا بن رہا ہے جیسے سچ مچ وڈا سیدھا سادہ بندہ ہو۔“

”تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ تم نے جن جن جگہوں کا ذکر کیا، میں وہاں گیا تھا لیکن اس میں اتفاقات کا بھی بہت ہاتھ ہے۔ خانقاہ تو میں صرف اس تجسس کی وجہ سے گیا تھا کہ دیکھوں کہ وہاں تعمیر کا کام کہاں تک پہنچا۔ میرا خیال تھا کہ میں وہاں سے سیدھا شریف صاحب کے گھر تک پہنچ جاؤں گا اس لیے کسی سے مدد لینے کی کوشش نہیں کی لیکن بدقسمتی سے میں راستہ بھٹک گیا اور راستے میں جلا ہوا مکان دیکھ کر جھٹکا تو تھوڑی دیر وہاں رک گیا۔ کھیتوں کی طرف بھی میں اتفاقاً ہی جا نکلا تھا ورنہ نہ تو میں حامد راؤ کو جانتا ہوں اور نہ ہی مجھے اس سے کوئی دلچسپی یا ہمدردی ہے۔“

پستہ قامت کی جارحانہ تقریر کے مقابلے میں اس نے مدافعانہ لہجہ اختیار کیا اور وضاحتیں پیش کرنے لگا۔

”تو تو وڈی ڈھیٹ شے ہے بھئی...... رنگے ہاتھوں پکڑا گیا ہے پھر بھی جھٹلانے کی کوشش کر رہا ہے۔ میرے خیال میں تیری چمڑی کو ابھی مزید دھنائی کی ضرورت ہے۔ چل ایسا ہے تو ایسا ہی سہی۔ میں تیری یہ خواہش بھی پوری کروا دیتا ہوں، کہیں بعد میں تو شکوہ کرے۔“ پستہ قامت نے اپنے الفاظ سے ظاہر کر دیا کہ وہ اس کے ایک لفظ پر بھی یقین نہیں رکھتا ہے۔ اپنی بات کے اختتام پر وہ اپنے مسلح غلاموں کی طرف مڑ گیا اور استہزائیہ لہجے میں بولا۔

”چلو بھئی میرے شیرو، اس پر ٹوٹ پڑو اور اس وقت تک مارتے رہو جب تک یہ سچ بولنے پر راضی نہ ہو۔“ اس کی زبان سے الفاظ ادا ہوتے ہی مسلح افراد پُرجوش نظر آنے لگے اور ان میں سے ایک قدرے آگے بڑھ آیا اور ادب سے بولا۔

”اگر آپ کی اجازت ہو تو ہم اس پر ترکیب نمبر ایک یا دو میں سے کوئی ایک آزما کر دیکھیں؟ سالا دو منٹ میں سیدھا ہو جائے گا اور فر فر سب بتا دے گا۔“

”اتنی جلدی نہ کر..... ابھی اسے تھوڑا سوچنے دے۔ چنگا ہے کہ یہ دو چار ہڈیاں تڑوا کر ہی سب کچھ اگل دے۔ تیری ترکیبوں میں سے کوئی ایک بھی آزمائی گئی تو وچارا دنیا سے نہ بھی اٹھا تو جیتے جی مر جائے گا۔ تجھے معلوم ہے کہ میں اتنا بے رحم بندہ نہیں ہوں۔“ پستہ قامت کے لفظ لفظ سے مکاری ٹپک رہی تھی۔ وہ کن انکھیوں سے مشابرم خان کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے ساتھی سے مخاطب تھا۔

”کوشش کر کہ یہ آسانی سے سب کچھ اگل دے۔ ہاں، میں ایسا کرتا ہوں کہ اسے تیری ترکیب نمبر ایک اور دو کی

تفصیل بتا دیتا ہوں تاکہ یہ خود بھی سمجھ داری سے کام لے سکے۔“ اپنے ساتھی سے بات کرتے کرتے وہ مشابرم خان کی طرف پلٹ گیا۔

”دیکھ بھئی خاناں! یہ جو آدمی ہے نا وڈا سخت ہے اور اس کی ترکیبیں بھی نرالی ہیں۔ اگر اس نے ترکیب نمبر ایک آزمانے کا سوچا تو تیرے ہاتھوں کو رسّی سے باندھ کر چھت پر لگے کنڈے سے لٹکا دے گا اور نیچے آگ جلا دے گا۔ آگ تیرے بدن کو چھوئے بغیر تیرے ماس اور ہڈیوں کو ایسے گلائے گی جیسے پائے گلتے ہیں۔ تو اذیت سے چیخے گا، چلائے گا لیکن موت بھی وڈی مشکل سے آئے گی۔“ وہ گویا کسی غیر مرئی پردے پر سارا منظر دیکھتا ہوا اس سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

”اس کی ترکیب نمبر دو اور بھی انوکھی ہے۔ سالا مٹی کے مٹکے میں چھوٹے سے چوہے کو گھسا کر مٹکے کا منہ بندے کے پیٹ پر الٹ دیتا ہے اور زمین میں میخیں گاڑ کر چاروں ہاتھ پیر ایسے باندھ دیتا ہے کہ آدمی حرکت بھی نہیں کر سکتا۔ اب تو سوچ کہ بند مٹکے میں قید چوہے کو جب باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ملے گا تو وہ کدھر کا رخ کرے گا۔ مٹکے کی پکی دیواریں تو اس کے دانتوں سے ٹوٹنے سے رہیں۔ پھر لازمی ہے کہ وہ ادھر ہی زور آزمائی کرے جدھر آسانی لگے گی۔ اب یہ تو خود سوچ سکتا ہے کہ جب چوہا تیرے بدن میں سرنگ بنا کر دوسری طرف نکلنے کی کوشش کرے گا تو تیرا کیا حال ہوگا۔ اللہ میری توبہ... میں تو خود پر ایسے ظلم کا سوچ بھی نہیں سکتا۔“ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے کان پکڑ لیے اور پھر گال بھی پیٹنے لگا۔

صاف محسوس ہو رہا تھا کہ وہ مشابرم خان کو ہراساں کرنے کے لیے یہ اداکاری کر رہا تھا لیکن یہ نہیں جانتا تھا کہ پہاڑوں کے اس بیٹے کا عزم و حوصلہ بھی پہاڑوں جیسا تھا۔ بلتستان کے پہاڑوں میں قائم دہشت گردوں کے تربیتی کیمپ کو تہس نہس کر ڈالنے والے مشابرم خان کو کسی دھمکی سے متاثر کر دینا اتنا آسان نہیں تھا۔ البتہ اس کے سامنے تشدد کے جن حربوں کا تذکرہ کیا گیا تھا، انہیں سن کر اسے اپنے دشمنوں کی سفاکی اور بربریت کا خوب اندازہ ہو گیا تھا اور ساتھ ہی وہ یہ بھی سوچ رہا تھا کہ پیر سائیں کی شخصیت پر کیا جانے والا شک واقعی درست ہے، ورنہ کسی روحانی شخصیت کے پیروکاروں یا مریدوں سے تو اتنی سفاکیت کی امید نہیں کی جا سکتی تھی۔ روحانی پیشواؤں کی تو اولین ترجیح ہی نرم خوئی و نرم دلی ہوتی ہے ورنہ وہ لوگوں کو اپنا گرویدہ کر ہی نہیں سکتے۔

”واجد بھائی! آپ کو پیر سائیں یاد کر رہے ہیں۔“ پستہ قامت اسے مزید مرعوب کرتے یا دھمکیاں دینے میں کامیاب ہوتا، اس سے قبل ہی ایک آدمی عجلت میں وہاں آیا اور اسے پیغام دیا۔

”اوہ..... مجھے تو پیر سائیں کے وڈے ضروری کام سے جانا تھا۔“ پیغام سن کر واجد کے نام سے مخاطب کیا جانے والا پستہ قامت چونکا پھر ترکیب نمبر ایک یا دو استعمال کرنے کا مشورہ دینے والے شخص کی طرف پلٹا۔

”ابھی اسے سوچنے کے لیے تھوڑا ٹیم دے دے۔ چنگا ہے کہ اس کے متھے میں عقل آ جائے ورنہ پھر تجھے اجازت ہے کہ کوئی سی بھی ترکیب آزما ڈال۔“ عجلت میں ہدایت دے کر وہ وہاں سے روانہ ہو گیا۔

”چل بھئی..... بھائی کی مہربانی سے تجھے تھوڑی مہلت مل گئی ہے۔ اگر عقل مند ہوا تو خود ہی اپنی آسانی کا فیصلہ کرے گا ورنہ ہم تو سچ اگلوانے کے لیے تیار ہی ہیں۔“ درشت رو شخص نے واجد کی روانگی کے بعد اس سے کہا اور اپنے ساتھیوں کو باہر نکلنے کا اشارہ کیا۔ وہ سب اشارہ پاتے ہی ایک ایک کر کے باہر نکلنے لگے۔

”اور سن......“ اس نے باہر نکلنے سے قبل مشابرم خان کے پہلو میں ایک ٹھوکر ماری۔ ”اب کوئی لفڑا کرنے کی کوشش نہ کرنا اور سکون سے یہاں پڑے رہنا۔ اگر اب تو نے کوئی الٹی سیدھی حرکت کی تو میرے بندے تیری ہڈیوں کے اتنے ٹوٹے کریں گے کہ گنے بھی نہ جا سکیں گے۔“ اس نے مشابرم خان کے دروازہ توڑنے کی کوشش یاد آنے پر یہ دھمکی دی تھی جس پر اس نے کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا اور خاموشی سے فرش پر پڑا اسے باہر جاتا دیکھتا رہا۔ دروازہ بند ہونے کے بعد اس نے اپنی نظروں کا زاویہ بدلا اور وہیں پڑے پڑے ایک بار پھر کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ اس کے سامنے وہی خالی سپاٹ دیواروں والا کمرا تھا جس میں باہر کی روشنی اور ہوا اندر پہنچانے کے لیے صرف ایک ہوادان موجود تھا اور اس ہوادان کی بلندی اتنی زیادہ تھی کہ وہ کسی طور اس تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔

احساسِ بے بسی سے اس نے اپنا دایاں ہاتھ زور سے زمین پر مارا اور پھر خود ہی بلبلا اٹھا۔ ظالموں نے اتنی بے دردی سے اس کی ٹھکائی کی تھی کہ چند منٹوں میں ہی سارا جسم دکھتا ہوا پھوڑا بن کر رہ گیا تھا اور آگے وہ اس پر جو طبع آزمائی کرنے والے تھے، اس کی تو سنی جانے والی تفصیل ہی لرزہ خیز تھی۔ عملاً اسے کسی تجربے سے گزرنے والا کس عذاب میں مبتلا ہو جاتا ہوگا، اس کا تو کوئی حساب ہی نہیں تھا۔ وہ بہادر اور باہمت تھا اور یہ بھی یقین رکھتا تھا کہ ایذا رسانی کی کسی ترکیب

کے سامنے ہتھیار ڈال کر زبان نہیں کھولے گا لیکن بہر حال اس کے دل میں یہ ایک بڑی فطری سی خواہش موجود تھی کہ اسے ایسے کسی دردناک تجربے سے نہ گزرنا پڑے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ بچاؤ کی تدبیر کیا ہوگی؟ اگر اپنے سابقہ بیان پر ڈٹا رہتا تو وہ لوگ لازماً اسے تشدد کا نشانہ بناتے اور اگر کوئی نئی کہانی تراش لیتا تو اس بات کی کیا ضمانت تھی کہ اس کی کہانی پر یقین کر لیا جاتا۔

وہ عجیب سی کشمکش و پیچ کے عالم میں زمین پر پڑا رہا پھر خیال آیا کہ اس طرح پڑے پڑے تو چوٹ کھایا ہوا جسم بالکل ہی اکڑ جائے گا، چنانچہ ہمت کر کے اٹھ کھڑا ہوا اور کمرے کے طول و عرض میں آہستہ آہستہ چہل قدمی کرنے لگا۔ ابتدا میں اسے اس عمل میں کافی تکلیف محسوس ہوئی لیکن پھر آخر کار ہاتھ پیر کھلنے لگے۔ ساتھ ہی یہ اطمینان بھی ہو گیا کہ ضربات شدید ہونے کے باوجود اس کی ہڈیاں سلامت ہیں۔

"شش......" چہل قدمی کا سلسلہ جاری تھا کہ اس نے کمرے کی فضا میں ہلکی سی شش کار سنی۔ اس نے بے ساختہ ہی نظریں گھما کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ آخر کار اس کی نظر ہوادان کے چوکھٹے میں جا ٹھہری۔ وہاں ایک پندرہ سولہ سال کے لڑکے کی شکل نظر آ رہی تھی۔ اس سے نظر ملتے ہی لڑکا خوش نظر آنے لگا پھر اس نے گچھے کی شکل میں لپٹی رسی کو اس کی طرف پھینکا۔ رسی تیزی سے کھلتی ہوئی نیچے پہنچ گئی۔ اس وقت مشابرم خان نے پہلی بار یہ دیکھا کہ رسی کے ایک سرے پر آنکڑا موجود ہے جو ہوادان میں پھنسا ہوا ہے جبکہ آزاد سرے کو لڑکے نے اس کی طرف پھینک دیا تھا۔ وہ خود بھی یقیناً اسی رسی کی مدد سے وہاں تک پہنچا تھا۔ اسے حیرت ہونے لگی کہ بھلا ٹالی والا میں اس کا ایسا کون سا ہمدرد نکل آیا جو اسے اس قید خانے سے نجات دلانے کے لیے سرگرم ہو گیا ہے۔

"سوچ کیا رہے ہو، جلدی سے رسی پکڑ کر اوپر آ جاؤ۔" اسے مخمصے میں پڑے دیکھ کر لڑکے نے دھیمی آواز میں جھنجلاہٹ کا مظاہرہ کیا جس پر وہ فوراً ہی حرکت میں آ گیا اور رسی کی مدد سے آہستہ آہستہ اوپر چڑھنے لگا۔

"لاؤ یہ رسی اب مجھے دے دو۔ پہلے میں نیچے جاؤں گا۔ پھر تم آ جانا۔ نیچے پہنچ کر میں رسی کو تین جھٹکے دوں گا۔ تم سمجھ لینا کہ اب تم رسی کھینچ سکتے ہو۔" جونہی وہ اتنی بلندی پر پہنچا کہ اس کے ہاتھ ہوادان کے فریم کو گرفت میں لے سکیں، لڑکے نے اسے ہدایات دینا شروع کر دیں۔ اس کی بات تھی بھی معقول۔ ہوادان اتنا وسیع نہیں تھا کہ اس میں بیک وقت دو آدمی سما سکتے۔ لڑکا وہاں سے ہٹتا تب ہی اس کے لیے جگہ بن سکتی تھی۔ اس نے فوراً ہی رسی چھوڑ کر ہوادان کا فریم گرفت میں لے لیا۔ دوسری طرف لڑکے نے اپنی کارروائی شروع کر دی اور رسی کی مدد سے دیوار کی دوسری طرف اترنا شروع کر دیا۔ ہوادان کے چوکھٹے میں چڑھ کر بیٹھ جانے پر مشابرم خان کو باہر کا منظر صاف نظر آ رہا تھا۔ لڑکا رسی کی مدد سے جس جگہ اتر رہا تھا، وہاں ایک خشک نالہ تھا جس میں بہت سا گھاس پھوس اور جھاڑ جھنکاڑ جمع تھا۔ قریب ہی ایک گدھا گاڑی کھڑی تھی جس کا گدھا ہر طرف سے بے نیاز خودرو جھاڑیوں کے پتوں پر منہ مارنے میں مصروف تھا۔ اسے اچھی طرح جائزہ لینے پر بھی دور تک کوئی اور انسان نظر نہیں آیا۔

سارے منظر پر ایک طائرانہ نظر ڈال کر وہ ایک بار پھر لڑکے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس کے قدم زمین پر ٹک چکے تھے اور وہ رسی کو جھٹکے دے رہا تھا۔ پھر اسے متوجہ دیکھ کر اس نے جھٹکے دینا چھوڑ دیا اور ہاتھ سے اسے نیچے اترنے کا اشارہ کیا۔ مشابرم خان اپنے اس کم سن ہمدرد کی ہدایت پر فوراً ہی عمل پیرا ہو گیا۔ ہوادان سے زمین کا فاصلہ اتنا زیادہ نہیں تھا کہ اگر وہ کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد چھلانگ لگا دیتا تو کوئی دشواری پیش آتی۔ اس نے رسی چھوڑ کر چھلانگ لگانے کا ارادہ بھی کیا لیکن پھر اس خوف سے ملتوی کر دیا کہ کہیں نیچے موجود جھاڑ جھنکاڑ میں نکیلے کانٹے نہ ہوں اور اس کے پیروں کو زخمی کر دیں۔ اسے قیدی بنانے والوں نے اس کے جوتوں سمیت ہر شے اپنے قبضے میں کر لی تھی اور وہ تن کے کپڑوں کے سوا ہر شے سے محروم ہو چکا تھا۔ کچھ دیر قبل ہونے والی مار پیٹ نے ویسے ہی اس کا جوڑ جوڑ ہلا ڈالا تھا، چنانچہ وہ ذرا سی بداحتیاطی سے اپنے پیروں کو زخمی کرنے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔

"جلدی کرو بھائی! یہاں زیادہ دیر رکنے سے گڑبڑ بھی ہو سکتی ہے۔" جیسے ہی اس کے قدم زمین سے ٹکے، لڑکے نے اس سے کہا۔

"تم کون ہو اور مجھے یہاں سے کیوں نکالا ہے؟" مشابرم خان نے اپنے ذہن میں مسلسل اٹھنے والا سوال اس سے کر ڈالا۔

"یہ ساری تفصیل بھی ہوتی رہے گی لیکن پہلے یہاں سے نکلنے کی کرو۔ کسی نے دیکھ لیا تو تمہارے ساتھ ساتھ میں بھی مارا جاؤں گا۔" لڑکے کے انداز میں واضح عجلت تھی۔ وہ تھوڑا سا خوف زدہ بھی نظر آ رہا تھا۔ یقینی سی بات تھی کہ پیر سائیں کے حواریوں کے قیدی کو فرار کروانا شیر کی کچھار میں ہاتھ ڈالنے کے مترادف تھا...... اور وہ کم سن لڑکا اگر کسی بھی وجہ سے یہ جرأت کر بیٹھا تھا تو اسے بہرحال اپنی سلامتی کی فکر تو

دامن گیر ہونی ہی تھی۔

"میں تمہیں یہاں سے باہر نکال دوں گا اس سے آگے کی ذمے داری تمہاری اپنی ہوگی۔" خشک نالے سے نکل کر گدھا گاڑی کی طرف جاتے ہوئے لڑکے نے اسے بتایا۔

"تمہارا نام کیا ہے...... کم از کم اتنا ہی بتا دو کہ بات چیت کرنے میں آسانی رہے۔" حالات کو سمجھتے ہوئے اس نے لڑکے کا تفصیلی حدود اربعہ معلوم کرنے کا ارادہ ملتوی کر کے اس سے اس کا نام دریافت کیا۔

"علی بخش۔" لڑکے نے مختصر جواب دیا جسے سن کر وہ چونک پڑا۔ پیر سائیں اور حامد راؤ کی شخصیت کے بارے میں بہت سے اہم انکشافات کرنے والے مزارع کا نام نور بخش تھا اس لیے یہ گمان کیا جا سکتا تھا کہ لڑکے کی اس سے کوئی نسبت ہے۔ ویسے تو گاؤں دیہاتوں میں اس قسم کے نام رکھنا ایک عام سا رواج ہوتا ہے لیکن ٹالی والا اس کے لیے ایک بالکل اجنبی جگہ تھا جہاں وہ یہی امید کر سکتا تھا کہ جلتے ہوئے گھٹن میں ملنے والے نور بخش کے دل میں اس کے لیے ہمدردی کے جذبات پیدا ہو گئے ہوں اور اس نے اپنے کسی رشتے دار کو اس کی مدد کے لیے بھیجا ہو۔ لڑکے کی عمر دیکھتے ہوئے وہ یہی اندازہ لگا سکتا تھا کہ وہ نور بخش کا بیٹا ہوگا کیونکہ اپنی گفتگو میں نور بخش نے اسے یہ بھی بتایا تھا کہ اس کا بیٹا شفقت راؤ کے بیٹے کا ہم عمر اور ابتدائی درجوں کا ہم جماعت تھا۔ اس حساب سے علی بخش نامی وہ لڑکا نور بخش کا بیٹا ہی ہو سکتا تھا۔ حقیقت جو بھی تھی، فی الحال وہ صرف قیاس آرائی ہی کر سکتا تھا۔ تصدیق یا تردید اسی وقت ہوتی جب لڑکا اس سے گفتگو پر آمادہ ہوتا۔

"تم اس گدھا گاڑی پر لیٹ جاؤ۔ میں تمہارے اوپر گھاس وغیرہ پھیلا دوں گا۔ اس طرح کوئی تمہیں دیکھ نہیں سکے گا۔" گدھا گاڑی کے قریب پہنچ کر علی بخش نام بتانے والے لڑکے نے اسے ہدایت دی جس پر اس نے فوراً عمل درآمد کر ڈالا۔ لڑکا پھرتی سے اس کے اوپر گھاس کے گٹھر پھیلانے لگا۔ یہ گٹھر یقینی طور پر اس کے منصوبے کا ایک لازمی حصہ تھے جن کا اس نے پیشگی انتظام کر رکھا تھا۔ گٹھر پوری طرح اس پر جمانے کے بعد علی بخش اچک کر گدھا گاڑی پر سوار ہو گیا اور گدھے کو چابک رسید کر کے چلنے کا اشارہ دیا۔ اس آخری منظر کو مشابرم خان نے اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا تھا بلکہ محض آوازوں اور حرکت سے تصور میں لایا تھا کیونکہ گھاس کے گٹھروں کے نیچے دبے ہونے کی وجہ سے نہ صرف وہ خود دوسروں کی نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا بلکہ خود بھی کسی کو دیکھنے کے قابل نہیں رہا تھا۔

ہچکولے کھاتی گدھا گاڑی پر شروع ہونے والا سفر اتنا خوش گوار نہیں تھا۔ خاص طور پر اس لیے بھی کہ اس کے نتھنوں میں گھاس کی خوشبو گھسی جا رہی تھی اور سانس لینے کے لیے ہوا کی خاصی قلت تھی۔ اس پر سے مستزاد اسے اپنے وجود پر گھاس کے گٹھروں کا بوجھ بھی برداشت کرنا پڑ رہا تھا لیکن پھر بھی اس کے لیے یہ صورت حال قابل قبول تھی کیونکہ یہی اس کی آزادی کی راہ تھی۔ ایک ایسی جگہ پر جہاں اس کا کوئی آشنا یا دوست موجود نہیں تھا اور وہ اپنے موبائل سمیت ہر شے سے محروم کر دیے جانے کے بعد بالکل بے دست و پا ہو کر رہ گیا تھا...... آزادی کی اس صورت کا نکل آنا غیبی امداد ہی محسوس ہو رہی تھی اور وہ اس غیبی امداد پر کسی قسم کا اعتراض کر کے کفرانِ نعمت کا مرتکب نہیں ہو سکتا تھا۔

گدھا گاڑی کا جھٹکوں اور ہچکولوں سے بھرپور وہ سفر جانے کتنی دیر جاری رہا۔ پھوڑے کی طرح دکھتے جسم کے ساتھ اسے تو یہ سفر خاصا طویل ہی لگا تھا چنانچہ جب گدھا گاڑی رکی تو اس نے دل ہی دل میں شکر ادا کیا اور خود اپنے ہاتھوں سے گٹھر ہٹا کر اٹھ بیٹھنے کی شدید خواہش پر قابو پاتے ہوئے علی بخش کی طرف سے اشارہ ملنے کا انتظار کرنے لگا...... کیونکہ وہ جانتا تھا کہ ان مخدوش حالات میں اس کی ذرا سی بھی بداحتیاطی کسی بڑی مصیبت کو دعوت دے سکتی ہے۔

"میں گٹھر ہٹا رہا ہوں۔" اسے زیادہ دیر انتظار کی زحمت سے نہیں گزرنا پڑا اور کان میں علی بخش کی مدھم سی سرگوشی سنائی دی۔ سرگوشی کے فوراً بعد ہی اس نے اپنے اوپر سے گٹھر ہٹتے ہوئے محسوس کیے اور بالآخر کھلا آسمان بھی دکھائی دے ہی گیا۔

"بہت بہت شکریہ علی بخش! آج تم نے مجھ پر جو احسان کیا ہے، وہ مجھے ہمیشہ یاد رہے گا۔ تم جو بھی ہو اور تم نے جس بھی وجہ سے میری مدد کی ہے، میں اس احسان کے بدلے میں تمہارا دل سے شکر گزار ہوں۔" اس نے گدھا گاڑی پر سیدھے بیٹھتے ہوئے دل کی گہرائیوں سے یہ الفاظ ادا کیے۔

"تمہارا شکریہ میں بعد میں وصول کرتا رہوں گا لیکن پہلے یہ بتاؤ کہ تم کون ہو؟" اچانک ہی علی بخش نے بالکل بدلے ہوئے تیوروں کے ساتھ اس سے یہ سوال کیا تو وہ چونک پڑا اور بہت تیزی سے یہ خیال ذہن میں آیا کہ کہیں یہ لڑکا بھی پیر سائیں کے ہرکاروں میں سے ایک نہ ہو جسے اس سے سچ اگلوانے کے لیے اس طریقے سے استعمال کیا گیا ہو۔ لیکن لڑکے کے چہرے پر پھیلی معصومیت اور سادگی ذہن میں پیدا ہونے والے اس اندیشے کی تردید کر رہی تھی۔ وہ دبلا پتلا لڑکا

جس کی ابھی صرف مسیں بھیگی تھیں، کسی طرح ان کرخت صورت اور مکار لوگوں میں سے محسوس نہیں ہو رہا تھا جنہیں نور سائیں کے مرید ہونے کا دعویٰ تھا۔

"میں تمہارے انداز کی تبدیلی کی وجہ نہیں سمجھ سکا۔ کچھ دیر پہلے تم مجھے اپنے ہمدرد محسوس ہو رہے تھے اور اب مجھ پر یہ کلہاڑی تانے کھڑے ہو۔" اس نے وزدیدہ نظروں سے علی بخش کے ہاتھ میں موجود چمک دار پھل والی کلہاڑی کو دیکھا۔ یہ کلہاڑی اس نے گدھا گاڑی میں سوار ہوتے وقت بھی ایک جانب پڑی دیکھی تھی لیکن یہ گمان نہیں ہوا تھا کہ وہ اسے خود اسی کی ذات پر آزمانے کا ارادہ رکھتا ہے۔

"فی الحال میں تمہارا دوست ہوں اور نہ دشمن۔ دوستی اور دشمنی کا فیصلہ اسی وقت ہو گا جب میں یہ جان لوں گا کہ میرے باپ کی موت سے تمہارا کیا تعلق ہے؟ ابھی تم یہ جان لو کہ ہم جس جگہ موجود ہیں یہاں عام طور پر کوئی نہیں آتا اس لیے اگر میں تمہیں قتل بھی کر ڈالوں تو کوئی دیکھنے والا نہیں ہو گا۔ ویسے بھی میں تمہارا قتل کر کے کسی مشکل میں نہیں پھنسوں گا بلکہ میرے اس کارنامے کے بدلے نور سائیں کے چاہنے والے میری پیٹھ ہی تھپکیں گے۔ ہاں اگر تم بے گناہ ہو تو یہ بھی بتا دوں کہ اس جگہ سے تمہیں چنڈ کے باہر کسی محفوظ مقام تک پہنچانا میرے لیے زیادہ مشکل نہیں ہو گا۔" اپنے باپ کی موت کا ذکر کرتے ہوئے پل بھر کے لیے اس کی آواز بھرائی تھی اور آنکھوں میں نمی سی ظاہر ہوئی تھی لیکن پھر اس نے فوراً ہی خود پر قابو پا لیا اور دوٹوک انداز میں اس پر اس کی پوزیشن واضح کرنے لگا۔

"دیکھو بچے! تم مجھ سے کھل کر بات کرو۔ تم مجھ سے بہت چھوٹے ہو اور میں تمہیں اپنے چھوٹے بھائی کی طرح محسوس کر رہا ہوں۔ لیکن تمہارا سوال مجھ پر واضح نہیں ہے۔ میں نہیں جانتا کہ تمہارا باپ کون ہے تو پھر اس کی موت کے بارے میں کیسے بتا سکتا ہوں؟" اس نے نرمی اور تحمل سے کام لیتے ہوئے علی بخش کو جواب دیا۔

"تم میرے باپ کو نہیں جانتے تو پھر اس کے ساتھ اتنی دیر تک کھیتوں میں بیٹھے باتیں کیوں کر رہے تھے؟" اس نے چیخ کر سوال کیا۔

"اوہ۔۔۔ تو تم نور بخش کے بیٹے ہو۔" اندازہ تو وہ پہلے ہی لگا چکا تھا، اب تصدیق ہونے پر دانستہ لہجے میں تحیر پیدا کرتے ہوئے بولا۔

"ہاں، میں اسی نور بخش کا بیٹا ہوں جسے تمہاری موجودگی میں گولی ماری گئی تھی اور میں اب تک نہیں سمجھ سکا کہ میرے باپ کا آخر قصور کیا تھا؟" اس بار اس کی آواز کی بھراہٹ اتنی نمایاں تھی کہ مشاہرم خان کو لگا کہ وہ ابھی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے گا۔ ساتھ ہی اسے گولی چلنے کی آواز بھی یاد آئی جو اس نے بے ہوشی میں جاتے ہوئے سنی تھی۔ وہ خفیف سا مضطرب ہوا تھا۔

"تو کیا نور بخش کو قتل کر دیا گیا؟"

"ہاں۔۔۔ میں نے اپنی نظروں کے سامنے اپنے باپ کو مرتے ہوئے دیکھا لیکن کچھ نہیں کر سکا۔ وہ لوگ اسے قتل کرنے کے بعد تمہیں اٹھا کر دیدہ دلیری کے ساتھ فرار ہو گئے۔ اب تم بتاؤ کہ تمہارا میرے باپ کے قتل سے کیا تعلق ہے؟ ان لوگوں نے تمہیں اس کے ساتھ دیکھ کر اسے کیوں مار ڈالا؟" علی بخش کے لہجے میں بڑا کرب تھا۔ خود مشاہرم خان کو نور بخش کے قتل کا سن کر شدید افسوس ہوا تھا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس غریب مزارع کو صرف اس جرم میں کہ وہ اسے چند حقائق سے آگاہ کر بیٹھا تھا، جان سے مار دیا گیا تھا۔

"مجھے نور بخش کی موت پر شدید افسوس ہے۔" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "اگر تم چاہو تو مجھے اپنے باپ کے قتل کا ذمے دار سمجھ کر مجھ سے بدلہ لے سکتے ہو۔" وہ بلا کم و کاست علی بخش کو اپنی تاحلی والا میں آمد سے لے کر نور بخش سے ملاقات کی تفصیل تک سب سناتا چلا گیا۔ البتہ اس نے اتنی احتیاط ضرور کی تھی کہ اس معاملے میں شہریار کا نام استعمال کرنے کے بجائے خود کو کسی خفیہ ادارے کا ملازم ظاہر کیا تھا۔ اتنا کچھ بھی وہ اسے اس لیے بتا گیا تھا کہ اسے یہ چھوٹا سا لڑکا بہت اچھا اور قابلِ اعتماد لگا تھا۔ پھر نور بخش نے صداقت والے معاملے میں اس کا جس طرح سے ذکر کیا تھا، اس سے بھی ظاہر تھا کہ وہ خاصی فہم و فراست کا مالک ہے اور اسے کچھ بتا دینا نقصان دہ نہیں ہو سکتا تھا۔

"مجھے یقین تھا کہ بات جو بھی ہو گی، اس میں اصل قصور نور سائیں کے غنڈوں کا ہی ہو گا۔ مجھے معاف کرنا بھرا۔۔۔ اپنے غم میں، میں تمہارے ساتھ تھوڑی بدتمیزی کر گیا۔" تفصیلات سن کر اس نے فوراً ہی معافی مانگ لی۔

"نہیں میرے بھائی! تم نے کوئی بدتمیزی نہیں کی۔ تم نے جو کچھ کیا، اپنی جگہ صحیح کیا بلکہ میں تمہاری جرأت اور ہوشیاری پر حیران ہوں۔ تم اتنے چھوٹے ہو کر جس طرح ان غنڈوں کے خلاف عمل میں آئے، یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔" مشاہرم خان نے دل کی گہرائیوں سے اسے سراہا جس پر علی بخش کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ پھر وہ اداس سے لہجے میں بولا۔

"سچ بات یہ ہے بھائی کہ جب انسان کے دل میں آگ لگی ہو تو جرأت اور ہوشیاری خود بہ خود ہی آجاتی ہے۔ میں اپنے باپ کی دردناک موت پر اتنا دکھی ہوں کہ میں نے سوچ لیا تھا کہ اگر تم مجرم نکلے تو تمہیں مار ڈالوں گا ورنہ اگر تم میرے باپ کے دوست ہو تو تمہیں بچانا اور اس کی موت کا اصل سبب جاننا بھی میرا فرض ہے۔ زیادہ شک تو مجھے یہی تھا کہ اصل مجرم پیر سائیں کے غنڈے ہی ہیں۔ تمہیں یہ جان کر حیرت ہوگی کہ تھانے میں ابا کے قتل کی جو رپورٹ درج ہوئی ہے، اس میں تمہیں مفرور قاتل ظاہر کیا گیا ہے اور ثبوت میں جائے وقوعہ سے تمہارا موبائل اور شناختی کارڈ ملنے کا ذکر کیا گیا ہے۔ میں نے بہت کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور اس رپورٹ کی مخالفت کرنا چاہتا تھا لیکن میری ماں نے مجھے روک دیا۔ اس کا کہنا ہے کہ شوہر کے بعد وہ اپنے بچوں کو نہیں کھونا چاہتی اس لیے خاموشی ہی بہتر ہے۔ ماں کے احترام میں، میں نے سر جھکا دیا لیکن میں کسی طرح اپنے باپ کے قتل کو نہیں بھول سکتا تھا اس لیے حرکت میں آگیا۔" علی بخش نے اسے تفصیل سے بتایا۔

"تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں کہاں قید ہوں؟ پھر تم ٹھیک اسی کمرے کے ہوادان تک پہنچ گئے جہاں مجھے رکھا گیا تھا۔" مشاہرم خان بھی اپنی ساری الجھنیں دور کرنے پر تلا ہوا تھا۔

"تمہیں جہاں رکھا گیا تھا، وہ مکان باقی گاؤں سے کافی ہٹ کر ہے اور آسیب زدہ مشہور ہے اسی لیے اس کے آس پاس کا علاقہ بھی ویران ہی رہتا ہے۔ ہمارے پاس چند پالتو بکریاں اور بھیڑیں وغیرہ ہیں۔ میں ان کے لیے چارے کا بندوبست کرنے کبھی کبھی اس طرف بھی نکل جاتا تھا اس لیے میری نظر میں یہ بات آگئی کہ اس مکان میں پیر سائیں کے مریدوں کا آنا جانا لگا رہتا ہے۔ میں نے انہیں وہاں کچھ رکھتے یا نکالتے بھی دیکھا ہے۔ ڈبے میں پیک وہ کیا چیز ہوتی ہے مجھے نہیں معلوم لیکن میں نے ابا کی تدفین کے بعد جب تمہیں تلاش کرنے کے بارے میں سوچا تو میرے ذہن میں یہی آیا کہ پیر سائیں کے غنڈے تمہیں وہیں لے گئے ہوں گے۔ میں گھر سے جانوروں کے لیے چارا لانے کا بہانہ کر کے نکلا اور مکان کے قریب چھپ کر نگرانی کرنے لگا۔ جب میں نے پیر سائیں کے واجد نامی چہیتے مرید کو اپنے آدمیوں کے ساتھ وہاں آتے دیکھا تو مجھے یقین ہوگیا کہ تم وہیں ہو۔ خوش قسمتی سے دو سال تک ہمارے اسکول میں ایک ایسے استاد نے بھی پڑھایا تھا جنہوں نے ہمیں اسکاؤٹس بننے کی تربیت دی۔ اسی تربیت کی وجہ سے میں رسی کی مدد سے اوپر ہوادان تک پہنچنے میں کامیاب ہوگیا اور یہ اتفاق ہی تھا کہ تم اسی کمرے میں موجود تھے۔ مکان کا پچھلا حصہ ہونے کی وجہ سے کسی نے مجھے وہاں دیکھا بھی نہیں اور میں آرام سے تمہیں وہاں سے نکال لایا۔"

علی بخش کی بتائی ہوئی ہر بات اس کے ذہن میں الجھے ہوئے سوالوں کا جواب بنتی جا رہی تھی چنانچہ وہ سکون بھرا ایک گہرا سانس لیتے ہوئے بولا۔ "مجھے امید ہے کہ اب تمہارا مجھ پر سے ہر شک دور ہوگیا ہوگا اور اب تم مجھے گاؤں سے باہر نکالنے میں کوئی حرج نہیں سمجھو گے؟"

"بالکل۔۔۔ کیوں نہیں؟ لیکن تمہیں ایک بار پھر گھاس کے گٹھروں کے پیچھے لیٹنے کی زحمت کرنی پڑے گی۔ میں جس راستے سے تمہیں گاؤں سے باہر نکالنے والا ہوں، وہ عام گزرگاہ نہیں ہے لیکن پھر بھی احتیاط ضروری ہے۔" علی بخش نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے جو تم مناسب سمجھو۔" وہ فوراً ہی راضی ہوگیا اور ایک بار پھر پہلے والے انداز میں لیٹ گیا۔ علی بخش اس کے جسم پر گھاس کے گٹھر جمانے لگا۔

"ایک بات سنو علی بخش!" اس نے ذہن میں آنے والے ایک خیال کے تحت اسے پکارا۔

"ہاں بولو بھائی۔" وہ فوراً ہی متوجہ ہوگیا۔

"میں تم پر زور نہیں دے رہا۔ نہ ہی یہ چاہتا ہوں کہ تمہاری جان خطرے میں پڑے لیکن اگر تم اپنے باپ کے قاتلوں کو انجام تک پہنچانا چاہتے ہو تو اتنا کر سکتے ہو کہ اپنے ہاتھ بچاتے ہوئے ان لوگوں پر نظر رکھو کہ یہ پیری مریدی کے بھیس میں اصل کام کیا کر رہے ہیں۔ کسی دن میں یا میرا کوئی آدمی آکر تم سے معلومات لے لیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ دوبارہ کوشش کی جائے تو ہم ان بہروپیوں کی اصلیت جان کر انہیں بے نقاب کر دیں گے اور تمہارے گاؤں کے سادہ لوح لوگ ان کے شر سے محفوظ ہو جائیں گے۔" مشاہرم خان نے بہت سبھاؤ سے اپنا مدعا بیان کیا جسے سن کر علی بخش نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور پھر فوراً ہی اثبات میں گردن ہلا دی۔ اس کے حامی بھرنے پر وہ خوش ہوگیا پھر علی بخش کو اپنے چہرے کے سامنے گٹھر رکھتے دیکھ کر سکون سے آنکھیں موند لیں۔ ٹالی والا میں بہت مشکل وقت گزارنے کے باوجود وہ یہاں سے بالکل ہی ناکام واپس نہیں جا رہا تھا۔ اسے امید تھی کہ جتنی کارگزاری وہ دکھا سکا ہے، اسے بھی شہریار کی طرف سے سراہا جائے گا۔

☆☆☆

"بات سننا بہن!" ماہ بانو بس سے اتری تو اس کے ساتھ اترنے والوں میں وہ عورت بھی شامل تھی جو اپنے بچے کے ساتھ اس کے برابر والی نشست پر بیٹھی تھی اور راستے بھر وقفے وقفے سے روٹی کے ٹکڑوں کو آم کے اچار سے کھاتی رہی تھی۔ اپنے مطلوبہ بس اڈے پر اس عورت کو اترتے دیکھ کر اس نے بہتر سمجھا کہ اسی سے اسلم کے گھر کا اتا پتا معلوم کر لے تاکہ بغیر بھٹکے سیدھی وہاں پہنچ سکے۔ اسلم نے اسے بس اڈے سے اپنے گھر تک پہنچنے کے لیے کچھ نشانیاں تو بتائی تھیں لیکن پھر بھی وہ تذبذب کا شکار تھی۔ اس چھوٹے سے گاؤں میں ایسا کوئی نظام بھی نہیں تھا کہ کسی کا گھر تلاش کرنے کے لیے مکان نمبر یا گلی نمبر کا استعمال کیا جا سکے۔ یہاں یہ طریقہ رائج ہی نہیں تھا۔ چھوٹے سے گاؤں کی مختصر سی آبادی میں لوگ ایک دوسرے کو اتنی اچھی طرح جانتے تھے کہ باپ دادا کے ناموں تک سے بھی واقف تھے۔ یہ بات اسلم نے اسے بطور خاص بتائی تھی۔ وہ خود بھی گاؤں دیہاتوں کے اس طرز زندگی سے واقف تھی۔ اس لیے اپنی ساتھی مسافر کو اپنے ساتھ ہی اترتے دیکھ کر اسے مخاطب کر بیٹھی۔ وہ عورت اس کی طرح تنہا نہیں تھی بلکہ اس کے ساتھ بس سے ایک مرد بھی اترا تھا۔ دبلا پتلا، گہری رنگت اور دراز قامت والے اس مرد کے چہرے کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں جس کی وجہ سے چہرے پر کرختگی سی محسوس ہوتی تھی۔ وہ عمر میں عورت سے لگ بھگ دس بارہ سال بڑا محسوس ہو رہا تھا۔

"کہو کیا ہے ادی؟" اس کے پکارنے پر عورت متوجہ ہوئی تو مرد بھی قدرے فاصلے پر رک کر دزدیدہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ اس نے جان بوجھ کر اسے نظر انداز کر دیا۔ وہ جانتی تھی کہ اس قسم کے چھوٹے علاقوں میں تنہا عورت خود بہ خود ہی توجہ کا مرکز بن جاتی ہے اور لوگ اسے عجیب نظروں سے دیکھنے لگتے ہیں۔

"یہاں اس گاؤں میں اسلم حنیو کی ماں رہتی ہے۔ مجھے اس کے گھر تک جانا ہے۔" اس نے اپنا مدعا بیان کیا جسے سن کر عورت کوئی جواب دیے بغیر غور کر اس کی شکل دیکھنے لگی۔

"اسلم کا باپ اکرم حنیو ریلوے میں ملازمت کرتا تھا اور کئی سال پہلے مر چکا ہے۔ اس کی ایک بیٹی بھی تھی جس نے خودکشی کر لی تھی۔" عورت کے تاثرات سے وہ یہ سمجھی کہ وہ اس کا مدعا سمجھ نہیں سکی ہے اس لیے مزید حوالے دینے لگی۔

"آپ زینت بی بی کا تو نہیں پوچھ رہی ہو؟" عورت کے کچھ بولنے سے قبل مرد نے درمیانی فاصلہ طے کیا اور اس کے دوبدو ہو کر پوچھا۔

"ہاں ہاں وہی۔۔۔۔" اسے یاد آگیا کہ اسلم نے اپنی ماں کا یہی نام بتایا تھا۔

"آپ ہمارے ساتھ چلو۔ میں آپ کو زینت بی بی کا گھر دکھا دوں گا۔" مرد نے فوراً ہی پیشکش کی جسے اس نے قبول کرنے میں کوئی عار نہیں سمجھا اور ان کا بس اڈے سے پیدل سفر شروع ہوگیا۔ حسب توقع سفر لمبا تھا۔

"آپ اسلم کی کون ہو؟" راستے میں مرد نے اس سے دریافت کیا۔ اس کے انداز میں گہرا تجسس تھا۔

"میں ان لوگوں کی دور کی رشتے دار ہوں اور کراچی سے آئی ہوں۔ مجھے کسی نے اطلاع دی تھی کہ زینت بی بی بیٹی کی موت اور بیٹے کے فرار کے بعد بالکل تنہا رہ گئی ہے۔ میں بھی کراچی میں اکیلی ہی رہتی ہوں اس لیے میں نے سوچا کہ زینت بی بی کو اپنے ساتھ لے جاتی ہوں۔ اس طرح ہم دونوں کی ہی تنہائی دور ہو جائے گی۔" اس نے پہلے سے سوچی ہوئی کہانی اسے سنا ڈالی۔

"تم اکیلی کیوں رہتی ہو؟ تمہارے گھر والے کہاں ہیں؟" مرد نے فوراً ہی ایک دوسرا سوال داغ دیا۔

"میرے شوہر ملک سے باہر ہیں اور سال چھ مہینے میں ہی چکر لگاتے ہیں اسی لیے میں زینت بی بی کو اپنے ساتھ رکھنا چاہتی ہوں۔" اس نے تحمل سے جواب دیا۔

"تمہارے بچے نہیں ہیں؟" وہ اس کا مکمل انٹرویو لینے پر تلا ہوا تھا۔

"نہیں۔" اس نے سرخ پڑتے چہرے کے ساتھ مختصر جواب دیا۔ مرد کے مقابلے میں عورت نے اس سے کوئی سوال نہیں کیا تھا اور اپنے بچے کو گود میں اٹھائے چپ چاپ چلتی رہی تھی۔ اس کے ساتھ چلتے مرد کو اتنی توفیق بھی نہیں ہوئی تھی کہ پیدل چلنے کی اس مشقت میں کم از کم عورت کو بچے کے بوجھ سے آزاد کر کے اسے اپنی گود میں لے لے۔

"لاؤ بہن! تھوڑی دیر کے لیے بچہ مجھے تھما دو۔" کچھ عورت کی ہمدردی میں اور کچھ مرد کے سوالات سے بچنے کے لیے اس نے عورت کو پیشکش کی۔

"نہیں ادی! تم پریشان نہ ہو۔ مجھے عادت ہے بچہ گود میں اٹھا کر چلنے کی۔" فوراً ہی اس کا مقصد سمجھتے ہوئے عورت نے جواب دیا۔ جواب دیتے ہوئے اس کی نظریں پل بھر کے لیے ماہ بانو کی نظروں سے ٹکرائی تھیں۔ ان آنکھوں میں عجیب سا تاثر تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ اس سے کچھ کہنا چاہ رہی ہو لیکن کہنے سے معذور ہو۔

"یہ ٹھیک بول رہی ہے بی بی! ہماری عورتیں شہری عورتوں کی طرح نازک مزاج نہیں ہوتیں کہ ذرا سا بچہ گود میں لے کر چلنے سے کمر میں بل پڑ جائے۔" مرد نے اپنی دخل اندازی ضروری سمجھتے ہوئے ٹکڑا لگایا۔ جواب میں ماہ بانو نے بحث نہیں کی۔ اس اجنبی گاؤں میں جہاں وہ اسلم کے حوالے کے ساتھ آئی تھی کسی سے بھی غیر ضروری مخالفت مول لینا مناسب نہیں تھا۔ اسے معلوم تھا کہ کبھی کبھی معمولی نظر آنے والی باتیں بھی آگے چل کر بڑی بڑی مصیبتوں کو جنم دیتی ہیں اس لیے بہتر تھا کہ وہ حتی الامکان احتیاط سے کام لیتی۔

"پہلے میں اپنی زنانی کو گھر چھوڑوں گا پھر تمہیں زینت بی بی کا مکان دکھاؤں گا۔" چلتے چلتے جب وہ لوگ ایسے مقام پر پہنچے جہاں سے مکانات نظر آنے لگے تو مرد نے اس سے کہا۔ جواب میں اس نے سر کو اثبات میں جنبش دے کر اپنی رضامندی ظاہر کر دی۔ مکانات کا سلسلہ شروع ہوا تو مرد کے قدموں میں تیزی آگئی اور وہ ان دونوں سے چند قدم آگے بڑھ گیا۔ ماہ بانو کی نظر اسی پر تھی اس لیے جب چلتے چلتے اس نے اچانک اپنے ہاتھ پر دباؤ محسوس کیا تو بُری طرح چونک گئی۔ وہ اس کے ساتھ چلتی عورت تھی جس نے اس کے بائیں ہاتھ پر اپنے ہاتھ سے دباؤ ڈالا تھا۔

"تمہیں اسلم نے یہاں بھیجا ہے نا؟" اس نے بے حد مدھم آواز میں اس سے سوال کیا۔ سوال بھی کیا تھا بس گویا ایک یقین سا تھا اس کے الفاظ میں اور وہ ماہ بانو سے محض تصدیق چاہ رہی تھی۔ اس کے اس قدر درست اندازے پر وہ ششدر سی رہ گئی۔

"تم یہاں سے چلی جاؤ ورنہ اسلم مشکل میں پڑ جائے گا۔" شاید ماہ بانو کے تاثرات نے ہی تصدیق کا کام کر دیا تھا جو وہ اس کی زبان سے جواب سنے بغیر عجلت میں بولی۔

"تم کون ہو، تمہیں یہ بات کیسے معلوم ہے؟" اس نے سرسراتے لہجے میں سوال کیا۔ لیکن عورت کو جواب دینے کا موقع نہیں ملا اور مرد نے پلٹ کر اسے ڈپٹا۔

"کیا مرے مرے قدموں سے چل رہی ہے۔ گھر جانے کو دل نہیں چاہ رہا کیا؟" اس کے لہجے میں ایسی تندی اور کاٹ تھی کہ عورت کے قدم برق رفتاری سے حرکت میں آ گئے اور پل بھر میں ہی وہ اس سے کئی قدم آگے بڑھ گئی۔ ماہ بانو ہکا بکا اسے دیکھتی ہی رہ گئی اور وہ ایک پختہ مکان کے دروازے میں داخل ہو کر غائب بھی ہو گئی۔

"چلو بی بی! اب میں تمہیں زینت بی بی کا گھر دکھا دیتا ہوں۔" اس سے قبل کہ وہ عورت کے دیے مشورے پر عمل کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں کوئی فیصلہ کرتی، مرد اس کی طرف پلٹا۔ وہ بھی سر جھٹک کر اس کے پیچھے ہو لی۔ اب جبکہ وہ یہاں تک آہی گئی تھی تو واپس پلٹنا بیکار تھا۔ رہی خطرہ مول لینے والی بات تو خطرہ تو اس نے یہاں آنے کا فیصلہ کر کے پہلے ہی مول لے لیا تھا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" مرد کے ساتھ چلتے چلتے اس نے اچانک ہی سوال کیا۔

"نواز چانڈیو۔" اس نے بتایا پھر پوچھنے لگا۔ "تم میرا نام کیوں پوچھ رہی ہو؟"

"بس..... میں نے سوچا کہ زینت خالہ سے ملوں گی تو انہیں بتاؤں گی کہ مجھے ان تک پہنچانے والے مہربان لوگ کون ہیں۔" اس نے بے پروا سا انداز اختیار کر کے جواب دیا۔

"ضرور بتانا۔ وہ میرا نام سن کر بہت خوش ہوگی۔" نواز چانڈیو کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ پھیل گئی جسے دیکھ کر ماہ بانو کو اس کی بیوی کی تنبیہہ یاد آگئی اور دل بُری طرح دھڑکنے لگا۔ شاید وہ بہت زیادہ خطرے میں گھر گئی تھی لیکن اب کر بھی کیا سکتی تھی، اب تو کوئی جائے فرار بھی نہیں رہی تھی۔

"وہ دیکھو، وہ رہا زینت بی بی کا گھر۔ تم جا کر اس سے مل لو۔ میں واپس جاتا ہوں۔" اس کے دل میں پیدا ہوتے خدشات کے برخلاف نواز چانڈیو اسے دور ہی سے ایک گھر کی طرف اشارہ کر کے واپس پلٹ گیا۔ وہ کچھ دیر کے لیے اسے وہاں سے جاتا دیکھتی رہی پھر اس مکان کی طرف متوجہ ہوئی جس کی طرف وہ اشارہ کر گیا تھا۔

مکان باہر سے دیکھنے میں بالکل ویران اور بے آباد لگ رہا تھا۔ ایک ایسا مکان جو اپنے مکینوں سے محروم ہو گیا ہو اور وہاں صرف ایک بوڑھی غم زدہ عورت..... باقی رہ گئی ہو۔ اسے ایسا ہی ویران اور وحشت زدہ نظر بھی آنا چاہیے تھا۔ اس نے بوجھل ہوتے دل کے ساتھ آگے بڑھ کر دروازے پر دستک دی لیکن کئی بار کی دستک کے جواب میں بھی اندر سے کوئی جواب وصول نہیں ہوا۔ البتہ وہ اتنا اندازہ لگانے میں کامیاب ہو گئی کہ دروازہ اندر سے بند نہیں ہے اور اسے ہاتھ سے دھکیل کر کھولا جا سکتا ہے۔ کوئی چارہ نہ دیکھ کر اس نے یہی طریقہ استعمال کیا۔ پرانا بوسیدہ دروازہ اس کے دھکا دیتے ہی چرچراہٹ کی آواز کے ساتھ کھل گیا اور اس نے ایک بار پھر دستک دینے کے بعد قدم اندر رکھا۔ اندر قدم رکھتے ہی اس کی قوت شامہ نے اندازہ لگا لیا کہ یہ دروازہ بہت دنوں بعد کھلا ہے اور اندر صفائی وغیرہ کا کوئی معقول انتظام بھی نہیں ہے۔ گرد سے اٹے فرش پر اپنے جوتوں کے نشان چھوڑتی ہوئی وہ اندر کا جائزہ لینے لگی۔

گھر چھوٹا سا تھا اور اس میں باورچی خانے اور غسل خانے کے علاوہ صرف دو کمرے تھے۔ ایک کمرے میں جھانکنے پر اسے چارپائی پر پڑا مدقوق سا وجود نظر آ گیا۔ ہڈیوں کا ڈھانچا بنی وہ عورت جس کی آنکھیں دروازے پر جمی تھیں، اسلم کی ماں ہے یہ سوچ کر اسے سخت صدمہ ہوا۔ اسلم ایک دن باتوں باتوں میں اس کے سامنے ذکر کر چکا تھا کہ وہ شکل و صورت میں اپنی ماں سے مشابہ ہے لیکن اس کے سامنے جو عورت لیٹی تھی، اس کے تیکھے نقش تو جانے کہاں کھو گئے تھے؟ گوشت سے محروم چہرے پر ہڈیوں کے سوا کچھ نظر ہی نہیں آ رہا تھا۔ بس سیاہ آنکھیں تھیں جو دو گڑھوں میں دھنسی دروازے کی جانب نگراں تھیں۔ وہ لپک کر عورت کے قریب پہنچی اور اس کا ہاتھ تھام کر آنکھوں سے لگاتے ہوئے رو پڑی۔ روتے ہوئے اس کے ہونٹوں سے بس ایک لفظ نکل سکا۔

"ماں جی....." اور آگے آنسوؤں کے حلق میں پھنسے گولے نے اسے کچھ بولنے نہیں دیا۔

"اس..... لم۔" جواباً انہوں نے بالکل دھیمی نقاہت زدہ آواز میں ایک لفظ پکارا، وہ بھی ٹکڑوں میں۔ صاف ظاہر تھا کہ کمزوری اتنی زیادہ ہے کہ انہیں بولنے کا بھی یارا نہیں رہا۔

"میں آپ کو اسلم کے پاس لے جانے کے لیے آئی ہوں ماں جی۔" اس نے خود کو سنبھالتے ہوئے آنسو بھری آنکھوں کے ساتھ ان سے کہا۔ جواباً انہوں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے اوپر کی طرف دیکھا جس سے وہ یہی سمجھی کہ وہ اس حالت میں بھی اپنی ضد پر قائم ہیں اور بیٹے سے ملنے کے لیے راضی نہیں۔

"اسے معاف کر دیں ماں جی! وہ آپ سے بہت محبت کرتا ہے۔ آپ کی ناراضی کا خیال اسے سکون سے جینے نہیں دیتا اور وہ دن رات آپ سے ملنے کے لیے تڑپتا رہتا ہے۔" اس نے گلوگیر لہجے میں ان سے استدعا کی تو ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ پھر انہوں نے گویا اپنی تمام تر ہمت اور توانائی کو یکجا کرتے ہوئے ہونٹوں کو جنبش دی۔

"ما..... معاف کر دیا اسے، پر اب....." ان کی آواز دھیمی سے دھیمی ہوتی چلی گئی۔ ماہ بانو نے اپنے کان ان کے متحرک ہونٹوں سے تقریباً چپکا لیے۔ وہ ان کی زبان سے نکلنے والے ایک بھی لفظ کو سننے سے محروم نہیں رہنا چاہتی تھی۔

"ملنے کا وقت....." انہوں نے اپنا جملہ مکمل کرنا چاہا لیکن نہ کر سکیں۔ البتہ ماہ بانو نے ان کی بات کا مفہوم سمجھ لیا۔ وہ اسلم کو دل سے معاف کر چکی تھیں لیکن انہیں اپنی حالت کی وجہ سے امید نہیں تھی کہ بیٹے سے مل سکیں گی۔ پہلے بھی اشارے میں شاید انہوں نے اسے یہی بات سمجھانی چاہی تھی۔

"ایسی باتیں نہ کریں ماں جی! میں آپ کو اس کے پاس لے کر چلوں گی۔ ابھی آپ کو بہت دن جینا ہے تاکہ ہم آپ کی دعاؤں کے سائے میں زندگی گزار سکیں۔ ہم شادی کرنے والے ہیں ماں جی اور اس موقع پر آپ کا موجود ہونا بہت ضروری ہوگا۔ آپ کی دعاؤں کے بغیر اسلم کیسے دولہا بنے گا۔" وہ بہت زیادہ جذباتی ہو گئی تھی اور اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کس طرح اس تن مُردہ میں جان ڈال دے۔ بس دل میں یہی خیال تھا کہ اسلم کو دل و جان سے چاہنے والی ماں اس کی خوشی کا سن کر پھر سے جی اٹھے گی اس لیے شرم و حیا کو بھلا کر ان کے سامنے اپنی اور اسلم کی متوقع شادی کا ذکر کر ڈالا۔ اس ذکر کو سن کر بوڑھی نحیف آنکھوں میں خوشی کی رمق سی جاگی اور انہوں نے اپنا ہاتھ اس کے سر کی طرف بڑھایا۔ ان کا مقصد سمجھ کر اس نے اپنا سر ممکنہ حد تک جھکا لیا تاکہ انہیں زیادہ زحمت نہ کرنی پڑے۔ ان کا ہاتھ بس پل بھر کے لیے اس کے سر پر ٹکا اور واپس گر گیا۔ وہ فوراً ہی سر اٹھا کر ان کی طرف متوجہ ہوئی۔ گہری گہری سانسیں لیتی وہ اس بُری طرح ہانپ رہی تھیں جیسے نہ جانے کتنی مشقت سے گزری ہوں۔ اس نے پانی کی تلاش میں ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔ پلنگ کے بالکل قریب ہی اسے پھلوں کی دو پیٹیوں کو اوپر تلے رکھ کر بنائی گئی عارضی سی میز نظر آ گئی۔ وہاں دیگر سامان کے ساتھ پانی کا ایک کٹورا بھی رکھا تھا۔ اس نے جلدی سے وہ کٹورا اٹھایا۔ اس میں بس تھوڑا سا ہی پانی تھا اور وہ بھی کچھ اتنا صاف نہیں لگ رہا تھا کہ وہ عام حالات میں کسی انسان کو پلانے کا سوچتی لیکن یہاں حالات سخت مخدوش تھے۔ اسے معلوم تھا کہ اس دور دراز گاؤں میں پانی کی کس قدر قلت ہے۔ جیکب آباد سے مال گاڑی کے ذریعے ہفتے میں صرف دو دن آنے والے پانی تک اس بوڑھی کمزور عورت کی پہنچ ہونا ناممکن تھا چنانچہ اس نے دل پر جبر کر کے وہی کٹورا ان کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ پانی کے محض چند قطرے ان کے منہ کے اندر گئے اور باقی پانی باچھوں سے بہہ گیا اور اس سے قبل کہ وہ مزید پانی پلانے کی کوشش کرتی، انہیں ایک جھٹکا لگا اور وہ ساکت ہو گئیں۔

اس نے ہراساں سی ہو کر ان کی طرف دیکھا۔ وہ بالکل ساکت تھیں اور نیم وا آنکھوں کی پتلیاں غیر متحرک نظر آ رہی تھیں۔ وہ ششدر سی ان کے وجود کو ٹٹولنے لگی۔ نہ کہیں دھڑ

تھی اور نہ ہی سانسوں کی آمدورفت۔ وہ اتنی آسانی اور خاموشی سے دنیا کو خیرباد کہہ گئی تھیں کہ وہ قریب ہونے کے باوجود اندازہ نہیں کرسکی تھی۔ نزع کی تکلیف کا اس نے بہت ذکر سنا تھا۔ خود بھی اپنی آنکھوں کے سامنے کئی لوگوں کو مرتا دیکھ چکی تھی لیکن کبھی کسی کی روح اتنی آسانی سے نکلتے نہیں دیکھی تھی۔ اسلم کی ماں زینت بی بی یقیناً کوئی نیک خاتون تھیں جن کی روح قبض کرتے ہوئے فرشتۂ اجل نے بھی بہت نرمی سے کام لیا تھا۔ اس حادثے پر وہ کئی منٹ تک حیران پریشان سی بے یقینی کے عالم میں وہیں بیٹھی رہی پھر خیال آیا کہ زندگی کی ضرورتوں سے آزاد ہوجانے والی زینت بی بی کو بے گوروکفن تو نہیں چھوڑا جاسکتا۔ اس سلسلے میں ان کے پڑوسی ہی اس کے سب سے بہترین معاون ثابت ہوسکتے تھے چنانچہ وہ ان کے گھر سے باہر نکلی اور بالکل دیوار سے جڑے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔

”کون ہو بی بی؟“ ایک ادھیڑ عمر عورت دروازے پر آئی اور اسے دیکھ کر حیرت سے پوچھنے لگی۔

”میں آپ کے برابر والے گھر سے آئی ہوں۔ آپ میرے ساتھ چلیں۔ زینت بی بی کا انتقال ہوگیا ہے۔“ اس نے اسلم کے گھر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے عورت کو اطلاع دی جسے سن کر اس کے چہرے پر دکھ کے تاثرات ابھرے لیکن پھر وہ بڑی بے رخی سے بولی۔

”ابھی میں مصروف ہوں، بعد میں آجاؤں گی۔“ اپنی بات کہہ کر اس نے اسے ذرا بھی مہلت نہیں دی اور دروازہ بند کرلیا۔ وہ حیران پریشان سی کھڑی رہ گئی۔ ایسی سردمہری اور بے اعتنائی تو اس نے شہروں میں بھی نہیں دیکھی تھی۔ لوگ کسی کی خوشیوں میں شامل ہوں نہ ہوں لیکن ایسے برے وقت میں تو بہرحال تھوڑا بہت ساتھ دے ہی دیتے ہیں۔ گاؤں دیہاتوں کی تو پھر بات ہی الگ تھی۔ لوگ ایک دوسرے کی چھوٹی بڑی خوشیوں اور غموں میں شامل ہونا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ لیکن یہاں جانے کیا بات تھی کہ زینت بی بی کی قریب ترین پڑوسن نے بھی اس کے مرنے پر بے رخی کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس صورت حال پر وہ مایوس اور افسردہ سی تھکے تھکے قدموں سے واپس اسلم کے گھر کی طرف چل پڑی۔ ڈھول میں اسے اس گھر میں اسلم کی ماں کی لاش موجود تھی اور وہ اسے تنہا نہیں چھوڑ سکتی تھی۔

زینت بی بی کے کمرے میں پہنچ کر اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ چند لمحے پہلے جس پڑوسن نے شدید بے اعتنائی کا مظاہرہ کیا تھا، وہ زینت بی بی کے مردہ جسم سے لپٹی بری طرح رو رہی تھی۔ وہ اس معمے کو سلجھانے کی کوشش کرتے ہوئے اسے پیٹھ پر ہاتھ پھیر کر دلاسا دینے لگی۔ آخر کچھ دیر بعد عورت نے خود کو سنبھال ہی لیا اور سیدھی بیٹھ کر اپنی آنکھوں میں آئے آنسو خشک کرتے ہوئے بولی۔

”معاف کرنا بیٹی! میں نے مجبوری میں تمہارے ساتھ وہ سلوک کیا تھا۔ مجھے تمہارے پیچھے کافی فاصلے پر نواز چانڈیو کھڑا ہوا نظر آگیا تھا اس لیے میں نے تمہارے ساتھ وہ سلوک کیا۔ وہ بہت کمینہ آدمی ہے۔ اگر میں تمہارے ساتھ فوراً ادھر آجاتی تو وہ میری بچی کا جینا اور بھی مشکل کردیتا۔“

”میں کچھ بھی نہیں خالہ۔“ اس کے لیے عورت کے وہ جملے واقعی ناقابل فہم تھے اس لیے بے بسی سے بولی۔

”ہاں، تم کیسے سمجھوگی.....“ عورت نے ایک گہرا سانس لیا پھر اس کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے پوچھنے لگی۔ ”تم زینت بی بی کی کون ہو؟ میں نے اس سے پہلے بھی تمہیں یہاں نہیں دیکھا۔“ جواب میں اس نے وہی کہانی دہرادی جو اس سے قبل نواز چانڈیو کو سنائی تھی۔

”خیر..... تم جو بھی ہو لیکن مجھے یقین ہے کہ تم زینت اور اس کے بیٹے کی ہمدرد ہو اس لیے تمہیں تفصیل بتادیتی ہوں۔“ عورت کا انداز ایسا تھا جیسے اسے ماہ بانو کی بات پر یقین نہ آیا ہو لیکن اس نے بحث نہیں کی اور گفتگو پر آمادہ نظر آنے لگی۔

”تمہیں پتہ تو معلوم ہوگا نا کہ زینت کا بیٹا اسلم ایک بھاگا ہوا مجرم ہے اور یہاں اس کے خون کے پیاسے آج بھی اس کا انتظار کررہے ہیں؟“ اس نے شاید بہت سی تفصیل میں جانے سے بچنے کے لیے اس سے یہ سوال کیا تھا۔ ماہ بانو نے فوراً ہی اثبات میں سرہلادیا۔

”بس سارا کھیل ہی اس انتقام کا ہے۔ اسلم نے جسے قتل کیا تھا، اس کے گھر والے آج بھی بدلہ لینے کے لیے بے چین ہیں۔ اسلم کے یہاں سے بھاگنے کے بعد انہوں نے بے چاری زینت بی بی کا جینا مشکل کردیا تھا۔ اسے مزدوری بھی بہت مشکل سے ملتی تھی اور پینے کے پانی کا کوٹا بھی۔ میں پڑوسی ہونے کی وجہ سے اس کی تھوڑی بہت مدد کردیا کرتی تھی۔ زینت کا مجھ پر ایک احسان بھی تھا کہ اس نے میری بیٹی فاخرہ کو اپنا دودھ پلایا تھا۔ فاخرہ کی پیدائش پر میں اتنی بیمار ہوگئی تھی کہ اسے دودھ ہی نہیں پلاسکی تھی۔ دودھ کے رشتے سے فاخرہ بھی زینت سے بالکل ماں جیسی محبت کرتی تھی اور ہروقت اس کی خدمت کے لیے تیار رہتی تھی۔ دشمنوں کو اس کی یہ ادا اچھی نہیں لگی اور ظالم نواز چانڈیو نے میری بچی کو اغوا کرکے ہمیں یہ پیغام بھجوادیا کہ لڑکی کا میرے ساتھ نکاح پڑھوادو ورنہ میں اس کی عزت برباد کردوں گا۔ نواز چانڈیو عمر میں فاخرہ سے بہت بڑا ہے پھر اس کی پہلے سے شادی بھی ہوچکی تھی۔ لیکن وہ وقت ایسا تھا کہ ہم اس کی بات ماننے پر مجبور ہوگئے۔ اگر نہ مانتے تو عزت بھی جاتی اور فاخرہ کی کہیں شادی بھی نہ ہوپاتی۔ شادی کے بعد اس ظالم نے میری پھول جیسی بچی پر بہت ظلم کیا اور ہمیں بھی پیغام بھجوادیا کہ اگر ہم نے زینت بی بی کے ساتھ میل جول رکھا تو وہ فاخرہ کے ساتھ اور ظلم کرے گا۔ بس پھر ہم نے مجبوراً زینت سے کھلے بندوں ملنا چھوڑ دیا۔ وہ تو شکر تھا کہ ہماری برسوں کی گہری محبت کی وجہ سے دونوں گھروں کے درمیان ایک کھڑکی موجود تھی۔ میں اس کھڑکی سے ہی کبھی کبھار زینت سے بات کرلیا کرتی تھی اور تھوڑی بہت مدد بھی کردیتی تھی۔ زینت بڑی ہمت والی عورت تھی۔ میں نے کئی بار اسے کہا بھی کہ یہاں سے نکل کر کہیں اور چلی جائے لیکن وہ اپنا علاقہ چھوڑنے پر راضی نہیں ہوئی اور جو بھی تھوڑی بہت روکھی سوکھی کما کر کھاسکتی تھی، اس پر گزارہ کرتی رہی۔ شاید بیٹے سے ناراضی کے باوجود اسے یہ آس بھی تھی کہ ایک دن وہ لوٹ کر یہیں آئے گا۔ بیچ میں ایک بار وہ آیا بھی تھا لیکن تب حالات اتنے بگڑے نہیں تھے اس لیے زینت کی ضد بھی قائم تھی۔ بہرحال، قصہ مختصر یہ کہ زینت یہاں رہتی رہی اور حالات کی چکی میں پستی رہی۔ پچھلے ایک مہینے سے اس کی حالت اچھی نہیں تھی۔ بیماری میں نہ دوا تھی اور نہ غذا..... نہ ہی کوئی خدمت کرنے والا۔ میں ہی ڈرتے ڈرتے ایک آدھ چکر لگا لیتی تھی لیکن صفائی وغیرہ نہیں کرتی تھی کہ کہیں اچانک چانڈیو خاندان کا کوئی فرد ادھر آجائے اور صاف ستھرا گھر دیکھ کر شک میں پڑ جائے۔ آج پورے دن سے بھی میرا یہاں آنا نہیں ہوسکا تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ آج زینت کی زندگی کا آخری دن ہے۔ ورنہ کسی طرح آہی جاتی۔“ اپنی بات کے اختتام پر اس نے پھر سے رونا شروع کردیا جبکہ ماہ بانو کے ذہن کی بہت سی گتھیاں سلجھ گئیں۔ اسے سمجھ آگئی کہ نواز چانڈیو کے ساتھ موجود عورت فاخرہ ہی تھی جس نے اسے یہاں سے بھاگ جانے کا مشورہ دیا تھا۔ وہ نہ تو تب اس مشورے پر عمل کرسکی تھی اور نہ ہی اب کرسکتی تھی۔ اس کے لیے اسلم کی ماں کی لاش کو بے گوروکفن چھوڑ کر جانا منظور نہیں تھا اس لیے اس کی باعزت تدفین تک یہیں رکنا چاہتی تھی۔

”اب ان کی تدفین کا انتظام کیسے ہوگا؟“ اس نے عورت سے پوچھا۔

”میں مجبور ہوں بیٹی، کچھ نہیں کرسکتی۔ تم گاؤں کے دوسرے لوگوں سے بات کرکے دیکھو۔ میں تو اب یہاں زیادہ دیر رک بھی نہیں سکتی۔ کسی اور نے مجھے یہاں دیکھ لیا تو نواز کو بھی خبر ہوجائے گی۔“ وہاں سے بے بس سا جواب آیا۔

”ٹھیک ہے۔ آپ جائیں۔ میں خود ہی کچھ کرتی ہوں۔“ ماہ بانو نے پُرخیال انداز میں عورت سے کہا اور خود گھر سے باہر کا رخ کرلیا۔ عام حالات میں لواحقین اپنے مردے کو تنہا چھوڑنا کبھی گوارا نہیں کرتے۔ خود اسے بھی زینت بی بی کی لاش کو تنہا چھوڑ کر جانا اچھا نہیں لگ رہا تھا لیکن مجبوری یہی تھی کہ اس کے باہر نکلے بغیر ان کی باعزت تدفین ممکن ہی نہیں تھی۔

اپنے ذہن میں آئے منصوبے کے تحت وہ وہاں سے نکل کر نواز چانڈیو کے گھر کی طرف روانہ ہوگئی اور اس کے دروازے پر پہنچ کر زوردار دستک دی۔ دستک کے جواب میں نواز سے مشابہ مگر عمر میں چند سال کم، ایک آدمی دروازے پر نمودار ہوا۔

”مجھے نواز چانڈیو سے ملنا ہے۔“ اس نے اس آدمی کے سوال کرنے سے قبل ہی اپنا مدعا بیان کیا۔

”میں یہاں ہوں بی بی..... کیا کام ہے؟“ فوراً ہی اسے اپنے عقب سے آواز آئی۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ نواز اس کے بالکل پیچھے کھڑا تھا، یعنی اسلم کی پڑوسن صحیح کہہ رہی تھی۔ وہ اسلم کے مکان کے اردگرد ہی کہیں چھپ کر اس کی نگرانی کرتا رہا تھا اور اسے اپنے گھر کی طرف آتا دیکھ کر پیچھے ہی آگیا تھا۔

”مجھے آپ سے ایک ضروری کام تھا اس لیے یہاں آئی تھی۔“ اپنے اندر اٹھتی ناگواری کی لہر کو دباتے ہوئے اس نے تحمل سے بات کا آغاز کیا۔

”ضرور کرو جی لیکن پہلے اندر تو آؤ۔ اوئے سرفراز..... راستہ دے بی بی کو۔“ اس نے اسے پیشکش کرنے کے ساتھ اب تک دروازے میں کھڑے شخص کو حکم دیا۔

”شکریہ بھرا۔“ اس نے فوراً حکم کی تعمیل کی لیکن ماہ بانو نے قدم آگے نہیں بڑھائے اور لجاجت سے بولی۔

”میں زیادہ دیر یہاں نہیں رک سکتی۔ مجھے فوراً زینت بی بی کے گھر واپس جانا ہے۔ میں اسے اپنے ساتھ لے جانے کے لیے یہاں آئی تھی لیکن وہ بے چاری تو میرے گھر میں قدم رکھتے ہی مرگئی اب میں اس کے لیے اور تو کچھ کر نہیں سکتی اس لیے اس کے کفن دفن کا انتظام کرنا چاہتی ہوں۔ یہاں گاؤں میں میری آپ کے سوا کسی سے جان پہچان بھی نہیں ہے اس لیے آپ کے گھر چلی آئی۔ زینت خالہ کی پڑوسن تو بہت عجیب عورت تھی۔ میری بات ڈھنگ سے سنی بھی نہیں اور دروازہ بند

کرلیا۔" نواز چانڈیو سے اپنی آمد کا مقصد بیان کرتے ہوئے اس نے دانستہ پڑوسن کا ذکر کیا..... کیونکہ وہ جانتی تھی کہ نواز نے اسے وہاں جاتے ہوئے دیکھا تھا اور وہ اس ذکر کو گول کر کے اپنے بارے میں شک کا موقع نہیں دینا چاہتی تھی۔

"اوہ..... تو آخر بڑھیا مر ہی گئی۔" نواز کے کوئی جواب دینے سے قبل سرفراز نے نفرت سے کہا لیکن ماہ بانو نے دیکھا کہ نواز نے اسے آنکھ کا اشارہ کر کے خاموش رہنے کو کہا اور خود اس کی طرف متوجہ ہوا۔

"ٹھیک ہے بی بی..... تم جو چاہتی ہو کرو۔ ہم تمہیں روکنے ٹوکنے والے کون ہوتے ہیں؟"

"میرا مطلب یہ تھا کہ آپ اس سلسلے میں میری مدد کریں۔ کفن دفن پر جو خرچہ ہوگا، وہ تو میں خود دے دوں گی لیکن ظاہر ہے مجھے یہاں کے بارے میں کچھ معلوم نہیں کہ کون لوگ یہ کام کر سکتے ہیں۔ آپ میری ایسے لوگوں سے ملاقات کروا دیں۔" وہ اپنی عمر سے کہیں بڑھ کر بردباری اور سمجھداری سے کام لے رہی تھی۔

"ارے غیروں سے کیا مدد لینا بی بی۔ فون کر کے بڑھیا کے بیٹے کو بلوا لو۔ ساری حیاتی اِدھر اُدھر موج کرتے ہوئے گزار لی۔ اب کم سے کم اپنی ماں کو آ کر قبر میں تو اتار دے۔" نواز چانڈیو کی بہت بے نیازی سے کہی اس بات میں بڑی گہرائی تھی۔ ماہ بانو کا دل سن کر زور سے دھڑکا۔ یعنی نواز نے بھی اس کی کہانی کو قبول نہیں کیا تھا اور اس شک میں مبتلا تھا کہ اسے اسلم نے یہاں بھیجا ہے یا کم سے کم یہ کہ وہ اسلم سے رابطے میں تو ضرور رہی ہے۔

"میں کہاں سے اسے فون کروں؟ مجھے کیا معلوم کہ وہ کہاں ہے اور کہاں نہیں؟" اس نے ذرا تیز لہجے میں نواز کی بات کا جواب دیا۔

"تمہارا بھی عجیب ہی قصہ ہے۔ نہ جانے اچانک کہاں سے زینت بی بی کی رشتے دار بن کر ٹپک پڑی ہو ورنہ دیکھنے میں تو کسی طرح اس کی برادری کی نہیں لگتیں۔ تمہاری تو بول چال بھی بالکل الگ ہے۔" جواباً نواز نے بھی چڑچڑے پن کا مظاہرہ کرتے ہوئے جو بات کہی، اس سے اس کے اندر کا شک اور بھی ظاہر ہو گیا۔

"میرے شوہر کا تعلق پنجابی خاندان سے ہے۔ ان سے شادی ہونے کی وجہ سے میری بول چال پر بھی اثر پڑا ہے لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ تم مجھے زینت خالہ کا رشتے دار ماننے سے انکار کر دو۔ اگر میری ان سے رشتے داری نہ ہوتی تو مجھے کیا ضرورت پڑی تھی کہ اتنا لمبا سفر کر کے یہاں آتی۔ ان کی کون سی یہاں زمینیں جائیدادیں ہیں جن پر مجھے قبضہ کرنا ہے یا اپنا حصہ لینا ہے۔" اس نے حاضر جوابی سے کام لے کر اپنے دفاع میں دلائل دیے۔

"مجھے بھی تو حیرت ہے کہ اتنے برسوں بعد تم یہاں پہنچیں کیسے؟ تمہیں کس نے بتایا کہ زینت بی بی اکیلی ہے؟" اس کی بحث ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ ماہ بانو اس ساری حجت کا مقصد سمجھ رہی تھی۔ وہ اس سے بحث کر کے کسی نہ کسی طرح یہ اندازہ لگانا چاہ رہا تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہی ہے، اس میں سچائی بھی ہے یا پھر وہ اسلم کی طرف سے وہاں بھیجی گئی ہے۔

"رشتے داروں کو آپس میں ایک دوسرے کے حالات معلوم ہو ہی جاتے ہیں۔ مجھے بھی کافی عرصے سے زینت خالہ کے بارے میں معلوم تھا لیکن تم اسے میری خود غرضی سمجھ لو کہ اب جبکہ میں خود تنہا رہ رہی ہوں تو مجھے اپنا اکیلا پن دور کرنے کے لیے ان کا خیال آ گیا، ورنہ شاید میں اب بھی یہاں کا رخ نہ کرتی۔" اس نے بالکل حقیقی اداکاری کرتے ہوئے خود کو ایک ایسی خود غرض رشتے دار ظاہر کیا جسے اپنی غریب خالہ ضرورت کے وقت ہی یاد آئی تھی لیکن اب وہ اس کی موت کے بعد اپنے رویے پر شرمسار تھی۔ اس کی اداکاری اور الفاظ کے چناؤ نے شاید نواز چانڈیو کو بھی متاثر کیا تھا کیونکہ وہ کچھ تذبذب کا شکار نظر آ رہا تھا۔

"میں لاکھ خود غرض سہی لیکن اب میرے لیے یہ ممکن نہیں کہ میں زینت خالہ کو کفنائے دفنائے بغیر یہاں سے چلی جاؤں۔ اگر تم میری مدد کرو تو میں جلد از جلد اس کام سے فارغ ہو کر آج ہی یہاں سے روانہ ہو سکتی ہوں۔ زینت خالہ کا گھر میں نے دیکھا ہے۔ اس کی حالت تو اتنی خراب ہے کہ بندہ دو چار گھنٹے بھی گزار لے تو بڑی بات ہے، پوری رات گزارنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" اس نے لوہا گرم دیکھ کر ایک اور ضرب لگانے کی کوشش کی۔ ویسے یہ حقیقت تھی کہ وہ جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہتی تھی۔ یہاں عدم تحفظ کے احساس کے علاوہ اسے اسلم کے پاس بھی وقت پر واپس لوٹنے کی جلدی تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اس کے واپس پہنچنے تک وہ بے کل رہے گا۔

"چنگی گل ہے بی بی! تمہارے کہنے پر ہم سارا بندوبست کر دیتے ہیں..... ورنہ فرض تو یہ بڑھیا کے بیٹے کا بنتا تھا کہ آ کر اپنی ماں کو مٹی دیتا، پر ایسے ڈاکو لٹیروں کو ماں بہنوں کی فکر ہی کہاں ہوتی ہے۔" نواز چانڈیو نے اس پہ احسان جتاتے ہوئے آخر ہامی بھر ہی لی۔ ماہ بانو نے اس سے

اخراجات کا تخمینہ لگوا کر اپنے شولڈر بیگ سے رقم نکال کر اسے تھمائی اور واپس زینت بی بی کے گھر کی طرف چل دی۔ آہستہ آہستہ وہاں گاؤں کی عورتیں بھی جمع ہونا شروع ہو گئیں۔ ان عورتوں نے مل کر گھر کی صفائی ستھرائی کی اور زینت بی بی کو آخری سفر کے لیے غسل دے کر کفن پہنا دیا۔ ماہ بانو ہر کام میں ان عورتوں کے ساتھ پیش پیش رہی۔ اس دوران اسے عورتوں کی دبی دبی زبان میں کی جانے والی گفتگو سے یہ اندازہ ہو گیا کہ گاؤں میں زینت بی بی کے مرنے کی خبر عام کرنے والا نواز چانڈیو ہی تھا۔ عورتوں کو اس امر پر حیرت تھی کہ نواز چانڈیو سب سے بڑا دشمن ہو کر زینت بی بی کی تجہیز و تدفین میں کیسے پیش پیش ہے؟ کوئی اسے خوفِ خدا، تو کوئی نئی چال گردان رہی تھی۔ انہی عورتوں کی باتوں سے اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ چانڈیو گھرانے کے سب ہی مرد بڑے غصیلے اور ہتھ چھٹ ہیں اسی وجہ سے گاؤں کے زیادہ تر لوگ ان سے دبتے تھے اور زینت بی بی کے معاملے میں بھی کھل کر ان کی مخالفت نہیں کر سکے تھے۔

وہ بلا تبصرہ ان عورتوں کی باتیں سنتی رہی۔ ان عورتوں کو اس کے بارے میں بھی بہت تجسس تھا کہ وہ کون ہے اور کس حوالے سے زینت بی بی کی رشتے دار ہوتی ہے؟ اس نے انہیں بھی وہی کچھ بتایا جو نواز چانڈیو کو بتا چکی تھی اور زیادہ گہرائی میں جا کر معلومات کرنے کا موقع دیے بغیر قرآن شریف کی تلاوت کرتی رہی۔ اس طرح اسے عورتوں کے سوال جواب سے بھی نجات مل گئی اور اسلم کی ماں کی بے بس موت پر مضمحل ہوتے دل کو بھی خاصا سکون ملا۔

اس کی خواہش کے مطابق نواز چانڈیو نے سارے مراحل سرعت سے مکمل کروا دیے تھے اور زینت بی بی کو آخری آرام گاہ تک پہنچانے کے بعد بھی اتنی مہلت تھی کہ وہ وہاں سے روانہ ہو سکتی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ نواز چانڈیو خود بھی کسی وجہ سے اس کی وہاں سے جلد از جلد روانگی کا متمنی ہے، جب ہی اس کے بولے بغیر خود ہی واپسی کا ٹکٹ بھی لے آیا۔ اس نے کسی قسم کے شک کا اظہار کیے بغیر قیمت ادا کر کے شکریے کے ساتھ ٹکٹ وصول کر لیا۔ بوجھل دل اور قدموں کے ساتھ جب وہ اس چھوٹے سے گاؤں سے روانہ ہو رہی تھی جہاں سے اسلم کا آخری رشتہ بھی ٹوٹ چکا تھا تو تمام تر اندرونی کیفیات کے باوجود پوری طرح الرٹ تھی۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں یہاں سے اس کا تعاقب کر کے کوئی اسلم تک پہنچنے کی کوشش نہ کرے۔ لیکن اپنے ارد گرد اسے ایسا کوئی چہرہ نظر نہیں آیا۔ یہاں تک کہ نواز چانڈیو بھی اسے سوار کروانے کے بعد الوداعی انداز میں ہاتھ ہلاتا ہوا رخصت ہو گیا۔

اس کے جانے کے تھوڑی دیر بعد ہی بس چل پڑی اور تھکی ہاری غم زدہ ماہ بانو نے بھی آخرکار آنکھیں بند کر کے سر پشت گاہ سے ٹکا لیا۔ اس بس کو لگے بندھے مخصوص راستوں پر چل کر طے شدہ منزل پر ہی پہنچنا تھا چنانچہ کوئی اس کے تعاقب میں تھا یا نہیں، اس بارے میں خود کو فی الحال ہلکان کرنا بیکار تھا۔

☆☆☆

"تمہاری کارکردگی ہماری توقعات سے بہت کم ہے مسٹر چوہدری! کوئی بڑا کام کرنا تو دور کی بات، تم تو ابھی تک اپنے کارخانے میں بھروسے کے نچلے درجے کے ملازمین کا بھی ڈھنگ سے بندوبست نہیں کر سکے ہو۔ میرے آدمی کام شروع کرنے کے لیے بالکل تیار ہیں لیکن جب تک ان کی سکیورٹی کا ڈھنگ سے بندوبست نہیں ہوتا، میں انہیں وہاں نہیں بھیج سکتا۔ وہ معمولی لوگ نہیں ہیں۔ ہم نے ڈالروں کی برسات کر کے ایک ایک ایکسپرٹ کو تیار کیا ہے۔ اگر تمہاری غفلت نے انہیں ذرا سا بھی گزند پہنچایا تو میں تمہاری بنیادیں تک ہلا کر رکھ دوں گا۔ ہم وہ لوگ ہیں جو چاہیں تو حکومتوں کے تختے الٹ دیں، تمہارے جیسے فیوڈل لارڈز کو تو ہم پیروں کی خاک بھی نہیں گردانتے۔ اگر کبھی تم پر ہمارا غضب نازل ہوا تو سمجھو زمین پر تمہارا نام و نشان بھی نہیں ملے گا۔" دوسری طرف مسٹر الفا کے نام سے اسے اپنا تعارف کروانے والا وہ کٹ کھنا بلا تھا جس نے لندن میں اس سے ملاقات کی تھی اور بڑی آسانی سے لنڈا کو اس کے پہلو سے نکال کر لے گیا تھا۔ مسٹر الفا نے اسے لندن بلا کر تفصیلی ملاقات کی تھی اور بتایا تھا کہ اس کے جوتوں کے کارخانے کو آگ لگا دی گئی ہے تاکہ وہاں تعمیر نو کے بہانے ایک ایسا تہ خانہ بنایا جائے جو زیر زمین ہیروئن کی تیاری کے لیے لیبارٹری کا کام دے سکے۔ لیبارٹری کا نقشہ بھی اس نے تیار کروا دیا تھا اور وہاں ضروری مشینوں کی تنصیب اور عملے کی فراہمی بھی اپنے ذمے رکھی تھی۔

چوہدری کو صرف اتنا کرنا تھا کہ وہاں کی حفاظت اور کام کاج کے لیے ایسے افراد کا بندوبست کر دے جو وفادار بھی ہوں اور لڑنے بھڑنے میں ماہر بھی۔ اس لیبارٹری میں پیرآباد سے متصل جنگلات میں کاشت کی جانے والی افیون سے ہیروئن سازی کا کام ہونا تھا۔ چوہدری کے ہی تعاون سے کاشت کی جانے والی اس افیون کو وہ لوگ پہلے ہی تجربے کی بھٹی سے گزار کر پرکھ چکے تھے کہ اس سے تیار ہونے والی ہیروئن کسی طرح معیار میں اس ہیروئن سے کم نہیں جو شمالی

علاقہ جات میں کاشت کی گئی افیون سے تیار کی جاتی رہی ہے۔ چودھری نے اندازہ لگایا تھا کہ الفا اور اس کے دوسرے ساتھی بہت چالاک ہیں اور انہوں نے اس امر پر پوری طرح نظر رکھی ہوئی ہے کہ اگر کبھی شمالی علاقہ جات میں ان کے قدم اکھڑ جائیں تو مستقبل میں انہیں اپنا کاروبار چلانا مشکل نہ ہو۔ پنجاب کے ایک منفرد خصوصیات رکھنے والے جنگل میں افیون کی کاشت سے لے کر چودھری کے کارخانے کو ہیروئن سازی کی لیبارٹری میں تبدیل کرنے تک ان کے منصوبہ ساز ذہن کی ساری ہوشیاری نمایاں تھی۔ وہ مہینوں یا سالوں کے بجائے نسلوں تک کی منصوبہ بندی کرنے والے لوگ تھے جنہوں نے آنے والے خطرات کو قبل از وقت بھانپ کر اپنی کارروائی شروع کر دی تھی۔ لیکن چودھری اپنے خانگی مسائل میں الجھ جانے کے باعث قابل اطمینان کارکردگی نہیں دکھا سکا تھا اور اب اپنی صرف "ہیلو" کے جواب میں الفا کی نان اسٹاپ پھٹکار سن رہا تھا۔ بے ذلت دولت کے لالچ میں اس نے خود مول لی تھی اور آقا سے محکوم بننے کے ذلت آمیز تجربے سے گزر رہا تھا۔ پھر بھی مطمئن تھا کہ یہ ذلت بڑے محدود پیمانے پر ہے اور صرف وہ خود ہی اس سے واقف ہے ورنہ باقی لوگوں پر تو ان کا سکہ اب بھی پہلے ہی جیسا چلتا ہے۔ اس محدود ذلت کے مقابلے میں اس کے نیلے ڈالروں میں بڑھتے بینک بیلنس کی زیادہ اہمیت تھی جو ماضی میں تمام تر بے ایمانی اور مظالم کرنے کے باوجود بھی اتنی تیزی سے نہیں بڑھا تھا، چنانچہ اپنے بدلتی آقا کو منانے کے لیے خوشامدی لہجے میں بولا۔

"آپ کو تو معلوم ہے سر کہ میری بیوی کا انتقال ہو گیا ہے۔ میں ذرا اس کی آخری رسومات وغیرہ کی ادائیگی میں مصروف تھا۔ آپ اطمینان رکھیں، اب دوبارہ آپ کو شکایت نہیں ہوگی۔"

"دوبارہ شکایت ہوئی تو میں تمہارا اطمینان رخصت کر دوں گا کیونکہ مجھے بھی معلوم ہے کہ تمہاری بیوی کی موت کے طبعی ہونے کا امکان بہت کم ہے اور ائرپورٹ سے تم جو تابوت لاد کر اپنے گاؤں تک لے گئے تھے، وہ برطانیہ تو کیا کسی بھی بیرون ملک سے نہیں لایا گیا۔ میرے خیال میں اگر میں اس سلسلے میں تمہارے بیٹے کو بریف کر کے تمہاری بیوی کی قبر کشائی اور پوسٹ مارٹم پر اکساؤں تو ایسے کچھ انکشافات ہوں گے جن کے بعد تمہارے لیے اپنے بیٹے سے سامنا کرنا ممکن نہیں رہے گا۔" اس کا لہجہ صد درجے زہریلا تھا۔

چودھری پہلی بار صحیح معنوں میں اندر تک کپکپا گیا۔ نیویارک جاتے ہوئے ڈیوڈ سے ٹکراؤ ہونے سے لے کر اب تک وہ لوگ اس پر دو ہی حربے آزماتے رہے تھے۔ ایک لالچ دوسرا بلیک میلنگ۔۔۔۔ لیکن آج کی بلیک میلنگ سب سے سوا تھی۔ وہ اپنے اکلوتے بیٹے کے سامنے یہ راز کسی صورت کھلتے نہیں دیکھ سکتا تھا کہ اس نے خود وڈی چودھرائن کو ہلاک کروایا ہے۔ وہ لاکھ مہذب و مؤدب سہی لیکن اپنی ماں کے قتل کو کسی صورت معاف نہیں کر سکتا تھا۔ چودھری کو اندازہ تھا کہ مسٹر الفا نے اسے جو دھمکی دی ہے، وہ کھوکھلی نہیں ہو گی۔ وہ لوگ جو لندن میں بیٹھے بیٹھے اس کے کارخانے کو آگ لگوا دیں اور عمارت کا پرانا نقشہ حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ نیا نقشہ بھی بنا کر اس کے سامنے رکھ دیں، ان کی رسائی اور اختیار کے بارے میں کوئی شک کیا ہی نہیں جا سکتا تھا۔

"میں نے کہا ہے۔۔۔ سر کہ میری طرف سے آپ کو دوبارہ شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔ آپ میری بات پر یقین رکھیں۔" اس نے کنپٹی سے بہہ کر گردن کی طرف جاتی پسینے کی لکیر کو صاف کیے بغیر ہکلاتے ہوئے یقین دہانی کروائی۔

"اچھی بات ہے۔ اب تم ذرا دوبارہ سے اپنے لیے مقرر کیے ہوئے کام ذہن نشین کر لو۔ آدمیوں کی تقرری کے بعد تمہیں ایسے افراد سے رابطہ کرنا ہو گا جو ہماری تیار کی گئی ہیروئن کی مقامی مارکیٹ میں کھپت کے ساتھ ساتھ بیرون ملک سپلائی میں بھی کام آ سکیں۔ پہلی کیٹگری کے لیے بظاہر عزت دار لیکن جرائم کی دنیا سے وابستہ لوگوں سے رابطہ کرنا مناسب رہے گا جبکہ دوسری کیٹگری کے لیے مکمل طور پر عزت دار لوگ مناسب رہیں گے۔ آگے تم خود اپنی صوابدید کے مطابق بھی کام کر سکتے ہو۔ مجھے اصل غرض نتائج سے ہے کیونکہ تم جانتے ہو کہ مارکیٹ میں ہیروئن کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ پہلے سے موجود لوگوں کی موجودگی میں ہمارے مال اور آدمیوں کو اپنی جگہ بنانے میں مشکل ہوگی۔ اور ہاں، یہ خیال رکھنا کہ ہمارے کچھ آدمی پہلے ہی سے اس میدان میں کام کر رہے ہیں۔ تم بے خبری میں کہیں ان سے الجھ مت بیٹھنا۔" اسے مکمل طور پر دبا لینے کے بعد مسٹر الفا نے اپنی ہدایات اور احکامات جاری کرنے شروع کر دیے۔

"او کے سر! باقی سب کچھ تو میں آپ کی ہدایات کے مطابق کر لوں گا لیکن مارکیٹ میں پہلے سے اپنے آدمیوں کی موجودگی والی بات نے مجھے الجھن میں ڈال دیا ہے۔ میں ان آدمیوں سے واقف نہیں ہوں اس لیے لاعلمی میں ہمارے آدمیوں کے آپس میں تصادم کی نوبت آ سکتی ہے۔" چودھری نے اسے اپنی مشکل کا احساس دلایا۔

"پہلی بات تو یہ یاد رکھو کہ تمہیں کوئی بالکل نچلے درجے پر کام نہیں کرنا ہے۔ نہ ہی تم چھوٹے موٹے جرائم پیشہ افراد سے رابطے میں رہو گے۔ تمہیں ان معروف مجرموں سے رابطے میں رہنا ہے جو مختلف طرح کی تجارت یا کاروبار کی آڑ میں ہیرا پھیری کے کام کرتے ہیں، یا ذرا سے لالچ کے لیے کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ آگے وہ اپنے نیٹ ورکس خود بنائیں گے البتہ تمہارا ہر ایک سے باعلم ہونا ضروری ہے۔ رہی آپس میں تصادم کی بات تو یہ یاد رکھنا کہ براہ راست اور فوری تصادم سے ہر حال میں گریز کرنا ہے۔ اس قسم کی صورت حال سامنے آنے پر پہلے کنفرمیشن ضروری ہے۔

"یہاں میں تمہیں یہ بھی بتا دوں کہ جلد میں تمہیں ایک اسپیشل موبائل فون بھجوانے والا ہوں۔ اس فون کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی کالز ٹریس کرنا بہت مشکل بلکہ ناممکن ہو گا۔ موبائل میں خاص طور پر ایک ایسا سسٹم انسٹال کیا گیا ہے کہ اگر کسی نے کال ٹریس کرنے یا ریکارڈ کرنے کی کوشش کی تو خودبخود رابطہ منقطع ہو جائے گا۔ اس موبائل سیٹ سے تم محدود پیمانے پر میسجز بھی بھیج سکتے ہو۔ یوں سمجھ لو کہ تم اس سے جو میسج سینڈ کرو گے، وہ صرف مخصوص لوگوں تک ہی جا سکے گا۔ کسی مسئلے کی صورت میں تمہیں میسج کا ہی استعمال کرنا ہو گا۔ مجھ سمیت چند خاص لوگ اس میسج کو پڑھ سکیں گے اور تمہیں بروقت ہدایات مل جائیں گی۔ یہ چند موٹی موٹی باتیں ہیں جو میں نے تمہیں بتا دی ہیں، باقی جب سیٹ تمہارے ہاتھ آئے گا تو تم خود بھی اس کی خصوصیات جان لو گے۔ بعد میں، میں بھی وقت کے ساتھ ساتھ تمہیں آگاہ کرتا رہوں گا۔" الفا کا لہجہ اب خاصا نرم ہو گیا تھا جس پر چودھری نے سکون کا سانس لیا۔

"شکریہ سر! میں بے چینی سے آپ کے اس تحفے کا انتظار کروں گا۔" الفا کے نرم لہجے کے باوجود وہ اس سے موبائل فون سیٹ کو بھیجنے کے وقت اور طریقے کے بارے میں استفسار نہیں کر سکا۔

"او کے، بائے۔" اس نے رابطہ منقطع کر دیا اور چودھری بے ساختہ ہی رومال کی مدد سے چہرے پر بہنے والے پسینے کی لکیریں صاف کرنے لگا۔

"میں اندر آ جاؤں ابا جی!" وہ مراد شاہ تھا جو دروازے کے باہر کھڑا اس سے پوچھ رہا تھا۔

"آ ہو پتر! آ جا، تینو بھلا اجازت لینے کی کی لوڑ ہے۔" اپنے ولی عہد کی آواز سن کر وہ بری طرح چونکا اور اس گھبراہٹ میں کہ کہیں اس نے اس کی ٹیلی فونک گفتگو نہ سن لی ہو، جلدی سے بولا۔

"میں کیا کروں ابا جی! فرنگیوں کے ساتھ رہ کر ان کی بہت سی عادتیں بھی اپنا لی ہیں۔ خاص طور پر اچھی عادتیں۔" وہ مسکراتا ہوا اندر داخل ہو گیا اور باپ کے اشارے پر ایک نشست سنبھال لی۔

"چل یہ بھی چنگی گل ہے کہ تو نے ان کی چنگی گلاں ہی سیکھی ہیں ورنہ تو جتنے عرصے سے ادھر رہ رہا ہے، پورا پکا فرنگی بھی بن سکتا تھا۔" مراد شاہ کا مزاج اعتدال پر دیکھ کر اس نے اندازہ لگا لیا کہ اس نے اس کی گفتگو نہیں سنی ہے چنانچہ ہلکا پھلکا سا ہو کر ہنستے ہوئے جواب دیا۔

"میں اتنا بودا نہیں ہوں جو آسانی سے کسی کے رنگ میں رنگ جاؤں۔ جن کی شخصیت کمزور ہو وہ تو یہاں رہ کر بھی فرنگی بننے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔"

"جیو ندا رہ میرا پتر! مجھے بھی معلوم ہے کہ میرا شیر کسی سے دبنے والا یا اس کے پیچھے چلنے والا نہیں ہے۔ میں تو ایویں تجھ سے تھوڑا مذاق کر رہا تھا۔ تو چھوڑ اس قصے کو اور بتا کہ ادھر آرام نال تو ہے نا؟ کسی چیز کی لوڑ ہو تو منشی کو پیغام بھجوا دے۔ گھنٹے دو گھنٹے میں وہ تیرا ہر مسئلہ حل کر سکتا ہے۔" چودھری کو لگا کہ مراد کو اس کی بات بری لگی ہے اس لیے فوراً ہی اس کی دل جوئی کرنے لگا۔

"کسی شے کی ضرورت نہیں ہے ابا جی۔ حویلی میں ہر وہ سہولت موجود ہے جو کسی بڑے اور ترقی یافتہ شہر کے گھر میں ہو سکتی ہے۔ ویسے بھی مجھے کون سا ہمیشہ یہیں رہنا ہے۔ میں آپ کے پاس آیا ہی اس لیے تھا کہ آپ سے واپسی کے سلسلے میں اجازت لے سکوں۔ باہر کے باہر ہی دو چکر مار کر گیا ہوں لیکن آپ بڑی لمبی بات چیت میں مصروف تھے اس لیے ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا۔"

"ہاں، وہ ایک ضروری کاروباری فون تھا اس لیے مجھے تھوڑا ٹائم لگ گیا۔" اس نے سرسری سے لہجے میں جواب دے کر بات کو ٹالنا چاہا۔

"آپ بات کرتے ہوئے کافی پریشان لگ رہے تھے۔ اس لیے مجھے تھوڑی تشویش ہونے لگی تھی۔" وہ بھی گویا اس موضوع کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

"کاروباری پریشانی ہی تھی پتر۔ میں نے تجھے بتایا تو تھا کہ میرا کارخانہ جل گیا ہے، اب ادھر اس کی دوبارہ تعمیر ہو رہی ہے اور ٹھیکیدار کا کہنا ہے میری وہاں موجودگی ضروری ہے، پر میرا جی کچھ کرنے کو نہیں چاہتا۔ ابھی تیری ماں کو مرے دن ہی کتنے ہوئے ہیں جو میں خود کو سنبھال کر ان مصروفیتوں میں الجھ سکوں۔" اس نے نہایت غم زدہ شکل بنا کر اپنی فرضی مشکل کا ذکر کیا حالانکہ درحقیقت وہ صرف شہر جانے کے لیے

جواز پیدا کر رہا تھا۔

’’زندگی نام ہی اسی کا ہے اباجی! آدمی کو بڑے سے بڑا غم سہہ کر بھی خود کو سنبھالنا پڑتا ہے۔ میرے خیال میں تو آپ شہر چلے جائیں تو مصروفیت میں آپ کا دل بہل جائے گا۔ میں خود بھی اسی وجہ سے یہاں سے جلد روانہ ہونے کا خواہش مند ہوں۔ نیو یارک پہنچ کر اپنی جاب کی مصروفیت میں الجھوں گا تو ذہن بٹ جائے گا۔ ورنہ یہاں تو ہر دم اماں کا ہی خیال ذہن پر سوار رہتا ہے۔ انھیں اپنے سامنے لحد میں اتارنے کے باوجود یقین نہیں آتا کہ وہ اس طرح اچانک دنیا سے چلی گئی ہیں۔ کہتے ہیں مرنے سے قبل قدرت انسان کے منہ سے ایسی کوئی نہ کوئی بات کہلواتی ہے جو بعد میں یاد آئے تو لواحقین کو خیال آتا ہے کہ مرنے والے کو اپنی موت کے اشارے ملنا شروع ہو گئے تھے، جب ہی ایسا کہہ گیا لیکن مجھے تو بہت یاد کرنے پر بھی اماں کی ایسی کوئی بات یاد نہیں آتی جس سے لگے کہ وہ اپنی زندگی کے آخری دن گزار رہی تھیں۔ وہ تو زندگی سے بڑی محبت کرنے والی اور ایک ایک لمحہ اپنی مرضی سے گزارنے والی خاتون تھیں۔ وہ کیسے اتنی خاموشی سے چلی گئیں، یقین نہیں آتا۔‘‘ مراد شاہ نے جو موضوع چھیڑ دیا تھا، وہ ذرا نازک تھا۔ اگر وہ تفصیل سے وڈی چودھرائن کی موت پر گفتگو کرنے بیٹھ جاتا تو وہ مشکوک حالات ضرور زیرِ بحث آتے جس سے چودھری گریز ہی کرنا چاہتا تھا چنانچہ تیزی سے پینترا بدلتے ہوئے رقت زدہ لہجے میں بولا۔

’’بس پتر! اللہ کی مرضی کے آگے کسی کی کیا چل سکتی ہے۔ تُو بھی صبر کر میں بھی صبر کی کوشش کرتا ہوں ورنہ سچ پوچھو تو حال ایسا ہے کہ راتوں کو ڈھنگ سے نیند نہیں آتی اور دل میں درد کی لہریں سی اٹھتی محسوس ہوتی ہیں۔ سوچ رہا ہوں کہ کارخانے کا کام دیکھنے لاہور جاؤں گا تو اپنا مکمل چیک اپ بھی کروالوں گا۔‘‘

’’ایسی بات تھی تو آپ کو پہلے ذکر کرنا چاہیے تھا اباجی! میں آپ کو خود اسپتال لے کر چلتا۔‘‘ حسبِ توقع مراد کا دھیان ماں کی طرف سے ہٹ گیا اور وہ اس کے لیے تشویش میں مبتلا ہونے لگا۔

’’او نہیں اوئے۔ ایسی بھی کوئی جلدی نہیں ہے۔ یہ تو صدمے کی وجہ سے میں ذرا ڈھیلا پڑ گیا ہوں ورنہ تو جانتا ہے کہ تیرا پیو ابھی اتنا بوڑھا نہیں ہوا کہ سہارے تلاش کرے۔ ہور فیر تیرا سہارا کیا لینا۔ تُو ٹھہرا دو دن کا مہمان۔ آگے بھی تو میں نے اپنے سارے کم آپ ہی دیکھتے ہیں تو فیر بیکار میں عادت کیوں خراب کروں۔‘‘ مراد شاہ کے ساتھ لاہور جانا اس کے کاموں میں رکاوٹ بن سکتا تھا اس لیے فوراً ہی انکار کر دیا۔ ساتھ ہی وہ بیٹے پر طنز کے تیر چلانے سے بھی باز نہ آیا تھا کہ اس طرح ایک طرف تو اپنے دل کی بھڑاس نکل جاتی تھی تو دوسری طرف اگلا بھی دباؤ میں آکر کچھ بولنے کے قابل نہ رہتا تھا۔ اب بھی یہی ہوا۔ مراد شاہ گردن جھکائے چپ بیٹھا رہ گیا اور وہ خود دل ہی دل میں اپنے آپ کو اس ہوشیاری پر داد دیتا بظاہر ناراض سا اٹھ کر باہر نکل گیا۔

☆☆☆

شہریار پریشان سا اپنے دفتر میں ٹہل رہا تھا۔ مشابرم خان اس کی خواہش پر ناڑلی والا گیا تھا اور وہاں سے واپس لوٹ کر نہیں آیا تھا۔ واپس نہ آنا اتنا تشویش ناک نہ ہوتا اگر وہ وہاں سے اس سے رابطہ کر لیتا لیکن اس نے تو پلٹ کر اپنی کوئی خبر ہی نہیں دی تھی۔ خود شہریار کی اپنی کوششیں بھی بارآور ثابت نہیں ہوئی تھیں۔ مشابرم خان کا فون مسلسل بند جا رہا تھا اور یہ ایک غیر معمولی بات تھی۔ موبائل بند ہونے سے یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا تھا کہ وہ ایسے حالات کا شکار ہے کہ اس کے لیے اپنا موبائل استعمال کرنا ممکن نہیں۔ اب یہ حالات کچھ بھی ہو سکتے تھے۔ ممکن تھا کہ رازداری اور احتیاط کے باعث اس نے خود ہی اپنا موبائل بند کر دیا ہو۔ یا پھر کسی وجہ سے وہ اپنا سیٹ کھو بیٹھا ہو۔ یہ دونوں امکانات ذرا قابلِ اطمینان تھے لیکن تیسرا امکان بہت دہشت ناک تھا۔ ممکن تو یہ بھی تھا کہ کسی وجہ سے مشابرم خان مخالفین کی نظر میں آگیا ہو اور انہوں نے اس کا سیٹ چھین کر اسے آف کر دیا ہو اور اب وہ کڑی پوچھ گچھ کے مراحل سے گزر رہا ہو۔ خود اس کے سامنے کالے میاں کی مثال موجود تھی۔ پیر سائیں کے اس چیلے کو گھیرنے کے بعد انہوں نے سب سے پہلے اس کے سیٹ پر ہی قبضہ کیا تھا اور بعد میں حقائق اگلوانے کے لیے اس کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا تھا۔ زخمی کالے میاں ابھی تک نورکوٹ کے سرکاری اسپتال میں زیرِ علاج تھا اور اس کے کمرے کے باہر پولیس کے سپاہی متعین تھے۔ اس کی استدعا پر ایس پی نے کالے میاں کا کیس منظرِ عام پر نہیں آنے دیا تھا اور شہریار کی طرف سے اشارہ ملنے تک اس کی گرفتاری کو صیغۂ راز میں ہی رکھا جانا تھا۔

شہریار نے سوچ لیا تھا کہ پیر سائیں کی شخصیت کو بے نقاب کرنے کے بعد کالے میاں کے جرم کا تعین کرتے ہوئے اس کی رہائی یا اسیری کا فیصلہ کیا جائے گا۔ اگر ابھی وہ اسے منظرِ عام پر لے آتا تو پیر سائیں اور اس کے ساتھی

ہوشیار ہو جاتے اور انھیں حقائق معلوم ہونا ناممکن ہو جاتا لیکن ابھی تو اصل مسئلہ مشابرم خان کا تھا۔ اسے کسی طرح اس کی خبر لینی تھی لیکن وہ طریقۂ کار کا تعین نہیں کر پا رہا تھا۔ ایک طریقہ تو اس کے ذہن میں یہ تھا کہ وہ اس ضلع کے اے سی سے جس میں ناڑلی والا گاؤں موجود تھا، رابطہ کرتا اور اسے اعتماد میں لیتے ہوئے اس سے مشابرم خان کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی استدعا کرتا لیکن یہ طریقۂ کار کئی وجوہات کی بنا پر خطرناک بھی ثابت ہو سکتا تھا۔ اوّل تو وہ وہاں اپنے ہم منصب کی شخصیت سے اچھی طرح واقف نہیں تھا کہ آیا وہ کوئی ایماندار اور فرض شناس افسر ہے یا پھر بہت سوں کی طرح بس کرسی پر بیٹھ کر راج کر رہا ہے۔ کسی بے ایمان اور راشی افسر سے مدد ملنا تو دور کی بات مشابرم خان کی مشکلات میں مزید اضافہ ہونے کا خطرہ تھا۔ پھر یہ بھی ممکن تھا کہ مشابرم خان کو وہاں بھجوائے جانے کا مقصد اگلے بندے کو پسند نہیں آتا اور وہ اسے اپنی حدود میں مداخلت بے جا گردانتا۔ یہ اعتراض ایماندار اور بے ایمان دونوں طرح کا افسر کر سکتا تھا اور اس میں کوئی ایسی غلط بات بھی نہیں ہوتی..... کیونکہ یہ حقیقت تو اپنی جگہ تھی کہ شہریار اپنی حدود سے باہر نکل کر ہی کام کر رہا تھا چنانچہ اپنے ذہن میں آنے والے اس خیال کو تو اس نے خود ہی مسترد کر دیا۔

اس خیال کو مسترد کر دینے کے بعد اس کے پاس دوسری راہ یہ رہ جاتی تھی کہ وہ اپنے طور پر کسی دوسرے آدمی کو مشابرم خان کے سلسلے میں سن گن لینے کے لیے ناڑلی والا بھیجے لیکن ایسا آدمی آتا کہاں سے؟ یہاں اس کے پاس قابلِ اعتماد بندے تھے ہی کتنے؟ مشابرم خان کے بعد ایک عبدالمنان ہی رہ جاتا تھا اور وہ اپنے تمام تر خلوص کے باوجود ایسی صلاحیتوں کا مالک نہیں تھا کہ اس پر اس قسم کے کسی کام کا بوجھ ڈالا جاتا۔ لے دے کر ایک جگو ہی رہ جاتا تھا لیکن اسے بھی وہ کتنی بار زحمت دیتا۔ جگو خود ایک سیاسی جماعت سے وابستہ تھا اور ان کے لیے غنڈا گردی کرتا تھا۔ اسے بھی بار بار اس کی ڈیوٹی سے ہٹا کر اپنے کاموں کے لیے بلانا صحیح نہیں تھا۔ اس قسم کی سرگرمیوں میں مبتلا لوگوں کا کچھ پتا تھوڑی تھا کہ کب ان کے پیچھے خفیہ ایجنسی کے بندے لگ جائیں اور پھر خود اس کی راہ پر بھی ہو لیں۔

وہ جو کچھ کر رہا تھا، بے شک وطن کی محبت میں کر رہا تھا لیکن قانون کہتا تھا کہ وہ سب اس کے دائرۂ اختیار میں نہیں آتا۔ وہ خود بھی اس حقیقت کو تسلیم کرتا تھا اور ابتدا میں کوشش بھی کرتا رہا تھا کہ ہر کام طریقۂ کار کے مطابق ہو لیکن اس نے دیکھ لیا تھا کہ ہر جگہ اتنی کالی بھیڑیں تھیں کہ کام بنانا ہی مشکل ہو جاتا تھا اور وہ ان لوگوں میں سے نہیں تھا جو اپنی بے بسی تسلیم کر کے ہاتھ پر ہاتھ دھر کر ایک طرف ہو بیٹھیں۔ وہ انسانیت اور اپنے وطن کے لیے جو کچھ کر سکتا تھا وہ ضرور ہی کر گزرنا چاہتا تھا لیکن ابھی تو اصل مسئلہ تھا کہ مشابرم خان کا احوال کیسے معلوم ہو؟ وہ ایک بار پھر شدت سے اس امر کی ضرورت محسوس کر رہا تھا کہ اپنی ایک بڑی اور فعال ٹیم تشکیل دے سکے تاکہ وقتِ ضرورت آدمیوں کا ایسا کال محسوس نہ ہو۔

فی الحال تو اس نے سوچ لیا تھا کہ چند گھنٹے مزید اگر مشابرم خان کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہو سکا تو وہ تمام تر مصلحتوں کو بالائے طاق رکھ کر خود نکل کھڑا ہوگا۔ مشابرم خان اس کے کہنے پر ناڑلی والا گیا تھا اس لیے وہ ساری ذمے داری بھی اپنے ہی شانوں پر محسوس کر رہا تھا۔ اس فیصلے پر پہنچنے کے بعد اسے قدرے سکون محسوس ہوا تو اپنے دفتر کا طول و عرض ناپنے کا سلسلہ چھوڑ کر کرسی پر جا بیٹھا۔ اسی وقت موبائل کی گھنٹی بجی۔ اس نے اسکرین پر جگمگاتا نام دیکھ کر فوراً ہی کال ریسیو کر لی۔ اسے کال کرنے والا میجر ذیشان تھا۔ وہی میجر ذیشان جس نے مولوی کا بہروپ دھارنے والے را کے ایجنٹ کو گرفتار کرنے میں اس کا بھرپور ساتھ دیا تھا اور اب بھی وہ ایجنٹ اس کی کسٹڈی میں زیرِ تفتیش تھا۔

’’السلام علیکم میجر صاحب! مزاج بخیر..... آج کیسے آپ نے ہمیں یاد فرمایا؟‘‘ اپنی تمام تر پریشانی کے باوجود اس نے بات کرنا شروع کی تو لہجہ ہموار اور شگفتہ تھا۔

’’وعلیکم السلام اے سی صاحب۔ مزاج بالکل بخیر ہے۔ رہی آپ کو یاد کرنے کی بات تو وہ تو ہم اکثر کرتے ہی رہتے ہیں لیکن فون کرنے کی نوبت اسی وقت آئی ہے جب آپ کو بتانے کے لیے کچھ خاص موجود ہو، ورنہ آپ جس طرح اداس ہوتے ہیں مجھے اپنی نااہلی کا بڑی شدت سے احساس ہوتا ہے۔‘‘ اس کے ہر سوال کا ترتیب وار جواب دیتے ہوئے میجر ذیشان کا لہجہ بھی خوشگوار تھا بلکہ صاف محسوس ہو رہا تھا کہ وہ مسکرا رہا ہے۔

’’ایسی کوئی بات ہے تو فوراً بتا دیجیے۔‘‘ شہریار اس کی کال کا مقصد سمجھ کر بے چین ہو گیا۔

’’اشیش پر کام کرتے رہنے سے ہمیں بڑی کامیابیاں ملی ہیں اور ہم سخت محنت کے بعد اس کی زبان کھلوانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ اس نے اپنے کچھ ساتھیوں کے نام اور ٹھکانے بتانے کے ساتھ ساتھ ایسے منصوبوں کے بارے میں بھی اعتراف کیا ہے جن سے بھارت کی پاکستان دشمنی کھل

کر سامنے آ گئی ہے۔ میں فون پر آپ کو اتنی زیادہ تفصیلات نہیں بتا سکتا۔ مل بیٹھنے کا موقع نکلا تو پھر آگاہ کروں گا۔" میجر ذیشان کے پاس اس کے لیے واقعی بڑی خبریں تھیں۔

"تو پھر جلد از جلد یہ موقع نکالتے ہیں۔ ویسے میرے خیال میں جو کچھ معلوم ہو چکا ہے، اس کی بنیاد پر بھی بھارت پر کافی دباؤ ڈالا جا سکتا ہے۔ آپ اشیش کو میڈیا کے سامنے لے آئیں تاکہ ساری دنیا بھارت کے کرتوتوں سے آگاہ ہو سکے۔" وہ بہت کم اتنا جذباتی ہوتا تھا جتنا اس وقت ہو رہا تھا۔

"اسے میڈیا پر لانا تو خیر ممکن نہیں ہے۔ بھارتی فوراً ہی اسے ہمارا پروپیگنڈا قرار دیتے ہوئے اشیش سے لاتعلقی ظاہر کر دیں گے، البتہ اس سے حاصل شدہ معلومات کی روشنی میں اس کے ساتھیوں کی بیخ کنی کی جا سکتی ہے۔" میجر ذیشان نے اسے بڑا ناپا تلا جواب دیا تو اسے بھی احساس ہوا کہ واقعی اس کا مشورہ قابلِ عمل نہیں ہے۔

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ میرے خیال میں اب آپ لوگوں کو بالکل بھی دیر نہیں کرنا چاہیے۔ ڈائریکٹ ایکشن لیں ان لوگوں کے خلاف۔ پہلے ہی اشیش کی زبان کھلوانے میں اتنی زیادہ دیر لگ گئی ہے۔ وہ لوگ کہیں ہوشیار ہو کر بھاگ ہی نہ نکلے ہوں۔" اس نے ایک اور مشورے سے نوازا۔

"ہم اندیشہ تو ہمیں بھی یہی ہے لیکن بہرحال ہم اوپر والوں کے حکم کے محتاج ہوتے ہیں اور اپنی مرضی سے کوئی ایکشن نہیں لے سکتے۔" میجر ذیشان نے بے بسی سے جواب دیا۔

"اوپر والوں کے فیصلے اور احکامات تو جانے کن بنیادوں پر کیے جاتے ہیں۔ اوپر والوں کی ڈھیل کی وجہ ہی سے تو بھارت کو کھلی بدمعاشی دکھانے کا موقع ملتا ہے۔ ہم عجیب بدنصیب قوم ہیں کہ ہماری قومی سلامتی کے فیصلے اوپر والوں کے مفادات کی نذر ہو جاتے ہیں۔" اسے بہت شدت کے ساتھ غصہ آیا تھا ورنہ وہ ان لوگوں میں سے نہیں تھا جو صرف حکومت کو کوستے رہنے پر اکتفا کر کے خود ہاتھ پہ ہاتھ دھر کر بیٹھ جاتے ہیں۔

"یہ تو بہت کھلے حقائق ہیں جنہیں ہر شخص جانتا ہے لیکن ہم کر ہی کیا سکتے ہیں؟" میجر ذیشان نے مایوسی کے ساتھ کہا۔

"اور کوئی نہیں لیکن کم از کم فوج تو بہت کچھ کر سکتی ہے۔ ہماری قوم پاک فوج سے اندھی عقیدت رکھتی ہے۔ لوگوں کے دل میں یہ یقین ہے کہ بُرے وقت میں ان کی فوج کا ہر سپاہی سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن کر دشمن کی راہ میں کھڑا ہو جائے گا۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ اگر مخلص لوگ چاہیں تو سب کچھ ہو سکتا ہے۔ بس ایک ایسے ونگ کی تشکیل کی ضرورت ہے جو آزادانہ ملکی مفادات کے لیے کام کرتے ہوئے دشمن کو نیست و نابود کر سکے۔" اس نے اپنے ذہن میں پیدا ہونے والا آئیڈیا میجر ذیشان کے گوش گزار کر دیا۔

"میں کچھ کچھ آپ کی بات سمجھ رہا ہوں۔ یعنی آپ چاہتے ہیں کہ جس طرح آپ ذاتی حیثیت میں چند لوگوں کے ساتھ کام کر رہے ہیں اسی طرح فوج کے کچھ لوگ بھی کرنے لگیں؟" میجر ذیشان چونک کر بولا۔

"بالکل..... میں بالکل یہی چاہتا ہوں کیونکہ ہم جس طرح کے حالات کا شکار ہیں کہ ہمارے پاس اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں ہے۔ ہمیں اپنے ملکی مفادات کے لیے اس طرح کے اقدامات اٹھانے ہی ہوں گے۔ لیکن مجبوری یہ ہے کہ میرے پاس افراد و وسائل دونوں کی کمی ہے۔ اگر فوجی قیادت اس طرح کا کوئی ونگ تشکیل دے دیتی ہے تو اس سے مجھ جیسے افراد کو بھی سپورٹ مل جائے گی کیونکہ مجھے لگتا ہے کہ میں جس راستے پر چل پڑا ہوں، آگے چل کر معاملات بہت گمبھیر ہو جائیں گے اور مجھے کسی مضبوط سپورٹ کی ضرورت پڑے گی۔ یہ تو آپ کے بھی سامنے ہے کہ تھوڑی سی ہی بھاگ دوڑ کے نتیجے میں میرا را کے ایجنٹوں سے واسطہ پڑ چکا ہے اور آگے بھی جانے کن کن ملک دشمنوں کو بے نقاب ہونا ہے۔" وہ اپنی تجویز کے حق میں دلائل دیتا چلا گیا۔

"آئیڈیا تو شاندار ہے لیکن معلوم نہیں کہ عمل بھی ہو سکے گا یا نہیں۔ اس قسم کی خفیہ تنظیم کو بنانا پھر اس سے اس طرح سے کام لینا کہ ہم اس کے وجود کو خفیہ رکھیں، کچھ اتنا قابلِ عمل نہیں لگتا۔" میجر ذیشان خود بڑا محبِ وطن آدمی تھا اور دل سے اس بات کا خواہش مند رہتا تھا کہ ملک کے دشمنوں کو نیست و نابود کر ڈالے لیکن فوجی پابندیوں کی وجہ سے اکثر بس پیچ و تاب کھا کر ہی رہ جاتا تھا اس لیے اسے اس کا آئیڈیا پسند آیا لیکن ساتھ ہی وہ اس سلسلے میں شکوک و شبہات کا بھی شکار تھا۔

"انسان کرنا چاہے تو سب کچھ کر سکتا ہے۔" شہریار نے پُرامید لہجے میں کہا۔

"میں کرنل صاحب سے بات کروں گا۔ وہی اس معاملے کو آگے بڑھا سکتے ہیں ورنہ خود میری تو کوئی ایسی حیثیت نہیں کہ میں اتنا بڑا کام کروا سکوں۔"

"آپ کام کے آغاز کے لیے جو معمولی سی کوشش کریں گے وہ بھی بہت اہم ہے۔ مشین کا کوئی بھی پرزہ چاہے وہ کتنا ہی چھوٹا ہو، کبھی ناکارہ نہیں ہوتا بلکہ اس کے نہ ہونے سے مشین ضرور ناکارہ ہو سکتی ہے۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ میں اپنی سی پوری کوشش کروں گا کہ اس آئیڈیے پر عمل ہو سکے۔ آپ میری کامیابی کے لیے دعا کیجیے گا۔" میجر ذیشان کی آواز پُرعزم ہو گئی۔

"ان شاء اللہ..... بلکہ میں صرف دعا ہی نہیں کروں گا، خود بھی کوشش کروں گا۔ میرے بھی کچھ اہم افسران سے ذاتی روابط ہیں۔ میں انہیں قائل کرنے میں کامیاب ہو گیا تو سمجھیں ہمیں اپنے حق میں کئی اہم ووٹ مل جائیں گے۔" اس نے میجر کی ہمت بڑھائی۔

"بس تو پھر ان شاء اللہ اگلی بار بات ہونے پر ہمارے پاس ایک دوسرے کے لیے اچھی خبریں ہوں گی۔ جب تک کے لیے اجازت دیجیے۔ اللہ حافظ۔" میجر ذیشان نے اختتامی جملے ادا کر کے کال منقطع کر دی تو اس نے بھی زیرِ لب اللہ حافظ کہتے ہوئے موبائل واپس میز پر ڈال دیا۔ میجر ذیشان سے آج اس کی جو گفتگو ہوئی تھی، وہ اتنی اہم اور حوصلہ بخش تھی کہ مشابرم خان کی گمشدگی سے طاری ہونے والا اعصابی دباؤ بھی کافی کم محسوس ہونے لگا تھا۔ وہ بے اختیار ہی تھوڑا ریلیکس ہو کر بیٹھ گیا۔ اسی دم انٹرکام بول اٹھا۔

"سر! مشابرم خان کافی خراب حالت میں دفتر پہنچا تھا اور آپ سے ملاقات کا خواہش مند تھا۔ میں نے زبردستی اسے اسپتال روانہ کر دیا ہے لیکن اس کا اصرار تھا کہ آپ کو ضرور اس کی آمد سے آگاہ کر دیا جائے۔" دوسری طرف عبدالمنان تھا جو ہیجان زدہ لہجے میں اسے اطلاع دے رہا تھا۔

"میری گاڑی نکلواؤ۔ میں ابھی اسی وقت اسپتال جاؤں گا۔" مشابرم خان کی واپسی کی اطلاع نے اس کو بالکل الرٹ کر دیا اور اس نے فوری طور پر خود بھی اسپتال جانے کا فیصلہ کیا۔

"اوکے سر۔" عبدالمنان کے اس دو لفظی جواب کا مطلب تھا کہ اس کے احکامات پر فوری عمل ہو گا چنانچہ اس نے بھی فوراً ہی سیٹ چھوڑ دی۔ ایک طرف اگر یہ اکسائٹمنٹ تھی کہ مشابرم خان تالی والا سے کون کون سی خبریں لے کر لوٹا ہے تو دوسری طرف اس کی حالت کی طرف سے بھی تشویش تھی کہ جانے وہ وہاں کیا کچھ سہہ کر آیا ہے۔

اپنے دفتر سے نکل کر اسپتال پہنچنے میں اسے چند منٹوں سے زیادہ وقت نہیں لگا تھا لیکن اسپتال میں اسے کچھ دیر انتظار کرنا پڑا۔ ڈاکٹرز مشابرم خان کی مرہم پٹی کر رہے تھے۔ اس مرحلے سے فارغ ہو کر وہ اس کے سامنے پہنچا تو

باوجود تکلیف کے مسکرا رہا تھا۔ شہریار کو معلوم ہو گیا تھا کہ اس کی آمد کی اطلاع سن کر اس نے ڈاکٹرز کو اپنے جسم میں سکون آور دوا انجیکٹ نہیں کرنے دی تھی تاکہ پہلے اس سے پورے ہوش و حواس کے ساتھ ملاقات کر سکے۔

"کیسے ہو یار مشابرم خان! تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔" شہریار نے شاید پہلی بار اس کے سامنے ایسی جذباتیت کا مظاہرہ کیا تھا۔ رتبے کے اعتبار سے وہ بہت نیچے کا آدمی تھا۔ ایک ڈرائیور کو یہاں پوچھتا ہی کون ہے لیکن شہریار کے لیے وہ صرف ایک عام سا ڈرائیور نہیں تھا۔ وہ اس کے مشن پر کام کرنے والا سب سے فعال اور نڈر سپاہی تھا جسے وہ کسی بھی قیمت پر کھونے کے لیے تیار نہیں تھا، چنانچہ بڑے مختصر حالات کے بعد اس کے واپس لوٹنے پر جذباتی ہونا سمجھ میں آتا تھا۔

"میں ٹھیک ہوں سر! بس ذرا پھنس گیا تھا اس لیے آپ کو انتظار کی تکلیف اٹھانی پڑی۔" اس کا لہجہ معذرت خواہانہ تھا۔

"بے وقوف آدمی! مجھے تم سے شکوہ نہیں ہے۔ میں تمہارے لیے پریشان ہو رہا تھا۔" شہریار نے اسے ڈپٹا تو اس کی آنکھوں میں اس محبت بھری ڈانٹ پر نمی سی آ گئی جسے چھپا کر وہ اپنے اوپر گزرنے والے حالات کی تفصیل سنانے لگا۔ تالی والا سے نکل کر بھی وہ بڑی مشکل سے یہاں تک پہنچا تھا کہ نہ جیب میں کرائے کی رقم تھی اور نہ ہی رابطے کا کوئی ذریعہ۔ پھر اسے یہ بھی ڈر تھا کہ پیچھے سے کوئی اسے ڈھونڈتا ہوا نہ آ رہا ہو۔ اس لیے بہت احتیاط سے کام لینا پڑا تھا۔ وہ کچھ فاصلے کے لیے لفٹ لے کر اور کافی راستہ پیدل چل کر یہاں تک پہنچا تھا اس لیے بیر سا سنگھ کے غنڈوں سے مار کھایا ہوا جسم اور بھی بدحال ہو گیا تھا۔ شہریار اس کی سنائی گئی تفصیل کا ایک ایک لفظ غور سے سنتا رہا اور اس کے ذہن میں یہ خیال اور بھی راسخ ہو گیا کہ اس نے میجر ذیشان کے سامنے جس خفیہ ونگ کی تشکیل کی تجویز پیش کی تھی، ان حالات سے نمٹنے کے لیے اس کا قیام ناگزیر ہے۔ اب اسے اپنی تجویز پر عمل درآمد کروانے کے لیے اور بھی زیادہ شدت سے کوشش کرنی تھی۔ اس کوشش میں کامیاب ہونے تک بھی وہ چپ ہو کر بیٹھنے والا نہیں تھا۔ تالی والا میں پیری مریدی کی آڑ لے کر تخریبات کا خطرناک دھندا کرنے والے ملک دشمن کو جلد اور بروقت سبق سکھانا بے حد ضروری تھا اور اس سلسلے میں اس کا ذہن فوری طور پر منصوبہ بندی کرنے کے لیے متحرک ہو گیا تھا۔

☆☆☆

جیکب آباد کے بس اڈے پر اتر کر اس نے ارد گرد

جائزانہ نظر ڈالی۔ اپنے اطراف میں اسے ایسا کوئی چہرہ نظر نہیں آیا جسے وہ مشکوک قرار دے سکے۔ بس میں اس کے ساتھ موجود مسافروں میں سے بھی کچھ راستے میں ہی مختلف مقامات پر اتر گئے تھے اور کچھ جہاں اس کے ساتھ اترنے کے بعد اِدھر اُدھر بکھر گئے تھے۔ ان سب کو یقیناً اپنی پہلے سے طے شدہ منزل کی طرف جانا تھا اور ان میں سے کوئی بھی اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ اس نے اطمینان کا ایک گہرا سانس لیتے ہوئے خود بھی اس ہوٹل تک جانے کا فیصلہ کیا جہاں اسلم ٹھہرا ہوا تھا اور یقیناً بڑی شدت سے اس کی واپسی کا بھی منتظر تھا۔ ہوٹل تک کے سفر کے لیے اس نے تانگے کا انتخاب کیا۔ ویسے تو وہ یہ فاصلہ پیدل بھی طے کر سکتی تھی لیکن اسلم کے گاؤں تک کے سفر اور پھر وہاں پیش آنے والے واقعات نے اسے بُری طرح تھکا دیا تھا اس لیے اس میں پیدل چلنے کی ہمت نہیں رہی تھی۔ اپنی کیفیت اور حالات کے اعتبار سے اسے تانگا ہی سب سے موزوں سواری محسوس ہوئی تھی۔ اس میں بیٹھ کر وہ پیدل چلنے کی زحمت سے بھی بچ جاتی اور اردگرد پر نظر رکھنا بھی آسان رہتا۔

وہ تانگے میں سوار ہوئی تو اس کے ساتھ مرد و زن اور دو بچوں پر مشتمل ایک خاندان بھی سوار ہو گیا۔ اس نے ان سے کوئی تعرض نہیں کیا کیونکہ اسے اندازہ تھا کہ اگر کوئی اس کے پیچھے ہوا بھی تو وہ اکیلا مرد ہی ہوگا۔ کم از کم بیوی بچوں کو ساتھ لے کر کوئی اس قسم کی مہم جوئی کے لیے نہیں نکل سکتا تھا۔ وہ اطمینان سے بیٹھی رہی۔ تانگا حرکت میں آیا تو اس کی آنکھ کی متحرک پتلیاں بھی اردگرد کا جائزہ لینے لگیں۔ دور دور تک ایسا کوئی فرد یا سواری نہیں تھی جسے وہ اپنے تانگے کے تعاقب میں محسوس کرتی۔ اس کے ساتھ تانگے میں سوار ہونے والا خاندان بھی ایک مقام پر تانگا رکوا کر اتر گیا۔ اس سے آگے ہوٹل تک کا راستہ بھی خیریت سے گزرا۔ اس نے ہوٹل پہنچ کر اپنے اور اسلم کے لیے مخصوص کمرے کے دروازے پر دستک دی تو فوری طور پر اندر سے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں ہوا۔ ایک ڈیڑھ منٹ کے وقفے سے اس نے دوبارہ دستک دی لیکن جواب ندارد۔ وہ حیران رہ گئی۔ یہ تو ممکن نہیں تھا کہ وہ موجود نہیں تھی اور اسلم لمبی تان کر سو گیا ہو پھر اس خاموشی کا کیا مطلب تھا؟ اسے کچھ گھبراہٹ سی ہونے لگی پھر خیال آیا کہ ہو سکتا ہے وہ باتھ روم میں ہو اور فوری طور پر جواب دینے کی پوزیشن میں نہ ہو۔ اس خیال پر اسے قدرے اطمینان محسوس ہوا اور وہ ذرا صبر سے انتظار کرنے لگی۔

انتظار کا یہ دورانیہ طویل ثابت نہیں ہوا اور مزید ایک منٹ گزرنے سے پہلے دروازہ کھل گیا۔ سامنے اسلم موجود تھا جو سر پر تکونا رومال باندھے کھڑا تھا۔ اس کی پتلون کے پائنچے بھی ٹخنوں سے اوپر تک مڑے ہوئے تھے۔ ماہ بانو کو دیکھ کر اس نے بے قرار نظروں سے اس کے عقب میں کچھ تلاشا اور پھر مایوس سا ہو کر پیچھے ہٹ کر اسے اندر آنے کا راستہ دیا۔ تھکی ہوئی اور اعصاب زدہ ماہ بانو پیر گھسیٹتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ کمرے میں اس کی نظر ایک کونے میں بچھی جائے نماز پر پڑی۔ وہ سمجھ گئی کہ اسلم اس کی سلامتی اور کامیابی کے لیے اللہ کے حضور سربسجود تھا اسی لیے اسے دروازہ کھولنے میں تاخیر ہو گئی تھی۔ اسلم کی کیفیت کو سمجھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں نمکین پانی بھرنے لگا جسے چھپانے کی کوشش کرتی ہوئی وہ وہاں بچھی ایک چارپائی پر سر جھکا کر بیٹھ گئی۔

"ناکام واپس آئی ہو نا؟ میری ماں نے تمہارے کہنے پر بھی مجھے معاف نہیں کیا نا؟" وہ دل گرفتگی سے کہتا ہوا اس کے سامنے فرش پر گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور اس کا ہاتھ تھام کر اس کی پشت پر گرے شفاف قطرے کو دیکھنے لگا۔ یہ قطرہ ماہ بانو کی آنکھ سے ٹپکا تھا جس سے اس نے اس کی ناکامی کو اخذ کیا تھا۔

"ایسی بات نہیں ہے اسلم! ماں جی نے تمہیں معاف کر دیا ہے بلکہ میرے جانے سے پہلے ہی وہ میری سفارش کے بغیر تمہیں معاف کر چکی تھیں۔ وہ لاکھ ضدی اور اصول پرست سہی لیکن تمہاری ماں تھیں اسلم! یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ تمہیں معاف نہ کرتیں۔ انہوں نے خود میرے سامنے تمہارے لیے معافی کا اعلان کیا تھا۔" وہ بھیگی آواز سے اسے بتانے لگی۔

"تو پھر وہ تمہارے ساتھ آ گئیں کیوں نہیں؟ وہ مجھ سے ناراض نہیں تو انہیں تمہارے ساتھ آنا چاہیے تھا۔" اس نے کسی روٹھے ہوئے ضدی بچے کی طرح مچل کر احتجاج کیا۔

"وہ مجبور تھیں۔ شاید ان کے دل میں بھی تم سے ملنے کے لیے آنے کی خواہش تھی لیکن وقت نے انہیں مہلت......" اسے اپنا جملہ مکمل کرنے میں دقت ہو رہی تھی۔

"کیا مطلب؟ تم کیا کہنا چاہتی ہو؟" اسلم نے اسے جھنجوڑا لیکن ماہ بانو اس کی طرف متوجہ نہیں تھی۔ وہ ہراساں نظروں سے اس کی پشت پر موجود دروازے کو دیکھ رہی تھی جسے اسلم اپنے اضطراب میں کھلا ہی چھوڑ آیا تھا۔

یہ پُرپیچ و سنسنی خیز داستان جاری ہے
مزید واقعات آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں

کھلے دروازے کے اس پار نظر آنے والے چہرے اس کے لیے اجنبی نہیں تھے۔ وہ نواز چانڈیو اور اس کا بھائی سرفراز چانڈیو تھے جو خون آشام نظروں سے ان دونوں کو گھور رہے تھے۔ ماہ بانو کو یہ سمجھنے میں مشکل نہیں ہوئی کہ اس کی محتاط روی کے باوجود وہ دونوں اس کا پیچھا کرتے ہوئے یہاں تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ یقیناً ان دونوں بھائیوں نے یہ کام بے حد ہوشیاری اور چالاکی سے کیا تھا، جب ہی وہ گاؤں سے یہاں تک ان میں سے کسی کی جھلک بھی نہیں دیکھ سکی تھی۔ اسے متوجہ دیکھ کر وہ دونوں تیزی سے کمرے میں داخل ہوئے اور اندر آتے ہی دروازہ بند کر کے کنڈی لگا دی۔ اب تک تمام تر صورتِ حال سے بے خبر اسلم دروازہ بند ہونے کی آواز پر چونک کر پلٹا اور اپنے دیرینہ دشمنوں کو سامنے دیکھ کر ٹھٹک گیا۔

"آخر ہم نے تجھے ڈھونڈ ہی لیا اسلم! تُو بہت بھاگا اپنی موت سے لیکن آج تیرا وقت پورا ہو ہی گیا۔" نواز چانڈیو نے اسے کینہ توز نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔

"میرا وقت پورا نہیں ہوا بلکہ تمہاری موت کھینچ کر تمہیں یہاں تک لائی ہے۔" وہ فوری جھٹکے سے سنبھل چکا تھا چنانچہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتا ہوا بے خوفی سے بولا۔

"میرے ہتھیار کے سامنے تو خالی ہاتھ کھڑا ہے اور دھمکی دے رہا ہے۔ کیا کہنے بھئی تیرے۔" اپنے پسٹل کی نمائش کرتے ہوئے نواز چانڈیو نے استہزائیہ قہقہہ لگایا۔

"ہتھیاروں پر بھروسا تیرے جیسے نامرد کرتے ہیں۔ تیری گردن توڑنے کے لیے تو میرے بازوؤں کی طاقت ہی کافی ہے۔" اسلم اس سے مرعوب ہوئے بغیر بولا۔

"میں نامرد ہوتا تو تیری اس دودھ شریک بہن کو ماں نہ بنا پاتا۔ افسوس کہ تجھے مہلت نہیں ملے گی ورنہ میں تجھ سے کہتا کہ کبھی گوٹھ جا کر اپنی بہن سے پوچھ کہ کیسے نواز چانڈیو نے اسے اغوا کر کے اپنے نکاح میں آنے پر مجبور کیا تھا۔ بڑی اڑیل گھوڑی تھی تیری بہن پر آج میرے گھر میں میری چپلیں سیدھی کرتی ہے اور میرے بچے کو پالتی ہے۔" وہ اسلم کو بھڑکانے کی نیت سے بولا اور جس تیزی سے اسلم کے چہرے کی رنگت سرخ پڑی، اس سے ظاہر ہو گیا کہ وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب رہا ہے۔ ابھی تک ہونے والی گفتگو میں اس کے بھائی سرفراز نے کوئی حصہ نہیں لیا تھا، وہ اسلم پر نظریں جمائے چپ چاپ کھڑا تھا۔ دوسری طرف ماہ بانو بھی بالکل خاموشی سے یہ مکالمے بازی سن رہی تھی۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اس سچویشن میں خاموش تماشائی کے علاوہ اور کون سا کردار ادا کرے۔

"میری بہن کی آنکھوں سے نکلنے والے آنسوؤں کی ایک ایک بوند کا حساب تجھے اپنے خون کے قطروں سے دینا ہوگا۔ تیرا بھائی تو بہت آسان موت مرا تھا، تجھے میں تڑپا تڑپا کر ماروں گا۔" اسلم کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔ ماہ بانو اس کا یہ انداز دیکھ کر اندر سے کانپ اٹھی۔

"میرے بھائی کی موت کے بدلے کے لیے تو تیری ماں کی دردناک موت ہی کافی ہے۔ سسک سسک کر مری ہے بڑھیا۔ آخری وقت تیری یہ دھمکی وہاں پہنچ گئی ورنہ تو اس کے حلق میں پانی کی دو بوند بھی ٹپکانے والا کوئی نہ ہوتا۔" نواز چانڈیو کے الفاظ نے جہاں اسلم کو کرنٹ لگایا وہاں ماہ بانو بھی بے بسی کے شدید احساس سے تلملا کر رہ گئی۔ جس خبر کو وہ بہت قرینے سے اسلم تک پہنچانا چاہتی تھی، نواز چانڈیو نے بڑی بے رحمی و بیہودگی سے اسے سنا ڈالی تھی۔ اس وقت تو وہ اسلم کی شکوہ کناں نظروں کے جواب میں اپنی پلکیں جھکانے کے سوا کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ اسلم نے بھی بس پل بھر کے لیے ہی اس کی طرف دیکھا اور پھر بجلی کی سی تیزی سے نواز پر جھپٹا۔ ہتھیار بدست نواز چانڈیو جو نہتے اسلم کے مقابلے میں خود کو برتر سمجھ رہا تھا، بجلی کے اس کوندے سے کسی طور نہیں بچ سکا اور اسلم نے اسے لمحہ بھر میں ہی زمین چاٹنے پر مجبور کر دیا۔ ساتھ ہی اس کا پسٹل بھی ہاتھ سے نکل گیا اور چارپائی کے نیچے جا گرا۔

"بس سیدھے کھڑے ہو جاؤ ورنہ یہ لڑکی اپنی جان سے چلی جائے گی۔" اب تک خاموش کردار بنا سرفراز چانڈیو، بھائی کو زیر ہوتے دیکھ کر فوراً حرکت میں آیا اور تیزی سے ماہ بانو کے قریب پہنچ کر اسے اپنے بازوؤں میں اس طرح جکڑ لیا کہ اس کے ہاتھوں کی ذرا سی جنبش ماہ بانو کی گردن کا منکا توڑ سکتی تھی۔ اس کی دھمکی سن کر اسلم اپنی جگہ ٹھٹک گیا۔ دنیا میں اپنی ماں، بہن کے علاوہ اس نے جس عورت کو بے تحاشا چاہا تھا، وہ ماہ بانو تھی۔ ماں اور بہن کو تو وہ کھو چکا تھا اب صرف ماہ بانو بچی تھی جسے وہ کسی قیمت پر نہیں کھو سکتا تھا چنانچہ خود بخود ہی نواز چانڈیو پر سے اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ اسے ڈھیلا پڑتے دیکھ کر نواز نے فوراً ہی اسے اپنے اوپر سے دھکیلا اور کھڑے ہو کر اس کے پہلو میں ایک زوردار ٹھوکر لگائی۔

"سوچ سمجھ کر ہاتھ پیر چلا نواز! میں ابھی بے بس ہوں تو یہ نہ سمجھ کہ آگے بھی یہی صورتِ حال رہے گی۔ میں تیرا حشر بگاڑ کر رکھ دوں گا۔" اسلم نے قہر برساتی آواز میں اسے دھمکی دی۔

"تو دیکھے گا کہ ایسا وقت کبھی نہیں آئے گا۔" جواب میں نواز نے بھی نفرت بھرے لہجے میں کہتے ہوئے اس کے منہ پر ایک تھپڑ اور دے مارا۔ تھپڑ اتنا زوردار تھا کہ اسلم کے گال کا اندرونی حصہ پھٹ گیا اور منہ سے خون کی پتلی سی لکیر بہہ نکلی۔ خون دیکھ کر ماہ بانو کے ہونٹوں سے بے ساختہ چیخ نکل گئی۔

"آواز بند کرو ورنہ تمہیں گلا گھونٹ کر پھینک دوں گا۔" اسے گرفت میں لیے کھڑا سرفراز غرایا۔

"یاد رکھ سرفراز کہ اس لڑکی کا بال بھی بیکا نہیں ہونا چاہیے۔ یہ تم لوگوں کی زندگی کی ضمانت ہے۔ اسے کچھ ہوا تو تم دونوں بھائیوں کا وہ حال کروں گا کہ لاشیں بھی پہچانی نہیں جا سکیں گی۔" اسلم کی غراہٹ سرفراز چانڈیو کی غراہٹ سے کئی گنا قہر وغضب میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ایک پل کے لیے تو وہ دونوں بھائی بھی اپنی برتری کے باوجود اندر سے لرز کر رہ گئے مگر اچانک ہی دروازے پر ہونے والی زوردار دستک نے ہر ایک کی توجہ اپنی طرف مبذول کرا لی۔

"کون ہے؟" لمحہ بھر کے توقف کے بعد نواز چانڈیو نے پوچھا۔ اس اثنا میں سرفراز، ماہ بانو کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اسے آواز نکالنے سے محروم کر چکا تھا جبکہ اسلم کو بھی اس نے آنکھ کے اشارے سے یہ بات سمجھا دی تھی کہ اس کا بولنا ماہ بانو کو نقصان پہنچا دے گا۔

"میں ہوٹل کا مالک ہوں۔ اس کمرے میں کیا ہو رہا ہے؟" باہر سے سخت لہجے میں پوچھا گیا۔

"کچھ نہیں بھائی سب خیر ہے۔ ہم ذرا اپنی مرضی سے فرنیچر سیٹ کر رہے تھے اس لیے تھوڑا شور شرابا ہو گیا۔ اب تمہیں کوئی شکایت نہیں ہوگی، تم جاؤ۔" نواز نے اپنی آواز کو نرم بنانے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا۔

"کیا میں اندر آ کر دیکھ سکتا ہوں کہ تم لوگوں نے فرنیچر کی کیسی سیٹنگ کی ہے؟" ہوٹل کے مالک کی سوچتی ہوئی آواز سنائی دی۔

"نہیں بھائی صاحب! اندر ہماری پردے دار زنانی موجود ہے ہم تمہیں اندر نہیں بلا سکتے۔" اس نے صاف انکار کر دیا۔

"ٹھیک ہے لیکن اب مجھے یہاں سے کوئی شور شرابا سنائی دیا تو میں تمہیں اپنے ہوٹل سے نکال دوں گا۔ یہ تمہارا گھر نہیں ہے جو تم یہاں اپنی مرضی سے فرنیچر سیٹ کر رہے ہو۔" ہوٹل کے مالک نے غصیلے لہجے میں کہا اور پھر یوں محسوس ہوا کہ وہ وہاں سے چلا گیا ہو۔

"یہ آدمی کہیں کوئی گڑبڑ نہ کردے بھائی جی۔ ہمیں یہاں سے فوراً نکل جانا چاہیے۔" سرفراز نے تشویش زدہ لہجے میں نواز سے کہا تو اس نے گردن ہلا دی اور اسلم کو کینہ توز نظروں سے گھورتے ہوئے بولا۔

"سیدھی طرح کوئی گڑبڑ کیے بغیر ہمارے ساتھ چلے گا تو تجھے چند سانسوں کی مہلت اور مل جائے گی ورنہ میں ہر انجام سے بے پروا ہو کر بھرے مجمع میں تجھے اور اسے گولی مار دوں گا۔ یہ تیری کتنی چالاک ہے، یہ تو ہمیں معلوم ہو گیا ہے۔ ویسے ایک قل میں مانتا ہوں کہ تو نے عورت بڑی زبردست ڈھونڈی ہے اپنے لیے۔ سالی ہوشیار بھی بڑی ہے۔ اس کی ہوشیاری دیکھ کر ہی میں اور سرفراز بس میں اس کے ساتھ آنے کے بجائے ریل گاڑی سے یہاں پہنچے تھے۔ پھر بس اڈے پر پہنچ کر پہلے سے دو تانگوں میں گھس کر بیٹھ گئے تھے۔ تیسرے سے ہم نے ساز باز کرلی تھی کہ لڑکی اگر اس کے تانگے میں بیٹھے تو وہ ہمیں اس کا پتا بتا دے۔ ہماری ترکیب کامیاب رہی ورنہ یہ چوکنی ہرنی تو ایسے گردن گھما گھما کر اڈے پر چاروں طرف دیکھ رہی تھی جیسے خطرے کی بو سونگھ رہی ہو۔"

نواز چانڈیو کی بے وقت کی راگنی نے ماہ بانو کی یہ الجھن دور کردی کہ وہ دونوں اس کی تمام تر احتیاط کے باوجود آخر یہاں تک پہنچنے میں کامیاب کیسے ہو گئے۔

"میرا اور اس کا جو معاملہ ہے وہ ہمارے درمیان ہے۔ تو یہ یاد رکھ کہ اب تو اپنے غلیظ منہ سے اس کے لیے کوئی گالی نہیں نکالے گا ورنہ میں بھی ہر انجام کو بھول کر یہیں تیرا مردہ دفن کر دوں گا۔" اسلم کی کنپٹیوں پر ابھری رگیں اس کے غصے کی شدت کا پتا دے رہی تھیں۔

"اس کی بڑکوں کو چھوڑو بھائی جی! پہلے یہاں سے نکلنے کی کرو۔ اس کی بکواس کا مزا ہم اسے بعد میں چکھا لیں گے۔" سرفراز چانڈیو کی چھٹی حس نے شاید کسی خطرے کی بو سونگھ لی تھی جو مسلسل یہاں سے روانگی پر زور دے رہا تھا۔ شاید اسے گمان گزرا تھا کہ ہوٹل کے مالک کی وارننگ محض وارننگ نہیں تھی بلکہ وہ واقعی پولیس کو یہاں بلا سکتا تھا۔

"چل پھر نکلتے ہیں یہاں سے۔" غصے میں ہونے کے باوجود نواز کو بھائی کی بات سمجھ آ گئی۔ اس موقع پر اسلم نے بھی کسی قسم کی مزاحمت نہیں کی۔ مرتکب جرم کا عہد کرنے کے باوجود وہ یہ بات سمجھتا تھا کہ قانون کی نظر میں وہ اب بھی ایک مفرور ڈاکو ہے جسے کسی بھی طور معاف نہیں کیا جائے گا اور وہ اپنی زندگی کے بہت سے سال برباد ہو جانے کے بعد اب مزید ماہ و سال جیل کی سلاخوں کے پیچھے نہیں گزارنا چاہتا تھا۔ زندگی کے بہت سے بنجر سال گزارنے کے بعد اب کہیں جا کر اس کی آنکھوں نے خواب بُننے شروع کیے تھے۔ وہ اپنے خوابوں کی اس دنیا میں حقیقت میں بسنا چاہتا تھا۔۔۔ چنانچہ بے حد محتاط تھا۔

ہوٹل کے کمرے سے وہ اس ترتیب سے باہر نکلے کہ نواز نے اسے اپنے ساتھ رکھا تھا جبکہ ماہ بانو اور سرفراز پیچھے چلے آ رہے تھے۔ انہوں نے ایسا انداز اختیار کیا ہوا تھا جیسے وہ چاروں آپس میں شناسا ہوں لیکن یہ تو اسلم کو معلوم تھا کہ نواز چانڈیو کا دایاں ہاتھ جو کہ اس کی جیب کے اندر ہے، ایک بھرے ہوئے پسٹل کو گرفت میں لیے ہوئے ہے اور وہ اپنی مرضی کے خلاف کوئی حرکت ہونے پر اسے استعمال کرنے میں کوئی دریغ نہیں کرے گا۔ اسلم نے اپنی زندگی کے پچھلے چند سالوں میں اسلحے کا اتنا استعمال کیا تھا کہ اس کے لیے پسٹل کی حیثیت محض ایک کھلونے کی سی تھی۔ وہ چاہتا تو جس وقت وہ سیڑھیاں اتر کر نیچے جا رہے تھے اور گاہکوں سے بھرے ہوٹل کے ہال سے گزر رہے تھے تو کسی بھی لمحے نواز اور سرفراز کو چابکدستی سے زیر کر سکتا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی پھرتی اور طراری کے سامنے وہ دونوں بھائی ٹک ہی نہیں سکتے تھے۔ لیکن مسئلہ وہی تھا کہ وہ پولیس کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کسے معلوم تھا کہ پنجاب کے ایک جنگل سے فرار ہونے والے اسلم کو سندھ میں بھی کوئی شناخت کر لیتا اور اس کے بعد تو انجام بس جیل کی کوئی سیلن زدہ، تاریک کوٹھری ہی ہو سکتی تھی چنانچہ وہ خاموشی سے سر جھکائے ہوٹل سے باہر نکلتا چلا گیا۔ باہر ایک تانگا موجود تھا۔ نواز کے اشارے پر وہ لوگ تانگے میں سوار ہو گئے۔ ماہ بانو نے پہچان لیا کہ اس تانگے کا کوچوان وہی شخص ہے جس نے بس اڈے سے اسے یہاں تک پہنچایا تھا۔

"چلو۔" وہ چاروں تانگے میں بیٹھ چکے تو نواز نے کوچوان کو حکم دیا۔ اس نے فوراً ہی گھوڑے کو چابک رسید کی اور گھوڑا حرکت میں آ گیا۔ گھوڑا ہوٹل سے چند قدم ہی آگے بڑھا ہو گا کہ انہوں نے موٹر سائیکل پر سوار دو پولیس والوں کو ہوٹل کے سامنے رکتے ہوئے دیکھا۔ سرفراز نے معنی خیز نظروں سے نواز کی طرف دیکھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ اپنی معاملہ فہمی پر بڑے بھائی سے داد طلب کر رہا ہو اور یہ تھی بھی حقیقت کہ اگر وہ لوگ چند منٹ اور ہوٹل کے کمرے میں رکے رہتے تو پولیس والوں سے ٹکراؤ ہونا لازمی تھا۔ وہ جو ایک شک سا تھا کہ ہوٹل کا مالک محض وارننگ پر اکتفا نہیں

کرے گا، سچ ثابت ہوا تھا۔

"دیکھو صاحب جی! کوئی گڑبڑ ہے تو مجھے ابھی بتا دو۔ میں غریب آدمی ہوں اس لیے تھوڑے سے پیسوں کے لالچ میں تمہارے کام کے لیے راضی ہو گیا لیکن کسی پھڈے میں نہیں پڑ سکتا۔ تمہاری کسی گڑبڑ کی وجہ سے مجھے جیل جانا پڑا تو پیچھے میرے بیوی بچے بھوکے مر جائیں گے۔" گھوڑا گاڑی کچھ اور آگے بڑھی تو کوچوان نے تشویش زدہ لہجے میں نواز سے کہا۔ اپنے لباس اور چہرے مہرے سے وہ واقعی غریب آدمی محسوس ہو رہا تھا جو لالچ میں آ کر خطرہ تو مول لے بیٹھا تھا لیکن انجام سے خوف زدہ تھا۔

"چپ کر کے تانگا چلاتا رہے۔ جب ایک بار میں نے تجھ سے کہہ دیا ہے کہ تجھے کوئی مشکل نہیں ہوگی۔ تو ہمیں ہماری مرضی کی جگہ پر چھوڑ تا اور اپنی رقم لے کر واپس پلٹ جانا تو تجھے پھر کس چیز کا ڈر ہے۔ تجھ جیسے ڈیڑھ پسلی کے آدمی سے میں کوئی تو پیں تو چلوا نہیں سکتا۔ تو بس اتنا کرنا بعد میں اگر کوئی تجھ سے ہمارے بارے میں پوچھے تو کہہ دینا کہ سواریوں کو بس اڈے کے قریب اتار دیا تھا۔ تو خود ہی پریشانی سے بچا رہے گا۔" نواز چانڈیو نے سخت لہجے میں کوچوان کو جواب دیا جس پر وہ چپ سادھ کر اپنے گھوڑے کے ساتھ مصروف ہو گیا البتہ اس کے بشرے سے تشویش کے آثار اب بھی ختم نہیں ہوئے تھے۔ اس کی حالت اس شخص کی سی تھی جو اوکھلی میں سر تو دے بیٹھا تھا لیکن اب موسلوں سے خوف زدہ تھا۔

مختلف گلی کوچوں سے گزرتا ہوا تانگا آخرکار شہر کے آباد حصے کو چھوڑ کر ویرانے کی طرف بڑھنے لگا۔ ویرانے میں پہنچتے ہی ماہ بانو کا دل بے طرح دھڑکنے لگا۔ نواز اور سرفراز، اسلم کے جانی دشمن تھے جو ظاہر ہے اسے کسی نیک ارادے سے تو اپنے ساتھ لے کر نہیں جا رہے تھے۔ دوسری طرف اسلم کو اطمینان محسوس ہونے لگا۔ کسی ویرانے میں وہ آبادی کے مقابلے میں ان دونوں سے زیادہ اچھی طرح نمٹ سکتا تھا۔ نواز اور سرفراز بھی یقیناً ایسا ہی کچھ سوچ رہے تھے۔ اپنی اپنی سوچوں میں گم تانگے کے ان سارے سواروں کے خیالات کا سلسلہ اس وقت ٹوٹا جب ویرانے کی خاموشی میں ابھرتی گھوڑے کی ٹاپیں بند ہو گئیں۔

"بس صاحب! اس سے آگے میں نہیں جا سکتا۔" کوچوان نے تانگا روکتے کے ساتھ ہی اعلان کیا۔

"ٹھیک ہے۔ زیادہ آگے جا کر ہمیں بھی واپسی میں مشکل ہو گی۔" نواز چانڈیو نے اعتراض کیے بغیر اس کی بات مان لی اور وہ سب تانگے سے اُتر گئے۔ نیچے اترنے کے بعد نواز چانڈیو نے کوچوان کو رقم تھمائی۔ یہ ایسا موقع تھا جب اس کی توجہ اسلم کی طرف سے لمحہ بھر کے لیے ہٹ گئی۔ اگر اسلم چاہتا تو اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اسے زیر کر سکتا تھا لیکن اس نے مناسب سمجھا کہ تانگے والے کو اپنے تانگے سمیت وہاں سے نکل جانے دے۔ وہ غریب آدمی تھا اور تھوڑے سے لالچ میں آ کر اس صورتِ حال میں پھنس گیا تھا۔ اس بے چارے کا مزید کسی مشکل سے دوچار ہوئے بغیر ہی یہاں سے نکل جانا مناسب تھا۔ آخرکار وہ اپنا تانگا لے کر وہاں سے روانہ ہو گیا۔ اس نے اپنے تانگے کی رفتار خاصی تیز رکھی تھی چنانچہ جلد ہی گھوڑے کی ٹاپوں کی آوازیں معدوم ہو گئیں۔ اور وہ سب پورے ارتکاز کے ساتھ ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہو گئے۔ سرفراز اور نواز کی آنکھوں سے نکلتی نفرت کی چنگاریاں صاف دیکھی جا سکتی تھیں۔

اسلم کا حال بھی کچھ مختلف نہیں تھا بلکہ اس کا نقصان تو کچھ زیادہ ہی تھا۔ ان دونوں نے تو صرف اپنا ایک بھائی کھویا تھا جبکہ اسلم نے اپنی ماں اور بہن کو کھونے کے ساتھ ساتھ اپنی زندگی بھی برباد ہوتی دیکھی تھی۔ پھر ایک ستم رسیدہ فاخرہ بھی تھی جسے اس کی دودھ شریک بہن ہونے کے جرم میں نواز چانڈیو جیسے بھیڑیے کی بیوی بننا پڑا تھا۔ وہ دونوں اس سے اپنے بھائی کے خون کا بدلہ لینے آئے تھے لیکن اگر وہ حساب کرتا تو اس کا نقصان ہر صورت زیادہ تھا۔ ماہ بانو الگ سراسیمہ تھی۔ اسلم سے محبت نہ کرنے کے باوجود وہ اس کی خیرخواہ تھی اور ہر صورت اس کی بھلائی چاہتی تھی۔ وہ ان بھائیوں کے ہاتھوں زیر ہو کر مارا جاتا تو بھی اسے دکھ ہوتا اور انہیں زیر کر کے جرم قتل کا مرتکب ہوتا تو بھی وہ تکلیف محسوس کرتی۔

"میں چاہوں تو ایک گولی تیرے بھیجے یا دل میں اتار کر ایک پل میں تیرا کام تمام کر دوں لیکن اس طرح میرے دل میں بھڑکتی انتقام کی آگ پوری طرح نہیں بجھے گی۔ میں تجھے تڑپا تڑپا کر ماروں گا تب ہی میرے سینے میں ٹھنڈ پڑے گی۔" آخرکار نواز چانڈیو نے ہی بولنے میں پہل کی اور اپنی نفرت کا اظہار کیا۔ یہ نفرت اس کے چہرے پر بھی لکھی ہوئی تھی۔ ابھی اندھیرا پوری طرح نہیں پھیلا تھا۔ چنانچہ اس ویرانے میں وہ چاروں ایک دوسرے کے تاثرات بخوبی دیکھ سکتے تھے۔ ماہ بانو نے بھی دیکھا کہ نواز چانڈیو کی بکواس کے جواب میں اسلم نے زبان سے ایک لفظ ادا نہیں کیا لیکن اس کے چہرے پر کسی زخمی درندے کی سی وحشت اتر

آئی۔۔۔ اور پھر جیسے کوئی کوبرا لپکتا ہے بالکل اسی طرح اس نے پھرتی سے اپنی پنڈلی کے ساتھ بندھا خنجر کھینچا اور نواز کے پستول والے ہاتھ پر دے مارا۔ اس کا نشانہ اتنا درست تھا کہ خنجر کے اِدھر اُدھر جا کر لگنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ نواز چانڈیو کے ہاتھ سے پستول نکل کر دور جا گرا اور اس نے زوردار چیخ مارتے ہوئے اپنے دوسرے ہاتھ سے خون آلود ہاتھ تھام لیا۔ دوسری طرف خود ماہ بانو نے بھی پھرتی کا مظاہرہ کیا اور جھکائی دے کر سرفراز سے خاصے فاصلے پر چلی گئی۔ وہ ایک بار اسلم کو اپنی وجہ سے ان لوگوں کے سامنے مجبور ہوتا دیکھ چکی تھی اب اتنی جلدی اس صورتِ حال کو دوبارہ دیکھنے اور سہنے کے موڈ میں نہیں تھی اس لیے اس کی ذہنی اور جسمانی چابک دستی زوروں پر تھی۔ جھکائی دے کر اپنی جگہ سے ہٹتے ہوئے اس نے اس بات کو ذہن میں رکھا تھا کہ نواز کا پستول کس سمت میں گرا ہے چنانچہ اس نے اسی طرف کا رخ کیا اور پستول اپنی گرفت میں لینے میں کامیاب ہو گئی۔

”اپنی اپنی جگہ پر سیدھے کھڑے ہو جاؤ ورنہ میں تم دونوں کو گولی مار دوں گی۔“ نہایت مہارت سے پستول پر اپنی گرفت مضبوط کرتے ہوئے اس نے دھمکی دی تو اسلم نے چونک کر اس کی طرف دیکھا پھر اس کے ہونٹوں پر ایک مطمئن سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔

”تمہیں کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آج تم مجھے ان کے ساتھ دو دو ہاتھ کر لینے دو ورنہ یہ بار بار میری راہ میں آ کر کھڑے ہوتے رہیں گے۔ میں تمہیں حکم دے رہا ہوں کہ تم اپنی حفاظت کے علاوہ کسی بھی دوسری صورت میں اس ہتھیار کا استعمال نہیں کرو گی۔ یہ مردوں کی لڑائی ہے اور میں اسے مردانہ وار ہی لڑنا چاہتا ہوں۔“

اسلم کی بات نے اسے کشمکش میں مبتلا کر دیا لیکن پھر اسے لگا کہ اس کے پاس اس کی بات مان لینے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔ زبانی دھمکی دینا الگ بات تھی لیکن اس کے لیے نواز اور سرفراز کو گولی مار کر ان کا قصہ ختم کر دینا آسان نہیں تھا۔ وہ شدید مجبوری کے علاوہ کسی انسان پر گولی چلا ہی نہیں سکتی تھی اور یہاں تو اسلم موجود تھا اس سب سے نمٹنے کے لیے چنانچہ وہ اپنی رضامندی کے اظہار کے لیے اثبات میں سر ہلاتی ہوئی ایک جانب کھڑی ہو گئی۔ یہ یقین ہو جانے کے بعد کہ ان پر اسلحے کا استعمال نہیں کیا جائے گا، دونوں بھائی نڈر ہو گئے اور بیک وقت اسلم پر چھلانگ لگا دی۔

اسلم کی عقابی نظریں ان کے بدن کی ایک ایک جنبش کو دیکھ رہی تھیں۔ جیسے ہی وہ دونوں بھائی دائیں بائیں سے اس پر حملہ آور ہوئے، وہ تیزی سے حرکت میں آیا اور ان دونوں کے ٹکرانے سے قبل ہی جھکائی دے کر ذرا فاصلے پر جا گرا۔ دونوں بھائی اپنے ہی زور میں ایک دوسرے سے ٹکرائے اور بلبلاتے ہوئے زمین پر گر گئے۔ انہیں اٹھنے کی مہلت دیے بغیر اسلم حرکت میں آیا اور ان کی طرف چھلانگ لگاتے ہوئے اپنی بائیں ٹانگ کو اس طرح گھمایا کہ وہ پہلے نواز کے جبڑے کا مزاج پوچھتی ہوئی سرفراز کی ناک سے جا ٹکرائی۔ پیروں میں موجود سخت تلے والے جوتوں کی وجہ سے دونوں ہی نے ضرب کی تکلیف کو شدت سے محسوس کیا اور حلق سے نکلنے والی چیخوں کو کسی طرح نہ روک سکے۔ خاص طور پر سرفراز زیادہ تڑپا کیونکہ اسے لگ رہا تھا کہ اس کی ناک کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔ نتھنوں سے بہہ کر ہونٹوں پر آتے خون کا نمکین ذائقہ وہ اپنی زبان پر محسوس کر سکتا تھا۔ اپنے ہی خون کے ذائقے نے اس کو وحشت زدہ کر دیا اور وہ کسی بھی نتیجے کی پروا کیے بغیر غراتا ہوا اسلم کی طرف لپکا۔ اس کے انداز میں اتنی وحشت تھی کہ اسلم اپنی تمام تر پھرتی کے باوجود خود کو اس کے وار سے نہ بچا سکا اور سرفراز کا پتھر جیسا سر اس کے پیٹ سے ٹکرا گیا۔ ضرب شدید تھی چنانچہ اس کے قدم اکھڑ گئے۔ اسی لمحے نواز بھی سنبھل کر اس پر حملہ آور ہوا اور دونوں بھائیوں نے مل کر اسے پچھاڑ لیا اب صورتِ حال یہ تھی کہ وہ زمین پر چت لیٹا ہوا تھا اور ایک نے اس کے پیر اور دوسرے نے ہاتھ جکڑ رکھے تھے۔

ایسا لگتا تھا کہ دونوں بھائی اس پر حاوی آ چکے ہوں لیکن وہ اسلم تھا۔ خطروں اور مشکلوں کو خاطر میں لائے بغیر ان سے بچ نکلنے کی تدبیر کرنے والا۔ اپنی خراب پوزیشن کے باوجود اس نے اپنے حواس قائم رکھے اور یہ اندازہ لگانے میں کامیاب ہو گیا کہ نواز کی گرفت اپنے زخمی ہاتھ کی وجہ سے ذرا کمزور ہے۔ حقیقت میں تو وہ اس ہاتھ کو جس پر اسلم نے خنجر سے وار کیا تھا، استعمال کرنے کے قابل ہی نہیں تھا۔ نواز کی یہ کمزوری بھانپتے ہی اس نے پھرتی سے اپنے جسم کے بالائی حصے کو حرکت دی اور لیٹے لیٹے اسے اپنے ہاتھوں پر اٹھا کر پوری قوت سے سرفراز پر دے مارا۔ نواز کے جسم کے زور سے سرفراز پیچھے کی طرف الٹ کر گر پڑا۔ اسلم ایک لمحہ لگائے بغیر پھرتی سے کھڑا ہوا اور ان دونوں پر جا پڑا۔ اب ان کے پاس خود کو بچانے کے لیے کوئی مہلت نہیں تھی۔ اسلم کے چاروں ہاتھ پیر چل رہے تھے اور تابڑ توڑ ان کے جسموں پر پڑ رہے تھے۔ وہ دو ہونے کے باوجود اپنے اوپر ٹوٹ پڑنے والی اس افتاد سے بچنے کے لیے کچھ نہیں کر پا رہے

تھے۔ جسم کے ایک حصے کو بچانے کے لیے ہاتھ سامنے کرتے تو دوسرا حصہ زد میں آ جاتا اور وہ یوں تڑپ اٹھتے جیسے کسی بھاری ہتھوڑی سے کاٹا جا رہا ہو۔ اندھا دھند لگائی جانے والی ان ضربوں میں سے ایک ضرب اس شدت سے سرفراز کی کنپٹی پر پڑی کہ وہ اپنے حواس قائم نہیں رکھ سکا اور بے ہوش ہو کر زمین پر گر گیا۔ بھائی کی یہ حالت دیکھ کر نواز کی گھگی بندھ گئی اور وہ تھوڑی بہت جو مزاحمت کر رہا تھا، اس سے بھی گیا۔

”بہت تڑپا تڑپا کر مارا ہے نا تو نے میری ماں کو۔ اب بتا کہ تجھے کون بچائے گا؟ تو نے اپنے لیے جگہ کا انتخاب خود کیا ہے۔ یہاں میں تیرے جسم کا ریشہ ریشہ بھی الگ کر دوں گا تو کوئی تیری چیخ و پکار سن کر بچانے والا نہ ہو گا۔“ دایاں پیر اس کی گردن پر جما کر وہ جس سفاکی سے بولا، اسے محسوس کر کے نواز چانڈیو تو کیا ذرا فاصلے پر کھڑی یہ تماشا دیکھتی ماہ بانو بھی پوری جان سے تھرا گئی۔

”مجھے معاف کر دو اسلم! اب میں تیری راہ میں کبھی نہیں آؤں گا۔“ کچھ دیر قبل بڑھکیں مارنے والا نواز چانڈیو اس وقت کسی حقیر کیچوے کی طرح زمین پر پڑا اس سے رحم کی بھیک مانگ رہا تھا۔ اس کے مضروب ہاتھ کے علاوہ بھی جسم کے مختلف حصوں پر چوٹیں آئی تھیں۔ جبڑے پر لگنے والی ضرب نے تو ایسا کام دکھایا تھا کہ وہ اپنے اندرونی کان تک میں تکلیف محسوس کر رہا تھا اور اسے بولنے میں مشکل پیش آ رہی تھی۔

”تجھے معاف کر دوں تجھے؟ تو نے اور تیرے خاندان نے مل کر میری زندگی تباہ کر دی۔ یہ تم ہی لوگ تھے جن کے لالچ کی وجہ سے مجھے ہاتھوں سے قلم چھوڑ کر ہتھیار اٹھانا پڑا۔ میں اعلیٰ افسر بننے کے خواب بھول کر لٹیرا بن گیا اور جب میں اس جرم میں پکڑا گیا تو تم نے میری بہن کا رشتہ اپنے بھائی سے ختم کر کے اسے خودکشی کرنے پر مجبور کر دیا۔ صرف تم لوگوں کی وجہ سے قاتل بھی بنا اور ڈاکو بھی۔ میری زندگی کے کتنے قیمتی سال کسی درندے کی طرح جنگلوں کی خاک چھانتے گزر گئے اور اس پر بھی تم لوگوں کو چین نہیں آیا۔ تم نے ایک طرف فاخرہ جیسی معصوم لڑکی کی زندگی برباد کی تو دوسری طرف میری بوڑھی بے بس ماں کو تڑپا تڑپا کر مارا۔ اتنا سب کچھ کرتے ہوئے تمہیں رحم نہیں آیا۔۔۔ تو پھر آج مجھ سے معافی کی امید کیوں رکھتے ہو۔ میں تو تم دونوں کی بوٹی بوٹی الگ کر کے چانڈیو خاندان کو تحفے میں بھیجوں گا کہ اگر ان میں اب بھی کسی کی سوچ میں دم ہے تو اسلم کے سامنے آئے اور اپنا انجام دیکھ لے۔“

وہ گویا قہر و غضب میں بپھرا ہوا سمندر تھا جو سب کچھ پاش پاش کر کے رکھ دینا چاہتا تھا۔ اپنے اس جنون میں اس نے نواز کی گردن پر سے پیر ہٹا کر اس کی مضروب ہتھیلی کی انگلیوں کو پاؤں کے نیچے دبایا اور پوری قوت سے آر پار ہو جانے والے خنجر کو کھینچ لیا۔ خنجر نکلتے ہی اس کے ہاتھ سے ایک بار پھر تیزی سے خون کا اخراج شروع ہو گیا لیکن اسلم کو گویا کچھ نظر ہی نہیں آ رہا تھا۔ وہ تو بہت چمکتی ہوئی نظروں سے اپنے محبوب خنجر کی دھار کو دیکھ رہا تھا۔ ہر وقت اس کی پنڈلی سے بندھا رہنے والا یہ خنجر کئی نازک مواقع پر اس کے کام آیا تھا۔ خوش قسمتی سے آج بھی نواز اور سرفراز میں سے کسی کو ہوٹل سے روانہ ہونے سے قبل اس کی جامہ تلاشی کا خیال نہیں آیا تھا چنانچہ یہ صرف خنجر پکڑا جانے سے بچ گیا تھا بلکہ وہ رقم بھی محفوظ رہی تھی جسے احتیاط کے پیشِ نظر وہ کپڑوں کے نیچے اپنے جسم سے باندھ کر رکھتا تھا۔

چند لمحوں کے لیے خنجر کا جائزہ لینے کے بعد اس کا ہاتھ اٹھا اور قوس بناتا ہوا نواز چانڈیو کے جسم کی طرف بڑھا۔ خوف سے اس کا چہرہ سیاہ پڑ گیا اور تکلیف کے خیال سے اس نے پہلے ہی ہونٹ بھینچ کر آنکھیں بند کر لیں۔

”بس اسلم! تم اسے نہیں مارو گے۔ میں تمہیں ایسا نہیں کرنے دوں گی۔“ خنجر نواز چانڈیو سے چند انچ کی دوری پر تھا کہ ماہ بانو نے لپک کر اسلم کا خنجر والا ہاتھ تھام لیا۔ نازک ہاتھوں کی یہ گرفت اسلم کے لیے بڑی مضبوط تھی۔ بے پناہ طیش میں ہونے کے باوجود وہ چند انچ کا باقی رہ جانے والا فاصلہ اپنے خنجر کو طے نہ کروا سکا۔

”مجھے مت روکو ماہ! اس شخص کے کھاتے میں اتنے مظالم ہیں کہ اسے اس کے انجام تک پہنچائے بغیر میرے دل میں ٹھنڈک نہیں پڑے گی۔“ اس نے نہایت بے بسی سے ماہ بانو سے درخواست کی۔ آج پہلی بار اس نے اس کے لیے یہ طرزِ تخاطب استعمال کیا تھا اور نہایت مخدوش حالات کے باوجود ماہ بانو کے دل کو اس کا یہ طرزِ تخاطب پسند آیا تھا لیکن یہ وقت اپنی پسند ناپسند کے اظہار کا نہیں بلکہ بپھرے ہوئے اسلم کو سنبھالنے کا تھا۔

”تم میرے سامنے جرائم سے مکمل طور پر کنارہ کش ہونے کا وعدہ کر چکے ہو اسلم اور میں یہ کسی طور گوارا نہیں کر سکتی کہ تم میرے سامنے کسی کی جان لو۔ اگر معاملہ دفاع کا ہوتا اور تم اس کا کوئی وار بچاتے ہوئے اسے ہلاک کر دیتے تو میں نظرانداز کر دیتی لیکن اب یہ بالکل نہتا اور بے بس تمہارے

قدموں میں پڑا ہے اور تم سے اپنی جاں بخشی کا طالب ہے۔ اب کسی طور اس بات کی گنجائش نہیں نکلتی کہ تم اسے کوئی نقصان پہنچاؤ۔" وہ بہت ٹھوس لہجے میں اپنے عمل کے حق میں دلائل دے رہی تھی۔

"یہ آج بے بس ہے اس لیے اس کا سر کچل دینا بہتر ہے۔ میں نے اسے چھوڑ دیا تو پھر یہ مجھ پر وار کرنے کے لیے کبھی نہ کبھی میرے سامنے آ کھڑا ہوگا۔" اس نے جوابی دلیل دی۔

"اللہ، رسولؐ، قرآن جس کی چاہے قسم لے لو اسلم! آج کے بعد میں کبھی تمہاری راہ میں نہیں آؤں گا۔ اگر کبھی اتفاق سے بھی تمہارا سامنا ہو گیا تو نظر چرا کر گزر جاؤں گا۔" نواز جو ذہنی طور پر اپنی موت کے لیے تیار ہو گیا تھا، مایوسی کے گھپ اندھیرے میں نظر آنے والی امید کی کرن کو دیکھ کر جھٹ بول پڑا۔ اس کی بات ایسی تھی کہ اسلم بھی ٹھٹک گیا۔ وہ جانتا تھا کہ نواز کے خاندان کے لوگ لاکھ لالچی اور کینہ پرور سہی لیکن اس درجے ذلیل نہیں تھے کہ اللہ، رسولؐ یا قرآن کی قسم کھا کر کوئی جھوٹا وعدہ کر سکیں۔

"اس کی بات کا یقین کر لو اسلم! یہ درمیان میں جو حوالے لے آیا ہے، ہم انہیں رد کر ہی نہیں سکتے اور پھر فاخرہ کا بھی سوچو۔ چاہے زور زبردستی کے نتیجے میں ہی سہی لیکن تمہاری منہ بولی بہن اس کی بیوی اور اس کے بچے کی ماں ہے۔ اگر اسے کچھ ہوا تو فاخرہ بیوہ اور اس کا بچہ یتیم ہو جائے گا۔" اسے نرم پڑتا دیکھ کر ماہ بانو نے ایک ضرب اور لگائی۔ وہ پہلے ہی قائل ہونے لگا تھا، فاخرہ کا ذکر آنے پر بالکل ہی ڈھے گیا۔ رشتوں کا احترام اور محبت اس کی گھٹی میں موجود تھے۔ وہ کیسے اس بات کو نظر انداز کر دیتا۔۔۔

"ٹھیک ہے لیکن اسے یہ وعدہ بھی کرنا ہوگا کہ فاخرہ کو آئندہ اس کی ذات سے کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی اور یہ پوری عزت اور محبت کے ساتھ اسے اپنے ساتھ رکھے گا۔ اس کا ہر حق اپنا فرض سمجھ کر ادا کرے گا۔" اس نے شرط عائد کی۔

"میں وعدہ کرتا ہوں۔ آئندہ کبھی تم میں سے کسی کا گاؤں آنا ہو تو فاخرہ سے مل کر خود معلوم کر لینا کہ میں اس کے ساتھ کیسا سلوک کرتا ہوں۔ تمہیں میری طرف سے کوئی شکایت سننے کو نہیں ملے گی۔" وہ گویا کسی قبر کے کنارے کھڑا تھا اور ڈر رہا تھا کہ اسلم کی کوئی بھی بات ماننے سے لمحہ بھر کی بھی دیر کی تو وہ لات مار کر اسے قبر میں دھکیل دے گا چنانچہ جلدی جلدی بنا کسی تاخیر کے اس کی ہر شرط قبول کرتا جا رہا تھا۔

"میں نے تیرے ہر وعدے پر یقین کر لیا۔ اگر کبھی تیری یا تیرے بھائی کی طرف سے کوئی وعدہ خلافی ہوئی تو یاد رکھنا کہ میں تجھے اتنی مہلت بھی نہیں دوں گا کہ تو مجھ سے رحم کی بھیک مانگ سکے۔" سفاکی سے کہتا ہوا وہ پیچھے ہٹا اور اپنا خنجر اس کے کپڑوں سے صاف کر کے واپس پنڈلی سے باندھ لیا۔ خنجر کی دہشت زدہ کر دینے والی نوک نظروں کے سامنے سے ہٹی تو نواز جانڈیو کی جان میں جان آئی۔

"تمہارا بہت شکریہ اَدی! تمہاری وجہ سے ہماری جانیں بچ گئیں۔" کچھ دیر قبل ماہ بانو کے لیے حقیر ترین الفاظ استعمال کرنے والا اسے بہن کہہ کر مخاطب کر رہا تھا۔ یہ بھی ایک کمال تھا۔

"مجھے اَدی کہہ کر پکارا ہے تو پھر اس لفظ کا بھرم بھی رکھنا۔ میں نے سنا ہے تمہاری قوم میں اگر کوئی مرد کسی عورت کو اَدی کہہ دے تو پھر ساری زندگی اس لفظ کی لاج رکھتا ہے۔۔۔ چاہے اپنی جان سے ہی کیوں نہ چلا جائے۔"

"تم ہمیں اتنی غیرت مندوں میں سے پاؤ گی۔ آج کے بعد تمہیں یا اسلم کو ہماری طرف سے کوئی تکلیف پہنچے کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ہاں اگر تم کسی اور وجہ سے تکلیف میں مبتلا ہو تو اپنے اس بھائی کو مدد کے لیے پکار سکتی ہو۔" وہ کافی تکلیف میں تھا اس لیے بولتے ہوئے اس کی آواز لڑکھڑا رہی تھی۔ زندگی بچ جانے کی خوشی نے اس کے سارے کس بل نکال دیے تھے۔ اس وقت وہ خود کو ان کا سب سے بڑا خیر خواہ ثابت کرنے پر تلا ہوا تھا۔

"اب چلو ماہ! کیا اس مردود سے مذاکرات کرنے میں ہی ساری رات گزار دو گی؟" اسلم اس کی خواہش پر ان دونوں بھائیوں کی جاں بخشی تو کر چکا تھا لیکن بہرحال، اتنا اعلیٰ ظرف نہیں تھا کہ خود کو اتنے ڈھیر سارے نقصانات پہنچانے والے شخص سے اسے باتیں کرتا دیکھ کر اپنے خون کو کھولنے سے روک سکے چنانچہ اسے ٹوک ہی دیا۔

"ہاں ٹھیک ہے ہم اب چلتے ہیں۔" وہ فوراً ہی اس کی طرف بڑھ گئی۔ اس ویرانے سے نکلنے کے لیے ان کے پاس سواری کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ اس لیے یہ طے تھا کہ اچھا خاصا فاصلہ انہیں پیدل ہی طے کرنا ہوگا۔ نواز اور سرفراز کو بھی اسی طریقۂ کار پر عمل کرنا پڑتا لیکن ان کی روانگی فوری طور پر متوقع نہیں تھی۔ سرفراز بے ہوش تھا۔ نواز کو اسے ہوش میں لانے میں کچھ دیر لگتی پھر دونوں ہی کی حالت اتنی خراب تھی کہ وہ وہاں سے نکلتے تو گرتے پڑتے ہی وہ فاصلے طے کر پاتے۔ اچھے خاصے زخمی ہونے کی وجہ سے ان کے لیے ماہ بانو اور

اسلم کی رفتار سے سفر کرنا ممکن نہیں ہوتا چنانچہ انہیں ایسا کوئی اندیشہ نہیں تھا کہ واپسی کے سفر میں وہ دونوں ان کے لیے کوئی رکاوٹ کھڑی کر سکیں۔ احتیاطاً روانگی سے قبل اسلم نے دونوں کی جامہ تلاشی بھی لے لی تھی لیکن پہلے ہی ماہ بانو کے قبضے میں آ جانے والے پسٹل کے علاوہ ان کے پاس سے کوئی ہتھیار برآمد نہیں ہوا تھا۔ یقیناً ان دونوں سے اسلم کو جج کرنے میں غلطی ہو گئی تھی اور وہ محض اپنے دو ہونے کے زعم میں بغیر مناسب تیاری کے ہی اس کے مقابل اتر آئے تھے۔ اب نتیجہ خود ان کے سامنے تھا۔ اسلم ان کی جاں بخشی کا احسان ان کے سر رکھ کر انہیں اس ویرانے میں چھوڑ کر خود نہایت اطمینان سے وہاں سے جا رہا تھا۔

"ہوٹل کے کمرے میں تمہاری کوئی خاص چیز تو موجود نہیں ہے؟ میں نہیں چاہتا کہ ہم سامان لینے کے لیے ہوٹل جائیں اور کسی مشکل میں پڑ جائیں۔" وہ لوگ جب اتنا فاصلہ طے کر چکے کہ انہیں دونوں بھائی نظر آنا بند ہو گئے تو اسلم نے اس سے پوچھا۔

"ہم اس وقت ہوٹل کے بجائے کہاں جا رہے ہیں؟" اس کی بات سن کر ماہ بانو نے حیرت سے استفسار کیا۔

"میں آج رات ہی یہ شہر چھوڑ کر نکل جانا چاہتا ہوں۔ نواز کے وعدے پر یقین ہونے کے باوجود میں کوئی رسک لینے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ زندگی نے بہت مشکل سے مجھ پر تھوڑا سا مہربان ہونا شروع کیا ہے اور میں اپنا سب کچھ گنوا دینے کے بعد اب تھوڑا سا سکون چاہتا ہوں اس لیے ہماری آج رات ہی یہاں سے روانگی ضروری ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ ہمیں یہاں سے نکل کر بس اڈے تک پہنچنے کے لیے اتنی مہلت مل جائے گی کہ آخری روانہ ہونے والی بس میں سوار ہو سکیں۔" وہ پورا پروگرام طے کر چکا تھا۔

"اگر تمہاری یہی خواہش ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ نہ ہی ہوٹل کے کمرے میں میری ایسی کوئی چیز موجود ہے جس کی خاطر میں وہاں جانا چاہوں۔" ماہ بانو نے حامی بھر لی۔

"میرا بھی یہی اندازہ تھا۔" وہ مطمئن ہو گیا۔ اصولی طور پر تو وہ جانتا ہی تھا کہ چند جوڑے کپڑوں کے علاوہ روزمرہ استعمال کی بس چند اشیا ہی ان کے اسباب میں شامل تھیں اس لیے ہی یہ پروگرام ترتیب دیا تھا۔ وہ اپنا اسلحہ بھی حامد راؤ کے پاس امانتاً رکھوا کر آیا تھا اور رقم کا کافی بڑا حصہ بھی۔ شناختی کاغذات سے وہ اور ماہ بانو دونوں ہی فی الحال محروم تھے اس لیے سامان میں ان کی موجودگی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

ویرانے سے آبادی تک کا پیدل سفر طے کر کے آخر کار وہ ایسے مقام پر پہنچ گئے جہاں سے انہیں ایک آٹو رکشا مل گیا۔ رکشے میں بیٹھ کر وہ بس اڈے پہنچ گئے۔ آخری بس روانہ ہی ہونے والی تھی اور یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ اس میں چند سیٹیں خالی تھیں۔ ٹکٹ اور کھانے پینے کی چند چیزیں خرید کر اسلم اس کے ساتھ بس میں سوار ہو گیا۔ ان کے سوار ہوتے ہی بس چل پڑی۔ ماہ بانو نے بس کے اندر جلتی لائٹوں میں پہلی بار اسلم کے چہرے کا تفصیلی جائزہ لیا۔ وہاں بے تحاشا حزن و ملال ثبت تھا۔ وہ سمجھ سکتی تھی کہ اس کی یہ کیفیت اپنی ماں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کھو دینے اور پھر نواز و سرفراز کو انتقام لیے بغیر چھوڑ دینے کی وجہ سے ہے اس کے لیے اپنے دل میں گہری ہمدردی محسوس کرتے ہوئے اس نے اپنا ہاتھ اسلم کے گھٹنے پر رکھے اس کے دائیں ہاتھ پر رکھا۔ اتنے سے عمل میں ہی اس کی انگلیاں کپکپانے لگی تھیں۔ اس کی اس انوکھی حرکت پر اسلم نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"سوچ سوچ کر خود کو اتنا نڈھال نہ کرو۔ میں تمہیں تفصیل سے بتاتی ہوں کہ میں جب تمہارے گاؤں پہنچی تو وہاں کیا حالات پیش آئے۔ دکھ تو بالکل فطری بات ہے لیکن پھر بھی مجھے یقین ہے کہ تم بہت سی باتیں جان کر اطمینان بھی محسوس کرو گے۔" وہ خود ہی اسے ایک ایک تفصیل سے آگاہ کرتی چلی گئی البتہ اس تفصیل کو بیان کرتے ہوئے اس نے اس بات کا دھیان رکھا تھا کہ دکھ دینے والی باتوں کا تذکرہ سرسری ہی رہے۔ اسلم نے اس کا ہر لفظ پوری توجہ سے سنا لیکن زبان سے کچھ نہ بولا۔ اس کے چہرے پر چھائی سرخی البتہ گواہی دے رہی تھی کہ وہ ضبط کے کڑے مراحل سے گزر رہا ہے۔ سب کچھ سن لینے کے بعد اس نے اپنا سر پشت گاہ سے ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔ بہت دیر وہ اسی کیفیت میں بیٹھا رہا۔ ماہ بانو نے میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اسے مخاطب کر سکتی۔ وہ یونہی بس میں موجود مسافروں کا جائزہ لینے لگی۔ ان میں اکثریت مردوں کی تھی جو چند ایک عورتیں تھیں بھی تو اتنے سخت پردے میں کہ ان کے ہاتھ پیروں کی انگلیاں تک دکھائی نہیں دے رہی تھیں۔ ایسے میں محض چادر میں لپٹی ماہ بانو کا وجود بہت سوں کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔ ان حریصانہ نظروں کی چبھن سے شدید الجھن محسوس کرتی ہوئی وہ ایک بار پھر اسلم کی طرف متوجہ ہو گئی۔ بند آنکھوں کے باوجود نہ جانے کیسے اس نے اس کا متوجہ ہونا محسوس کر لیا اور نہایت آہستہ آواز میں اسے پکارا۔

"ماما......" چند گھنٹوں میں وہ دوسری بار اس کے لیے یہ طرز تخاطب استعمال کر رہا تھا۔

"ہوں۔" اسے لگا کہ اسلم کی وہ پکار کچھ غیر معمولی ہے اس لیے خود بھی اتنی ہی دھیمی آواز میں اسے جواب دیا۔

"ہم یہاں سے حامد راؤ کے گھر پہنچتے ہی نکاح کر لیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔" دل کی دھڑکن کچھ معدوم سی ہونے لگی تھی اس کے باوجود اس نے اسے اثبات میں جواب دیا۔ پھر کچھ خیال آنے پر بولی۔ "لیکن حامد راؤ کے سامنے تو آپ نے ہمارے رشتے کے بارے میں کچھ اور ہی بتایا تھا۔ ہم ان کے گھر میں کس طرح نکاح کر سکتے ہیں؟"

"ہم کورٹ میرج کر لیں گے۔" اسلم نے حل بتایا۔

وہ دونوں بے حد احتیاط سے بس اتنی آواز میں بات کر رہے تھے کہ ان کی آوازیں کسی تیسرے کے کانوں میں نہ پڑ سکیں یوں بھی خوش قسمتی سے ان کے آگے والی سیٹ خالی پڑی ہوئی تھی۔

"ہمارے پاس تو شناختی کاغذات بھی نہیں ہیں۔ ہم کورٹ میرج کیسے کر سکتے ہیں؟" اس نے اہم مسئلے کی طرف توجہ مبذول کروائی۔

"تو پھر ہم کسی مسجد کے ملا کو پکڑ لیں گے کہ بس جناب شرعی تقاضے پورے کر دیں، باقی دنیاوی و قانونی مسائل سے ہم بعد میں نمٹتے رہیں گے۔" اس کے پاس کوئی مسئلہ لاینحل نہیں تھا۔

"ہاں ایسا تو ہو سکتا ہے لیکن ایسے اہم موقع پر کسی اپنے کو تو موجود ہونا چاہیے۔ کسی ایسے شخص کو جو ہماری خوشی میں خوش ہو سکے۔" وہ کچھ اداس سی تھی۔ فطری طور پر اس نے بھی ہر لڑکی کی طرح اپنی شادی کے حوالے سے کچھ خواب بُن رکھے تھے اور ایسی عجیب سی شادی کے خیال سے دکھی ہو رہی تھی۔

"میرا تو تمہیں معلوم ہی ہے کہ کوئی اپنا باقی ہی نہیں رہا۔ ہاں اگر تمہارا کوئی ایسا اپنا ہے جسے تم اپنی خوشی میں بلا سکو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔" وہ بہت کول موڈ میں تھے۔

البتہ ماہ پا سوچ میں پڑ گئی۔ بے جی اور ابا جی اس کی شادی پر سب سے زیادہ خوش ہوتے، چودھری کے کارندوں کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ سگی ماں پاگل ہو چکی تھی اور باپ اس کے پیچھے خوار تھا۔ ایک بھائی اور بہن زندگی کی بازی ہار چکے تھے اور جو ایک بہن بچی تھی وہ بھی اپنے سسرال والوں کی وجہ سے مجبور ہو جاتی۔ سگی سہیلیاں تو بس ویسے ہی چھوٹ گئی تھیں غرض یہ کہ چودھری سے پالا پڑنے کے بعد اس سے اس کے سارے اپنے چھوٹ گئے تھے۔ اپنوں کی اس قحط سالی میں بس ایک شخص ملا تھا جو دل کو اچھا لگا تھا لیکن پھر معلوم ہوا کہ وہ بھی ڈاکٹر ماریا کا ہو گیا ہے۔ اس کا خیال دل میں آنے پر وہ بے چین سی ہو گئی۔ کوئی عہد و پیمان نہ ہونے کے باوجود آج بھی دل میں یہ یقین تھا کہ وہ اسے پکارے گی تو وہ ضرور آئے گا۔ اس نے یہ بات اسلم سے کچھ نہیں کہا لیکن دل میں یہ طے ضرور کر لیا کہ وہ اپنے اس یقین کو آزمائے گی ضرور......

☆☆☆

"کہاں کی تیاری ہے جناب؟" وہ ٹائی کی ناٹ درست کرتے ہوئے آئینے میں اپنا جائزہ لے رہا تھا کہ اسے اپنے پیچھے ماریا کا عکس نظر آیا۔ وہ بڑے دلربا انداز میں مسکراتی ہوئی اس سے سوال کر رہی تھی۔

"بس...... ایک دوست سے ضروری ملاقات کرنی تھی۔" اس نے سرسری سا جواب دیا۔

"یہاں آ کر بھی آپ کے ضروری کاموں کا سلسلہ ختم نہیں ہوا۔ میں تو سوچ رہی تھی کہ میری نہ سہی ممانی جان کی محبت میں آپ گھر میں ٹک کر بیٹھیں گے اور کچھ وقت مجھی کو دیں گے لیکن آپ کا تو وہی پرانا حال ہے۔ نور کوٹ ہو یا لاہور آپ کو رہنا سرکاری افسر ہی ہے۔ سوٹ بوٹ میں ملبوس، فائلوں میں سر دیے اور میٹنگوں میں مصروف۔" اس نے شکوہ کیا۔ وہ لوگ آج صبح سویرے ہی لاہور پہنچے تھے۔ لاہور آنے کا یہ پروگرام شہریار نے رات گئے اچانک ہی طے کر لیا تھا اور اب چند گھنٹوں بعد ہی گھر سے نکل پڑنے کو تیار تھا۔

"ہر محبت کا اپنا مقام ہوتا ہے بیگم صاحبہ! ممانی جان کے لیے بے شک میرے دل میں بہت محبت ہے لیکن اس وقت وطن کی محبت کا تقاضا ہے کہ میرا اپنے دوست سے ملنے کے لیے جانا ضروری ہے۔ بلکہ تم یہ سمجھو کہ میری لاہور آمد کا اصل مقصد ہی یہی تھا...... سوچا ساتھ میں ماموں اور ممانی سے بھی مل لیتے ہیں۔ بہت دنوں سے ملاقات ہی نہیں ہوئی تھی۔ ایک موقع نکلا تو میں نے اسے ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا۔" اب وہ سامنے سجی پرفیوم کی شیشیوں میں سے اپنے لیے کوئی خوشبو منتخب کر رہا تھا۔ ماریا نے اس کا انتخاب مکمل ہونے سے پہلے نیلگوں محلول والی ایک بوتل اٹھائی اور اسپرے کا ڈھکن ہٹا دیا۔

"اگر آپ کا وہ دوست کوئی لڑکی نہیں ہے تو یہ خوشبو

بہت مناسب رہے گی۔" اس کے لہجے اور انداز میں کچھ شوخی تھی۔

"دوست فی میل بھی ہو تو کوئی فرق نہیں پڑتا ہاں البتہ اگر کوئی گرل فرینڈ ہوتی تو الگ بات تھی۔" اس نے ماریا کی بات کا برا مانے بغیر دوستی لہجے میں جواب دیا۔

"میرے ہوتے ہوئے آپ گرل فرینڈ بنائیں گے؟" اس نے ہلکا سا مکا شہریار کے بازو پر مارا۔ ابتدائی دنوں کے مقابلے میں ان دونوں کے تعلقات کافی خوشگوار ہو گئے تھے اور وہ ایک دوسرے کے ساتھ خاصی بے تکلفی سے پیش آنے لگے تھے۔

"افسوس کہ مجھے تمہارے نہ ہوتے ہوئے بھی کبھی اس کام کی فرصت نہیں مل سکی۔" اس نے چہرے پر خوامخواہ کی اداسی طاری کی۔

"اب پچھتاوے کیا ہوت جب چڑیا چگ گئی کھیت۔ چاہیے اب جا کر اپنے میل فرینڈ سے ہی ملاقات پر اکتفا کیجیے۔" اس کی اداکاری پر ماریا کو ہنسی آ گئی۔

"وہ تو میں جا ہی رہا ہوں۔ تمہیں دھکے دینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" اس نے مصنوعی خفگی دکھائی۔

"خوامخواہ کی الزام تراشی مت کیجیے۔ مجھے معلوم ہے کہ میں نے آپ کو روکنا بھی چاہا تو آپ ہرگز نہیں رکیں گے۔" ماریا نے حقیقت بیان کی تو وہ مسکرا دیا۔

"اچھا تو پھر اجازت؟"

"بالکل اجازت ہے جناب لیکن آپ کی تیاری میں کچھ کمی سی لگ رہی ہے۔" اس نے شہریار کا تنقیدی جائزہ لیا۔

"کیسی کمی؟"

"ٹائی کے ساتھ ٹائی پن نہیں ہے۔ آپ ایک منٹ رکیں میں لے کر آتی ہوں۔ پچھلی بار آپ کے لیے خریدی تھی لیکن دینی یاد نہیں رہی۔" وہ لپک کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ دوبارہ واپس آئی تو اس کی مٹھی میں کچھ دبا ہوا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر خود ہی وہ پن شہریار کی ٹائی میں لگا دی۔ اس نے آئینے میں جائزہ لیا۔ گٹار کی شکل کی وہ ٹائی پن اپنی بناوٹ کے اعتبار سے اگرچہ خاصی نفیس تھی لیکن اسے اپنے ذوق سے کافی ہٹ کر کچھ بچکانا سی لگی۔ مجبوری یہ تھی کہ وہ ماریا کے سامنے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار بھی نہیں کر سکتا تھا چنانچہ جبراً مسکرا کر تھینکس کہتا ہوا باہر نکل گیا۔

پورچ میں اس کی گاڑی کھڑی تھی جسے وہ خود ڈرائیو کر کے لاہور لایا تھا۔ مشابرم خان کے ٹالی والا سے زخمی حالت میں واپس آنے کی وجہ سے اس نے اسے اتنی لمبی ڈرائیو کے لیے زحمت دینا مناسب نہیں سمجھا اور اسے نور کوٹ میں آرام کے لیے چھوڑ آیا تھا۔ اس وقت بھی اسے خود ہی اپنی گاڑی ڈرائیو کر کے ایک فور اسٹار ہوٹل جانا تھا جہاں میجر ذیشان سے اس کی ملاقات طے تھی۔

کل رات میجر ذیشان نے ہی اسے فون کر کے یہاں ملاقات کا پروگرام ترتیب دیا تھا۔ وہ خاصا پرجوش محسوس ہو رہا تھا اور گفت وشنید کے لیے سیل فون کو نامناسب قرار دیتے ہوئے بالمشافہ ملاقات کا خواہش مند تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ چونکہ آج کل لاہور میں موجود ہے اس لیے ملاقات کے لیے یہ وقت خاصا مناسب ہے۔ شہریار کے لیے بھی لاہور کا ایک مختصر دورہ ترتیب دینا ایسا کوئی خاص مشکل نہیں تھا چنانچہ وہ یہاں پہنچا ہوا تھا اور اب میجر ذیشان سے ملنے جا رہا تھا۔ طے شدہ ہوٹل تک پہنچنے میں اسے مشکل سے بیس منٹ لگے۔ گاڑی پارکنگ میں روک کر اترتے ہوئے اس نے اپنی رسٹ واچ پر نظر ڈالی اور مطمئن ہو گیا کہ وہ دیے گئے وقت سے چند منٹ قبل ہی پہنچنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ اس نے پارکنگ سے نکلتے ہوئے بچکانا محسوس ہونے والی ٹائی پن نکال کر کوٹ کی جیب میں ڈال لی۔ ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں پہنچ کر اسے پہلی تفصیلی نظر میں ہی میجر ذیشان ایک میز پہ دکھائی دے گیا۔ پابندیٔ وقت وہاں بھی عروج پر تھی۔

"بہت اچھا لگا تمہیں یہاں دیکھ کر۔" سلام دعا سے فارغ ہو کر اس نے میجر ذیشان سے بے تکلفی سے کہا۔ یہ بات پہلے ہی طے کر چکے تھے کہ آپ جناب کا تکلف ترک کر کے ایک دوسرے سے دوستوں کی طرح بات کریں گے تاکہ ساتھ مل کر کام کرنے میں زیادہ آسانی رہے۔

"اچھا تو مجھے بھی لگا تمہارے شہر میں آ کر۔" وہ جانتا تھا کہ شہریار اصل میں لاہور کا رہائشی ہے جو ملازمت کے سلسلے میں نور کوٹ میں مقیم ہے اس لیے خوش دلی سے مسکراتا ہوا بولا۔ پھر اپنی بات کو مزید آگے بڑھایا۔ "مجھے یقین ہے کہ تمہیں مجھے دیکھنے سے زیادہ اس خوش خبری کو سن کر زیادہ خوشی ہو گی جو میں تمہارے لیے لایا ہوں۔"

"یعنی میں نے تمہیں جو اسپیشل فورس کے قیام کے سلسلے میں مشورہ دیا تھا، اس میں کوئی پیش رفت ہوئی ہے؟" اس نے دبے دبے جوش سے کہتے ہوئے فوراً اندازہ لگایا۔

"نہیں۔" میجر ذیشان نے اطمینان سے انکار کیا۔

"تو پھر کیا خوش خبری ہو سکتی ہے؟" وہ الجھا کہ اس نے تو یہی کام اس کے ذمے لگایا تھا۔

"مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم جو چاہتے تھے وہ میرے یا تمہارے کچھ کہنے سے قبل پہلے ہی ہو چکا ہے۔۔۔ ہمارے لیے یہ ایک خوش آئند بات ہے کہ ہمارے بڑوں میں ابھی تک کچھ ایسے لوگ باقی ہیں جو اس وطن اور اپنے ہم وطنوں سے محبت کرتے ہیں۔ یہ کارنامہ ایسے ہی کچھ گنے چنے کرنلوں اور جنرلوں نے مل کر انجام دیا ہے۔" وہ خود تفصیل سنانے کے لیے بے چین تھا لیکن ویٹر کو قریب آتے دیکھ کر اسے اپنی گفتگو کا سلسلہ روکنا پڑا۔ اسے آرڈر نوٹ کروانے کے بعد انہوں نے ٹوٹا ہوا گفتگو کا سلسلہ دوبارہ جوڑ لیا۔

"میں تمہاری دی ہوئی تجویز پر بات کرنے کے لیے موقع کی تلاش میں ہی تھا کہ ایک دن کرنل صاحب نے فوج سے میرا استعفیٰ طلب کر کے حیران کر دیا۔ میں ان کے اس مطالبے پر ہکا بکا رہ گیا لیکن جب انہوں نے وجہ بتائی تو میں نے بخوشی اپنا استعفیٰ ان کے حوالے کر دیا۔"

"یعنی اب تم پاکستان آرمی میں نہیں ہو۔" اسے صدمہ سا ہوا۔

"ظاہراً ورنہ آج بھی اپنے وطن کا ایک سپاہی ہوں۔" میجر ذیشان اطمینان سے مسکرایا۔

"اصل قصہ کیا ہے فوراً بیان کرو۔" اس نے عجلت دکھائی۔

"وہی سنانے جا رہا ہوں۔ ہوا کچھ یوں کہ جب میں نے کرنل صاحب کے مطالبے پر حیرت اور پریشانی کا اظہار کیا تو انہوں نے مجھے بتایا کہ میری حب الوطنی اور بہادری کو دیکھتے ہوئے انہوں نے میرے لیے کوئی اور فیصلہ کر لیا ہے اور یہ فیصلہ تھا مجھے اس اسپیشل فورس میں شامل کرنے کا جن کے زیادہ تر ملازمین فوج سے یا پھر پولیس کے محکمے سے تعلق رکھتے ہیں۔ کچھ سویلینز بھی ہیں لیکن ان سے زیادہ حساس نوعیت کے کام نہیں لیے جاتے۔ کرنل صاحب نے مجھے بتایا کہ اس اسپیشل فورس کا قیام چند سال قبل ہی ناگزیر حالات میں عمل میں لایا گیا ہے جس سے پاکستان کی سیاسی قیادت کا تعلق نہیں ہے۔ فورس کے قیام کی تجویز ان محب وطن افسران نے پیش کی تھی۔ حفاظت وطن کے لیے بنائی گئی اس فورس کو خاصا مخفی رکھا گیا ہے اور یہ لوگ بظاہر ایک سیکیورٹی ایجنسی کی صورت میں کام کر رہے ہیں۔ اس ایجنسی کی کئی برانچز ملک کے تقریباً ہر اہم شہر میں موجود ہیں۔ بہت زیادہ معاوضے پر کام کرنے والی اس سیکیورٹی ایجنسی کے ملازمین کو اعلیٰ ترین طبقے سے تعلق رکھنے والے لوگ یا ادارے ہی ہائر کر سکتے ہیں۔ اس طرح ایک تو اخراجات کا مسئلہ کافی حد تک حل ہو جاتا ہے دوسرے ان افراد تک رسائی ہو جاتی ہے جو ملک کے خلاف سازشوں کے جال بن رہے ہیں۔ ہر برانچ میں مختلف درجوں کی صلاحیتیں رکھنے والے افراد کام کر رہے ہیں۔ کہاں کس کی ڈیوٹی لگانی ہے، یہ ضرورت دیکھ کر طے کیا جاتا ہے۔ کسی وزیر، سفیر وغیرہ نے خدمات طلب کی ہوں تو اعلیٰ صلاحیتیں رکھنے والے افراد کا انتخاب ہوتا ہے جو اپنے ظاہری فرائض انجام دینے کے ساتھ ساتھ اہم معاملات پر بھی نظر رکھ سکیں۔ کچھ وہ افراد ہیں جنہیں فورس کے اندرونی معاملات سے باخبر نہیں رکھا جاتا اور وہ خود کو حقیقتاً صرف سیکیورٹی گارڈ ہی سمجھتے ہیں۔ البتہ ان کا انچارج ان سے روزانہ کی بنیاد پر رپورٹ لیتا رہتا ہے ہر جگہ سیکیورٹی گارڈز کو شفٹ تبدیل ہونے کے بعد پہلے دفتر آ کر تحریری رپورٹ جمع کروانی ہوتی ہے پھر ہی اس کا ڈیوٹی ٹائم ختم ہوتا ہے چونکہ ہماری ایجنسی میں باقی تمام جگہوں کے مقابلے میں بھاری تنخواہیں دی جاتی ہیں اس لیے کوئی اس لمبی روٹین پر اعتراض بھی نہیں کرتا۔"

میجر ذیشان نے جو تفصیلات بتائیں انہیں سن کر اس کی آنکھوں میں تحسین کے جذبات ابھر آئے لیکن زبان سے فوری طور پر اس لیے اظہار نہ کر سکا کہ ان کی ٹیبل پر دیا گیا آرڈر سرو ہو رہا تھا۔ ویٹر آرڈر سرو کر کے مودبانہ ایک طرف کھڑا ہوا تو ذیشان نے اسے ہاتھ سے جانے کا اشارہ کر دیا۔

"یہ سب تو بہت زبردست ہے۔ میں نہیں سوچ سکتا تھا کہ ہمارے ملک میں بھی ایسے دردمند لوگ اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں جو اس ملک کی سلامتی کے لیے سوچتے ہیں ورنہ یہاں تو جو جتنا بڑا افسر ہے اتنا ہی بڑا اسپرپاور کا غلام ہے۔"

"میں بھی کچھ اسی طرح کی سوچ رکھتا تھا لیکن CFP کے وجود نے ہر شکوہ دور کر دیا ہے۔ میں سوچنے پر مجبور ہو گیا ہوں کہ ابھی چند محب وطن افراد عوام کے علاوہ خواص میں بھی موجود ہیں اسی لیے تو ہمارا وطن اب تک قائم ہے۔" میجر ذیشان نے اس کی تائید میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

"اور ان شاء اللہ تاقیامت قائم رہے گا۔" اس نے فوراً ٹکڑا لگایا۔

"ان شاء اللہ۔" چمچہ منہ کی طرف لے جاتے ہوئے میجر ذیشان نے بھی کہا۔

"تمہارا تقرر کس شہر میں ہوا ہے؟" شہریار نے بھی کھانے سے انصاف کرتے ہوئے سوال کیا۔ اس وقت وہ خود کو جتنا ریلیکس محسوس کر رہا تھا، اسے لفظوں میں بیان نہیں

کر سکتا تھا۔

"نہیں لاہور میں۔ ابھی کل ہی تو میں نے آفس جوائن کیا ہے۔ میرے ذمے دن بھر جمع ہونے والی رپورٹس میں سے اہم رپورٹوں کو پڑھنا اور ضرورت کے مطابق احکامات جاری کرنا ہے۔ کوئی بڑا معاملہ ہو تو مجھے اپنے سینئر کو اطلاع دینی ہوگی۔" اس نے بتایا۔

"ویری گڈ۔ مجھے امید ہے کہ اپنے اس عہدے پہ کام کرتے ہوئے تم میری بھی خاطر خواہ مدد کر سکو گے۔" شہر یار نے امید ظاہر کی۔

"شیور۔۔۔۔ میرے آدمی ہر طرح سے ٹرینڈ ہیں۔ خاموش نگرانی سے لے کر مار دھاڑ تک ان سے ہر کام لیا جا سکتا ہے۔ کرنل صاحب سے تمہارا تعارف تو ہے ہی۔ میں خود بھی ان سے سرسری تذکرہ کر چکا ہوں۔ اپنے ذاتی اختیارات سے ہٹ کر اگر کوئی بڑا معاملہ پیش آیا تو میں ان سے باقاعدہ اجازت بھی لے سکتا ہوں۔ تم بے فکر ہو کر جو کرنا چاہتے ہو کرو۔ پاکستان کی حفاظت کی خاطر تمہیں CFP کی بھرپور حمایت حاصل رہے گی۔" ذیشان نے اسے تسلی دی۔

"سی ایف پی۔۔۔۔ اس سیکیورٹی ایجنسی کا نام میرا سنا ہوا تو ہے لیکن یہ حروف کس کا مخفف ہیں، یہ معلوم نہیں۔"

"سی ایف پی کا مطلب ہے کیئر فار پاکستان (Care for pakistan) اسی لیے جو شخص بھی پاکستان کی کیئر کرتا ہو ہم اس کا ساتھ دینے کے لیے بھی تیار ہیں۔"

آج میجر ذیشان کی گفتگو کا ڈھنگ ہی نرالا تھا۔ وہ پہلے سے کہیں زیادہ پر اعتماد لگ رہا تھا۔

"اس طرف آجانے سے تم انیشن کیا روالے معاملے سے الگ ہو گئے ہو گے۔ میں اس شخص کو کسی صورت نہیں بھول سکتا کیونکہ وہ مجھے ان لوگوں تک پہنچا سکتا ہے جو ملک و قوم کے ہی نہیں میرے ذاتی مجرم ہیں۔ میرا کوئی دن ایسا نہیں گزرتا جب مجھے حماد بھائی اور شیبا کے کفن میں لپٹے ہوئے وجود یاد نہ آتے ہوں۔" وہ جذباتی ہونے لگا۔

"ریلیکس یار! مجھے تمہارے جذبات کا احساس ہے اور تم بے فکر ہو جاؤ۔ مجھے انیشن والے معاملے سے الگ نہیں کیا گیا ہے بلکہ اسی معاملے کی وجہ سے میں سی ایف پی میں شامل ہوا ہوں۔" انیشن سے ہمیں جو کلیوز ملے ہیں ان ہی پہ کام کرنے کے لیے مجھے لاہور بھیجا گیا ہے۔ کراچی والی برانچ میں بھی اس معاملے پہ کام ہو رہا ہے بلکہ فرسٹ تو ساری ہی برانچز کو کیا گیا ہے لیکن ورما اور پانڈے وغیرہ کی زیادہ تر موومنٹ چونکہ ان دونوں شہروں میں دیکھی گئی ہے اس لیے یہاں خاص طور پہ کام کیا جا رہا ہے۔" ذیشان نے اسے تسلی دی تو اسے کچھ اطمینان حاصل ہوا۔

"ٹھیک ہے۔۔۔۔ یہ تم نے مجھے ایک اور اچھی اطلاع دی ہے۔ اس معاملے میں جو بھی پیش رفت ہو تم مجھے اس سے باخبر رکھنا۔"

"بالکل۔ تمہیں کہنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔" ذیشان نے یقین دہانی کروائی اور پھر کچھ چونکتے ہوئے بولا۔ "ہمرے ہاں یاد آیا، مجھے تمہارے چودھری صاحب کے بارے میں بھی ایک خبر دینی تھی ویسے تو خبر ایسی خاص نہیں ہے اور شاید مجھ تک بھی نہ پہنچتی اگر مسلسل سے چودھری افتخار کا نام میرے لوگوں کے سامنے نہ آتا۔ آج صبح ہی مجھے اس بارے میں بتایا گیا ہے۔ چودھری صاحب نے اپنے لاہور میں موجود کاروبار کے لیے ہماری سیکیورٹی ایجنسی سے خدمات حاصل کی ہیں۔ ان کا موقف ہے کہ پچھلے دنوں اپنے کاروبار میں لگنے والی آگ کے سلسلے میں وہ تشویش کا شکار ہیں کہ کہیں یہ کسی دشمن کی کارروائی نہ ہو اس لیے وہاں تربیت یافتہ گارڈز رکھنا چاہتے ہیں۔ ظاہری طور پہ یہ ایک عام سا معاملہ تھا اس لیے میرے ماتحت نے وہاں عام گارڈز کی ڈیوٹی لگا دی لیکن دوسری طرف کچھ ایسے چھوٹے تاجروں سے بھی چودھری کے رابطے کی خبریں ملی ہیں جن کا ریکارڈ کچھ اچھا نہیں ہے۔ یہ وہ تاجر ہیں جو اسمگل شدہ کپڑے، الیکٹرونکس آئٹمز اور خشک میوہ جات سے لے کر اسلحے تک سب کچھ فروخت کرتے ہیں۔ چودھری کا ماضی ریکارڈ جیسا ہے اس کی روشنی میں اس کا اس طرح کے بے ایمان تاجروں سے رابطہ کھٹکتا تو ہے لیکن فی الحال یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ کس چکر میں ہے۔"

"اس شخص کی ہوس کا پیٹ کسی صورت نہیں بھرتا۔ کہنے کو تو اللہ نے بے تحاشا دولت سے نوازا ہے لیکن وہ پھر بھی حرام راستوں سے کمانے کی فکر میں لگا رہتا ہے۔ اب بھی کسی کالے دھندے کے چکر میں ہوگا۔ معاملہ سامنے آئے تو تم خود نمٹ لینا۔" اس نے چودھری کے ذکر پہ بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے کہا تو ذیشان نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس کے بعد بھی وہ کھانے کے ساتھ ساتھ کئی موضوعات پہ گفتگو کرتے رہے۔ یہ سلسلہ تھما تو انہیں احساس ہوا کہ دو ڈھائی گھنٹے گزر چکے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے سے الوداعی معانقہ کر کے رخصت ہو گئے۔

شہر یار نے اپنی گاڑی پارکنگ سے نکالی ہی تھی کہ اس کا موبائل بجنے لگا۔ اس نے موبائل نکال کر اسکرین پہ آتا نمبر چیک کیا تو بالکل اجنبی نمبر دیکھ کر چونک پڑا۔ اس کا یہ موبائل نمبر چند بہت ہی خاص لوگوں کے پاس تھا اس لیے اس نمبر پہ کسی اجنبی نمبر سے کال آنا اچنبھے کی بات تھی۔ حیرت کے باوجود اس نے کچھ سوچتے ہوئے کال وصول کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

"السلام علیکم اے سی صاحب! میں ماہ بانو بول رہی ہوں۔" دوسری طرف سے سنائی دینے والی آواز نے اسے ہلا کر رکھ دیا اور اسٹیئرنگ وہیل پہ اس کا ہاتھ بہک سا گیا۔

"کیا ہوا سر آپ کچھ بول کیوں نہیں رہے؟ آپ کو میری آواز آ رہی ہے نا؟" اس کی خاموشی پہ وہ تشویش سے پوچھنے لگی۔

"تم کہاں ہو ماہ بانو؟ کہاں چلی گئی تھیں تم؟ مجھے اپنا پتا بتاؤ۔" اس نے خود کو سنبھالتے ہوئے ماہ بانو سے کہا۔

"میں یہیں لاہور میں ہوں سر! لیکن فی الحال آپ کو اپنا کوئی پتا نہیں بتا سکتی اصل میں یہاں میرا ایسا کوئی ٹھکانا ہے ہی نہیں جہاں میں آپ کو ملاقات کے لیے بلا سکوں لیکن میں آپ سے ملنا چاہتی ہوں۔" اس نے اپنے فون کرنے کا مقصد بیان کیا۔

"تمہیں جہاں بھی ملنے میں سہولت ہو مجھے بتا دو میں فوراً پہنچ جاؤں گا۔" اس نے فوراً ہی کہا۔ ماہ بانو کو اس نے کبھی فراموش کیا ہی نہیں تھا اور اب اچانک اس کی آواز سن کر ہیجان میں مبتلا ہو گیا تھا۔ جواب میں ماہ بانو نے اسے جگہ کا نام بتا دیا۔ وہ جگہ اس مقام سے کافی دور تھی جہاں وہ اس وقت موجود تھا چنانچہ بولا۔

"میں ایک گھنٹے کے اندر وہاں پہنچنے کی کوشش کرتا ہوں۔ تم میرا انتظار کرنا۔" اس کے بعد اس نے خلاف عادت گاڑی بھگانی شروع کر دی۔ رش والی جگہوں پہ مجبوری تھی لیکن جہاں بھی سڑک خالی ملتی، وہ گاڑی کی رفتار تیز کر دیتا۔ اس مارم ماری کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ حسب وعدہ اس فاسٹ فوڈ ریسٹورنٹ تک پچاس منٹ میں پہنچنے میں کامیاب ہو گیا جس کا پتا ماہ بانو نے اسے بتایا تھا۔

ریسٹورنٹ کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے بھی اس کا دل بے طرح دھڑک رہا تھا کہ جانے وہاں ماہ بانو کو دیکھ بھی سکے گا یا نہیں۔ لیکن اس کا ہر خوف اور وسوسہ اس وقت دور ہو گیا جب اس نے ڈائننگ ہال کے دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی اسے ایک میز کے سامنے بیٹھا دیکھ لیا۔ وہ پہلے کے مقابلے میں کافی کمزور ہو گئی تھی لیکن اس کی دلکشی و دلربائی وہی تھی جس نے پہلی نظر میں ہی اسے اپنا اسیر کر لیا تھا اور لاکھ کوشش کے باوجود بھی اپنا دامن اس کی محبت سے چھڑانے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔

"کیسی ہو ماہ بانو؟" اس کے مقابل بیٹھتے ہوئے اس نے آہستہ سے سوال کیا۔

"زندگی کے طوفانوں سے مسلسل ابھی تک بچی رہی ہوں۔ کب کوئی موج غرق کر دے نہیں معلوم۔ آپ اپنی سنائیں کس حال میں ہیں۔ بیگم صاحبہ تو ٹھیک ہیں نا؟" اس نے حزنیہ مسکراہٹ کے ساتھ اس سے پوچھا تو وہ چونک گیا۔ اچھے خاصے طویل عرصے تک منظر سے غائب رہنے کے باوجود وہ اس کی شادی سے واقف تھی، یہ ایک اچنبھے کی بات تھی۔

"سب ٹھیک ہے۔ تم اپنا احوال سناؤ۔ مجھے تمہارے بارے میں جو آخری اطلاع ملی وہ یہی تھی کہ تمہیں تالی والا نام کے کسی گاؤں میں دیکھا گیا تھا لیکن اس سے پہلے بھی یقیناً بہت کچھ پیش آیا ہوگا۔ کراچی کے ہاسٹل سے اغوا ہونے کے بعد جنگل میں ڈاکوؤں کے ڈیرے تک پہنچنے سے لے کر تالی والا اور پھر یہاں لاہور تک کا سفر آسان تو نہ ہوگا۔ میں اس سارے سفر کا احوال جاننا چاہتا ہوں۔" اس نے حکم دیا اور ماہ بانو کے لیے اس کے حکم سے سرتابی ممکن نہیں تھی۔ وہ اسے سب کچھ سناتی چلی گئی۔ اس آپ بیتی میں اسلم کا ذکر ناگزیر تھا لیکن وہ فوری طور پہ یہ بتانے کی ہمت نہیں کر سکی کہ وہ اسلم سے شادی کا وعدہ کر کے اس کے ساتھ جنگل سے فرار ہوئی تھی۔

"تمہاری کزن راحیلہ کے ڈاکٹر بھائی پہ مجھے بھی شبہ ہو گیا تھا کہ ہو نہ ہو اسی شخص نے چودھری کو تمہارے بارے میں اطلاع دی ہے۔ میں نے اس کے بارے میں کافی چھان بین بھی کروائی تھی جس کے نتیجے میں یہ معلوم ہوا تھا کہ وہ شخص خوب صورت اور نوجوان لڑکیوں کے بیوپار میں بھی ملوث ہے لیکن بدقسمتی سے ہمارے اس تک پہنچنے سے پہلے ہی وہ ملک سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ پیچھے اس کی بہن ملی تھی لیکن وہ خود اپنے بھائی کی اصلیت کھلنے پہ حیران پریشان تھی اس لیے میں نے اس کی چھوٹی موٹی خطائیں معاف کر دیں۔"

"اچھا کیا۔ راحیلہ تو بس ایک سبب تھی۔ میرے نصیب نے مجھے جہاں لے جانا تھا وہاں لے جا کر رہا۔" اس کے انداز گفتگو سے شہر یار کو ایسا لگ رہا تھا کہ وہ مختصر دورانیے میں ہی اپنی عمر کے کئی سال طے کر گئی ہو۔

"اب بھی یقیناً تم اسلم کے ساتھ ہی کہیں رہ رہی ہو اسی

لیے اس کی گرفتاری کے ڈر سے مجھے اپنی رہائش گاہ کا پتا نہیں بتایا۔" اس نے ماہ بانو سے ایک نازک سوال کیا۔

"آپ کا اندازہ کافی حد تک درست ہے۔" اس نے انکار نہیں کیا۔ "اسلم اور میں ایک ہی جگہ ٹھہرے ہوئے ہیں لیکن ایسے مسائل سے دوچار ہیں جن کے حل کے لیے اپنے تیز بانوں سے مدد نہیں لے سکتے اس سلسلے میں ہمیں آپ کی مدد درکار ہے اور اسی لیے میں نے آپ کو فون کیا ہے۔" اس نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔

"کیسی مدد چاہیے تمہیں؟" شہریار نے یہ پوچھتے ہوئے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ اس میں کوئی بہت بڑی تبدیلی آگئی تھی، کوئی ایسی تبدیلی جس کی وجہ سے وہ اس سے نظریں بھی نہیں ملا پا رہی تھی۔

"میں اور اسلم شادی کرنا چاہتے ہیں لیکن ہمارے پاس شناختی کاغذات نہیں ہیں۔ آپ ہمیں وہ کاغذات بنوا کر دیں گے۔" آخرکار اس نے دعا کا کر ہی دیا۔

"تم ایک ڈاکو سے شادی کرنا چاہتی ہو؟" وہ حیران ہوا۔

"میرے لیے وہ میری عزت کا محافظ پہلے ہے ڈاکو بعد میں ویسے بھی وہ اپنی مرضی سے ڈاکو نہیں بنا تھا۔ اسے حالات نے مجبور کر دیا تھا اور اب وہ اپنی اس زندگی کو ترک کرنا چاہتا ہے تو میں اس کا ساتھ دینا چاہتی ہوں۔" اس نے سپاٹ لہجے میں شہریار کو جواب دیا۔

"انسانی ہمدردی اچھی چیز ہے لیکن تم اپنی زندگی کیوں داؤ پر لگا رہی ہو؟ وہ شخص قانون کو مطلوب ہے جلد یا بدیر گرفتار ہو جائے گا پھر تمہارا مستقبل کیا ہوگا؟" اسے گمان ہوا کہ ماہ بانو اپنی ہمدرد فطرت کی وجہ سے اسلم سے شادی کرنا چاہتی ہے اس لیے اسے اس کے فیصلے کے مضمرات سے آگاہ کرنے لگا۔

"آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے سر! میں ہمدردی میں اسلم سے شادی نہیں کر رہی ہوں۔ میں اس لیے اس کا ساتھ قبول کر رہی ہوں کہ وہ اس دنیا کا واحد شخص ہے جو دل کی گہرائیوں سے مجھے چاہتا ہے اور مجھے میری تمام تر خامیوں اور مسائل کے ساتھ قبول کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔" بڑی بے دردی سے سپاٹ لہجے میں یہ جملے ادا کرتے ہوئے اسے اندازہ بھی نہیں تھا کہ شہریار کو اس کی بات سے کتنی تکلیف پہنچ رہی ہے لیکن وہ کوئی اعتراض بھی نہیں کر سکتا تھا، اس کا کہنا بھی ایک طرح سے درست ہی تھا۔ وہ اسے چاہنے کے باوجود اپنانے کا فیصلہ بروقت اسی لیے تو نہیں کر پایا تھا کہ وہ عمر، تعلیم اور سماجی رتبے کے اعتبار سے اسے خود سے کافی پیچھے معلوم ہوتی تھی۔ اس کے احساسات سے بے خبر ماہ بانو کہتی جا رہی تھی۔

"رہی اس کی گرفتاری کی بات تو میں نے آپ کو اسی لیے مدد کے لیے بلایا ہے۔ آپ ہم دونوں کو ایک نئی شناخت کے ساتھ پاکستان سے باہر نکلنے میں مدد دیں گے تاکہ ہم بلاخوف و خطر اپنی نئی زندگی کی شروعات کر سکیں۔"

"تمہیں اتنا یقین کیوں ہے کہ میں تمہاری مدد کروں گا؟" شہریار نے اسے بغور دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"شاید اس لیے کہ آپ پہلے بھی ہر مشکل میں مدد کرتے رہے ہیں۔" اس نے ترنت جواب دیا۔

"وہ الگ معاملہ تھا۔ میں تمہیں مظلوم اور بے قصور سمجھ کر تمہاری مدد کرتا رہا لیکن اب ایک مبینہ ملزم کے فرار کا معاملہ ہے۔ میں کیسے کسی مفرور ملزم کا مددگار بن سکتا ہوں؟" اس نے اعتراض کیا۔

"آپ کو ایسا کرنا پڑے گا کیونکہ یہ دو زندگیوں کا سوال ہے۔ اسلم اور میں دونوں حالات کے ستائے ہوئے ہیں۔ ایک دوسرے کا ساتھ اور آپ کا تعاون ہمارے مستقبل کو محفوظ کر دے گا۔ ہم محفوظ و مامون ہو گئے تو شاید کبھی اس دنیا میں کوئی کارآمد کردار بھی ادا کر سکیں۔ اسلم کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے بھیج کر بہرحال آپ کوئی کارنامہ انجام نہیں دیں گے۔" وہ بہت ٹھہرے ہوئے لہجے میں مضبوطی سے بات کر رہی تھی۔ شہریار نے خود کو اس کے سامنے مجبور پایا۔ صرف اس لیے نہیں کہ اس کے دلائل مضبوط تھے بلکہ اس لیے کہ وہ ماہ بانو تھی جس کی خوشی اسے دل و جان سے عزیز تھی۔

"ٹھیک ہے۔ میں تمہارا یہ کام کر دوں گا۔ اس کے علاوہ اور کچھ......" وہ ہتھیار ڈال رہا تھا لیکن لہجہ سپاٹ اور کٹھور تھا۔

"ہاں، ایک کام اور ہے۔" اس نے کہا اور پھر پل بھر کے توقف سے بولی۔ "آپ کو میرے نکاح میں شریک ہونا ہوگا۔ میں چاہتی ہوں کہ میرا کوئی تو اپنا اس موقع پر میرے پاس موجود ہو۔" نہ چاہنے کے باوجود اس کی آنکھوں سے دو آنسو نکل کر رخساروں پر بہہ گئے۔ اسے کیسے بتاتی کہ وہ اس کے دل کو کتنا اپنا لگتا ہے۔

"میں آجاؤں گا۔ تم مجھے دن اور وقت بتا دینا بلکہ اس سلسلے میں جو بھی انتظامات کرنے ہوں، وہ بھی میں کروں گا۔" اس کے آنسوؤں نے شہریار کو موم کر دیا۔

"ٹھیک ہے سر! اب میں چلتی ہوں۔" اس کے لیے مزید شہریار کے سامنے رکنا ممکن نہیں رہا۔ شہریار نے بھی اسے نہیں روکا۔ نہ ہی اس کے جانے کے بعد وہ اپنی جگہ سے اٹھا یہاں تک کہ اس کا پیچھا کر کے یہ بھی جاننے کی کوشش نہیں کی کہ وہ کہاں رہ رہی ہے۔ اتنے عرصے بعد ماہ بانو کے ملنے کی ساری خوشی اس کے تازہ فیصلے نے برباد کر دی تھی۔ وہ خودغرض نہیں تھا کہ ماہ بانو کی خوشیوں کی راہ میں حائل ہونے کی کوشش کرتا لیکن اسے صاف محسوس ہو رہا تھا کہ اس نے اپنی زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ حالات کے گرداب سے نکلنے کی خواہش میں کر ڈالا ہے لیکن اسے ڈر تھا کہ کہیں وہ کسی اور گرداب میں نہ پھنس جائے۔ وہ اسے اس کے فیصلے سے باز بھی نہیں رکھ سکتا تھا کیونکہ اس نے محسوس کر لیا تھا کہ وہ اپنے فیصلے میں اٹل تھی۔ اب اسے صرف اس کی مدد کرنی تھی اور ساتھ ہی یہ دعا بھی کہ وہ خوش رہے۔ حتمی نتیجے پر پہنچنے کے بعد وہ خود بھی ریسٹورنٹ سے روانہ ہو گیا۔ اس کی منزل رانا ہاؤس تھی۔ وہاں پہنچتے ہی اس کا آفرین رانا سے سامنا ہو گیا۔

"تم دونوں میاں بیوی ہم سے ملنے آئے ہو یا دوستوں سے ملاقاتیں کرنے؟" اسے دیکھتے ہی انہوں نے پیار بھرا شکوہ کیا۔

"ماریا بھی کہیں گئی ہوئی ہے کیا؟" ان کے جملے سے اندازہ لگاتے ہوئے اس نے استفسار کیا۔

"ہاں اسے بھی اپنی کسی فرینڈ سے ملنے جانا تھا۔ مریم کی گاڑی لے کر گئی ہے۔ میں نے کہا تھا کہ ڈرائیور کے ساتھ چلی جاؤ لیکن اس نے کہا کہ میں خود ہی ڈرائیو کر لوں گی۔" انہوں نے اسے تفصیلات سے آگاہ کیا۔

"پہلے وہ لاہور میں ہی تو رہتی تھی ظاہر ہے یہاں اس کی دوستیں بھی ہوں گی۔ اچھا ہے ملنے چلی گئی۔ تھوڑی دیر میں آجائے گی۔ تب تک میں آپ کو کمپنی دے دیتا ہوں۔" حقیقتاً اس وقت وہ مکمل تنہائی کا خواہش مند تھا لیکن اسے اس بات کا بھی احساس تھا کہ سجاد اور رشینا کے انتقال کے بعد وہ بہت زیادہ تنہائی کا شکار ہو گئی ہیں اور اب واحد اس کی ذات ہی ہے جس سے انہوں نے اپنی بچی کچھی خوشیاں اور خواہشیں وابستہ کر رکھی ہیں اس لیے اپنے احساسات کو پس پشت ڈال کر ان کے ساتھ وقت گزارنے کا فیصلہ کر لیا۔

"ارے نہیں بیٹا! میں تم سے شکایت نہیں کر رہی تھی۔ بس ایسے ہی مذاق میں کہہ دیا تھا۔ تم جاؤ جا کر آرام کرو۔" وہ اس سے ماں جیسی محبت کرتی تھیں پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ ان سے اس کے دل کی خواہش چھپی رہ جاتی۔ انہوں نے فوراً ہی اسے اپنی طرف سے ریلیکس کر دیا۔

"آرام بھی کر لوں گا۔ پہلے آپ چائے تو بنوائیں، ساتھ بیٹھ کر ایک ایک پیالی چائے پیتے ہیں پھر آرام بھی ہو جائے گا۔" وہ وہیں لاؤنج میں ہی ایک صوفے پر براجمان ہو گیا۔ وہ اگر اس کے لیے ممتا کے جذبات رکھتی تھیں تو خود وہ بھی انہیں سگی ماں سے بڑھ کر ہی درجہ دیتا تھا کہ مائیں تو سب ہی اپنی اولاد سے پیار کرتی ہیں لیکن آفرین رانا وہ ہستی تھیں جنہوں نے اسے بچپن میں اس کے والدین کی حادثاتی موت کے بعد بے پناہ محبت اور شفقت سے نوازا تھا۔ ان کے لیے اگر اسے اپنی طبیعت پر تھوڑی دیر جبر کرنا پڑتا تو بھی گوارا تھا۔

"ٹھیک ہے۔ جیسی تمہاری مرضی۔" وہ کھل اٹھیں اور خوشی خوشی ملازم کو بلا کر چائے کا آرڈر دے دیا۔ اس کے بعد ان کے درمیان گفتگو کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ان کے پاس بہت سے موضوعات تھے۔ خصوصاً وہ لیاقت رانا کی بیماری اور مریم کی تنہائی کی طرف سے بہت فکرمند تھیں۔ خود وہ بھی ان دونوں کے لیے دل میں کڑھتا رہتا تھا۔ لیکن انہیں تسلیاں اور دلاسے دیتا رہا۔ دیکھا جائے تو حالات نے سب سے زیادہ انہیں ہی جھنجھوڑ کیا تھا لیکن انہوں نے کمزور عورت ہونے کے باوجود ظاہری طور پر خود کو بہت سنبھال لیا تھا۔ وہ انہیں تسلیاں اور دلاسے دیتا گفتگو کا رخ بہت ہوشیاری سے موڑنے میں کامیاب ہو گیا۔ چنانچہ چائے آنے تک وہ خاصے لائٹ موڈ میں آچکی تھیں۔ چائے کے دوران بھی وہ دونوں ہلکے پھلکے موضوعات پر ہی گفتگو کرتے رہے۔ اسی دوران میں ماریا بھی واپس آکر ان کے ساتھ شامل ہو گئی۔

"جاؤ اب تم دونوں جا کر تھوڑی دیر آرام کر لو۔ دوبارہ رات کے کھانے کے بعد نشست جمائیں گے۔" آخر آفرین رانا ہی کو خیال آیا تو انہوں نے ان دونوں سے کہا۔ اس بار شہریار نے بھی تکلف سے کام نہیں لیا۔ وہ فارمل ڈریس میں خود کو تھوڑا سا بے آرام محسوس کر رہا تھا اس لیے خود بھی چینج کرنے کی خواہش رکھتا تھا۔ وہ اور ماریا ساتھ ساتھ چلتے اپنے لیے مخصوص کمرے میں آ گئے۔

"آپ کی ٹائی پن کہاں ہے؟" کمرے میں پہنچ کر وہ کوٹ اتارنے لگا تو ماریا نے اس سے سوال کیا۔ اس کا ہاتھ بے ساختہ ہی اپنے کوٹ کی جیب کی طرف رینگ گیا لیکن جیب خالی تھی۔ وہ ایک ایک کر کے اپنی ساری جیبیں ٹٹولنے لگا۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ پارکنگ سے نکلتے ہوئے اس نے ٹائی پن نکال کر اپنے کوٹ کی جیب میں ڈالی تھی لیکن اب

وہ وہاں موجود نہیں تھی جس کا مطلب تھا کہ وہ ٹائی پن جیب میں رکھنے کے بجائے وہیں کہیں گرا بیٹھا تھا۔

''کیا ہوا؟'' ماریا نے اسے بغور دیکھتے ہوئے کچھ چیختے لہجے میں پوچھا۔

''سوری ڈیئر! شاید وہ کہیں گر گئی ہے۔'' اس نے معذرت کرلینا ہی مناسب سمجھا۔

''میں نے اتنے پیار سے آپ کو وہ ٹائی پن گفٹ کی تھی اور آپ نے ذرا بھی قدر نہیں کی۔'' اس کا موڈ آف ہوگیا۔

''آئی ایم ایکسٹریملی سوری ڈارلنگ! مجھے واقعی نہیں پتا چلا کہ وہ کہاں اور کب گری۔'' اس وقت وہ سخت ذہنی اذیت سے دوچار تھا۔ ماہا نو سے ہونے والی ملاقات نے اس کے اندر تہلکہ مچا رکھا تھا لیکن قسمت کی ستم ظریفی سے اسے ایسے نازک وقت میں ہی ہر رشتے کے نخرے اٹھانے پڑ رہے تھے۔

''آدمی کو کسی کے دیے گفٹ کی قدر ہو تو وہ اسے جان سے لگا کر رکھتا ہے۔ آپ کے نزدیک میرے گفٹ کی اہمیت ہی نہیں تھی تو آپ اسے سنبھالتے کیسے؟'' ماریا کا شکوہ برقرار تھا۔ اس میں مزید حوصلہ نہیں رہا کہ وہ اسے منانے کے لیے کچھ کہہ سکے۔ وہ منہ پھلا کر ڈریسنگ روم کی طرف چلی گئی تو وہ اس کے پیچھے جانے کے بجائے خود وہیں رک گیا اور خلاف مزاج کوٹ اتار کر ایک طرف ڈالتے ہوئے بستر پر نیم دراز ہوگیا۔ نیم دراز حالت میں ہی اس نے اپنی ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کی اور پھر مکمل طور پر لیٹ کر ایک تکیے سے سر اور منہ بھی چھپالیا۔ اگر اس وقت آفرین بانو اسے دیکھ لیتیں تو انہیں سخت دھچکا لگتا اور وہ سمجھ لیتیں کہ وہ کسی بہت بڑے نقصان سے دوچار ہوا ہے کیونکہ اس انداز میں تو وہ بس صرف بچپن کے ان دنوں ہی تکیوں میں منہ چھپا کر لیٹا تھا جب اس کے والدین کا انتقال ہوا تھا۔

☆☆☆

''کیا پروگریس ہے چودھری؟'' چودھری کو الفا کی طرف سے بھجوایا گیا خصوصی موبائل فون حیدرآباد میں ہی مل گیا تھا۔ اب جبکہ وہ لاہور میں رہ کر اس کی ہدایات پر عمل کر رہا تھا، پہلی بار اس موبائل فون کی گھنٹی بجی تھی۔ وہ کال ریسیو کرنے سے پہلے ہی اندازہ لگا سکتا تھا کہ دوسری طرف کون ہوگا۔ فون ریسیو کرنے کے بعد اس کے اندازے کی تصدیق ہوگئی۔

دوسری طرف الفا اپنے مخصوص حاکمانہ اور اکھڑ لہجے میں اس سے مخاطب تھا۔ حکم چلانے والے چودھری کو اس کا یہ لہجہ سخت ناگوار گزرتا تھا لیکن برداشت کرنے کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ ہوسِ زر کے علاوہ اب دوسری مجبوریاں بھی اس کے دامن سے لپٹ گئی تھیں۔ پچھلی بار بات ہونے پر الفا اسے صاف طور پر دھمکی دے چکا تھا کہ کسی بھی قسم کی خلاف ورزی کی صورت میں وہ وڈی چودھرائن کی پُراسرار موت کے سلسلے میں چند...... ایسے شواہد فراہم کردے گا جس کے بعد اس کے لیے اپنے بیٹے کے سوالوں کا جواب دینا مشکل ہو جائے گا۔ اس نے بلیک میلنگ کے اسی واحد ہتھکنڈے پر اکتفا نہیں کیا تھا۔ موبائل فون کے ساتھ اسے ایک سربمہر لفافہ بھی موصول ہوا تھا اور اس لفافے میں موجود تصویریں دیکھ کر اس کے پسینے چھوٹ گئے تھے۔ جدید کیمرے سے کھینچی گئی ان تصویروں میں وہ لنڈا کے علاوہ ان کال گرلز کے ساتھ بھی نظر آرہا تھا جن کے ساتھ وہ لندن میں قیام کے عرصے میں رنگ رلیاں مناتا رہا تھا۔ خاص بات یہ تھی کہ تصویروں پر تاریخیں اور وقت بھی پرنٹ تھا اور ظاہر ہے یہ ایک بیّن ثبوت تھا کہ جن دنوں وہ وڈی چودھرائن کے علاج کے بہانے لندن میں رہ رہا تھا حقیقتاً وہاں اس کی کیا مصروفیت تھی۔ تصویروں کے ساتھ کوئی خط وغیرہ موجود نہیں تھا۔ نہ ہی اس سے فون پر ان کے متعلق کچھ کہا گیا تھا لیکن وہ تصویریں خود چیخ چیخ کر اعلان کررہی تھیں کہ چودھری افتخار عالم شاہ تمہارے پر کاٹ کر دیے گئے ہیں اس لیے اب اڑنے یا اڑنے کی کوشش نہ کرنا۔

''پروگریس بہت اچھی ہے جناب! کارخانے کی حفاظت کا معقول انتظام کرلیا گیا ہے۔ میرے ذاتی ملازمین کے علاوہ تربیت یافتہ گارڈز بھی موجود ہیں۔ مارکیٹ میں بھی میں نے تیزی سے روابط قائم کرلیے ہیں اور کئی ایسے لوگوں سے مل بیٹھنے میں کامیاب ہوگیا ہوں جو ہمارے بزنس میں شامل ہونے کے لیے تیار ہیں۔'' اس نے اپنی کارکردگی کی رپورٹ پیش کی۔ حقیقی معنوں میں آج پہلی بار وہ مکمل طور پر زیر ہو کر بات کر رہا تھا ورنہ اس سے قبل لالچ میں مبتلا ہونے کے باوجود کہیں نہ کہیں یہ خیال بھی دل میں موجود رہتا تھا کہ جب چاہے ان کے مال کو ٹھوکر مار کر خود کو ان سے الگ کرسکتا ہے لیکن اب اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ کسی صورت ان کے چنگل سے نہیں نکل سکتا۔

''گڈ! تم اچھے جارہے ہو۔ مقامی منڈی میں تمہاری کارکردگی سے میں بھی مطمئن ہوں لیکن تمہیں اصل کام مال کو بیرونِ ملک ایکسپورٹ کرنے کے سلسلے میں کرنا ہوگا۔ مقامی منڈی میں تو میں تمہیں پہلے بھی بتا ہی چکا ہوں کہ میرے آدمی آل ریڈی کام کر رہے ہیں۔'' الفا کا لہجہ قدرے نرم ہوگیا۔ البتہ اپنی گفتگو سے وہ اس پر یہ ظاہر کرنے میں ضرور کامیاب ہوگیا تھا کہ وہ اس کی طرف سے بے خبر نہیں ہے۔ جو کچھ وہ کر رہا ہے، اس سے اچھی طرح واقف ہے اور یہ بات چودھری کے لیے تشویش کا باعث تھی۔ وہ اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ وہ کس حد تک زیرِ نگرانی ہے اور اس کی کون کون سی سرگرمیاں ان لوگوں کے علم میں ہیں یا آتی رہیں گی۔

''ہمیں کن ممالک میں مال ایکسپورٹ کرنا ہوگا؟'' سارے وسوسے اور اندیشے اپنے آپ تک محدود رکھتے ہوئے اس نے کام کا سوال کیا۔

''امریکا..... ہمارا اصل ہدف یونائیٹڈ اسٹیٹ آف امریکا ہوگا۔'' الفا کے جواب نے اس کے چھکے چھڑا دیے۔ دوسرے ملکوں کا معاملہ الگ تھا لیکن امریکن ائرپورٹس پر جس سختی سے چیکنگ کی جاتی تھی وہاں سے مال نکالنا بہت مشکل تھا۔

''یہ تو بہت مشکل کام ہوگا۔ اس کے لیے تو خصوصی تربیت یافتہ اور تجربہ کار ایجنٹس کی ضرورت ہوگی اور مجھے افسوس ہے کہ میرے پاس ایسے لوگ نہیں ہیں۔'' اس نے ہمت کرکے ڈھکے چھپے لفظوں میں انکار کرہی دیا۔

''اوہ..... اگر ایسا ہے تو کوئی بات نہیں۔ تمہارے پاس لوگوں کی کمی ہوسکتی ہے لیکن میرے پاس ان یادگار تصویروں کے بے شمار پرنٹس موجود ہیں جو تمہیں یقینی طور پر موصول ہو چکی ہوں گی اور تم انہیں دیکھ کر خاصے محظوظ بھی ہوئے ہوگے۔ بائی دا وے تصویریں صاف تو آئی ہیں نا۔ گزرے ہوئے خوب صورت لمحات کی ان یادگاروں کو سنبھال کر رکھنا ویسے اگر نہ بھی سنبھال سکو تو کوئی مسئلہ نہیں۔ میرے پاس تو کئی پرنٹس ہیں۔ تمہیں جب ضرورت پڑے مجھ سے منگوا لینا۔'' وہ چڑے چھلے لہجے میں اسے چھید رہا تھا۔

''میں نے آپ کو انکار نہیں کیا ہے مسٹر الفا۔'' اس کے سامنے موجود ہوتا تو وہ اپنا شملہ اتار کر اس کے قدموں میں رکھ دیتا۔ اب یہ نہیں معلوم کہ مغربی تہذیب کا پروردہ الفا شملہ قدموں میں رکھنے کا مطلب سمجھتا بھی تھا یا نہیں۔

''مشکلات کا رونا نہیں رویا جاتا عقل سے کام لے کر ان کا حل نکالا جاتا ہے۔ اس بار میں تمہیں ایک ترکیب بتا دیتا ہوں آئندہ کے لیے تم اپنا دماغ خود لڑانا۔'' اس نے سرد لہجے میں جواب دیا پھر ذرا سے توقف کے بعد بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔

''ہیروئن کی ترسیل کے لیے تم بچوں کے ڈائپرز استعمال کرسکتے ہو۔ عام طور پر ان ڈائپرز کی اندرونی سطح سفید ہی ہوتی ہے۔ تمہیں ایک ایسے ماہر کاریگر کی خدمات حاصل کرنی ہوں گی جو ڈائپرز کے جاذب میٹریل کی جگہ مہارت سے ہیروئن کا سفوف بچھا سکے۔ اس سلسلے میں احتیاط یہ کرنی ہوگی کہ اس بات کا خیال رکھا جائے کہ ہیروئن کی مقدار ایک حد سے تجاوز نہ کرے ورنہ بڑھا ہوا وزن شکوک کو جنم دے سکتا ہے، پچاس ڈسپنسر والا کسی بھی کمپنی کا تیار کردہ ڈائپرز کا پیک اس کام کے لیے کافی ہوگا۔ کیریئر کے طور پر تمہیں کسی ایسی عورت کا انتخاب کرنا ہوگا جس کا چھ ماہ سے لے کر دو ڈھائی سال تک کا بچہ اس کے ساتھ سفر کرسکے۔ ایسی عورت ڈائپرز کا یہ پیک اپنے سفری بیگ میں بہ آسانی لے جاسکتی ہے۔ پیک کو کھلا ہی رہنے دینا اور اوپر کے چند پیسوں کو ان کی اصلی حالت میں رکھنا۔ کسی بہت حفاظت سے پیک کی گئی چیز کے مقابلے میں کھلا ہوا پیک کسٹم والوں کو اپنی طرف کم متوجہ کرے گا۔ کسٹم پر موجود بوگیر کتوں سے بچنے کے لیے سفری بیگ میں تیز خوشبو والے پرفیوم کی ایسی بوتل رکھی جاسکتی ہے جو معمولی سی چٹخی ہوئی ہو۔ کاسمیٹک کے دیگر سامان کے ساتھ موجود ایسی بوتل کے بارے میں یہی سمجھا جائے گا کہ سامان رکھنے اتارنے میں بوتل چٹخ گئی ہے لیکن ہمارا کام ہوجائے گا اور تیز خوشبو بوگیر کتوں کو ڈاج دینے میں کامیاب رہے گی۔'' الفا کی بتائی ترکیب سن کر چودھری اَش اَش کر اٹھا۔ اس نے دل میں فیصلہ کرلیا کہ مقامی مارکیٹ میں بھی اس ترکیب سے مال سپلائی کرے گا۔ اس طرح کسی کو اندازہ نہیں ہوسکے گا کہ ڈائپرز کے کاروبار کی آڑ میں اصل دھندا کیا ہو رہا ہے۔

''شکریہ مسٹر الفا! آپ نے تو میرا مسئلہ ہی حل کردیا۔ بس آپ مجھے وقت کا تعین کرکے بتا دیجیے گا باقی سارے انتظامات میں خود کرلوں گا۔'' وہ فوراً ہی چہکنے لگا۔

''یاد رکھنا کہ یہ ترکیب ایک آدھ بار استعمال ہوگی۔ بار بار اس کا اعادہ کیا گیا تو وہ لوگ ہوشیار ہوجائیں گے۔ آئندہ کے لیے تمہیں خود ترکیبیں سوچنی ہوں گی۔ البتہ عمل سے پہلے مجھ سے ڈسکس کرسکتے ہو۔'' اس نے چودھری کے چہکنے کو محسوس کرکے فوراً ہی تنبیہ کردی۔

''ٹھیک ہے۔ جیسی آپ کی مرضی۔'' چودھری نے فوراً ہی فرماں برداری کا مظاہرہ کیا۔ جواباً دوسری طرف سے الفا نے سلسلہ منقطع کردیا۔ اس کا یہ انداز چودھری کو سخت طیش دلاتا تھا لیکن وہ سوائے اپنی جگہ پیچ و تاب کھانے کے

کچھ کر بھی تو نہیں سکتا تھا چنانچہ سر جھٹک کر آئندہ انجام دیے جانے والے کاموں کے بارے میں سوچنے لگا کہ کون سا کام کس کے ذمے لگانا ہے۔ کل کا دن اسے مراد شاہ کے ساتھ گزارنا تھا۔ کل وہ واپس نیویارک روانہ ہونے والا تھا اس لیے وہ اسے وقت دینا چاہتا تھا۔ وقت نکالنے کے لیے ضروری تھا کہ زیادہ سے زیادہ کام آج ہی نمٹا لے چنانچہ وہ مصروف ہو گیا۔

☆☆☆

وہ لوگ رات کے کھانے سے فارغ ہو چکے تھے اور ہلکی پھلکی گفتگو کے ساتھ چائے کا دور جاری تھا کہ شہریار کے موبائل پر کال آنے لگی۔ اس نے موبائل نکال کر چیک کیا تو دوسری طرف موجود شخص کی نشاندہی ہو گئی۔ وہ مشاہرم خان تھا جو اسے کال کر رہا تھا۔ وہ "ایکسکیوزمی" کہہ کر سب کے درمیان سے اٹھ گیا۔

"سوری سر ایک اہم اطلاع تھی اس لیے میں نے آپ کو اس وقت فون کیا ہے۔" اس کی آواز سنتے ہی مشاہرم خان نے معذرت خواہانہ انداز میں گفتگو شروع کی۔۔۔۔ اس کے لہجے کا دبا دبا جوش بتا رہا تھا کہ اطلاع واقعی اہم ہے۔

"تکلفات میں پڑے بغیر سنا ڈالو۔" اس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"میں نے آپ سے نالی والا کے علی بخش کا ذکر کیا تھا نا، وہی لڑکا جس نے مجھے وہاں سے نکالا تھا اور ہمارے لیے مخبری کا کام کرنے کا بھی وعدہ کیا تھا۔ وہ لڑکا میرے پاس آیا ہوا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ پیر سائیں کے خفیہ ٹھکانے پر کچھ لوگ ایک گاڑی میں بہت سے بند ڈبے لے کر پہنچے ہیں۔ وہ لوگ ڈبے اتار ہی رہے تھے کہ علی بخش اپنی گدھا گاڑی لے کر اطلاع دینے یہاں آ پہنچا۔ مجھے امید ہے کہ ہم فوری طور پر نالی والا پہنچ جائیں تو پیر سائیں کے خلاف کوئی نہ کوئی ثبوت ضرور حاصل کر لیں گے۔" مشاہرم خان خاصا پُرجوش تھا۔

"تم انتظار کرو۔ میں دیکھتا ہوں کہ کیا کیا جا سکتا ہے۔" اس نے سنجیدگی سے جواب دے کر سلسلہ منقطع کر دیا اور خود میجر ذیشان کا نمبر ملانے لگا۔ اس سے رابطہ ہونے پر اسے ساری صورت حال سے آگاہ کیا۔

"اطلاع تو اہم ہے لیکن ٹائمنگ کا مسئلہ ہے۔ اس مخبر لڑکے کو نالی والا سے نور کوٹ پہنچنے میں کئی گھنٹے لگے ہوں گے۔ اب ہم کسی کارروائی کے لیے وہاں جائیں گے تو ہمیں بھی پہنچنے میں اچھا خاصا وقت لگے گا۔ مجھے ڈر ہے کہ اس وقت تک وہاں کچھ نہیں بچے گا اور ہماری ساری بھاگ دوڑ بیکار جائے گی۔" اس کی بات سن کر ذیشان نے خدشے کا اظہار کیا۔

"یہ سب باتیں تو میرے ذہن میں بھی ہیں لیکن ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بھی تو نہیں بیٹھا جا سکتا۔ ہمیں کچھ نہ کچھ تو کرنا ہو گا۔" وہ خاصا بے چین ہو رہا تھا۔

"فوری اور بروقت ایکشن کی تو ایک ہی صورت ہے کہ ہم وہاں کی پولیس کو ایکشن میں لائیں اور انہیں اس جگہ کا محاصرہ کرنے کی ہدایت کرنے کے بعد خود پیچھے سے روانہ ہو جائیں۔" ذیشان نے کچھ سوچتے ہوئے تجویز پیش کی۔

"اب تک میرے سامنے جو حالات و واقعات آئے ہیں ان سے نالی والا کی پولیس ناقابل اعتبار محسوس ہوتی ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہو گا کہ وہاں کے تھانے دار کو پیر سائیں کا چمچہ سمجھا جاتا ہے۔"

"پھر تو ہم وہاں کی پولیس سے کام نہیں لے سکتے۔" ذیشان فکرمند ہوا۔

"میرے ذہن میں ایک تجویز ہے لیکن یہ نہیں معلوم کہ تمہارے اختیارات کی حد کہاں تک ہے اور تم کن کن لوگوں سے کام لے سکتے ہو۔" اس نے پُرسوچ انداز میں بولنا شروع کیا۔

"تم تجویز تو بتاؤ۔ جو کچھ ہو سکا میں ضرور کروں گا۔" ذیشان فوراً بولا۔

"اگر ہم پولیس فورس کے بجائے نالی والا سے قریب ترین کسی چیک پوسٹ وغیرہ پر موجود فوج یا رینجرز کے جوانوں سے کام لے سکیں تو زیادہ اچھا رزلٹ آ سکے گا۔"

"اوہ یس۔ یہ اچھی تجویز ہے۔ میں معلوم کرتا ہوں کہ وہاں سے قریب ترین علاقے میں فوج کا کوئی یونٹ کام کر رہا ہے یا نہیں۔ تم اگر ہمارے ساتھ چلنا چاہو تو تیاری رکھو۔ میں اس طرف سے کوئی پوزیٹو رسپانس ملنے پر تمہیں فون کروں گا پھر اگر ضرورت ہوئی تو ہم خود وہاں کے لیے روانہ ہو جائیں گے۔" ذیشان نے سلسلہ منقطع کر دیا تو وہ خود تیاری کے لیے چل پڑا۔ لباس کی تبدیلی کے ساتھ ہی اس نے اپنا ریوالور بھی ہولسٹر میں رکھ لیا۔ کسی ممکنہ مہم جوئی کے خیال سے اس نے فارمل ڈریس کے بجائے جینز اور ٹی شرٹ کا انتخاب کیا تھا اور اسی مناسبت سے جوتے بھی جوگرز پہنے تھے۔ اپنی تیاری کی طرف سے مطمئن وہ گھر سے نکلنے کو تیار تھا کہ ماریا کمرے میں چلی آئی۔

"خیریت آپ کہاں جا رہے ہیں؟" اس کی تیاری دیکھتے ہوئے اس نے حیرت سے دریافت کیا۔

"ضروری کام ہے ایک دوست سے ملنے جا رہا ہوں۔" اس نے مختصر جواب دیا۔

"آپ کی تیاری سے تو کچھ عجیب سا ہی احساس ہو رہا ہے۔ میں نے پہلے تو کبھی آپ کو دوستوں سے اس حلیے میں ملاقات کے لیے جاتے ہوئے نہیں دیکھا۔" ماریا نے فوراً ہی اعتراض جڑا تو وہ دل میں خود کو ہی کوس کر رہ گیا۔ بچپن سے کچھ ایسے ماحول میں تربیت ہوئی تھی کہ وہ ملنے جلنے کے لیے ہمیشہ فارمل ڈریسنگ ہی کرتا تھا اور ظاہر ہے ماریا بیوی کی حیثیت سے اس کی اس عادت سے واقف تھی چنانچہ فوراً ہی اس کے جھوٹ کو پکڑ لیا۔

"او کے یار! میں مانتا ہوں کہ میں کسی دوست سے ملنے نہیں جا رہا ہوں لیکن ضروری کام سے بہرحال جا رہا ہوں۔ مجھے نہیں معلوم کہ مجھے وہاں کتنا وقت لگے گا اور میں واپس لاہور آ بھی سکوں گا یا نہیں۔ تم ایسا کرنا کہ پروگرام کے مطابق صبح نور کوٹ کے لیے روانہ ہو جانا۔ ہو سکتا ہے کہ میں ڈائریکٹ وہیں پہنچوں۔" اس نے آدھا ادھورا سا اعتراف کیا۔

"ایسا کون سا ضروری کام آ پڑا شہریار کہ آپ ایک فون کال پر اچانک ہی اٹھ کر چل پڑنے کے لیے تیار ہیں اور جا بھی لاہور سے باہر رہے ہیں۔ آپ کو کم از کم ماموں اور ممانی جان کو تو بتا کر جانا چاہیے۔" وہ خفگی کا اظہار کرنے لگی۔

"انہیں بتایا تو وہ تم سے بھی زیادہ سوال جواب کریں گے۔ بہتر ہے کہ تم انہیں میرے جانے کے بعد بتا دینا۔"

"لیکن بتاؤں کیا؟ مجھے تو خود کچھ معلوم نہیں کہ آپ کہاں، کس کے ساتھ اور کیوں جا رہے ہیں؟" اس کی آواز تھوڑی سی بلند ہوئی۔

"جتنا تمہیں معلوم ہے بتا دینا۔ بعد میں، میں خود ان دونوں سے بات کر لوں گا۔" وہ کسی طور کھلنے پر راضی نہیں تھا۔

"آپ مت جائیں۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ آپ کے انداز سے ظاہر ہے کہ آپ کسی خطرناک کام کے لیے جا رہے ہیں۔" وہ یک دم ہی روہانسی ہو کر اس سے لپٹ گئی۔

"یہ کیا بچپنا ہے ماریا! تم اتنا کیوں گھبرا رہی ہو؟ انشاء اللہ کل تم مجھے بالکل ٹھیک ٹھاک حالت میں نور کوٹ میں دیکھو گی۔" اس نے نرمی سے ماریا کو ٹوکتے ہوئے اس کا شانہ سہلایا۔

"آپ صرف مجھے تسلی دینے کے لیے ایسا کہہ رہے ہیں ورنہ مجھے معلوم ہے کہ کوئی تو گڑبڑ ہے۔" وہ کسی طور مطمئن ہو کر نہیں دے رہی تھی۔

"ٹھیک ہے کوئی گڑبڑ ہے اور شاید تھوڑا سا خطرہ بھی لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ میں گھر میں بند ہو کر بیٹھ جاؤں۔ خطروں سے لڑنا تو مرد کی شان ہوتی ہے اور جب معاملہ بہت سی انسانی زندگیوں کے تحفظ کا ہو تو کسی نہ کسی کو تو خطرہ مول لینے کی ہمت کرنی ہی پڑتی ہے۔ تم مجھے جانے دو اللہ نے چاہا تو ہم پھر ملیں گے۔" اس نے نرمی سے کہتے ہوئے ماریا کے بازو خود سے الگ کرنے کی کوشش کی تو جواباً وہ مزید اس سے چپک گئی اور اس کے لبوں کا ایک بھرپور بوسہ لے ڈالا۔

"یہ بوسہ آپ کو یاد دلاتا رہے گا کہ آپ کو کسی کی خاطر واپس لوٹنا ہے اس لیے اپنا بہت خیال رکھیے گا۔" وہ نہایت جذباتیت سے کہتی ہوئی اس سے الگ ہوئی۔ جواباً وہ صرف سر ہلانے پر ہی اکتفا کر سکا کیونکہ اس کے موبائل پر ذیشان کی کال آنے لگی تھی۔

"مبارک ہو شہریار! نالی والا کے ایک قریبی علاقے میں موجود رینجرز والوں کو ٹارگٹ کی طرف موو کرنے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر وہ سارے علاقے کو اپنے کنٹرول میں لے لیں گے۔ اب تم بتاؤ کہ ان کی طرف سے رپورٹ آنے کا انتظار کرنا ہے یا ابھی یہاں سے روانہ ہونا ہے؟" ذیشان نے اسے خوش خبری سناتے ہوئے استفسار کیا۔

"میں تو فوری روانگی چاہتا ہوں کیونکہ مجھے کچھ نہ کچھ کامیابی ملنے کا پورا یقین ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"تو پھر ٹھیک ہے یہاں آ جاؤ ہم نے بھی روانگی کی تیاریاں شروع کر دی ہیں۔" ذیشان نے یہ کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا۔

"او کے ڈیئر! میں چلتا ہوں۔" وہ ماریا کے گال کو ہلکے سے تھپتھپاتا ہوا چل پڑا۔ سی ایف پی کا دفتر وہاں سے بہت زیادہ دور نہیں تھا۔ اسے وہاں تک پہنچنے میں بیس منٹ سے بھی کم وقت لگا۔ یہ ایک پانچ منزلہ عمارت تھی جس کے گراؤنڈ فلور پر سی ایف پی کا دفتر تھا جبکہ باقی عمارت میں دیگر مختلف نوعیت کے دفاتر تھے۔

"سر تیمور اپنے دفتر میں ہیں۔ آپ بھی وہیں چلے جائیں۔" وہ دفتر پہنچا تو ایک شخص نے اس کا تعارف سنتے کے ساتھ ہی اسے اطلاع دی۔ اس وقت اسے معلوم ہوا کہ گراؤنڈ فلور

پر واقع اس دفتر کے علاوہ زیر زمین بھی تعمیر کی گئی ہے اور وہاں بھی سی ایف پی والوں کا قبضہ ہے اہلکار کی راہنمائی پر سیڑھیاں اتر کر نیچے جاتے ہوئے اس نے فوراً ہی محسوس کر لیا کہ دفتر کا یہ حصہ ساؤنڈ پروف ہے اور یقیناً سی ایف پی کی اصل سرگرمیوں کا مرکز بھی۔ ممکن تھا کہ وہ مشکوک افراد سے معلومات کے حصول کے لیے بھی اس حصے کو استعمال کرتے ہوں۔ زیر زمین موجود عمارت کے اس ساؤنڈ پروف حصے میں اگر کسی پر سخت جسمانی تشدد بھی کیا جاتا تو اس کی چیخیں باہر سنائی نہیں دیتیں۔

سیڑھیاں اترتے ہوئے اس کا ذہن بہت تیزی سے یہ سب سوچ رہا تھا۔ اب معلوم نہیں کہ وہ ہی اپنی سوچوں میں بہت زیادہ مگن تھا یا نیچے سے اوپر کی طرف تیزی سے بڑھتا وہ سیاہ پوش اہلکار بے پروائی کا مرتکب ہوا تھا جو ان دونوں کا تصادم ہو گیا۔ تصادم شدید تھا۔ اسے اپنے قدم ڈگمگاتے ہوئے محسوس ہوئے لیکن خیر گزری کہ سیاہ پوش نے اپنے ساتھ ساتھ اسے بھی سنبھال لیا اور "سوری سر" کہتا ہوا تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ یہ سب اتنے مختصر دورانیے میں ہوا تھا کہ وہ اس کی شکل بھی ڈھنگ سے نہیں دیکھ سکا۔ نیچے پہنچتے ہی اس کا ذیشان سے سامنا ہو گیا۔ وہ بھی چست سیاہ لباس میں ملبوس تھا۔

"اچھا ہوا تم آگئے۔ ہم بس نکلنے ہی والے تھے۔ گاڑی بالکل تیار ہے۔" وہ اس سے مصافحہ کرتا ہوا بولا اور پھر اپنے ساتھ ہی لے کر آگے بڑھتا چلا گیا۔ ذیشان کے ساتھ ساتھ چلتا وہ اردگرد کا بھی جائزہ لیتا جا رہا تھا۔ کافی وسیع و عریض رقبے پر قائم دفتر کے اس حصے میں متعدد بند دروازے نظر آ رہے تھے۔ دروازوں کے پیچھے کیا تھا وہ نہیں جانتا تھا لیکن اتنا اندازہ ضرور لگا سکتا تھا کہ وہ لوگ خاصے منظم طریقے سے کام کر رہے تھے۔ ذیشان اسے اپنے ساتھ جس جگہ لے گیا وہ ایک بڑا گیراج تھا جہاں بیک وقت تین سے چار گاڑیاں کھڑی ہو سکتی تھیں۔ اس وقت بھی وہاں دو گاڑیاں موجود تھیں۔ ایک پراڈو اور دوسری لینڈ کروزر۔ اس وقت لینڈ کروزر کے دروازے کھلے ہوئے تھے اور اس کی ڈرائیونگ سیٹ کے علاوہ پچھلی سیٹیں بھی آباد نظر آ رہی تھیں۔

"آجاؤ۔" ذیشان نے کھلے دروازے سے اندر بیٹھتے ہوئے اس سے کہا۔ ان دونوں کے اندر بیٹھتے ہی لینڈ کروزر حرکت میں آگئی۔

"وہاں کی پوزیشن کو تو رینجرز والے کنٹرول کر لیں گے۔ میں احتیاطاً اپنے ساتھ یہ تین بندے لے جا رہا ہوں تاکہ ہم اپنے طور پر جو کچھ کرنا چاہیں آسانی سے کر سکیں۔" لینڈ کروزر خم دار چڑھائی سے گزر کر عمارت کے پچھلے حصے سے باہر نکل رہی تھی جب ذیشان نے اسے بتایا۔ اس نے جواباً کچھ کہے بغیر محض سر ہلا دیا۔ مشکل سے پانچ منٹ ہی ان کا سفر خاموشی سے گزرا ہوگا کہ پچھلی سیٹ پر موجود دو افراد میں سے ایک ذیشان سے مخاطب ہوا۔

"تالی والا سے کال آرہی ہے سر۔"

"لاؤ بات کرواؤ۔" ذیشان نے فوراً اس سے سیٹ لے لیا اور بات کرنے لگا۔ اس کی گفتگو سے اندازہ ہوا کہ دوسری طرف رینجرز کا کوئی دستے دار ہے جو اپنے تالی والا کے قریب پہنچنے کی اطلاع دینے کے بعد مزید ایکشن کے لیے اجازت لے رہا ہے۔ ذیشان نے اسے اپنی جلد آمد سے آگاہ کرتے ہوئے آگے بڑھنے اور ایکشن لینے کی اجازت دے دی۔

اس کال کے بعد آگے کا پون گھنٹا پھر خاموشی کا تھا۔ تیزی سے سفر کرتی لینڈ کروزر کے اردگرد کے مناظر بھی اسی رفتار سے تبدیل ہوتے جا رہے تھے لیکن گاڑی میں موجود ان پانچ نفوس میں سے شاید کسی کی بھی توجہ ان معمولی تبدیلیوں کی طرف نہیں تھی۔ وہ سب چشم تصور سے تالی والا میں ہونے والی کارروائی دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ذیشان کے ہاتھ میں موجود سیٹ ایک بار پھر جاگا تو ہر ایک ہمہ تن گوش ہو گیا۔ خصوصاً اس کے ساتھ بیٹھا شہریار۔ ذیشان سنجیدگی سے دوسری طرف کی بات سنتا رہا پھر بولا۔

"ٹھیک ہے حراست میں لیے گئے تمام افراد کو فی الحال ایک کمرے میں بند کر دیں اور وہاں موجود سامان کے ساتھ چھیڑ چھاڑ نہ کریں۔ میں ایکسپرٹس کی موجودگی کے بغیر وہاں سے کسی چیز کو ہٹانا مناسب نہیں سمجھتا۔" نہایت سنجیدگی سے یہ ہدایات دینے کے بعد وہ اپنے سیٹ پر کہیں اور رابطہ کرنے میں مصروف ہو گیا۔ رابطہ ہونے پر اس نے جو گفتگو کی اس سے اندازہ ہوا کہ وہ بارودی مواد و ہتھیاروں وغیرہ سے متعلق ماہرین کی خدمات کے لیے کسی سے درخواست کر رہا ہے۔ وہ ابھی اس گفتگو کو نمٹا کر فارغ ہوا تو شہریار کی بے تحاشا سوالیہ نظروں سے سامنا ہو گیا۔

"تالی والا میں رینجرز نے آپریشن شروع کر دیا ہے۔ انہوں نے دو گروہوں میں کارروائی کی تھی۔ ایک گروہ پیر سائیں کی گرفتاری کے لیے کام کر رہا اور دوسرا اس مشکوک عمارت کی طرف گیا تھا۔ پیر سائیں کی گرفتاری کے لیے جانے والوں کو ناکامی کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ وہ نہ تو خانقاہ میں موجود تھا اور نہ ہی اس گھر میں جہاں آج کل اس کی رہائش بتائی جا رہی ہے۔ بہر حال ممکنہ حد تک گاؤں کا محاصرہ کر لیا گیا ہے اور کوشش یہی ہے کہ اگر وہ اب تک گاؤں سے نہیں نکل سکا ہے اور وہیں کہیں چھپا ہوا ہے تو اسے نکلنے نہ دیا جائے۔ اس کے قریبی ساتھیوں کو گرفتار کر کے ان سے بھی پوچھ گچھ کی جائے گی۔ دوسری طرف عمارت پر ریڈ کرنے والوں کو بڑی کامیابی ملی ہے۔ ہمیں شبہ تھا کہ وہ عمارت منشیات کے ذخیرے کے لیے استعمال کی جا رہی ہے لیکن معاملہ صرف اتنا نہیں ہے۔ وہاں سے بہت سا بارودی ذخیرہ اور خودکار ہتھیار برآمد ہوئے ہیں۔ اسی لیے میں نے رینجرز والوں کو زیادہ اشتیاق اور چھیڑ چھاڑ سے روک دیا ہے۔ ہم نے رینجرز کے جس یونٹ سے مدد لی تھی، وہ فعال اور فرض شناس تو ثابت ہوا ہے لیکن افسوس کہ ان کے پاس زیادہ جدید آلات اور سہولیات موجود نہیں ہیں۔ بہتر ہے کہ ہم باقی کام اپنی نگرانی میں کروائیں۔"

ذیشان نے گمبھیر سنجیدگی کے ساتھ جو اطلاعات فراہم کیں انہیں سن کر وہ بھی ششدر رہ گیا۔ دشمن جانے کہاں کہاں اپنے پنجے گاڑ چکا تھا۔ بڑے شہروں میں ہونے والی دہشت گردی کی کارروائیاں ہی کیا کم تھیں کہ اب تسلسل سے مختلف گاؤں دیہاتوں میں ان کی موجودگی کے آثار ملنے لگے تھے۔ شاید شہروں سے پہلے انہوں نے ان چھوٹے موٹے علاقوں میں ہی اپنے قدم جمائے تھے جہاں انتظامیہ کی کمزور گرفت اور رہائشیوں کی سادہ لوحی کی وجہ سے طویل عرصے تک ان کی موجودگی کا پتا ہی نہیں چل سکا اور وہ دیمک کی طرح دھیرے دھیرے اپنا کام کرتے رہے۔ کچھ عجب نہیں تھا کہ بڑے شہروں میں ہونے والی دہشت گردی کی کارروائیوں کو ان چھوٹے علاقوں میں ہی بیٹھ کر کنٹرول کیا جا رہا ہو اور یہیں دہشت گرد بھی تیار کیے جا رہے ہوں۔ طبقاتی تفریق، معاشی بدحالی اور تعلیم و صحت کی سہولیات سے عاری کسی معاشرے میں ایسے نوجوانوں کو ڈھونڈنا کوئی ایسا مشکل کام نہیں تھا خصوصاً اس صورت میں کہ دشمن چالاک، کینہ پرور اور بے رحم تھا۔ جیتے جاگتے، صحت مند و خوب صورت جوانوں کو موت کی وادی میں دھکیل دینا بے رحمی نہیں تو اور کیا تھا لیکن محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہونے کا نعرہ لگانے والوں کو اپنی اس بے رحمی کا ادراک ہی کہاں تھا؟ یوں بھی دشمن سے رحم کی امید رکھنا بیکار تھا۔ اصل کام تو اپنے دفاع کو مضبوط کرنا تھا اور دفاع صرف فوج اور ہتھیاروں سے ہی نہیں ہوتا... اپنے لوگوں کو شعور و آگہی کی روشنی بھی دینی پڑتی ہے لیکن لوگوں کی جہالت سے فائدہ اٹھا کر اقتدار کے ایوانوں میں پہنچنے والے ایسی غلطی کیوں کر کرتے۔ وہ تو ممکنہ حد تک کھاؤ پیو اور جمع کرو بلکہ کرتے ہی چلے جاؤ کی پالیسی پر عمل پیرا رہتے تھے... ایک جاتا نہیں تھا تو دوسرا اپنی باری کے لیے بے چین رہتا... ایسے میں ملک بھر میں کیا ہو رہا ہے اور کیا نہیں، اس کا کھوج کون لگاتا اور کیوں لگاتا۔

وہ راستے بھر اسی طرح کے خیالات میں غلطاں و پیچاں رہا۔ سفر خاصا طویل تھا لیکن وہ نور کوٹ سے لاہور تک اکثر سفر کرتے رہنے کا عادی تھا۔ تالی والا تک کا وہ سفر محض مزید چند منٹ ہی طویل ثابت ہوا ہوگا۔ راستے میں ایک دو بار ذیشان نے رینجرز والوں سے رابطہ کر کے انہیں ہدایات دی تھیں۔ ان میں سے ایک ہدایت گاؤں والوں کو اپنے مکانات تک محدود رہنے کے سلسلے میں دی گئی تھی۔ دوسری بار بات ہونے پر رینجرز کو لیڈ کرنے والے ان کے افسر نے بتایا تھا کہ مسجد سے اس سلسلے میں اعلان کر دیا گیا ہے اور گاؤں والوں نے اس ہدایت پر عمل درآمد بھی کیا ہے۔ دوسرے مرحلے میں گھر گھر تلاشی کا کام شروع کر دیا گیا تھا تاکہ اگر پیر سائیں اپنے کسی چیلے کے ساتھ کسی گھر میں روپوش ہو تو اسے بازیافت کیا جا سکے۔ سفر طے ہونے تک انہیں اس سلسلے میں کسی کامیابی کی نوید نہیں ملی تھی اور اب وہ تالی والا میں داخل ہو رہے تھے۔

گاؤں کی حدود میں داخل ہوتے ہی انہیں تالی کے درخت نظر آنا شروع ہو گئے۔ یہی درخت گاؤں کی وجہ تسمیہ بھی تھے۔ اب تک بت کی طرح ساکت بیٹھا شہریار گاؤں کی حدود شروع ہوتے ہی اپنے خون میں جوش سا محسوس کرنے لگا اور اس کی نظریں گاڑی کے شیشوں سے باہر اردگرد کا جائزہ لینے لگیں۔ طویل شاہراہوں پر فراٹے بھرنے والی لینڈ کروزر کی رفتار بھی گاؤں کی حدود میں پہنچ کر کافی کم ہو گئی تھی۔ اردگرد کے مناظر پہلے کی طرح پلک جھپکنے میں نظروں سے غائب نہیں ہو رہے تھے تب ہی اس کی جائزہ لیتی آنکھوں نے تالی کے درختوں کے جھنڈ میں حرکت سی محسوس کی۔ پل بھر کو دکھائی دینے والی وہ متحرک شے نیلے رنگ کی تھی یعنی وہ کوئی جانور نہیں ہو سکتا تھا بلکہ یقینی طور پر کوئی انسان تھا جس نے نیلے رنگ کے کپڑے پہن رکھے تھے۔

"گاڑی روکو۔" اس نے بلند آواز میں کہا تو

ڈرائیونگ سیٹ پر موجود اہلکار نے فوراً بریک لگا دیے۔ ابھی لینڈ کروزر پوری طرح رکی بھی نہیں تھی کہ وہ دروازہ کھول کر باہر کی طرف لپکا اور نالی کے اس جھنڈ کی طرف دوڑتا چلا گیا۔ اس کے حساب سے اگر اس جھنڈ میں کوئی شخص موجود تھا تو وہ مشکوک تھا کیونکہ کسی عام دیہاتی کو گھر تک محدود رہنے کا حکم ملنے کے بعد یوں چوری چھپے یہاں موجود رہنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

''تم جو کوئی بھی ہو فوراً ہاتھ اٹھا کر باہر آجاؤ۔ دیر کرنے کی صورت میں سخت نقصان اٹھاؤ گے۔'' اندازے سے اس جگہ کے قریب پہنچنے پر جہاں اس نے مشکوک فرد کو غائب ہوتے دیکھا تھا، وہ با آواز بلند بولا اور اپنا ریوالور ہولسٹر سے نکال کر اس کا سیفٹی کیچ ہٹا دیا۔ چند سیکنڈ گزر گئے لیکن دوسری طرف سے کوئی ردعمل ظاہر نہیں ہوا تو وہ محتاط قدموں سے آگے بڑھا۔ اس کے قدم بڑھاتے ہی ایک شعلہ سا لپکا اور فضا میں فائر کی آواز گونجی۔ وہ خوش قسمت تھا جو اس فائر سے بچنے میں کامیاب ہو گیا کیونکہ اس کے اضطراری طور پر نیچے گرتے ہی گولی عین اس مقام سے گزری جہاں اس کا سر تھا۔ اس نے لیٹے لیٹے ہی اندازے سے ان دو درختوں کے درمیان فائر جھونک دیا جہاں اس کے خیال کے مطابق وہ شخص موجود تھا اور اب اس فائر کے بعد اس کے مشکوک ہونے میں بھی کوئی شک نہیں رہا تھا۔ فائر کرنے کے بعد وہ اپنی جگہ ٹھہرا نہیں رہا بلکہ تیزی سے قلابازی کھا کر ایک موٹے تنے کے پیچھے پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس درخت کا انتخاب اس نے بہت ہوشیاری سے کیا تھا۔ اس کے پیچھے چھپنے سے ایک تو وہ جوابی فائر سے بچ گیا تھا دوسرے اس کے اور حملہ آور کے درمیان فاصلہ بھی قدرے کم ہو گیا تھا۔ ساتھ ہی مقابلے میں اس کی پوزیشن بھی پہلے سے کافی بہتر ہو گئی تھی۔ پہلے اس کا مقابل چھپا ہوا تھا اور وہ اس کی نظروں میں تھا اب وہ دونوں ہی ایک دوسرے کو نہیں دیکھ سکتے تھے۔ مقابل کی درست پوزیشن جاننے کے لیے اس نے ایک بار پھر اسی سمت ... فائر کیا۔ فوراً ہی پے در پے دو جوابی فائر داغے گئے لیکن اس نے محسوس کر لیا کہ وہ فائر پہلے کے مقابلے میں زیادہ فاصلے سے کیے گئے تھے اور باقاعدہ سوچ سمجھ کر نہیں کیے گئے تھے بلکہ اسے محض یہ باور کروایا گیا تھا کہ اس کا مقابل ابھی موجود ہے لیکن حقیقتاً وہ وہاں سے فرار ہو رہا تھا۔ وہ خود بھی تیزی سے حرکت میں آگیا اور درختوں کی آڑ لے کر آگے بڑھنے لگا۔

ذیشان اور اس کے ساتھی بھی یقیناً اس کے پیچھے جھنڈ میں داخل ہوئے ہوں گے لیکن انہوں نے اب تک اپنی موجودگی کا کوئی ثبوت نہیں دیا تھا اس لیے وہ اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ وہ کس طرف موجود ہیں اور کیا کر رہے ہیں؟ اس وقت تو وہ پورے ارتکاز سے فرار ہوتے شخص کی آہٹوں اور سرسراہٹوں کو محسوس کرتا اس کا تعاقب کر رہا تھا۔

تعاقب کا یہ سلسلہ زیادہ طویل ثابت نہیں ہوا اور اسے ایک بار پھر نیلے کپڑوں کی جھلک دکھائی دے گئی۔ اس نے فوراً ہی اس سمت دو فائر جھونک دیے لیکن یہ دونوں ہی فائر صرف اس شخص کو خوف زدہ کرنے کے لیے کیے گئے تھے اور مقصد صرف اسے خوف زدہ کرنا تھا۔ جواب میں فوراً ہی کئی فائر ہوئے۔ اس نے کیے گئے ہر فائر کی گنتی یاد رکھی تھی اس لیے اس وقت وثوق سے کہہ سکتا تھا کہ اس کے مقابل کا ریوالور اب خالی ہو چکا ہے اور وہ مزید فائر کرنے کی پوزیشن میں نہیں رہا۔ اس بات کا یقین ہوتے ہی وہ بالکل بے خوف ہو گیا اور اندھا دھند اٹھ کر اس کی سمت دوڑا۔ اس کا اندازہ درست تھا مقابل کے پاس واقعی مزید گولیاں نہیں بچی تھیں اس لیے اسے اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر وہ بدحواس سا ہو کر بھاگا لیکن اب شہریار اسے چھوڑنے والا نہیں تھا۔ ویسے بھی اپنے چھریرے ورزشی بدن کی وجہ سے اسے اس بے ڈھب پستہ قامت آدمی پر فوقیت حاصل تھی۔ بھاگتے بھاگتے اس نے ایک لانگ جمپ لگائی اور سیدھا اس پر جا پڑا۔ اس کے حملے کے زور میں وہ زمین پر گر گیا۔ خود شہریار بھی اس پر جا پڑا اور دونوں ہاتھوں سے اس کی ٹھکائی کرنے لگا۔ بدحواس آدمی نے پہلے تین چار وار تو خاموشی سے سہہ لیے پھر وہ بھی اپنے بچاؤ کے لیے حرکت میں آیا اور شہریار کی گردن اپنے دونوں ہاتھوں میں دبوچ لی۔

بے شک وہ پھرتیلا نہیں تھا لیکن اس کے موٹے جسم میں بلا کی طاقت تھی۔ شہریار کو یوں لگا کہ اس کی گردن کسی آہنی شکنجے میں پھنس گئی ہو۔ وہ دونوں ہاتھوں کی مدد سے اپنی گردن کے گرد موجود اس شکنجے کو ڈھیلا کرنے کی کوشش کرنے لگا لیکن موٹی موٹی انگلیوں والے بے ڈھب ہاتھ تو جیسے کسی طاقتور سلوشن کی مدد سے اس کی گردن سے چپک گئے تھے اور لمحہ بہ لمحہ اس کے لیے سانس لینے کے عمل کو دشوار بناتے جا رہے تھے۔ اس نے اس شکنجے سے خود کو آزاد کروانے کی آخری ترکیب کے طور پر اپنے جسم کی تمام تر توانائی کو یکجا کیا اور دائیں ٹانگ کا گھٹنا آگے کی طرف موڑ کر پوری قوت سے مقابل کی ناف پر دے مارا۔ اس کا یہ وار کارگر ثابت ہوا اور موٹے نے تڑپ کر اس کی گردن چھوڑ دی۔ گردن آزاد ہوتے ہی شہریار نے اس کی ناک پر سر کی زوردار ٹکر ماری۔ اس کی ناک سے خون کا فوارہ سا پھوٹ پڑا۔

''بس اتنا کافی ہے۔ اب ہمیں اسے اریسٹ کرنے دو۔'' وہ ابھی اسے دو چار ہاتھ اور جڑنے کا ارادہ رکھتا تھا کہ قریب سے ذیشان کی آواز سنائی دینے پر چونک گیا اور پھر فوراً ہی موٹے سے الگ ہو کر پیچھے ہٹ گیا۔

اس کے پیچھے ہٹتے ہی ذیشان کے دو اسلحہ بردار ماتحت آگے بڑھے اور اسے اپنی زد میں رکھتے ہوئے ایک نے اس کے ہاتھ میں ہتھکڑی پہنا دی۔ ہتھکڑی پہنانے کے بعد انہوں نے موٹے کو اٹھنے کا حکم دیا۔ خوفناک اسلحے کی موجودگی میں اسے اس حکم سے سرتابی کی مجال نہیں تھی اس لیے وہ کراہتا ہوا کھڑا ہو گیا۔

''آپ کا ریوالور سر۔'' ان میں سے ایک نے شہریار کا زمین پر گرا ریوالور اٹھا کر اسے مؤدبانہ پیش کیا تو اس نے خاموشی سے ریوالور تھام کر دوبارہ ہولسٹر میں رکھ لیا۔ جوش میں اس نے فوراً ہی ریوالور ہاتھ سے چھوڑ دیا تھا اور مقابل کو خالی ہاتھ زیر کرنے بیٹھ گیا تھا ورنہ سب سے آسان طریقہ تو یہ تھا کہ وہ ریوالور کی نال اس کی کنپٹی سے لگاتا اور اپنے حکم کی تعمیل کروا لیتا۔

''میں اور میرے یہ دونوں ساتھی تمہارے پیچھے ہی اس جھنڈ میں داخل ہو گئے تھے لیکن تم دونوں کے درمیان فائرنگ کا تبادلہ ہونے لگا۔ میں نے اس موقع پر مداخلت کرنی مناسب نہیں سمجھی کیونکہ تم بہت پُرجوش تھے اور ہماری مداخلت پر کچھ بھی سوچے سمجھے بغیر بھڑک سکتے تھے۔ ہم تینوں نے تم دونوں کے درمیان ہونے والی ہاتھ پیروں کی لڑائی بھی اچھی طرح دیکھی ہے۔ اگر تم چند سیکنڈ اور اپنی گردن اس شخص کے ہاتھوں سے چھڑانے میں کامیاب نہ ہو پاتے تو پھر مداخلت کو ناگزیر سمجھتے ہوئے ہم میں سے کوئی تمہارا ساتھ دینے کے لیے سامنے آجاتا۔'' نیلے کپڑوں والے موٹے کو اپنے ساتھ لیے لینڈ کروزر کی طرف واپس جاتے ہوئے ذیشان آہستہ آواز میں اسے تفصیلات سے آگاہ کرنے لگا۔ جسے وہ ہونٹ بھینچے سنتا رہا۔ اسے اندازہ تھا کہ ذیشان اسے کیا سمجھانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس وقت اس نے کافی احمقانہ انداز میں بہادری کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ اگر وہ اندھا دھند دوڑ پڑنے کے بجائے ان لوگوں کو بھی آگاہ کر دیتا تو اس شخص کو زیادہ آسانی سے گرفتار کیا جا سکتا تھا۔ وہ تو اس کی قسمت اچھی تھی کہ وہ کسی فائر کی زد میں نہیں آیا ورنہ حماقتیں تو اس نے کئی ایک کی تھیں۔

ان کے لینڈ کروزر میں واپس بیٹھتے ہی ڈرائیور نے فوراً ہی گاڑی آگے بڑھا دی جبکہ ایک اہلکار اسپرٹ میں بھیگی روئی سے زخمی ملزم کی ناک سے بہتا خون روکنے کی کوشش کرنے لگا۔

''کیا نام ہے تمہارا؟'' ذیشان نے اسے گھورتے ہوئے وہیں اپنی تفتیش کا آغاز کر دیا۔

''واجد جناب۔'' اس نے نہایت فرمانبرداری سے بتایا۔ اس نام کو سن کر شہریار چونک گیا۔ کچھ دن قبل پیر آباد سے گرفتار ہونے والا کالے میاں جو کہ بابے کی بیوی شہزادی سے مردہ بچے کی ہڈیاں وصول کرنے آیا تھا، اس نام کے شخص کو پیر سائیں کا خاص کارندہ بتا چکا تھا۔ مشابرم خان کی تحقیقات کے نتیجے میں بھی یہ نام سامنے آیا تھا اور اب جن مشکوک حالات میں وہ شخص انہیں ملا تھا اس سے بھی ظاہر ہو رہا تھا کہ یہ وہی واجد ہے جس کا ذکر وہ سنتا رہا ہے۔

''ادھر جھنڈ میں کیا کر رہے تھے؟'' ذیشان نے کھردرے اور سخت لہجے میں پوچھا۔

''سخت حاجت ہو رہی تھی صاحب اس لیے گیا تھا۔'' اس نے خود پر کچھ اور معصومیت طاری کر لی۔

''کیوں تم نے اعلان نہیں سنا تھا کہ سب گاؤں والے اپنے گھر تک محدود ہیں۔''

''مجھے ذرا کم سنائی دیتا ہے صاحب۔ مجھے نہیں معلوم کسی اعلان کا۔'' اس نے پکے منہ کے ساتھ جھوٹ بولا جسے سن کر ذیشان کا میٹر گھوم گیا۔ اس نے الٹے ہاتھ کا ایک تھپڑ اس کے منہ پر دے مارا۔

''جھوٹ بولتا ہے سالا۔ میری ہر بات کا فرفر جواب دے رہا ہے اور مسجد کے لاؤڈ اسپیکر سے ہونے والا اعلان سنائی نہیں دیا۔''

''ہم منزل پر پہنچ گئے ہیں سر۔'' اسی وقت ڈرائیونگ سیٹ پر موجود شخص نے اطلاع دی۔

''اسے بھی اتارو گاڑی سے اور دوسرے زیرحراست افراد کے ساتھ رکھو۔ بعد میں، میں اس سے پوچھتا ہوں کہ اسے کیا سنائی دیتا ہے اور کیا نہیں؟'' فیصلے لہجے میں حکم صادر کرتا ہوا ذیشان لینڈ کروزر سے اترنے لگا۔ شہریار بھی اس کے ساتھ ہی تھا۔

''واجد نام کا یہ شخص اہم ہے اور پہلے ہی مشتبہ افراد کی فہرست میں شامل ہے۔'' اس نے ذیشان کو دھیمی آواز میں آگاہ کیا جس پر اس نے محض سر ہلایا اور رینجرز کے کمانڈ کرنے والے افسر کی طرف متوجہ ہو گیا جو اس کے استقبال کے لیے پیش قدمی کر چکا تھا۔ ان لوگوں سے مصافحہ کرتے ہوئے اس نے وہی معلومات دہرانا شروع کر دیں جن سے وہ راستے میں

بھی آگاہ کرتا رہا تھا۔ ان معلومات میں محض اتنا اضافہ ہوا تھا کہ رینجرز کے جوان جنھوں نے آبادی والے اس گاؤں کے بیشتر مکانات کی تلاشی لے چکے تھے لیکن کہیں سے بھی پیر سائیں کو برآمد نہیں کیا جاسکا۔ معلومات کے اس تبادلے کے بعد وہ انھیں اپنے ساتھ عمارت کے اندر لے گیا۔ آسیب زدہ مشہور اس عمارت کے ایک کمرے میں گتے کے چند چھوٹے ڈبوں کے ساتھ لوہے کی بڑی بڑی پیٹیاں رکھی ہوئی تھیں۔ گتے کے دو تین ڈبوں کے علاوہ لوہے کی ایک پیٹی کھلی ہوئی تھی۔ وہ دیکھ سکتے تھے کہ گتے کے ڈبوں میں سفید سفوف کی پڑیاں موجود ہیں جبکہ پیٹی میں بارودی مواد کا ذخیرہ تھا۔ منشیات اور اسلحے کے اس تباہ کن ذخیرے کو دیکھ کر وہ سب ہی اپنے اندر سنسنی سی محسوس کرنے لگے۔ یقینی سی بات تھی کہ پیر سائیں کے نام سے مشہور وہ شخص کسی خطرناک دشمن ملک کا ایجنٹ تھا جو روحانی پیشوا کے بہروپ میں اپنا گھناؤنا کام سرانجام دے رہا تھا۔

"اس پیر سائیں کو ہر حال میں گرفتار ہونا چاہیے آفیسر! اصل بندہ وہی ہے۔ وہ ہمارے ہاتھ نہیں آئے گا تو کچھ حاصل نہیں ہوگا۔" اس سارے ذخیرے کو دیکھ کر ذیشان اضطراری طور پر بول اٹھا۔

"میں نے ملنے والے احکامات اور ہدایات پر پوری طرح عمل کیا ہے جناب۔ اگر وہ بندہ یہاں ہوتا تو میں ضرور اسے گرفتار کرنے میں کامیاب ہوجاتا لیکن اس کا تو پورے گاؤں میں کہیں کوئی نام و نشان نہیں ہے۔" رینجرز آفیسر نے سنجیدگی سے جواب دیا اور اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "ایسا لگتا ہے کہ کسی نے عین وقت پر مخبری کر دی تھی کیونکہ ہم پروگرام کے مطابق دو گروپس میں دونوں طے شدہ ٹارگٹس تک پہنچے تھے۔ آپ کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق جس مکان میں پیر سائیں کے ہونے کا امکان تھا، ہم نے اسے گھیر کر اچھی طرح تلاشی لی تھی لیکن وہ وہاں موجود نہیں تھا۔ یہاں تک کہ اہلِ خانہ بھی اس بات سے واقف نہیں تھے کہ پیر سائیں اپنے مخصوص کمرے میں موجود نہیں ہے۔ ان لوگوں نے اس کے غائب ہونے کو اس کی کوئی روحانی کرامت سمجھا تھا کہ وہ خود تک خطرے کے پہنچنے سے پہلے ہی غائب ہوگیا تھا لیکن میرے حساب سے کسی نے مخبری کر کے عین وقت پر اسے فرار کروا دیا تھا۔ وہ مخبر کون ہوسکتا ہے، یہ کھوج لگانا آپ کا کام ہے کیونکہ مخبر کا آپ میں سے ہی ہونا یقینی ہے۔ میں یا میرے آدمی تو چھاپہ مارنے سے پہلے اس ساری صورتِ حال سے مکمل طور پر بے خبر تھے۔"

رینجرز آفیسر سپاٹ لہجے میں جو کچھ کہہ رہا تھا، وہ قرین از قیاس تھا۔ پیر سائیں کا اس اچانک عملی واقعہ سے غائب ہو جانا واضح بھی ظاہر کر رہا تھا کہ اسے مخبری کی گئی ہے وہ بھی اسے عین وقت پر کہ اسے منشیات اور بارود کے ذخیرے کو وہاں سے نکالنے کی مہلت نہیں مل سکی اور وہ محض اپنے آپ کو بچا کر لے گیا۔

"واجد کو پکڑیں۔ اس سے معلوم کریں۔ وہ اس بہروپیے کا سب سے قریبی ساتھی ہے۔ وہ ضرور اس کے اور اس کے دھندوں کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہوگا۔" اس گمبھیر صورتِ حال میں شہریار کو تاریکی سے نکلنے کی جو راہ سجھائی دی تھی وہ اس نے اوروں کو بھی سجھائی۔

"ٹھیک ہے۔ اسے دیکھتے ہیں۔" ذیشان نے جواب دیا اور فوراً ہی رینجرز آفیسر کی طرف متوجہ ہوگیا۔

"آپ کے تعاون کا شکریہ آفیسر! اب جبکہ ساری صورتِ حال انڈر کنٹرول ہے تو باقی معاملات میں اور میرے ساتھی خود دیکھ لیں گے۔" اس کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ اب وہ آگے کے معاملات میں رینجرز والوں کی شمولیت نہیں چاہتا ہے۔

"اوکے۔ میں اپنے جوانوں کے ساتھ یہاں سے روانہ ہوجاتا ہوں۔" وہ اس کا اشارہ بھانپ کر جانے کے لیے تیار ہوگیا۔

"ایک بار پھر شکریہ۔" ذیشان نے اس سے ہاتھ ملایا۔ شہریار نے بھی اس کی تقلید کی۔

"آؤ اب واجد کو بھی دیکھ لیتے ہیں۔ میرے باقی آدمی یہاں پہنچ کر جب تک اپنا کام شروع کرتے ہیں بہتر ہے کہ اتنی دیر میں ہم اس شخص کو بھی ٹٹول لیں۔ ہم یہاں سے روانہ ہونے سے پہلے جتنی معلومات حاصل کرنے میں کامیاب ہوجائیں گے اتنا بہتر رہے گا کیونکہ اس طرح ہم حاصل شدہ معلومات پر فوری ایکشن بھی لے سکیں گے۔" رینجرز آفیسر کی روانگی کے بعد ذیشان نے اس سے کہا اور پھر زیرِ حراست افراد کے لیے مخصوص کمرے میں جانے کے لیے اس کے شانے پر دوستانہ انداز میں ہاتھ رکھ دیا۔ ہاتھ رکھتے ہی وہ بری طرح چونکا اور اس کے شانے کو بغور دیکھتے ہوئے اس کی ٹی شرٹ پر چپکی کسی ہم رنگ شے کو انگوٹھے اور شہادت کی انگلی کی مدد سے الگ کیا۔ شہریار ششدر سا اس کی حرکت دیکھتا رہ گیا۔

یہ پُر پیچ و سنسنی خیز داستان جاری ہے
مزید واقعات آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں

ہے۔ اسلم اور ماہ بانو ایک ہی کمرے میں رات گزارتے ہیں۔ صبح ان کی روانگی کا پروگرام ہوتا ہے۔ تاہم رات میں کچھ لوگ ان کے مکان کو گھیر لیتے ہیں۔ گھیراؤ کرنے والے لوگ حامد راؤ سے کہتے ہیں کہ شفقت راؤ کی بیوی اور بیٹی کو ان کے حوالے کردیا جائے۔ یہ بات سن کر حامد راؤ گولی چلا دیتا ہے اور پھر وہاں دو بدو مقابلہ شروع ہوجاتا ہے۔ تاہم وہ سب دشمنوں کا گھیرا توڑ کر فرار ہوجاتے ہیں اور حامد راؤ کے شہر میں واقع فلیٹ میں آجاتے ہیں۔ ادھر مشابرم خان شہریار کو خانقاہ کی رپورٹ دیتا ہے اور اس گاؤں میں ہونے والے مقابلے کی خبر دینے کے ساتھ وہاں اسلم اور ماہ بانو کی موجودگی اور پھر فرار کا بتاتا ہے۔ شہریار کی خبر سن کر چونک جاتا ہے۔ بہرحال وہ مشابرم خان کو دوبارہ تالی والا جا کر تحقیقات کرنے کا حکم دیتا ہے۔ مشابرم خان وہاں پہنچ کر ایک بوڑھے شخص سے معلومات حاصل کرتا ہے۔ بات چیت کے دوران اچانک اس کے سر پر قیامت ٹوٹ پڑتی ہے۔ اس کا ذہن تاریکی میں ڈوبنے لگتا ہے۔ بے ہوشی طاری ہونے سے قبل اس کے کان جو آواز سنتے ہیں وہ گولی چلنے کے دھماکے کی ہوتی ہے۔ اس کے سر پر وار کرکے اسے بے ہوش کردیا جاتا ہے۔ وہ پیر سائیں کے ہرکاروں کے ہتھے چڑھ جاتا ہے جو اس پر تشدد کرتے ہیں۔ لیکن وہ نور بخش کے بیٹے کی مدد سے وہاں سے فرار ہوکر شہریار کے پاس پہنچتا ہے۔ ادھر ماہ بانو اسلم کے گاؤں اس کی ماں کو لینے پہنچتی ہے مگر زینت بی بی انتقال کرجاتی ہے۔ وہ اس کی تدفین کرا کے واپس اسلم کے پاس پہنچ جاتی ہے۔ تاہم نواز چانڈیو اور اس کا بھائی وہاں پہنچ جاتے ہیں اور ماہ بانو اور اسلم کو وہاں سے لے کر جانے میں آجاتے ہیں مگر اسلم اچانک حملہ کرکے انہیں ناکوں چنے چبوا دیتا ہے۔ وہ چانڈیو کو مارنے کا ارادہ کرتا ہے تو ماہ بانو آڑے آجاتی ہے اور اسے اس عمل سے روکتی ہے۔ وہ اسے چھوڑ کر وہاں سے نکل دیتے ہیں اور شہر چھوڑ دیتے ہیں۔ ادھر شہریار کی ملاقات میجر ذیشان سے ہوتی ہے تو وہ اسے بتاتا ہے کہ ایک اسپیشل فورس قائم کرلی گئی ہے اور وہ خود اس میں شامل ہوگیا ہے۔ شہریار یہ خبر سن کر خوش ہوتا ہے۔ یہ فورس ایک سیکورٹی ایجنسی کے طور پر خفیہ کام کرتی ہے۔ واپسی میں شہریار کو ماہ بانو کا فون موصول ہوتا ہے تو وہ چونک جاتا ہے۔ وہ اس سے ایک ریسٹورنٹ میں ملتی ہے اور اسلم سے شادی کی خبر سنا کر اس سے اپنے شناختی کاغذات بنوانے کے لیے اس کی مدد چاہتی ہے۔ شہریار اس کی ضد کے آگے ہتھیار ڈال دیتا ہے اور اس کی مدد کرنے پر راضی ہوجاتا ہے۔ ادھر اللہ چودھری کو ہیروئن کی ترسیل بیرون ملک کرنے کی ہدایت کرتا ہے۔ ناچار چودھری کو ہامی بھرنی پڑتی ہے۔ شہریار کو مشابرم خان کے ذریعے تالی والا میں مشکوک ڈبوں کے پہنچائے جانے کی اطلاع ملتی ہے۔ شہریار میجر ذیشان کے ذریعے وہاں کارروائی کرواتا ہے اور خود بھی اس کے ہمراہ تالی والا پہنچتا ہے۔ میجر ذیشان اور شہریار زیر حراست افراد سے تفتیش کے لیے جانے لگتے ہیں تو اچانک میجر ذیشان اس کے شانے پر ہاتھ رکھتا ہے۔ وہ اس کے شانے کو بغور دیکھتے ہوئے اس کی ٹی شرٹ پر چپکی کسی ہم رنگ شے کو انگوٹھے اور شہادت کی انگلی سے الگ کرتا ہے۔ یہ منظر شہریار کو ششدر کردیتا ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

شہریار نے حیرت سے ذیشان کے ہاتھ میں موجود شے کو دیکھا۔ وہ کیکڑے کی شکل کی ایک چپٹی سی شے تھی جسے ذیشان نے اس کی شرٹ پر سے اکھاڑا تھا۔ اس شے کی رنگت اس کی ٹی شرٹ جیسی ہی تھی اس لیے پہلی نظر میں اسے وہاں دیکھا نہیں جاسکتا تھا۔ ذیشان بھی اگر اس کے شانے پر ہاتھ رکھنے کے نتیجے میں محسوس ہونے والے ابھار پر غور نہ کرتا تو اسے اس شے کی وہاں موجودگی کا احساس نہیں ہوتا۔ شہریار خود اس شے کی موجودگی پر حیران اور پریشان تھا کہ آخر اس نے اس کی ٹی شرٹ تک کیسے اور کب رسائی حاصل کی۔ اپنی اس الجھن میں اس نے ذیشان سے کچھ کہنا چاہا لیکن اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور خود اس کیکڑے نما شے کا غور سے جائزہ لیتا رہا۔ آخر کار ڈیڑھ دو منٹ کے جائزے کے بعد وہ کسی نتیجے پر پہنچ گیا اور ایک گہری سانس لیتے ہوئے اس سے بولا۔

”تم قیدیوں والے کمرے کی طرف چلو شہریار.... میں ابھی دو منٹ میں وہاں آتا ہوں۔“ شہریار کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی اس کی ہدایت پر عمل پیرا ہوگیا اور اس کمرے کا رخ کیا جہاں دوسرے کئی افراد کے ساتھ ساتھ واجد کو بھی قید کیا گیا تھا۔ اس کمرے کے دروازے پر اب رینجرز کے کسی اہلکار کے بجائے ان کے ساتھ آیا ہوا CFP کا اہلکار موجود تھا۔ اس کے اشارے پر اس نے کمرے کا دروازہ کھول دیا۔ کمرے میں آٹھ افراد بند تھے جن کے ہاتھ پیروں کو رسّی کی مدد سے باندھ کر انہیں بے بس کردیا گیا تھا۔

”ہم بے قصور ہیں صاحب! ہمیں آپ نے یہاں کیوں بند کردیا ہے؟“ اسے اندر آتا دیکھ کر ان میں سے ایک فرد نے تیز لہجے میں کہا تو شہریار نے زبان سے کچھ کہنے کے بجائے اسے سخت نظروں سے گھورا۔ اس شخص کی ڈھٹائی واقعی بڑے کمال کی تھی کہ وہ اسلحے اور منشیات سے بھرے ایک آسیب زدہ مشہور مکان میں پایا گیا تھا پھر بھی خود کو بے قصور قرار دے رہا تھا۔ اسے گھورتے ہوئے اس نے محسوس کیا کہ اس آدمی کے نقش و نگار کچھ آشنا سے محسوس ہورہے ہیں۔ فوری طور پر اسے وجہ بھی سمجھ آگئی۔ وہ شخص کافی حد تک واجد سے مشابہ تھا لیکن اس کے مقابلے میں ذرا کم موٹا اور عمر میں چند سال چھوٹا محسوس ہورہا تھا۔

”نام کیا ہے تمہارا؟“ اس نے سخت لہجے میں احتجاج کرنے والے سے دریافت کیا۔

”خالد جناب۔“ اس نے نام بتایا۔

”واجد کے بھائی ہو؟“ اس نے کمرے میں ہی موجود نیلے لباس میں ملبوس موٹے واجد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

”جی.... بالکل صحیح پہچانا آپ نے۔“ اس نے اعتراف کیا۔

”ٹھیک ہے، تم ان دونوں بھائیوں کو یہاں سے نکال کر دوسرے کمرے میں لے چلو۔“ اس بار اس نے سی ایف پی کے اہلکار کی طرف رخ کرتے ہوئے حکم دیا اور خود باہر کی طرف قدم بڑھا دیے۔ واجد اور خالد یہ دونوں اس کی یادداشت میں اچھی طرح محفوظ تھے اور اسے یاد تھا کہ پیر آباد سے پکڑے جانے والے کالے میاں نے سخت تفتیش کے نتیجے میں اس بات کا اعتراف کیا تھا کہ پیر سائیں کا سب سے خاص کارگا واجد ہے جبکہ اس کا بھائی خالد بھی اپنے بڑے بھائی کا معاون و مددگار ہے۔ اس لیے اسے یہی مناسب معلوم ہوا تھا کہ تفتیش کا آغاز ان دونوں بھائیوں سے ہی کیا جائے تاکہ زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل ہوسکیں۔

”میں ان دونوں کو اس سامنے والے کمرے میں لے جاتا ہوں۔ وہاں ایسی بہت سی چیزیں ہیں جو آپ کو ان سے بات چیت کرنے میں مدد دیں گی۔“ سی ایف پی کا اہلکار بھی ذرا سے وقفے سے کمرے سے باہر آگیا اور اس سے بولا۔ اہلکار کے ساتھ ساتھ واجد اور خالد بھی کمرے سے نکلے تھے لیکن اس طرح کہ ان کے ہاتھ پیر بدستور بندھے ہوئے تھے اور اسی وجہ سے انہیں حرکت کرنے کے لیے عجیب و غریب طریقۂ کار استعمال کرنا پڑا تھا۔ خالد اپنی آپس میں جوڑ کر بندھی ہوئی پنڈلیوں کے باعث اچھل اچھل کر آگے بڑھ رہا تھا جبکہ واجد موٹا ہونے کی وجہ سے اس طریقۂ کار پر عمل نہیں کرسکتا تھا اور کسی جانور کی طرح گھٹنوں کے بل آگے بڑھنے کی کوشش کررہا تھا۔ یہ عمل بھی کچھ ایسا آسان نہیں تھا۔ اسے اپنے آپس میں بندھے ہوئے ہاتھوں پر کافی زور ڈال کر جسم کو آگے کھسکانا پڑ رہا تھا۔ سی ایف پی کا اہلکار مسلح تھا اور چاہتا تو ان دونوں کے پیر کھول کر انہیں ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں آسانی سے منتقل کرسکتا تھا۔ اسلحے کی موجودگی میں دونوں بھائیوں کی یہ جرأت نہیں ہوسکتی تھی کہ وہ بھاگنے کی کوشش کرتے لیکن اس نے ایسا نہیں کیا تھا تو شاید اس لیے کہ پہلے مرحلے پر ہی ان کے کس بل نکالنے کا انتظام ہوسکے۔ شہریار کھڑا دونوں بھائیوں کی یہ درگت دیکھ رہا تھا کہ ذیشان واپس لوٹ آیا۔ ”گڈ۔“ اپنے سامنے جاری تماشے کو دیکھ کر اس نے بے ساختہ ہی اپنے ماتحت کو داد دی۔

”میں نے رینجرز کے آفیسر سے بات کرکے چند سپاہیوں کو یہیں روک لیا ہے۔ ہمارے پاس نفری بہت کم ہے اس لیے بہتر ہوگا کہ باہر نگرانی کے لیے چند مسلح افراد موجود رہیں۔“ اس نے شہریار کے برابر میں کھڑے ہوتے ہوئے اسے اطلاع دی لیکن اس وقت شہریار کا الجھا ہوا ذہن اس شے کے بارے میں جاننا چاہتا تھا.... جس کی موجودگی پر ذیشان خاصا چونکا ہوا نظر آیا تھا۔ ذیشان نے اس کی کیفیت کو بھانپ لیا اور شانے پر دوستانہ انداز میں ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

”باقی معاملات پر بعد میں بھی تفصیل سے گفتگو کی جاسکتی ہے۔ اس وقت ہمیں فوری درپیش مسائل سے نمٹنا ہوگا۔“

شہریار کے پاس اس کی تائید کرنے کے سوا کوئی گنجائش نہیں تھی۔ وہ کیکڑے نما شے کیا تھی؟ یہ ذیشان ہی جانتا تھا اور اگر فی الوقت وہ اسے اہمیت دینے کو تیار نہیں تھا تو اس کے لیے بھی بہتر تھا کہ اس کا خیال ذہن سے جھٹک کر موجودہ کاموں کی طرف توجہ دے۔ واجد اور خالد دوسرے کمرے میں منتقل کیے جاچکے تھے چنانچہ ان دونوں نے بھی اس کمرے کا رخ کیا۔ کمرے میں کئی ایسی اشیا موجود تھیں جنہیں تشدد کے لیے استعمال کیا جاسکتا تھا۔

”ہاں بھئی! اب فوراً شروع ہوجاؤ اور بتاؤ کہ تمہارا پیر سائیں یہاں اپنی پیری کی آڑ میں کون کون سے دھندے کررہا تھا؟“ اپنے ماتحت کو اشارے سے واپس اپنی پہلے والی ڈیوٹی پر جانے کی ہدایت کرتے ہوئے ذیشان نے سخت لہجے میں تفتیش کا آغاز کیا۔

”میں کچھ نہیں جانتا، نہ میرا اس مکان سے کوئی تعلق ہے۔ آپ لوگوں نے مجھے زبردستی تالی کے جھنڈ سے پکڑ کر یہاں پہنچایا ہے، اور اب زبردستی ہی الزام لگا رہے ہو۔“ موٹے واجد نے نہایت ڈھٹائی کے ساتھ جواب دیا۔

”الزام تو ہم نے ابھی تک کوئی لگایا ہی نہیں مسٹر! ابھی تو ہم صرف تم سے تمہارے پیر سائیں کے دھندوں کے بارے میں پوچھ رہے ہیں۔“ ذیشان نے اسے جواب دیا۔ ”اور تم ہرگز بھی یہ نہ کہنا کہ پیر سائیں سے تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے۔ تمہارے پیر سائیں نے کالے میاں نامی جس شخص کو شہزادی سے مردہ بچے کی ہڈیاں لینے پیر آباد بھیجا تھا، وہ ہماری حراست میں ہے اور نہ صرف ہمیں اس کے موبائل پر تمہارا نمبر ملا ہے بلکہ اس نے خود بھی ہمیں بتایا ہے کہ واجد، پیر سائیں کا سب سے خاص بندہ ہے۔ تمہارے ساتھ ساتھ اس نے تمہارے اس بھائی کا بھی نام لیا ہے۔“ اسے جھوٹ پر کمر بستہ دیکھ کر شہریار نے دخل اندازی ضروری سمجھی اور چند ایسے حقائق اس کے سامنے رکھ دیے کہ اس کے پاس جھوٹ بولنے کی گنجائش کم سے کم ہی رہے۔ اس نے

دیکھ لیا تھا کہ اس کی زبان سے کالے میاں کا نام سن کر واجد کا سیاہ چہرہ مزید سیاہ پڑ گیا تھا اور وہ یوں ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا جیسے اپنے دفاع میں کچھ کہنے کے لیے جھوٹ تراشنا چاہتا ہو لیکن فوری طور پر ایسا کرنے سے قاصر ہو۔ سی ایف پی کے اہلکار کی عجلت آمیز آمد نے اس کی یہ مشکل آسان کر دی۔

"سر! باہر گاؤں کے بہت سے لوگ جمع ہیں اور آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔" اس نے ذیشان کو اطلاع دی۔

"اوہ..... مجھے پہلے ہی اس بات کا اندازہ تھا۔" اطلاع سن کر وہ دھیرے سے بڑبڑایا اور پھر اپنے ماتحت سے بولا۔ "ہم لوگ ابھی آتے ہیں۔ باہر پہرے پر جو سپاہی ہیں، انھیں پیغام دے دو کہ ہجوم کو مکان سے دور ہی رکھیں لیکن ایسی کوئی حرکت نہیں کریں کہ لوگ مشتعل ہو جائیں۔"

"اوکے سر!" ماتحت فوراً واپس پلٹ گیا۔

"میں ابھی باہر والوں سے نمٹ کر آتا ہوں۔ تم دونوں بھائی اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر سوچ لو کہ تمہیں سیدھے طریقے سے ہمارے سامنے حقائق اگلنے ہیں یا ہم اپنے طریقۂ کار سے تمہاری زبانیں کھلوائیں۔ یہ بات بہرحال یاد رکھنا کہ سچ تمہیں اگلنا ہی ہوگا۔ اپنی کھال بچا کر آسانی سے اگل دو گے تو اپنا ہی بھلا کرو گے ورنہ ہمارے لیے تمہاری زبانیں کھلوانا کچھ مشکل نہیں ہے۔" ماتحت کے باہر نکلنے کے بعد اس نے واجد اور خالد کی طرف دیکھتے ہوئے نہایت سفاک لہجے میں یہ سب کہا اور پھر شہریار کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کرتے ہوئے باہر نکل گیا۔ مکان کے ارد گرد رینجرز کے چوکس جوان پھیلے ہوئے تھے اور کچھ فاصلے پر وہ ہجوم تھا جو ان لوگوں سے ملنے آیا تھا۔ وہ لوگ تعداد میں کافی زیادہ تھے لیکن وردی پوش مسلح رینجرز اہلکاروں کی وجہ سے قابو میں تھے ورنہ بصورتِ دیگر مکان پر ہلا بھی بول سکتے تھے۔ ذیشان نے شاید ایسے ہی کسی خطرے کے پیشِ نظر ان جوانوں کو روک لیا تھا۔

"آپ میں سے صرف تین افراد آگے آئیں اور جو کچھ کہنا چاہتے ہیں کہہ دیں۔" دروازے سے ذرا آگے جا کر کھڑے ہوتے ہوئے ذیشان نے دبنگ لہجے میں حکم صادر کیا جس پر ہجوم میں ذرا دیر کے لیے کھلبلی سی مچی اور پھر تین مرد آگے بڑھے۔ یہ تینوں ہی عمر رسیدہ تھے اور چہرے مہرے اور لباس سے خوش حال محسوس ہو رہے تھے۔

"ہم آپ سے یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ ہمارے پنڈ میں کیا ہو رہا ہے؟ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ آپ لوگ پیر سائیں کی گرفتاری کے لیے آئے ہیں اور ان کے نہ ملنے پر شریف صاحب کو ان کے گھر سے گرفتار کر لیا ہے۔ شریف صاحب کے علاوہ پنڈ کے اور بھی کچھ لوگ آپ کی قید میں ہیں۔ آپ کے سپاہیوں نے گھر گھر تلاشی لے کر ہم سب کی بے حرمتی کی ہے۔ ہم سب عزت دار لوگ ہیں، کوئی چور اچکے نہیں کہ ایسا برتاؤ برداشت کر سکیں۔ ہمارے نوجوان بہت غصے میں ہیں لیکن ہم نے صرف سرکاری وردی کے احترام میں انھیں قابو میں رکھا ہوا ہے۔ یہاں جو کچھ ہو رہا ہے، آپ اس کے بارے میں وضاحت دیں ورنہ جوشیلے نوجوان ہمارے قابو سے باہر بھی ہو سکتے ہیں۔" تینوں میں سے ایک باریش شخص نے گفتگو کا سلسلہ شروع کیا تو آخر میں اس کا لہجہ دھمکی آمیز ہو گیا۔ ذیشان نے اس کا یہ انداز محسوس کرنے کے باوجود نظر انداز کر دیا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

"بزرگوار! جو کچھ ہوا اس کے لیے مجھے افسوس ہے۔ یقیناً آپ لوگوں نے اپنے گھروں میں ہمارے سپاہیوں کے داخل ہونے کا برا مانا ہوگا لیکن ہم اپنی ڈیوٹی سے مجبور تھے۔ ہمارے پاس اطلاع تھی کہ یہاں ایک مشکوک ملک دشمن آدمی پیر سائیں کا بہروپ بھر کر اپنی مجرمانہ سرگرمیوں میں مصروف ہے اس لیے ہمیں اس شخص کی گرفتاری کے لیے یہ آپریشن کرنا پڑا۔ ہمیں شریف صاحب کے گھر میں ان کی موجودگی کی اطلاع ملی تھی لیکن ہمارے پہنچنے سے پہلے ہی وہ وہاں سے فرار ہو گیا۔ شریف صاحب کو ہم نے صرف شبے میں گرفتار کیا ہے۔ اگر تفتیش کے بعد وہ بے قصور ثابت ہوئے تو انھیں رہا کر دیا جائے گا۔ میرے خیال میں اب آپ یہ بھی سمجھ گئے ہوں گے کہ ہمیں آپ کے گھروں کی تلاشی کیوں لینی پڑی۔ ہمیں شک تھا کہ مفرور مجرم کو آپ میں سے اس کے کسی عقیدت مند نے اپنے گھر میں پناہ نہ دے رکھی ہو اس لیے بہ حالتِ مجبوری ہمیں آپ لوگوں کی خانہ تلاشی لینی پڑی۔"

"یہ بکواس ہے۔ تم پیر سائیں پر جھوٹا الزام لگا رہے ہو۔ وہ اللہ کے نیک بندے ہیں۔ اسی لیے تو اللہ نے تمہارے ناپاک قدموں کے یہاں پہنچنے سے پہلے ہی انھیں خبردار کر دیا۔" اس کی بات ختم ہوتے ہی ان تینوں میں سے ایک جو شاید عمر میں ان سب سے چھوٹا تھا، جوش سے چلایا۔

"مجھے ایسا کوئی جھوٹ بولنے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔ نہ ہی میں اور میرے سپاہی اتنے فارغ ہیں کہ فضول معاملات میں اپنی ٹانگ اڑائیں۔ ہم نے پکی مخبری پر یہاں ریڈ کیا تھا اور اب ہمارے پاس ایسے ٹھوس ثبوت ہیں جنھیں دیکھنے کے بعد آپ ہمیں جھٹلا نہیں سکتے۔ میں آپ کے

اطمینان اور گاؤں کے معصوم لوگوں کے ذہنوں پر سوار عقیدت کی اندھی عینک... اتارنے کے لیے آپ کو بھی وہ ثبوت دکھانے کے لیے تیار ہوں۔ آپ میرے ساتھ اندر چل کر دیکھ سکتے ہیں کہ یہاں کیا کچھ موجود ہے۔" ذیشان ایک جھٹکے سے مڑ گیا۔ وہ تینوں بھی لمحہ بھر تو تذبذب کا شکار نظر آئے پھر اس کے پیچھے چل پڑے۔ ان کے ساتھ اندر کی طرف جاتا ہوا شہریار دل ہی دل میں ذیشان کی فہم و فراست کو سراہ رہا تھا۔ اتنے بڑے ہجوم سے چند سپاہیوں اور اسلحے کے زور پر نمٹنا واقعی مشکل تھا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ وہ سب لوگ معصوم اور بے گناہ ہیں اور صرف اندھی عقیدت اور وقتی اشتعال کے تحت سامنے آ کھڑے ہوئے ہیں۔ ان میں سے اگر ایک فرد کو بھی گولی ماری جاتی تو یہ ظلم ہوتا۔ چنانچہ ان سے نمٹنے کے لیے سب سے بہترین راستہ وہی تھا جو ذیشان نے اختیار کیا تھا۔

"یہ اسلحے اور بارود کا ڈھیر آپ لوگ یہاں دیکھ سکتے ہیں۔ ان آتشیں ہتھیاروں کے علاوہ یہاں اس سفید سفوف کا بھی ذخیرہ ہے جو لوگوں کو ہتھیاروں سے بھی زیادہ مہلک اور دردناک موت سے ہمکنار کر سکتا ہے۔ گولی کھا کر مرنے والا تو صرف ایک بار میں مر جاتا ہے لیکن نشے کی لعنت میں مبتلا لوگوں کا حال تو آپ لوگ بھی اچھی طرح جانتے ہوں گے۔ نشئی آدمی نہ صرف اپنی صحت، دولت اور عزت گنواتا ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اس کا پورا خاندان بھی برباد ہو جاتا ہے۔ آپ کے درمیان پیر سائیں کا بہروپ دھار کر رہنے والا سفاک درندہ لوگوں میں یہی موت بانٹ رہا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اپنی آنکھوں سے اتنا سب کچھ دیکھ لینے کے بعد اب آپ کے پاس اعتراض کی کوئی گنجائش نہیں ہوگی۔" ان تینوں کو منشیات اور بارود کے ذخیرے سے بھرے کمرے میں لے جا کر ذیشان نے بلند آواز میں بولنا شروع کر دیا۔ وہ ایک محبِ وطن پاکستانی تھا جو حقیقتاً اس وقت اپنے ہم وطنوں کی بے وقوفی اور جاہلانہ عقیدت مندی پر سخت غصے میں تھا لیکن بظاہر اس نے تحمل اس لیے خود کو قابو میں رکھا تھا کہ بات بڑھنے کے بجائے سنبھل جائے۔

"یہ سب تو ٹھیک ہے جناب لیکن اس سے یہ کیسے ثابت ہو سکتا ہے کہ پیر سائیں کا ان سب چیزوں سے کوئی تعلق ہے؟ یہ مکان تو آسیب زدہ مشہور تھا اور پیر سائیں کبھی اس مکان میں نہیں آئے۔ وہ تو اپنی خانقاہ سے بھی بہت کم باہر نکلتے تھے۔" کچھ دیر پہلے ذیشان کی باتوں کو الزام تراشی قرار دینے والا ایک بار پھر بہروپیے پیر کی حمایت میں دلیل دینے لگا لیکن اب اس کا لہجہ پہلے جتنا بلند نہیں تھا۔

"پیر سائیں یہاں نہیں تو کیا ہوا؟ اس کے آدھے درجن سے زیادہ خاص مرید تو یہیں ہیں نا۔ ان کو دیکھ کر تمہاری آنکھیں نہیں کھل رہیں یا پھر عقل پر پتھر پڑے ہوئے ہیں۔" ذیشان جھنجلایا۔

"ایک منٹ..... میرے خیال میں ہم ان کے رہے سہے شکوک و شبہات دور کرنے کا انتظام کر سکتے ہیں۔ یہ اگر ہمارا کہا نہیں مان رہے تو واجد اور خالد کی زبان سے حقائق سن کر ضرور یقین کر لیں گے۔" اس موقع پر شہریار نے دخل اندازی کی اور پھر براہ راست ان تینوں سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

"آپ تینوں ہمارے ساتھ آئیں۔" وہ انھیں اس جگہ سے باہر لے کر اس کمرے تک پہنچ گیا جہاں واجد اور خالد کو رکھا گیا تھا۔

"اندر پیر سائیں کے سب سے خاص بندے واجد اور خالد موجود ہیں۔ ہم ان سے تفتیش کریں گے۔ آپ لوگوں کو صرف اتنا کرنا ہوگا کہ بغیر کوئی آواز نکالے بالکل خاموشی سے اندر کی باتیں سنتے رہیں اور اس کے بعد فیصلہ کریں کہ کون غلطی پر ہے۔" کمرے کے دروازے پر پہنچ کر شہریار نے سرگوشی میں ان تینوں سے کہا اور پھر انھیں رضامند پا کر ذیشان کے ساتھ کمرے کے اندر چلا گیا۔ کمرے کا دروازہ اس نے جان بوجھ کر پوری طرح بند کرنے کے بجائے اس میں ہلکی سی جھری چھوڑ دی تھی تاکہ باہر موجود تینوں افراد آسانی سے اندر کی آوازیں سن سکیں۔ ان تینوں کی نگرانی کے لیے البتہ سی ایف پی کا مسلح اہلکار ان کے سروں پر ضرور مسلط تھا تاکہ اگر ان کے عمر رسیدہ جسموں میں اگر جوانی کی کوئی ایسی رمق جاگے جو انھیں کنٹرول سے باہر کرنے لگے تو اسے قابو کیا جا سکے۔

"ہاں بھئی..... کیا فیصلہ کیا تم دونوں بھائیوں نے؟ سچ بولنا ہے یا پھر ہم بولنا سکھائیں؟" اندر پہنچ کر شہریار نے ہی واجد اور خالد سے گفتگو کا آغاز کیا۔ ذیشان نے اس سے کوئی تعرض نہیں کیا لیکن وہ کچھ خاموش سا ہو گیا تھا۔

"ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ جو کچھ ہمیں معلوم ہے، ہم آپ کو سچ سچ بتا دیں گے لیکن اس کے لیے ہماری بھی ایک شرط ہے۔" دونوں بھائیوں نے پہلے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر واجد نے گفتگو کا سلسلہ شروع کیا۔

"کیسی شرط.....؟" شہریار غرایا۔

"آپ کو ہمیں سلطانی گواہ بنانا ہوگا۔"

"ٹھیک ہے، ہمیں منظور ہے۔" شہریار کو تذبذب میں دیکھ کر ذیشان نے اسے جواب دیا۔ وہ کسی صورت اس موقع کو گنوانا نہیں چاہتا تھا۔ وہ دونوں بھائی پیر سائیں کے قریبی ساتھی تھے اس لیے ان سے بڑے انکشافات کی امید تھی۔ وہ خود بھی اگر بہت بڑے مجرم تھے تو ان سے وعدہ کر لینے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ سی ایف پی کوئی عام حکومتی اداروں کی طرح تو کام کرتی نہیں تھی کہ وہ لوگ خود کو کسی کا پابند محسوس کرتے۔ یہ تو ان کی اپنی صوابدید پر ہوتا تھا کہ کس مجرم کو تھانے میں بند کروانا ہے، کسے عدالت کے سامنے پیش کرنا ہے اور کسے خود ہی سزا دینی ہے۔ ان کی دی ہوئی سزا عموماً سزائے موت ہی ہوتی تھی کیونکہ ان کے پاس کوئی ایسی جیل وغیرہ تو تھی نہیں جہاں اپنے مجرموں کو قید میں طویل عرصے تک رکھ سکیں۔ سزائے موت کے علاوہ وہ اگر خود سے کوئی سزا دیتے تھے تو وہ قطعی غیر روایتی ہوتی تھی ورنہ قانون میں لکھی ہوئی روایتی سزاؤں کے لیے دیگر محکمے تھے ہی۔

"پیر سائیں کے نام سے مشہور یہ بندہ کئی سال پہلے ہمارے پنڈ میں آیا تھا۔ اس وقت بھی یہاں ایک خانقاہ موجود تھی لیکن وہ موجودہ خانقاہ سے بہت چھوٹی اور معمولی تھی۔ اس وقت اس میں رہنے والے پیر سائیں بھی اتنے مشہور نہیں تھے لیکن تھے سچ مچ اللہ والے۔ بے چارے خاموشی سے اپنی عبادت و ریاضت میں مصروف رہتے تھے۔ اگر کوئی عقیدت مند اپنی حاجت لے کر آتا تو اسے دعا سے نواز دیتے۔ باقی انہیں کوئی لالچ وغیرہ نہیں تھا۔ موجودہ پیر سائیں ان کے پاس ایک غریب، نادار اور دنیا سے بیزار شخص بن کر آیا اور ان کا مرید بن کر رہنے لگا۔ بڑے پیر سائیں کے مقابلے میں وہ بڑا چرب زبان اور ہوشیار تھا۔ آہستہ آہستہ خانقاہ میں آنے والے لوگوں پر اس کا جادو چلنے لگا۔ وہ بڑے پیر سائیں کی طرح صرف دعا نہیں دیتا تھا بلکہ اس کے پاس کچھ سفوف وغیرہ موجود ہوتے تھے جن سے وہ ٹونے ٹوٹکے کر کے لوگوں کا علاج معالجہ بھی کر دیتا تھا۔ ہمارا باپ پنڈ کے قبرستان کا گورکن تھا اس لیے میرا اور خالد کا قبرستان میں کافی آنا جانا تھا۔ ایک رات میں نے دیکھا کہ پیر سائیں قبرستان میں ہے اور وہاں ایک کھلی ہوئی قبر سے ہڈیاں جمع کر رہا ہے۔ اس نے بھی مجھے دیکھ لیا اور بجائے گھبرانے یا شرمندہ ہونے کے خود چل کر میرے پاس آ گیا اور بولا کہ اگر تم اپنی زبان بند رکھو تو بہت فائدے میں رہو گے ورنہ ابھی اور اسی وقت مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔۔۔ مجھے یہ دھمکی دیتے ہوئے اس نے اپنے میلے کچیلے کپڑوں میں سے پستول نکال لیا۔ پستول دیکھ کر میں ڈر گیا کہ اگر میں نے اس کی گل نہ مانی تو وہ مجھے قتل کر دے گا۔ فیر میں تھا بھی غریب گھر کا بندہ۔ ہمیں ڈھنگ سے پیٹ بھر کر کھانا بھی نہیں ملتا تھا۔ میں نے سوچا کہ اگر اس کی گل مان کر مجھے چار پیسے مل گئے تو میرا بھلا بھی ہو جائے گا اور جان بھی بچ جائے گی۔ ویسے بھی وہ قبرستان سے پرانی گلی سڑی ہڈیاں ہی تو لے رہا تھا جس سے کسی کا کیا بگڑنا تھا۔ میں نے اس کی گل ماننے کی ہامی بھر لی۔ وہ میرا جواب سن کر بہت خوش ہوا اور بولا۔

"یہ تو نے اپنے حق میں وڈا اچھا فیصلہ کیا ہے۔ تو دیکھنا کہ آنے والے دنوں میں، میں کیا سے کیا ہو جاؤں گا اور اگر تو نے اس وقت بھی میرا ساتھ دیا تو عیش کرے گا۔۔۔ عیش۔" مجھ سے یہ کہنے کے بعد اس نے مجھے تھوڑی سی رقم بھی دی اور قبرستان سے چلا گیا۔ مجھے پیسے ملنے کی خوشی تھی ہو اس خوشی میں، میں نے اس کے کہے پر غور بھی نہیں کیا تھا لیکن جب دو دن بعد وڈے پیر سائیں کے مرنے کی خبر ملی اور ان کی جگہ نئے پیر سائیں نے سنبھال لی تو مجھے شک گزرا کہ کچھ نہ کچھ گڑبڑ ہے۔ وچارے وڈے پیر سائیں تو تھے بھی بالکل اکیلے آدمی۔ ان کے بال بچے ہوتے تو ان کی اچانک موت پر غور کرتے۔ پنڈ والوں نے تو اپنا اتنا فرض ادا کیا کہ عزت کے ساتھ انہیں دفنا دیا مگر مجھے چونکہ کھد بد لگ گئی تھی اس لیے میں پیر سائیں کے پاس جا پہنچا اور صاف صاف اپنے شک کا اظہار کر دیا۔ اس نے میرے شک کی تصدیق تو نہیں کی لیکن بولا کہ اگر تم الٹی سیدھی بکواس کرنے کے بجائے میرے مرید بن جاؤ تو میں تمہیں بہت فائدہ پہنچاؤں گا۔ میں پہلے بھی ایک بار اس سے رقم حاصل کر چکا تھا اس لیے لالچ میں آ گیا اور خانقاہ میں اس کے ساتھ رہنے لگا۔ وہ وڈا عجیب آدمی تھا۔ نماز قرآن پڑھتا کبھی نظر نہیں آیا۔ بس جب دیکھو، تب ایک کوٹھری میں گھسا رہتا تھا اور جانے کون سے جنتر منتر کرتا رہتا تھا۔ اس کے پاس جانے کون کون سے ٹونے ٹوٹکے تھے کہ آنے والے لوگ نامراد نہیں رہتے تھے۔ فیر میں بھی تھا جو اس کی کرامات کو ایک سے چار کر کے لوگوں کے سامنے بیان کرتا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے خانقاہ پر آنے والوں کی تعداد دگنی تگنی بڑھ گئی۔ اسی حساب سے نذرانے بھی خوب آتے تھے اور میرا اس میں ٹھیک ٹھاک حصہ ہوتا تھا اس لیے میں نے سوچا کہ یہ بندہ جو کر رہا ہے، کرنے دو۔ اس سے کسی کو کوئی نقصان تو نہیں ہو رہا بلکہ الٹا لوگ فائدے میں ہی ہیں۔"

واجد نادر کے لیے سانس لینے کو رکا پھر ان دونوں کی مستقل خود پر جمی نظروں کو دیکھتے ہوئے ایک بار پھر بولنا شروع ہو گیا۔

"میں پیر سائیں کا خاص مرید تھا لیکن رات کے وقت مجھے بھی خانقاہ میں رکنے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔ حالانکہ گزرے برسوں میں خانقاہ کی عمارت وڈی شان دار ہو گئی تھی اور ادھر بہت سی جگہ تھی۔ پیر سائیں نے باہر سے بندے بلوا کر یہ عمارت بنوائی تھی۔ اس عمارت میں ایک تہ خانہ بھی ہے، مجھے معلوم تھا لیکن اس کا مقصد میں نہیں جانتا تھا۔ مجھے بس یہی شک تھا کہ وہ جنتر منتر کرتا ہو گا اس لیے کسی کو خانقاہ میں ٹکنے نہیں دیتا۔ سچ پوچھیں تو اتنے سالوں میں، میں اسے کسی نیک بزرگ کے بجائے سفلی علم کا ماہر سمجھنے لگا تھا اور میرا یہ شک اتنا غلط بھی نہیں تھا لیکن وہ اس کے علاوہ اور کون کون سے دھندے کرتا ہے۔۔۔ یہ مجھے بہت بعد میں معلوم ہوا۔ اس نے دیکھا کہ میں اس کا وفادار ہوں تو وہ آہستہ آہستہ مجھے اپنے رازوں میں شامل کرتا چلا گیا۔ یہ زیادہ پرانی گل نہیں ہے۔ بس ڈیڑھ دو سال پہلے ہی کی گل ہے کہ مجھے معلوم ہوا کہ پیر سائیں ہیروئن اور اسلحے کا دھندا بھی کرتا ہے بلکہ اس کا اصل دھندا تو ہی یہ ہے۔ پیری کا ناٹک تو اس نے دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے رچایا ہوا تھا۔ رات کے وقت خانقاہ میں اس سے ملاقات کے لیے اس کے گاہک اور سپلائر آتے تھے اس لیے وہ اس وقت کسی کو آنے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ مجھے بھی اس نے ہم رازیوں بنایا کہ اکیلے سارے معاملات دیکھنا اس کے لیے مشکل ہو رہا تھا۔ دوسرے وہ چاہتا تھا کہ خانقاہ کے علاوہ بھی پنڈ میں اسے ایسا کوئی ٹھکانا مل جائے جہاں وقت ضرورت وہ اپنا مال رکھ سکے۔ یہ مکان برسوں سے خالی پڑا تھا، اور پنڈ والے اسے آسیب زدہ سمجھتے تھے اس لیے میں نے اسے استعمال کرنے کا مشورہ دیا، اور فیر کچھ اپنے شعبدے بھی دکھائے کہ پنڈ والوں کو مکان کے آسیب زدہ ہونے کا یقین ہو گیا۔۔۔۔ اور انہوں نے مکان کے قریب بھٹکنا بالکل ہی بند کر دیا۔ مجھے اس ساری خدمت اور راز داری کی وڈی قیمت ملتی تھی۔ میں نے اپنے ساتھ اپنے بھرا خالد کو بھی شامل کر لیا۔ ہمارا پیو چار پانچ سال ہوئے دنیا سے گزر چکا ہے اس لیے کوئی ہم سے پوچھ تاچھ کرنے والا نہیں تھا اور کوئی کچھ پوچھنا بھی چاہتا تو نہیں پوچھ سکتا تھا کیونکہ ہم پیر سائیں کے سب سے خاص مرید تھے۔ پیر سائیں کی عقیدت کے علاوہ ہمارے پالے ہوئے غنڈوں کا بھی ڈر تھا جو لوگوں کو ہم سے دور رکھتا تھا۔ یہ غنڈے ہی خانقاہ کے خادم بن کر دن رات وہاں رہتے تھے اور دھندا سنبھالنے کے علاوہ آنے جانے والوں پر نظر بھی رکھتے تھے۔" واجد کا اعترافی بیان یہاں تک پہنچا تھا کہ دروازے کے باہر شور شرابا سنائی دینے لگا۔ شہریار فوری طور پر اس شور کا مطلب سمجھتا ہوا باہر نکل گیا اور دروازہ باہر جا کر بند کر دیا۔ اس کے اندازے کے عین مطابق دروازے سے کان لگائے کھڑے تینوں افراد غیظ و غضب میں مبتلا تھے اور کمرے کے اندر داخل ہونا چاہتے تھے لیکن سی ایف پی کے اہلکار نے انہیں ان کی اس کوشش میں کامیاب نہیں ہونے دیا اور دروازے سے کافی دور ہٹا دیا گیا تھا۔

"کیا تماشا ہے؟ کیوں آپ لوگوں نے یہاں ہنگامہ مچا رکھا ہے؟" اس نے ان تینوں کی طرف دیکھتے ہوئے بگڑے ہوئے موڈ کے ساتھ پوچھا۔

"ہمیں اندر جانے کی اجازت دیں صاحب۔ ہم اس مردود کے ٹوٹے ٹوٹے کر دیں گے۔" کچھ دیر قبل پیر سائیں کا سب سے بڑا حمایتی بننے والا غضب ناک لہجے میں بولا۔

"فی الحال ایسا ممکن نہیں ہے۔ وہ ہمارے کام کا بندہ ہے جس سے ہمیں کافی معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔ آپ لوگوں کو اس سے ہونے والی گفتگو سنانے کا صرف اتنا مقصد تھا کہ آپ سچ خود اپنے کانوں سے سن لیں اور باقی گاؤں والوں کو بھی کنٹرول میں رکھیں کہ ہم نے کسی کی دل آزاری یا بے حرمتی کے لیے یہ آپریشن نہیں کیا ہے بلکہ ان کے سامنے نیکوکار بن کر رہنے والے ایک بڑے مجرم کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی ہے۔ بے شک مجرم یہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا ہے لیکن اس کا ایک اہم ٹھکانا بھی ختم ہو گیا ہے اور ہمیں امید ہے کہ اب آئندہ بھی آپ ایسے کسی فرد کو اپنے درمیان ٹھکانا بنانے بھی نہیں دیں گے۔" اس نے ان لوگوں کو دھیمی آواز میں سمجھایا۔ یہ احتیاط اس لیے تھی کہ کہیں واجد اور خالد تک اس کی آواز نہ پہنچ جائے اور وہ اپنی زبانیں بند کر لیں۔

"ہمیں صاحب کی گل ماننی چاہیے۔ یہ سرکاری افسر ہیں۔ ان کا حکم ماننا ہمارا فرض ہے۔" بدا کرامت کے لیے آئے ہوئے تینوں معترضین میں سے جو شخص اب تک بالکل خاموش رہا تھا، وہ اس موقع پر بول پڑا اور اس کے دونوں ساتھیوں نے اپنی خاموشی سے اس کی تائید کر ڈالی۔

"میری آپ لوگوں سے گزارش ہے کہ باہر جا کر لوگوں کو بے شک پیر سائیں کے بارے میں سب کچھ بتا دیں لیکن فی الحال واجد اور خالد کے بارے میں زبان نہیں کھولیے گا۔ وہ پیر سائیں کے خلاف بہت اہم گواہ ہیں اس لیے ان کا زندہ سلامت رہنا ضروری ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ

آپ ان کے بارے میں بتا بھی تو لوگ اشتعال میں انھیں قتل کرنے چڑھ دوڑیں۔ انھیں قتل کر کے کسی کو کچھ حاصل نہیں ہوگا لیکن ہم بہت سی اہم معلومات حاصل کرلیں گے۔" انھیں قائل ہوتا دیکھ کر اس نے دھیمی آواز میں ایک اور استدعا کی جو قبول کرلی گئی اور وہ تینوں سر جھکا کر باہر نکل گئے۔ انھیں رخصت کرنے کے بعد وہ واپس کمرے میں لوٹا۔ دونوں بھائی سراسیمہ نظروں سے دروازے کی طرف ہی دیکھ رہے تھے۔

"کیا قتل ہے سر! کون لوگ اندر گھسنے کی کوشش کر رہے تھے؟" اسے دیکھتے ہی واجد نے سوال کیا۔ وہ عمر میں بڑا تھا اور پیر سائیں سے اس کے تعلقات بھی زیادہ قریبی اور دیرینہ تھے اس لیے اب تک ساری گفتگو وہی کر رہا تھا۔ خالد کسی سعادت مند چھوٹے بھائی کی طرح ایک طرف خاموش بیٹھا تھا۔

"گاؤں کے کچھ مشتعل افراد اندر آگھسے تھے۔ کسی طرح باہر یہ خبر پھیل گئی ہے کہ اس مکان میں منشیات اور اسلحے کا ذخیرہ موجود ہے چنانچہ گاؤں والے ان لوگوں سے دو دو ہاتھ کرنے کے خواہش مند ہیں جنھیں یہاں رنگے ہاتھوں پکڑا گیا ہے۔" اس نے انھیں ہراساں کرنے کے لیے حقائق کو توڑ مروڑ کر بیان کیا۔ ان کے چہروں پر موجود دہشت نے بتا دیا کہ وہ اپنی کوشش میں کامیاب رہا ہے۔

"تم اتنے پریشان نہ ہو۔ فی الحال میں نے ان لوگوں کو ٹال دیا ہے کہ مجرموں سے نمٹنا قانون کا کام ہے اس لیے ہم کسی شخص کو آپ لوگوں کے حوالے نہیں کر سکتے۔ اب تمہارا بھی فرض ہے کہ ہمارے ساتھ تعاون کرو ورنہ دوسری صورت میں ہم تمہیں ان لوگوں کے حوالے کردیں گے۔ ہم معروف لوگ ہیں اور خواہ مخواہ کا بوجھ ڈھوتے پھرنے کے قائل نہیں۔ اگر تم ہمارے لیے بیکار ثابت ہوئے تو ہم تمہیں کہیں پھینک جائیں گے اور یہ تم اچھی طرح سمجھ سکتے ہو کہ تمہارے پنڈ کے لوگ تمہارے ساتھ کیا سلوک کرسکتے ہیں۔" وہ لوہا گرم دیکھ کر اس پر مزید چوٹیں لگانے سے باز نہ آیا۔ ذیشان ایک طرف خاموش کھڑا تھا اور اس کی کارکردگی سے مطمئن نظر آرہا تھا۔

"ہم وعدہ کرتے ہیں سر! اب تک بھی میں نے آپ کو جو کچھ بتایا ہے بالکل سچ بتایا ہے۔ آگے بھی جہاں تک ہوسکا، ہم آپ سے تعاون کریں گے۔" واجد نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ وہ بے شمار لوگوں کے ہاتھوں اپنی تکا بوٹی ہونے کے خیال سے ہی لرز اٹھا تھا۔ کچھ ایسی ہی کیفیت خالد کی تھی۔

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ تم اپنا بیان جاری رکھو۔ ہم خود فیصلہ کرلیں گے کہ تم ہمارے لیے کتنے مفید ہو۔" اس بار ذیشان نے گفتگو میں مداخلت کی اور اپنے سیٹ پر آنے والا پیغام پڑھنے لگا۔

"ہو رکیا سر! ساری گل تو میں نے آپ کو بتا دی ہے۔ پیر سائیں کیا دھندا کر رہا تھا، وہ آپ خود بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہو۔ ادھر ہم مال وصول کرتے تھے، ہور بعد میں اسے آگے سپلائی کر دیتا تھا۔ اگر سپلائی کرنے میں ٹیم ہوتا تو مال خانقاہ کے تہ خانے میں رکھ دیا جاتا ورنہ ادھر سے ہی آگے بڑھا دیتے۔ اس واری بھی ارجنٹ سپلائی تھی اس لیے ہم نے مال یہاں سے اٹھایا نہیں تھا۔ اب علوم نہیں کہ آپ لوگوں کو اس کی خبر کیسے ہوگئی۔ میرے پاس بالکل اخیر میں پیر سائیں کا فون آیا تھا کہ واجد پنڈ سے نکل جاؤ ادھر چھاپا پڑنے والا ہے لیکن مجھے نکلنے کا موقع ہی نہیں ملا ہور رینجرز والے پہلے ہی پہنچ گئے۔ میں بچنے کے لیے نالی کے پیچھے بھی چھپ گیا جدھر سے آپ لوگوں نے مجھے پکڑ لیا۔" اس نے گویا قصہ ختم کر دیا۔

"تمہارا پیر سائیں یہاں سے کب فرار ہوا تھا اور کیسے؟ رینجرز والوں نے تو پنڈ میں داخل ہوتے ہی اس مکان پر ریڈ کیا تھا جہاں وہ ٹھہرا ہوا تھا لیکن انھیں اس کا کوئی نام و نشان نہیں ملا۔" اس کی رکی ہوئی گاڑی کو آگے بڑھانے کے لیے شہریار نے سوالوں کا سلسلہ شروع کیا۔ ذیشان خاموشی سے یہ کارروائی دیکھنے کے ساتھ ساتھ اپنے سیٹ پر بھی مصروف تھا۔

"میرے خیال میں وہ پہلے ہی ادھر سے نکل گیا تھا۔ اس کے پاس ایک شان دار گھوڑا تھا جسے وہ کبھی کبھار اندر گرد آنے جانے کے لیے استعمال کرتا تھا۔ وہ اسی گھوڑے پر گیا ہوگا۔ خود کو بچانے کی فکر میں اسے میرا خیال بھی بعد میں آیا ہوگا اس لیے اس نے مجھے دیر سے فون کیا۔ میں خود ایسا بدحواس تھا کہ خالد تک کو فون کرنا بھول گیا۔" واجد نے جواب دیا۔

"پیر سائیں کا فون نمبر بتاؤ۔" اس نے حکم دیا۔

"نمبر اس موبائل میں ہے جو آپ کے ساتھیوں نے تلاشی میں میری جیب سے نکالا تھا۔ اس نمبر پر میں نے دوبارہ فون کرنے کی کوشش بھی کی تھی لیکن نمبر بند جا رہا تھا۔" واجد نے بتایا تو وہ معنی خیز انداز میں سر ہلا کر رہ گیا۔ اسے امید تھی کہ اب وہ بھگوڑا پیر سائیں بھی اس نمبر کو استعمال نہیں کرے گا۔

"تمہارے اس پیر سائیں کا نام کیا تھا؟"

"علوم نہیں جی۔ نام اس نے کبھی بتایا نہیں۔ وہ تو پیر سائیں کی زندگی میں خود کو فقیر کہلواتا تھا پھر پیر سائیں بن کر بیٹھ گیا۔ سب اسے یہی کہتے تھے ہور اس نے بھی پوچھنے پر بھی اپنا نام نہیں بتایا تھا۔"

"مال پہنچانے والوں اور لے جانے والوں میں سے تم جن جن افراد کو جانتے ہو، ان کے نام پتے بتاتے جاؤ۔" اس نے تفتیش کا سلسلہ آگے بڑھایا۔

"ان میں سے کوئی میری جان پہچان کا نہیں ہے۔ لانے اور لے جانے والے دونوں ہی کی طرف کے بندے خاموشی سے آکر اپنا کام نمٹا لیتے ہیں۔ ہمیں آپس میں گل بات کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ مال کدھر سے آرہا ہے، کون لا رہا ہے یا کدھر جائے گا ہور کون لے جائے گا، یہ سارے معاملے پیر سائیں آپ نمٹاتا تھا۔ ہم لوگ تو صرف نگراں اور مزدور تھے۔" واجد نے صاف ہری جھنڈی دکھائی۔

"پھر بھی تم ان میں سے کچھ لوگوں کو تو پہچانتے ہوگے؟ ہر بار سارے نئے لوگ تو تمہارے سامنے نہیں آتے ہوں گے۔ .... کچھ لوگوں سے بار بار بھی تمہارا واسطہ پڑتا ہوگا؟" اس نے ہمت نہیں ہاری اور تحمل سے پوچھ تاچھ کا سلسلہ جاری رکھا۔

"ہاں تھے تو ایسے کچھ لوگ پر ان کے بارے میں بھی میں آپ کو زیادہ کچھ نہیں بتا سکتا۔ بس ان کے حلیے وغیرہ ہی بتا سکتا ہوں۔" وہ پُرسوچ انداز میں بولا۔

"ٹھیک ہے۔ ابھی رہنے دو۔ یہ باتیں ہم تم سے بعد میں تفصیل سے پوچھیں گے۔ تم اپنا ذہن بنا لو۔" اس کے مزید تفصیلات میں جانے سے پہلے ذیشان نے گفتگو میں دخل دیا پھر شہریار کی طرف رخ کرتے ہوئے بولا۔ "ہمارے آدمی یہاں پہنچ چکے ہیں۔ ان کے ساتھ ہر طرح کے ماہرین بھی موجود ہیں۔ ہمیں پہلے ان کے ساتھ مل کر یہاں کے معاملات نمٹانے ہوں گے۔ ان لوگوں سے باقی تفتیش ہم بعد میں اپنے مرکز پہنچ کر کریں گے۔"

"اوکے، ایز یو وش۔" وہ فوراً پیچھے ہٹ گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہاں سی ایف پی کے اہلکاروں کی کارروائیاں شروع ہوگئیں۔ ان کے کرنے کے لیے وہاں بے شمار کام تھے جنھیں وہ نہایت مستعدی اور برق رفتاری سے نمٹا رہے تھے۔ ذیشان بھی ان کے ساتھ مصروف تھا اور مختلف ہدایات جاری کر رہا تھا۔ اس دوران میں اس کا اپنے افسران بالا سے بھی وقتاً فوقتاً رابطہ ہو رہا تھا اور وہ انھیں بھی یہاں کی رپورٹس پہنچا رہا تھا۔

اس موقع پر شہریار کو ایک طرف ہو جانا پڑا.... وہ کتنا
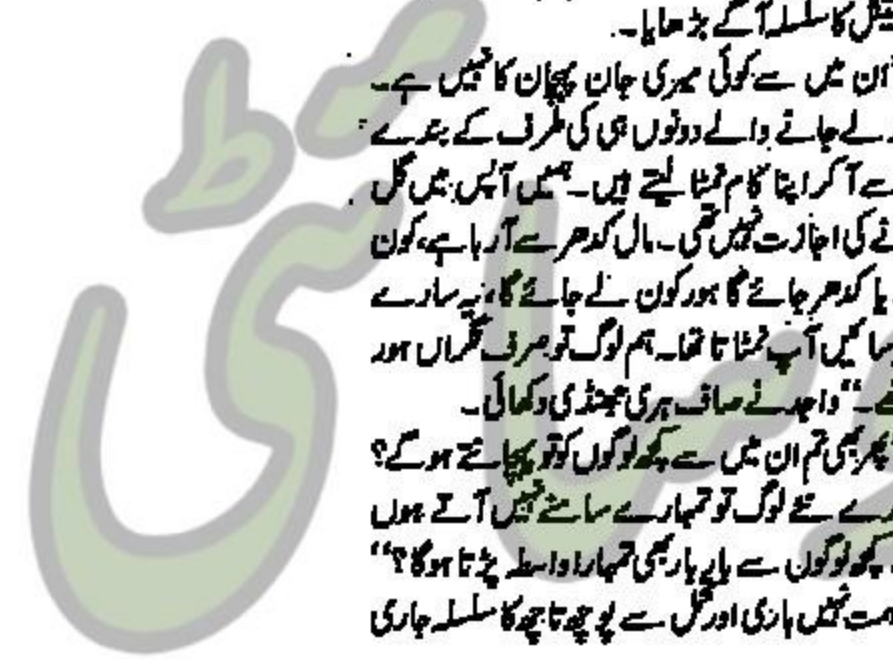
ہی محب وطن اور وفادار سہی لیکن سی ایف پی کا ملازم نہیں تھا اس لیے اس کا براہ راست ان کے معاملات میں دخل دینا مناسب بھی نہیں تھا۔ وہ بس خاموش تماشائی بنا وہاں ہونے والی کارروائیاں دیکھتا رہا اور دل ہی دل میں ان کے نظم وضبط اور مہارت کو سراہتا رہا۔ تقریباً ایک گھنٹے کے اندر انہوں نے وہاں اپنی کارروائی مکمل کرلی اور واپسی کی تیاری کرنے لگے۔ ہیروئن اور اسلحے وغیرہ کا اسٹاک رینجرز کی نگرانی میں روانہ کیا گیا۔ ان چیزوں کو ٹھکانے لگانا انہی لوگوں کے ذمے تھا۔ اس ذخیرے کو پکڑنے کا کریڈٹ بھی انہیں ہی ملتا۔ سی ایف پی کو ایسے کسی کریڈٹ سے کوئی غرض نہیں تھی، نہ انہیں میڈیا پر آکر اپنے کارنامے کی تشہیر کرنی تھی۔ درحقیقت ان کے نزدیک یہ کوئی کارنامہ تھا بھی نہیں۔ ان کا اصل کام تو شروع ہی یہیں سے ہوا تھا۔ انہیں ان ذخائر سے زیادہ ان افراد میں دلچسپی تھی جو اس کے پیچھے اصل کردار ادا کررہے تھے۔ سازش کی بنیاد تک پہنچے بغیر ایسی چھوٹی موٹی کامیابیاں حاصل کرنا ان کے نزدیک غیر اہم اور بے معنی تھا۔ اس موقع پر انہوں نے واجد اور خالد کے علاوہ دیگر گرفتار شدگان کو بھی رینجرز کے ہی حوالے کردیا تھا۔ وہ ان کے ساتھ جو بھی سلوک کرتے، انہیں اس سے کوئی غرض نہیں تھی۔ روانگی کے وقت ہی یہ بات بھی شہریار کے علم میں آئی کہ مقامی تھانے کے چھ افراد پر مشتمل عملے کو بھی معطل کرکے زیر حراست لیا جاچکا ہے۔ یہ کام بھی ان کے نالی والا میں داخلے سے قبل ذیشان کی ہدایت پر رینجرز اہلکاروں نے ہی انجام دیا تھا۔

خاص بات یہ ہوئی تھی کہ تھانے دار کو بھی سی ایف پی نے اپنی تحویل میں لے لیا تھا لیکن ظاہر یہ کیا گیا تھا کہ وہ عملے کی گرفتاری سے پہلے ہی فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا ہے۔ شہریار بہت غور سے ان لوگوں کے طریقۂ کار کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ اہم نکات کو فوکس کرکے بڑی سرعت سے کام کرنے والے لوگ تھے جن کی کارکردگی قابل تعریف تھی۔ وہ ان لوگوں کے ساتھ کئی گھنٹے گزارنے کے بعد واپسی کے راستے پر عازم سفر ہوا تو ذہن کئی سمتوں میں تقسیم ہوچکا تھا۔ اگر ایک طرف یہ اطمینان تھا کہ ایک قابل قدر ادارہ ملکی سلامتی کے لیے فعال ہے، دوسری طرف دشمنوں کے بارے میں بھی اس بات کا بخوبی اندازہ لگا چکا تھا کہ ان کی جڑیں بہت گہرائی تک اتر چکی ہیں اور وہ کسی عفریت کی طرح اس وطن کو کھانے پر تلے بیٹھے ہیں۔ ان کے ان ناپاک عزائم کو کامیاب بنانے کے لیے نالی والا کے تھانے دار، واجد اور خالد جیسے کئی بے ضمیر و لالچی لوگ مددگار و معاون تھے۔ اسے اس کیڑے تھا

شے کی طرف سے بھی تشویش تھی جسے ذیشان نے اس کی ٹی شرٹ سے علیحدہ کیا تھا اور پھر نہایت خاموشی سے اٹھا کر باہر کی طرف لے گیا تھا۔ وہ نالی والا سے باہر نکلے تو اس کی الجھن زبان پر آگئی۔

"میں تم سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں ذیشان؟"

"وہ ایک جدید ڈیوائس تھی جس کی مدد سے ہمارے درمیان ہونے والی گفتگو کہیں اور سنی جارہی تھی۔ میں نے باہر لے جاکر اسے ضائع کردیا تھا لیکن میرا اندازہ ہے کہ پیر سائیں کی گرفتاری میں ہونے والی ناکامی کے پیچھے اسی ڈیوائس کا ہاتھ ہوگا۔" اس کے لبوں سے سوال ادا ہونے سے پہلے ہی ذیشان نے گمبھیر سنجیدگی کے ساتھ اسے مختصر جواب سے نواز دیا جسے سن کر اس کے ہوش اڑ گئے۔

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ ایسی کوئی ڈیوائس مجھ تک کیسے پہنچی؟" اس نے بیک وقت حیرانی اور پریشانی سے سوال کیا۔

"یہ تم سوچ کر بتاؤ اور غور کرو کہ اس مشن پر نکلتے وقت کن افراد سے تمہارا اس طرح سے واسطہ پڑا تھا کہ وہ موقع کا فائدہ اٹھا کر ڈیوائس تمہاری ٹی شرٹ پر چسپاں کرسکتے۔ یہ خیال رکھنا کہ اس ڈیوائس کو تمہارے ساتھ نتھی کرنے کے لیے بس چند سیکنڈوں ہی کی ضرورت تھی۔ اسے بہت آسانی سے کسی اسٹیکر کی طرح تمہارے کپڑوں کے ساتھ چپکایا جاسکتا تھا۔" ذیشان سنجیدہ تھا لیکن اس کے انداز میں ایسی کوئی بات نہیں تھی کہ جس سے وہ یہ اندازہ لگاتا کہ وہ اس پر شک کررہا ہے۔ وہ بہت بردباری کے ساتھ اسے حقیقت سے آگاہ کرنے کے ساتھ مشوروں سے نواز رہا تھا۔ اس کے رویے کا کمال تھا کہ شہریار اچانک لگنے والے شاک سے فوراً ہی سنبھل گیا اور غور کرنے لگا کہ یہ کس کی حرکت ہوسکتی ہے۔ غور کرتے ہوئے اسے سی ایف پی کا وہ اہلکار یاد آیا جس سے اس کا سی ایف پی کے دفتر میں زیر زمین عمارت میں جاتے ہوئے سیڑھیوں پر ٹکراؤ ہوا تھا۔ وہ ٹکراؤ لمحاتی تھا لیکن مقابل کو اتنی مہلت بہرحال ملی تھی کہ اگر وہ چاہتا تو اس کی ٹی شرٹ پر وہ ڈیوائس چسپاں کردیتا۔ اس شخص کے علاوہ اس کا صرف ماریا سے قریبی واسطہ پڑا تھا۔ وہ اسے رخصت کرتے ہوئے کچھ دیر کے لیے جذباتی ہوگئی تھی اور اس طرح سے اس کے وجود سے لپٹ گئی تھی کہ اس کے لیے ڈیوائس کو اس کے ساتھ اٹیچ کرنا بے حد آسان تھا۔ ماریا کا خیال ذہن میں آنے کے باوجود وہ اس پر شک کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ اس کی شریک حیات تھی اور شادی شدہ زندگی کے مختصر سے دورانیے میں ہی خود کو ایک اچھی بیوی کے ساتھ ساتھ انسان دوست

بھی ثابت کرچکی تھی۔ ذرا سی دیر میں ایسے کئی واقعات اس کے ذہن سے گزر گئے جب اس نے ماریا کی اچھائی کا مشاہدہ کیا تھا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ خود ستم رسیدہ تھی۔ چودھری نے اپنی بدمعاشی سے اسے ہیرآباد والے مرکز صحت میں کام کرنے کے لیے راضی کیا تھا اور وہ اس کی دھمکیوں سے خوف زدہ ہوکر نہ چاہتے ہوئے بھی لاہور سے اپنی پریکٹس چھوڑ کر وہاں آنے پر مجبور ہوگئی تھی۔ وہ چودھری کے ہاتھوں جسمانی استحصال اور بلیک میلنگ کا بھی شکار ہوتی رہی تھی۔ وہ تو شہریار سے شادی کے بعد اس کی جان چھوٹی اور ایک مضبوط سہارا ملنے کے بعد چودھری نے اس کا پیچھا چھوڑا۔

اگر وہ جرائم پیشہ افراد کے کسی اتنے مضبوط نیٹ ورک سے جڑی ہوتی تو چودھری کے ہاتھوں کھلونا ہرگز بھی نہ بنتی۔ دل ہی دل میں ماریا کے حق میں دلائل دیتے ہوئے اسے اچانک ہی ایک بات یاد آگئی۔ اس سے قبل بھی جب وہ ذیشان سے ملاقات کے لیے جارہا تھا تو ماریا نے ستارہ کی شکل کی ایک ٹائی پن اس کی ٹائی میں لگائی تھی۔ بچکانا محسوس ہونے کی وجہ سے اس نے وہ ٹائی پن نکال کر کوٹ کی جیب میں رکھ لی تھی لیکن سوئے اتفاق کہ وہ ٹائی پن جیب میں جانے کے بجائے باہر ہی کہیں گر گئی۔ ذیشان سے ملاقات کے بعد وہ گھر واپس پہنچا تو ماریا نے اس سے ٹائی پن کے بارے میں استفسار کیا تھا اور اس کے کھو جانے کا سن کر ناراض بھی ہوئی تھی۔ اب وہ سوچ رہا تھا کہ کیا وہ ٹائی پن بھی کوئی ڈیوائس تھی جس کی مدد سے ماریا اس کی اور ذیشان کی ملاقات کا حال جاننا چاہتی تھی یا پھر واقعی وہ ایک بیوی کا اپنے شوہر کے لیے محبت بھرا تحفہ تھا؟ اس کا ذہن الجھ سا گیا اور اس نے فیصلہ کیا کہ فی الوقت وہ اس سلسلے میں ذیشان سے کچھ نہیں کہے گا اور اپنے طور پر ماریا کو چیک کرے گا۔ البتہ سی ایف پی کے اہلکار سے اپنے ٹکراؤ کے بارے میں اس نے ضرور بتا دیا۔

"کیا تم اس کو پہچان لوگے؟" اس کی بات سن کر ذیشان نے فوراً ہی سوال کیا۔

"نہیں، اس وقت چونکہ میں جلدی میں تھا اور وہ واقعہ پیش بھی بس چند سیکنڈوں میں آیا تھا، اس لیے میں اس کی شکل نہیں دیکھ سکا تھا۔" اس کا جواب ذیشان کے لیے مایوس کن تھا۔

"تم نے مجھے بہت بڑی الجھن میں ڈال دیا ہے۔ میرے نزدیک سی ایف پی ایک ایسا ادارہ ہے جس کا ہر رکن مخلص، ایمان دار اور محب وطن ہے۔ یہاں کسی ایسے شخص کا

وجود جسے کالی بھیڑ کہا جاسکے، میرے لیے بے حد تشویش ناک ہے۔ پھر تم اس شخص کی نشان دہی بھی نہیں کرسکتے۔ اس صورت میں تو میرے لیے میرا ہر ماتحت مشکوک ہوجائے گا۔ تم خود سوچو کہ ان حالات میں، میں اپنی ٹیم کے ساتھ کس طرح کام کرسکوں گا؟" ان کی واپسی اسی لینڈ کروزر میں ہورہی تھی لیکن ڈرائیونر کے علاوہ اب محکمے کا کوئی فرد ان کے ساتھ نہیں تھا اس لیے وہ سرگوشیوں میں سہی لیکن کھل کر اس موضوع پر بات کررہے تھے۔

"میں نے صرف ایک شبہ ظاہر کیا ہے۔ ہوسکتا ہے میرا اندازہ غلط ہو اور وہ ڈیوائس کسی اور شخص نے میرے کپڑوں سے اٹیچ کی ہو۔"

"سوال پھر وہی پیدا ہوتا ہے کہ وہ شخص کون ہے؟" زیشان اس کی بات سن کر بولا تو اس کے تصور میں ایک بار پھر ماریا کا چہرہ ابھرا لیکن اس نے اس بار بھی زیشان سے اپنے اندیشے کا ذکر کرنے کے بجائے خاموشی اختیار کرلی اور کھڑکی کے شیشوں کے پار تیزی سے گزرتے مناظر کو خالی الذہنی کی کیفیت کے ساتھ دیکھتا رہا۔

☆☆☆

حامد راؤ کے چھوٹے سے فلیٹ میں اس وقت جشن کا سا سماں تھا۔ وہ سب پورے جوش و خروش کے ساتھ مختلف چینلز سے نشر کی جانے والی خبریں دیکھ رہے تھے۔ ان خبروں کا تعلق ٹالی والا سے تھا۔ نیوز کاسٹر نے جو تفصیلات بتائی تھیں، ان کے مطابق ٹالی والا میں قائم خانقاہ کا سارا کچا چٹھا کھل گیا تھا۔ برسوں سے لوگوں کو اپنی اندھی عقیدت میں مبتلا رکھنے والا پیر سائیں ایک اسمگلر اور ملک دشمن کے طور پر سامنے آیا تھا جس نے صرف اپنے مکروہ کاروبار پر پردہ ڈالے رکھنے کے لیے پیر سائیں کا بہروپ اختیار کررکھا تھا۔ خبروں میں بار بار منشیات، اسلحے اور بارود کے ذخائر کی فوٹیج دکھائی جارہی تھی اور ساتھ ہی ساتھ پاک رینجرز کی کارکردگی کو بھی خوب سراہا جارہا تھا جس نے اتنی بڑی سازش کا پتا چلا کر کارروائی کی۔ سی ایف پی حسب روایت اپنا اصل کام انجام دینے کے بعد پس پردہ چلی گئی تھی اور سارا کریڈٹ رینجرز والوں کو ملا تھا۔

رینجرز کے افسران کی اکڑی ہوئی گردنیں فوٹیج میں واضح طور پر دیکھی جاسکتی تھیں اور راؤ فیملی ان مناظر کو دیکھ دیکھ کر خوش ہورہی تھی۔ خبروں میں واضح طور پر بتایا گیا تھا کہ اس سارے دھندے کو چلانے میں خانقاہ پر رہنے والے مریدوں کے ساتھ ساتھ مقامی تھانے کا عملہ بھی پوری طرح شامل تھا۔ مریدوں اور پولیس اہلکاروں کی گرفتاری کی خوش خبری کے ساتھ یہ ایک بری خبر بھی سنائی گئی تھی کہ اس سارے واقعے کا اصل کردار پیر سائیں اور اس کے ٹکڑے کھا کر سرکار سے نمک حرامی کرنے والا تھانے دار ریڈ سے قبل ہی ٹالی والا سے فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے ہیں۔ ان دونوں مجرموں کے فرار ہونے پر ان سب کو بہت دکھ تھا لیکن پھر بھی وہ خوش تھے کہ بہت سے مسائل سے خود بخود ہی نکل آئے ہیں۔ ٹالی والا میں ان کے مکان اور کھیتوں کو بے شک تقریباً آتش کردیا گیا تھا لیکن وہ اتنے بحیثیت اور باہمت تھے کہ واپس اپنی جگہ پر لوٹ کر نئے سرے سے زندگی کا آغاز کرسکتے تھے۔ واپس لوٹنے کا ارادہ تو خیر وہ پہلے بھی رکھتے تھے لیکن خود اس ارادے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے انہیں کافی ہاتھ پیر مارنے پڑتے، خصوصاً اس لیے بھی کہ پیر سائیں کے وحشی مرید اور اندھے عقیدت مند ان کی جان کے دشمن بنے ہوئے تھے۔ اب مرید تو گرفتار ہوچکے تھے اور یقیناً عقیدت مندوں کی آنکھوں پر بندھی پٹی بھی کھل چکی تھی، اس لیے واپسی کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ وہ لوگ خبریں دیکھتے ہوئے جلد از جلد گاؤں واپس لوٹنے کے پروگرام بنا رہے تھے۔ ساتھ ہی یہ امید بھی کی جارہی تھی کہ شفقت راؤ تک بھی جب یہ خبریں پہنچیں گی تو وہ جلد ان سے آملے گا۔

"کیوں بھئی اسلم پتر! تمہارا کیا ارادہ ہے...... ہمارے ساتھ پنڈ واپس چلو گے یا یہیں رہ کر کام کاج کرنے کا ارادہ ہے؟ ہم نے انتخاب تم پر چھوڑ دیا ہے۔ تم جہاں چاہو رہو کر ہمارے ساتھ کام کرسکتے ہو یا اگر چاہو تو ہم سے الگ بھی کہیں اور کام دھندا دیکھ سکتے ہو۔ ہماری طرف سے تمہیں فیصلے کا پورا اختیار ہے۔ تم پر کوئی زور زبردستی نہیں ہے، جو چاہو کرو۔ ہمارے گھر اور دل کے دروازے تمہارے لیے ہمیشہ کھلے رہیں گے۔" ٹی وی پر کمرشل بریک چلنے لگا تو حامد راؤ نے اپنی توجہ وہاں سے ہٹا کر اسلم کی طرف مبذول کی اور اس سے دریافت کرنے لگے۔

"ابھی ہم کچھ نہیں کہہ سکتے چاچا جی! ہمیں سوچنے کے لیے تھوڑی سی مہلت چاہیے۔" اسلم فوری طور پر ان کے سوال کا جواب دینے کے بجائے تذبذب میں پڑ گیا تو ماہ بانو نے خود جواب دینے کی ذمے داری سنبھال لی۔ اس نے یہ مہلت اس لیے مانگی تھی کہ اسے شہریار کے جواب کا انتظار تھا۔ اگر وہ لوگ اس کے تعاون سے ملک سے باہر نکلنے میں کامیاب ہوجاتے تو یہ ان کے لیے سب سے بہتر ہوتا ورنہ یہاں رہنے میں مسلسل ان کے سروں پر خطرے کی تلوار ہی لٹکی رہتی کہ

جانے کب چودھری کا کوئی چمچہ اس تک رسائی حاصل کرلے یا اسلم کو ایک مفرور ڈاکو کی حیثیت سے شناخت کرکے گرفتار کرلیا جائے۔

"جیسا تم دونوں مناسب سمجھو۔ ہم تو تمہاری خوشی میں خوش ہیں۔" حامد راؤ نے مہلت طلب کرنے پر کسی قسم کے تجسس کا اظہار نہیں کیا اور کھلے دل سے انہیں فیصلے کی آزادی دے کر خود مسعود کی طرف متوجہ ہوگئے جو ٹی وی پر خبریں دیکھنے کے ساتھ ساتھ فون پر اپنے ذرائع سے بھی ان کی تصدیق کررہا تھا۔ وہ فون بند کرکے فارغ ہوا تو وہ اسے ہدایات دینے لگے کہ پنڈ واپسی سے قبل انہیں کن کن امور پر غور کرنا ہوگا اور وہاں گھر کے تباہ ہوجانے کے باعث خواتین کی واپسی کو کتنے عرصے تک موخر کرنا پڑے گا۔ تھوڑی سی تشویش انہیں وہاں سے فرار ہوتے وقت کی جانے والی فائرنگ سے زخمی اور ہلاک ہونے والوں کی طرف سے تھی۔ یقیناً انہیں وہاں لوٹ کر ان مسائل سے بھی نمٹنا پڑتا لیکن بہرحال یہ امید ضرور تھی کہ سیلف ڈیفنس میں کی جانے والی اس کارروائی پر وہ زیادہ مشکل میں گرفتار نہیں ہوں گے۔

دونوں باپ بیٹے کو گفتگو میں منہمک دیکھ کر اسلم نے ماہ بانو کو وہاں سے اٹھنے کا اشارہ کیا اور جب وہ دونوں وہاں سے نکل کر علیحدہ کمرے میں پہنچے تو معمولی سی جھنجلاہٹ کے ساتھ بولا۔

"آخر تمہیں راؤ صاحب کی پیشکش قبول کرنے میں کیا قباحت محسوس ہورہی ہے؟ میرے خیال میں تو ہم جن حالات سے گزر رہے ہیں، ان میں یہ ایک اچھی پیشکش ہے۔ رہائش اور روزگار کا مسئلہ بھی حل ہوجائے گا اور راؤ صاحب اپنے اثر و رسوخ سے کام لے کر ہمارے شناختی کاغذات بھی بنوادیں گے۔"

"یہ سب تو ہوجائے گا لیکن تم ان لوگوں کو کیوں بھول رہے ہو جو بو گیر کتوں کی طرح ہمیں ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔ ٹالی والا حیدر آباد سے اتنی دور نہیں ہے کہ چودھری کے کتے میری تلاش میں وہاں تک نہ پہنچیں۔ میں نے اس ملک کے طول و عرض میں بہت بھاگ کر دیکھ لیا ہے اسلم...... میرے دشمن ہر جگہ میرے پیچھے پہنچ جاتے ہیں۔ اب میں یہاں سے کہیں دور نکل جانا چاہتی ہوں تاکہ کچھ تو سکون سے رہنے کی صورت بنے۔" اس نے دل گیر لہجے میں اسلم کی بات کا جواب دیا تو وہ چونک گیا۔

"ملک سے باہر تم کہاں جانا چاہتی ہو؟"

"کچھ معلوم نہیں، بس جہاں قسمت لے جائے۔" اس کا انداز کھویا کھویا سا تھا۔

"لیکن کیسے؟ یہ سب کیسے ہوگا؟ ہمارے پاس ایسے وسائل ہی کہاں ہیں جو یہ کام ہوسکے۔ پھر میں پولیس کو مطلوب بھی ہوں۔ اگر ائرپورٹ پر ہی دھر لیا گیا تو ---؟" اسلم نے سوالات اٹھائے۔

"مجھے معلوم ہے کہ یہ مشکل کام ہے لیکن پھر بھی امید ہی ہے کہ جس سے مدد کے لیے درخواست کی ہے، وہ کچھ نہ کچھ ضرور کرے گا۔ رہی تمہارے ائرپورٹ پر دھر لیے جانے کی بات تو میرے خیال میں ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ یہاں تم سے بہت بڑے بڑے مجرم آسانی سے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ ویسے بھی میں نے جس شخص کے ذمے یہ کام لگایا ہے، اسے معلوم ہے کہ تم کون ہو اور تمہاری حقیقت کیا ہے۔ وہ خود ہی دیکھ بھال کر سارا انتظام کرے گا۔"

"آخر وہ کون ہے جس پر تمہیں اتنا اعتماد ہے؟" اسلم نے حیرانی سے پوچھا۔

"وہی جسے میں اپنے نکاح کے موقع پر بلانا چاہتی ہوں۔ میں نام نہیں بتاؤں گی، تم اسی روز ان سے مل لینا۔"

"لگتا ہے وہ تمہارا کوئی بہت ہی قریبی عزیز ہے۔" اسلم کے لہجے میں خود بخود حسد کی ہلکی سی جھلک ظاہر ہوئی۔

"تم جو بھی سمجھو لیکن بس مجھے اس شخص پر بھروسا ہے۔ اگر اس نے میرے یقین کو توڑا تو پھر ہمارے اس سیکنڈ آپشن راؤ صاحب کی پیشکش کو ہی قبول کرنا ہوگا۔ اسی لیے میں نے احتیاطاً انہیں کوئی واضح جواب نہیں دیا ہے۔"

"ٹھیک ہے، جیسی تمہاری مرضی۔ بس یہ خیال رکھنا کہ ہم بہت نازک حالات سے گزر رہے ہیں اور ہمارے پاس زیادہ دیر کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔" وہ اتنا کہہ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ ماہ بانو کچھ دیر تو اپنی جگہ ساکت بیٹھی رہی لیکن پھر اندرونی بے چینی نے زیادہ دیر تک ایک جگہ بیٹھنے نہیں دیا اور وہ اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگی۔ اسے اس بات سے انکار نہیں تھا کہ اسلم کے اندیشے درست بھی نکل سکتے ہیں۔ وہ تو بس ایک انجانے سے احساس کے تحت شہریار پر بھروسا کیے بیٹھی تھی، ورنہ بہرحال شہریار اس کا پابند نہیں تھا کہ اس کی ہر خواہش اور مطالبہ پورا کردیتا۔

کمرے کے مختصر طول و عرض میں چکر پہ چکر لگاتی وہ مسلسل اپنے یقین اور اسلم کے اندیشوں کا موازنہ کرتی رہی اور بالآخر بے چینی اس حد تک بڑھی کہ وہ شہریار کا خصوصی موبائل نمبر ڈائل کرنے پر مجبور ہوگئی۔ دوسری طرف سے فوراً

ہی کال ریسیو کی گئی۔

"السلام علیکم۔" شہریار کی آواز سن کر اس نے کانپتی ہوئی آواز میں سلام کیا۔ یہ طے تھا کہ وہ دونوں الگ الگ راہوں کے مسافر ہیں پھر بھی دل اس کی آواز سن کر اپنی دھڑکن کی "لے" بدلنے سے باز نہیں آتا تھا۔

"وعلیکم السلام! کیسی ہو؟" اس نے متانت سے سلام کا جواب دیتے ہوئے دریافت کیا۔

"میں ٹھیک ہوں۔ آپ۔ ۔ ۔ سے ایک کام کہا تھا اس کے بارے میں پوچھنا تھا۔" وہ ہمت کر کے فوراً ہی اصل مطلب پر آ گئی۔

"کام تم نے ایک نہیں، کئی ایک کہے تھے .... لیکن فکر نہیں کرو، سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ ابھی تو تم یہ بتاؤ کہ نکاح کا پروگرام کب ہے تاکہ تمہاری فرمائش پر میں اس میں شرکت کے لیے تیار رہ سکوں اور اس دن اپنا کوئی اور پروگرام نہ رکھوں۔"

"شناختی کاغذات کے بغیر قانونی کارروائی میں پریشانی ہوگی اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ پہلے یہ کام ہو جائے۔" اسے لگا کہ شہریار کا لہجہ کچھ عجیب سا ہے پھر بھی حقیقت بیان کر دی۔

"تمہاری راہ کی یہ رکاوٹ تو سمجھو دور ہو گئی۔ تمہیں شاید یاد نہیں رہا لیکن جب میں نے تمہیں کراچی میں ایڈمیشن دلوایا تھا تو مہرین کے نام سے تمہارے نئے شناختی کاغذات بھی تیار کروائے تھے۔ اسلم کے لیے بھی میرا خیال ہے کہ نئے کاغذات بنوانے کے بجائے اس کے پرانے کاغذات وغیرہ کی ہی ڈپلیکیٹ نکلوا دوں۔ یہ کام ایک دو دن میں ہو جائے گا۔ میں ذرا دوسرے معاملات میں الجھ گیا تھا اس لیے تھوڑی سی تاخیر ہو گئی۔" اس بار وہ سنجیدگی سے بتانے لگا۔

"آپ کا بہت شکریہ سر! مجھے آپ پر یقین تھا اسی لیے آپ سے مدد کی درخواست کی تھی۔" اس کا جواب سن کر ماہ بانو نے فوراً ہی ممنونیت کا اظہار کیا۔

"تمہارے اس یقین پر پورا اترنے کے لیے مجھے اپنے اصولوں کو توڑنا پڑا ہے۔" شہریار کی آواز میں شکوہ اتر آیا۔

"سوری سر! میں خود بھی اس بات کو سمجھتی ہوں لیکن سکون سے جینے کی ایک راہ نظر آئی تو تھوڑی سی خود غرضی پر اتر آئی۔" اس نے معذرت خواہانہ لہجے میں اپنی مجبوری بیان کی۔

"او کے! تم خوش رہو، میرے لیے یہی سب سے اہم ہے۔" اس نے گویا بات ہی ختم کر دی لیکن ماہ بانو کا دل ایک بار پھر بے طرح دھڑکنے لگا۔ روانی میں شہریار یہ کیا کہہ گیا تھا۔ کیا واقعی وہ اس کے لیے اتنی اہم تھی کہ اس کے لیے اس کی خوشی ہر شے سے بڑھ کر تھی۔

"تالی والا سے متعلق خبروں کا تمہیں علم تو ہو گیا ہوگا۔ رینجرز نے وہاں کافی بڑی کارروائی کی ہے اور میرے خیال میں تمہارے محسنوں کی بھی بہت سی مشکلات اب دور ہو جائیں گی۔" ابھی وہ اپنی بے ترتیب ہوتی دھڑکنوں کو پوری طرح سنبھال بھی نہیں پائی تھی کہ شہریار نے گفتگو کا موضوع یکدم ہی بدل دیا۔

"جی مجھے معلوم ہے۔ تقریباً تمام نیوز چینلز نے اس خبر کو گہری دلچسپی کے ساتھ دکھایا ہے۔" اس نے جواب دیا پھر یکدم چونک کر بولی۔ "کہیں اس آپریشن کے پیچھے آپ کا ہاتھ تو نہیں ہے؟ میرے خیال میں آپ نے جن معاملات میں الجھے ہونے کا ذکر کیا تھا، وہ یہی ہیں۔"

"وہ رینجرز کا کارنامہ ہے بی بی! تم نے خبریں ٹھیک طرح سے دیکھی اور سنی نہیں شاید۔ میں ایک چھوٹے سے ضلع کا اے سی ہوں۔ میرے کہنے پر بھلا رینجرز والے اتنا بڑا آپریشن کیونکر کر سکتے ہیں؟" اس نے جان بوجھ کر خود کو اس معاملے سے الگ ظاہر کرنے کی کوشش کی۔

"آپ انکساری سے کام لیں تو الگ بات ہے ورنہ حیدرآباد کے جنگل میں ہونے والا آپریشن اس سے کہیں زیادہ بڑا تھا۔" وہ ذہین تھی اس لیے اسے جتانے سے باز نہ آئی کہ وہ اس بظاہر چھوٹے سے افسر کی پہنچ سے خاصی واقف ہے۔

"میں تمہاری سوچ پر کوئی پابندی عائد نہیں کر سکتا۔ تم جو چاہو سمجھنے کے لیے آزاد ہو۔ تمہارا کام بہرحال ہو جائے گا۔ تم نے جس نمبر سے مجھے کال کی ہے، اسے آن رکھنا۔ میں اسی پر تمہیں اطلاع دوں گا۔" شہریار نے اس سے بحث کیے بغیر گفتگو کا موضوع ایک بار پھر بدل دیا بلکہ گفتگو کو ایسی نہج پر لے آیا کہ اب مزید بات چیت جاری رکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس نے جس مقصد کے لیے اسے فون کیا تھا، اس کا جواب مل چکا تھا اس لیے اب اجازت طلب کر لینا ہی بہتر تھا۔ اس نے یہی کیا لیکن خود کو بہت دیر تک اس کی آواز کے سحر سے آزاد نہیں کر سکی۔

☆☆☆

"گرفتار شدگان پر کام کرنے کا کیا نتیجہ نکلا؟ ان سے کوئی کام کی بات معلوم ہوئی یا نہیں؟" وہ پھر ذیشان سے رابطے میں تھا اور اس سے استفسار کر رہا تھا۔

"مجھے ان لوگوں سے بہت زیادہ کام کی باتیں معلوم ہونے کی امید تھی بھی نہیں۔ بس اس لیے ساتھ اٹھا کر لے گیا تھا کہ انہیں ان کے لالچ کا ٹھیک ٹھاک مزہ چکھا سکوں۔ اب اگر ان میں سے کوئی زندہ رہا بھی تو باقی زندگی اپنے زخموں کو چاٹتے ہوئے گزارے گا۔ ان میں سے کوئی اس قابل بھی نہیں رہا ہوگا کہ خود سے بھیک مانگ سکے۔ ہاں، ان کی حالت دیکھ کر کوئی خود سے چند سکے ان کے آگے ڈال کر چلا جائے تو الگ بات ہے۔" ذیشان نے نہایت سفاکانہ لہجے میں اس کے سوال کا جواب دیا۔

"کیا مطلب؟ کیا تم لوگ اس طرح کے کام بھی کرتے ہو؟" وہ حیران ہوا۔

"ہم جو کچھ کرتے ہیں، اس ملک کے لیے کرتے ہیں چنانچہ جو اس ملک کے ساتھ برا کرتا ہے، ہم اس کے ساتھ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔" اس نے دوٹوک لہجے میں جواب دیا۔

"او کے، اٹ یو لائک..... لیکن کچھ معلومات تو حاصل ہوئی ہوں گی ان لوگوں سے؟ کوئی بہت معمولی سا کلیو بھی ہمارے کام کو آگے بڑھانے میں مدد دے سکتا ہے۔ ہم تالی والا میں ان کے صرف ایک ٹھکانے کو ختم کر دینے پر تو اکتفا نہیں کر سکتے۔ اس سازش کے پیچھے چھپے اصل چہروں کو دیکھنے کے لیے ہمیں ہر طرف ہاتھ پیر مارنے پڑیں گے۔" اس نے تحمل سے کام لیتے ہوئے گفتگو کا سلسلہ آگے بڑھایا۔

"اس بات کو میں اور میرے بڑے بھی سمجھتے ہیں۔ ہمارے لوگ تالی والا کی کارروائی کے بعد آرام سے نہیں بیٹھے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ انہیں کیا کرنا ہے اور وہ کر رہے ہیں۔" ذیشان کا جواب بڑا مبہم سا تھا۔ اس بار وہ ذرا چونک پڑا۔ گفتگو کی ابتدا ہی سے ذیشان اس سے ایسے لہجے میں بات کر رہا تھا جیسے وہ اسے خود سے الگ سمجھ رہا ہو اور کھل کر اسے کچھ بھی بتانے سے گریزاں ہو۔

"کیا بات ہے تم کچھ اکھڑے اکھڑے لگ رہے ہو؟ کوئی پرابلم ہے کیا؟" اس نے فوراً ہی اس سے اس کے رویے کی وجہ دریافت کی۔

"میرے پرابلم کو چھوڑو، تم یہ بتاؤ کہ تم نے ڈیوائس کے معمے کو حل کیا یا نہیں؟" ذیشان کے سوال نے اس کے ذہن کو ایک زوردار جھٹکا لگایا۔

"کیا تم مجھے ناقابلِ اعتبار سمجھ رہے ہو؟ تمہیں ڈر ہے کہ مجھے کچھ بتانے کی صورت میں تمہارے سیکرٹس اوپن ہو جائیں گے؟" اس نے صدمے کی سی کیفیت میں دریافت کیا۔

"اعتبار اور بے اعتباری کا معاملہ بھی عجیب ہے دوست! تمہارے معاملے نے تو برسوں سے خدمات انجام دیتے کئی افراد کو مشکوک افراد کی لسٹ میں کھڑا کر دیا ہے۔ تم ہمارے درمیان موجود سیاہ بھیڑ کو شناخت نہیں کر سکے لیکن تم نے اس کی موجودگی کا شک ظاہر کر کے مجھے سخت مشکل میں ڈال دیا ہے۔ تم خود سوچو کہ چارج سنبھالتے ہی میں کس مشکل میں گرفتار ہو گیا ہوں۔ اگر تمہارے حوالے کے ساتھ ایسا کوئی شک ظاہر کر کے تحقیقات شروع کرتا ہوں تو خود کئی سوالوں کی زد میں آ جاؤں گا۔ سب سے پہلے تو مجھ سے یہی پوچھا جائے گا کہ میں نے باہر کے آدمی کو اپنے ساتھ شامل کیوں کیا؟"

"یہ سوال کون پوچھے گا؟ جو تم سے اوپر ہے وہ میری شمولیت سے واقف ہے اور اس پر معترض بھی نہیں۔" وہ ذیشان کی کیفیت کو سمجھ رہا تھا لیکن پھر بھی اسے اس کی باتوں سے گہرا صدمہ پہنچا تھا چنانچہ اپنے لہجے میں اترنے والی سرد مہری کو کسی طور قابو نہیں کر سکا۔

"ٹھیک ہے..... لیکن اوپر والوں میں سے بھی کوئی پسند نہیں کرے گا کہ تمہارے ذریعے ہمارے راز باہر نکلیں۔ اب بھی میں کہہ نہیں سکتا کہ ہمارے درمیان ہونے والی گفتگو کہیں اور نہیں سنی جا رہی ہوگی۔" وہ کچھ زیادہ ہی صاف گوئی اور بے مروتی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

"او کے! اگر تمہیں میری طرف سے اتنے ہی زیادہ خدشات ہیں تو مناسب ہے کہ ہم ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں۔ مجھے تو کام کرنا ہے۔ تم میرا ساتھ دو یا نہیں دو، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں اپنی بساط کے مطابق اپنے مشن پر ڈٹا رہوں گا۔ البتہ مجھے یہ افسوس رہے گا کہ ہم ایک اچھی ٹیم بنتے بنتے رہ گئے۔" ذیشان بے مروتی پر اتر آیا تھا تو اس کے لیے بھی مناسب تھا کہ وہ خود کو اس سے الگ کر لیتا۔ چنانچہ یہ الفاظ ادا کر کے سلسلہ منقطع کر دیا اور موبائل پٹخنے کے انداز میں میز پر رکھنے کے بعد اور کچھ بس نہیں چلا تو اپنی ہی ہتھیلی کو اپنے داہنے ہاتھ کے زوردار مکے کا نشانہ بنا لیا۔ اس ٹکراؤ سے اچھی خاصی زوردار آواز پیدا ہوئی لیکن بہرحال، اس نے اپنے موبائل کی میسج ٹون سن لی۔ اگر یہ موبائل نمبر چند مخصوص لوگوں کے لیے ہی مختص نہ ہوتا تو وہ میسج ٹون کو نظرانداز کر دیتا لیکن اب دیکھنے پر مجبور ہو گیا۔ میسج ذیشان کی طرف سے تھا اور محض ایک لفظ پر مشتمل تھا۔ وہ لفظ تھا "احتیاط"۔ اس پیغام کو پڑھ کر اس پر سوچ کے نئے در وا ہو گئے اور وہ ذیشان کی ساری گفتگو کو مختلف تناظر میں دیکھنے لگا۔

ذیشان نے اس سے ایسے لب و لہجے میں شاید اس لیے گفتگو کی تھی کہ اگر کسی ذریعے سے ان کے درمیان ہونے والی گفتگو سنی بھی جا رہی ہو تو اول تو کسی قسم کی معلومات دشمن تک منتقل نہ ہو سکیں اور دوم یہ کہ اپنے مخالفین کو یہ تاثر دیا جا سکے کہ اب ان دونوں کا گٹھ جوڑ ختم ہو چکا ہے اور اب وہ ایک نہیں رہے ہیں۔

یہ سارے خیالات ذہن میں آنے پر وہ پُرسکون ہو گیا اور دل ہی دل میں ذیشان کو اس کی ذہانت پر داد دینے کے ساتھ ساتھ یہ بھی سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ اگر حقیقت پسندی سے کام لیا جائے تو... اس نے صرف احتیاط ہی نہیں، بیچ بیچ بھی انہی خدشات اور مشکلات کی وجہ سے جن کا وہ ابھی ذکر کر رہا تھا، اس سے ذرا بدتہذیبی سے بات کی ہے تو وہ اس کا حق تھا۔ ذہن سوچنے سمجھنے کے لائق ہوا تو وہ دیگر امور کی طرف توجہ دینے کے بھی قابل ہوا۔

اسے یاد آیا کہ نتھیا گلی والا میں ڈیوائس پکڑے جانے پر اس کا شک ماریا پر بھی گیا تھا لیکن اس شک کو رفع کرنے کے لیے وہ کوئی عملی قدم نہیں اٹھا سکا تھا۔ نور کوٹ واپس آتے ہی اسے دفتری امور میں الجھنا پڑا تھا پھر ماہ پارہ تو سے متعلق مسائل بھی تھے جنہوں نے اس کے دل و دماغ کو الجھا کر رکھ دیا تھا۔ ایسے میں وہ ماریا کو پرکھنے کا کام کیسے کرتا؟ وہ خود خاصی معروف عورت تھی اور لاہور سے واپس آتے ہی اپنے کاموں میں مصروف ہو گئی تھی۔ اس وقت بھی وہ نیو آباد والے مرکزِ صحت گئی ہوئی تھی۔ اس کے مرکزِ صحت جانے کا خیال آیا تو اسے محسوس ہوا کہ یہ بہت اچھا موقع ہے جب وہ ماریا کی غیر موجودگی میں اس کے سامان کی تلاشی لے سکتا ہے۔ وہ فوراً ہی اپنی رہائش گاہ جانے کے لیے تیار ہو گیا۔

ملازمین اسے معمول سے ہٹ کر گھر آتا دیکھ کر حیران ضرور ہوئے لیکن کسی نے اس سے کوئی سوال نہیں کیا۔ وہ سیدھا اپنے اور ماریا کے مشترکہ بیڈ روم میں پہنچ گیا۔ سب سے پہلے اس نے بیڈ روم کا باریک بینی سے جائزہ لیا۔ وہاں ایسی کوئی شے موجود نہیں تھی جسے وہ مشکوک قرار دے سکتا۔ بیڈ روم کی طرف سے مطمئن ہو کر اس نے ڈریسنگ روم کا رخ کیا۔ وہاں اس کے اور ماریا کے کپڑوں کے علاوہ آرائش سے متعلق دیگر چیزیں بھی موجود تھیں۔ اس بے تحاشا سامان کا جائزہ لینا اتنا آسان نہیں تھا لیکن اس کی مجبوری یہ تھی کہ اسے تن تنہا ہی یہ کام کرنا تھا۔ وہ کسی کو اپنی مدد کے لیے اپنے ساتھ شامل نہیں کر سکتا تھا کیونکہ ماریا سے اس کی شادی چاہے جن حالات میں بھی ہوئی تھی، بہرحال وہ اس کی شریکِ حیات اور عزت تھی اور وہ محض شک کی بنیاد پر اسے کسی ایک بھی شخص کے سامنے ذلیل نہیں کر سکتا تھا۔ اپنی بیوی کو اپنی زبان سے کسی کے سامنے مشکوک قرار دینا اس کے نزدیک اسے ذلیل کرنے ہی کے مترادف تھا چنانچہ وہ خود تنہا سارا کشت اٹھا رہا تھا۔

کپڑوں کے ڈھیر سے لے کر جوتے، جیولری، ہیئر کلپس، ٹائی پنز اور کف لنکس تک اس نے ہر ہر شے کھنگال ڈالی۔ کہیں ایسا کچھ نہیں تھا جو مشکوک لگتا۔ البتہ یہ ضرور ہوا تھا کہ کئی گھنٹوں کی اس مشقت سے وہ سخت اوب گیا تھا اور اسے یوں محسوس ہونے لگا تھا کہ وہ دنیا کا سب سے بڑا احمق ہے جو خوامخواہ اپنی بیوی پر شک کر کے خود کو اس جنجال میں پھنسا بیٹھا ہے۔ بہرحال، ہمیشہ کے لیے دل میں شک کا کانٹا لیے بیٹھے رہنے سے یہ کہیں بہتر تھا کہ وہ ایک بار اپنی تسلی کر ہی لیتا۔ اس خیال کے آنے پر اس نے ایک بار پھر کمر کسی اور میدان میں اترنے کے لیے تیار ہونے لگا۔ بیڈ روم اور ڈریسنگ روم کے بعد اس کی اسٹڈی ہی رہ جاتی تھی جہاں کسی خفیہ اور حفاظتی نقطۂ نظر سے خاص شے کو رکھا یا چھپایا جا سکتا۔ ان تین مقامات کے علاوہ باقی پوری رہائش گاہ میں ملازمین کا بلا روک ٹوک آنا جانا لگا رہتا تھا اس لیے کسی بھی آنے کے نظر میں آنے یا ضائع ہو جانے کا بہت زیادہ خطرہ تھا۔

وہ ملازم کو چائے پہنچانے کا حکم دے کر اسٹڈی میں چلا گیا۔ ڈھیروں کتابوں سے بھرے شیلفس میں سے کہیں بھی ایک چھوٹی سی ڈیوائس چھپا دینا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ خاص طور پر اس طرح کی کوئی ڈیوائس جو نتھیا گلی والا میں اسے اپنی ٹی شرٹ پر چھپاں حالت میں ملی تھی۔ حقیقتاً ایسی کسی شے کو اسٹڈی میں تلاش کرنا بھوسے کے ڈھیر میں سوئی تلاشنے کے مترادف تھا لیکن اسے یہ کام کرنا ہی تھا۔ ایک بار میں نہ سہی، مختلف اوقات میں وہ قسطوں میں یہ کام کر سکتا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ دائیں طرف کی دیوار میں موجود شیلفس سے یہ کام شروع کرے گا۔ وہ اس شیلف کی طرف بڑھتا، اس سے قبل ہی دروازے پر دستک کی آواز ابھری۔

"کم اِن۔" اسے یاد آ گیا کہ اس نے ملازم کو چائے لانے کا حکم دیا تھا چنانچہ اسے اندر آنے کی اجازت دینے کے ساتھ خود رائٹنگ ٹیبل کے ساتھ رکھی کرسی کی طرف بڑھ گیا۔ مؤدب ملازم نے اس کے سامنے چائے لا کر رکھی۔ اور اس کی طرف سے واپس جانے کا اشارہ ملنے پر فوراً ہی باہر کی طرف رخ کر لیا۔ وہ گھونٹ گھونٹ کر کے چائے پیتا ہوا ایک بار پھر اپنی اسٹڈی کا جائزہ لینے لگا۔ اسے کتابوں کا

شروع ہی سے بہت شوق تھا۔ گھر سے ملنے والی تربیت نے اس شوق کو اور بھی زیادہ پنپنے کا موقع دیا۔ نتیجتاً اس کے پاس کتابوں کا ایک ڈھیر جمع ہو گیا۔ یہاں پوسٹنگ کے وقت جہاں وہ اپنی پسند کا فرنیچر وغیرہ ساتھ لے کر آیا، وہیں اپنی بیشتر کتابیں بھی یہیں منتقل کر لیں۔ یہ کتابیں اس کی بہترین رفیق تھیں جن کے ساتھ وہ بے تحاشا مصروفیت کے باوجود کچھ نہ کچھ وقت گزارنے کی کوشش کرتا تھا۔ اب انہی ہمدم و ہم ساز کتابوں کے بیچ اس کے کسی دشمن کی کسی سازش کے چھپے ہونے کا امکان تھا اور اسے بہت تحمل کے ساتھ اس سازش کو بے نقاب کرنا تھا ورنہ ان قیمتی کتابوں کو نقصان پہنچنے کا بھی احتمال تھا۔ چائے کے گھونٹ بھرتے ہوئے وہ ابھی خیالات میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس کا بایاں ہاتھ بے خیالی میں مخمل پر رکھے کرسٹل کے اس پیالے میں گردش کر رہا تھا جس میں بہت سے رنگ برنگے موتی بھرے ہوئے تھے۔ وہ بغیر دیکھے پیالے میں سے ایک موتی اٹھاتا اور پھر اسے چھوڑ کر دوسرا اٹھا لیتا۔ یکے بعد دیگرے کئی موتی اس طرح اس کے ہاتھ سے گزر چکے تھے اور ان کے ایک ردھم سے پیالے میں گرنے سے خوش گوار سا احساس پیدا ہو رہا تھا۔ غیر شعوری طور پر موتی گرنے سے پیدا ہونے والی آوازوں کے ردھم میں ڈوبا وہ یکدم ہی چونک گیا اور اپنے انگوٹھے اور شہادت کی انگلی کے بیچ دبے موتی کو غور سے دیکھنے لگا۔

وہ ایک سرخ رنگ کا چمک دار موتی تھا۔ اس رنگ اور سائز کے اور بھی بہت سے موتی پیالے میں موجود تھے لیکن اسے محسوس ہوا کہ اب تک اس کے ہاتھ سے گزرنے والے موتیوں کے مقابلے میں اس موتی کا وزن قدرے مختلف ہے۔ اس نے موتی ہٹا کر ایک جانب احتیاط سے رکھ دیا اور پیالے میں موجود سرخ رنگ کے موتی چن چن کر نکالنے لگا۔ پہلے نکالے گئے موتی کو ملا کر ان کی کل تعداد بارہ بنتی تھی۔ پہلے نکالے گئے موتی کے مقابلے میں اسے ان گیارہ موتیوں کے وزن میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوا تھا۔ پہلا موتی باقیوں کی نسبت وزنی تھا۔ وہ اپنے شک کی مضبوطی کو جانچنے کے لیے ایک ایک کر کے باقی رنگ کے موتیوں کا بھی جائزہ لینے لگا۔ نتیجہ وہی تھا۔ اس کے رگ و پے میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ چائے پینی تو وہ کبھی کا بھلا چکا تھا۔ اب پوری طرح اس مشکوک موتی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ باقی موتیوں کی طرح اس موتی میں بھی کوئی سوراخ نہیں تھا اور پوری سطح پر چمک دار و ہموار سرخ رنگ چڑھا ہوا تھا۔ وہ نہایت احتیاط سے انگوٹھے کے ناخن کی مدد سے موتی پر سے وہ رنگ کھرچنے لگا۔

آہستہ آہستہ سرخ رنگ بالکل غائب ہو گیا اور سفید رنگ کا پلاسٹک کا خول نظر آنے لگا۔ اس خول کو بہت غور سے دیکھنے پر اسے ایک باریک سی لکیر نظر آئی۔ یہ لکیر واضح طور پر موتی کو دو حصوں میں تقسیم کر رہی تھی۔ یعنی وہ موتی دو ٹکڑوں میں مل کر بنا تھا۔ دیکھا جائے تو یہ کوئی ایسی انوکھی بات نہیں تھی۔ عام طور پر موتی جیسی ساخت کی اشیا کو بنانے کے لیے یہ طریقہ استعمال کیا جاتا تھا لیکن وہ جس طرح کھوج میں چلا تھا اور جس شک کی بنیاد پر اس موتی کو ہاتھ میں لیے بیٹھا تھا، وہ اسے آخری حد تک جانے پر مجبور کر رہا تھا۔ آخری حد یہی تھی کہ وہ جوڑ سے موتی کو کھول کر دیکھتا چنانچہ اس نے یہی کیا اور پیپر کٹر کی معمولی سی مدد سے اس موتی کو کھولنے میں کامیاب ہو گیا۔

دو حصوں میں تقسیم ہو جانے والے موتی نے اس کے چھکے چھڑا دیے۔ موتی اندر سے خالی نہیں تھا بلکہ اس کے کھوکھلے کرے میں کوئی شے موجود تھی۔ سائنسی ایجادات و آلات کے بارے میں بہت زیادہ وسیع معلومات نہ رکھنے کے باوجود وہ اندازہ لگا سکتا تھا کہ وہ کیا شے تھی۔ یقیناً وہ ویسی ہی کوئی ڈیوائس تھی جو اس سے قبل نتھیا گلی والا میں اس کی ٹی شرٹ پر چسپاں پائی گئی تھی۔ کوئی تھا جو اس کی مصروفیات سے واقف رہنے کی کوشش کر رہا تھا اور یقینی طور پر وہ اس کے اتنے قریب تھا کہ اس کی دسترس اس کی نجی استعمال کی اشیا تک بہت آسانی سے تھی۔ تو کیا واقعی وہ ماریا تھی جو اس کی بیوی کے روپ میں دشمن کی آلۂ کار بنی ہوئی تھی؟ سانپ کی دم سے پڑنے والے کوڑے کی طرح یہ خیال اس کے ذہن سے ٹکرایا اور اشتعال کی ایک زوردار لہر اس کے پورے وجود میں اٹھی۔ اگر یہ ماریا کا کارنامہ تھا تو وہ اس کے ہاتھوں اپنے برے انجام سے کسی صورت نہیں بچ سکتی تھی۔ اس کے ذہن میں یہ خیال چکرا ہی رہا تھا کہ دروازے پر دستک کی آواز ابھری۔ اس نے جلدی سے دو ٹکڑوں میں منقسم موتی کو ڈیوائس سمیت اپنی جیب میں منتقل کر لیا اور دستک دینے والے کو اندر آنے کی اجازت دے دی۔ فوراً ہی دروازہ کھلا اور ماریا خوشبو کے جھونکے کی طرح اندر داخل ہوئی۔ اس نے خوب صورت لباس زیبِ تن کر رکھا تھا اور مناسب میک اپ اور جیولری کے ساتھ خاصی دلکش لگ رہی تھی۔

"ہیلو۔" وہ مسکراتی ہوئی اس کے قریب چلی آئی۔ "مجھے معلوم ہوا کہ آپ گھر آئے ہوئے ہیں اور خاصا وقت اوپر بیڈ روم میں گزارنے کے بعد اب اسٹڈی میں ہیں تو میں نے سوچا کہ آپ سے خیریت معلوم کر لوں۔ آپ کی بے

وقت دفتر سے واپسی آدمی کو ذرا تشویش میں مبتلا کر دیتی ہے کہ نصیب دشمناں کہیں طبیعت وغیرہ خراب نہ ہو۔" وہ شہریار کی خود پر جمی نظروں سے بے خبر اپنی ہی بولتی جا رہی تھی۔ بولتے بولتے اس کی نظر میز پر رنگوں کے اعتبار سے الگ الگ کر کے رکھے گئے موتیوں پر پڑی تو حیران نظر آنے لگی۔

"آپ کیا یہاں بیٹھ کر کوئی گیم کھیل رہے ہیں؟"

"نہیں لیکن گیم کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔" شہریار نے چھپتے ہوئے لہجے میں اسے جواب دیا۔

"میں ہیلپ کروں۔ ویسے کیا کوئی نیا گیم ہے؟" وہ خود بھی ایک کرسی کھینچ کر اس کے قریب بیٹھ گئی اور تجسس سے پوچھنے لگی۔

"گیم تو یقیناً پرانا ہے لیکن میرے علم میں ابھی آیا ہے۔" وہ جواب دیتے ہوئے بہت غور سے اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہاں حیرت اور تجسس تو بے شک تھا لیکن ایسی کوئی بات نہیں تھی جس سے اسے محسوس ہوتا کہ وہ اپنی چوری پکڑے جانے پر خائف ہو۔ اس کا رد عمل ایک مکمل طور پر انجان شخص جیسا تھا۔ کہیں سے لگتا ہی نہیں تھا کہ وہ اس کرسٹل باؤل میں موجود کسی مشکوک موتی سے واقف ہو۔ اس کے رویے پر وہ ایک بار پھر تذبذب میں مبتلا ہو گیا اور اس معاملے کو دوسرے پہلو سے سوچنے لگا۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ماریا کا اس سارے چکر سے کوئی تعلق ہی نہ ہو اور جو لوگ اس کی کھوج میں لگے ہیں، انہوں نے یہ سارا بندوبست کیا ہو۔ سی ایف پی کے دفتر میں سیڑھیوں پر اس سے ٹکرانے والا اہلکار بھی ان کا ساتھی ہو سکتا تھا اور اس کے گھر پر کام کرنے والے ملازمین میں سے بھی کسی کو چھوٹی موٹی خدمت کے بدلے میں بڑا لالچ دے کر راضی کیا جا سکتا تھا۔ صفائی کے لیے اسٹڈی میں آنے والے ملازم کے لیے نظر بچا کر باؤل میں سے ایک موتی نکال کر لے جانا اور اس کی جگہ دوسرا لا رکھنا کوئی ایسا مشکل کام نہیں تھا۔ اگر کوئی اسے وہ موتی اٹھاتا ہوا دیکھ بھی لیتا تو اتنی معمولی سی شے کی چوری کے الزام میں کچھ کہہ تو نہیں سکتا تھا۔ ماریا اگر اس معاملے میں ملوث ہوتی تو اس کے لیے بہت آسان ہوتا کہ کسی زیادہ محفوظ اور خفیہ مقام کا انتخاب کرتی۔ اس کی بیوی کی حیثیت سے وہ اس گھر کی مالکن تھی اور ہر جگہ بلا روک ٹوک اور بلا جواز جتنا چاہے وقت گزار سکتی تھی۔

"کن خیالوں میں ڈوب گئے؟ مجھے کچھ بتائیں نا اپنے گیم کے بارے میں۔" ماریا کی آواز اسے گہری سوچ سے باہر لائی۔

"چھوڑو بھی، تم کس چکر میں پڑ گئیں۔ میں تو بس وقت گزاری کے لیے اس کام میں لگ گیا تھا۔ آج طبیعت تھوڑی سست ہو رہی تھی اس لیے دفتر میں دل نہیں لگا اور گھر واپس آ گیا کہ کچھ دیر آرام کر لوں گا لیکن بے وقت آرام کی عادت نہیں ہے اس لیے زیادہ دیر بستر پر لیٹ نہیں سکا۔ تم تھکی ہوئی آئی ہو، جا کر فریش ہو جاؤ اور کچھ کھاؤ پیو۔ میں بھی واپس دفتر جاتا ہوں۔ میرے چلے آنے سے وہاں کئی کام رک گئے ہوں گے۔" اس نے تیزی سے خود کو سنبھال کر خلاف عادت تھوڑی لمبی وضاحت دی اور پھر عجلت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک بار پھر دفتر جانے کے لیے کمربستہ ہو گیا۔ ماریا نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ یہ کوشش کامیاب نہیں رہے گی۔ شہریار کے روانہ ہوتے ہی اس نے بے پروائی سے سر کو جھٹکا دیا اور اس کے مشورے پر عمل کرنے چل پڑی۔

☆☆☆

"اپنی کارکردگی کی رپورٹ دو سنتھیا! ہمارے بڑے آج کل تم سے خوش نہیں ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ تمام مراعات حاصل کرنے کے باوجود کافی طویل عرصے سے کوئی قابل ذکر کام نہیں کر رہیں۔ بہتر ہے کہ اس سے پہلے کہ تمہیں ریٹائر کر دیا جائے، تم خود کو مزید کام کرنے کا اہل ثابت کرو۔"

پر رعونت لہجے میں کہے گئے یہ الفاظ سن کر ادھیڑ عمر سنتھیا کو پتنگے لگ گئے اور وہ چیخ کر بولی۔

"میں اپنی مرضی سے ایک طرف ہو کر نہیں بیٹھی ہوں۔ بڑوں ہی نے میرے میرج بیورو والے سیٹ اپ کا بھانڈا کھل جانے پر مجھے انڈر گراؤنڈ ہو جانے کا مشورہ دیا تھا۔ میں نے صرف اس مشورے پر عمل کیا ہے لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ کچھ نہیں کر رہی ہوں۔ یہ بات تم بھی جانتے ہو کہ میں نہایت خاموشی سے خام مال پر کام کر رہی ہوں۔ میرا طریقہ کار ذرا سست رفتار ہے لیکن تم دیکھنا کہ اس کے کتنے زبردست نتائج حاصل ہوں گے۔"

"او پلیز اب تم مجھ پر اپنے استانی بننے کا رعب مت جھاڑو۔ جو کچھ تم کر رہی ہو وہ ہمارے آدمی پہلے ہی سے کر رہے ہیں اور ان کے نتائج بھی بہت واضح اور تیز رفتار ہیں۔" دوسری طرف سے بیزاری کا اظہار کیا گیا۔

"تیز رفتار نتائج دینے والے تمہارے وہ جعلی ملا تیز رفتاری سے پکڑے بھی جا رہے ہیں۔ میرے ساتھ کم از کم ایسا نہیں ہوگا۔" سنتھیا نے تیزی سے جواب دیا۔

"کہنے کو میں تم سے اس معاملے پر لمبی بحث بھی کر سکتا ہوں کیونکہ یہ ایک کھلی حقیقت ہے۔ ایک طرف تو ہم نے انہیں دہشت گردی کا شکار کر دیا ہے۔ اور ساتھ ہی ان مسلمانوں کو ساری دنیا میں منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا... پاکستان کے اندرونی حالات روز بروز بگڑتے جا رہے ہیں۔ ان کی معاشی حالت ہر گزرتے دن کے ساتھ کمزور سے کمزور تر ہوتی جا رہی ہے۔ بہرحال، اس وقت میں تمہیں یہ سب نہیں گنوانا چاہتا۔ میرے کال کرنے کا مقصد کچھ اور تھا۔"

"تو پھر بہتر ہے کہ تم وہ مقصد بیان کر دو۔" سنتھیا نے روکھے پن سے کہا۔

"پرابلم یہ ہے کہ ہمارا ایک بندہ غائب ہے۔ اس بندے کا نام ہے اشیش کمار۔ وہ ایک چھوٹے سے گاؤں میں ڈیوٹی دے رہا تھا اور چونکہ لمبے منصوبے پر کام کر رہا تھا اس لیے ہمیں ڈیلی رپورٹ دینے کا پابند نہیں تھا۔ اسے اس کی جگہ سے ایک رات اچانک چھاپا مار کر اٹھا لیا گیا لیکن بدقسمتی سے ہمیں وقت پر خبر نہیں ہو سکی اور جب خبر ہوئی تو کافی دن ہو گئے تھے۔ ہم نے دوڑ دھوپ کر کے یہ تو معلوم کر لیا ہے کہ اس چھاپے کے پیچھے آرمی انٹیلی جنس تھی اور ہمارا آدمی ابھی تک انہی کی کسٹڈی میں ہے۔ تم اندازہ کر سکتی ہو کہ اس عرصے میں انہوں نے اس پر ہر طرح کا ٹارچر کر کے معلومات اگلوانے کی کوشش کی ہوگی۔ اشیش کس حد تک ٹارچر کو سہہ سکا ہوگا اور اس نے اب تک کیا کچھ اگلا ہوگا، ہمیں ٹھیک طرح سے اندازہ نہیں بس ہم نے احتیاطاً اپنے وہ سارے پتے اور ٹھکانے بدل لیے ہیں جو اشیش کے علم میں تھے لیکن پھر بھی ہم یہ چاہتے ہیں کہ اشیش کو انٹیلی جنس والوں کی گرفت سے نکالا جائے اور اسی سلسلے میں مجھے تمہاری مدد درکار ہے۔" وہ یہاں تک بتا کر رک گیا۔

"کیسی مدد؟ تم بولتے جاؤ میں تمہاری بات توجہ سے سن رہی ہوں۔" سنتھیا کے لہجے سے اس کی گہری دلچسپی کا اظہار ہو رہا تھا۔

"ہم معلوم کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں کہ اشیش کا کیس کرنل توحید کے ہاتھ میں ہے۔ ہم نے کرنل کی مصروفیات کو مسلسل اپنی نظر میں رکھا ہے۔ ہم موقع کی تلاش میں رہے ہیں کہ کسی طرح کرنل کو گرفت میں لے سکیں اور اب وہ موقع مل گیا ہے۔ کرنل اپنے کسی قریبی عزیز کی شادی میں شرکت کے لیے چار دن کی چھٹی پر لاہور آ رہا ہے۔ ہمیں ایسا کوئی موقع تلاشنا ہے کہ اس تک تمہاری کوئی فرینڈ لڑکی پہنچ جائے۔ اگر وہ لڑکی کرنل کو شیشے میں اتارنے میں کامیاب

رہی تو اس سے اشیش کے متعلق بہت کچھ اگلوا سکتی ہے۔ ہمیں ایک بار اشیش کا ٹھکانا معلوم ہو جائے تو سمجھو مسئلہ حل ہو گیا۔ ہم اپنی پوری کوشش کر کے اسے وہاں سے نکال لائیں گے..... اور اگر نکالنے میں ناکام رہے تو اسے ویشنو پر قربان ہونا پڑے گا۔ ہم اپنا اتنا اہم ایجنٹ پاکستانی انٹیلی جنس کی کسٹڈی میں نہیں چھوڑ سکتے۔" اس کا لہجہ فیصلہ کن اور سفاکیت سے بھرپور تھا۔ عرصے سے ان کے ساتھ کام کرنے کی وجہ سے سنتھیا ان کے اس طریقہ کار سے واقف تھی۔ وہ غیروں کی طرح اپنوں کو بھی خوب جی بھر کر استعمال کرنے کے بعد کوئی برا وقت پڑنے پر ٹھوکر لگانے میں دیر نہیں کرتے تھے۔ ان کے نزدیک کوئی بھی آدمی بس اس وقت تک اہم رہتا تھا جب تک وہ اس سے فائدہ اٹھاتے رہیں۔ دوسری صورت میں وہ اسے کسی ٹشو پیپر کی طرح ہاتھ پونچھ کر ڈسٹ بن میں پھینک دیتے تھے۔

"میں نے تمہاری ساری بات سمجھ لی ہے لیکن تم خود اچھی طرح یہ بات جانتے ہو کہ میرا وہ پرانا سیٹ اپ بکھر چکا ہے۔ ارمیلا، گیتا اور جولی کے انجام سے تم واقف ہو۔ میری وہ تینوں قابل لڑکیاں اب میرے پاس کیا، اس دنیا میں ہی نہیں رہی ہیں۔ جولی کو تو مجھے خود مروانا پڑا تھا کہ وہ سجاد رانا کی نظروں میں آ گئی تھی۔ اب میرے لیے جو لڑکیاں کام کر رہی ہیں، وہ کند ذہن اور عیاش سیاست دانوں کو تو بے وقوف بنانے کے لیے ٹھیک ہیں لیکن آرمی انٹیلی جنس کے کرنل کو قابو کرنا ان کے بس کی بات نہیں۔ ان میں سے کسی کو میں نے ڈیوٹی سونپ بھی دی تو وہ کرنل کو ہاتھ میں لینے کے بجائے خود بھی اس کے ہاتھ آ سکتی ہے۔ اس لیے میرے خیال میں تم اس کے بجائے کوئی اور طریقہ سوچو۔" اس نے اپنی مجبوری بتاتے ہوئے انکار کر دیا۔

"مجھے چلانے کی کوشش مت کرو سنتھیا! میں ورما ہوں اور اچھی طرح جانتا ہوں کہ تمہارا سب سے اہم مہرہ ابھی سلامت ہے۔ تم اسے یہ ڈیوٹی سونپ دو تو وہ ہر حال میں کامیاب لوٹے گی۔" وہ مکاری سے بولا۔

"تم اتنے ہی حالات سے واقف ہو تو یہ بھی جانتے ہو گے کہ وہ پہلے ہی ایک اہم کام میں مصروف ہے اور اسے اس کی جگہ سے نہیں ہلایا جا سکتا۔ پہلے ہی اس کے لیے حالات بہت مشکل ہیں۔" سنتھیا نے تختی سے جواب دیا۔

"مجھے اس کے حالات کا اچھی طرح علم ہے اور یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ چاہے تو کسی بھی بہانے دو چار دن کے لیے خلاصی پا سکتی ہے۔ اشیش ہمارے لیے اتنا اہم نہیں ہوتا

تو میں تم پر زور نہیں دیتا۔ مجھے اشیش والا مسئلہ ہر صورت حل کرنا ہے۔" سنتھیا پر اپنی باخبری کا رعب جھاڑنے کے بعد وہ آخر میں کچھ نرم پڑ گیا۔

"اوکے! میں دیکھتی ہوں کہ تمہارے لیے کیا کرسکتی ہوں۔ پھر جو بھی پوزیشن ہوگی، تمہیں اس سے آگاہ کردوں گی۔" اس بار سنتھیا نے بھی نرم رویہ اختیار کیا۔ وہ ایک مانی ہوئی سیکرٹ ایجنٹ تھی جو برسوں سے را اور موساد دونوں کے لیے کام کررہی تھی۔ آج تک اس کی ڈبل ایجنٹ والی حیثیت نہیں کھل سکی تھی۔ درحقیقت وہ موساد کے لیے کام کرتی تھی اور را میں اس کی شمولیت کا مقصد محض موساد کے مفادات کا تحفظ تھا۔ را کے اعلیٰ سطحی افسران اس کی خدمات کو سراہتے تھے کیونکہ وہ پاکستان میں رہ کر بڑی کامیابی سے پاکستان کے خلاف کارکردگی دکھاتی رہتی تھی۔ موساد کی طرف سے بھی اسے کچھ اسی قسم کی ذمے داریاں سونپی گئی تھیں لیکن ان ذمے داریوں میں کچھ اضافہ اس حوالے سے ہوجاتا تھا کہ اسے را والوں کے تمام اقدامات سے موساد کے بڑوں کو آگاہ رکھنا ہوتا تھا۔ یقینا موساد میں بھی کچھ ایسے لوگ ہوں گے جو درحقیقت را کے مفادات کے لیے کام کرتے ہوں گے۔ سنتھیا بہرحال ایسے کسی مشکوک فرد سے واقف نہیں تھی اور پوری تن دہی سے اپنی ذمے داریاں پوری کررہی تھی۔ ان ذمے داریوں میں سے ایک بظاہر الگ تھلگ رہ کر افیون کی کاشت اور ہیروئن کی تیاری کے سلسلے میں چودھری کی کارکردگی پر نظر رکھنا بھی شامل تھا۔ وہ ان دنوں جس قسم کی زندگی گزار رہی تھی، کوئی شک نہیں کرسکتا تھا کہ وہ کس قدر خطرناک عورت ہے۔ اس کی بظاہر سادہ اور بےضرر شخصیت کے پیچھے جو سیکرٹ ایجنٹ موجود تھی، اس تک کسی کا پہنچنا آسان نہیں تھا اور وہ ہر سے اعلیٰ افسران سے اہم ملکی راز اگلوانے سے لے کر بم دھماکے کروانے تک سب کچھ کر گزرتی تھی۔

"صرف کوشش نہیں کرنی، ہر حال میں یہ کام کرنا ہے۔" اس کے نرم پڑتے ہی ورنا نے مزید زور دیا۔

"اوکے! تم بےفکر رہو۔ تمہارا کام ہوجائے گا۔" بالآخر اس نے ہامی بھرہی لی۔

"تھینکس! تم نے ہاں کردی ہے تو اب میں سچ مچ بےفکر ہوگیا ہوں۔" اس بار ورنا خوش ہوگیا اور چند ایک مزید رسمی جملے بول کر فون کال کا سلسلہ منقطع کردیا۔ ورنا سے جان چھوٹتے ہی وہ دوسری اہم کالز میں مصروف ہوگئی۔ اسے اشیش کمار سے ایسی کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ اس کی خاطر اپنی کسی اہم ایجنٹ کو مشکل میں ڈالتی لیکن مجبوری یہ تھی کہ ایک طرف اسے را سے اپنی وفاداری کو ثابت کرنا تھا تو دوسری طرف وہ کرنل توحید کو نظرانداز نہیں کرسکتی تھی۔ اسے امید تھی کہ اس پر کام کرکے وہ پاکستان کے کئی اہم راز معلوم کرسکتی ہے، چنانچہ رسک لینا مجبوری تھا۔

☆☆☆

"تم نے مجھے جو ڈیوائس بھجوائی تھی، میں نے اس کا معائنہ کروالیا ہے۔ تمہارا اندازہ درست تھا۔ وہ واقعی ایک نہایت حساس نوعیت کا مائیکروفون ہے جس کی مدد سے کافی طویل فاصلے سے بھی تمہاری گفتگو سنی جاسکتی تھی۔" ذیشان اسے جو کچھ بتارہا تھا، وہ پہلے ہی سمجھ چکا تھا اس کے باوجود دھچکا سا لگا تھا۔ وہ تو اپنی دانست میں پوری رازداری سے دشمنوں کے خلاف برسرپیکار تھا لیکن اب یہ جان کر کہ دشمن تو کب کا اس کے گھر میں نقب لگا چکا ہے، اپنی ہی جگہ چور سا بن گیا تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ اس کے ساتھ یہ کھیل کب سے کھیلا جارہا ہے اور اس کے کون کون سے راز ابھی تک دشمنوں کے ہاتھ لگ چکے ہیں۔

"میں تمہیں ایک ڈیٹیکٹر بھجوانے والا ہوں۔ اس ڈیٹیکٹر کی خصوصیت ہے کہ وہ مائیکروفون اور جاسوسی کے لیے استعمال ہونے والے دیگر آلات کو بڑی مہارت سے پکڑ لیتا ہے۔ تم پر نظر رکھنے کے لیے جو طریقہ کار استعمال کیا جارہا ہے، اس کے توڑ کے لیے میرا بھیجا ہوا ڈیٹیکٹر بہت کارآمد ثابت ہوگا۔" دوسری طرف ذیشان نے اپنی گفتگو کا سلسلہ جاری رکھا ہوا تھا۔

"تھینک یو ذیشان! مجھے واقعی ایسی کسی چیز کی ضرورت محسوس ہورہی ہے۔"

"تمہیں شکریہ ادا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ تم ہماری صفوں میں شامل ہو اس لیے تمہارے مسائل کو حل کرنا ہمارا فرض ہے۔" ذیشان نے اسے جواب دیا اور مزید سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے بولا۔ "میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا اور اب موجودہ حالات کو دیکھتے ہوئے بھی یہ مشورہ دوں گا کہ اپنے قرب و جوار میں ایسے شخص کو تلاش کرو جو یہ سب کررہا ہے۔ یہ مت سوچو کہ تمہارے اردگرد موجود سارے لوگ تمہارے وفادار ہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ ہمیشہ قریب ترین لوگ ہی غداری کے مرتکب ہوتے ہیں۔ تمہارے شک ظاہر کرنے پر میں نے سی ایف پی کے اپنے یونٹ میں موجود ایک ایک فرد کو کھنگالنا شروع کردیا ہے۔ اس یونٹ میں موجود ہر شخص ایسا ہے جس کے کریڈٹ پر کوئی نہ کوئی کارنامہ موجود ہے اور وہ ادارے اور ملک سے اپنی وفاداری کو ثابت کرچکا ہے۔ لیکن تمہارے شک ظاہر کرنے کے بعد میرے لیے ہر شخص مشکوک ہوگیا ہے۔ اب میں اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھوں گا جب تک اپنے درمیان موجود اس غدار کو ڈھونڈ نہ نکالوں گا یا پھر یہ کہ میرے لوگ بےقصور ثابت ہوجائیں گے۔" ذیشان بہت گمبھیر لہجے میں بول رہا تھا۔ اس نے یہ بات نوٹ کی تھی کہ جب سے ذیشان نے سی ایف پی کو جوائن کیا تھا، بےحد سنجیدہ ہوگیا تھا اور پہلے سے کہیں زیادہ ذمے دار محسوس ہونے لگا تھا۔

"میں تمہارے مشورے پر ضرور عمل کروں گا۔ درحقیقت حالات ایسے ہیں کہ میں خود اسی نہج پر سوچنے کے لیے مجبور ہوگیا ہوں۔" اس نے ذیشان کو یقین دہانی کروائی۔

"وش یو گڈ لک۔ امید رکھو کہ حالات تمہارے قابو میں آجائیں گے اور کسی صورت اپنا مورال گرنے نہ دو۔" ذیشان یقینی طور پر اس کی کیفیات کو سمجھ رہا تھا چنانچہ گفتگو کا سلسلہ منقطع کرنے سے پہلے اسے حوصلہ دینا ضروری سمجھا۔ اس کے خلوص کو دل کی گہرائیوں سے محسوس کرتے ہوئے اس نے ایک گہرا سانس لیا اور بنگلے کے اندرونی حصے میں جانے کے لیے پلٹ گیا۔ احتیاط کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس فون کال کے لیے اس نے اندر کسی کمرے تک محدود رہنا مناسب نہیں سمجھا تھا اور لان کی کھلی فضا میں ذیشان سے گفت و شنید کی تھی۔

"آپ کہاں تھے؟ میں آپ ہی کو دیکھ رہی تھی۔ ابھی اسٹڈی میں جھانک کر آئی ہوں کہ آپ زیادہ تر وہیں پائے جاتے ہیں لیکن آپ شاید کہیں باہر نکل گئے تھے۔" وہ جیسے ہی اندر داخل ہوا، ماریا نے اسے دیکھتے ہی بولنا شروع کردیا۔ اس نے اس دوران غور سے اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا لیکن وہاں ایسی کوئی بات نہیں تھی جس سے اسے اندازہ ہوتا کہ وہ اس کے ساتھ کسی قسم کی دھوکا دہی کررہی ہے۔ وہی معمول کا لب و لہجہ تھا اور وہی چہرے پر موجود سادگی اور سنجیدگی۔۔۔ وہ اس کو مشکوک افراد کی فہرست میں سب سے اوپر رکھنے کے باوجود اس پر شک کرنے میں تذبذب کا شکار تھا۔

"کہیں گم نہیں ہوا، یہیں تھا بس ذرا دیر کے لیے لان میں چہل قدمی کے لیے گیا تھا۔" اس نے جواب دیا اور آگے بڑھ کر ایک نشست سنبھال لی۔ موبائل پر گفتگو کا ذکر اس لیے بھی جان بوجھ کر گول کردیا تھا کہ یہ نمبر بس مخصوص لوگوں کے لیے ہی تھا۔ دفتری امور اور میل جول کے لیے وہ الگ موبائل استعمال کرتا تھا۔ ماریا کے بیوی ہونے کے باوجود اس نے کبھی اسے یہ نمبر دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی بلکہ ایک طرح سے احتیاط ہی برت رہا تھا کہ کبھی یہ سیٹ کسی کے ہاتھ میں نہ جانے پائے۔ اپنی اس احتیاط کی وجہ سے اسے خاصا اطمینان تھا کہ یہ نمبر کسی غیر محفوظ ہاتھ تک نہیں پہنچا ہوگا۔

"اصل میں، میں آپ کو انفارم کرنا چاہ رہی تھی کہ کل میرا لاہور جانے کا پروگرام ہے۔ ایک فرینڈ کا فون آیا تھا۔ جس ہاسٹل میں، میں جاب کرتی تھی، وہاں کی انتظامیہ کی کوششوں سے ڈاکٹرز کا ایک سیمینار منعقد کیا جارہا ہے۔ موضوع اچھا ہے اور میری اس میں دلچسپی بھی ہے تو میں نے سوچا کہ شرکت کرلی جائے۔ تانج کے ساتھ ساتھ پرانے فرینڈز اور کولیگز سے ملاقات کا موقع بھی مل جائے گا۔"

"اینجوائے یور وش۔ مشابرم خان تمہیں لاہور پہنچادے گا۔" اس نے بغیر کسی حیل و حجت کے اسے اجازت دے دی۔ ویسے بھی وہ اس سے اجازت نہیں مانگ رہی تھی، صرف اطلاع دے رہی تھی اور وہ اس کے اس رویے پر یوں بھی معترض نہیں تھا کہ ابتدا سے ہی اس نے ماریا پر اس قسم کی پابندیاں عائد نہیں کی تھیں کہ وہ کوئی بھی کام کرنے سے پہلے اس سے اجازت طلب کرے۔ اس کے نزدیک ماریا ایک باشعور، سمجھ دار اور تعلیم یافتہ عورت تھی جسے پوری پوری آزادی حاصل ہونی چاہیے تھی۔

"تین روزہ سیمینار ہے۔ ہوسکتا ہے ایک دو دن میں مزید وہاں دوستوں کے ساتھ گزاروں۔ اتنے دن مشابرم خان وہاں رکا تو آپ کو پریشانی ہوگی۔" اس نے کسی خیال رکھنے والی بیوی کی طرح فکرمندی کا اظہار کیا۔

"مشابرم خان تمہیں چھوڑ کر واپس آجائے گا۔ وہاں ماموں جان کا ڈرائیور ہوگا تم کہیں بھی آنے جانے کے لیے اس کے ساتھ چلی جانا۔ واپسی کے لیے دیکھ لیتے ہیں کہ کیا صورت بنے گی۔ ہوسکتا ہے کہ دو تین دن میں خود میرا لاہور کا چکر لگ جائے ورنہ تم فون کردینا تو میں مشابرم خان کو بھجوا دوں گا۔" وہ بہت سہولت سے اس کے سامنے تجاویز پیش کر رہا تھا۔ اس کے لہجے میں ایسا کوئی شائبہ نہیں تھا کہ وہ اسے شک کی نظر سے دیکھنے لگا ہے۔ اور حقیقت بھی یہی تھی کہ وہ ابھی تک دل سے اس پر شک کر بھی نہیں رہا تھا۔

"سوری، میں آپ کو بتانا بھول گئی۔ جی کا بھی میرے ساتھ لاہور جانے کا پروگرام ہے۔ آپ کو یاد ہی ہوگا کہ میں نے آپ کو بتایا تھا کہ وہ کتنی سوشل خاتون تھیں اور انہیں صرف اور صرف میری وجہ سے یہاں ایک گاؤں میں آکر رہنا پڑ رہا

ہے۔ بے شک وہ اپنی زبان سے شکوہ نہیں کرتیں لیکن مجھے تو احساس ہے کہ میری وجہ سے ان کی زندگی بالکل تنہا ہو گئی ہے۔ اسی لیے جب میرا لاہور جانے کا پروگرام بنا تو میں نے انہیں بھی اپنے ساتھ چلنے کی آفر کر دی۔ میرا خیال تھا کہ جتنا وقت میں اپنی مصروفیت میں گزاروں گی، ممی اپنے احباب سے ملاقات کر لیں گی۔ باقی بچا کھچا وقت ہم دونوں ماں بیٹی ایک ساتھ گزار لیں گے۔ انہوں نے میری آفر قبول کر لی لیکن اس شرط کے ساتھ کہ ہم کسی ہوٹل میں اسٹے کریں گے۔ ایکچوئلی انہیں ماموں جان کے گھر میں رکنا اچھا نہیں لگ رہا۔ ظاہری طور پر کافی ماڈرن نظر آنے کے باوجود وہ مشرقی ویلیوز کو اہمیت دیتی ہیں۔ اس لیے بیٹی کے سسرال میں رہنا پسند نہیں کرتیں۔ پھر ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ ان کے وقت بے وقت آنے جانے سے ماموں جان وغیرہ ڈسٹرب ہوں گے۔"

"ٹھیک ہے، جب تم سب کچھ طے ہی کر چکی ہو تو میں تمہارے پروگرام کو خراب کرنے والا کون ہوتا ہوں۔ البتہ یہاں سے لاہور تک تم مشابرم خان کے ساتھ ہی جانا کیونکہ مجھے تمہارا پبلک ٹرانسپورٹ سے جانا بالکل اچھا نہیں لگے گا اور میرے خیال میں تمہاری ممی بھی اس میں کوئی حرج محسوس نہیں کریں گی۔" اس نے نہایت سکون سے ماریا کی ساری بات سنی اور آخر میں اپنا فیصلہ سنایا۔

"تھینک یو شہریار! مجھے خوشی ہے کہ آپ کو میرا اتنا خیال ہے۔ میرے ساتھ ممی کی مجبوری نہیں ہوتی تو میں خود بھی ماموں جان کی کوٹھی پر رکنا پسند کرتی۔ آفرین آنٹی اتنی خیال کرنے والی خاتون ہیں کہ ان سے مل کر ہمیشہ ہی اچھا لگتا ہے۔ اب بھی مجھے جیسے ہی موقع ملا، ان سے ملاقات کے لیے ضرور جاؤں گی۔" اس نے مشابرم خان کے ساتھ جانے پر کوئی اعتراض نہیں کیا بلکہ خوشی کا اظہار کرتے ہوئے اپنے ارادے سے بھی آگاہ کیا۔

"اس سلسلے میں میری طرف سے تمہارے اوپر کوئی زبردستی نہیں ہے۔ تمہارا دل چاہے اور تم سہولت محسوس کرو تو ممانی جان سے ملنے چلی جانا ورنہ کوئی پابندی نہیں ہے۔ البتہ مجھے یہ فکر ضرور رہے گی کہ تم وہاں کنوینس کے لیے پریشان رہو گی۔"

"پریشانی کیسی؟ میں کرائے پر کوئی کار لے لوں گی یا پھر ہوٹل سے بھی ایسی کوئی سہولت مل جائے گی۔ آج کے دور میں اس قسم کی باتوں کے لیے کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔" اس نے بے نیازی سے شانے اچکاتے ہوئے جواب دیا تو شہریار اس کی اس ادا کو دیکھتا رہ گیا۔ مڈل کلاس سے تعلق رکھنے والی ڈاکٹر جو اس سے شادی کے نتیجے میں اپر کلاس میں داخل ہو گئی تھی، کیسے اسے بتا رہی تھی کہ پیسے کے بل بوتے پر کون سے مسائل حل ہو سکتے ہیں اور کیسی سہولتیں حاصل کی جا سکتی ہیں۔

"ٹھیک ہے، جو مناسب سمجھو کرو۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔" اس نے کل اختیارات ماریا کو سونپ دیے تو وہ خوش ہو گئی اور فرطِ جذبات سے اس کے قریب چلی آئی۔

"تھینک یو سو مچ شہریار! آپ سچ مچ بہت اچھے ہیں۔" صوفے پر اس کے پہلو میں بیٹھ کر اس نے گرم جوشی سے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے اپنے جذبات کا اظہار کیا۔

"اور تم اس بہت اچھے شوہر کو اکیلا چھوڑ کر جا رہی ہو؟" اس نے بھی شکوہ کرنے میں دیر نہیں لگائی۔

"دو چار دن کی تو بات ہے۔ اگر آپ نہیں چاہتے تو میں نہیں جاتی۔" وہ اس کے کچھ اور بھی قریب ہو بیٹھی اور اپنی ٹھوڑی اس کے بازو پر ٹکاتے ہوئے ایک ادا سے بولی۔

قربت کے ان لمحات میں شہریار نے اپنے جسم میں سنسناہٹ سی محسوس کی۔ یہ عورت اس کی بیوی تھی اور انہوں نے خلوت میں ایک دوسرے کے بھیدوں کو خوب جانا تھا لیکن شاید کچھ بھید ایسے تھے جو دل کے نہاں خانوں میں ہی چھپے رہ گئے تھے اور ان بھیدوں تک رسائی کے لیے اسے ماریا کو ڈھیل دینی ہی تھی۔ چنانچہ خود کو سنبھالتا ہوا نرمی سے بولا۔ "میں نے تو صرف مذاق کیا تھا۔ تمہیں معلوم ہے کہ میں زبردستی کرنے والا آدمی نہیں ہوں۔ اگر تم لاہور جانا چاہتی ہو تو ضرور جاؤ۔ میں اپنی خاطر تمہیں قطعی نہیں روکوں گا۔"

"سو کیوٹ۔" ماریا نے جھک کر اس کا رخسار چوما۔ "مجھے معلوم تھا کہ آپ کا یہی جواب ہوگا۔" وہ بہت خوش تھی۔

"سارے ذہین شوہر بیوی کی بات مانتے ہیں۔ میں نے کون سا کمال کیا ہے؟" اس نے بھی ہنس کر جواب دیتے ہوئے خوش مزاجی کا ثبوت دیا۔ موجودہ حالات میں دل کی ہر بات دل میں ہی رکھنی ضروری تھی کیونکہ اگر ماریا مجرم تھی تو اسے اس کی کسی بات پر شک میں مبتلا ہو کر چوکنا ہونے کا موقع نہیں ملنا چاہیے تھا۔ بصورتِ دیگر بھی یہ راز، راز ہی رہتا تو اچھا تھا، ورنہ ایک شک کا اظہار اس کی ازدواجی زندگی کو تباہ کر دیتا۔

"آپ کی شرافت کی گواہ ہوں جب ہی تو یہاں بیٹھ کر چھیڑ چھاڑ کر رہی ہوں۔" ماریا نے بھی شہریار کا ساتھ دیتے ہوئے اس کے بازو پر ہلکی سی چٹکی لی۔ اس کی آنکھوں سے

جھلکتی شرارت نے اسے کچھ اور بھی دل ربا بنا دیا تھا۔ شہریار پُرسوچ نگاہوں سے اسے دیکھتا رہ گیا۔ ایسا کچھ تو تھا اس عورت میں کہ وہ اس سے محبت نہ کرنے کے باوجود اس کی قربت میں زندگی گزار رہا تھا۔

"مجھے ایسے نہ دیکھیں۔ یہ ہمارا بیڈروم نہیں ہے۔" وہ کچھ اور شریر ہوئی۔

"تو چلو پھر وہیں چلتے ہیں۔" اس نے بھی جوابی وار کیا۔

"آپ چلیں، مجھے تو اپنے لاہور کے سفر کے لیے پیکنگ کرنی ہے۔" اس نے یکدم ہی بڑی جھنڈی دکھا دی اور ہنستی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ وہ خود کون سا خواہش مند تھا، سو وہیں آنکھیں موند کر بیٹھ گیا۔ ماریا کے لاہور کے سفر کے لیے اسے خود بھی تو تیاری کرنی تھی اور سوچنا تھا کہ کیا لائحہ عمل اختیار کرے۔

☆☆☆
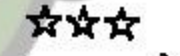
ماریا اور اس کی ممی سویرے ہی مشابرم خان کے ساتھ لاہور کے لیے روانہ ہو گئی تھیں۔ اس نے مشابرم خان کو اچھی طرح اس کی ڈیوٹی سمجھا دی تھی۔ بظاہر وہ ان دونوں کو ان کے پسندیدہ ہوٹل تک ڈراپ کرنے کے بعد واپس آ جاتا لیکن حقیقت میں اسے وہیں رہ کر ان دونوں کے معمولات کی نگرانی کرنی تھی۔ اس مقصد کے لیے وہ شہریار کی گاڑی کو رانا ہاؤس میں چھوڑ دیتا اور خود اپنے لیے موٹر سائیکل کرائے پر لے لیتا۔ شہریار کی گاڑی ماریا کے لیے جانی پہچانی ہونے کی وجہ سے نگرانی کے لیے غیر موزوں تھی۔ اس گاڑی کو استعمال کرنے کی صورت میں مشابرم خان فوراً ہی نظر میں آ جاتا۔ موٹر سائیکل کے استعمال کا یہ فائدہ تھا کہ ایک تو موٹر سائیکل سوار کے لیے خود کو کسی کونے کھدرے میں چھپا لینا آسان تھا اور تعاقب کرتے ہوئے بھی وہ ہیلمٹ کے استعمال سے اپنا چہرہ چھپا سکتا تھا۔

مشابرم خان اس کی ساری ہدایات بغیر کسی حیل و حجت کے سنتا رہا تھا۔ یہاں تک کہ اس کے چہرے پر بھی ایسا کوئی تاثر نہیں ابھرا تھا جس سے یہ ظاہر ہوتا کہ اسے شہریار کے اپنی بیوی کی نگرانی کروانے پر حیرت یا کسی قسم کا تجسس ہے۔ وہ واقعی اپنے کام سے کام رکھنے والا ایک نہایت وفادار آدمی تھا جس کے لیے حکم کی بجا آوری ہی سب سے اہم تھی اس کے باوجود شہریار اس کے سامنے خفت محسوس کر رہا تھا اور جانتا تھا کہ زبان و تاثرات سے کسی قسم کا اظہار نہ کرنے کے باوجود مشابرم خان کے ذہن میں سوالات نے جنم تو ضرور لیا ہوگا۔

ہو سکتا ہے کہ وہ سوچ رہا ہو کہ صاحب کو اپنی بیوی کے کردار پر شک ہے اور یہ ایک قابلِ شرم بات تھی۔ لیکن مجبوری یہ تھی کہ وہ ماریا والے معاملے کو نظرانداز بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اگر بات اس کے ذاتی مفاد کی حد تک ہوتی تو شاید وہ طرح دے بھی جاتا لیکن یہ ملکی سالمیت کا معاملہ تھا۔ پچھلے کچھ عرصے میں جس طرح کے واقعات سامنے آتے رہے تھے، اس سے صاف ظاہر تھا کہ ملک دشمن ایجنسیاں خصوصاً را کے پٹھو پوری طرح سے سرگرم ہیں اور پاکستان کی سالمیت کے در پے ہو چکے ہیں۔ دیکھا جائے تو اس قسم کے لوگوں سے نمٹنا اس کے فرائضِ منصبی میں شامل نہیں تھا لیکن ایک محب وطن پاکستانی کی حیثیت سے وہ خود کو اس جنگ سے الگ تھلگ نہیں رکھ سکتا تھا۔ اسے اسی ملک میں جینا مرنا تھا تو وہ اس ملک کے لیے جینے مرنے کا بھی حوصلہ رکھتا تھا۔ ملکی مفادات کے آگے اسے کوئی شخص اور رشتہ عزیز نہیں تھا۔ نہ ہی وہ اپنی ناک بچانے کے لیے اس معاملے کو مزید ٹال سکتا تھا۔ البتہ اس نے اتنی احتیاط ضروری کی تھی کہ ذیشان کو اس معاملے میں ملوث کرنے کے بجائے مشابرم خان سے کام لے رہا تھا کیونکہ مشابرم خان اس کے لیے ہر فرد سے زیادہ قابلِ اعتماد تھا۔ اسے معلوم تھا کہ ہر دو صورتوں میں بات اس کی ذات سے آگے نہیں بڑھے گی اور اگر ماریا بےقصور ثابت ہوئی تو وہ اپنی ازدواجی زندگی کو پہلے ہی کی طرح چلاتا رہے گا۔ دوسری صورت میں ماریا کو اس کے بدترین انجام سے بھی کوئی نہیں بچا سکتا تھا۔

اس معاملے کو ہر زاویے سے سوچ لینے کے باوجود وہ شدید اضطراب کا شکار تھا۔ دفتری امور بھی اسی بے چینی کے ساتھ انجام دیے جا رہے تھے۔ عبدالمنان نے تجویز پیش کی تھی کہ آج نور پور کا دورہ کر لیتے ہیں تاکہ وہاں جاری ترقیاتی کاموں کا جائزہ لیا جا سکے لیکن اس نے یہ ذمے داری اس کے شانوں پر ڈال کر خود جانے سے انکار کر دیا تھا۔ معمول کے کاموں کی انجام دہی کے دوران ماہ پانو اور اسلم کے شناختی کاغذات بھی اس تک پہنچ گئے اور مشابرم خان کا فون بھی آ گیا کہ وہ ماریا اور اس کی ممی کو لاہور پہنچا چکا ہے۔ اس موقع پر شہریار نے اسے ہدایت دی کہ وہ خود ہوٹل کے سامنے سے ہٹ کر گاڑی رانا ہاؤس پہنچانے کی کوشش نہ کرے۔ اس کام کے لیے وہ رانا ہاؤس فون کر کے کسی ملازم کو بھیج دے گا اور وہی ملازم اس کے لیے موٹر سائیکل بھی فراہم کر دے گا۔ اس نے یہ نئی ہدایت اس خیال سے دی تھی کہ یہ نہ ہو کہ مشابرم خان گاڑی پہنچانے رانا ہاؤس جائے اور اس دوران ماریا اپنی ممی کے ساتھ کہیں روانہ ہو جائے۔ یہ احکامات جاری

کرنے کے بعد اسے قدرے اطمینان ہوا تھا کہ جلد یا بدیر بلی تھیلے سے باہر آجائے گی۔ لیکن بہرحال، وہ مکمل طور پر پرسکون نہیں ہو سکتا تھا۔ اضطراب کی اس کیفیت سے گزرتے ہوئے اسے ماہ بانو کی کال موصول ہوئی۔

"تم نے بہت اچھے موقع پر فون کیا ہے۔ تمہارے کاغذات مجھ تک پہنچ چکے ہیں اور اب تم دونوں جب چاہو سول میرج کر سکتے ہو۔" اس نے خوش دلی کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اسے اطلاع دی۔

"ہم تو فوری طور پر یہ کام کرنا چاہتے ہیں لیکن اصل مسئلہ آپ کا ہے۔ آپ نے وعدہ کیا تھا کہ آپ میری شادی میں ضرور شرکت کریں گے۔" ماہ بانو نے اسے یاد دلایا۔

"مجھے اپنا وعدہ بہت اچھی طرح یاد ہے۔ تم جب کہو گی، میں پہنچ جاؤں گا۔" اس نے بڑے وقار سے جواب دیا۔ یہ الگ بات تھی کہ دل میں ایک ملال سا تھا۔ وہ اسے نہیں پا سکا تھا یہ دکھ اپنی جگہ لیکن اسے ماہ بانو کا جیون ساتھی کے طور پر ایک مفرور ڈاکو کو منتخب کرنا بھی اچھا نہیں لگا تھا۔

"اگر میں کہوں کہ آج ہی تو کیا آپ آجائیں گے؟" وہ جانے کیوں اسے آزمانے پر تلی ہوئی تھی۔

"ہاں، مجھے تھوڑی مشکل تو ضرور ہوگی لیکن میں ضرور آجاؤں گا۔" اس نے صاف لہجے میں جواب دیا تو کچھ دیر کے لیے لائن پر خاموشی سی چھا گئی پھر ماہ بانو کی نم ناک سی آواز سنائی دی۔

"تو پھر آجائیں۔ دیر ہو گئی تو کہیں میرے لیے اپنے وعدے کی پاسداری کرنا مشکل نہ ہو جائے۔" اس ایک جملے میں کیا نہیں تھا۔ وہ اپنی جگہ تڑپ سا گیا۔ اس چھوٹی سی لڑکی کے جذبے کوئی اس سے پوشیدہ تو نہیں تھے جو وہ اس کی کیفیت کو محسوس نہ کر سکتا یا اسے اتنی بات سمجھ نہیں آتی کہ اس کا اسلم سے شادی کا فیصلہ محض ایک سمجھوتا ہے۔

"جب دل نہیں مانتا تو خود پر جبر کیوں کرتی ہو؟ مت کرو یہ شادی۔ میں تمہیں تنہا ہی ملک سے باہر بھجوا دوں گا۔ باہر رہ کر تم اطمینان سے اپنی تعلیم مکمل کرنا اور جب تمہیں اپنے معیار کا کوئی شخص ملے تو اس سے شادی کر لینا۔ ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے؟ اتنا بڑا فیصلہ کرنے کے لیے تمہارے پاس ابھی بہت وقت ہے۔" اس نے اسے سمجھانے کی ایک اور کوشش کی۔

"وقت کی بات رہنے دیں اے ایس پی صاحب! کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ انسان ساری زندگی کسی فیصلے پر نہیں پہنچ پاتا اور کبھی زندگی بھر کے فیصلے ایک لمحے میں ہو جاتے ہیں۔ رہی میری کم عمری کی بات تو یہ آپ بھی جانتے ہیں کہ میں اتنی سی عمر میں جتنے تجربات سے گزر چکی ہوں، عام طور پر لڑکیاں ساری زندگی میں بھی اتنے برے تجربات سے نہیں گزرتیں۔ اس لیے مجھ میں انسانوں کی پرکھ بھی عام لڑکیوں کے مقابلے میں تھوڑی زیادہ ہے۔ آپ کا قانون چاہے اسلم کو کسی بھی نام سے پکارے، میرے نزدیک وہ حالات کا مارا ہوا ہے جو بہت آسانی سے سنبھل جائے گا اور اپنی مثبت خصوصیات کے ساتھ زندگی گزار سکے گا۔" وہ کسی جہاندیدہ عورت کی طرح اس کی بات کا جواب دے رہی تھی۔

"اگر تم اسلم کو صرف ہمدردی میں اپنا رہی ہو تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہارے اس سے شادی کیے بغیر بھی اسے ملک سے باہر نکلوا دوں گا تاکہ وہ پوری آزادی کے ساتھ اپنی نئی زندگی کی شروعات کر سکے۔" وہ ہر حال میں اسے اس کے غلط فیصلے سے روک لینا چاہتا تھا۔

"میں اسلم کو بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔ اس کی نئی زندگی کے آغاز کے لیے میرا وجود آکسیجن کی طرح لازم و ملزوم ہے۔ اس نے بڑی شدت سے میرے ساتھ جینے کا خواب دیکھا ہے۔ میں اسے نہ ملی تو وہ جی نہیں سکے گا۔" اس نے نہایت دردمندی سے بتایا۔

"لگتا ہے اسے بہت قریب سے جاننے لگی ہو؟" جانے کیوں وہ طنز کر گیا۔ جواباً ماہ بانو کچھ نہیں بولی تو اسے خود ہی اپنی زیادتی کا احساس ہوا۔

"سوری، میں کچھ زیادہ ہی بول گیا ہوں۔ تم مجھے ایڈریس بتاؤ کہ میں کہاں پہنچوں؟ میں ابھی آدھے گھنٹے میں یہاں سے روانہ ہو جاؤں گا۔ اگر تمہاری تقدیر میں لکھا ہے تو تمہاری شادی آج ہی کی تاریخ میں اسلم سے ہو گی۔" شرمندگی کا اظہار کرتے کرتے آخر میں اس کا لہجہ پرعزم ہو گیا۔

"آپ ایسا کیجیے کہ مینار پاکستان پر پہنچ جائیں۔ پھر جہاں بھی جانا ہوگا، ہم ساتھ چلیں گے۔" ذرا دیر سوچنے کے بعد ماہ بانو نے اس سے کہا تو اس نے رضامندی ظاہر کرتے ہوئے سلسلہ منقطع کر دیا اور خود عبدالمنان کو بلا کر اسے ہدایات دینے لگا۔ ان ہدایات میں عبدالمنان کو آج کے دن نور پور جانے سے منع کرنا بھی شامل تھا۔ یہ کام اس کے بجائے دفتر کا کوئی دوسرا بندہ بھی کر سکتا تھا۔ اس کی غیر موجودگی میں البتہ عبدالمنان کا یہاں رہنا بہت ضروری تھا۔ اسے ہدایات دینے کے بعد اس نے چند ایک مزید ضروری امور نمٹائے اور حسب وعدہ آدھے گھنٹے میں دفتر سے روانہ ہو گیا۔ اس کی ذاتی گاڑی میں تو اس وقت مشابرم خان ماریا کو لاہور چھوڑنے گیا ہوا تھا اس لیے ناچار اسے دفتر کی گاڑی استعمال کرنی پڑی۔ گاڑی وہ خود ڈرائیو کر رہا تھا اور عبدالمنان کی پیشکش کے باوجود اس نے کسی اور ڈرائیور کو ساتھ لے جانا پسند نہیں کیا تھا۔ مشابرم خان کی بات پھر بھی الگ تھی لیکن اس وقت وہ جس نوعیت کے کام سے جا رہا تھا، کسی دوسرے شخص کو اپنے ساتھ لے جانا گوارا ہی نہیں کر سکتا تھا۔ ماہ بانو کا معاملہ اتنا نازک تھا کہ وہ اس کے سلسلے میں اپنے سائے پر بھی بھروسا کرنے میں ڈرتا تھا۔ وہ خانماں برباد لڑکی اگر اس کی کسی کوتاہی کے سبب مزید مشکل میں پڑ جاتی تو وہ سخت پچھتاوا اور ندامت محسوس کرتا۔ اس پچھتاوے سے بچنے کے لیے ہی تو وہ اس کے لیے بہت کچھ قانون کی حدود سے نکل کر بھی کرنے کے لیے راضی ہو گیا تھا۔ اگر وہ آباد ہو جاتی تو اسے اپنے دل کی بربادی کا ذرا ملال نہ ہوتا۔

خیالوں میں غلطاں وہ مسلسل آگے بڑھتا چلا گیا لیکن پھر تھکن کا سا احساس ہونے لگا۔ یہ تھکن اس سفر کی نہیں تھی۔ کئی دن سے اس کا ذہن الجھا ہوا تھا۔ کل رات بھر بھی وہ ماریا کے کردار کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔ اعصابی کشیدگی نے ایسے ڈھنگ سے ناشتا بھی نہیں کرنے دیا تھا اور وہ پہلے دفتری مصروفیات کے بعد اب اس سفر میں مبتلا ہو گیا تھا۔ گاڑی بھی ذاتی نہیں تھی اس لیے چلانے میں تھوڑی سی الجھن ہو رہی تھی۔ اس نے مناسب سمجھا کہ راستے میں رک کر کہیں سے گرما گرم چائے پی لے تاکہ طبیعت تھوڑی فریش ہو جائے۔ عام حالات میں وہ جب بھی لمبے سفر پر نکلتا تھا راستے کی ضروریات کے مطابق سامان گاڑی میں رکھوا لیتا تھا، لیکن آج کچھ عجلت کے باعث اور کچھ اپنی ذہنی کیفیت کے سبب ایسی کوئی تیاری نہیں کی تھی اور گاڑی میں سوائے سادہ پانی کی بوتل کے خورونوش کی کوئی شے موجود نہیں تھی۔

ذہن میں رکنے کا خیال آیا تو اس نے آنے والے پہلے ہوٹل پر ہی گاڑی روک لی۔ اس ہوٹل پہ اترنے کے بعد اسے یاد آیا کہ یہ وہی مقام ہے جہاں سے اس کی زندگی میں بہت بڑی تبدیلی رونما ہوئی تھی۔ ماریا سے شادی کا فیصلہ اس ہوٹل کے ہی ایک چھوٹے سے کمرے میں قیام کا مرہون منت تھا۔ یہاں اس نے اپنی ذات کا فخر و غرور لٹا دیا تھا اور پھر تاوان میں عمر بھر کے لیے ماریا کا ساتھ قبول کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ آج بھی اپنی زندگی کے ان تاریک لمحوں پر حیران ہوتا تھا جب ماریا کے وجود نے اس سے اس کی ساری

سدھ بدھ چھین لی تھی۔ مانا کہ وہ حسین اور پرکشش تھی لیکن اس کی زندگی میں خوب صورت لڑکیوں کی کون سی کمی رہی تھی جو وہ ماریا کے ساتھ تنہائی ملتے ہی آپے سے باہر ہو گیا۔ قدموں کی وہ لغزش آج اس کے جی کا جنجال بنی ہوئی تھی اور وہ ماریا کو گلے میں پھنسی ہوئی ہڈی کی طرح نہ تو نگل سکتا تھا اور نہ اگل سکتا تھا۔

"یہ لو صاحب! اسپیشل دودھ پتی ہے۔" اس کی فرمائش پر نہایت پھرتی سے اس کی ٹیبل تک چینک اور پیالی پہنچانے والے ہوٹل کے چھوٹے نے مخصوص لب و لہجے میں اس کے قریب آکر کہا تو وہ سامنے دھری چائے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ چھوٹا آرڈر پورا کر کے فوراً ہی وہاں سے ہوا ہو گیا تھا۔ یہ ایک خاصا معروف ہوٹل تھا جہاں پرائیویٹ کاروں سے لے کر عام بسوں میں سفر کرنے والے مسافروں تک سب ہی رکتے تھے۔ اسی وجہ سے ہوٹل کے مختصر سے عملے کو خاصا فعال رہنا پڑتا تھا۔ وہ چائے کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیتا ہوا یونہی اپنے اردگرد پھیلی افراتفری کا جائزہ لینے لگا۔ وہ وقت ایسا تھا کہ زیادہ تر لوگ چائے پینے پر ہی اکتفا کر رہے تھے۔ بس اِکا دُکا ہی افراد ایسے تھے جن کے آگے کھانے کی پلیٹیں نظر آ رہی تھیں۔ کھانے کا اصل وقت ڈیڑھ دو گھنٹے بعد ہوتا۔ پھر یقیناً ترتیب الٹ جاتی اور وہاں چائے نوشوں کے بجائے کھانا تناول کرنے والوں کا رش بڑھ جاتا۔

اپنی فراغت اور تنہائی کے باعث آزادی سے اردگرد کی ٹیبلوں کا جائزہ لیتے ہوئے اپنے سے کچھ فاصلے پر موجود ایک چہرے کو دیکھ کر وہ ذرا چونک گیا۔ وہ چہرہ اسے کچھ شناسا لگا تھا لیکن عجیب بات یہ ہوئی کہ اس سے نظر ملتے ہی وہ شخص کچھ بوکھلا سا گیا اور فوراً ہی چائے کی پیالی ہونٹوں سے لگا کر منہ پھیر لیا۔ اس شخص کے اس ردعمل نے اسے حیرت میں مبتلا کر دیا۔ وہ جب اس شخص کی طرف متوجہ ہوا تھا تو وہ پہلے ہی سے اسے دیکھ رہا تھا لیکن نظر ملنے پر نہ صرف فوراً ہی انجان بن گیا بلکہ کچھ اس طرح سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا جیسے اس کی سرے سے شہریار کی طرف توجہ ہی نہ ہو۔ اس کے اس ردعمل پہ بے چینی محسوس کرنے کے باوجود وہ انجان بن گیا اور چائے ختم کر کے اس کا بل ادا کرنے تک دانستہ خود کو انجان ہی ظاہر کرتا رہا۔ لیکن اسے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ جب وہ بل کی ادائیگی کے بعد وہاں سے اٹھا تو اس شخص نے بھی بہ عجلت اپنی جگہ چھوڑ دی اور اس سے بھی زیادہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا باہر نکل گیا۔ شہریار باہر نکل کر اپنی گاڑی میں بیٹھا تو وہ شخص بھی پیچھے کچھ فاصلے پر کھڑی اپنی گاڑی اسٹارٹ کرنے لگا۔ اس

شخص کا انداز ایسا تھا کہ شہریار چونک گیا اور اپنی گاڑی میں بیٹھنے کے باوجود تذبذب کے باعث انجن اسٹارٹ نہیں کر سکا۔ پچھلی گاڑی میں موجود شخص نے البتہ اس کا انتظار نہیں کیا اور اپنی گاڑی آگے نکال لے گیا۔ اس کی اس حرکت سے شہریار کے دل میں جو موہوم سا اندیشہ پیدا ہوا تھا کہ شاید وہ شخص اس کا تعاقب کر رہا ہے، وہ دور ہو گیا لیکن اس کے ذہن میں پیدا ہونے والی الجھن ہنوز اپنی جگہ موجود تھی۔

اس نے گاڑی ہوٹل سے آگے بڑھالی تھی، اس کے باوجود اس شخص کا خیال اپنے ذہن سے نہیں جھٹک سکا تھا۔ اسے رہ رہ کر یہ خیال آرہا تھا کہ اس شخص کی صورت اسے شناسا کیوں محسوس ہورہی تھی؟ آخرکار آدھے گھنٹے کی مغزماری کے بعد اس کے ذہن میں روشنی سی چمکی۔ اس شخص کو وہ اس سے قبل بھی مذکورہ ہوٹل میں ہی دیکھ چکا تھا۔ شاید وہ وہاں ویٹر تھا اور جس روز وہ ماریا کی طبیعت کی خرابی کی وجہ سے وہاں رکا تھا، یہی شخص ماریا کی مطلوبہ دوائیں لینے کسی قریبی قصبے وغیرہ تک گیا تھا لیکن آج تو اس کی جون ہی بدلی ہوئی تھی۔ وہ کہیں سے بھی اس معمولی ہوٹل کا ملازم نہیں لگ رہا تھا۔ اس کے جسم پر بیش قیمت لباس تھا اور وہ جس گاڑی میں گیا تھا وہ بھی لاکھوں کی مالیت کی تھی۔ جانے قلیل عرصے میں اس کی ایسی کیا کایا پلٹ ہوئی تھی کہ وہ بالکل بدل کر رہ گیا تھا۔ کچھ دیر وہ مزید سوچتا رہا لیکن پھر یہ خیال آنے پر کہ خواہ مخواہ اپنی توانائیاں ایک غیر متعلق شخص کے متعلق سوچنے میں برباد کر رہا ہے، آنے والے خیالات کو ذہن سے جھٹک دیا لیکن دماغ کو چین ہی کہاں تھا۔ کبھی ماریا کی تصویر پردۂ خیال پر ابھرتی تو کبھی ماہ بانو کی متوقع شادی کا خیال آجاتا اور دل ہی دل میں وہ اسلم پر رشک کرنے لگتا جسے اتنا انمول اور معصوم حسن ملنے والا تھا۔ جانے وہ دلہن بن کر کیسی لگتی۔ بری لگنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بس یہ سوچتا تھا کہ اس کے حسن کے سامنے چاند شرما کر بادلوں میں چھپ جاتا ہے یا سورج کو اپنی ضیا کم لگتی ہے۔ اس کے معصوم حسن کے سامنے تو مس ورلڈ کا تاج اور کئی حسینوں کی آن اسے مستند ٹھہرایا ہوا حسن بھی بے معنی تھا پھر دلہن کے روپ کی تو بات ہی الگ ہوتی ہے۔ عام سی لڑکی بھی جب ارمانوں کے ساتھ سہاگ کا جوڑا پہنتی ہے تو کھلی ہی معلوم ہوتی ہے لیکن جانے ماہ بانو کے لیے کسی نے وہ خصوصی جوڑا خریدا بھی تھا یا نہیں۔

اس نے اسے مینار پاکستان پر بلوایا تھا اور ظاہر ہے اس عوامی جگہ پر تو وہ سولہ سنگھار کیے دلہن کے روپ میں جلوہ افروز نہیں ہو سکتی تھی۔ یعنی وہ بغیر سج دھج کے ہی دلہن بنتے جارہی تھی۔ یہ خیال ذہن میں آیا تو اس کے دل پر ایک گھونسا سا پڑا۔ آخر ہر لڑکی کی طرح اسے بھی تو حق تھا کہ سہاگ کا سرخ سہ پہلا جوڑا پہنے۔ لیکن اس کا ایسا کوئی عزیز تھا ہی کب جو اس کے لیے یہ اہتمام کرتا۔ وقت کے گرداب میں پھنسی اس لڑکی کا ہر رشتہ تو اس سے چھین لیا گیا تھا۔ اس کے پیاروں میں سے کچھ کو موت نے نگل لیا تھا اور کچھ ویسے ہی اس سے جدا ہو گئے تھے۔ شاید اپنی اسی شدید تنہائی کی وجہ سے اس نے اپنی شادی کے اہم موقع پر اسے مدعو کیا تھا یقیناً اپنا واحد عزیز مان کر.... تو پھر اس کا بھی فرض بنتا تھا کہ اس کا مان رکھتے ہوئے اپنے بے نام رشتے کا حق ادا کرتا۔

وہ لاہور کی حدود میں داخل ہوا تو اس کی گاڑی کا رخ خودبخود ہی ایک بڑے شاپنگ سینٹر کی طرف ہو گیا۔ اس شاپنگ سینٹر میں ایسے کئی بوتیکس تھے جہاں وہ بھاری رقم کے عوض فوری طور پر تیار شدہ برائیڈل ڈریس خرید سکتا تھا۔ گاڑی شاپنگ سینٹر کی پارکنگ میں کھڑی کر کے اس نے رسٹ واچ میں وقت دیکھا، وہ کافی تیز رفتاری سے آیا تھا اس لیے وقت کی خاصی بچت ہو گئی تھی اور ماہ بانو سے مینار پاکستان پر ملنے وہ دن کی روشنی میں آرام سے پہنچ سکتا تھا۔ اس بات کا اطمینان ہو گیا تو اس نے قدم ایک مشہور بوتیک کی طرف بڑھا دیے۔ ویسے ماضی میں اسے اس قسم کی شاپنگ کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ یہاں تک کہ اس کی اپنی شادی کے موقع پر بھی ساری خریداری آفرین رانا نے ہی کی تھی لیکن اسے یقین تھا کہ وہ ماہ بانو کے لیے ایک عمدہ عروسی جوڑے کا انتخاب کرنے میں کامیاب رہے گا۔

وہ بوتیک میں داخل ہوا تو سیلز گرل نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا اور اس کی خریداری کی نوعیت جان کر مہذبانہ لہجے میں بولی۔ ”اگر آپ کے پاس وقت ہے تو میں آپ کو کیٹلاگ دکھا دیتی ہوں۔ کیٹلاگ کی مدد سے آپ اپنی پسند کے ڈریس کا آرڈر دے سکتے ہیں اور اس میں اپنی پسند کے مطابق ردوبدل بھی کروا سکتے ہیں۔ ہمارا بوتیک طے شدہ وقت پر آپ کا آرڈر تیار کر دے گا۔“

”نہیں، میرے پاس بالکل بھی وقت نہیں ہے۔ میں ابھی ابھی بالکل تیار شدہ ڈریس خریدنا چاہتا ہوں۔“ ظاہر ہے اس کا جواب یہی ہونا چاہیے تھا جسے سن کر سیلز گرل نے ذرا سا تامل کیا اور پھر اپنی ایک ہیلپر کی مدد سے اسے تیار شدہ عروسی جوڑے دکھانے لگی۔ وہ سارے ہی جوڑے یقینی طور پر قیمتی اور بیش قیمت تھے لیکن اسے کوئی ایک بھی ماہ بانو کے لیے نہیں جچ رہا تھا۔ سیلز گرل خندہ پیشانی سے اس کی بے زاری برداشت کر رہی تھی۔ اس کی ہیلپر بھی تن دہی سے ڈبے نکال نکال کر لا رہی تھی۔ اتفاق سے اسی وقت سیلز گرل کے موبائل پر کوئی کال آنے لگی اور وہ اسے ایکسکیوز کرتی ہوئی ایک سائڈ پر ہو کر کال سننے لگی۔ اس دوران ہیلپر لڑکی نے اسے انتظار کی زحمت سے دوچار نہیں کیا اور خود ملبوسات نکال کر دکھانے لگی۔ اس کے دکھائے ہوئے ایک سرخ عروسی جوڑے نے شہریار کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ قندھاری انار جیسے سرخ رنگت والے اس جوڑے کا کپڑا بے حد نفیس تھا جسے رنگ برنگے پتھروں کے امتزاج سے بوجھل کیا گیا تھا۔ جوڑا اصلی ہوئی حالت میں بالکل تیار تھا اور اسے دیکھ کر شہریار کو یوں لگا تھا جیسے یہ ماہ بانو کے لیے ہی تیار کیا گیا ہو۔

”مجھے یہ ڈریس خریدنا ہے۔“ اس نے فوراً ہی لڑکی کو اپنی پسند سے آگاہ کیا۔

”اوہ! ایمن! تم نے یہ سوٹ کیوں دکھایا۔ اسے تو مسز تجویر نے اپنی بیٹی کے لیے آرڈر پر تیار کروایا ہے۔“ اسی اثنا میں کال سننے کے لیے ایک سائڈ پر ہو جانے والی سیلز گرل نے واپس آکر اپنی ہیلپر کو ٹوکا اور پھر اس کی طرف متوجہ ہوتی ہوئی کاروباری مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ ”سوری سر! میری اسسٹنٹ نے غلطی سے آپ کو کسی اور کا آرڈر کیا ہوا ڈریس دکھا دیا ہے۔ آپ اس کے علاوہ کوئی اور ڈریس دیکھ لیں۔ ہمارے بوتیک پر اس سے بھی زیادہ خوب صورت اور قیمتی برائیڈل ڈریسز موجود ہیں۔ یقیناً آپ کو ان میں سے کوئی ضرور پسند آئے گا۔“

”سوری مس! مجھے یہی چاہیے۔ آپ اپنی اونر سے معلوم کر لیں، ہو سکتا ہے وہ اس سلسلے میں کچھ کر سکیں۔ مجھے بہرحال، یہ سوٹ ابھی اور ہر قیمت پر چاہیے۔“ اس نے اپنا مافی الضمیر پوری وضاحت سے بیان کر دیا جسے سن کر سیلز گرل کے چہرے کے تاثرات کچھ بدل سے گئے اور وہ نہایت حلیمانہ مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

”آپ ضد کر رہے ہیں تو میں میڈم سے بات کر کے دیکھتی ہوں۔ آپ پلیز کچھ دیر یہاں بیٹھ کر ویٹ کر لیں۔“ وہ کاؤنٹر کے پیچھے سے نکل کر باہر آئی اور اپنی اسسٹنٹ سے بولی۔ ”ایمن! ان صاحب کو ان کی پسند کے مطابق چائے، کافی یا جو بھی یہ لینا چاہیں سرو کرو۔ میں ابھی میڈم سے ڈسکس کر کے آتی ہوں۔“ اس کے نظروں سے اوجھل ہوتے ہی ایمن نامی لڑکی شہریار کی خدمت پر کمربستہ نظر آنے لگی لیکن اس وقت وہ کچھ بھی کھانے پینے کے موڈ میں نہیں تھا اس لیے صاف لفظوں میں انکار کر کے یونہی وہاں بیٹھا رہا اور بے مقصد ادھر ادھر نظریں گھمانے لگا۔ بوتیک کی بناوٹ خوب صورت تھی اور وہاں تعمیر میں شیشوں اور آئینوں کا بے تحاشا استعمال کیا گیا تھا۔ شیشوں والی دیواروں کی وجہ سے باہر سے ہی اندر موجود ملبوسات نظر آنے لگتے تھے اور گاہک خودبخود ہی اندر کھنچے چلے آنے پر مجبور ہو جاتے تھے.... جبکہ آئینوں کا استعمال یقیناً اس لیے کیا گیا تھا کہ خواتین ملبوسات کو اپنے ساتھ لگا کر اندازہ کر سکیں کہ کون سا رنگ اور جوڑا ان پر جچ رہا ہے۔ مقصد بہرحال جو بھی رہا ہو، وہ تو اس وقت ایک آئینے میں اس چہرے کی جھلک دیکھ کر بھونچکا رہ گیا جسے دوران سفر بھی ہوٹل پر دیکھ کر چونکا تھا لیکن پھر نظرانداز کر دیا تھا۔ اس چہرے کا آج ہی کے دن میں اتنی جلدی دوبارہ نظر آنا محض اتفاق نہیں ہو سکتا تھا۔

”کیا یہ شخص میرا تعاقب کر رہا ہے؟ لیکن کیوں؟“ اس کے ذہن میں سوالات ابھرے۔ وہ تو ہوٹل سے اس کے گاڑی آگے نکال لے جانے پر اس کی طرف سے قطعی بے پروا ہو گیا تھا لیکن اب حالات بتا رہے تھے کہ یہ بے پروائی مناسب نہیں تھی۔ اب بھی وہ بے شک آئینے میں اس کے چہرے کی ایک جھلک ہی دیکھ سکا تھا لیکن یہ ضروری تھا کہ پوری طرح ہوشیار رہے۔ ”مبارک ہو سر! میں نے میڈم کو آپ کے حق میں راضی کر لیا ہے۔ ہم مسز تجویر کو ان کا آرڈر دوبارہ تیار کر کے دے دیں گے لیکن ظاہر ہے کہ وقت کی کمی کی وجہ سے ہمیں کافی مشکلات اور اخراجات کا سامنا کرنا پڑے گا جس کے لیے آپ کو زحمت اٹھانی پڑے گی۔“ بوتیک کی مالکن سے مذاکرات کے لیے جانے والی سیلز گرل نے اسے خوش خبری سنانے کے ساتھ ساتھ کاروباری سی تمہید بھی باندھنا شروع کر دی۔

وہ اس تمہید کا مقصد سمجھ سکتا تھا چنانچہ نہایت سنجیدگی سے بولا۔ ”آپ مجھے پرائس بتا دیں۔“ جواباً سیلز گرل نے اسے ایک ہوشربا رقم بتائی جو یقیناً عام حالات میں اس جوڑے کی قیمت سے دگنی تگنی ہی تھی لیکن وہ کسی قسم کی بحث نہیں کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ خاموشی سے کریڈٹ کارڈ کی مدد سے پے منٹ کر دی اور پیک شدہ عروسی جوڑے کا ڈبا لیے بوتیک سے باہر نکل گیا۔ اب اسے پروگرام کے مطابق مینار پاکستان کی طرف جانا تھا لیکن اس طرف کا رخ کرنے سے پہلے اسے اپنے تعاقب کار کو بھی دیکھنا تھا۔ حالات کو دیکھتے ہوئے اس نے ماہ بانو کو موبائل پر اپنی لاہور آمد کے بارے میں باخبر کر دیا تاکہ وہ کسی اندیشے کا شکار نہ ہو لیکن فوری طور پر مینار پاکستان تک پہنچنے سے منع کر دیا اور اسے ہدایت دے دی کہ وہاں آنے

کے لیے وہ اس کے فون کا انتظار کرے۔ اس طرف سے فارغ ہوکر وہ پوری طرح اپنے تعاقب کی طرف متوجہ ہوگیا۔ بہت جلد اس کی نظروں نے اس گلکس کو تلاش کرلیا جو کافی فاصلے سے اس کے پیچھے چلی آرہی تھی۔ تعاقب کرنے والا بہت ہوشیاری سے اس کے پیچھے آرہا تھا۔ اگر اس نے بیک ویو کے آئینے میں اس کے چہرے کی جھلک نہ دیکھ لی ہوتی تو بھی اندازہ نہیں کرسکتا تھا کہ کوئی اس کے پیچھے ہے۔

اس نے فیصلہ کیا کہ اس شخص سے پیچھا چھڑانے کے بجائے اچھی طرح نمٹتا ہے تاکہ کھل کر اپنے دشمنوں کو دیکھ سکے۔ اپنے پاس پسٹل کی موجودگی کی یقین دہانی کرنے کے بعد اس نے جان بوجھ کر آہستہ آہستہ گاڑی مصروف شاہراہوں کے بجائے ایسے راستے پر ڈال لی جہاں کم سے کم ٹریفک تھا اور پھر بالکل ہی سنسان راستے کی طرف نکل پڑا۔ گلکس اس کے پیچھے تھی اور فاصلہ کافی زیادہ ہونے کے باوجود وہ درمیان میں دوسری گاڑیاں نہ ہونے کے سبب اسے صاف دیکھ سکتا تھا۔ اس موقع پر اس نے ایک خطرناک قدم اٹھایا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ جس سڑک سے گزر رہا ہے، آگے جاکر اس پر دائیں جانب ایک راستہ نکلے گا۔ اس نے یکدم ہی اپنی گاڑی کی رفتار بہت تیز کردی اور جیسے ہی دائیں جانب جانے والا وہ راستہ نظر آیا، سیدھی چلتی گاڑی کو اس پر موڑ لیا اور پھر گاڑی بیک کرکے پہلے والے راستے پر واپس آیا لیکن اب اس کی گاڑی آگے کے بجائے واپس پیچھے کی طرف دوڑ رہی تھی۔ یعنی اب اس کی گاڑی اور گلکس کا رخ ایک دوسرے کی جانب تھا۔ گلکس کو ڈرائیو کرنے والا یقیناً صورت حال میں آنے والی اس اچانک تبدیلی پر کچھ گڑبڑا گیا تھا اور خود کو انجان ظاہر کرکے وہاں سے نکلنا چاہتا تھا اس لیے ہارن پر ہارن دے کر شہریار کو راستہ دینے کا اشارہ کرنے لگا لیکن اس کا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ سڑک کی چوڑائی کم ہونے کی وجہ سے وہ اپنی کوشش میں کامیاب بھی تھا اور گاڑی کے بالکل درمیان میں ہونے کی وجہ سے گلکس والے کے پاس یہ گنجائش نہیں تھی کہ وہ دائیں یا بائیں سے نکل سکے۔ دونوں گاڑیوں کا تصادم ہونے سے قبل اس نے بریک لگا کر جھٹکے سے اپنی گاڑی روک لی۔ گلکس ڈرائیور نے بھی عین اسی وقت یہی قدم اٹھایا۔ یقینی طور پر وہ ڈر گیا تھا کہ کہیں یہ پاگل آدمی اپنی گاڑی کو میری گاڑی سے نہ ٹکرا دے۔

"یہ کیا جہالت ہے؟ کیا تم اپنے ساتھ ساتھ مجھے بھی مارنا چاہتے ہو؟ تم جیسے پاگل آدمی کو گاڑی چلانے کی اجازت کس نے دی ہے؟" دونوں گاڑیاں چند فٹ کی دوری پر ایک دوسرے کے سامنے رکیں تو گلکس والا دہاڑتا ہوا باہر نکلا۔ وہ اپنے رویے سے بالکل ایسا ظاہر کررہا تھا جیسے وہ ایک بے قصور انجان ہو اور سڑک پر ایک انجان آدمی کی غلطی پر اسے غصے سے ٹوک رہا ہو۔ اس کے برعکس نے شہریار پُرسکون انداز میں اپنی گاڑی سے باہر آیا اور اس پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے اس بات کا اندازہ لگالیا کہ اس کی دائیں جانب کی ابھری ہوئی جیب میں کوئی ہتھیار موجود ہے۔

"میری شکل کیا دیکھ رہے ہو، اپنی گاڑی ایک طرف کرو تاکہ میں اپنی گاڑی آگے نکال سکوں۔" اس کے پُرسکون انداز نے اس شخص کو تھوڑا سا گڑبڑا دیا تھا لیکن وہ اپنی کیفیت کو طیش دکھا کر چھپانے کی کوشش کررہا تھا۔

"تم اتنے ناراض کیوں ہورہے ہو مسٹر! میں نے تو تمہارے ساتھ تعاون کے لیے گاڑی روکی ہے۔ مجھے تم پر رحم آرہا تھا کہ خواہ مخواہ پچھلے کئی گھنٹوں سے میرے پیچھے گھومنے میں اپنا پیٹرول پھونک رہے ہو۔ ایسا کرو کہ تم میری گاڑی میں ہی آکر بیٹھ جاؤ اس طرح تم زیادہ زحمت سے بچ جاؤ گے۔" اس کا لہجہ بے شک پُرسکون اور ٹھہرا ہوا تھا لیکن انداز میں ایسی کاٹ تھی کہ وہ شخص بوکھلا کر رہ گیا۔

"تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے..... مجھے کیا ضرورت پڑی ہے کہ میں تمہارے پیچھے گھوموں؟" وہ بظاہر اپنی مدافعت کررہا تھا لیکن اس کا جسم اس طرح سے تن گیا تھا کہ لگتا تھا وہ بضرورت پڑنے پر کچھ بھی کر گزرنے کا ارادہ رکھتا ہو۔

"میرے پاس اس غلط فہمی کی بڑی ٹھوس وجہ ہے۔ میں اتنے زیادہ اتفاقات کا قائل نہیں ہوں کہ یہ مان سکوں کہ تم اتفاق سے اس ہوٹل میں میرے ساتھ تھے، اتفاق سے میرے ساتھ ساتھ لاہور پہنچ گئے۔ اتفاق سے اس شاپنگ سینٹر میں بھی پائے گئے جہاں میں موجود تھا اور اب اتفاق سے ہی اس سڑک پر بھی میرے ساتھ موجود ہو۔ صاف صاف بتاؤ کہ میرا پیچھا کیوں کررہے ہو؟" آرام سے بولتے بولتے آخر میں اس کا لہجہ بالکل سرد ہوگیا۔

"تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔" ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہتے ہوئے وہ اپنے موقف پر ڈٹا ہوا تھا۔

"میں اپنی اس غلط فہمی کو دور کرنا چاہتا ہوں۔ تم میرے ساتھ میری گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔ اگر میری تسلی ہوگئی تو تمہیں چھوڑ دوں گا۔" وہ اس وقت بالکل مختلف موڈ میں تھا۔

"دفع ہوجاؤ یہاں سے ورنہ میں تمہیں گولی ماردوں گا۔" اس شخص نے ہیجان زدہ ہوکر جیب سے ریوالور نکال لیا۔

"تو ٹھیک ہے۔ ماردو گولی۔" وہ اطمینان سے بولا۔

اب وہ بے چارہ عجیب تذبذب کے عالم میں تھا۔ یقیناً اس کی ڈیوٹی صرف تعاقب اور نگرانی تک تھی اور وہ کسی پھڈے میں نہیں پڑنا چاہتا تھا لیکن یہاں عجیب مشکل میں پڑ گیا تھا۔ اسے اور کچھ سمجھ نہیں آیا تو دفعتاً اپنے ریوالور کا رخ اوپر کی طرف کیا اور چند ہوائی فائر داغ دیے۔ شہریار گویا موقع کی تلاش میں تھا۔ اس نے پھرتی سے اس شخص پر جست لگائی اور ایک زوردار گھونسا اس کی ٹھوڑی پر رسید کیا۔ وہ شخص لڑکھڑایا اور اس سے قبل کہ سنبھلتا، شہریار نے اس کے ریوالور والے ہاتھ پر کھڑی ہتھیلی کا زوردار وار کیا۔ ضرب اتنی زوردار تھی کہ اس کے ہاتھ سے ریوالور نکل کر دور جاگرا۔ اب اس کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ خود بھی مقابلے پر ڈٹ جاتا چنانچہ پلٹ کر شہریار پر حملہ آور ہوا۔ وہ یقیناً اس کے پیٹ میں اپنے سر سے ٹکر مارنا چاہتا تھا لیکن وہ عین وقت پر جھکائی دے گیا اور دونوں ہاتھ آگے پھیلا کر اس کے بازوؤں کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ مقابل دبلا پتلا اور درمیانی قامت کا تھا پھر وہ باقاعدہ ورزش کا عادی مارشل آرٹس کا تربیت یافتہ تھا چنانچہ بازو گرفت میں آئے تو پھر اسے ہلنے نہیں دیا اور دونوں ہاتھوں پر اٹھا کر اپنے سر سے گزارتے ہوئے عقب میں پھینک دیا۔ عقب میں پھینکے گئے دشمن کا انجام دیکھنے کے لیے وہ فوراً ہی اچھل کر کھڑا ہوگیا اور اس کی طرف رخ کیا۔ اتنی بیدردی سے پھینکے جانے پر اس کا خاصا برا حشر ہوا تھا۔ پکی سڑک سے ٹکرا کر سر پھٹ گیا تھا اور ہاتھ پیروں میں بھی خراشیں آئی تھیں۔

"بہتر ہے کہ اب تم شرافت سے میری گاڑی میں بیٹھنے کے لیے تیار ہوجاؤ ورنہ ابھی صرف ڈینٹ پینٹ ہی پڑے ہیں، مزید گڑبڑ کرنے کی صورت میں، میں تمہیں کئی ٹکڑوں میں تقسیم کرکے بھی اپنے ساتھ لے جاسکتا ہوں۔" اس نے مار دھاڑ کے سلسلے کو طول دینے کے بجائے جیب سے پسٹل نکالا اور اسے سرد مہری کے ساتھ حکم دیا۔

"میں بے قصور ہوں۔ تم خواہ مخواہ میرے پیچھے پڑ گئے ہو۔" وہ سڑک پر اٹھ بیٹھا تھا اور سر سے بہتے خون کو آنکھوں میں جانے سے روکنے کے لیے بازو کو ماتھے پر پھیلا لیا۔ اپنی اس بہت کلاسی کے بعد بھی وہ اس بات پر مصر تھا کہ شہریار اسے ایک غیر متعلق شخص مان کر چھوڑ دے لیکن ایسا کہاں ممکن تھا۔ چنانچہ بے پروائی کے انداز میں بولا۔ "چلو خواہ مخواہ ہی سہی لیکن اب جبکہ میں تمہارے پیچھے پڑ ہی گیا ہوں تو اپنی تسلی کیے بغیر ہرگز نہیں چھوڑ سکتا۔ چلو اب سیدھے کھڑے ہوجاؤ اور اپنے دونوں ہاتھ پشت پر کرکے میری طرف پیٹھ کرکے کھڑے ہوجاؤ۔ یہ مت سوچنا کہ یہاں کوئی تمہاری مدد کے لیے آجائے گا۔ میں لاہور کی پیداوار ہوں اور یہاں کے چپے چپے سے واقف ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ اس راستے پر مشکل ہی سے کوئی گاڑی آتی ہے۔ اور آئی بھی تو یقین کرو کہ آنے والا صورت حال دیکھ کر دور ہی سے پلٹ جائے گا۔ کوئی نہیں بھی پلٹا تو تم یہ بات سمجھ سکتے ہو کہ ایک سرکاری افسر کی حیثیت سے میں تمہارے مقابلے میں بہت مضبوط پوزیشن پر ہوں۔ اور ہاں، تمہاری طرح میں ہتھیار کا استعمال کرنے میں بھی کسی تردد کا شکار نہیں ہوں گا۔ میرے پسٹل سے اگر فائر ہوا تو وہ لازماً تمہارے جسم کے کسی حصے میں چھید کرے گا۔ آگے تمہاری مرضی ہے کہ کیا کرتے ہو۔"

وہ واضح طور پر اسے ہنکا رہا تھا اور مقابل کو بھی اپنی کمزور پوزیشن کا احساس ہوچکا تھا چنانچہ چپ چاپ پلٹ گیا۔ اس کے پلٹتے ہی شہریار نے اپنے گلے سے ٹائی نکالی اور اس کے دونوں ہاتھ مضبوطی سے پشت پر باندھ دیے۔ اس سے مار دھاڑ میں لباس کی حالت پہلے ہی تھوڑی سی خراب ہوگئی تھی، اب رہی کی عدم موجودگی کے باعث ٹائی سے ہاتھ دھونے پڑے۔

''آگے بڑھو۔'' اس نے حکم دیا تو وہ ناچار آگے بڑھ گیا۔

''پائدان میں جھک کر بیٹھ جاؤ۔'' گاڑی کا اگلا دروازہ کھول کر اس نے ایک اور نادر شاہی حکم جاری کیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس شخص کے ذہنی تھوڑے کی وجہ سے راستے میں کسی پریشانی کا سامنا کرنا پڑے اس لیے اس کا پائدان میں فٹ ہونا مناسب تھا۔ اس شخص نے مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق اس کے حکم کی تعمیل کی۔ اس کی طرف سے مطمئن ہو کر شہریار نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ آگے کلنکس کی موجودگی کے باعث وہ سیدھا گاڑی نکال کر نہیں لے جا سکتا تھا چنانچہ ریورس گیئر میں ڈال کر دائیں جانب کے موڑ تک گیا اور پھر وہاں سے گاڑی کو سیدھی سڑک پر ڈال دیا۔ اب اس کے سامنے یہ مسئلہ تھا کہ اس شخص کو کہاں لے جائے؟ لاہور میں اس کا واحد ٹھکانا رانا ہاؤس تھا جہاں کا وہ ظاہر ہے رخ نہیں کر سکتا تھا۔ ایسے میں اس کا دھیان ذیشان کی طرف گیا تو اس نے فوراً اسے کال ملا دی۔

''میں ایک مشتبہ شخص کو پوچھ گچھ کے لیے کسی محفوظ مقام تک پہنچانا چاہتا ہوں۔ تم بتاؤ کہ کیا میں تمہارے دفتر کا رخ کر سکتا ہوں؟'' بنا کسی رسمی گفتگو کے اس نے اپنے مطلب کا سوال کیا۔

''کیا مطلب؟ کیا تم لاہور میں ہو؟'' ذیشان نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں، میں کچھ دیر قبل ہی ایک نجی کام سے یہاں پہنچا ہوں لیکن یہاں پہنچتے ہی ایک مصیبت گلے پڑ گئی۔ میرے خیال میں اس شخص سے کافی کارآمد معلومات حاصل کی جا سکتی ہیں لیکن میں ایسے کسی ٹھکانے سے محروم ہوں جہاں اسے رکھ سکوں اس لیے تمہارے پاس آنا چاہتا ہوں۔'' اس نے مختصراً اپنا مقصد بیان کیا۔

''چلے آؤ۔ پچھلی طرف کے گیراج کا دروازہ تمہیں اپنے لیے کھلا ملے گا۔'' ذیشان نے حسب توقع امید افزا جواب دیا تو اس نے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے موبائل آف کر دیا اور پوری توجہ ڈرائیونگ کی طرف مبذول کر لی۔ راستوں کو دھیان میں رکھ کر گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے اس کے ذہن میں ماہ بانو کا بھی خیال تھا۔ وہ یقیناً اس کی منتظر ہوگی اور تیزی سے گزرتا وقت اسے تشویش میں مبتلا کر رہا ہوگا لیکن وہ جس جنجال میں پھنس گیا تھا، اس سے جان بھی تو نہیں چھڑا سکتا تھا۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہو سکتا تھا کہ وہ فوری طور پر اس شخص سے پوچھ گچھ میں الجھنے کے بجائے اسے ذیشان کے حوالے کرے اور پھر خود ماہ بانو سے رابطہ کرے۔ اسی نوعیت کی سوچوں میں الجھا وہ ذیشان کے دفتر تک کا راستہ طے کرتا رہا۔ اس دوران پائدان میں پھنسا شخص اگر ذرا بھی ہلتا جلتا تو وہ اپنے پسٹل کی نال اس کی پیٹھ میں چبھو کر اسے احساس دلا دیتا کہ وہ اس سے غافل نہیں ہے اس لیے وہ کسی حماقت کی کوشش نہ کرے۔ آخر کار راستہ تمام ہو گیا اور ذیشان نے خود گیراج میں اس کا استقبال کیا۔

''کسے اٹھا لائے؟'' اس سے مصافحہ کرتے ہوئے اس نے خوش دلی سے دریافت کیا اور ساتھ ہی اپنے ساتھ موجود ماتحت کو اس کی گاڑی میں موجود شخص کو اتارنے کا اشارہ بھی کیا۔

''حدود اربع تو فی الحال مجھے بھی موصوف کا معلوم نہیں، بس اس لیے اٹھا لایا ہوں کہ جناب منکر نکیر کی طرح میرے ساتھ ساتھ لگے ہوئے تھے۔'' اس نے بھی جواباً خوش گوار لہجہ اختیار کیا۔ حالانکہ وہ اندرونی طور پر اچھا خاصا ڈسٹرب تھا اور ماہ بانو کے نکاح کی ٹینشن اس کے سر پر سوار تھی۔

''حدود اربع ہم ابھی تمہارے سامنے اگلوا لیتے ہیں۔ ہمارے پاس تاریخ و جغرافیے کے بڑے بڑے محقق موجود ہیں جن کے سامنے بندے کے لیے کچھ بھی چھپانا ممکن نہیں رہتا۔'' ذیشان نے ذو معنی لہجے میں جواب دیا۔

''یہ کام تم اپنی نگرانی میں کروا لو۔ میں جس کام کے لیے آیا تھا، وہاں پہنچنے میں پہلے ہی کافی لیٹ ہو گیا ہوں۔'' اس نے رسٹ واچ میں وقت دیکھتے ہوئے رکنے سے معذوری ظاہر کی۔

''ہاں، تم نے بتایا تو تھا کہ کسی ذاتی کام سے لاہور آئے ہو۔ خیریت.... فیملی میں سب ٹھیک ٹھاک تو ہیں؟'' وہ اس کے فیملی ممبرز سے زبانی ہی سہی، خاصا واقف ہو گیا تھا اس لیے ذرا تشویش سے پوچھا۔

''الحمدللہ، سب ٹھیک ہیں۔ میں تو یہاں ایک شادی میں شرکت کے لیے آیا تھا۔'' اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

''شادی میں آئے ہو تو پھر جلدی کس بات کی؟ اس وقت تک تو شادی ہالز میں میزبان خود بھی نہیں پہنچے۔'' ذیشان نے حیرت کا اظہار کیا۔

''جلدی اس لیے ہے کہ یہ شادی کسی ہال وغیرہ میں نہیں بلکہ کورٹ میں انجام پانی تھی اور میں شاید وہ واحد مہمان ہوں جسے مدعو کیا گیا ہے۔ لیکن میں سوچ رہا ہوں کہ اس وقت تو کورٹ بند ہو چکا ہوگا اس لیے مجھے اپنی تاخیر کے ازالے میں خود کوئی متبادل انتظام کرنا ہوگا۔''

''اوہ! یہ تو بڑی عجیب شادی ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ دلہن یا دولہا میں سے کوئی ایک یقیناً بہت خوش قسمت ہے جس کے بلاوے پر تم نے اتنی دور سے دوڑ لگائی ہے۔'' وہ لوگ ابھی تک گیراج میں ہی کھڑے باتیں کر رہے تھے البتہ اس کا لایا ہوا آدمی اندر کہیں منتقل کیا جا چکا تھا۔

''تمہیں وہ لڑکی ماہ بانو تو یاد ہوگی جسے بلتستان کی پہاڑیوں میں قائم دشمنوں کے ایک خفیہ کیمپ میں قید کیا گیا تھا اور وہ وہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہونے کے بعد تمہارے پاس پہنچ گئی تھی؟'' اس نے سوچا کہ اس معاملے میں ذیشان کو شریک راز کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے اس لیے اسے تفصیل سے آگاہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

''اوہ یس، مجھے اچھی طرح وہ لڑکی اور تمہارا ڈرائیور مشابرم خان یاد ہیں۔ تم نے ان دونوں کو انٹیلی جنس کی تحویل سے چھڑانے کے لیے سخت جدوجہد کی تھی۔'' ذیشان کو فوراً ہی یاد آ گیا۔

''بالکل، میں اسی لڑکی کا ذکر کر رہا ہوں۔ دراصل وہ ایک تنہا اور پریشان حال لڑکی ہے جس کا اپنوں سے رابطہ بالکل ٹوٹ چکا ہے۔ اس نے اپنے لیے کسی شخص کا انتخاب کر لیا ہے اور چونکہ یہ اس کی خواہش اور میرا وعدہ تھا کہ میں اس کی شادی میں ضرور شرکت کروں گا، سو میں تمہیں یہاں نظر آ رہا ہوں لیکن جس ناہنجار کو میں اپنے ساتھ لایا ہوں، اس نے میرا سارا پروگرام چوپٹ کر دیا ہے۔ اس لیے میرا خیال ہے کہ اب مجھے اکلوتے مہمان کے علاوہ منتظم کی ذمے داریاں بھی سنبھالنی ہوں گی اور نکاح خواں وغیرہ کے لیے دوڑ دھوپ کرنی پڑے گی۔'' اس نے ذیشان کو اپنی پریشانی سے آگاہ کیا۔

''اگر یہ مسئلہ ہے تو میں اسے حل کر دیتا ہوں۔ تم میرے ساتھ اندر چلو اور چائے شائے پیو۔ نکاح خواں اور گواہان کا بندوبست میرے ذمے لیکن دولہا اور دلہن بہرحال تمہیں ہی فراہم کرنے ہوں گے۔'' ذیشان نے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ کہا اور اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اسے اندر کی طرف لے جانے لگا۔

''کیا یہ کام اس جگہ ہوگا؟'' اس نے تعجب سے پوچھا۔

''کیا حرج ہے۔ سی ایف پی والے بھی آخر کار انسان ہی ہیں۔ انہیں بھی حق ہے کہ اپنی خوشی کی تقریبات میں شرکت کر سکیں۔ اپنے کرنل توحید بھی کسی عزیز کی شادی میں شرکت کے لیے آج کل لاہور آئے ہوئے ہیں۔ بتانے کا مقصد یہ ہے کہ ہم کوئی دنیا سے ماورا لوگ نہیں ہیں۔ جو کام تم اور دوسرے لوگ کر سکتے ہیں، وہ ہم بھی کر سکتے ہیں۔'' وہ اسے اپنے کمرے تک لا چکا تھا۔

''ٹھیک ہے پھر سب تمہارے ہاتھ میں دیا۔ دولہا، دلہن کو میں ہدایت دے دیتا ہوں۔ تمہیں اپنا کوئی آدمی گاڑی سمیت مینار پاکستان پر بھیج کر انہیں یہاں بلوانا ہوگا۔ پہچان کے لیے کوئی شناختی علامت اور بالکل درست مقام کا تعین کر کے میں تمہیں ابھی بتا دیتا ہوں تاکہ تمہارے آدمی کو بھٹکنا نہ پڑے۔ تم بھی مجھے بھیجے جانے والے آدمی اور گاڑی کا مختصر تعارف کروا دو تاکہ میں دوسری پارٹی کو آگاہ کر سکوں۔'' اتنی آسانی سے اور انوکھے انداز میں اپنے مسئلے کو حل ہوتا دیکھ کر وہ پُرجوش ہو گیا۔ پھر گویا بہت سے کام خود بخود ہی ہوتے چلے گئے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ اور ذیشان اپنے اپنے موبائلز پر خاصے مصروف رہے تھے۔ آدھے گھنٹے بعد جب ماہ بانو اور اسلم کو وہاں پہنچایا گیا تو پھولوں اور مٹھائیوں کے ساتھ ساتھ کئی دوسری اشیائے خورونوش بھی آ چکی تھیں جنہیں وہ اہلکار ٹیبل پر سجا رہے تھے۔ وہ دونوں اس کے کہنے پر یہاں آ تو گئے تھے لیکن کچھ حیران پریشان سے نظر آ رہے تھے۔ البتہ ماہ بانو نے معاملہ فہمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کسی قسم کے سوال جواب نہیں کیے کہ وہ اس پر جس طرح کا اعتماد کرتی تھی، اس میں ایسی کوئی گنجائش نکلتی ہی نہیں تھی۔ اب بھی اس نے اپنی الجھن کا اظہار کرنے کے بجائے اس کا اور اسلم کا باہمی تعارف کروانا شروع کر دیا۔ بھیر ذیشان اس وقت کمرے میں موجود نہیں تھا ورنہ وہ اسے بھی شناخت کر لیتی اور وہ بھی اس رسم تعارف میں شامل ہو جاتا۔ بہرحال، اس وقت اس نے ان دونوں کو باہم متعارف کروایا۔

''ماہ بانو سے آپ کا کافی ذکر سنا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ سے اس اہم موقع پر ملاقات بھی ہو گئی۔'' اسلم نے اس سے معانقہ کرتے ہوئے خوش اخلاقی سے کہا۔ اس کی آواز سن کر شہریار بری طرح چونکا۔ یہ آواز اپنی انفرادیت کے ساتھ اس کے لیے شناسا تھی۔

''مجھے جہاں تک یاد پڑتا ہے، یہ ہماری تیسری ملاقات ہے۔ اس سے قبل بھی ہم دو بار مل چکے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ان دونوں مواقع پر آپ نے اپنا تعارف کروانا پسند نہیں کیا تھا۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے لہجے میں طنز کی کاٹ در آئی کیونکہ اسلم کی آواز سنتے ہی اسے وہ دونوں ناخوش گوار واقعات یاد آ گئے تھے۔ اسے تقریباً سو فیصد یقین تھا کہ ایک بار جب اسے اغوا کر کے جنگل میں رکھا گیا تھا اور دوسری بار جب اس کے نور کوٹ والے بنگلے پر ڈاکا پڑا تھا،

بھی شخص تھا جو حملہ آوروں کی کمانڈ سنبھالے ہوئے تھا۔

"آپ کی یادداشت یقیناً اچھی ہے لیکن میں اپنی زندگی کے وہ ابواب اپنی کتابِ زندگی سے پھاڑ کر پھینک چکا ہوں اور اب میرا آپ سے واحد تعارف یہی ہے کہ آپ ماہ بانو کے ہمدرد ہیں۔ اور چونکہ ماہ بانو مجھے اپنی جان سے بھی بڑھ کر عزیز ہے اس لیے میرے لیے آپ بھی واجب الاحترام ہیں۔ ماضی میں آپ کو مجھ سے جو بھی تکلیف پہنچی اس کے لیے میں آپ سے صرف معذرت ہی طلب کر سکتا ہوں۔" اسلم نے اس کے اندازے کی تردید نہیں کی بلکہ بہت شائستگی سے سب کچھ قبول کرتے ہوئے معافی بھی مانگ لی۔ البتہ ماہ بانو ذرا سی ہونق ہو گئی تھی کہ یہ کیا چکر ہے۔ اسے اسلم کے شہریار کے بنگلے پر ڈاکا مارنے کا تو علم تھا لیکن دوسرے واقعے سے ناواقف تھی اس لیے حیران ہو رہی تھی۔ پھر اسے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ شہریار واردات کے وقت نقاب میں رہنے والے اسلم کو صرف آواز کی وجہ سے پہچان چکا تھا۔

"تم احمقوں کی طرح یہاں کیا کھڑی ہو؟ اتنی سادہ اور بے دھج سے عاری دلہن میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی۔ قاضی صاحب بس پہنچنے ہی والے ہیں۔ تم ساتھ والے کمرے میں جا کر جلدی سے لباس تبدیل کر لو۔ میں اندازے سے تمہارے لیے ویڈنگ ڈریس لایا ہوں۔ امید ہے کہ تمہیں صحیح آ جائے گا۔" شہریار نے اسے گھرکا تو وہ اسی طرح حیران پریشان اس کے حکم کی تعمیل کے لیے روانہ ہو گئی۔

"ماہ بانو آپ کو بہت اہمیت دیتی ہے۔ میں خوش ہوں کہ آپ نے اس کی فرمائش پر ہماری شادی میں شرکت پر ہامی بھر لی ورنہ وہ بہت اداس ہوتی۔" ماہ بانو کے جانے کے بعد اسلم نے اس سے کہا۔ اب وہ دونوں کمرے میں موجود نشستیں سنبھال چکے تھے اور واقعی ہر پرانی بات بھول کر نئے حوالے سے ایک دوسرے سے مخاطب تھے۔

"میرے لیے بھی وہ بہت اہم ہے۔ مجھے اس کا اداس ہونا بالکل اچھا نہیں لگتا۔ تم اس سے شادی کر رہے ہو تو خیال رکھنا کہ اسے خوش بھی رکھ سکو۔" اسلم کی بات کے جواب میں ہی سہی اس کی زبان سے اظہار کے چند لفظ پھسل گئے تھے جنہیں وہ خود محسوس نہیں کر سکا تھا لیکن اسلم نے ان الفاظ کو اپنی پوری معنویت کے ساتھ محسوس کیا تھا۔ البتہ اسی وقت ذیشان قاضی صاحب کے ساتھ وہاں آ گیا تو ان کی گفتگو کا موضوع ہی بدل گیا۔ قاضی صاحب شہریار کے فراہم کردہ شناختی کاغذات کی مدد سے نکاح نامے کا فارم پر کرنے لگے۔ فارم پر ہونے تک ماہ بانو بھی وہاں چلی آئی۔ بھاری عروسی

جوڑے کا دوپٹا اس کے سر پر تھا۔ اس سرخ عروسی لباس کے علاوہ اس نے کسی قسم کا زیور یا میک اپ استعمال نہیں کیا تھا پھر بھی اس پر ٹوٹ کر دلہناپے کا روپ آیا تھا اور وہ ان تینوں مردوں کے درمیان ذرا شرمائی لجائی سی محسوس ہو رہی تھی۔ اسلم تو اسے دیکھ کر دم بخود رہ گیا تھا البتہ شہریار نے دھیرے سے نظروں کا زاویہ بدل لیا تھا۔ وہ اس روپ کو اپنی نظروں میں سمونے کا کوئی حق نہیں رکھتا تھا البتہ اسے یہ اندازہ تو خوب اچھی طرح تھا کہ وہ اس لباس میں کیسی قیامت ڈھائے گی۔ ماہ بانو وہ لڑکی تھی جسے بہت دن قبل اس نے ہشام ہوٹل نئے ایک ویٹر سے نیلے پھولوں والی سیاہ چادر خرید کر دی تھی تو وہ اس عام سی چادر میں بھی چودھویں کے چاند کی طرح نظر آنے لگی تھی۔ پھر اس بیش قیمت و خوب صورت عروسی لباس کی تو بات ہی الگ تھی۔

ماہ بانو کے اندر آتے ہی ذیشان نے اسے احترام سے ایک خالی کرسی بیٹھنے کے لیے پیش کی اور پھر قاضی صاحب نے اس کی اجازت سے نکاح کی کارروائی شروع کر دی۔ اس نکاح میں شہریار اس کے وکیل کے طور پر شریک تھا جبکہ گواہان کے لیے ذیشان سمیت سی ایف پی کے اہلکار موجود تھے۔ نکاح کی کارروائی شروع ہوئی تو حسبِ قاعدہ سب سے پہلے دلہن کی اجازت کے حصول کے لیے اسے کاغذات پیش کیے گئے۔ شہریار چونکہ دلہن کا وکیل تھا اس لیے نکاح کا فارم اور قلم اس نے ہی ماہ بانو کے سامنے رکھے تھے۔ اس سے یہ دونوں چیزیں وصول کرتے ہوئے ماہ بانو نے اپنی نظریں جھکا رکھی تھیں۔

"ان کاغذات پر دستخط کر دیں بیٹی تاکہ نکاح کی کارروائی کو آگے بڑھایا جا سکے۔" کاغذات ہاتھ میں لینے کے باوجود ماہ بانو نے ان پر دستخط نہیں کیے تو قاضی صاحب نے اس کے گریز کو فطری شرم و حیا پر محمول کرتے ہوئے شفقت سے ہدایت دی۔ اس موقع پر شہریار اس کے عین سامنے کھڑا تھا اور اس کی انگلی فارم پر اس جگہ رکھی ہوئی تھی جہاں ماہ بانو نے اپنے دستخط ثبت کرنے تھے۔ قاضی صاحب کی آواز سن کر وہ گویا سکتے کی سی کیفیت سے باہر نکلی اور نظریں اٹھا کر شہریار کی طرف دیکھا۔ اگلے ہی پل قلم اس کی انگلیوں کی گرفت سے نکل کر نیچے جا گرا اور وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

اور حامد راؤ کے شہر میں واقع فلیٹ میں آجاتے ہیں۔ ادھر مشاہرم خان شہریار کو حالات کی رپورٹ دیتا ہے اور اس گاؤں میں ہونے والے واقعات کی تفصیل دینے کے ساتھ وہاں اسلم اور ماہ بانو کی موجودگی اور پھر فرار کا بتاتا ہے۔ شہریار یہ خبر سن کر چونک جاتا ہے۔ بہرحال وہ مشاہرم خان کو دوبارہ وہاں جاکر تحقیقات کرنے کا حکم دیتا ہے۔ مشاہرم خان وہاں پہنچ کر ایک بوڑھے شخص سے معلومات حاصل کرتا ہے۔ بات چیت کے دوران اچانک اس پر وار کرکے اسے بے ہوش کردیا جاتا ہے۔ وہ بہر سائیں کے پیروکاروں کے ہتھے چڑھ جاتا ہے جو اس پر تشدد کرتے ہیں۔ لیکن وہ نور بخش کے بیٹے کی مدد سے وہاں سے فرار ہوکر شہریار کے پاس پہنچتا ہے۔ ادھر ماہ بانو اسلم کے گاؤں اس کی ماں کو لینے پہنچتی ہے مگر بخت بی بی انتقال کرجاتی ہے۔ وہ اس کی تدفین کرا کے واپس اسلم کے پاس پہنچ جاتی ہے۔ تاہم نواز چانڈیو اور اس کا بھائی وہاں پہنچ جاتے ہیں اور ماہ بانو اور اسلم کو وہاں سے لے کر ریتا آجاتے ہیں مگر اسلم اچانک حملہ کرکے انہیں ناکوں چنے چبوا دیتا ہے۔ وہ چانڈیو کو مارنے کا ارادہ کرتا ہے تو ماہ بانو آڑے آجاتی ہے اور اسے اس کی جان بخشی پر روکتی ہے۔ وہ اسے چھوڑ کر وہاں سے نکل دیتے ہیں اور شہر چھوڑ دیتے ہیں۔ ادھر شہریار کی ملاقات میجر ذیشان سے ہوتی ہے تو وہ اسے بتاتا ہے کہ ایک اسپیشل فورس قائم کرلی گئی ہے اور وہ خود اس میں شامل ہوگیا ہے۔ یہ فورس ایک سیکیورٹی ایجنسی کے طور پر خفیہ کام کرتی ہے۔ وہ ابھی میں شہریار کو ماہ بانو کا فون موصول ہوتا ہے تو وہ چونک جاتا ہے۔ وہ اس سے ایک ریسٹورنٹ میں ملتی ہے اور اسلم سے شادی کی خبر سنا کر اس سے اپنے شادی کے انتظامات کے لیے اس کی مدد چاہتی ہے۔ شہریار اس کی ضد کے آگے ہتھیار ڈال دیتا ہے اور اس کی مدد کرنے پر راضی ہوجاتا ہے۔ شہریار کو مشاہرم خان کے ذریعے ناملی والا میں مشکوک اشیا کے پہنچائے جانے کی اطلاع ملتی ہے۔ شہریار میجر ذیشان کے ذریعے وہاں کارروائی کرواتا ہے اور خود بھی اس کے ہمراہ ناملی پہنچتا ہے۔ میجر ذیشان اور شہریار زیر حراست افراد سے تفتیش کے لیے جانے لگتے ہیں تو اچانک میجر ذیشان اس کے شانے پر ہاتھ رکھتا ہے تو وہاں کوئی شرٹ پر چپکی کوئی ہم رنگ شے ہوتی ہے۔ بعد ازاں پتا چلتا ہے کہ وہ جاسوسی کرنے والی جدید چپ ہوتی ہے۔ شہریار یہ پتا لگانے کے لیے کھوج میں لگ جاتا ہے۔ وہ اپنے گھر میں ایسی کسی ڈیوائس کو ڈھونڈتا ہے جو اسے کرسٹل کے پیالے میں رکھے موتیوں میں سے ایک موتی کی شکل میں مل جاتی ہے۔ شہریار کو ماریا پر شبہ ہوتا ہے۔ ماریا لاہور جانے کے لیے نکلتی ہے تو شہریار مشاہرم خان کو اس کی نگرانی کرنے کی ہدایت دیتا ہے۔ ادھر شہریار کو ماہ بانو کے نکاح کے سلسلے میں خود بھی لاہور جانا پڑتا ہے۔ راستے میں اسے اپنے تعاقب کا احساس ہوتا ہے۔ وہ تعاقب کرنے والے کو قابو کرلیتا ہے اور اسے لے کر ذیشان کے آفس پہنچ جاتا ہے۔ وہ لوگ ماہ بانو اور اسلم کو بھی وہیں بلا لیتے ہیں۔ پھر نکاح فارم پر دستخط کے وقت شہریار فارم پر انگلی رکھ کے کھڑا ہوتا ہے۔ ماہ بانو کے ہاتھ سے قلم چھوٹ جاتا ہے اور وہ اپنا چہرہ چھپا کر رونے لگتی ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

وہ رو رہی تھی اور بے تحاشا رو رہی تھی۔ بس ایک نظر ہی کی تو بات تھی جس نے اس پر کیسے کیسے راز افشا کردیے تھے۔ اسے آج پہلی بار صحیح معنوں میں اس حقیقت کا ادراک ہوا تھا کہ وہ جس کی چاہت دل میں لیے پھرتی ہے وہ بھی اس کی محبت میں گرفتار ہے۔ اگرچہ وہ زبان سے نہ سہی لیکن عمل سے تو تعلق خصوصی کا ثبوت ایک عرصے سے دیتا چلا آرہا تھا... لیکن وہ اس کی اس توجہ کو اس کے خلوص اور ہمدردی پر ہی محمول کرتی رہی تھی، ورنہ وہ کونسا موقع تھا جب شہریار نے اس کا خیال نہ رکھا ہو۔ پیر آباد سے پہلی بار چودھری کے چنگل سے بچنے کے لیے فرار ہونے سے لے کر اب تک وہ اس کا ساتھ دیتا رہا تھا۔ یہ کوئی معمولی بات تو نہیں تھی کہ وہ اس کی ایک فون کال پر اپنے سارے کام کاج چھوڑ کر اتنی دور دوڑا چلا آیا تھا اور اس وقت اس کا وکیل بنا اس سے نکاح کی اجازت طلب کررہا تھا۔ لیکن اس پل اس کی آنکھوں میں جو کرب تھا، اس نے ماہ بانو کو رلا دیا تھا۔ کرب کی یہ تحریر صاف بتا رہی تھی کہ وہ اسے کسی اور کا بنتے دیکھ کر کتنا آزردہ ہے اور یہ آزردگی ہی تو اس کی چاہت کی گواہ تھی۔ لیکن یہ گواہی سامنے آنے میں اتنی دیر لگ گئی تھی کہ وہ عروسی جوڑا پہنے کسی اور کے نکاح میں جانے کے لیے تیار بیٹھی تھی۔

آج اسے یہ بھی یقین ہوگیا تھا کہ شہریار کی ماریا سے شادی کسی مجبوری کے باعث ہوئی ہوگی لیکن وہ پہلے یہ بات سمجھ ہی نہیں سکی اور جذبات میں اسلم سے شادی کا وعدہ کر بیٹھی۔ اب اس کے لیے اپنا وہ وعدہ نبھانا مشکل ہو رہا تھا۔ لیکن کیا کوئی جائے فرار تھی؟ کیا وہ قاضی اور گواہوں کی موجودگی میں نکاح نامے پر دستخط کرنے سے انکار کرسکتی تھی؟ کیا وہ اسلم کی محبت اور احسانات کو فراموش کرکے اسے ایک بار پھر تنہائیوں کے حوالے کرسکتی تھی؟ ان تنہائیوں کے حوالے جو اسے ایک بار پھر برائی کی دلدل میں گھسیٹ لے جاتیں...

سوالات کا ایک ریلا سا تھا جو اس کے ذہن سے گزر رہا تھا لیکن انگلیوں میں اتنی تاب نہیں تھی کہ ذرا سی جنبش کر کے نکاح نامے پر دستخط کردیتیں۔ ہاتھ سے گرجانے والا قلم اب بھی اس کے قدموں میں پڑا تھا اور اس کی آنکھوں سے بہتے آنسوؤں نے نکاح نامے کے اوراق کو تر کرکے گویا ایک ایسی داستان رقم کردی تھی جسے پڑھنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں تھی۔ یہ ایک ایسی لڑکی کی داستان تھی جو حالات کے گرداب میں ڈوبتی ابھرتی کسی کی محبت میں مبتلا ہوگئی تھی لیکن زندگی اسے ایسے مقام پر لے آئی تھی جہاں وہ زبان سے اپنی محبت کا اعتراف نہیں کرسکتی تھی۔

”دستخط کردو ماہ بانو! قاضی صاحب انتظار کررہے

ہیں۔“ شہریار نے جھک کر اس کے قدموں میں پڑا قلم اٹھا کر نکاح نامے کے فارم پر رکھا اور آہستہ سے کہا۔ اس کا یہ چھوٹا سا جملہ ماہ بانو کے لیے حکم کا درجہ رکھتا تھا لیکن انگلیوں میں اس قدر سکت تھی کہ قلم تھامنے کی تاب ہی نہ رہی۔ شہریار نے آگے بڑھ کر محبت سے اپنا دایاں ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیا۔ یکایک اسے اپنے وجود میں کسی تناور درخت کے سائے میں آیا محسوس ہوا۔ آنسو تھم گئے اور جسم کی لرزش رک گئی۔ اگر یہی محبوب کا حکم تھا تو سرِ تسلیم خم تو کرنا ہی تھا۔ اس نے قلم مضبوطی سے انگلیوں کی گرفت میں لیا اور ایک ایک کرکے ہر بتائی ہوئی جگہ پر دستخط کرتی چلی گئی۔ اس کے دستخط کرتے ہی قاضی صاحب نے کارروائی آگے بڑھائی۔ مختصر سے خطبۂ نکاح اور دعا کے بعد وہاں مبارک سلامت کا شور اٹھ گیا۔ تمام حاضرین نے دولہا کو گلے لگا کر مبارک باد دی۔

”تمہیں اللہ نے اپنی بہت بڑی نعمت کا تحفہ دیا ہے۔ اس تحفے کی ہمیشہ قدر کرنا۔“ شہریار نے اسلم سے گلے ملتے ہوئے اسے نصیحت کی۔

”اطمینان رکھیے۔ مجھے خود بھی اپنی خوش نصیبی کا احساس ہے۔“ اس نے مسکرا کر اس کی تسلی کروائی۔

اس کے بعد کھانے پینے کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ مرد حضرات دل کھول کر اشیائے خورونوش سے انصاف کرنے لگے۔ ماہ بانو ایک تو دلہن تھی اور دوسرے وہاں موجود واحد خاتون۔ اس کے لیے کچھ بھی کھانا پینا دشوار ہو رہا تھا۔ سب کے بہت اصرار پر وہ بس ذرا سی گلاب جامن ہی چکھ سکی۔

شہریار نے بھی حسب عادت بہت ناپ تول کر بس ذرا سا ہی کھایا۔ وہ اپنے معمول کا اتنا پابند تھا کہ وقت بے وقت کھانا پینا ہمیشہ ہی ناپسند کرتا تھا اور اس وقت تو طبیعت بھی کچھ بوجھل سی تھی۔ اس وقت تو وہ اس محفل میں بس رسم دنیا نبھانے کو شامل تھا ورنہ دل تو تنہائی کا خواہاں ہو رہا تھا۔ تیس منٹ میں وہ لوگ اس سلسلے سے بھی فارغ ہوگئے۔ قاضی صاحب کو ان کی فیس کے ساتھ رخصت کردیا گیا۔ نکاح کی تقریب سے لطف اندوز ہونے کے لیے وہاں پہنچنے والے ایس ایف پی کے اہلکار بھی اپنے اپنے دھندوں سے لگ گئے۔ دو ملازمین کھانے پینے کے سلسلے میں ہوجانے والے پھیلاوے کو سمیٹنے لگے۔ ایسے میں شہریار ان دونوں کی طرف متوجہ ہوا۔

”میں نے تم دونوں کے لیے ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں اسپیشل روم بک کروادیا ہے۔ ڈرائیور تم لوگوں کو وہاں پہنچا دے گا۔ روم چوبیس گھنٹے کے لیے تمہارے ناموں سے بک ہے۔ تمہاری مرضی ہے کہ تم وہاں کتنا وقت گزارتے ہو۔ میری طرف سے کوئی پابندی نہیں۔“ اس نے بولتے ہوئے اپنی نظریں زیادہ تر اسلم کے چہرے پر ہی مرکوز رکھی تھیں۔ گلے میں موٹا سا پھولوں کا ہار ڈالے وہ خاصا پرکشش لگ رہا تھا۔ خوشی نے اس کے چہرے کو عجیب سی رونق عطا کردی تھی۔

”میری طرف سے یہ تمہاری شادی کا تحفہ ہے۔“ اس بار وہ ماہ بانو کی طرف مڑا اور ایک بند لفافہ اس کے ہاتھ میں تھمایا۔

”اس تکلف کی کیا ضرورت ہے شہریار صاحب! پہلے ہی آپ نے ہمارے لیے اتنا کچھ کیا ہے۔“ لفافہ دیکھ کر اسلم نے شرمندگی سے کہا۔

”یہ تکلف نہیں، میری خوشی ہے۔ اب تم دونوں یہاں وقت ضائع مت کرو اور فوراً روانہ ہوجاؤ۔ ڈرائیور تمہارا انتظار کررہا ہوگا۔“ اس نے بزرگانہ انداز اختیار کرتے ہوئے حکم دیا تو اسلم، ماہ بانو کا ہاتھ تھام کر کھڑا ہوگیا۔

”یہاں سے جاکر اس جگہ کو بالکل بھول جانا۔ یہ ایک عارضی بندوبست تھا۔ آئندہ اگر تمہیں مجھ سے کوئی کام ہو تو براہ راست مجھ سے ہی رابطہ کرنا۔“ اس نے ضروری سمجھا کہ انہیں نصیحت کردے۔ اس کی خاطر ذیشان نے اگر ایس ایف پی کے اس ٹھکانے کو استعمال کروالیا تھا تو اس کا بھی فرض تھا کہ اس کی حفاظت کے لیے احتیاط سے کام لے۔

”جیسا آپ کا حکم۔“ اسلم نے جواب دیا۔ ماہ بانو البتہ بالکل خاموش تھی۔ نکاح کے بعد سے اس نے ایک لفظ بھی ادا نہیں کیا تھا۔ یہاں تک کہ نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا کہ مبادا نظر اٹھے اور اس چہرے پر پڑ جائے جسے دیکھنا اب وہ اپنے لیے جائز نہیں سمجھتی تھی۔ اسلم کے نکاح میں آنے کے بعد اب وہ بس اسی کی وفادار بن کر رہنا چاہتی تھی اور وفاداری کے لیے احتیاط ضروری تھی۔

”تمہارے مہمان تو گئے۔ اب تمہارا کیا پروگرام ہے؟“ ذیشان جو کسی کام سے اٹھ کر چلا گیا تھا، ان دونوں کی روانگی کے ساتھ ہی واپس آیا اور اس سے استفسار کرنے لگا۔

”واپس نورکوٹ جانا ہے۔“ اس نے تھکن زدہ لہجے میں جواب دیا۔

”ایسا کرو، تم اپنی موجودہ ملازمت چھوڑ کر کسی ٹرک یا ویگن وغیرہ کے ڈرائیور بن جاؤ۔ جس حساب سے تم گھنٹوں ڈرائیو کرتے رہتے ہو، تمہارے لیے یہ کام بہت بہتر رہے گا۔“ اس کا جواب سن کر ذیشان نے جل کر جواب دیا تو وہ

ہنس پڑا۔

''اچھا پھر تم بتاؤ کہ کیا کروں؟''

''یہاں ایک ریسٹ روم ہے۔ وہاں تھوڑی دیر آرام کر لو۔ تمہارے لائے ہوئے بندے پر بھی کام ہو رہا ہے۔ وہ زبان کھولنے پر آمادہ ہوتا ہے تو پھر تمہیں اس کی کہانی اس کی زبانی سناتے ہیں۔ پھر آگے دیکھتے ہیں کہ کیا کرتا ہے اور کیا نہیں۔''

''ٹھیک ہے جیسی تمہاری مرضی۔'' وہ فوراً ہی ذیشان کے پروگرام سے متفق ہو گیا۔ اعصاب اتنے بوجھل ہو رہے تھے کہ کچھ دیر کے لیے تنہائی اور آرام کی شدت سے خواہش ہو رہی تھی۔ تنہائی ملی تو وہ اپنے عہدے اور بڑے پن کے خول سے نکل کر خود سے یہ اعتراف کرنے کی جرأت کر پاتا کہ وہ بھی ایک عام انسان ہے جس کا دل اس وقت احساسِ زیاں سے لہولہو ہے۔ یہ لہو اگر پانی بن کر آنکھوں سے نہ بہتا تو شاید اس کے جسم و جاں کے پرخچے اڑ جاتے اور اسے بہرحال زندہ رہنا تھا۔ اپنے لیے نہ سہی، اپنوں کے لیے اور اپنے وطن کے لیے۔

☆☆☆

سیاہ جینز پر سیاہ اور سرخ دھاریوں والی ٹی شرٹ پہنے وہ لڑکی غضب کی پرکشش لگ رہی تھی۔ اس لباس نے اس کی دراز قامت اور خوب صورت فگر کو خوب نمایاں کر کے دکھایا تھا۔ دلکش رنگت پر شانوں سے ذرا نیچے آتے براؤن بال بھی خوب جچ رہے تھے اور ہونٹوں پر جمی چمکتی سرخ رنگ کی لپ اسٹک نے تو گویا غضب ہی ڈھا رکھا تھا۔ اس کے کبوتر جیسے سفید پیروں میں سیاہ رنگ کی نازک سی اونچی ایڑھی کی سینڈل تھی۔ اس اونچی ایڑھی پر وہ کھٹ کھٹ کرتی چلتی ہوئی بڑے انہماک سے شیلفس میں رکھی مختلف چیزوں کا جائزہ لے رہی تھی۔ جب کوئی چیز اس کی نظرِ انتخاب میں آ جاتی تو وہ بایاں ہاتھ اٹھا کر اسے اس ٹرالی میں منتقل کر لیتی جسے وہ اپنے دائیں ہاتھ سے دھکیلتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ اپنی خریداری میں وہ اتنی منہمک تھی کہ اطراف سے بالکل بے خبر معلوم ہو رہی تھی۔ ایسے دیکھنے والا کوئی بھی شخص یہی اندازہ لگا سکتا تھا کہ نہ تو اسے شیلفس کے بالکل آخری سرے پر مصروف ادھیڑ عمر گریس فل سے آدمی کی موجودگی کی خبر ہے اور نہ ہی اپنے پیچھے پیچھے چلتے ان دو جوان العمر حلیے سے ذرا اوباش لگنے والے لڑکوں کی۔ وہ لڑکے بھی لگتا تھا کہ موقع کی تلاش میں تھے۔ وہ کچھ نکالنے کے لیے جیسے ہی شیلف کی طرف پلٹی، ان میں سے ایک نے اپنا پسٹل نکال کر اس کی پشت پر رکھ دیا۔

''سیدھی طرح خاموشی سے ہمارے ساتھ چلو ورنہ یہیں ڈھیر کر دیں گے۔'' اوباش لڑکے کی سرد آواز ... ایک جھٹکے سے مڑی اور اس کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں لیکن اس نے لڑکے کی ہدایت پر عمل کر کے خاموشی سے ... بجائے ایک دہشت زدہ سی چیخ ماری اور اپنی اونچی ایڑھی کے باوجود بگٹٹ بھاگ کھڑی ہوئی۔ وہ اسی سمت بھاگی جہاں ادھیڑ عمر شخص موجود تھا۔ اس کے چیخنے کی آواز پر وہ فوراً ہی اس طرف متوجہ ہو گیا اور بھاگتی لڑکی کے پیچھے پستول لہراتا لڑکا اور اس کا ساتھی بھی اس کی نظر میں آ گیا۔ اس سے قبل کہ وہ اس صورتِ حال پر کوئی قدم اٹھاتا، لڑکی تیز رفتاری سے درمیانی فاصلہ طے کر کے اس کے قریب آ گئی اور اس سے لپٹ گئی۔

''پلیز ہیلپ... ہیلپ پلیز۔'' وہ اس سے لپٹی خوف زدہ آواز میں درخواست کرنے لگی اور اسے یہ بھی خبر نہ ہو سکی کہ دھمکانے والے بدمعاش اسے کسی دوسرے شخص کی پناہ میں جاتے دیکھ کر فوراً ہی مخالف سمت میں بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔ وہ ایک بڑا سپر اسٹور تھا جہاں سیکیورٹی کا بھی مناسب انتظام تھا۔ شاید اسی لیے معاملہ گڑبڑ ہوتا دیکھ کر ان اوباشوں نے فوراً ہی راہِ فرار اختیار کر لی تھی۔

''کیا ہوا سر! کیا مسئلہ ہے؟'' فوراً ہی وہاں ایک سیکیورٹی اہلکار برآمد ہوا اور ادھیڑ عمر شخص سے دریافت کرنے لگا جو لڑکی کے ابھی تک خود سے لپٹے ہونے کی وجہ سے جزبز نظر آ رہا تھا لیکن صرف اس کے خوف کی وجہ سے برداشت سے کام لے رہا تھا۔

''کچھ بدمعاش ان خاتون کو تنگ کر رہے تھے۔ اس کے علاوہ میں کچھ نہیں بتا سکتا۔'' لڑکی کو خود سے الگ کرتے ہوئے انہوں نے جواب دیا۔

''میں دیکھتا ہوں۔ آپ لوگ پلیز ریلیکس رہیں۔'' سیکیورٹی اہلکار فوراً ہی پلٹ گیا۔

''آپ ٹھیک ہیں مس؟'' ادھیڑ عمر شخص نے گہرے گہرے سانس لیتی لڑکی سے دریافت کیا۔

''میں ٹھیک ہوں لیکن مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ کہیں وہ آس پاس ہی نہ چھپے ہوئے ہوں۔'' اس کی آنکھوں میں بے پناہ خوف تھا اور بُری طرح ہانپنے کی وجہ سے پیدا ہونے والا سینے کا زیر و بم چست ٹی شرٹ میں خوب محسوس ہو رہا تھا۔ یقینی طور پر تباہ کن حد تک حسین و پُرکشش تھی جس کے لیے کسی بھی اوباش کی نیت خراب ہو سکتی تھی اور شریف آدمی کے دل میں ہمدردی کی لہر اٹھ سکتی تھی۔ اس شریف آدمی نے بھی اتنے ...

... نہیں کیا اور نرمی سے بولا۔ ''آپ پریشان نہ ہوں۔ میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔ اگر آپ مزید شاپنگ کرنا چاہیں تو کر سکتی ہیں۔''

''نہیں، اس وقت شاپنگ کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بس آپ میرے ساتھ چل کر بل بنوا دیں۔ مجھے اکیلے یہاں سے باہر نکلتے ہوئے بھی خوف محسوس ہو رہا ہے۔'' لڑکی نے ان سے درخواست کی تو انہوں نے اثبات میں سر ہلا کر حامی بھر لی اور وہ دونوں اپنی اپنی ٹرالیوں کے ساتھ آگے بڑھ گئے۔

''مجھے یہاں کے سیکیورٹی انچارج سے ملنا ہے۔'' بل بنوانے کے لیے ٹرالیاں سامنے کرتے ہوئے انہوں نے بارعب لہجے میں کہا جس پر انہیں مین گیٹ پر بنے ایک کیبن کی طرف گائیڈ کر دیا گیا۔

وہ لڑکی سمیت اس جگہ پہنچے تو وہاں وہ سیکیورٹی اہلکار پہلے ہی موجود تھا جس سے واقعے کے فوراً بعد ان کی ملاقات ہوئی تھی۔ یقینی طور پر وہ اپنے افسر کو واقعے کی رپورٹ دے رہا تھا۔

''سر! یہ ہیں وہ لوگ جن کے ساتھ وہ واقعہ پیش آیا۔'' ان دونوں کو دیکھتے ہی سیکیورٹی گارڈ نے اپنے افسر کو مطلع کیا۔

''واقعہ ان خاتون کے ساتھ پیش آیا تھا۔ میں نزدیک ہونے کی وجہ سے اتفاقاً اس میں شامل ہو گیا ہوں۔'' ادھیڑ عمر آدمی نے مسکراتے ہوئے گویا صورتِ حال واضح کی۔

''مجھے افسوس ہے کہ آپ لوگوں کو زحمت ہوئی۔ میں فوراً اس واقعے کی تفتیش کروں گا۔'' انچارج نے ان کی طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔

''آپ کو افسوس ہونا بھی چاہیے۔ اتنے بڑے سپر اسٹور میں مسلح افراد کا گھس آنا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ مجھے تو حیرت اس بات پر ہے کہ مسلح آدمی اندر آئے کیسے؟ کیا آپ کے پاس اسلحے کو اندر آنے سے روکنے کے لیے متعلقہ آلات نہیں ہیں؟'' اس بار ان کا لہجہ سرد اور بارعب تھا۔ سیکیورٹی انچارج نے خود کو ان کے سامنے کافی کمزور محسوس کیا اور صفائی پیش کرنے کے انداز میں بولا۔

''میں خود اس سلسلے میں حیران ہوں سر! ہمارا سیکیورٹی سسٹم بہت اچھا ہے اور کوئی چاہے بھی تو ہتھیار چھپا کر اندر نہیں لے جا سکتا۔ ان حالات میں تو میں یہی اندازہ لگا سکتا ہوں کہ وہ کوئی کھلونا پسٹل تھا جس سے خاتون کو ہراساں کرنے کی کوشش کی گئی۔''

''ہو سکتا ہے ایسی ہی کوئی بات ہو۔ میں اچانک ان دونوں کے آ جانے سے بہت خوف زدہ ہو گئی تھی اس لیے کسی قسم کی تمیز نہیں کر سکی۔ ویسے بھی مجھے ہتھیاروں کی کوئی خاص پہچان نہیں ہے۔'' لڑکی نے فوراً ہی اس کے خیال سے اتفاق کر لیا جس سے اس کا حوصلہ بڑھا اور اپنی صفائی دینے کے لیے مزید بولا۔

''میرے ماتحت نے صرف خاتون کے چیخنے کی آواز سنی تھی۔ وہ کسی کو وہاں سے بھاگتا ہوا نہیں دیکھ سکا اور نہ ہی کسی اور سیکیورٹی گارڈ نے اسٹور سے کسی شخص کو افراتفری میں نکلتے ہوئے دیکھا۔ ورنہ کوئی مشکوک بات سامنے آنے پر ہم خود ہی فوری ایکشن لے لیتے ہیں۔''

''اس بات کا ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ دونوں اب بھی اسٹور میں کہیں چھپے ہوئے ہیں اور ذرا سی کوشش سے انہیں پکڑا جا سکتا ہے۔'' ادھیڑ عمر آدمی پُرخیال انداز میں بولا۔

''کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اس وقت اسٹور میں جتنے کسٹمرز موجود ہیں، انہیں خاتون کے سامنے شناختی پریڈ کروائی جائے؟'' سیکیورٹی انچارج نے اچنبھے سے پوچھا۔

''مجرموں تک پہنچنے کے لیے ایسا کرنے میں کیا حرج ہے؟'' ادھیڑ عمر شخص نے مضبوطی سے جواب دیا۔

''اس ایکشن کا اسٹور کی ساکھ پر بہت بُرا اثر پڑے گا۔ ہمارے معزز کسٹمرز اسے اپنی انسلٹ سمجھیں گے۔ پھر یہ بھی دیکھیں کہ خاتون کے ہراساں ہونے کے سوا کوئی بڑی بات ہوئی بھی نہیں۔ اگر انہیں کسی قسم کا جسمانی یا مالی نقصان پہنچتا تو ہم اس قسم کے سخت اقدامات اٹھا سکتے تھے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ میں اسٹور کے مختلف حصوں میں نصب کیمروں میں موجود ویڈیو آپ دونوں کو دکھا دوں تاکہ اگر کسی کیمرے کی گرفت میں ان مشکوک افراد کے چہرے آئے ہوں تو آپ انہیں پہچان لیں۔'' سیکیورٹی انچارج نے معذوری ظاہر کرتے ہوئے ایک متبادل تجویز پیش کی۔

''رہنے دیں۔ میں ایسے کسی جھنجٹ میں پڑ کر اپنا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتی۔ جو ہونا تھا ہو چکا۔ مجھے خوشی ہے کہ میرا کوئی نقصان نہیں ہوا اور میں صحیح سلامت اپنے گھر جا سکتی ہوں۔'' لڑکی نے اچانک مداخلت کر کے معاملہ ہی ختم کر دیا تو ادھیڑ عمر شخص بھی شانے اچکا کر رہ گیا۔ لڑکی کے پیچھے ہٹ جانے کے بعد اس کا کچھ کہنا بے مقصد سا ہو جاتا۔ وہ دونوں سیکیورٹی انچارج کی طرف سے سوفٹ ڈرنکس کی پیشکش کو مسترد کر کے گارڈ روم سے باہر

آ گئے۔ اس دوران میں ان کی بلنگ کا کام ہو چکا تھا اور خریدی ہوئی اشیا تھیلوں میں منتقل کی جا چکی تھیں۔

"آپ کے تعاون کا بہت بہت شکریہ۔ سرا ہو سکتا ہے آپ کو میرے رویّے سے مایوسی ہوئی ہو لیکن میں نے جان بوجھ کر اس معاملے کو طول دینا پسند نہیں کیا۔ مجھے تنگ کرنے والے اوباش جو بھی ہوں، میں ان کو بھیجنے والے سے واقف ہوں اس لیے خاموش ہو جانا ہی مناسب سمجھا۔" ادھیڑ عمر آدمی کے ساتھ ساتھ باہر نکلتے ہوئے لڑکی نے معذرت خواہانہ لہجے میں اپنے رویّے کی وضاحت پیش کرنے کی کوشش کی۔

"اوہ... یعنی یہ ذاتی دشمنی کا کیس ہے؟"

انہوں نے پوچھا جس پر لڑکی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ "اگر آپ کے پاس کچھ وقت ہو تو ہم کسی ریسٹورنٹ میں چل کر چائے پیتے ہیں۔ پھر میں آپ کو تفصیل سے آگاہ کروں گی۔"

"چائے پینے میں وہ بھی اتنی خوب صورت خاتون کے ساتھ کوئی حرج تو نہیں ہے... لیکن بڑی عجیب سی بات ہے کہ ہم ایک دوسرے سے ابھی تک متعارف نہیں ہوئے ہیں اور گفتگو کا سلسلہ نجی معاملات تک آ پہنچا ہے۔" انہوں نے مسکرا کر احساس دلایا تو لڑکی کے لب بھی کھل اٹھے اور ایسا لگا کہ سرخ پنکھڑیوں کے درمیان رکھے موتیوں کی سفید لڑی نے اپنی جھلک دکھائی ہو۔

"میں فلک ہوں... فلک خان اور آپ؟" اس نے تعارف کروانے میں پہل کرتے ہوئے ان کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"توحید احمد۔" ادھر سے مختصر جواب آیا۔ اس دوران وہ لوگ چلتے ہوئے پارکنگ میں پہنچ چکے تھے۔ اتفاق سے دونوں کی گاڑیاں ایک دوسرے سے قریب ہی کھڑی ہوئی تھیں۔ فلک کے پاس سفید رنگ کی سوزوکی مہران کا کافی پرانا ماڈل تھا جبکہ توحید احمد کے پاس شان دار پجیرو تھی۔ اس نے اپنا سامان سوزوکی مہران کی پچھلی سیٹ پر رکھ کر دروازہ دوبارہ لاک کیا اور توحید احمد کی طرف متوجہ ہوئی۔ اس دوران میں وہ بھی سامان رکھنے کا کام کر چکے تھے۔

"میری گاڑی آپ کے شایانِ شان نہیں ہے اس لیے میرے خیال میں، میں آپ کی طرف آجاتی ہوں۔" اس نے مسکراتے ہوئے توحید احمد سے کہا۔

"میں اس قسم کی سوچ کا مالک نہیں ہوں لیکن تمہارے میری گاڑی میں بیٹھنے سے میری گاڑی کی شان بڑھ جائے گی اس لیے واقعی تم میرے ساتھ آجاؤ۔" انہوں نے اسی خوش اخلاقی کا مظاہرہ کیا جو ایک خوش شکل اور خوش لباس لڑکی کے سامنے کسی مرد کے لیے لازم تھا۔ فلک ایک ادا سے چلتی ہوئی ان کی گاڑی کی طرف بڑھی۔

"آپ خاصے خوش مزاج اور ہینڈسم آدمی ہیں۔" جوابی تعریف گویا اس کا فرض بن چکا تھا۔

"حسن کے آگے تو سب ہی خوش مزاج ہو جاتے ہیں۔ مجھے ان بدمعاشوں پر حیرت ہے کہ انہوں نے تمہیں ہراساں کرنے کی گستاخی کیسے کی؟" وہ اب بھی مائل بہ شوخی تھے۔

"ان کا ذکر رہنے دیں۔ وہ کرائے کے ٹٹو تھے اور اپنا کام کر کے بھاگ گئے۔" اس نے ہونٹوں کو سکوڑتے ہوئے بیزاری کا اظہار کیا اور فرنٹ سیٹ پر براجمان ہو گئی۔ اس کے بیٹھتے ہی توحید احمد نے گاڑی پارکنگ سے نکال لی۔

"آپ کیا جاب کرتے ہیں؟" گاڑی چلتے ہی فلک نے ان سے سوال کیا۔

"میں تو ریٹائرمنٹ کی عمر کو پہنچ چکا ہوں۔ اب اس عمر میں کیا جاب کروں گا۔" انہوں نے بات اڑائی۔

"میں نہیں مانتی۔ اوّل تو آپ اتنے عمر رسیدہ لگتے نہیں ہیں، دوسرے آپ جتنے فٹ ہیں، کوئی ریٹائرڈ پرسن ہو ہی نہیں سکتا۔" اس نے ایک ادا سے سر کو دائیں بائیں ہلاتے ہوئے ان کی بات ماننے سے انکار کیا۔

"تم مجھے مسلسل خوش کر رہی ہو لڑکی! ایسا نہ ہو کہ خوشی میں میرا بلڈ پریشر اتنا ہائی ہو جائے کہ مجھے ہارٹ اٹیک ہی ہو جائے۔" انہوں نے گویا اسے تنبیہ کی جسے سن کر وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

"تمہاری طرح تمہاری ہنسی بھی بہت خوب صورت ہے۔" توحید احمد نے اسے ستائشی نظروں سے دیکھا تو اس کی آنکھیں چمک اٹھیں لیکن وہ انکساری کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولی۔

"اصل میں یہ آپ کا حسنِ نظر ہے۔ اگر میں واقعی ان خوبیوں کی مالک ہوتی تو میرا سابقہ شوہر مجھ پر دوسری عورتوں کو ترجیح کیوں دیتا۔" اس کی انکساری نے جملے کے آخر میں اداسی کا رنگ اختیار کر لیا۔

"اوہ... تو چوٹ کھائی ہوئی ہو۔ اندر چلو پھر تمہاری داستان بھی سنتے ہیں کہ کس بدنصیب نے اتنی پیاری لڑکی کی ناقدری کی۔" انہوں نے قریبی ریسٹوران کا انتخاب کیا تھا اس لیے فاصلہ فوراً ہی طے ہو گیا۔

ریسٹوران کی فضا بڑی خواب ناک تھی۔ دھیمے سروں

میں چھڑی موسیقی نے بڑا خوش گوار سا تاثر پیدا کر رکھا تھا۔ ان دونوں نے ویٹر کی راہنمائی میں ایک ٹیبل پر پہنچ کر قبضہ کر لیا اور توحید احمد نے فوراً ہی اسنیکس کے ساتھ چائے کا آرڈر بھی دے دیا۔

"میں نے آپ کو آفر کی تھی اس لیے یاد رکھیے گا کہ میزبان میں ہوں اور بل میں ہی پے کروں گی۔" ویٹر کے جاتے ہی اس نے فوراً انہیں ٹوکا۔

"خوب صورت خواتین کی میزبانی بس اس حد تک اچھی لگتی ہے کہ وہ چائے بنا کر پیش کر دیں۔ ان سے بل کوئی بدذوق ہی پے کروا سکتا ہے اور میں کم از کم اتنا بدذوق نہیں ہوں۔" انہوں نے بات ٹالی۔

"آپ بہت جولی ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ جوانی میں تو آپ لیڈی کلر رہے ہوں گے۔" اسے شاید بہت زیادہ ہنسنے کی عادت تھی اس لیے ایک بار پھر کھلکھلا کر ہنسی۔

"چلو اسی بہانے تم نے مجھے بوڑھا تو تسلیم کر لیا۔" انہوں نے گویا اس کی زبان پکڑی۔

"بوڑھے تو خیر آپ نہیں ہیں، بس میچور کہلا سکتے ہیں۔ ویسے بھی میرے نزدیک چھچھورے نوجوانوں سے بڑھ کر آپ جیسے خوش مزاج اور گریس فل شخص کی صحبت زیادہ اچھی ہے۔ اگر جوانی میں اتنی کشش ہوتی تو میں سال بھر کے اندر اپنے شوہر کو چھوڑ کر نہ آجاتی۔" اس نے شانے جھٹکتے ہوئے انہیں جواب دیا تو جیسے انہیں بھولی ہوئی بات یاد آ گئی۔

"ارے ہاں، تم کچھ بتا رہی تھیں اپنے شوہر کے بارے میں۔ ذرا بتاؤ تو وہ کون احمقِ اعظم تھا جس نے تمہاری قدر نہیں کی؟"

"احمق وہ نہیں، میں تھی۔ اس نے میری طرف ہاتھ بڑھایا اور میں اس کی دولت اور خوب صورتی سے مرعوب ہو کر اس کی بن گئی۔ حالانکہ میری فیملی نے اس شادی کی بہت مخالفت کی تھی۔ میرے والد اور بھائی کا کہنا تھا کہ ہم خود سے اتنے زیادہ ہائی اسٹیٹس کے بندے سے رشتہ نہیں نبھا سکتے، پھر وہ تھا بھی فیوڈل بیک گراؤنڈ کا بندہ... جس کے بارے میں لوگوں کی اچھی رائے نہیں تھی۔ میری آنکھوں پر اس وقت عشق کی پٹی بندھی تھی اس لیے میں نے کسی کی ایک نہ سنی اور مجبوراً میرے گھر والوں نے ہمیشہ کے لیے ناتا توڑ دینے کے اعلان کے ساتھ میری شادی کر دی۔ شادی کے بعد مشکل سے دو مہینے وہ شرافت کے جامے میں رہا پھر اِدھر اُدھر کی بازاری عورتوں پر منہ مارنے لگا۔ میں نے بہت سمجھایا، لڑائی جھگڑی لیکن اس نے اپنی روش نہیں بدلی۔ مجبور ہو کر میں نے طلاق مانگ لی جسے اس نے اپنی توہین سمجھتے ہوئے صاف انکار کر دیا۔ میں بھی ضد میں آ گئی اور اس کا گھر چھوڑ کر اس گھر میں شفٹ ہو گئی جو مجھے اس نے مہر میں دیا تھا۔ یہ بھی میرے والد کی مہربانی تھی کہ انہوں نے خفگی کے باوجود میری سیفٹی کا خیال کرتے ہوئے اس سے مہر میں مکان لکھوا لیا تھا۔ اپنے مکان میں شفٹ ہو کر میں نے کورٹ میں خلع کی درخواست دائر کر دی۔ اسے یہ بات بھی پسند نہیں آئی اور اب وہ مختلف حربوں سے کوشش کر رہا ہے کہ میں درخواست واپس لے لوں۔ کبھی دھمکی آمیز فون ملتے ہیں۔ کبھی گھر سے نکلتے وقت میری گاڑی کا پیچھا کیا جاتا ہے۔ اور آج جو ہوا، وہ آپ نے بھی دیکھ لیا۔" وہ جیسے تھک کر چپ ہو گئی۔

"تمہیں چاہیے تھا کہ اپنے میکے چلی جاتیں۔" انہوں نے سب سن کر مشورہ دیا۔

"وہاں اب کوئی نہیں ہے۔ والد کا میری شادی کے پندرہ دن بعد ہی انتقال ہو گیا تھا۔ ان کے انتقال کے بعد بھائی بھی جاب کے لیے کینیڈا چلا گیا۔ ان دونوں کے سوا میری فیملی میں کوئی تیسرا فرد تھا ہی نہیں۔ باقی دور کے رشتے داروں کا تو آپ کو بھی علم ہو گا کہ آج کل کوئی کسی کے پھڈے میں پڑنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ جو بھی حالات ہیں، مجھے ان سے تنہا ہی مقابلہ کرنا ہے۔" مایوسی سے بولتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے۔

"پلیز رونا نہیں۔ مجھ سے تمہارا رونا دیکھا نہیں جائے گا۔" انہوں نے فوراً اسے ٹوکا تو وہ ہنس دی۔ اسی وقت ان کی ٹیبل پر چائے سرو کی جانے لگی۔ چائے اور اسنیکس سے انصاف کرتے ہوئے وہ دونوں ایک دوسرے سے اور بھی گھل مل گئے۔ دونوں ہی کے تاثرات سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ بہت خوش ہیں اور ایک دوسرے کی کمپنی کو انجوائے کر رہے ہیں۔

"تم کہو تو میں تمہیں تمہارے گھر پر ڈراپ کر دیتا ہوں۔ رات ہونے والی ہے، تمہارا اکیلا جانا مناسب نہیں۔ تمہاری گاڑی میں کسی سے کہہ کر تمہارے گھر پہنچانے کا بندوبست کر دوں گا۔" ریسٹوران سے نکل کر وہ واپس توحید احمد کی گاڑی میں ان کے پہلو میں آ کر بیٹھی تو انہوں نے پیشکش کی۔

"آپ بہت اچھے ہیں۔ دل کی بات بھی سمجھ لیتے ہیں۔ میں خود بھی آپ سے یہی کہنا چاہ رہی تھی لیکن ہمت نہیں ہو رہی تھی۔" اس نے بے ساختہ ہی ان کے بازو کو دونوں

ہاتھوں میں دبوچتے ہوئے تشکر کا اظہار کیا اور پھر اپنا سر ان کے شانے سے ٹکا لیا۔ انہوں نے کوئی تعرض نہیں کیا۔

"میں اس دنیا میں بہت تنہا رہ گئی ہوں۔ آج آپ کے ساتھ وقت گزار کر ایسا لگا جیسے مجھے میرا کوئی اپنا مل گیا ہو۔" وہ ان کے شانے سے سر ٹکائے خوابیدہ لہجے میں بولنے لگی۔ ایک تو اس کا حُسن بے مثال، پھر اس کے بدن سے پھوٹتی مہک اور اس پر سے خودسپردگی کا یہ انداز... گاڑی کی فضا بڑی رومان پرور ہوگئی۔ توحید احمد اس کی باتیں سنتے اس کی بتائی ہوئی سمتوں میں گاڑی دوڑاتے رہے۔ آخر کار ایک اپرمڈل کلاس ایریا کے مکان پر پہنچ کر ان کا سفر اختتام پذیر ہوا۔

"اندر چلیے نا۔ جانے کیوں آج خالی مکان میں تنہا جاتے ہوئے روزانہ سے زیادہ وحشت ہو رہی ہے۔" گاڑی رکی تو اس نے بجائے نیچے اترنے کے ان کا ہاتھ تھام لیا۔

"اوکے... ایز یو وش۔" توحید احمد نے اسے مایوس نہیں کیا اور گاڑی سے نیچے اتر آئے۔ وہ دروازے کا لاک کھول کر اندر داخل ہوئی تو وہ اس کے ساتھ ساتھ تھے اور جانے اسے تنہائی کی وحشت سے نجات دلانے کے لیے کیا کرنے والے تھے۔

☆☆☆

فائیو اسٹار ہوٹل کا وہ کمرا کسی خواب کی تعبیر کی طرح تھا۔ کمرے کو دیکھ کر صاف اندازہ ہو رہا تھا کہ اسے خصوصی طور پر تیار کروایا گیا ہے۔ پورے کمرے میں پھولوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا جن کی بھینی بھینی خوشبو نے کمرے کی فضا کو معطر کر رکھا تھا۔

"آپ کے کمرے میں پھل، دودھ، مٹھائیوں اور مشروبات وغیرہ سے بھری ٹرالی پہنچا دی گئی ہے۔ اگر آپ کو کسی چیز کی کمی محسوس ہو تو انٹرکام پر ہمیں مطلع کر سکتے ہیں۔ مطلوبہ شے فوراً آپ تک پہنچا دی جائے گی۔" وہ انتظامیہ کا کوئی فرد تھا جو ریسپشن سے ان کے ساتھ یہاں تک آیا تھا اور اب کمرے کے دروازے کے قریب کھڑا احترام سے کہہ رہا تھا۔ کمرے میں موجود بے شمار پھولوں کے علاوہ پھولوں کا ایک گلدستہ اس نے بھی ہوٹل انتظامیہ کی طرف سے پیش کیا تھا جو اس وقت ماہ بانو کے ہاتھوں میں تھا۔

"تھینکس! اگر ہمیں ضرورت محسوس ہوئی تو ضرور آپ کو مطلع کریں گے۔" اسلم نے اسے نرمی سے جواب دیا۔ یہ ایک طرح سے اس کے لیے اشارہ بھی تھا کہ اب وہ وہاں سے جا سکتا ہے۔

"وش یو گڈ لک۔" وہ بھی عقل مند تھا، اشارہ پاتے ہی فوراً پلٹ گیا۔ اسلم دروازہ بند کر کے کمرے کے وسط میں کسی مجسمے کی طرح ایستادہ ماہ بانو تک آیا۔

"ایسا لگتا ہے کہ کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ ہم خانماں بربادوں کو بھی ایسا خوب صورت حجلۂ عروسی نصیب ہوگا، سوچا ہی کب تھا۔ میرا تو بس یہ خیال تھا کہ ہمارا نکاح ہوگا اور ہم واپس فلیٹ پر لوٹ جائیں گے لیکن محترم اے سی صاحب نے تو اس جنت میں پہنچا دیا۔" اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے خود سے قریب کرتے ہوئے وہ خوشی سے بھرپور لہجے میں بولا۔ آج کا دن اس کے لیے بڑا مرادوں والا تھا جسے دیکھتے ہی اپنا دل ہار بیٹھا تھا۔ آج وہ پورے حقِ ملکیت کے ساتھ اس کے ہمراہ اس خوب صورت خلوت کدے میں موجود تھی۔ دل چاہتا تھا بہک جائے اور اسے بھی اپنے ساتھ جذبات کی تیز رو میں بہا لے جائے مگر وہ... کچھ کھوئی کھوئی سی تھی۔ بیش قیمت عروسی جوڑا، نکاح کا بھرپور انتظام، مہنگے ترین ہوٹل میں یہ سجا سجایا خوب صورت کمرا اور اس کے پرس میں پڑا بھاری مالیت کے چیک کا لفافہ... یہ سب کیا تھا؟ اس سے تعلقِ خصوصی کا اظہار یا پھر کوئی مداوا؟

اس نے ہوٹل آتے ہوئے راستے میں شہریار کے دیے لفافے کو کھول کر دیکھ لیا تھا اور اس میں موجود چیک پر لکھی رقم دیکھ کر ششدر رہ گئی تھی۔ اتنی بڑی رقم کا تحفہ ہر کس و ناکس کو نہیں دیا جاتا۔ نہ ہی ہمدردی میں اس حد تک جایا جاتا ہے۔ یہ تو بس اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ سامنے والا دینے والے کو بہت عزیز ہو۔ آج ایک دن میں شہریار نے اسے اپنی محبت کے اتنے ثبوت دیے تھے کہ اس کے دل میں کوئی شک باقی نہیں رہا تھا۔ لیکن اب اپنے یقین کا وہ کیا کرتی؟ اب تو اسے سوچنا بھی جرم تھا۔ وہ اب اسلم کی بیوی تھی اور قانوناً و مذہبی طور پر اس سے وفا نبھانے کی پابند۔ فرض، وفاداری کا تقاضا تھا کہ اب اس کے سوا کسی دوسرے کے خیال کو بھی ذہن سے نہ گزرنے دیا جائے اور اس وقت وہ خود سے اسی جنگ میں مصروف تھی۔

"لوگ اپنے محبوب کو ساری زندگی پھولوں بھری... راہ گزر پہ چلانے کی خواہش کرتے ہیں۔ تم مجھے اتنی عزیز ہو کہ میرا دل چاہتا ہے، تمہیں اتنی بھی زحمت نہ کرنی پڑے اور میں تمہیں اپنی بانہوں کے جھولے میں جھلاتا رہوں۔"

اس کی کیفیت سے انجان اسلم نے یکایک اسے زمین سے اٹھا کر اپنی بانہوں میں تھام لیا اور چند قدم کا فاصلہ طے کر کے آہستگی سے پھولوں کی پتیوں سے بھرے نرم بستر پر

اتار دیا پھر وہ خود بھی گرنے والے انداز میں اس کے قریب ہی دراز ہو گیا۔ ماہ بانو اس کے بہکے بہکے تیور دیکھ رہی تھی لیکن آج وہ اسے کسی صورت نہیں روک سکتی تھی۔ آج وہ پورے حق سے اس کے قریب آیا تھا۔ وہ فطری حیا سے مجوب ہوتی ہوئی سر جھکا کر بیٹھ گئی۔ اسلم نے مسکراتے ہوئے مزید پیش قدمی کی اور اپنا سر اس کے زانو پر رکھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ماہ بانو کا ہاتھ کانپنے لگا۔

"بالکل چھوئی موئی ہو۔" اس کی حالت دیکھ کر وہ سرشاری سے ہنسا پھر ذرا سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔ "حسبِ قاعدہ مجھے اس وقت تمہیں منہ دکھائی میں کچھ دینا چاہیے۔ لیکن افسوس کہ میرے پاس ایسا کوئی انتظام نہیں ہے۔ تم سوچ رہی ہوگی کہ میرے پاس اچھی خاصی رقم موجود ہے، اس کے باوجود میں کوئی انتظام نہیں کر سکا... تو جانِ من... اس کی وجہ یہ ہے کہ میرے پاس جو کچھ ہے، وہ لوٹ کا مال ہے جسے میں انتہائی ضرورت کے لیے تو پھر بھی مجبوراً استعمال کر رہا ہوں لیکن ان انمول لمحوں میں تمہیں کوئی یادگار تحفہ دینے کے لیے ہرگز وہ رقم خرچ نہیں کرنا چاہتا۔ تمہارا تحفہ مجھ پر ادھار ہے۔ جب میرے پاس حق حلال کی آمدنی ہوگی تو میں ضرور تمہیں پیارا سا تحفہ دوں گا۔ ابھی تو میرے پاس بس میری خالص محبت ہے جسے میں تمہارے قدموں میں رکھ کر قبولیت کی درخواست کر سکتا ہوں۔" وہ بڑی دل سوزی سے سب کچھ کہتا چلا گیا۔ اب ماہ بانو کے لیے اپنی خاموشی کو برقرار رکھنا ممکن نہیں تھا۔ اس نے اپنے لب وا کیے۔

"مجھے خوشی ہے اسلم کہ آپ نے اس انداز میں سوچا۔ میں نے زندگی میں کبھی مادی چیزوں کو اہمیت نہیں دی۔ میرے نزدیک انسانی جذبات کوہِ نور ہیرے سے بھی بڑھ کر قیمتی ہیں۔ آپ نے میری انگلی میں موجود یہ انگوٹھی دیکھی ہے نا۔ یہ زہر مہرہ پتھر کی انگوٹھی ہے جو مجھے مشاہرم خان کی بھانجی زاد بہن نے دی تھی۔ اس بظاہر معمولی اور بھدی انگوٹھی کو میں اس دن سے مسلسل اپنی انگلی میں پہن کر اس لیے رکھتی ہوں کہ مجھے اس لڑکی کے خلوص نے بہت متاثر کیا تھا۔ پھر آپ کی تو بات ہی الگ ہے۔" روانی سے بولتے ہوئے اس نے ذرا سا توقف کیا اور پھر دوبارہ سلسلۂ کلام شروع کرتے ہوئے ذرا مسکرا کر بولی۔

"محبت قدموں میں رکھنے والی چیز نہیں ہوتی جناب... اسے دل میں بہت عزت و احترام سے رکھا جاتا ہے۔ میں نے بھی آپ کی محبت کو یہی مقام دیا ہے۔" اسلم کے شوہر کے عہدے پر فائز ہوتے ہی اس نے اس کے ساتھ اپنا طرزِ تخاطب بدل لیا تھا اور "تم" کا صیغہ چھوڑ کر اسے "آپ" کہہ کر مخاطب کر رہی تھی۔

"مجھے خوشی ہے کہ تمہارے دل میں میری محبت کے لیے کچھ جگہ نکل آئی ورنہ تم تو صاف انکار کر چکی تھیں۔" اسلم نے اس کی ماضی میں کہی بات کے حوالے سے کہا۔

"ہاں... اس وقت مجھے یہی لگا تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ انسان کے جذبات و خیالات میں بھی وقت کے ساتھ ساتھ کچھ نہ کچھ تبدیلی آ ہی جاتی ہے۔ پھر محبت تو بہتے پانی کی طرح ہے۔ جیسے بہتا پانی اپنی جگہ بنا لیتا ہے، اسی طرح محبت بھی خود بخود اپنی جگہ بنا ہی لیتی ہے۔" اس نے گہرا سانس لیتے ہوئے اعتراف کیا۔ سچ بھی یہی تھا کہ بے شک وہ شہریار کی محبت کی اسیر تھی لیکن اسلم کی محبت کے تند و تیز ریلوں نے کچھ مقامات پر ایسی دراڑیں پیدا کر دی تھیں کہ وہ خود کو بہت سے دلائل سے قائل کرنے کے بعد ہی سہی، اس سے شادی کرنے پر راضی ہو گئی تھی اور آج اس کی بیوی کی حیثیت سے اس خلوت کدے میں موجود تھی۔

"میرا مقصد تمہیں کچھ جتانا نہیں تھا۔ میں تو بس یہ بتانا چاہتا تھا کہ آج میں کتنا خوش ہوں اور آج دنیا کا ہر غم بھول کر خود کو بس تمہاری ذات میں گم کر لینا چاہتا ہوں۔" اس کا لہجہ یکدم ہی مخمور ہو گیا اور ماہ بانو کے لیے پھر ممکن نہ رہا کہ مئے محبت پی کر بہکتے ہوئے اس شخص کے جذبات کے آگے بند باندھ سکے۔ وہ بس اس منہ زور سمندر میں ڈوبتی ابھرتی رہ گئی۔

☆☆☆

"آپ کیا پینا پسند کریں گے؟ میرے پاس نئی پرانی شرابوں کی کئی اقسام ہیں۔" توحید احمد اور فلک کے درمیان بے تکلفی کے مراحل اس تیزی سے طے ہوئے تھے کہ وہ ان کو اپنے ساتھ بیڈ روم تک لے آئی تھی اور اب ایک الماری کھولے ان سے پوچھ رہی تھی۔

"گویا تم یہ شغل بھی کرتی ہو؟" وہ بہت آرام سے اس کے نرم گداز بستر پر بیٹھے ہوئے اسے مخمور نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ اس نے ان کی پسند پوچھی تو کہے بغیر نہ رہ سکے۔

"میں نے آپ کو بتایا تھا نا کہ میرا شوہر ایک لینڈ لارڈ کا بیٹا تھا۔ اس طبقے میں شراب اور شباب کے فراوانی سے استعمال سے بھی آپ بخوبی واقف ہوں گے۔ شروع شروع میں، میں اس کے اصرار پر صرف اسے خوش کرنے کے لیے پیتی تھی، بعد میں عادی ہو گئی۔ اب تو یہ مجھے اپنی دوست لگتی ہے جس میں ڈوب کر میں وقتی طور پر ہی سہی، اپنے سارے دکھ

اور پریشانیاں بھول جاتی ہوں۔" اس کی خوب صورت آنکھوں میں اداسی کے رنگ جھلکنے لگے۔

"اوہ پلیز نو... اداس مت ہونا۔ قسمت سے اگر مجھے تم جیسی حسینہ کے ساتھ وقت گزارنے کا موقع مل ہی گیا ہے تو میں اسے فن کمپیل کر گزارنا چاہتا ہوں۔" توحید احمد نے اسے فوراً ٹوک دیا۔

"او کے جناب! میں اداس نہیں ہوتی۔ آپ بتائیں کہ کیا پینا پسند کریں گے؟" وہ سر جھٹک کر فوراً ہی اداسی کے نرغے سے نکل آئی اور ان سے ان کی پسند پوچھنے لگی۔

"تم میزبان ہو، جو پلا دو مجھے منظور ہوگا۔ ویسے بھی مجھے یقین ہے کہ شراب سے زیادہ تم مدہوش کر دینے والی چیز ثابت ہوگی اور تمہارے ہاتھ سے تو سادہ پانی پی کر بھی بندے کو نشہ ہو جائے گا۔"

سپر اسٹور میں نظر آنے والی ان کی بارعب شخصیت کہیں دب کر رہ گئی تھی اور اب صرف ایک ٹھیٹ عاشق نظر آ رہا تھا۔ فلک نے ان کی بات کے جواب میں کچھ کہنے کے بجائے صرف دھیمے سروں میں ہنسنے پر اکتفا کیا اور ٹرے میں شراب کی بوتل کے ساتھ دیگر لوازمات سجا کر ان کے مقابل آ بیٹھی۔

"آپ شاید یقین نہ کریں کہ آج بہت عرصے بعد میں یوں کھل کر ہنسی ہوں۔" گلاسوں میں شراب ڈال کر اس میں سوڈے اور برف کی آمیزش کرتے ہوئے اس نے ان سے کہا اور ایک گلاس انہیں تھما دیا۔

"ہماری دوستی کے نام۔" گلاس منہ سے لگانے سے قبل توحید احمد نے اس کے گلاس سے اپنا گلاس ٹکرایا اور پھر ان دونوں نے بیک وقت سنہری رنگ کا وہ آتشیں محلول اپنے حلق میں انڈیل لیا۔ فلک نے فی الحال دونوں کے لیے ہی چھوٹا پیگ تیار کیا تھا چنانچہ وہ تیزی سے اپنے گلاس خالی کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ فلک نے فوراً ہی دوبارہ ساقی گری کی ذمے داری سنبھال لی اور اس بار ڈبل پیگ تیار کیا۔

"تمہارے سابقہ شوہر کا ذوق بہت عمدہ ہے۔ شباب سے لے کر شراب تک اس نے ہر عمدہ شے جمع کی ہے۔" فلک کے سانچے میں ڈھلے ہوئے جسم پر ایک حریصانہ سی نظر ڈالتے ہوئے توحید احمد نے شاید شراب کی تعریف میں وہ کلمات ادا کیے تھے۔

فلک نے کوئی جواب نہیں دیا اور ایک توبہ شکن انگڑائی لیتے ہوئے بولی۔ "آپ انجوائے کریں توحید صاحب! میں ذرا چینج کر آؤں۔ اصل میں ان کپڑوں میں، میں کچھ ایزی فیل نہیں کر رہی ہوں۔"

"او کے جاؤ لیکن ذرا جلدی آنا۔" توحید احمد نے ٹھیٹ عاشقوں کے انداز میں کہا اور گلاس ایک بار پھر منہ سے لگا لیا۔ فلک لہراتی ہوئی ملحقہ باتھ روم میں گھس گئی۔ سات منٹ لگا کر وہ واپس آئی تو اس حال میں تھی کہ بڑے بڑے زاہدوں کا ایمان ڈگمگا جائے۔ نئی شرٹ اور جینز کی جگہ کپڑے کے جن دو ٹکڑوں نے لی تھی، وہ کسی سے بھی لباس کہلائے جانے کے لائق نہیں تھے اور اس کا کندن سا بدن کسی کھلی کتاب کی طرح توحید احمد کے سامنے ظاہر ہو گیا تھا۔ وہ ایک ٹک اسے دیکھتے ہی رہ گئے۔ اس نے ایک فریبی مسکراہٹ کے ساتھ ان کی یہ محویت توڑی اور یہ دیکھ کر مطمئن ہو گئی کہ درمیانی وقفے میں انہوں نے اپنا گلاس خالی کر لیا ہے۔

"آہ... شہزادہ سلیم نے تمہارا یہ روپ دیکھ لیا ہوتا تو انارکلی کو بھول جاتا۔ میرا بڑی شدت سے دل چاہ رہا ہے کہ کاش میں کسی ملک کا بادشاہ ہوتا اور اپنا تخت و تاج تمہارے قدموں میں نچھاور کر دیتا۔" توحید احمد نے لب کشائی کی تو الفاظ میں اس کے لیے پذیرائی ہی پذیرائی تھی۔

"اصل میں مجھے بہت زیادہ کپڑے پہن کر سکون سے نیند نہیں آتی۔" وہ جیسے اپنی صفائی پیش کرنے لگی۔

"اور تمہیں اس حال میں دیکھ لینے والوں کی عمر بھر کی نیندیں اڑ جاتی ہوں گی۔" وہ برجستہ بولے۔

"مجھے اس حال میں میرے شوہر کے سوا صرف آپ دیکھ رہے ہیں۔ میں کوئی بازار میں بیٹھی طوائف نہیں جو سب مجھے یوں دیکھ سکیں۔" اس کی ادائیں کچھ کہہ رہی تھیں اور زبان پہ کچھ تھا۔ توحید احمد نے اس سے بحث نہیں کی اور اس کے اپنے قریب بیٹھنے پر اسے مخمور نظروں سے دیکھتے رہے۔ اس نے غیر محسوس طور پر ایک جام اور تیار کر کے ان کے لبوں سے لگا دیا۔

"آپ میں کچھ تو ایسا ہے جو آپ کے مخالف ایج گروپ کے ہونے کے باوجود مجھے آپ کی طرف کھینچ رہا ہے۔ آپ مجھ سے اپنا تفصیلی تعارف کروائیے نا۔ میں بھی جانوں کہ خاص دکھنے والے اس شخص کا ظاہر ہی اتنا شاندار ہے یا پھر بیک گراؤنڈ میں بھی کچھ ایسا ہے جو آپ کو خاص بنا رہا ہے۔" انہیں اپنے ہاتھوں سے پلاتی وہ بہت لاڈ سے پوچھ رہی تھی۔ توحید احمد کے غبارے میں گویا ہوا بھر گئی اور وہ سرشاری سے ہنس دیے۔

"تم نے دیکھا ہی کیا ہے جان من! جب ہم جوانی میں فوج کی یونیفارم پہنتے تھے تو لڑکیوں کے غول کے غول ہم پہ

مشٹلانے لگتے تھے۔ کوئی ادھر گرتی تھی تو کوئی اُدھر۔۔۔ اور ہم یوسف ثانی بنے بے نیازی سے گزرتے چلے جاتے تھے۔'' ہاتھ سے لڑکیوں کے اِدھر اُدھر گرنے کا اشارہ کرتے ہوئے ان کی زبان میں واضح لڑکھڑاہٹ تھی۔ یقینی طور پر بنتِ انگور نے اپنا کام دکھانا شروع کر دیا تھا۔

''اب آپ کس عہدے پر ہیں؟'' ان کے شانے پر سر ٹکاتے ہوئے فلک نے تجسس سے پوچھا۔

''اب ہم آرمی انٹیلی جنس میں کرنل کے عہدے پر کام کرتے ہیں۔ بڑا نام ہے ہمارا آرمی میں بھی۔ صدر اور وزیراعظم تک ہمارا دم بھرتے ہیں۔ بڑے بڑے سورماؤں کو ہم نے اپنے ہاتھوں سے ٹھکانے لگایا ہے۔'' ایسا لگتا تھا کہ وہ فلک کے سامنے اپنی شان بڑھا چڑھا کر بیان کرنا چاہتے ہوں۔ حالت بتا رہی تھی کہ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ نشہ گہرا ہوتا جا رہا ہے لیکن وہ پینے سے باز نہیں آ رہے تھے۔ فلک بھی پوری مستعدی سے انہیں پلا رہی تھی اور ان کا گلاس خالی نہیں ہونے دے رہی تھی۔

''آپ تو واقعی سچ مچ بڑے زبردست آدمی ہیں۔ آپ نے تو بڑے بڑے مجرموں کو ٹھکانے لگایا ہوگا؟'' پلانے کے ساتھ ساتھ وہ انہیں چڑھانے کا کام بھی کر رہی تھی۔

''یہ تو ہے۔ میری سروس بھری پڑی ہے ایسے کارناموں سے۔'' انہوں نے ایک ہچکی لیتے ہوئے جواب دیا۔

''ان مجرموں میں را کے جاسوس بھی ہوتے ہوں گے؟'' یہ یقین ہونے پر کہ ان کا نشہ گہرا ہو چکا ہے اور دماغ مخصوص سمت میں چل رہا ہے، اس نے گفتگو کو نازک مرحلے میں داخل کیا اور خود ان سے کچھ اور بھی قریب ہو گئی۔

''را کے کتے تو میرا خاص شکار ہیں۔ جہاں ملیں، انہیں چُن چُن کر پکڑتا ہوں اور پھر ان کی کھال ادھیڑ کر رکھ دیتا ہوں۔'' انہوں نے نفرت زدہ لہجے میں جواب دیا۔

''سنا ہے پچھلے دنوں آپ نے اشیش کمار نامی کسی را کے ایجنٹ کو پکڑا ہے؟'' وہ ان پر پوری طرح لد گئی اور واضح سوال کیا۔

''اشیش۔۔۔ کو۔۔۔ مار۔۔۔ یہ سالا کون ہے؟'' انہوں نے اپنی کنپٹی کو انگلیوں سے سہلاتے ہوئے ذہن پر زور دینے کی کوشش کی۔

''ہوسکتا ہے اس نے آپ کو اپنا نام غلط بتایا ہو۔ یہ وہ شخص ہے جسے آپ لوگوں نے پنڈی سے کافی دور ایک پسماندہ گاؤں سے پکڑا تھا۔ وہاں وہ مولوی کے بھیس میں رہ رہا تھا۔'' فلک نے اس کی یادداشت بحال کرنے کے لیے اشارے دیے۔

''آ۔۔۔ چھا۔ وہ اشیش کو۔۔۔ مار۔ وہ سالا تو ابھی بھی میرے ہی پاس ہے۔'' وہ مکمل طور پر بہکے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

''ہاں، وہی اشیش کمار۔ آپ نے اسے کہاں رکھا ہے؟ اس تک پہنچنے کا طریقہ بتائیں؟'' اس نے دیکھا کہ کرنل اتنا مدہوش ہو گیا ہے کہ غنودگی میں جانے لگا ہے تو ان کا کالر پکڑ کر جھنجوڑتے ہوئے پوچھنے لگی۔

''ریلیکس ڈارلنگ ریلیکس۔۔۔ تمہیں اتنی بے تابی ہے تو میں خود تمہیں ہی اشیش کمار تک پہنچا دوں گا۔'' یکدم ہی کرنل سیدھا ہو بیٹھا اور صاف لہجے میں سنجیدگی سے بولا تو فلک اچھل پڑی اور بے یقینی سے اسے دیکھنے لگی۔ آنکھوں کی سرخی کے علاوہ کرنل توحید کہیں سے بھی شراب کے نشے میں محسوس نہیں ہو رہے تھے۔

''کیا میں جان سکتا ہوں کہ مجھے را کی کس ایجنٹ سے شرفِ ملاقات حاصل ہو رہا ہے؟'' اس کی حیرت سے محظوظ ہوتے ہوئے انہوں نے طنزیہ لہجے میں سوال کیا۔

''یہ کیا بکواس ہے؟ میں کسی را کے ایجنٹ کو نہیں جانتی۔'' وہ بپھر گئی۔

''ساری جان پہچان ہم خود اگلوا لیں گے۔ میں اور میرے آدمی اس کام میں ایکسپرٹ ہیں۔'' انہوں نے اسے اپنی نظروں میں رکھتے ہوئے جواب دیا۔

''آپ کس قسم کی باتیں کر رہے ہیں؟ میری سمجھ میں بالکل بھی نہیں آ رہا۔'' وہ ان سے دور سرک کر تقریباً بیڈ کے دوسرے کنارے پر پہنچ گئی تھی۔

''لیکن میں اسی وقت سمجھ گیا تھا جب تم سپر اسٹور میں زبردستی میرے گلے پڑ گئی تھیں۔ تمہارا ایکٹ کیا ہوا ڈراما کافی بھونڈا تھا۔ پھر پارکنگ میں کھڑی تمہاری جعلی نمبروں والی گاڑی نے بھی مجھے احساس دلایا کہ تم کچھ گڑبڑ چیز ہو۔ اس لیے تمہاری حقیقت جاننے کے لیے میں جان بوجھ کر تمہارے جال میں پھنستا چلا گیا۔ تم نے مجھے اپنے شباب اور شراب کے نشے میں ڈبونا چاہا تو میں نے خود کو تمہارے سامنے بے بس ظاہر کیا اور بالآخر بلی تھیلے سے باہر آ ہی گئی۔ تم کن لوگوں کے لیے کام کر رہی ہو، یہ تو میں جان ہی چکا ہوں، اپنا باقی بائیوڈیٹا تم خود بتاؤ گی۔ شرافت سے بتاؤ گی یا ٹارچر روم میں، یہ تمہاری اپنی مرضی ہے۔'' وہ بہت اطمینان سے بول رہے تھے۔ فلک جو بیڈ کے کنارے تک کھسک آئی تھی ☆

یکدم ہی تیزی سے حرکت میں آئی اور سائیڈ ٹیبل پر رکھا لیمپ اٹھا کر انہیں کھینچ مارا۔ وہ ریلیکس نظر آنے کے باوجود ہوشیار تھے اس لیے فوراً جھکائی دے گئے اور پھرتی سے چھلانگ لگا کر دروازے کی طرف دوڑتی فلک کو چھاپ لیا۔ اس کا نازک جسم ان کے لمبے چوڑے وجود کے نیچے پس کر رہ گیا لیکن وہ کوئی معمولی لڑکی نہیں تھی جو فوراً ہار مان لیتی۔ اس نے الٹا گرے گرے ہی اپنے ہاتھ کو حرکت دی اور کہنی کی زوردار ضرب کرنل کے پہلو میں پڑی۔ اس نے اس ایک ضرب پر اکتفا نہیں کیا بلکہ لگاتار اپنے ہاتھوں پیروں اور سر کو حرکت میں لاتی چلی گئی۔ یقینی طور پر وہ ایک ماہر لڑاکا تھی جو انتہائی خراب پوزیشن میں ہونے کے باوجود اپنے دفاع سے دست بردار نہیں ہوئی تھی۔

کرنل کو مجبوراً اسے چھوڑ کر کھڑا ہونا پڑا اور انہوں نے بائیں پیر کی ایک زوردار ضرب اس کی کمر پر لگائی۔ وہ اچھل کر دیوار سے ٹکرائی اور یہ یقینی طور پر اس کی بدقسمتی تھی کہ دیوار سے ٹکرا کر اس کا سر پھٹ گیا اور وہ بُری طرح چکرا گئی۔ کرنل نے فوراً موقع کا فائدہ اٹھایا اور ہتھیلی کی ایک جچی تلی ضرب اس کی کنپٹی پر لگا دی۔ وہ لہرا کر فرش پر گر گئی۔ کرنل نے حقارت سے اس کے بے ہوش وجود کو دیکھا اور اپنے پاس موجود آپریٹس کا بٹن پش کیا۔ ''اندر آجاؤ۔'' مختصر حکم دے کر انہوں نے آپریٹس واپس رکھ لیا اور خود اطمینان سے دوبارہ بستر پر بیٹھتے ہوئے شراب کی بوتل کھول کر منہ سے لگالی۔ گلاس اور دیگر سامان تو ان کی ہاتھا پائی میں اِدھر اُدھر گر کر برباد ہو گیا تھا لیکن بستر پر لڑھک جانے والی بوتل محفوظ رہی تھی اور اب وہ مزے سے نیٹ ہی پی رہے تھے۔ ان جیسے بلانوش کے لیے یہ کوئی مشکل بات نہیں تھی اور دو چار پیگ تو ان کے لیے پانی کی طرح بے ضرر ثابت ہوتے تھے۔ اسی لیے وہ اپنے سامنے فرش پر پڑی حسینہ کو آسانی سے مات دینے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

''اس کی تلاشی لو اور کپڑوں کو چھوڑ کر معمولی سے معمولی شے بھی الگ کر کے اپنے قبضے میں لے لو۔ دانت وغیرہ بھی اچھی طرح چیک کر لینا کہ کہیں اس نے کسی کھوکھلی ڈاڑھ میں کوئی زہریلا کیپسول وغیرہ نہ چھپا رکھا ہو۔ مجھے یہ لڑکی ہر حالت میں زندہ سلامت چاہیے، اس لیے خیال رکھنا کہ کسی صورت اسے سوسائڈ کا موقع نہ ملے۔ اسے مقامی یونٹ پہنچانے کے بعد اپنے انچارج سے کہو کہ مجھے رپورٹ کرے۔'' وہ مفت ہاتھ آئی بوتل کا کام تمام کرنے میں لگے تھے کہ قدموں کی آہٹ ابھری اور ایک نوجوان سکیم رنی گارڈ کے یونیفارم میں اجازت لے کر اندر داخل ہوا۔ نوجوان نے اندر آتے ہی فوجی انداز میں انہیں سیلیوٹ مارا۔ وہ فوراً ہی اسے تفصیلی احکامات جاری کرنے لگے۔ ان کی ہدایات کو مستعدی سے ذہن نشین کرتا وہ فوراً ہی حرکت میں آ گیا۔ کرنل بنتِ انگور سے لطف اندوز ہوتے خاموشی سے اس کی کارکردگی کا جائزہ لیتے رہے۔

☆☆☆

وہ بالکل چت لیٹا ہوا تھا۔ اپنے جذبات کو قابو کر لینے کے لیے اسے کافی مہلت مل گئی تھی اور اب اس پر طوفان کے گزر جانے کے بعد کی سی خاموشی طاری تھی۔ اس خاموشی میں اس کے موبائل کی وائبریشن نے معمولی سا ارتعاش پیدا کیا۔ رنگ ٹون اس نے جان بوجھ کر بند کی ہوئی تھی کہ وہ اس وقت اپنے اندر کی آوازوں کے سوا کوئی آواز نہیں سننا چاہتا تھا لیکن ماحول پر چھائے جمود کو توڑنے کے لیے صرف وائبریشن ہی کافی ہوئی۔ اس نے موبائل نکال کر اسکرین پر آنے والا نام دیکھا۔ مشابرم خان کی طرف سے کال آ رہی تھی۔ اسے یکدم ہی یاد آیا کہ اس نے مشابرم خان کو ایک اہم ذمے داری سونپ رکھی تھی لیکن خود اس بُری طرح الجھ گیا تھا کہ اسے فراموش ہی کر بیٹھا تھا۔ اتنے گھنٹوں بعد مشابرم خان کے کال کرنے کا مطلب تھا کہ کوئی خاص بات ہے، اس نے فوراً ہی کال ریسیو کر لی۔

''ہاں خان! بولو کیا بات ہے؟''

''صاحب! میں آپ کے حکم پر مسلسل بیگم صاحب کے پیچھے ہوں اور کسی بھی معاملے میں ٹانگ اڑائے بغیر ان پر نظر رکھ رہا ہوں۔ وہ کدھر کدھر گئیں، یہ تفصیل بتانے کا تو ابھی موقع نہیں ہے۔ ابھی میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ کئی گھنٹے پہلے وہ ایک پھیرو والے آدمی کے ساتھ ایک گھر میں گئی تھیں۔ گھر کی چابی ان کے پاس تھی۔ اس کا مطلب ہے وہ خود اس آدمی کو اپنے ساتھ لے گئی تھیں۔ کافی دیر ہو گئی، میں باہر چھپ کر ان کے نکلنے کا انتظار کر رہا ہوں لیکن وہ باہر نہیں آئیں۔ البتہ سیکیورٹی گارڈ کے یونیفارم میں ایک آدمی جو پتا نہیں کہاں چھپا ہوا تھا، ابھی ابھی اندر گیا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ اندر کوئی گڑبڑ نہ ہو گئی ہو۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں گھر کے اندر جا کر دیکھوں؟'' مشابرم خان نے جلدی جلدی اسے مختصراً حالات سے آگاہ کرتے ہوئے اجازت طلب کی۔

''ابھی باہر رہ کر ہی نگرانی کرو اور مجھے گھر کا پتا لکھوا دو۔ میں خود وہاں آ رہا ہوں۔ اس دوران اگر کوئی گڑبڑ نظر آئے تو تم مجھے انفارم کر کے حرکت میں آ جانا۔'' شہریار نے

اسے ہدایات دیں۔

"آپ ادھر لاہور میں ہی ہیں سر؟" مشاہرم خان حیران ہوا۔

"ہاں لیکن تم پہلے کام کی بات کرو اور مجھے پتا بتاؤ۔" اس نے سختی سے جواب دیا۔ مشاہرم خان نے گڑبڑا کر فوراً ہی پتا بتا دیا۔

"ٹھیک ہے، میں پہنچ رہا ہوں۔" وہ رابطہ منقطع کر کے جانے کے لیے کھڑا ہوا۔ اسی وقت ذیشان دستک دے کر اندر داخل ہوا۔

"میں تو تمہیں جگانے کے لیے آیا تھا لیکن لگ رہا ہے کہ تم تو پہلے ہی سے جانے کی تیاری کر رہے ہو۔" اس نے ایک نظر میں ہی اس کی حرکات کو بھانپ لیا۔

"ہاں، مجھے جانا ہے۔" اس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"کچھ دیر رک جاتے تو ہم تمہارے لائے ہوئے بندے کے ساتھ ساتھ ایک اور اہم قیدی سے تمہاری موجودگی میں ہی تفتیش کروا لیتے۔ میں نے تمہیں بتایا تھا نا کہ کرنل صاحب آج کل لاہور میں ہی ہیں اور کرنل صاحب نے ہی اس آفت کی پرکالہ کو پکڑا ہے۔ اس وقت وہ ماڈل ٹاؤن کے ایک مکان میں موجود ہے اور تھوڑی ہی دیر میں میرا آدمی اسے لے کر پہنچ جائے گا۔" ذیشان کے کہے کو غیر دلچسپی سے سنتا وہ ماڈل ٹاؤن کا نام سن کر چونک پڑا۔ مشاہرم خان نے بھی تو اسے ماریا کی ماڈل ٹاؤن کے کسی مکان میں موجودگی کی اطلاع دی تھی۔

"مکان نمبر معلوم ہے تمہیں... ذرا مکان نمبر تو بتاؤ؟" اس نے بے تابی سے ذیشان سے پوچھا تو وہ حیرت زدہ تو ضرور ہوا لیکن جواب دے دیا۔ اس کے جواب نے تصدیق کر دی کہ ذیشان جس آفت کی پرکالہ کا ذکر کر رہا ہے، وہ ماریا ہی ہے۔ وہ ڈھے جانے والے انداز میں واپس بیٹھ گیا۔ اسی وقت اس کے موبائل کی وائبریشن پھر محسوس ہوئی۔ کال کرنے والا مشاہرم خان ہی تھا۔

"پجیرو والا اکیلا واپس جا رہا ہے سر... لیکن اس نے ابھی اپنی گاڑی آگے نہیں بڑھائی ہے۔ سیکیورٹی گارڈ کی گاڑی بالکل مکان کے دروازے کے ساتھ لگی ہے اور ایسا لگتا ہے کہ پجیرو والا اس کا انتظار کر رہا ہے۔ آپ بتائیں، میرے لیے کیا حکم ہے؟" مشاہرم خان کا لہجہ سخت ہیجان زدہ تھا۔ شہریار سمجھ گیا کہ ماریا کو مکان سے نکال کر یہاں لانے کا بندوبست کیا جا رہا ہے اور کرنل صاحب یہ کام اپنی زیرِ نگرانی کروا رہے ہیں۔

"تم خاموشی سے وہاں سے نکل کر راناہاؤس چلے جاؤ خان! میں بعد میں تم سے رابطہ کروں گا۔" اس نے تھکن زدہ لہجے میں جواب دے کر فون بند کیا اور ذیشان کی طرف متوجہ ہو کر اسے مخاطب کیا۔

"پرل کانٹی نینٹل کے روم نمبر سکسٹی ایٹ پر ریڈ کرواؤ ذیشان۔ ممکن ہے وہاں سے ایک اور اہم مجرم تمہارے ہاتھ لگ سکے۔"

"کون؟ کس کی بات کر رہے ہو تم؟" ذیشان حیران ہوا۔

"مسز جوزف کی۔ کرنل صاحب کی طرف سے پکڑی جانے والی قیدی ڈاکٹر ماریا جوزف کی ماں اور یقینی طور پر شریکِ جرم۔" وہ بہت ٹوٹے ہوئے لہجے میں بتا رہا تھا۔ ماریا کے مشکوک ہونے کو محسوس کر لینے کے باوجود اس وقت وہ شدید ذاتی صدمے سے دوچار ہوا تھا شاید آج کا دن اس کے لیے تھا ہی سخت کہ اسے ایک کے بعد ایک امتحان سے گزرنا پڑ رہا تھا۔

ذیشان نے چاہے اس کی بات کا بیک گراؤنڈ پوری طرح نہ سمجھا ہو لیکن فوراً ہی حرکت میں آ گیا اور ایک سرکتی پارٹی کو پرل کانٹی نینٹل کی طرف دوڑا دیا۔ شہریار البتہ سر تھامے ایک جگہ بیٹھا رہا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ ان حالات کا سامنا کیسے کرے۔ ماریا کا جو کردار سامنے آیا تھا، وہ اس کے نیک نام خاندان کی عزت کو بٹا لگانے کے لیے کافی تھا۔ یہ بے عزتی لیاقت رانا اور آفرین کے لیے ایک اور بڑا صدمہ ثابت ہوتی۔ وہ بے چارے پہلے ہی اتنے صدمے سہہ کر بیٹھے تھے، اس نئے صدمے سے جانے ان پر کیا گزرتی۔ وہ سوچ سوچ کر ہلکان ہوا جا رہا تھا۔

"کیا بات ہے شہریار! تم کچھ پریشان لگ رہے ہو؟" ذیشان نے اس کے شانے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے ہمدردی سے پوچھا۔

"میں تمہیں گواہ بنا کر کچھ کہنا چاہتا ہوں ذیشان!" اس نے یکدم ہی اپنا سر اوپر اٹھایا۔ "میں تمہیں گواہ بنا کر اپنی بیوی کو بقائمی ہوش و حواس طلاق دیتا ہوں۔ آج سے میرا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ مجھ پر حرام ہے۔" وہ بہت روانی سے کہتا چلا گیا۔

"مگر کیوں دوست؟" ذیشان حیران پریشان تھا کہ وہ اتنی اچانک اور اتنا ذاتی فیصلہ آخر اسے کیوں سنا رہا ہے؟

"وہ اس لیے کہ جب تم ڈاکٹر ماریا جوزف سے تفتیش

کا آغاز کرو تو اسے صرف ملک دشمن کی حیثیت سے دیکھو اور میرا اس سے رشتہ تمہیں پریشان نہ کرے۔" اس کا لہجہ بہت صاف تھا۔

"تو کیا ماریا جوزف تمہاری...؟" ذیشان نے حیرت سے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"ہاں، وہ میری بیوی تھی۔ اپنی صفوں میں موجود غدار کو تلاش کرتے کرتے اس کا مشکوک کردار میرے سامنے آ گیا تھا۔ اسی لیے آج کل میں اس کی نگرانی کروا رہا تھا۔ ابھی کچھ دیر قبل میرے آدمی نے مجھے اس کی اسی مکان میں موجودگی کی اطلاع دی تھی جہاں سے بقول تمہارے ایک اہم مجرمہ کو گرفتار کر کے لایا جا رہا ہے۔" اس نے ذیشان کو مختصراً آگاہ کیا۔

"اوہ... آئی ایم سوری۔ مجھے واقعی افسوس ہے۔"

اس مختصر تفصیل نے ہی ذیشان کو اس کی کیفیت سمجھا دی۔

"تمہیں افسوس کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ میری حماقت تھی کہ میں اپنے گرد بُنے جانے والے جال میں پھنستا چلا گیا۔ ماریا میری زندگی میں بالکل اچانک آئی تھی اور حقیقتاً اس نے اس شادی کے لیے مجھے باقاعدہ ٹریپ کیا تھا۔" ذیشان کو یہ بتاتے ہوئے وہ وقت کسی فلم کے منظر کی طرح اس کے ذہن میں تازہ ہو گیا تھا جب جانے کیسے وہ ماریا کے حسن کے آگے بے بس ہو گیا تھا اور پھر اپنی غلطی کی تلافی کے لیے اس سے شادی کر لی تھی۔ اس وقت وہ اتنا شرمندہ تھا کہ اپنے بہکنے پر شدید حیران ہونے کے باوجود یہ نہیں سوچ سکا تھا کہ اس کے خلاف کوئی چال چلی گئی ہے۔ شاید اس روز ماریا نے اپنے فلاسک میں سے اسے جو کافی پلائی تھی، اس میں ایسی کوئی دوا شامل تھی جس نے اس کے جذبات کو بھڑکا ڈالا تھا اور وہ جائز و ناجائز کی تمیز کھو بیٹھا تھا۔ یہ بات اسے اس روز سمجھ نہیں آئی تھی لیکن آج بہت اچھی طرح سمجھ آ رہی تھی۔

"میں تمہارے معاملے کو اچھی طرح سمجھ سکتا ہوں۔ ہمارے دشمن بہت فعال ہیں اور اس طرح سے جال پھینکتے ہیں کہ بندہ نہ چاہتے ہوئے بھی پھنس جاتا ہے۔ میرے خیال میں تمہارے سامنے اس بات کا اعتراف کرنے میں کوئی حرج نہیں کہ بلتستان کی پہاڑیوں میں تباہ ہونے والے دہشت گردوں کے اڈے والے کیس پہ کام کرتے ہوئے ایک ایسی قتالہ مجھ سے ٹکرائی تھی جو صرف چند گھنٹوں میں مجھے بے وقوف بنا کر مجھ سے کافی معلومات اڑا لے گئی تھی۔ میں آج تک اپنی یہ ہار کر بھی اس حسینہ کا دیا زخم بھول نہیں سکا ہوں۔ لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ مسلم ممالک کو چھوڑ کر دنیا بھر کی سیکرٹ سروسز، عورتوں کو جاسوسی کے لیے استعمال کرتی ہیں۔ یہ ایک عالمگیر حقیقت ہے کہ عورت کے حسن اور چالبازیوں کے سامنے بڑے بڑے سورما ہار مانتے آئے ہیں۔ یہود و ہنود تو اس معاملے میں خصوصاً بڑے بے غیرت ہیں۔ اپنی عورتوں کو غیر مردوں کی بانہوں میں بھیج کر ان کے ذریعے اہم رازوں تک پہنچنا ان کا بڑا پرانا ہتھکنڈا ہے۔ ہم مسلمان اپنی مذہبی اور اخلاقی اقدار کی وجہ سے اس انداز میں کام کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں سیکرٹ سروس میں خواتین کام بھی کرتی ہیں تو بہت محدود پیمانے پر... اور وہ بھی زیادہ تر دفاتر کے اندر۔" ذیشان دلائل اور مثالوں سے اس کا احساسِ شرمندگی دور کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"اپنے کرنل صاحب اس جال میں پھنسنے سے کیسے بچ گئے؟" اس نے یہی مناسب سمجھا کہ فی الحال ٹینشن کو جھٹک کر خود کو ماحول کا حصہ بنا لے تاکہ کم از کم ذیشان کی تسلی ہو جائے اور وہ ماریا کے ساتھ اسی طرح پیش آ سکے جس کی وہ مستحق تھی۔

"اپنے کرنل صاحب بڑے عجیب و غریب بندے ہیں۔ شراب پانی کی طرح پیتے ہیں پھر بھی نشے میں آؤٹ آف کنٹرول نہیں ہوتے۔ عورت کے بارے میں البتہ شریعت کے تحت پابند ہیں۔ بغیر نکاح کے کسی عورت سے تعلق قائم کرنے کو سخت معیوب سمجھتے ہیں۔ اس لیے تین خواتین کو اپنی زوجیت میں لے رکھا ہے۔" ذیشان نے قہقہہ لگاتے ہوئے اس کی معلومات میں اضافہ کیا اور بولا۔ "تم خود ہی سوچو، ایسے بندے کو روایتی ہتھکنڈوں سے بھلا کیسے زیر کیا جا سکتا ہے؟ انگلوں کو مات تو ہونی ہی تھی۔"

"تمہارا آدمی ابھی تک پہنچا نہیں؟ میرے خیال میں ماڈل ٹاؤن سے یہاں تک کا راستہ اتنا زیادہ تو نہیں ہے کہ اسے اتنی دیر لگ گئی۔" باتوں کے دوران شہریار کو خیال آیا تو اس نے ذیشان کو احساس دلایا۔

"نارمل حالات میں اسے اب تک پہنچ تو جانا چاہیے تھا لیکن ہو سکتا ہے کہ ٹریفک میں کہیں پھنس گیا ہو۔ میں ابھی اس سے رابطہ کرتا ہوں۔" اطمینان سے جواب دے کر وہ رابطے کی کوششیں کرنے لگا لیکن دوسری طرف سے اس کی کال ریسیو نہیں کی جا رہی تھی۔ اسی وقت ایک شخص دستک دے کر اندر داخل ہوا اور رپورٹ دی۔

"پرل کانٹی نینٹل جانے والی ٹیم کی طرف سے رپورٹ آئی ہے سر! ہمارا ٹارگٹ وہاں سے ہٹ چکا ہے۔ روانگی سے قبل اس نے ہوٹل انتظامیہ کو آگاہ نہیں کیا تھا لیکن ہمارے

آدمی کمرے کی تلاشی لے کر دیکھ چکے ہیں کہ وہاں سے زنانہ کپڑوں سے بھرے ایک بیگ کے سوا سب کچھ ہٹا لیا گیا ہے۔ وہ بیگ ہمارے آدمی اپنے ساتھ لے کر آرہے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ ان لوگوں کو واپس آنے دو۔ فی الحال ہمیں ایک دوسرا بڑا مسئلہ درپیش ہے۔ میں اشرف کو کانٹیکٹ کرنے کی کوشش کر رہا ہوں لیکن اس کی طرف سے کوئی رسپانس نہیں مل رہا۔ اسے ٹریس کرنے کی کوشش کرو۔" ذیشان نے اپنے ماتحت کو حکم دیا تو وہ فوراً ایڑیوں کے بل واپس گھوم گیا۔

"میرے خیال میں ہم آپریشن روم میں چلتے ہیں۔ وہاں ہمیں فوری رپورٹس ملتی رہیں گی اور میرے ماتحتوں کو بار بار بھاگ کر رپورٹ دینے یہاں تک نہیں آنا پڑے گا۔" ماتحت کے روانہ ہوتے ہی وہ خود بھی کھڑا ہو گیا اور شہریار سے بولا تو اس نے اس سے اتفاق کیا۔ وہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے آپریشن روم میں پہنچے۔ اس کمرے میں دو افراد پہلے سے موجود تھے جبکہ کمرا مختلف قسم کے مواصلاتی آلات اور کمپیوٹرز وغیرہ سے بھرا پڑا تھا۔

"سر! اشرف کی کسی اجنبی نمبر سے کال آئی ہے۔ وہ اس وقت شدید زخمی حالت میں ہاسپٹل میں موجود ہے۔" ذیشان کو دیکھتے ہی ایک آدمی نے ہیجان زدہ لہجے میں اطلاع دی۔ یہ وہی شخص تھا جو کچھ لمحوں قبل اسے پرل کانٹی نینٹل جانے والی ٹیم کی ناکامی کی خبر سنانے آیا تھا۔

"اوہ، پھر تو ہمیں بھی ہاسپٹل پہنچنا ہوگا۔" ذیشان فوراً الرٹ ہو گیا اور ایک منٹ بھی ضائع کیے بغیر وہ لوگ فوراً وہاں سے روانہ ہو گئے۔ راستے میں اس نے کرنل توحید کو بھی حالات سے آگاہ کر دیا اور ساتھ ہی انہیں یہ بھی بتا دیا کہ اشرف کی جگہ ایک دوسرا شخص ان کی موجودہ قیام گاہ کی طرف روانہ کر دیا گیا ہے۔ اصل میں ذیشان، کرنل توحید کی سیکیورٹی کی طرف سے بہت محتاط تھا اس لیے اس نے ہی زبردستی اصرار کر کے انہیں اس بات پر راضی کر لیا تھا کہ وہ جب تک لاہور میں ہیں ہی ایف پی کا ایک اہلکار ان سے دور رہ کر ان کی حفاظت کرتا رہے گا۔ حالات بتا رہے تھے کہ اس کا فیصلہ مناسب تھا۔ کھیل شروع ہو گیا تھا اور اب وہ لوگ تیزی سے اسپتال کی طرف جا رہے تھے۔

وقت کی اہمیت سے واقف ڈرائیور نے چند منٹوں میں ہی انہیں منزل تک پہنچا دیا۔ ذیشان نے شہریار کے علاوہ اپنے ایک ماتحت کو بھی اپنے ساتھ رکھا تھا۔ گاڑی رکتے ہی وہ لوگ تیزی سے اتر کر شعبۂ حادثات کی طرف بڑھ گئے۔ ذرا سی پوچھ گچھ کے بعد انہیں اشرف تک پہنچنے میں کامیابی ہو گئی۔ وہ بُرے حال میں تھا۔ اسے چار گولیاں لگی تھیں، دو پیروں میں، ایک بازو پر جبکہ ایک گولی نے کان کی لَو اڑا دی تھی۔ وہ ہوش میں تھا لیکن کافی تکلیف میں اور نقاہت زدہ محسوس ہو رہا تھا۔

"تھینک گاڈ، آپ لوگ پہنچ گئے۔ ڈاکٹر مجھے تکلیف سے بچانے کے لیے ٹرنکولائزر دینے والا تھا لیکن میں آپ کو رپورٹ دینے تک ہوش و حواس میں رہنا چاہتا تھا۔" اپنے فرض کی ادائیگی کے لیے یقیناً وہ شدید تکلیف برداشت کرنے کے مرحلے سے گزر رہا تھا۔ اگر اس کا احساسِ فرض اتنی شدت سے دوچار رہا ہوتا تو یقیناً وہ تکلیف سے بچ کر مسکن دوا کے زیرِ اثر سو رہا ہوتا۔ لیکن اگر ایسا ہوتا تو وہ سی ایف پی کا رکن ہی کیوں ہوتا؟ اس ادارے میں تو شامل ہی ان لوگوں کو کیا جاتا تھا جن کی حب الوطنی اور ایمان داری کا یقین ہوتا تھا۔

"شاباش اشرف! اب جلدی جلدی مجھے ساری رپورٹ دے دو تاکہ تم ریسٹ کر سکو۔" ذیشان نے اسے سراہا۔

"پہلے آپ برن وارڈ کے آئی سی یو پر کسی کی ڈیوٹی لگا دیں۔ میں جس عورت کو لے کر مرکز پہنچ رہا تھا، وہ اس وقت وہاں موجود ہے۔" اس نے ایک اہم اطلاع دی جسے سن کر ذیشان کے ماتھے پر شکنیں ابھریں لیکن اس نے زبان سے کوئی تبصرہ کیے بغیر اپنے ماتحت کو اشارہ کر دیا۔ وہ فوراً ہی کمرے سے نکل گیا۔ اب وہاں صرف وہ تینوں ہی تھے۔ طبی عملے کو پہلے ہی وہاں سے ہٹا دیا گیا تھا۔

"اب بتاؤ۔" ذیشان نے اشرف سے کہا تو وہ شروع ہو گیا۔

"میں اور کرنل صاحب اپنی اپنی گاڑیوں میں اس مکان سے ساتھ ساتھ ہی روانہ ہوئے تھے۔ ماڈل ٹاؤن سے نکلنے کے بعد کرنل صاحب اپنے راستے پر چلے گئے اور میں مرکز کی طرف چل پڑا۔ اس مرحلے میں، میں اطراف سے ہوشیار رہا تھا اور مجھے یقین تھا کہ ہمارا پیچھا نہیں کیا گیا ہے لیکن پھر ایک نسبتاً سنسان سڑک پر میرا یہ یقین غلط ثابت ہوا اور اچانک ہی سامنے سے ایک گاڑی نے آکر راستہ روک لیا۔ گاڑی رکتے ہی ان لوگوں نے بے تحاشا فائرنگ شروع کر دی۔ میرا کان اور ہاتھ زخمی ہو گیا لیکن میں نے ہمت کی اور گاڑی سے اتر کر اس کی آڑ لیتے ہوئے خود بھی جوابی فائرنگ کرنے لگا۔ وہ تعداد میں زیادہ تھے اور میں تنہا اس لیے وہ مجھ پر بھاری پڑ رہے تھے۔ مجھے دو گولیاں مزید لگ گئی تھیں۔ اتفاق سے آپریٹس اور موبائل دونوں ہی گاڑی میں رہ گئے تھے اس لیے میں کسی کو کال بھی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ تو سمجھیں غیبی مدد پہنچی اور فائرنگ کی آوازیں سن کر پولیس کی ایک موبائل نے وہاں کا رخ کرنے کی ہمت کر لی۔ پولیس موبائل کا سائرن سن کر حملہ آور فرار ہو گئے لیکن جاتے جاتے انہوں نے شدید فائرنگ کی اور میرے خیال میں جان بوجھ کر پیٹرول کی ٹینکی کو نشانہ بنایا۔ فوراً ہی گاڑی میں آگ بھڑک اٹھی۔ میں معاملہ بھانپ کر دور نہ ہٹ گیا ہوتا تو خود بھی اس آگ کی زد میں آسکتا تھا۔ میرے شور مچانے پر جانے کس طرح جلتی ہوئی گاڑی سے قیدی لڑکی کو نکالا گیا لیکن اتنی دیر میں وہ اچھی خاصی جھلس چکی تھی۔ ہمیں ہاسپٹل پہنچایا گیا۔ پولیس والے میرا بیان لینا چاہتے تھے لیکن میں نے انہیں بڑی مشکل سے یہ بات سمجھائی کہ یہ پولیس کا کیس نہیں ہے۔ میری درخواست پر مجھے ٹیلی فون فراہم کر دیا گیا اور اس طرح میں آپ تک اطلاع پہنچانے میں کامیاب ہو گیا۔ میں نے پولیس آفیسر سے لڑکی کی حفاظت کے لیے برن وارڈ کے باہر سپاہی تعینات کرنے کی درخواست بھی کی تھی۔ مجھے امید ہے کہ اس نے میری بات مان لی ہوگی۔" اشرف نے بہت ہمت کر کے پورا قصہ سنا دیا تھا لیکن اس کی نقاہت زدہ آواز بتا رہی تھی کہ وہ شدید تکلیف میں ہے۔

"او کے جوان! تم نے اپنا کام کر دیا اب دل بھر کر آرام کرو۔ باقی معاملات ہم خود دیکھ لیں گے۔" ذیشان نے اس کے شانے پر تھپکی دی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ شہریار بھی اس کے ساتھ ساتھ تھا اور حیرت زدہ تھا کہ اس کی کسی کوشش سے قبل ہی کس طرح ماریا کے لیے اذیت ناک سزا کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔

"تم نے کیا اندازہ لگایا ہے؟ وہاں کیا ہوا ہوگا؟" کمرے سے نکل کر برن وارڈ کی طرف جاتے ہوئے ذیشان نے اس سے اس کی رائے جاننی چاہی۔

"میرے خیال میں ماریا سے کام لینے والوں کو کسی طرح بازی پلٹنے کی خبر ہو گئی تھی۔ ہو سکتا ہے ماریا کی کرنل توحید کے ساتھ موجودگی کے دوران وہ اپنا کوئی آلہ استعمال کر رہے ہوں جس کی مدد سے وہاں ہونے والی گفتگو سنی جا رہی ہو۔ اسی لیے مسز جوزف بھی ہوٹل سے غائب ہو گئی اور کچھ لوگوں نے شاید ماریا کو چھڑانے کی کوشش کی اور جب دیکھا کہ انہیں ناکامی ہوئی ہے تو پیٹرول ٹینکی میں گولیاں مار کر ماریا کی موت کا انتظام کر گئے۔ یہ اتفاق ہی ہے کہ وہ زندہ ہے لیکن معلوم نہیں کچھ بتانے کے لائق ہے بھی یا نہیں۔" اس نے حالات کا تجزیہ پیش کر دیا۔

"میں بھی انہی خطوط پر سوچ رہا ہوں۔ اب اللہ کرے کہ وہ اس قابل ہو کہ ہمیں کچھ کام کی باتیں بتا سکے۔" اس سے اتفاق کرتے ہوئے ذیشان نے خواہش ظاہر کی، جواباً وہ خاموش رہا لیکن ظاہر ہے اس کی بھی یہی خواہش تھی۔

"از ایوری تھنگ او کے؟" آئی سی یو پہنچ کر اپنے آدمی کے چہرے پر نظر پڑتے ہی ذیشان نے پوچھا۔

"یس سر! لیکن پولیس والوں سے پتا چلا ہے کہ کچھ دیر پہلے یہاں گڑبڑ کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ کسی آدمی نے ڈیوٹی نرس کو پیشکش کی تھی کہ اگر وہ اس کا دیا ہوا انجکشن مریضہ کو لگا دے تو بدلے میں اسے بھاری رقم ملے گی۔ نرس ڈر گئی اس لیے اس نے اس آدمی کو انکار کر دیا اور یہاں موجود پولیس والوں کو اطلاع دے دی۔ اس اطلاع پر نرس کی مدد سے اس مشکوک آدمی کو ڈھونڈنے کی کوشش کی گئی لیکن وہ ہاتھ نہ آسکا۔" انہیں جو کچھ سننے کو ملا، اس سے ظاہر تھا کہ ماریا کے سرپرست موت کا تحفہ لیے سائے کی طرح اس کے اردگرد منڈلا رہے ہیں۔

"بی کیئر فل۔ جب تک ہم اس کا بیان حاصل نہیں کر لیتے اس کی زندگی ہمارے لیے بہت قیمتی ہے۔ چاہو تو کسی کو اپنی مدد کے لیے بلا لو لیکن یہ یاد رکھنا کہ اندر پرندہ بھی پر نہ مار سکے۔" سخت لہجے میں کہتا ہوا ذیشان اسے ساتھ لیے اندر گھس گیا۔ اندر ڈاکٹر اور ایک نرس موجود تھی۔

"میں اسپیشل برانچ سے ہوں اور مجھے مریضہ کا بیان لینا ہے۔" ڈاکٹر کو اپنا کارڈ پیش کرتے ہوئے ذیشان نے اس سے کہا۔

"میں آپ کو چند منٹ سے زیادہ اجازت نہیں دے سکتا۔ مریضہ ہوش میں ہے لیکن اس کی حالت بہت خراب ہے۔ اتنی شدید تکلیف میں اسے زیادہ بولنے پر مجبور کرنا اس کے ساتھ زیادتی ہوگی۔" ڈاکٹر نے شاید اس کا کارڈ دیکھ کر ہی بادلِ ناخواستہ انہیں بیان لینے کی اجازت دے دی تھی لیکن واضح طور پر محسوس ہو رہا تھا کہ اسے یہ بات پسند نہیں آرہی ہے۔

"زیادتی کرنے والوں کو کبھی نہ کبھی خود بھی زیادتی برداشت کرنی پڑتی ہے ڈاکٹر صاحب! بہرحال، آپ نے اپنا فرض ادا کر دیا، اب آپ ہمیں ہمارا فرض ادا کرنے دیں۔" ذیشان نے ایک طرح سے ڈاکٹر کو وہاں سے جانے کا اشارہ دیا اور خود بیڈ پر دراز ماریا کی طرف متوجہ ہوا۔ شہریار

پہلے ہی اس طرف متوجہ تھا۔ سوختہ حال ماریا کے جسم کو کچھ ایسی ترکیب سے ڈھانپا گیا تھا کہ جسم کو ڈھانپنے والی چادر اس کے جسم سے چپکی نہیں ہوئی تھی اور صرف چہرہ ہی نظر آرہا تھا۔ اس کا بایاں رخسار بُری طرح جھلسا ہوا تھا اور بھویں غائب تھیں۔ ہونٹوں پر اب تک موجود سرخ سرخی نے اس ہیئت کذائی کے ساتھ مل کر اسے کسی خون آشام بلا کا سا روپ دے دیا تھا۔ اس حسن کا دور دور تک نام و نشان نہیں تھا جس کے زور پر وہ جانے کتنوں کو فتح کرتی رہی تھی۔

"مسٹر شہریار کو میرے ساتھ دیکھ کر تم یہ بات تو اچھی طرح سمجھ گئی ہوگی کہ تمہارا بھانڈا پوری طرح سے کھل چکا ہے اور تمہیں کہیں سے کوئی تحفظ نہیں مل سکتا۔ اس لیے بہتر ہے کہ اب بغیر کسی حیل و حجت کے اپنے بارے میں سب کچھ بتاتی چلی جاؤ۔" ذیشان نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سرد مہری سے کہا۔

"تم مجھ سے ایک لفظ بھی نہیں اگلوا سکو گے۔ یہ بات تم بھی سمجھ سکتے ہو کہ جتنی شدید تکلیف میں، میں اس وقت ہوں، اس سے زیادہ اذیت تم مجھے نہیں دے سکتے۔ اگر کوشش کی تو میں مر جاؤں گی لیکن تمہیں کچھ حاصل نہیں ہوگا۔" یقینی طور پر وہ بے پناہ تکلیف میں تھی اور جو کچھ کہہ رہی تھی، اسے جھٹلایا نہیں جاسکتا تھا۔ اس کے بُری طرح جھلسے ہوئے جسم پر وہ آخر اور کیا تشدد کر سکتے تھے۔ ہاں، یہ ممکن تھا کہ اس کے چھالوں پر نمک چھڑک دیا جاتا لیکن ظاہر ہے کہ اس عمل سے وہ اتنی اذیت محسوس کرتی کہ فوری طور پر مر بھی سکتی تھی۔ پھر یہ کہ اس ترکیب سے وہاں جو شور مچتا، وہ الگ مسائل کا سبب بنتا۔ ملاقات کے لیے چند منٹ سے زیادہ کی اجازت نہ دینے والا ڈاکٹر تو ہنگامہ مچا دیتا اور پھر یہ میڈیا کا دور تھا۔ میڈیا والے تو ویسے ہی ہر جگہ اپنی ناک گھسانے کی کوشش کرتے تھے۔ اس معاملے کی حساس نوعیت کو سمجھے بغیر کوئی بے وقوف رپورٹر چٹ پٹی اسٹوری بھی بنا سکتا تھا۔

ذیشان نے لمحہ بھر ان مسائل کے بارے میں سوچا اور پھر دروازے پر جاکر اپنے آدمی سے بولا۔ "سوڈیم پینٹوتھل منگوالو۔ ہم اس کا استعمال کریں گے۔"

"آپ لوگ ایسا نہیں کر سکتے۔ مریضہ کی حالت پہلے ہی بہت خراب ہے۔ وہ اپنی جان سے بھی جاسکتی ہے۔" ڈاکٹر شاید آئی سی یو کے باہر ہی منڈلا رہا تھا۔ ذیشان کا حکم سن کر اس نے فوراً احتجاج کیا۔

"تم ہمیں کسی بات سے نہیں روک سکتے۔ میرا کارڈ دیکھ کر تمہیں اندازہ ہو گیا ہوگا کہ ہمیں ہر طرح کے اختیارات حاصل ہیں۔" ذیشان نے اسے ہاتھ پکڑ کر اندر کھینچ لیا اور دروازہ بند کر کے سختی سے بولا۔

"لیکن یہ غیر انسانی سلوک ہے۔ بے شک یہ عورت کوئی مجرم ہوگی لیکن اس وقت یہ ایک مریضہ ہے جسے بہترین طبی امداد پہنچانا ہمارا فرض ہے۔" ڈاکٹر پر فرض شناسی کا دورہ پڑا ہوا تھا اس لیے وہ اعتراض سے باز نہیں آرہا تھا۔

"انسانی سلوک انسانوں کے ساتھ کیا جاتا ہے، درندوں کے ساتھ نہیں۔ یہ عورت کتنے بھیانک جرائم میں ملوث ہے، تمہیں اندازہ نہیں۔ اگر ہم اس کی جان لے بھی لیں تو ان بے شمار لوگوں کے خون کی تلافی نہیں ہو سکتی جن کی جانیں اس کی وجہ سے گئی ہیں۔ ویسے بھی یہ موت کے قریب ہے۔ اگر ہم نے دیر کر دی تو ہو سکتا ہے طبعی موت مر جائے ورنہ اس کے اپنے ساتھی تو گھات لگائے بیٹھے ہی ہیں۔ اسے مروانے کی ایک کوشش تو کی ہی جا چکی ہے۔ اب کیا تم اس بات کے منتظر ہو کہ وہ اسپتال کے اس حصے کو ہی اڑا دیں؟" ذیشان نے تلخی سے جواب دیا۔

"پھر بھی ایک ڈاکٹر کس طرح یہ برداشت کر سکتا ہے کہ اس کے سامنے اس کی مریضہ کو..." ڈاکٹر منمنایا لیکن اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی دروازے پر دستک ہوئی۔ شہریار نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ سی آئی بی کا اہلکار ہاتھ میں کسی محلول سے بھری چھوٹی سی بوتل اور سرنج لیے کھڑا تھا۔

"ایک شیشی گاڑی میں موجود میڈیکل باکس میں ہی موجود تھی اس لیے مجھے آفس سے منگوانے کی ضرورت نہیں پڑی۔" اس نے سرنج اور بوتل تھماتے ہوئے بتایا۔

"او کے! ذرا تم اس ڈاکٹر کو سنبھالو۔ ہم اپنا کام کر لیں۔" ذیشان فوراً ہی مصروف ہو گیا۔

"یقیناً تم اس کے اثر سے واقف ہوگی؟" محلول سرنج میں بھر کر وہ ماریا کے قریب گیا اور اس کا جھلسا ہوا بازو چادر سے باہر نکالا۔ اس نے مزاحمت کرنے کی کوشش کی لیکن اس کی حالت اتنی بُری تھی کہ ذرا سی حرکت پر خود ہی کراہ اٹھی اور بے بس ہو کر مغلظات بکنے لگی۔ ذیشان نے ان سنی کر کے سوئی اس کے بازو میں چبھو دی۔

"عام طور پر منجھے ہوئے سیکرٹ ایجنٹس کو اس کا زیادہ ڈوز دینا پڑتا ہے لیکن اس کی خراب حالت کی وجہ سے میں نے بہت معمولی ڈوز دیا ہے۔ امید ہے کہ اس کے لیے اتنی مقدار کافی ہوگی۔" وہ شہریار کو آگاہ کرنے لگا البتہ نظریں ماریا پر ہی جمی ہوئی تھیں۔ فی الحال اس کی آنکھیں بند ہو گئی

تھیں لیکن اسے معلوم تھا کہ وہ جلد آنکھیں کھول دے گی۔ شہریار خاموشی سے لیکن دلچسپی کے ساتھ یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ کافی عرصے سے ان ملک دشمنوں کے خلاف برسرپیکار ہونے کے باوجود اس کے لیے یہ طریقۂ کار نیا تھا کیونکہ بہرحال وہ کوئی تربیت یافتہ سیکرٹ ایجنٹ نہیں تھا اور سی آئی بی کے ساتھ اسے بہت کچھ سیکھنے کا موقع مل رہا تھا۔ آخر ماریا نے اپنی آنکھیں کھول دیں لیکن اس کی آنکھوں میں شعور کی کوئی رمق نہیں تھی اور دھندلاہٹ سی اتری ہوئی تھی۔

"تمہارا اصل نام کیا ہے؟" ذیشان نے سوالات کا آغاز کیا۔

"کلارا اینڈرسن۔" اس نے خوابیدہ سے لہجے میں جواب دیا جسے سن کر ہی وہ لوگ چونک گئے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ اصلاً ہندو ہوگی لیکن اس کا جواب تو کچھ اور ظاہر کر رہا تھا۔

"تمہیں را کے لیے کام کرتے ہوئے کتنا عرصہ ہوا ہے؟"

"دورانِ تعلیم ہی میں نے ان کے لیے کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ میری ممی اس سے بھی پہلے سے ان کے لیے کام کر رہی تھیں۔" اس نے جواب دیا۔

"تمہارا مذہب کیا ہے؟"

"ہم یہودی ہیں۔" اس نے چونکا دینے والا انکشاف کیا۔

"پھر تمہیں را میں کیسے شامل کیا گیا؟" ذیشان نے اضطراب سے پوچھا۔

"میری ممی کے سیکنڈ شوہر ایک ہندو تھے اور را کے لیے کام کرتے تھے۔ انہی کی وجہ سے پہلے ممی کو وہاں کام کرنے کا موقع ملا اور پھر میں بھی شامل ہو گئی۔"

"خود تمہارے والد یہودی تھے؟"

"ہاں۔" اس نے تصدیق کی۔

"یعنی تم خود بھی ایک یہودی ہو پھر تم نے ہندوؤں کی سیکرٹ سروس کے لیے کام کرنا کیوں قبول کیا؟"

"عظیم اسرائیل کے مفاد کے لیے۔ میری ممی نے اپنے پہلے شوہر کے مرنے کے بعد انیل مکرجی سے شادی کی ہی اس لیے تھی کہ وہ جانتی تھیں کہ انیل مکرجی را کا ایجنٹ ہے اور پاکستان میں رہ کر را کے لیے کام کرتا ہے۔" انہیں اس سے تفتیش تو دوسرے پہلو پر کرنی تھی لیکن ابتدا ہی میں گفتگو کچھ ایسے رخ پر چل گئی تھی کہ حیرت انگیز انکشافات ہوتے رہے تھے۔

"یعنی تمہاری ممی حقیقت میں موساد کی ایجنٹ ہیں اور تم بھی؟" ذیشان نے فوراً نتیجہ اخذ کر لیا۔

"ہاں۔" جواب دیتے دیتے اس نے سر جھٹکا۔

"یہ اپنے حواسوں میں واپس آرہی ہے۔ اسے مزید ڈوز دینی پڑے گی۔" ذیشان بڑبڑایا اور پہلے کے مقابلے میں ذرا زیادہ دوا اس کے بازو میں انجیکٹ کی۔

"تم ماں، بیٹی ڈبل ایجنٹ بن کر رہ رہی ہو اور را کے ساتھ تمہارا معاملہ اس لیے چل رہا ہے کہ دونوں ہی طرف کے لوگ پاکستان کے دشمن ہیں؟"

"ہاں، ہم مسلمانوں سے نفرت کرتے ہیں اور ہر صورت انہیں نیست و نابود کرنا چاہتے ہیں۔" وہ نفرت سے بولی۔

"اس مقصد کے لیے تمہاری کیا حکمت عملی ہے؟" ذیشان نے دانت کچکچاتے ہوئے پوچھا۔

"ہم تمہارے لوگوں کے ذہنوں کو برباد کر دیں گے۔ ہم نے تمہارے ملک میں نشے اور اسلحے کی وبا اس بُری طرح پھیلا دی ہے کہ اب تم خود اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو برباد کر دو گے۔ را کے تعاون سے ہم نے تمہارے کئی چھوٹے چھوٹے دیہاتوں میں اپنے ایسے ایجنٹس پھیلا دیے ہیں جو نوجوان ذہنوں میں بغاوت کا بیج بو کر انہیں دہشت گرد بنا رہے ہیں۔ آنے والے وقتوں میں یہ شدت پسند تمہارے ملک کا نام و نشان مٹا دیں گے۔ تم دنیا میں اتنے بدنام ہو جاؤ گے کہ عالمی برادری تمہاری دشمن ہو جائے گی۔ خاص طور پر طرم خان بننے والا امریکا جو پہلے ہی تمہارا دوست نہیں اور بھی دشمن بن جائے گا۔" وہ فخر سے بتاتی جارہی تھی۔

"کیسے؟" ذیشان نے صرف ایک لفظی سوال کیا۔

"جب تمہارے ہاں سے بھاری مقدار میں وہاں ہیروئن سپلائی کی جائے گی تو وہ کیسے تمہیں بخشے گا؟"

"امریکا تو تمہارا سب سے بڑا سپورٹر ہے پھر تم لوگ وہاں کیوں ہیروئن پھیلا رہے ہو؟"

"اسے اپنے قابو میں رکھنے کے لیے..." یکدم ہی اس کی آواز ڈوبنے لگی اور تنفس بے ترتیب ہونے لگا۔ ذیشان نے لب بھینچ لیے پھر ڈاکٹر کی طرف مڑا۔

"اسے دیکھو ڈاکٹر۔" ڈاکٹر پہلے ہی ماریا جو کہ اصل میں کلارا اینڈرسن تھی کی حالت دیکھ کر اپنی جگہ سے کھڑا ہو چکا تھا۔ اس نے جلدی سے اسے آکسیجن ماسک لگایا اور پہلے سے جاری ڈرپ کے کینولا میں ہی دو تین انجکشن پے در پے داخل کر دیے۔ ذرا دیر کے لیے لگا کہ اس کی حالت سنبھل

رہی ہے اور سانس ہموار ہوتی جارہی ہے لیکن پھر اچانک ہی اس کا جسم جھٹکے کھانے لگا اور ڈاکٹر کی کوششوں کے باوجود وہ ایک ڈیڑھ منٹ کے دورانیے میں ساکت ہوگئی۔

”شی از نو مور۔“ ڈاکٹر نے پلٹ کر مایوسی سے بتایا۔

”مجھے اندازہ تھا۔ اس حالت میں اگر اس کی جگہ کوئی عام عورت ہوتی تو دو منٹ بھی ہمارے سوالوں کے جوابات نہیں دے سکتی تھی لیکن یہ کلارا ایجنڈرسن تھی، موساد کی وفاداری کرنے کے لیے کام کرنے والی ڈبل ایجنٹ۔ اس کے اعصاب عام عورتوں کے مقابلے میں بہت مضبوط تھے جو یہ اتنا بھی جی گئی۔“ ڈاکٹر کی بات سن کر ذیشان نے تبصرہ کیا پھر اسے غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”مجھے امید ہے کہ اب تم سمجھ گئے ہو گے کہ اس عورت نے انسانیت کی عمومی قدروں سے ہٹ کر اس طرح پیش آنا کیوں ضروری تھا۔ اگر یہ ہمیں کچھ بھی بتائے بغیر مر جاتی تو یہ ملک و قوم کے حق میں کسی صورت مناسب نہیں ہوتا۔ اب بھی یہ بہت سے راز اپنے ساتھ ہی لے گئی ہے۔ اس عورت سے حب الوطنی کا سبق سیکھنا اور جو کچھ سنا اسے بالکل بھول جانا۔ اگر اس کمرے میں ہونے والی گفتگو لیک آؤٹ ہوئی تو یہ تمہارے حق میں بہتر نہیں ہو گا۔“ اس کا لہجہ دھمکی آمیز تھا۔

”آپ بے فکر رہیں سر! میں اپنا قومی فریضہ سمجھتے ہوئے اس گفتگو کو ہمیشہ راز رکھوں گا۔“ ڈاکٹر نے اسے یقین دلایا پھر خیال آنے پر چونک کر پوچھنے لگا۔ ”ڈیڈ باڈی کا کیا کرنا ہے؟ کیا اسے آپ کے لوگ اپنے ساتھ لے جائیں گے؟“

”اس لاش کو لاوارث لاشوں میں شامل کر دو۔“ ذیشان کے جواب دینے سے قبل شہریار نے سرد مہری سے جواب دیا تو اس نے بھی تائیدی انداز میں سر ہلا کر اس کے فیصلے کی توثیق کر دی۔ زبردستی اس کی زندگی میں شامل ہونے والی اس دھوکے باز عورت کا یہی انجام مناسب تھا۔

☆☆☆

”کلارا تو اپنے انجام کو پہنچ گئی لیکن اپنے پیچھے بہت سے سوالات چھوڑ گئی ہے۔ اس سے ہمیں یہ تو معلوم ہو گیا کہ موساد والے را کی مدد سے یہاں کیا کھیل کھیل رہے ہیں لیکن افسوس کہ ہمیں اس سے ان کے طریقہ کار اور خاص آدمیوں وغیرہ کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی مہلت نہیں ملی۔ اشیش کمار سے بھی ہمیں جو معلومات حاصل ہوئی تھیں، وہ اتنی بار آور ثابت نہیں ہوئی ہیں۔ اس نے ہمیں اپنے جن ٹھکانوں کے بارے میں بتایا تھا، وہ خالی پڑے ہیں۔ مسلسل

ہاتھ پیر مارنے کے باوجود ہمارے آدمیوں کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑ رہا ہے۔“ وہ دونوں ذیشان کے دفتر میں بیٹھے ہوئے تھے اور ذیشان کے لہجے میں شدید افسوس تھا۔

”میرے خیال میں اگر ہم تھوڑی احتیاط سے کام لیتے تو نوبت یہاں تک نہیں آتی۔ کلارا کو صرف ایک آدمی کے ساتھ یہاں بھیجنے کا فیصلہ ہی غلط تھا۔ اگر اشرف کو کور دینے کے لیے کچھ اور لوگ بھی اس کے ساتھ ہوتے تو حملہ آوروں سے بہتر طریقے سے نمٹا جا سکتا تھا۔“ شہریار نے خیال آرائی کی۔

”یہ تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ کرنل صاحب کو خود بھی افسوس ہے کہ انہوں نے عجلت میں یہ قدم اٹھا لیا۔ بس اس وقت ان کے ذہن میں یہ تھا کہ جلد از جلد لڑکی کو ہماری تحویل میں پہنچا دیا جائے۔“ ذیشان خود کف افسوس مل رہا تھا۔

”گھر کی تلاشی لینے پر بھی کچھ نہیں ملا؟“

”ہاں، وہ گھر صرف ہفتے بھر پہلے اسٹیٹ ایجنسی کی مدد سے کرائے پر لیا گیا تھا اور کرائے پر لینے والے نے اپنے جو کوائف ظاہر کیے، وہ جعلی ثابت ہوئے ہیں۔ ابھی رات بیتی نہیں تھی لیکن سی ایف پی والوں نے تیزی سے اپنی کارروائی مکمل کر لی تھی۔ یہاں تک کہ وہ رات گئے تک کھلی رہنے والی اسٹیٹ ایجنسی سے معلومات حاصل کر کے ان کی تصدیق کا کام بھی کر چکے تھے۔“

”ایسا تو ہونا ہی تھا۔ دنیا کا کوئی بھی سیکرٹ ایجنٹ کوشش کرتا ہے کہ اپنے پیچھے کوئی کلیو نہ چھوڑے، یہاں تو را کے ساتھ ساتھ موساد کے ایجنٹ بھی برسرِ پیکار تھے۔“ شہریار نے تبصرہ کیا۔

”ہاں، موساد والے را کے ایجنٹس سے کہیں زیادہ ذہین اور بہادر ہوتے ہیں۔ کلارا کی جامہ تلاشی سے حاصل ہونے والا سامان اگرچہ گاڑی کے ساتھ جل کر راکھ ہو گیا ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ اس کی جیولری وغیرہ کی آڑ میں خودکشی کا کوئی سامان اور حساس مائیکروفون ضرور ہو گا جب ہی تو اس کی ماں کو بھاگ نکلنے کا موقع مل گیا... اور کلارا کو بھی چھڑانے اور ناکامی کی صورت میں مروانے کی کوشش کی گئی۔“

ذیشان نے اس کی تائید میں دلیل پیش کی پھر ذرا پُرخیال انداز میں بولا۔ ”شہریار... میں ایک پوائنٹ پر غور کر رہا ہوں۔ آخر ایسی کیا بات تھی کہ ان لوگوں نے تم پر اتنی خاص نظر رکھنا ضروری سمجھا کہ کلارا سے تمہاری شادی ہی کروا ڈالی؟“

”میں انجانے میں ان کی راہ پر لگ گیا تھا۔ نور پور

میں ہونے والے بم بلاسٹ کے بعد میں نے اللہ آباد کے اس مدرسے کو دریافت کر لیا تھا جہاں را کا ایک ایجنٹ شاہنواز کے روپ میں گاؤں کے معصوم اور بھولے بھالے بچوں کی برین واشنگ کر رہا تھا۔ پھر میں ورما تک بھی جا پہنچا تھا اور اشیش کمار کی گرفتاری میں بھی میرا کچھ نہ کچھ ہاتھ شامل ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

”یہ سب ٹھیک ہے لیکن مجھے لگتا ہے کہ معاملہ اس سے بھی آگے کا ہے۔ آخر اس علاقے میں وہ لوگ اتنے سرگرم کیوں ہیں؟ کلارا تو چلو تمہاری نگرانی کر رہی تھی لیکن اس کی ماں کیوں پیر آباد میں رہ رہی تھی؟ وہ کلارا سے کہیں زیادہ سینئر اور منجھی ہوئی ایجنٹ تھی پھر اسے کیوں ایک گاؤں میں ڈال دیا گیا؟ اسکول میں ٹیچنگ کے ذریعے بچوں کے ذہنوں کی برین واشنگ کرنے والا کام بھی مجھے اس کے اسٹینڈرڈ کا نہیں لگتا۔ پیر آباد میں یقیناً کچھ اور بھی خاص بات ہے جو اسے وہاں موجود تھی۔“ ذیشان کا ذہن الجھا ہوا تھا۔

”میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ پیر آباد میں تو چودھری افتخار کا ہی سکہ چلتا ہے بلکہ وہ اتنا بااختیار ہے کہ اردگرد کے دیہاتوں کے دوسرے چودھری بھی اس سے دبتے ہیں۔ میری اصل جنگ تو شروع ہی چودھری سے ہوئی تھی۔ میں اس کے مظالم کے خلاف سینہ سپر ہوا تھا اور پھر پتا نہیں کیسے یہ را اور موساد کا چکر شروع ہو گیا۔“ وہ خود بھی الجھنے لگا۔

”ایک منٹ... ایک منٹ۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ چودھری خود بھی درون خانہ ان ملک دشمن ایجنٹوں سے ملا ہوا ہو؟ تم نے کلارا کے بارے میں جو کچھ مجھے بتایا ہے، اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ کلارا کو تم تک پہنچانے میں چودھری کا پورا ہاتھ تھا۔ بظاہر تمہیں اپنی مظلومیت کی کہانی سنا کر تمہاری ہمدردیاں حاصل کرنے والی کلارا شاید شروع ہی سے چودھری سے تعاون کر رہی تھی یا پھر یہ کہ چودھری اس سے تعاون کر رہا تھا اور اصل منصوبہ اسی کا تھا۔ اگر تم غور کرو تو تمہارے گرد بہت خوب صورتی سے جال بُنا گیا۔ تمہاری نیچر کے بارے میں تو چودھری شروع میں ہی اندازہ لگا چکا تھا کہ تمہیں کسی بازاری عورت کے ذریعے قابو میں نہیں کیا جا سکتا اس لیے انہوں نے تمہیں شادی کے جال میں پھانس کر اپنی ایک اہم ایجنٹ کو تمہارے قریب کر دیا تا کہ تمہارے ہر عمل پر نظر رکھ سکیں۔ اب تم غور کرو کہ تمہاری وجہ سے چودھری کو کہاں کہاں رکاوٹ کا سامنا تھا اور اپنی شادی کے بعد کن معاملات سے تمہاری نظر ہٹ گئی۔“ ذیشان بالکل درست سمت میں سوچ رہا تھا، خود وہ بھی سوچ میں ڈوب گیا۔

”بنیادی طور پر میرے چودھری سے دو ہی اختلافات ہیں۔ وہ اپنے گاؤں کے لوگوں کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ خاص طور پر تعلیم کا سخت مخالف ہے۔ دوسرے میں نے سابقہ فاریسٹ آفیسر اور ایس پی کے گٹھ جوڑ سے کی جانے والی لکڑی اور کھالوں کی اسمگلنگ پر سخت پہرا لگوا دیا ہے۔ موجودہ فاریسٹ آفیسر اور ایس پی دونوں ہی پہلے والوں سے بہت بہتر ہیں اس لیے چودھری کا دھندا ٹھپ ہو گیا ہے۔“ سوچتے ہوئے اس نے چودھری سے اپنے اختلافات کی وجوہات بیان کیں۔

”نہیں یار! یہ دونوں ہی پوائنٹ ایسے نہیں ہیں جن کی وجہ سے موساد والے تمہاری راہ پر لگ جائیں۔ تعلیم و ترقی کے معاملے میں چودھری کا جو رویہ ہے، وہ ہمارے جاگیرداروں کے ہاں عام ہے۔ رہی اسمگلنگ والی بات تو لکڑی اور کھالوں کی اسمگلنگ سے بھی را یا موساد جیسی ایجنسیوں کو کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی۔ یہ سارے ہمارے اندرونی مسائل ہیں جو ہر جگہ ہیں۔ اس لیے بالخصوص تمہارے علاقے میں ان کے سرگرم ہونے کی وجہ سمجھ نہیں آتی۔“ ذیشان نے دونوں ہی پہلوؤں کو رد کر دیا۔

”بات تمہاری بھی صحیح ہے لیکن اگر چودھری کے را یا موساد میں سے کسی سے روابط ہیں تو اس کی کیا وجہ ہے؟ بے شک چودھری کا اعلیٰ افسران میں اٹھنا بیٹھنا ہے لیکن میں نہیں سمجھتا کہ اس کی ایسے اہم ملکی رازوں تک پہنچ ہو گی جن سے کسی غیر ملکی خفیہ ایجنسی کو دلچسپی ہو۔ اگر فرض کر لیا جائے کہ ایسا ہی ہے تو اس صورت میں تو انہیں بالکل بھی مجھے نہیں چھیڑنا چاہیے تھا تا کہ جو کام خاموشی سے چل رہا ہے، وہ چلتا رہے۔“ اس نے فوراً قائل ہوتے ہوئے خود بھی صورتِ حال کا تجزیہ کیا۔

”یہ ملکی راز اِدھر سے اُدھر کرنے والا معاملہ نظر نہیں آتا۔ اگر تم کلارا کی باتوں کو یاد کرو تو ہمیں ان کے تین ہدف نظر آتے ہیں۔ کسی بھی قسم کی تعلیم کے ذریعے ذہنوں کی برین واشنگ کرنا۔ ہیروئن کے پھیلاؤ اور اسلحے کے ذریعے دہشت گردی کا فروغ۔ اور دیکھا جائے تو ان تینوں طریقوں سے بھی وہ ایک ہی ہدف حاصل کر رہے ہیں... ہماری یوتھ کو ناکارہ بنانا۔ اب اگر ہم ان معاملات میں چودھری کے کردار کو دیکھیں تو صرف وہ ایک اکیلا ہی کیا، اس کے دوسرے بھائی بند بھی اپنی رعایا کو جدید تعلیم سے محروم رکھ کر پہلے ہی ان سے تعاون کر رہے ہیں۔ چودھری اگر ان سے تعاون کر سکتا ہے تو ہیروئن اور اسلحے کے پھیلاؤ کے سلسلے میں۔ اور اب تک

ان دونوں معاملات میں اس کے ملوث ہونے کی کوئی سن گن نہیں ملی ہے۔ اس لیے فی الحال ہم اس امکان کو بھی چھوڑ دیتے ہیں۔ ویسے بھی جہاں تک میں سمجھا ہوں، چودھری کو جو بھی اہمیت ہے، وہ علاقے کے حوالے سے ہے اور تم وہ واحد بااثر شخص ہو جو اختیارات کے معاملے میں چودھری سے ٹکر لے سکتے ہو اس لیے وہ تمہارے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔"

"اور علاقے میں سب سے اہم شے ہے پیر آباد سے متصل جنگل۔" وہ خود بھی ذیشان کے تجزیے میں اس کے ساتھ ساتھ تھا۔

"بالکل صحیح... اور اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ وہاں جنگل میں ایسی کیا خاص بات ہے جو موساد والے براہ راست دلچسپی لے رہے ہیں۔ کلارا کی ماں جس کا نام ہم فی الحال سلتھیا جوزف ہی مان لیتے ہیں، پیر آباد میں آخر کس لیے سکونت پذیر تھی؟ وہاں ایسا کیا ہو رہا ہے کہ موساد کی ایک ایجنٹ کی وہاں مستقل موجودگی کو ضروری سمجھا گیا؟" ذیشان نے سوالات اٹھانے شروع کیے تو اس کا ذہن بھی کھلتا گیا اور یہ بات بھی یاد آگئی کہ جب وہ اقبال باجوہ کی جگہ کسی ایمان دار فاریسٹ آفیسر کی تقرری کے لیے کوشاں تھا تو اسے ماریا نے ہی عابد انصاری کا نام تجویز کیا تھا۔ موجودہ حالات میں سوچا جاسکتا تھا کہ بظاہر فرض شناس اور ایمان دار آفیسر نظر آنے والا عابد انصاری انہی کا کوئی ایجنٹ ہوگا۔ اس نے فوراً ہی ذیشان کو اس بات سے آگاہ کر دیا۔

"تم بالکل صحیح خطوط پر سوچ رہے ہو۔ اب ہمیں اتنا کرنا ہے کہ عابد انصاری کی خفیہ نگرانی کے ساتھ ساتھ مقامی لوگوں کے تعاون سے مخبروں کا ایسا جال بچھا دیں جو ہمیں اندر کی خبر لا کر دے سکیں۔ اس سلسلے میں تم ہی زیادہ بہتر کام کر سکتے ہو اس لیے کہ تمہارے مقامی آبادی میں روابط ہیں۔" اس سے اتفاق کرتے ہوئے ذیشان نے آئندہ کا لائحہ عمل بھی طے کر دیا۔

"ڈونٹ وری۔ میں یہ معاملہ سنبھال لوں گا۔ اب میرا یہ مسئلہ حل ہو چکا ہے کہ کس طرح میرے راز لیک آؤٹ ہو رہے تھے اس لیے میں پہلے کے مقابلے میں زیادہ کانفیڈنٹ ہوں۔"

اس نے ذیشان کو تسلی دی تو وہ کرسی سے اٹھتے ہوئے بولا۔ "چلو یہ معاملات تو طے پا گئے۔ بہتر ہے کہ کچھ دیر نیند لے لی جائے۔ صبح پھر تمہیں روانہ ہونا ہوگا اور مجھے بھی باقی کی بھاگ دوڑ کرنی ہوگی۔"

شہریار نے اس سے اختلاف نہیں کیا اور خود بھی اپنی جگہ چھوڑ دی۔ ذیشان اسے اپنے ساتھ اس کمرے تک لے گیا جہاں وہ کچھ گھنٹے قبل بھی موجود تھا اور خود کو ماہ بانو کی شادی کے صدمے سے سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس وقت وہ کہاں جانتا تھا کہ چند گھنٹوں بعد خود اس کی اپنی شادی شدہ زندگی ختم ہو جائے گی اور اسے ایک اور بڑے امتحان سے گزرنا پڑے گا۔

"ایک بات پوچھوں شہریار؟" کمرے کے دروازے پر رک کر ذیشان اس سے مخاطب ہوا تو وہ زبان سے کچھ کہے بغیر اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

"ویسے تو یہ تمہارا پرسنل معاملہ ہے لیکن میں صرف اس وجہ سے تم سے پوچھ رہا ہوں کہ ایک دوست کی حیثیت سے اگر تمہیں ضرورت محسوس ہو تو میں تمہاری مدد کر سکوں۔" وہ سوال کرنے سے جھجک رہا تھا اس لیے تمہید باندھی۔

"کیا تم ماریا کے بارے میں کچھ پوچھنا چاہتے ہو؟" شہریار نے خود ہی اندازہ لگا لیا۔

"ہاں، تم نے اسے لاوارث لاشوں میں شامل تو کروا دیا لیکن ظاہر ہے لوگ اسے تمہاری بیوی کی حیثیت سے جانتے تھے۔ تم اس کے اچانک غائب ہو جانے کی کیا وضاحت دو گے؟"

"تم اس سلسلے میں کیا مشورہ دیتے ہو؟" اس نے ذیشان کو غور سے دیکھا۔

"میرے ذہن میں ایک تجویز ہے۔ تم اپنے عزیز واقارب اور دوست احباب کی تسلی کے لیے یہ کہہ سکتے ہو کہ ماریا کا ٹریفک کے ایک حادثے میں انتقال ہو گیا ہے اور اس کی ماں کی خواہش پر اس کی تدفین پاکستان کے بجائے امریکا میں کی جائے گی۔ اس طرح تم ماں بیٹی کی عدم موجودگی کا جواز پیدا کر سکو گے۔"

"نہیں، میں ایسا نہیں کر سکتا۔ اگر میں نے ماریا کے مرنے کی خبر پھیلا دی تو میرے گرد افسوس کرنے والوں کا ہجوم لگ جائے گا اور مجھے اس عورت سے اتنی نفرت ہے کہ میں اس کے لیے خود کو جھوٹ موٹ بھی افسردہ ظاہر نہیں کر سکتا۔" اس نے سختی سے انکار کر دیا۔

"پھر...؟ اس کے علاوہ کیا کرو گے تم؟"

"میں بتا دوں گا کہ میں نے ڈاکٹر ماریا کو ذاتی وجوہات کی بنا پر طلاق دے دی ہے اور وہ طلاق کے بعد اپنی ماں کے ساتھ کہیں چلی گئی ہے۔ ظاہر ہے، اس کے بعد کسی میں یہ جرأت نہیں ہوگی کہ مجھ سے طلاق کی وجوہات دریافت کر سکے۔" وہ بڑے بے تاثر لہجے میں اپنا پروگرام بتانے لگا جس سے ذیشان کو اندازہ ہوا کہ سارا وقت اس کے ساتھ مصروف رہنے کے باوجود اس کا ذہن اپنے مسئلے کے حل کے لیے بھی سوچ رہا تھا۔

"ٹھیک ہے، جیسا تم مناسب سمجھو۔" وہ اس کا شانہ تھپک کر واپس مڑ گیا تو شہریار بھی اندر جا کر بستر پر دراز ہو گیا۔ بستر پر لیٹ کر گھڑی پر نظر پڑی تو اسے اندازہ ہوا کہ صبح ہونے ہی والی ہے۔ اسے خیال آیا کہ گزری رات میں اس کے علاوہ یقیناً ماہ بانو نے بھی رت جگا ہی منایا ہوگا لیکن فرق اتنا تھا کہ وہ آباد ہوئی تھی اور وہ خود برباد... لیکن اس کے لیے ماہ بانو کی آبادی اپنی بربادی سے زیادہ اہم تھی۔ چنانچہ دل میں ایک اطمینان سا محسوس کرتے ہوئے کروٹ بدل کر سونے کی کوشش کرنے لگا اور حیرت انگیز طور پر نیند کی دیوی نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔ شاید اس لیے کہ آج وہ ایک بوجھ کی طرح زندگی میں شامل رہنے والے رشتے سے نجات حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

☆☆☆

سلتھیا جوزف کسی زخمی شیرنی کی طرح کمرے میں ادھر سے ادھر ٹہل رہی تھی۔ ایک سیکرٹ ایجنٹ کی حیثیت سے اس کی ساری زندگی قربانیاں دیتے ہوئے گزری تھی۔ وہ برسوں سے اپنے عزیز واقارب سے کٹ کر اپنے وطن سے اتنی دور رہی تھی۔ اپنے عزیز شوہر اینڈرسن کی موت کے بعد دلی جذبات کے برخلاف را کے ایک ایجنٹ سے شادی کرنا اور پھر را میں اپنے لیے جگہ بنانا کوئی آسان بات نہیں تھی۔ اپنے فرائض کی انجام دہی کے لیے وہ کئی بار اپنی آبرو کی قربانی بھی دے چکی تھی۔ ایک عام عورت جیسی معمولی نوعیت کی لیکن انمول خوشیاں تو کبھی اس کا مقدر بن ہی نہیں سکی تھیں۔ سیکرٹ ایجنٹ کی زندگی نے اس سے ایک گھریلو عورت کا سکھ چھین لیا تھا لیکن وہ پھر بھی خوش تھی کہ وہ اپنے وطن کے لیے کچھ کر رہی ہے۔ اس نے اپنی بیٹی کے دل میں بھی اسرائیل کی محبت پروان چڑھائی تھی چنانچہ وہ میڈیکل کی تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی معاون و مددگار بھی بن گئی تھی۔

کلارا کو اپنے ڈھب سے پالنے میں اسے اس لیے مشکل نہیں ہوئی تھی کہ اس کا دوسرا شوہر انیل مکرجی اپنی پیشہ ورانہ ذمے داریوں کی وجہ سے عموماً گھر سے دور ہی رہتا تھا پھر شادی کے صرف پانچ سال بعد وہ ہارٹ اٹیک سے مر گیا تو اس کی راہ کی ہر دیوار ہٹ گئی۔ انیل مکرجی چونکہ پاکستان میں جوزف کے نام سے عیسائی بن کر رہ رہا تھا، اس لیے اسے

مسز سلتھیا جوزف کے نام سے پکارا جاتا تھا جبکہ اپنی بیٹی کلارا اینڈرسن کو اس نے ہر جگہ ماریا جوزف کا ہی نام دیا تھا۔ کاغذات کی رو سے وہ عیسائی مذہب سے تعلق رکھنے والی ایک پاکستانی لڑکی تھی لیکن سلتھیا نے اپنے بڑوں سے وعدہ لے رکھا تھا کہ جب بھی ماریا اسرائیل واپس جانے کی خواہش کرے گی، اسے وہاں کلارا اینڈرسن کے نام سے شہریت دے دی جائے گی۔ اپنی زندگی کے خشک تجربے کے بعد اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ کلارا کو طویل عرصہ وطن سے دور رہ کر جاسوسی کرنے پر مجبور نہیں کرے گی بلکہ چند سال میں اسرائیل واپس بھیج کر وہاں کسی معقول شخص سے اس کی شادی کروا دے گی۔ اس نے بہت سال کام کیا تھا اور آنے والے وقت میں ریٹائر ہو کر اپنے نواسے نواسیوں کے ساتھ زندگی کا لطف لینا چاہتی تھی لیکن اس کا ہر خواب ادھورا رہ گیا تھا۔ کلارا کے دنیا میں نہ رہنے سے اس کے لیے آنے والے کل کے لیے کوئی پلاننگ، کوئی خوشی باقی نہیں رہی تھی اور یہ دکھ اس کے لیے ناقابل برداشت تھا۔

"بیٹھ جاؤ سلتھیا! تمہارے اس طرح ٹہلنے سے ماریا واپس نہیں آجائے گی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تمہارا غم بہت بڑا ہے لیکن ایسا تو ہم میں سے کسی کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔ ہم جو کام کر رہے ہیں، اس میں جان کی بازی ہارنے کا سب سے زیادہ ڈر رہتا ہے۔" اسی کمرے میں ایک کرسی پر بیٹھا ورما کچھ دیر تو اسے ٹہلتا ہوا دیکھتا رہا لیکن پھر ٹوکنے پر مجبور ہو گیا۔ اسے سلتھیا اور ماریا کی موساد سے وابستگی کا قطعی علم نہیں تھا لیکن را کی ایجنٹس کے علاوہ ان کے ماں بیٹی ہونے سے بہر حال واقف تھا۔

"ماریا کے واپس آنے کا تو میں تب سوچوں گی جب مجھے اس کے چلے جانے کا یقین آئے گا۔ مجھے بتاؤ ورما کہ میری بیٹی کیسے مر گئی؟ میں نے تمہارے کہنے پر اسے اس کام کے لیے مجبور کیا تھا تو کیا تمہارا فرض نہیں بنتا تھا کہ اس کی پروٹیکشن کا بھی خیال رکھتے۔ وہ اتنے اہم مشن پر تھی اور تمہارا کوئی آدمی اسے کور دینے کے لیے قرب و جوار میں موجود نہیں تھا۔ کرنل کے اس کی اصلیت جان لینے کے بعد اس گھر سے روانہ ہونے تک تمہیں اتنی مہلت ملی تھی کہ اگر تمہارے آدمی کہیں نزدیک میں ہوتے تو اٹیک کر کے ماریا کو چھڑا سکتے تھے۔ لیکن تم نے تو میری بچی کو موت کے منہ میں اکیلا ہی چھوڑ دیا تھا۔" وہ اس کے سامنے آ کر کھڑی ہوئی اور ٹیبل پر ایک ہاتھ ٹکاتے ہوئے غصے سے بولی۔

"مجھے ماریا کی صلاحیتوں پر پورا بھروسا تھا۔ میں سمجھتا

تھا کہ وہ کرنل کو اس طرح قابو کرے گی کہ وہ اس کے آگے بے بس ہو جائے گا۔ لیکن وہاں تو کہانی ہی الٹ گئی۔ پھر بھی میں نے جو کچھ کرنا ممکن تھا، وہ کیا۔ میرے آدمی بہت تیزی سے ماریا کی مدد کے لیے پہنچے تھے اور انہوں نے اس گاڑی کو گھیر بھی لیا تھا۔ انہیں مقابلے میں کامیابی بھی مل جاتی لیکن اسے ماریا کی بدقسمتی کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ ایک تو وہاں پولیس موبائل پہنچ گئی اور دوسرے اتفاقاً ہی ایک گولی گاڑی کے پیٹرول ٹینک میں لگ گئی۔ مجھے خود اپنی اتنی ذہین ورکر کو کھونے کا دکھ ہے لیکن میں اس کا نصیب تو نہیں بدل سکتا تھا نا؟" چہرے پر افسردگی سجائے ورما نے اسے صفائی پیش کی حالانکہ وہ اتنا معصوم نہیں تھا جتنا خود کو ظاہر کر رہا تھا۔ اس نے اپنے آدمیوں کو ماریا کی مدد کے لیے بھیجتے وقت ہی انہیں یہ ہدایت دے دی تھی کہ اگر وہ ماریا کو چھڑانے میں کامیاب نہ ہو سکیں تو اسے موت کے گھاٹ اتار دیں اور اس کی ہدایت ہی ماریا کی اذیت ناک موت کا سبب بنی تھی۔

"تم نہیں سمجھ سکتے ورما! تم بھی اس تکلیف کو محسوس ہی نہیں کر سکتے جس سے میں ماریا کے پکڑے جانے سے لے کر اب تک گزر رہی ہوں۔ میں اپنے ہوٹل کے کمرے میں بیٹھی وہاں کی آوازیں سن رہی تھی۔ اس کرنل نے بہت چالاکی سے میری بچی کو بے وقوف بنایا تھا۔ میں نے ہوٹل سے فرار ہونے سے بھی پہلے تمہیں ماریا کی مدد کے لیے کال کر دی تھی لیکن تم نے دیر کر دی اور وہ اتنی بھری جوانی میں موت کے منہ میں چلی گئی۔ اس کی موت کا دکھ ایک طرف، مجھے یہ غم بھی مار رہا ہے کہ میری جان سے بھی پیاری بیٹی ایک لاوارث لاش کی حیثیت سے اسپتال کے مردہ خانے میں پڑی ہوئی ہے۔ اگر تم اسے مرنے سے نہیں بچا سکے تو کم از کم اس کی ڈیڈ باڈی تو حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ میں اس کا لاوارثوں کی طرح دفن ہونا برداشت نہیں کر سکوں گی۔" اب وہ ایک کرسی پر بیٹھ گئی تھی اور سرخ آنکھوں کے ساتھ پُرزور مطالبہ کر رہی تھی۔

"بے وقوف مت بنو سنتھیا! یہ ایک ٹریپ بھی ہو سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ پاکستانی انٹیلی جنس کے آدمی مردہ خانے کے ارد گرد ہی منڈلا رہے ہوں اور ہم لاش لینے جائیں تو وہ ہمارے آدمیوں کو ہی چھاپ لیں۔ میں ایک لاش کے لیے اپنے جیتے جاگتے قابل آدمیوں کو کسی صورت نہیں گنوا سکتا۔" ورما نے سختی سے اسے انکار کر دیا تو وہ اپنی مٹھیاں بھینچ کر رہ گئی۔

یہاں موساد کے ورکرز اتنی بڑی تعداد میں نہیں تھے کہ وہ چھوٹے موٹے کاموں کے لیے انہیں حرکت میں لا سکتی۔ عموماً اپنے کاموں کے لیے وہ لوگ را والوں ہی کو استعمال کرتے تھے۔ اگر کوئی کام راز میں رکھنا ہوتا تو پھر اس کے لیے کرائے کے آدمی استعمال ہوتے تھے لیکن اس وقت وہ کرائے کے آدمی استعمال کرتی تو را والے چونک جاتے کہ اس کا ان کے علاوہ کن لوگوں سے رابطہ ہے اور وہ ان کی مرضی کے خلاف کوئی کام کیونکر کر سکتی ہے۔ پھر یہ رسک تو واضح تھا کہ جو بھی ماریا کی لاش لینے جاتا، اس کے ذریعے ان لوگوں تک پہنچنے کی کوشش کی جاتی۔ کرائے کے کسی آدمی کی صلاحیتوں پر ایک حد سے زیادہ بھروسا نہیں کیا جا سکتا تھا۔ انٹیلی جنس کے تربیت یافتہ جوانوں کے مقابلے میں ان کی ناکامی کا امکان بہت زیادہ تھا۔ پہلے ہی وہ اپنے اس آدمی کے غیاب پر پریشان تھی جسے شہریار کی نگرانی کا کام سونپا گیا تھا۔ اس نے جو آخری رپورٹ پہنچائی تھی، اس کے مطابق شہریار نور کوٹ سے لاہور کی طرف سفر کر رہا تھا۔ اس کے بعد وہ آدمی رابطے میں نہیں رہا تھا اور یہی اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ پکڑا جا چکا ہے۔ اس یقین کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اسپتال میں شہریار کو دیکھا گیا تھا۔ ماریا کے آخری لمحات میں وہ اس کے کمرے میں تھا اور اس کے بعد اس کی لاش کو لاوارث قرار دے کر مردہ خانے میں ڈال دیے جانے کا مطلب تھا کہ بہت سے راز افشا ہو چکے ہیں اور اب تک خود کو انجان ظاہر کر کے وہ انہیں دھوکا دے رہا ہے۔

وہ لوگ یہ تو پہلے ہی سمجھ چکے تھے کہ شہریار کو اپنی نگرانی کے لیے استعمال کی جانے والی ڈیوائس کے بارے میں علم ہو گیا ہے لیکن اس نے اپنے رویے سے یہ ظاہر نہیں ہونے دیا تھا کہ وہ ماریا پر شک کر رہا ہے۔ پھر بھی ماریا فکر مند تھی اور سنتھیا کے سامنے تشویش کا اظہار کر چکی تھی۔ سنتھیا نے اسے بھی مشورہ دیا تھا کہ جیسے ہی وہ محسوس کرے کہ شہریار اس پر شک کر رہا ہے تو فوراً منظر سے غائب ہو جائے لیکن اس معاملے کی تصدیق یا تردید ہونے سے قبل ہی درمیان میں کرنل توحید والا معاملہ نکل آیا اور ماریا کی کہانی ہی ختم ہو گئی۔ اور یہ تو طے تھا کہ پہلے چاہے شہریار اس کی حقیقت سے واقف نہ ہو سکا ہو لیکن اب بہت کچھ جان گیا ہوگا۔ اس لیے اسے خود بھی اب اس سے دور رہنا تھا اور اپنے اوپر والوں کو بھی رپورٹ دینی تھی کہ پیر آباد میں رہ کر جو ذمے داریاں وہ نبھا رہی تھی، وہ کسی اور کو سونپ دی جائیں۔

"صبر کرو سنتھیا! ماریا کی موت کا مجھے بھی افسوس ہے اور میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ اس کا بدلہ چکایا جائے گا۔ لیکن ماریا کی ڈیڈ باڈی سے محروم رہنا ہماری مجبوری ہے۔

اس کی خدمات اور قربانیوں کے اعتراف کے باوجود ہم اس کی آخری رسومات اعزاز سے انجام دینے کی پوزیشن میں نہیں ہیں اور یہ بات تم بھی سمجھ سکتی ہو کہ کسی سیکرٹ ایجنٹ کا ایسا انجام خلافِ معمول نہیں ہے۔ ہم اپنے من میں تو اسے اونچے سنگھاسن پر بٹھا سکتے ہیں لیکن سرِعام اس کی خدمات کا اعتراف نہیں کر سکتے۔" اسے خاموش پا کر ورما نے اپنا لہجہ بدلا اور نرمی سے سمجھانے لگا۔ سنتھیا نے یونہی سر ہلا کر اس کی تائید کی پھر ذرا وقفے سے بولی۔

"ورما... میں دو بندوں کا وجود اس زمین پر زیادہ عرصے تک نہیں دیکھنا چاہتی۔ ایک کرنل توحید اور دوسرا اے سی شہریار عادل۔ میں نے اور میری بیٹی نے عمر بھر جو خدمات اور قربانیاں دی ہیں، ان کے بدلے میں مجھے جلد از جلد ان دونوں کی موت چاہیے۔ اور میرے خیال میں تمہارے لیے یہ کام زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوگا۔ تمہارے تربیت یافتہ خودکش حملہ آور آسانی سے یہ کام کر ڈالیں گے۔" اس کا لہجہ سپاٹ لیکن آنکھوں میں انتقام کی چنگاریاں تھیں۔

"ٹھیک ہے۔ جیسے ہی ممکن ہوا، ہم یہ کام کر گزریں گے۔" ورما نے شاید اسے ٹالنے کی کوشش کی۔

"موقع ابھی موجود ہے۔ کرنل توحید جس شادی میں شرکت کے لیے آیا ہے، وہاں گھات لگاؤ ورنہ دوسرا موقع نہ جانے کب ملے۔ شہریار کے معاملے میں البتہ تم سہولت سے پلاننگ کر سکتے ہو۔ وہ ایسا ٹارگٹ ہے جو ہمارے سامنے ہے اور ہم کبھی بھی اس پر ہاتھ ڈال سکتے ہیں۔" صدمے کی کیفیت میں ہونے کے باوجود اس کا تربیت یافتہ ذہن اپنا کام کر رہا تھا اور وہ پوری مستعدی سے انتقامی کارروائی کا سوچ رہی تھی۔

"تم جلد بازی سے کام لے رہی ہو سنتھیا۔" ورما نے اسے ٹوکنا چاہا۔

"نہیں، میں تمہیں بتا رہی ہوں کہ بروقت ایکشن لینا کتنا ضروری ہے، ورنہ دیر ہو جائے گی۔ پاکستانی انٹیلی جنس کو بھی معلوم ہونا چاہیے کہ را کے کسی ایجنٹ کا خون اتنا ارزاں نہیں ہے کہ انہیں اس کی قیمت نہ چکانی پڑے۔ انہیں اپنے کیے کی بھاری قیمت چکانی ہوگی۔" وہ بہت ٹھوس لہجے میں بول رہی تھی۔ ورما کے پاس انکار کی گنجائش نہیں تھی۔ وہ جانتا تھا کہ سنتھیا کے اوپر تک تعلقات ہیں۔ اگر وہ انکار کر دے گا تو وہ اوپر سے منظوری حاصل کر لے گی اس لیے بہتر تھا کہ وہ خود ہی تعاون کی ہامی بھر لے۔

☆☆☆

"ماسی! مجھے کوئی کام دلوا دے۔ منشی جی کی تو حویلی میں وڈی گل ہے۔ چودھری صاحب کا تو سنا ہے نوالہ منہ میں نہیں جاتا ان سے مشورہ کیے بغیر۔ وہ سفارش کریں گے تو مجھے کوئی نہ کوئی کام مل ہی جائے گا۔" شہزادی کی گود میں اس کا سب سے چھوٹا بیٹا تھا اور وہ بے خیالی میں بچے کے سر پر ہاتھ پھیرتی منشی اللہ رکھا کی بیوی سے درخواست کر رہی تھی۔

"دیکھ شہزادی! تیرا معاملہ وڈا نازک ہے۔ پنڈ میں کوئی تیری شکل دیکھنے کو تیار نہیں۔ تو نے جو حرکت کی تھی، اسے کون بھول سکتا ہے۔ ایسے میں، میں تیری سفارش کروں گی تو لوگوں کا دل مجھ سے بھی بُرا ہو جائے گا۔ تیری خاطر میں سارے پنڈ سے بھلا کیوں بُری ہوں؟" ماسی نے منہ ٹیڑھا کر کے اسے جواب دیا۔

"میں نے تجھے بتایا ہے نا ماسی کہ اس معاملے میں میرا کوئی قصور نہیں تھا۔ اماں اور بالے نے مجھے مجبور کیا تھا۔ بالا جس ڈبا پیر کے چکر میں پڑ گیا تھا، اسی نے اسے الٹی سیدھی پڑھائی تھی اور اماں میرے سر ہو گئی تھی کہ کسی بھی طرح مردہ بچے کی ہڈیاں لا کر دے ورنہ ساری حیاتی کے لیے تجھے تیرے بچوں کی شکل سے ترسا دوں گی۔ اب تو ہی دل پر ہاتھ رکھ کر بتا کہ کوئی ماں اپنے بچوں کے بغیر کیسے رہ سکتی ہے۔ میں نے بھی بہت مجبور ہو کر وہ کام کیا تھا۔ اب تو ویسے بھی ساری گل کھل گئی ہے۔ پولیس والوں نے بھی مجھے بے قصور جان کر چھوڑ دیا ہے، پیر پنڈ والے تو میرے اپنے ہیں۔ میں ان کے سامنے بچی سے جوان ہوئی ہوں پھر ماں بنی۔ کیا ان لوگوں کو نہیں معلوم کہ شہزادی کوئی بُری عورت نہیں ہے۔ مجبوری میں بندے سے غلطی ہو جائے تو اللہ بھی بخش دیتا ہے، پیر پنڈ والے کیوں معاف نہیں کریں گے؟" اس کی آنکھوں سے آنسو نکل کر روانی سے رخساروں پر بہہ رہے تھے اور وہ بولتی جا رہی تھی۔

نالی والا میں ہونے والی کارروائی نے اس کے لیے بڑی آسانی پیدا کر دی تھی۔ ایک طرف جہاں پیر سائیں کا پول کھلا تھا، وہیں بالے کی ماں بھی شرمسار ہو کر پوتوں کو سینے سے لگائے روتی پیٹتی پیر آباد واپس آ گئی تھی اور رو رو کر گاؤں والوں کو بتایا تھا کہ جہاں وہ بیٹے کی معذوری دور کرنے کے لیے بڑی آس سے گئی تھی، وہاں اس کی زندگی کھو کر آ رہی ہے۔ بالے کی چودھری سے وابستگی کے عرصے میں اس نے جس طرح گاؤں کے لوگوں کو ڈرا دھمکا کر رکھا ہوا تھا، لوگ ویسے ہی اسے پسند نہیں کرتے تھے لیکن خوف کی وجہ سے دب کر بات کرنے پر مجبور تھے۔ چودھری نے اپنا ہاتھ اس کے سر سے ہٹایا تو گاؤں والے بھی اس سے بے رخی برتنے

لگے۔ اس پر سے شہزادی کے مردہ بچے کی ہڈیاں قبر سے نکالنے کا واقعہ پیش آگیا تو بالے کے خاندان سے ان کی نفرت میں مزید اضافہ ہوگیا۔ اب بالے کی ماں اور شہزادی بچوں سمیت گاؤں واپس تو آگئے تھے لیکن گاؤں والوں نے ان کا سوشل بائیکاٹ کر رکھا تھا۔ شہزادی کو حالات سے لڑنے کا کوئی اور حل نہ سوجھا تو وہ گاؤں کی با اثر عورتوں میں سے ایک منشی اللہ رکھا کی بیوی کے پاس مدد کی درخواست لے کر پہنچ گئی۔

"اچھا چنی میں دیکھوں گی، پر ابھی تو تُو عدت میں ہے۔ عدت پوری ہوجائے تو پھر میرے پاس آنا۔ اس وقت مجھ سے جو بن پڑا کروں گی۔" اس کے آنسوؤں سے متاثر ہو کر اس نے ذرا نرم لہجہ اختیار کیا اور اسے ٹالنے کی کوشش کی۔

"کیسی عدت ماسی! گھر میں بچوں کے کھانے کے لالے پڑے ہیں۔ تو ہی بتا، مرنے والوں کے ساتھ بھلا کون مرتا ہے۔ ہور زندہ آدمی کے ساتھ تو پیٹ لگا ہوا ہے۔ مجھ سے ہور اپنے بچوں کا بھوک سے بلکنا نہیں دیکھا جائے گا۔ تُو دیکھنا میں پہلے انہیں گلے دبا کر ماروں گی فیر خود بھی نہر میں چھال مار کر اپنی جان دے دوں گی۔" روتے روتے اس نے عزائم کا اظہار کیا تو ماسی گھبرا گئی۔

"کیسی گل کر رہی ہے کڑیے؟ معصوم جانوں کا کیا قصور ہے جو تو ان کی جان لے لے گی۔ ذرا صبر سے کام لے۔ منشی جی آتے ہیں تو میں ان سے گل کرتی ہوں۔ وہ تیرے لیے ایسا کوئی کام دیکھیں گے کہ تیرا پنڈ کی عورتوں سے زیادہ سامنا ہی نہ ہو۔ ابھی میں تجھے اپنے پاس سے آٹا اور دال دے دیتی ہوں۔ گھر لے جا کر پکا کر خود بھی کھا اور بچوں کو بھی کھلا۔ کل تک اللہ نے چاہا تو میں تجھے خوش خبری سناؤں گی۔" اس کی خودکشی کی دھمکی کام کر گئی تھی چنانچہ ماسی گھبرا کر وعدہ کرنے لگی۔ اس کی بات سن کر شہزادی کی آنکھوں میں چمک آگئی۔

"یہ تو وڈی چنگی گل ہوگی ماسی کہ مجھے پنڈ کی دوسری عورتوں سے الگ کوئی کام مل جائے۔ میں نہ سامنے رہوں گی تو وہ مجھے طعنے دینے سے باز نہیں آئیں گی ہور کیا پتا کبھی غصے میں میرے منہ سے بھی کچھ الٹی سیدھی نکل جائے۔ انہیں تو بس موقع ہی مل جائے گا۔ سب کی سب مل کر میری گردن ہی مروڑ دیں گی۔" وہ گویا ماسی کو اس بات پر پکا کر رہی تھی کہ اسے باقی عورتوں سے ہٹ کر کوئی کام دیا جائے۔ یہ بات اپنی جگہ تھی بھی حقیقت کہ اسے گاؤں کی عورتوں کی بدسلوکی کا خدشہ تھا لیکن اس اصرار کے پیچھے ایک وجہ شہریار کی طرف سے سونپی گئی ذمے داری بھی تھی۔ اس نے اسے اسی شرط پر رہائی دلوائی تھی کہ وہ چودھری کے خلاف شواہد جمع کرنے میں اس کی مدد کرے گی اور وہ یہ اسی صورت کرسکتی تھی کہ اسے چودھری کے ہاں ملازمت مل جائے۔ چنانچہ وہ اپنی تنگ دستی کی داستان لے کر منشی اللہ رکھا کی بیوی کے پاس پہنچ گئی تھی۔ اللہ رکھا کی بیوی اس کی ماں کی رشتے کی بہن بھی ہوتی تھی۔ اس لیے اسے پورا یقین تھا کہ وہ اسے اپنے حق میں ہموار کرلے گی اور اس کا یقین غلط ثابت نہیں ہوا تھا۔ وہ اس کے اور بچوں کے فاقے کرنے کا سن کر پسیج گئی تھی حالانکہ حقیقتاً ایسا نہیں تھا۔ اس کے حالات جان کر شہریار نے پہلے ہی اسے سی آفس سے وظیفہ جاری کروا دیا تھا لیکن شہریار ہی کی وجہ سے اسے چودھری کے ہاں ہر صورت ملازمت کی راہ نکالنی تھی۔

"اچھا جا، زیادہ بک بک نہ کر۔ وڈی آئی غصے والی۔ اتنے برسوں میں اپنے مرد ہور ساس کا تو کچھ بگاڑ نہیں سکی۔ وہ دونوں جب چار چوٹ کی مارتے تھے تو تیرا غصہ کدھر چلا جاتا تھا؟ ان سے ڈر کر تو تُو نے اپنے لیے ایسی شکل پیدا کرلی ہے کہ کوئی تیری شکل دیکھنے کو راضی نہیں۔ ہور تو اپنے غصے کا ڈراوا دیتی ہے۔" ماسی اس کی بات سن کر بڑبڑانے لگی۔

"وہ الگ گل ہے ماسی پر تُو نے دیکھ لیا نا کہ مجھے ستانے والوں کو اللہ نے سکھ سے نہیں رہنے دیا۔ مجھ سے زبردستی ویاہ اور خوب مار کٹائی کرنے والا خود تڑپ تڑپ کر مرا، ہور اس کی ماں آج میرے آسرے پر پڑی ہے۔ میں چاہوں تو بڑھیا کو دھکے دے کر گھر سے نکال دوں... پر نہیں، میرے دل میں رب سوہنے کا ڈر ہے۔ میں کیوں بھلا کسی کے ساتھ برا کروں؟ جس کو جو سزا دینی ہوگی، میرا رب خود دے دے گا۔" وہ اپنے اندر کی سچائی بیان کر رہی تھی۔ ماسی نے اس بار کوئی تبصرہ نہیں کیا اور دال، آٹے کے تھیلوں کے علاوہ گھی کا ایک چھوٹا ڈبا بھی اس کے آگے رکھ دیا۔

"تہاڈی وڈی مہربانی ماسی... رب سائیں تینوں ساری جیاں خوش رکھے۔" وہ چیزیں دیکھ کر خوش ہوگئی اور چھوٹے کاکے کے ساتھ اس سارے سامان کو بھی سنبھالتی ہوئی اپنے گھر کی طرف روانہ ہوگئی۔

☆☆☆

اس سبزہ زار پر رنگ و نور کی برسات سی ہو رہی تھی۔ کہیں لہراتے آنچل تھے تو کہیں قیمتی ڈنر سوٹوں میں اکڑی ہوئی گردنیں۔ بلند و بانگ مردانہ قہقہوں کے درمیان سریلی ہنسی کی آوازیں ابھرتیں تو جلترنگ سا محسوس ہونے لگتا۔ طرح طرح کی خوشبوؤں کے درمیان سگار و پائپ کا کثیف دھواں بھی چکراتا پھر رہا تھا لیکن اس کثافت کو مختلف قسم کے پکوانوں کی مہک نے زیر کر رکھا تھا۔ اصل میں یہ ایک شادی خانہ آبادی کی تقریب تھی جس میں کرنل توحید احمد بھی شریک تھے اور بھرپور طریقے سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ پیشہ ورانہ مصروفیات کی وجہ سے ان کا عزیز و اقارب سے کم ہی ملنا ہو پاتا تھا۔ اس لیے آج وہ سب کے گلے شکوے دور کرنے کی کوشش میں ہر ایک سے ہی بڑے تپاک سے مل رہے تھے۔ اثنا میں بعض نوجوان چہرے تو ایسے تھے جنہیں وہ شناخت بھی نہیں کرسکے تھے اور انہیں خود اپنا تعارف کروانا پڑا تھا کہ وہ ان کے فلاں کزن یا فلاں عزیز کے بچے ہیں۔ اس خالص نجی تقریب میں انہیں ذیشان کے اصرار پر ہی ایف پی کے چار جوانوں کو بھی شرکت کی اجازت دلوانی پڑی تھی۔ ان میں سے دو جوان انہیں مسلسل اپنے آس پاس منڈلاتے نظر آرہے تھے جبکہ دو فی الحال نظروں سے اوجھل تھے۔ نوٹس میں آجانے والے جوانوں سے وہ جان بوجھ کر بے نیازی ظاہر کر رہے تھے اور عزیز و اقارب کے درمیان کھڑے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ ایسے میں انہیں اپنی بیگم کا پیغام ملا کہ خاندان کی کچھ بزرگ خواتین ان سے ملاقات کی خواہش رکھتی ہیں تو وہ زنانہ حصے کی طرف روانہ ہوگئے۔ ان کا خاندان ذرا روایت پسند تھا اس لیے جہاں آج کل مخلوط محافل کا رواج ہو چلا تھا، ان کے ہاں اب بھی اس بات کا اہتمام کیا جاتا تھا کہ مردانہ اور زنانہ حصے الگ ہی رکھے جائیں۔ مرد حضرات عموماً رسومات کے موقع پر یا خصوصی بلاوے پر ہی زنانہ حصے کا رخ کرتے تھے جیسا کہ اس وقت توحید احمد کو کرنا پڑا تھا۔

وہ جیسے ہی وہاں پہنچے، قریبی رشتے دار خواتین نے انہیں گھیرے میں لے لیا۔ ان خواتین سے دعا سلام اور خیر و عافیت کا سلسلہ نمٹاتے انہوں نے ان دونوں خواتین کا نوٹس بھی لے لیا تھا جو زنانہ حصے میں ان کی آمد کے ساتھ ہی نہایت پھرتی سے لیکن غیر محسوس طور پر ان کے دائیں بائیں آکھڑی ہوئی تھیں۔ لمبے قد اور چھریرے جسموں والی ان خواتین نے زرق برق شلوار قمیص زیب تن کر رکھے تھے اور شادی کی تقریب کی مناسبت سے میک اپ بھی کر رکھا تھا۔ پھر بھی کرنل توحید کو انہیں دیکھ کر ہنسی آرہی تھی اور وہ اس ہنسی کو خاندان کی خواتین سے خوش خلقی نبھانے میں خوب استعمال کر رہے تھے۔

"ہمارا توحید تو فوج کو ایسا پیارا ہوا کہ برسوں گزر جاتے ہیں ہمیں ڈھنگ سے اس کی صورت دیکھنے کو نہیں ملتی۔ پتا نہیں اسے یاد بھی ہے کہ بچپن میں یہ گھنٹوں میری گود میں چڑھا رہتا تھا۔ آج اپنے پوتا پوتی کو دیکھتی ہوں تو توحید کا بچپن یاد آجاتا ہے۔" ایک نہایت عمر رسیدہ خاتون نے پیار سے گلہ کرتے ہوئے ان کے بچپن کا دور یاد کیا۔

"میں وہ وقت کیسے بھول سکتا ہوں پھپھی جان... وہ تو میری زندگی کا سنہری دور تھا، اور میری سب سے لاڈلی پھپھی! ملازمت ہی ایسی ہے کہ مجھے مجبوراً آپ سب سے دوری سہنی پڑتی ہے۔" وہ بہت خوش اخلاقی سے خاتون کے شکوے کا جواب دینے لگے۔ اسی وقت جانے کیا ہوا کہ ان کے بائیں طرف موجود خاتون نے انہیں ایک زوردار دھکا دیا اور اگلے ہی لمحے فضا گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے گونج اٹھی۔ مہمان خواتین میں یک دم ہی کھلبلی سی مچ گئی اور خواتین ادھر ادھر چھپنے کی کوشش کرتی چیخیں مارنے لگیں۔ توحید احمد نے بھی فوراً ہی کوٹ کی جیب سے ریوالور نکال لیا اور اردگرد کا جائزہ لیتے ہوئے اٹھنے کی کوشش کرنے لگے۔

"ابھی یہیں بیٹھے رہیں سر! فائرنگ کی طرف سے کلیئرنس مل جائے تو پھر میں آپ کو یہاں سے نکال لوں گا۔" فوراً ہی ان کے قریب سے سرگوشی ابھری تو انہوں نے آواز کی سمت دیکھا۔ یہ وہی خاتون تھی جس نے انہیں دھکا دے کر نیچے گرا لیا تھا اور ان کے گرتے ہی فوراً وہاں فائرنگ کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔ البتہ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ خاتون کے منہ سے برآمد ہونے والی آواز خالصتاً مردانہ تھی جسے سن کر وہ ان مخدوش حالات میں بھی مسکرائے بغیر نہیں رہ سکے اور ان کی مسکراہٹ نے خاتون کو جھینپ جانے پر مجبور کر دیا۔ اصل میں وہ عورت کے بہروپ میں سی ایف پی کا ہی ایک نوجوان اہلکار تھا جس کو خوب کھرچ کھرچ کر شیو بنانے کے بعد میک اپ اور زنانہ لباس پہنا کر اس تقریب میں شامل کر دیا گیا تھا۔

ذیشان ان کے ساتھ ہونے والے واقعے کے بعد اتنا کانشس تھا کہ ان کی سیکیورٹی کے سلسلے میں ذرا بھی رسک لینے کو تیار نہیں تھا۔ جب اسے ان کی اس روایت کا پتا چلا کہ خواتین کے حصے میں مردوں کو بلا روک ٹوک جانے کی اجازت نہیں ہوتی تو اس نے فورس میں خواتین کی کمی کا سدباب کرتے ہوئے فوراً ہی اپنے دو نوجوان اہلکاروں کو عورت کے بہروپ میں تقریب میں شامل کرنے کا بندوبست کر ڈالا... اور اب حالات بتا رہے تھے کہ یہ بندوبست کتنا مناسب اور ضروری تھا۔

"آپ کا اور بیگم صاحبہ کا یہاں سے فوراً نکل جانا مناسب ہے سر! آپ کی گاڑی ریڈی ہے۔ ہم آپ کو گاڑی

تک پہنچا دیتے ہیں۔ یاسر اور کاشف آپ کے ساتھ جائیں گے جبکہ میں اور نواز یہاں رک کر معاملات نمٹائیں گے۔"

فائرنگ کی آواز یقیناً مردانہ حصے میں بھی سنی گئی تھی اور وہاں موجود سیکیورٹی اہلکار فوراً دوڑ کر اس طرف آگئے تھے۔ ان اہلکاروں میں سے ہی ایک ان سے یہ سب کہہ رہا تھا۔ حالات ایسے تھے کہ انہیں اس کی بات ماننی ہی پڑی۔ سخت سیکیورٹی میں وہاں سے روانہ ہوتے ہوئے انہوں نے بس اتنا ہی دیکھا کہ میزوں کے درمیان ایک عورت کی لاش پڑی ہے اور سی ایف پی کے اہلکار لوگوں کو اس لاش سے دور رہنے کی ہدایات دے رہے ہیں۔

"معافی چاہتا ہوں سراج! میری وجہ سے تمہاری تقریب خراب ہوگئی۔ اب تم سمجھ گئے ہوگے کہ میں خاندانی تقریبات میں شرکت سے اتنا گریز کیوں کرتا ہوں۔" گاڑی کی طرف جاتے ہوئے وہ لمحہ بھر کے لیے اپنے اس عزیز کے قریب رکے جس کے بے حد اصرار پر اس کی بیٹی کی شادی میں شرکت کے لیے آئے تھے اور معذرت کرنے لگے۔ حقیقتاً انہیں اپنی وجہ سے اس خوشیوں بھری تقریب کے رنگ میں بھنگ پڑتے پر دلی افسوس تھا۔

"کوئی بات نہیں توحید بھائی! جو بھی نصیب میں لکھا تھا سو ہوا۔" اس شخص نے ستے ہوئے چہرے کے ساتھ جواب دیا۔ شاید کچھ اور لوگ بھی اس گفتگو میں شریک ہوتے لیکن یاسر اور کاشف نے کسی کو موقع نہیں دیا اور انہیں ان کی بیگم سمیت وہاں سے لے کر نکلتے چلے گئے۔

"وہاں کیا ہوا تھا؟" گاڑی میں بیٹھنے کے بعد گاڑی چل پڑی تو انہوں نے سنجیدہ چہرے سے یاسر نامی نوجوان سے جو اس وقت بھی لڑکیوں والے حصے میں تھا، دریافت کیا۔

"آپ اپنی رشتے دار خاتون سے بات کر رہے تھے تو میری نظر یکدم ہی اس عورت پر پڑی جو ایک قریبی میز پر سے اچانک ہی کھڑی ہوئی تھی اور آپ کو نشانہ بنانا چاہتی تھی۔ میں نے فوراً ہی آپ کو اس کی زد پر سے ہٹانے کے لیے دھکا دے دیا اور اس کی طرف ایک فائر بھی کر ڈالا۔ میرے خیال میں میری چلائی ہوئی گولی اس کے بازو پر لگی تھی لیکن وہ گولی کھا کر پیچھے ہٹنے کے بجائے تیزی سے میز کے پیچھے سے نکلی اور اسی سمت میں دوڑ کر آنے لگی جہاں ہم لوگ موجود تھے۔ اس موقع پر کوئی رسک لینا ممکن نہیں تھا اس لیے نواز نے اس کے سینے میں گولی مار دی۔ میرا اندازہ ہے کہ گولی ٹھیک دل میں لگی تھی اس لیے اسے دوبارہ اٹھنے کی مہلت نہیں ملی۔" یاسر فوراً ہی انہیں رپورٹ دینے لگا۔

"کیا اس عورت کا کوئی دوسرا ساتھی وہاں موجود نہیں تھا؟" انہوں نے دریافت کیا۔

"کوئی دوسرا مشکوک شخص سامنے نہیں آیا۔ جہاں تک میرا اندازہ ہے، وہ عورت خودکش حملہ آور تھی جو اپنا فائر ناکارہ جانے کے بعد آپ کے قریب پہنچ کر خود کو بلاسٹ کر لینا چاہتی تھی۔ نواز کی سینے پر ماری گئی گولی نے اسے مہلت ہی نہیں دی ورنہ وہاں بڑے پیمانے پر تباہی پھیل سکتی تھی۔" اس نے جواب دیا۔ اسی وقت کرنل توحید کے موبائل کی گھنٹی بجنے لگی۔ انہوں نے دوسری طرف ذیشان کی موجودگی کے باعث فوراً ہی کال ریسیو کر لی۔

"آپ خیریت سے تو ہیں سر؟" اس نے بے تابی سے پوچھا۔

"الحمدللہ! تمہارے جوانوں نے بے مثال کارکردگی کا مظاہرہ کیا ورنہ شاید اس وقت تمہیں مجھ سے بات کرنی نصیب نہیں ہوتی۔" انہوں نے کھل کر سی ایف پی کے اہلکاروں کی کارکردگی کو سراہا۔

"ہمارے ہر جوان کے پیچھے آپ ہی کی محبت اور منصوبہ بندی ہے سر! بس مجھے یہ خوشی ہے کہ انہوں نے اپنی تربیت کو ضائع نہیں جانے دیا۔ مجھے ایسے کسی حملے کا پہلے ہی خدشہ تھا۔ ہمارے ہاتھوں کلارا اینڈرسن کے انجام نے را اور موساد دونوں کو بلبلانے پر مجبور کر دیا ہوگا اس لیے کسی نہ کسی طرف سے تو انتقامی کارروائی لازمی تھی۔ میں ایسے ہی کسی حملے کے ڈر سے آپ کی حفاظت کی طرف سے بہت فکرمند تھا۔ جو کچھ ہوا، اس میں دو ہی افراد قابلِ شناخت تھے، ایک آپ اور دوسرا شہریار... باقی ہم سارے تو پس پردہ ہیں۔ آپ کا معاملہ اس لیے زیادہ نازک ہے کہ آپ اصلی جنس سے وابستہ ہیں اور کلارا آپ ہی کو پھانسنے کے چکر میں اپنی جان سے گئی۔" ذیشان نے جواب دیا۔

"اندازہ تو مجھے بھی تھا لیکن میں ایک فیملی فنکشن کو ڈسٹرب نہیں کرنا چاہتا تھا۔ لیکن آدمی کی خواہش سے کیا ہوتا ہے، جو ہونا تھا وہ ہو گیا اور میرے حصے میں خوامخواہ کی ندامت آگئی۔ اب میں ان لوگوں سے کتنی ہی معذرت کر لوں لیکن جس طرح ان کی تقریب برباد ہوئی ہے، اس کا تو کوئی مداوا ہو ہی نہیں سکتا۔" ان کے لہجے میں گہرا تاسف تھا۔

"یہ حقیقت تو اپنی جگہ ہے سر! میرے ماتحت نے مجھے وہاں کی جو رپورٹ دی ہے، وہ واقعی قابلِ افسوس ہے۔ معاملہ صرف فائرنگ کا بھی ہوتا تو افراتفری اور بدمزگی سے بچا جا سکتا تھا لیکن حملہ آور لڑکی کے جسم پر موجود خودکش جیکٹ

نے ہمیں مجبور کر دیا کہ ہم تقریب کے منتظمین سے شادی لان خالی کروا لینے کی درخواست کریں۔ مجھے نواز نے فون پر جیسے ہی رپورٹ دی تھی، میں نے بم ڈسپوزل اسکواڈ اور مزید نفری کو اس طرف روانہ کر دیا تھا۔ بم کو ناکارہ بنانے اور ایکسپرٹس کی دیگر کارروائی کے لیے ضروری تھا کہ وہاں سے لوگوں کا رش ختم کیا جائے اس لیے جو کچھ ہوا، بہت مجبوری میں ہوا۔ آپ میری طرف سے بھی اپنے عزیز سے معذرت کر لیجیے گا لیکن ساتھ ہی انہیں یہ بھی سمجھا دیجیے گا کہ شکر ہے زیادہ بڑا نقصان نہیں ہوا۔ اگر ہمارے لوگ الرٹ نہ ہوتے تو اس وقت وہاں کئی بے گناہوں کی لاشیں پڑی ہوتیں۔ شادی کا کیا ہے، وہ لوگ گھر جا کر سادگی سے بھی دلہن کو رخصت کر سکتے ہیں... یا اگر ایسا قابلِ قبول نہ ہو تو پھر کسی دن فنکشن ارینج کر سکتے ہیں۔ آدمی زندہ سلامت ہو تو رکے ہوئے کام تو کسی نہ کسی طور نمٹا ہی لیے جاتے ہیں۔ البتہ انسانی جان کے نقصان کی تلافی کسی صورت نہیں ہو سکتی۔" ذیشان ایک آفاقی حقیقت بیان کر رہا تھا۔

"تمہاری بات درست ہے۔" انہوں نے اس کی تائید کی اور مزید بولے۔ "تمہارے لوگ کارروائی مکمل کر لیں اور لڑکی کی شناخت وغیرہ ہو جائے تو مجھے رپورٹ کر دینا۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ کل صبح ہی لاہور سے روانہ ہو جاؤں گا۔ جب حالتِ جنگ میں ہی رہنا ہے تو پھر دوسروں کو کیوں اپنے ساتھ گھسیٹا جائے۔ ہم اپنی روکھی پھیکی زندگی میں ہی ٹھیک ہیں۔" آزردگی سے کہتے ہوئے انہوں نے سلسلہ منقطع کر دیا اور سبک رفتاری سے دوڑتی گاڑی کے شیشے سے باہر تیزی سے گزرتے مناظر پر نظریں جمالیں۔ گاڑی میں موجود دیگر نفوس میں سے کسی میں یہ جرأت نہیں تھی کہ انہیں مخاطب کر سکتا۔

☆☆☆

"میں تہاڈے نال آنے کی تیاری کر رہا ہوں پتر! کچھ معلوم نہیں کہ دو چار دن میں پہنچ بھی جاؤں۔" چودھری افتخار فون پر اپنے بیٹے مراد شاہ کو اطلاع دے رہا تھا۔

"ضرور ابا جی! کیوں نہیں۔ یہاں بھی آپ کا ہی گھر ہے۔ جب دل چاہے آئیں اور جب تک چاہیں رہیں۔ لیکن مجھے حیرت ہے کہ اس بار آپ اتنی جلدی دوبارہ کیسے آرہے ہیں، میں خود ابھی تو وہاں سے آیا ہوں۔" اسے خوش آمدید کہنے کے ساتھ مراد شاہ نے حیرت کا اظہار بھی کیا۔ وہ برسوں سے امریکا میں تھا لیکن پہلے کبھی چودھری نے اتنے مختصر وقفے سے وہاں کا دورہ نہیں کیا تھا۔ خاص طور پر اس صورت میں کہ ابھی کچھ دن قبل ہی تو وہ بیوی بچوں سمیت پاکستان میں رہ کر آیا تھا۔

"بس پتر! ادھر دل نہیں لگتا۔ تو تھا تو فیر بھی حویلی میں تھوڑی رونق تھی، اب تو جیسے کاٹ کھانے کو دوڑ رہی ہے۔ تیری ماں کے بعد میرا دل ہی نہیں لگتا اس لیے سوچا کہ تھوڑے دن تیرے پاس آ کر رہ لیتا ہوں۔" اس نے لہجے میں افسردگی بھرتے ہوئے مکاری سے جواب دیا۔ اب وہ بیٹے کو یہ تو نہیں بتا سکتا تھا کہ اسے اپنے سیٹ آقا مسٹر الفا کی طرف سے پیغام موصول ہوا ہے کہ کچھ عرصے کے لیے منظر سے ہٹ جاؤ۔ میری طرف سے کلیئرنس ملے تو واپس آ جانا۔ اس حکم کا پس منظر کیا تھا، اسے نہیں معلوم تھا لیکن اس نے خطرہ بھانپ لیا تھا اور واپس حویلی جانے کے بجائے لاہور سے ہی سیدھا اسلام آباد پہنچ گیا تھا۔ ویزا لگتے ہی وہ فوراً امریکا کے لیے فلائی کر جاتا۔ جاگیر کے کاموں کی طرف سے اسے اتنی فکر نہیں تھی۔ منشی اللہ رکھا تجربہ کار اور قابلِ بھروسا آدمی تھا جو اس کے پیچھے سارے انتظامات بخیر و خوبی سنبھال لیتا۔

"حوصلے سے کام لیں ابا جی! آپ تو بڑے مضبوط دل کے آدمی ہیں، آپ سے مجھے یوں ہمت ہارنے کی امید نہیں تھی۔ آپ کا سایہ حویلی کے لیے بہت ضروری ہے۔ اماں کے جانے کا غم اپنی جگہ لیکن اور بھی لوگ ہیں جنہیں وہاں آپ کی ضرورت ہے۔ تاجور، صنوبر، بہزاد شاہ، اس کی بیوی بچہ اور چھوٹی ماں۔ یہ سارے لوگ بھی آپ سے محبت کرتے ہیں۔ انہیں بھی آپ کی توجہ کی ضرورت ہے۔" مراد شاہ اسے احساس دلانے لگا۔

"چھڈ دے پتر! میں سب کو جانتا ہوں۔ تاجور، صنوبر اپنے سسرالیوں کے ساتھ مل کر جائیداد ہتھیانے کے لیے میرے خلاف سازشوں میں شامل رہتی ہیں۔ بہزاد شاہ سے میں کیا دل بہلاؤں، اسے اپنا ہوش نہیں ہے۔ ہور رہی چھوٹی چودھرائن تو اس سے میرا دل سب سے زیادہ کھٹا ہے۔ اس کی جنی اولاد نے مجھے ایسا دکھ دیا ہے کہ میں جب بھی بستر پر لیٹتا ہوں لگتا ہے کانٹے چبھ رہے ہیں۔ بڑے کھوں کی بنائی عزت کو خاک میں ملا دیا ہے اس الوری بچی نے۔ ایک واری میرے ہاتھ آجائے تو میں اس کا گلا ہی دبا ڈالوں۔" چودھری کے لہجے میں نفرت کا زہر بھر گیا۔

"جانے دیں ابا جی! اب معاف کر دیں کشور کو۔ دیکھا جائے تو اس کے ساتھ زیادتی بھی ہو رہی تھی۔ ہر لڑکی کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کا گھر بار ہو۔ وہ اپنے بچوں کو پالے پوسے، پر آپ نے تو عمر بھر اس کی شادی نہ کرنے کا ہی فیصلہ کر رکھا تھا۔ ایسے میں اسے جو راہ دکھائی دی، وہ اس پر چل پڑی۔" اس نے حقائق جتاتے ہوئے باپ کا دل نرم کرنے

کی کوشش کی۔

"تو زیادہ فلسفہ نہ بگھار۔ خاندان میں اس کے جوڑ کا کوئی رشتہ تھا ہی کہاں جو میں اس کا ویاہ کرتا۔ مجھے بھی احساس تھا اس کے کچھ کا اس لیے اسے تاجور اور صنوبر سے بڑھ کر آزادی دی تھی، پر اسے میری دی ہوئی آزادی ہضم نہیں ہوئی اور وہ میرے ہی منہ پر کالک مل کر چلی گئی۔" چودھری دہاڑا۔

"اگر آپ خاندان میں رشتہ جوڑنے کی شرط ہٹا کر کسی دوسرے ہم پلہ خاندان میں اسے بیاہ دیتے تو نوبت یہاں تک نہیں آتی۔ آدمی کو حالات دیکھ کر تھوڑی بہت اپنے اصولوں میں لچک پیدا کرنی پڑتی ہے۔" باپ کا مزاج جاننے کے باوجود وہ اسے آئینہ دکھانے سے باز نہیں آیا۔ ادھر حسب توقع چودھری کا مزاج برہم ہو گیا۔

"تو تو امریکا میں رہ کر بے غیرت ہو گیا ہے مراد! پر میں تیرے جیسے کل کے چھوکرے کے کہنے میں آ کر اپنے بزرگوں کی ریت رواج نہیں بھول سکتا۔ ہم نے نسلوں سے کبھی اپنی دھی غیر برادری میں بیاہ کر اپنا سر کسی کے آگے نیچے نہیں ہونے دیا۔ ہور اگر کبھی نے کشور کی طرح بغاوت کی کوشش کی تو اس کا سر کچل دیا۔ کشور بھی جتنا چاہے بھاگ لے لیکن ایک دن تو میرا ہاتھ اس کی گردن تک پہنچے گا ہور وہ دن اس کی زندگی کا آخری دن ہوگا۔" اس نے نہایت سفاکی سے اپنے عزائم کا اظہار کیا۔

"توبہ کریں ابا جی! آپ کتنے آرام سے قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے کی باتیں کرتے ہیں۔" مراد شاہ نے جھرجھری سی لے کر اسے ٹوکا۔

"ہمارے اپنے قاعدے قانون ہیں مراد شاہ! ہم دوسروں کے بنائے ہوئے قانون پر نہیں چلتے۔ کشور کی سزا طے ہے، بس مجھے موقع ملنے کی دیر ہے۔ تو میرا پتر بن کر مجھے زیادہ سبق پڑھانے کی کوشش نہ کر ہور سن لے... اگر تو نے ایسی ہی گلاں کرنی ہیں تو پھر میں ادھر آ کر تیرے نال نہیں رہوں گا۔ پچھلی واری کی طرح کسی ہوٹل میں کمرا بک کروا لوں گا۔" چودھری نے آخر میں اسے دھمکانا ضروری سمجھا۔ اس کی دھمکی سن کر مراد شاہ کو وہ منظر یاد آ گیا جب اس نے باپ کو سنہری بالوں والی ایک بے باک عورت کے ساتھ دیکھا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر تلخ مسکراہٹ دوڑ گئی اور دل چاہا کہ مری ہوئی بیوی کے لیے ضرورت سے زیادہ محبت جتانے والے باپ کو اس کی آوارگی یاد دلا دے لیکن پھر رشتے کا احترام مانع آ گیا اور اس نے خاموشی ہی بہتر سمجھی۔

"ناراض نہ ہوں ابا جی! ٹھیک ہے، میں آپ سے بحث نہیں کرتا۔" اس نے ہتھیار ڈال دیے۔

"بس تو فیر خدا حافظ۔ میں نے تو تجھے صرف اطلاع دینے کے لیے فون کیا تھا... تو نے آپ ہی لمبی بحث چھیڑ دی۔" اس نے فون بند کر دیا اور سامنے رکھی بوتل سے سنہری سیال گلاس میں انڈیل کر اپنے لیے جام تیار کرنے لگا۔ مراد شاہ کی تلخ باتوں نے اس کا موڈ سخت آف کر دیا تھا اور اس خراب موڈ کی بحالی کے لیے شراب ضروری تھی۔ شراب نوشی کے دوران موبائل کی گھنٹی نے اسے ڈسٹرب کر دیا لیکن دیکھنا تو تھا کہ کس کی کال ہے۔ احتیاط کے پیش نظر اس نے اپنے زیر استعمال رہنے والا نمبر فی الحال بند کر رکھا تھا اور ایک نئے نمبر کی سم لے کر بس گنتی کے چند لوگوں کو جن سے رابطہ ضروری تھا، یہ نیا نمبر دے دیا تھا۔ اس وقت بھی اس نے بادل ناخواستہ موبائل اٹھا کر اسکرین پر آنے والا نمبر چیک کیا تو شیخ صاحب کا نام جگمگا رہا تھا۔ شیخ صاحب طبی مقاصد کے لیے استعمال ہونے والے آلات کی سپلائی کا کام بڑے پیمانے پر کرتے تھے اور اس کاروبار سے ان کی ٹھیک ٹھاک انکم بھی ہو جاتی تھی لیکن جب چودھری نے ڈالرز کا لالچ دیا تو ہیروئن فروشی میں بھی کوئی عذر نہیں جانا۔ ویسے بھی وہ اپنا کام کون سا ایمان داری سے کرتے تھے۔ جہاں موقع ملتا تھا، سامنے والی پارٹی کو چونا لگا ہی دیتے تھے اس لیے ہیروئن کے کاروبار میں شامل ہونے پر ان کے ضمیر نے انہیں ذرا ملامت نہیں کی اور چودھری سے ان کی گاڑھی چھننے لگی۔

"فرمایئے شیخ صاحب! کیسے یاد کیا آپ نے؟ آپ کا آدمی تو خیریت سے پہنچ گیا نا؟" یس کا بٹن پش کرتے ہی اس نے بے تکلفی سے گفتگو کا آغاز کر دیا۔

"نہیں چودھری صاحب! گڑبڑ ہو گئی۔ وہ دونوں میاں بیوی لندن ایئرپورٹ پر پکڑے گئے ہیں اور اب ان سے ایک بند کمرے میں پوچھ گچھ ہو رہی ہے۔" دوسری طرف سے شیخ صاحب کی پریشان آواز سنائی دی تو چودھری کا دماغ اڑ گیا۔

"ایسا کیسے ہو سکتا ہے شیخ صاحب! ہم نے تو اتنا اچھا بندوبست کیا تھا۔ کہیں آپ کا آدمی گھبراہٹ کی وجہ سے تو کسٹم والوں کی نظر میں نہیں آ گیا؟" چودھری سخت جھنجلاہٹ کا شکار تھا۔

"اسے تو میں نے کچھ بتایا ہی نہیں تھا۔ بس جیولری بکس دے کر یہی کہا تھا کہ جب تم لندن پہنچ کر ہوٹل میں ٹھہرو گے تو جن صاحب کی یہ امانت ہے، وہ خود آ کر اسے وصول کر لیں گے۔ رواج کے مطابق میں نے جیولری بکس کو گفٹ پیپر میں پیک بھی اسی لیے نہیں کروایا تھا کہ بند پیکٹ ایک تو لے جانے والے بندے کا ذہن الجھا دے گا، دوسرے کسٹم والے بھی کھوج میں پڑ جائیں گے... لیکن پھر بھی نہ جانے کیسے ہماری منصوبہ بندی ناکام رہی اور مال پکڑا گیا۔" شیخ صاحب کی پریشانی بھی کم نہیں تھی۔ وہ واقف تھے کہ پچھلی کھیپ جیمز کی آڑ میں امریکا پہنچائی جا چکی ہے اس لیے چودھری کی طرح ان کا اعتماد بھی کافی بڑھا ہوا تھا۔ مسٹر الفا کی ہدایت پر چودھری نے جیمز والی تدبیر دوبارہ نہیں دہرائی تھی اور اس بار نیا طریقہ کار استعمال کیا گیا تھا۔ انہوں نے پلاسٹک کی مدد سے ایک ایسا جیولری بکس تیار کروایا تھا جو دیکھنے میں بالکل سنگ مرمر کا لگتا تھا۔ اس جیولری بکس میں ایسا خلا رکھا گیا تھا جس میں ہیروئن بھر دی گئی تھی۔ ظاہری شکل و صورت اور وزن کی وجہ سے بہت غور کیے بغیر کوئی شک نہیں کر سکتا تھا کہ وہ جیولری بکس سنگ مرمر کا نہیں بلکہ پلاسٹک کا ہے۔ اس جیولری بکس کو شیخ صاحب نے اپنے ایک ملازم کے ذریعے بھجوانے کا بندوبست کیا تھا اور وہ ملازم اسے لندن پہنچا دیتا تو وہاں سے اسے دوسرے ذریعے سے امریکا بھجوایا جا سکتا تھا۔ اس کام کے لیے انہوں نے اپنے جس ملازم کو استعمال کیا تھا، وہ ایک پڑھا لکھا نوجوان تھا جس سے وہ زیادہ تر مارکیٹنگ کا کام لیتے تھے۔ نوجوان قابل اور محنتی تھا اس لیے شیخ صاحب اس کی اکثر دوسروں کے سامنے تعریف بھی کر دیا کرتے تھے۔ چنانچہ جب انہوں نے حال ہی میں ہونے والی اس کی شادی کے تحفے کے طور پر اسے لندن کا ٹکٹ اور ویزا دلوایا تو وہ بہت خوش ہوا اور اپنے تئیں شیخ صاحب کی مہربانی کے طفیل ہنی مون منانے لندن جا پہنچا۔ اب یہ تو اسے لندن ایئرپورٹ پر معلوم ہو رہا ہوگا کہ غریب آدمی کو اس قسم کے ہنی مون کا خواب کتنا مہنگا پڑتا ہے۔

"مال جس طرح بھی پکڑا گیا ہو، گردن تو میری پھنسے گی۔ تم تو پتا نہیں کیسے ہوا کہہ کر ایک طرف بیٹھ سکتے ہو لیکن میں ایسا نہیں کر سکتا۔" چودھری کا موڈ ایک بار پھر بہت خراب ہو چکا تھا اور اس کی شدت پہلے سے کہیں زیادہ تھی۔ اس نے نہایت بے مروتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے لائن کاٹی اور پھر ہونٹ کاٹتے ہوئے الفا کی طرف سے بھجوایا گیا خصوصی موبائل نکال کر دھڑکتے دل سے اس ناکامی کی خبر ایس ایم ایس کے ذریعے بھجوا دی۔ اس کا اندازہ تھا کہ یہ خبر الفا کو بہت بری لگے گی اور وہ کٹ کھنے بیل کی طرح اس پر چڑھ دوڑے گا۔ وہ خائف سا خود کو ہونے والی بے عزتی کے لیے تیار کرنے لگا۔ ادھر موبائل نے کال کی آمد کا اعلان شروع کر دیا۔ اس نے مرے ہوئے ہاتھوں سے یس کا بٹن پش کیا۔

"مال پکڑے جانے کی اطلاع تمہارے پیغام سے پہلے ہی ہم تک پہنچ چکی ہے۔ میرے آدمی کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ تمہارے کیریئر کی زبان بند کرنے کا بندوبست ہو سکے۔ لڑکا بہت گھبرایا ہوا ہے، اسے تھوڑا ریلیکس کرنے کے لیے انویسٹی گیشن آفیسر نے کافی منگوائی ہے۔ کافی کے مگ میں ڈالی جانے والی ایک گولی اس لڑکے کی زبان ہمیشہ کے لیے بند کر دے گی۔ لڑکی فی الحال بے ہوش ہے لیکن ہمیں اندازہ ہے کہ اسے کچھ معلوم نہیں اس لیے اسے نہیں چھیڑا جائے گا۔" اس کی کچھ بھی سنے بغیر الفا خود اسے سپاٹ سے لہجے میں بتاتا چلا گیا۔ اس کی اتنی باخبری اور مستعدی نے چودھری کو بے حد مرعوب کر دیا۔

"میں شرمندہ ہوں سر! معلوم نہیں میرے آدمی کی کس غلطی کی وجہ سے مال پکڑا گیا۔" الفا کی طرف سے برہمی کا اظہار نہ ہونے کے باوجود اس نے معذرت ضروری سمجھی۔

"مال پکڑے جانے کی فکر مت کرو۔ ایسا ہو جاتا ہے۔ تمہاری پلاننگ اتنی خراب نہیں تھی لیکن قسمت نے ساتھ نہیں دیا۔ اتفاقاً ہی جیولری بکس کسٹم آفیسر کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر جا گرا اور اس کے ٹوٹنے کی وجہ سے مال باہر نکل آیا۔ عام طور پر ہم کیریئرز کی اتنی فکر نہیں کرتے ہیں لیکن ابھی تم ناتجربہ کار ہو اس لیے ہمیں تمہارے کیریئرز پر نظر رکھنی پڑ رہی ہے۔ یاد رکھو، کیریئر بھلے پکڑا جائے لیکن کسی بھی انویسٹی گیشن آفیسر کو اس کے ذریعے تم تک نہیں پہنچنا چاہیے۔" آج الفا کسی خرانٹ باس سے ہٹ کر مہربان لب و لہجے میں گفتگو کر رہا تھا۔

"بہت بہتر سر! آئندہ میں پورا خیال رکھوں گا۔" چودھری کا کھویا ہوا اعتماد بحال ہوا تو وہ مستعدی سے بولا۔

"فی الحال تو تم اپنا خیال رکھو۔ تمہارے علاقے میں ہماری اسپیشل ایجنٹ ماریا ماری گئی ہے اور مسز جوزف کو فرار ہونا پڑا ہے۔ ہمیں امید تو نہیں ہے کہ مرنے سے پہلے ماریا نے تمہارے بارے میں زبان کھولی ہوگی پھر بھی تمہارا محتاط رہنا ضروری ہے۔ وقتی طور پر ساری سرگرمیاں روک دینا مناسب ہے۔ آگے حالات واضح ہوں گے تو پھر کام شروع کیا جا سکتا ہے۔" اس بار الفا نے جو اطلاعات فراہم کیں، انہیں سن کر چودھری کو حالات کی سنگینی کا اندازہ ہوا۔ خاص طور پر ڈاکٹر ماریا کی موت کی خبر اس کے لیے کسی دھماکے سے بڑھ کر ثابت ہوئی تھی۔

"وہ کب اور کیسے ماری گئی سر! یہاں تو کہیں اس بارے میں کوئی خبر ہی نہیں سننے میں آئی؟" اس نے اپنی

حیرت کا اظہار کیا۔ اور یہ حیرت ٹھیک بھی تھی۔ شہریار کی بیوی کی حیثیت سے تو ماریا کی موت کی خبر بہت تیزی سے پھیلنی چاہیے تھی لیکن وہاں تو بالکل خاموشی تھی۔

"اس کی موت میں پاکستانی انٹیلی جنس شامل ہے اور جو حالات ہمارے سامنے آئے ہیں، ان سے ثابت ہو رہا ہے کہ شہریار کے بھی انٹیلی جنس سے روابط ہیں۔ ماریا کی موت کے وقت وہ اس کے پاس ہی موجود تھا لیکن اس کے باوجود ماریا کی ڈیڈ باڈی لاوارث لاشوں کے درمیان رکھ دی گئی جس کا مطلب ہے کہ اس نے ماریا کے بارے میں کوئی اور فیصلہ کر لیا ہے۔ بہرحال جو بھی بات ہے، وہ دو چار دن میں سامنے آ جائے گی۔ اسے اپنی بیوی کے سلسلے میں پبلک کے سامنے کچھ نہ کچھ جواب دہی تو کرنی پڑے گی۔" وہ جس اسپیشل موبائل پر بات کر رہے تھے، اس کے متعلق انھیں یقین تھا کہ اس کی کال ٹریس نہیں کی جا سکے گی اس لیے کھل کر گفتگو ہو رہی تھی۔ شاید ماریا کی موت کا ہی اثر تھا کہ الفا اس سے اتنے دوستانہ انداز میں بات کر رہا تھا ورنہ پہلے کبھی اس نے چودھری کو اس لائق کب سمجھا تھا۔

"اس اے سی کا پتا صاف کروائیں جی... خوامخواہ خدائی فوجدار بن کر ہر معاملے میں اپنی ٹانگ اڑاتا ہے۔ جب سے ہمارے علاقے میں پوسٹ ہوا ہے، ناک میں دم کر کے رکھا ہوا ہے۔" چودھری کے دل میں شہریار کے لیے پرانا بغض تھا اس لیے وہ موقع ملتے ہی الفا کو بھی اس کے خلاف بھڑکانے کی کوشش کرنے لگا۔

"اس کے بارے میں فیصلہ کیا جا چکا ہے۔ جلد نتیجہ سامنے آ جائے گا... لیکن یاد رکھو کہ اے سی کی موت ہمارے مسائل کا واحد حل نہیں ہے۔ وہ مر بھی گیا تو انٹیلی جنس والے پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔ وہ ہماری راہ پر لگ چکے ہیں۔ اس لیے ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم بہت ہوشیار رہیں اور ہر لمحے اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھیں۔" الفا نے اسے نصیحت کی۔

"ٹھیک ہے سر! اب ہم پہلے سے زیادہ احتیاط کریں گے۔" اس نے یقین دہانی کروائی۔

"بس اب مجھے کچھ اور نہیں کہنا۔ گڈ بائے۔" الفا کی طرف سے سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔ اس فون کال سے فارغ ہو کر چودھری نے ایک بار پھر پینے کا سلسلہ شروع کر دیا لیکن اب وہ ٹھہر ٹھہر کر اور پُرفکر انداز میں پی رہا تھا۔

☆☆☆

"دشمن کی جسارتیں بڑھتی ہی جا رہی ہیں۔ میں تو توقع نہیں کر سکتا تھا کہ کرنل توحید پر اتنا کھلا حملہ کیا جائے گا۔" ذیشان کی زبانی سارے حالات جان کر اس نے تبصرہ کیا۔

"میرے لیے یہ حملہ خلاف توقع نہیں تھا۔ چوٹ کھایا ہوا دشمن بلبلا کر کچھ بھی کر سکتا ہے۔ پھر ٹارگٹ بھی سامنے تھا۔ روٹین سے ہٹ کر کسی بھی تقریب میں ان کے لیے کرنل صاحب کو نشانہ بنانا زیادہ آسان تھا، اس لیے انھوں نے جوابی وار کرنے میں دیر نہیں کی۔ وہ تو شکر ہے کہ میرے لوگ الرٹ تھے ورنہ ہمیں ناقابل تلافی نقصان سے دوچار ہونا پڑتا۔" ذیشان نے جواب دیا۔

"حملہ آور عورت کے بارے میں کچھ معلوم ہوا؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں، عورت کو شناخت کیا جا چکا ہے۔ دو سال قبل اس عورت کے شوہر اور بچے ایک جلوس میں شامل تھے کہ وہاں بم بلاسٹ ہو گیا اور اس حادثے میں وہ لوگ ہلاک ہو گئے۔ ظاہر ہے عورت کو شدید صدمہ پہنچا پھر حیرت انگیز طور پر یہ اچانک ہی اپنے گھر سے غائب ہو گئی۔ عزیز و اقارب نے گمشدگی کی رپورٹ درج کروائی لیکن کوئی نتیجہ نہیں نکل سکا۔ اب جبکہ وہ ایک خودکش حملہ آور کے طور پر سامنے آئی ہے تو ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ اسے کسی دہشت گردوں کے گروہ نے ٹریپ کر لیا ہوگا اور برین واشنگ کے ذریعے حکمرانوں اور انتظامیہ کے خلاف اس کے اندر زہر بھر دیا ہوگا۔ کسی صدمے سے بے حال عورت کے دماغ میں اس قسم کے خیالات بھرنا زیادہ مشکل بات نہیں ہے۔ چنانچہ جب اسے اپنی جان داؤ پر لگا کر کرنل صاحب کے خاتمے کا مشن سونپا گیا ہوگا تو وہ دل و جان سے راضی ہو گئی ہوگی۔" ذیشان نے حالات کا تجزیہ کیا۔

"تم درست کہہ رہے ہو۔ میں خود اپنی آنکھوں سے ان ملک دشمنوں کے کام کرنے کا طریقہ دیکھ چکا ہوں۔ میرے ذہن سے آج تک اللہ آباد کا وہ لڑکا نہیں نکل سکا جسے اپنے خاندان کے ساتھ ہونے والے ظلم نے اتنا مشتعل کیا تھا کہ وہ اپنے جسم سے بارودی مواد باندھ کر بھرے مجمع میں گھس گیا تھا اور مجھ سمیت بیوروکریسی اور سیاست سے تعلق رکھنے والے افراد کو ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس واقعے میں کئی بے گناہ مارے گئے تھے۔ وہ تو قسمت اچھی تھی کہ مجھ سمیت اسٹیج پر موجود دیگر افراد کو معمولی زخموں کے علاوہ کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا۔" اس نے ایک گزرا ہوا قصہ دہرایا۔

"تمہیں اب بھی بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ اس وقت میں نے تمہیں فون کیا ہی اس تاکید کے لیے ہے کہ اپنا خیال رکھو۔ کرنل صاحب کے بعد دشمنوں کا دوسرا ٹارگٹ تم ہی ہو سکتے ہو۔" اس نے شہریار کو اپنے اندیشے سے آگاہ کیا۔

"جب اوکھلی میں سر دیا تو موسلوں سے کیا ڈرنا۔ حالات میرے بھی سامنے ہیں لیکن اب میں ڈر کر خود کو کسی پردہ دار خاتون کی طرح گھر کی چار دیواری تک تو محدود نہیں رکھ سکتا۔" اس نے ہنسی میں بات اڑانے کی کوشش کی اور اپنی بات کو مزید موضوعِ گفتگو سے بچانے کے لیے فوراً ہی اگلا سوال داغ دیا۔

"اس بندے کا کیا ہوا جسے میں نے اپنا تعاقب کرتے ہوئے پکڑا تھا؟ پے در پے پیش آنے والے واقعات میں وہ بندہ تو میرے ذہن سے ہی نکل گیا تھا۔ اس نے کچھ اگلا کہ وہ کون ہے اور کس کے کہنے پر کام کر رہا تھا؟"

"وہ ایک کرائے کا ٹٹو ہے اور ہمارے لیے ناکارہ۔ اس کا شمار ان جرائم پیشہ افراد میں ہوتا ہے جو رقم کے لیے کسی بھی پارٹی کا کام کرنے پر راضی ہو جاتے ہیں۔ ہمارے سلسلے میں اس سے فون پر معاملات طے کیے گئے تھے اور معاوضے کی رقم بھی بندہ لانے میں کسی نہ کسی طریقے سے اس تک پہنچ جاتی تھی۔ یعنی پارٹی اس کے سامنے نہیں آئی تھی اور وہ صرف اتنا بتا سکا ہے کہ فون پر اسے کسی عورت سے ہدایات ملتی تھیں۔ جو فون نمبر اس سے ملا ہے، وہ بھی بیکار ہے کیونکہ سم کسی فرضی نام سے خریدی گئی تھی۔ میں نے اس بندے کو اس کے سابقہ ریکارڈ کی بنیاد پر پولیس کے حوالے کر دیا ہے۔ پولیس والے خود ہی حسب توفیق اس کی خاطر مدارات کر دیں گے۔" ذیشان نے مفصل جواب دیا۔ اس جواب سے اتنا تو بہرحال واضح ہو گیا تھا کہ اس بندے کو اس کے پیچھے ماریا یا اس کی ممی نے ہی لگوایا تھا۔

"اس کا مطلب ہے، ہمارے پاس لے دے کر ایک اشیش کماری بچا ہے جس کی مزید چھان بین کر کے کچھ اور معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی جا سکتی ہے۔" اس نے تبصرہ کیا۔

"اس پر تو خیر کام جاری ہی ہے۔ اس کے علاوہ تمہارے چودھری صاحب اور عابد انصاری پر نظر رکھی ہے۔ تمہیں یہ سن کر افسوس ہوگا کہ چودھری مسلسل منظر سے غائب ہے اور کہیں سے اس کی کوئی سن گن نہیں مل رہی۔"

"یہ تو واقعی بڑی افسوس ناک خبر ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ واقعی ملک دشمنوں کے ایجنٹ کا کردار ادا کر رہا تھا جب ہی حالات بگڑتے ہی منظر سے غائب ہو گیا۔ تم اس کا نام ای سی ایل میں ڈلوانے کی کوشش کرو۔ کم از کم اسے ملک سے باہر نہیں نکلنا چاہیے۔" اس نے مشورہ دیا۔

"یہ کام میں ابھی کر دیتا ہوں۔ تم بتاؤ، تمہاری طرف کیا خبریں ہیں... تمہاری مخبر نے کچھ کام دکھایا؟" اس سے

اتفاق کرتے ہوئے ذیشان نے استفسار کیا۔

"وہ میری توقع سے زیادہ کامیابی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی ہے۔ اسے شیخ اللہ رکھا کی سفارش پر عابد انصاری کے بنگلے پر کام کرنے کا موقع مل گیا ہے۔ امید ہے کہ جلد اس کی طرف سے اہم اطلاعات آنی شروع ہو جائیں گی۔" اس نے خوش خبری سنائی۔

"یہ تو اچھی بات ہے۔ تم احتیاط سے اپنے حصے کا کام کرتے رہو۔ میں یہاں رہ کر معاملات پر نظر رکھتا ہوں۔ ضرورت پڑنے پر ہم فوراً حرکت میں آجائیں گے۔ میں نے اپنی فورس کو ہائی الرٹ کر رکھا ہے اس لیے وہ پہلے سے بھی زیادہ تیزی سے حرکت میں آنے کی پوزیشن میں ہیں۔" ذیشان نے اسے بتایا اور پھر ان دونوں کے درمیان چند ایک مزید باتیں ہونے کے بعد گفتگو کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ شہریار نے بھی اپنی توجہ دفتری امور کی طرف مرکوز کر لی۔ اسے احساس تھا کہ دوسری سرگرمیوں میں الجھنے کی وجہ سے وہ اپنی پیشہ ورانہ ذمے داریاں پہلے کی طرح بھرپور طریقے سے انجام نہیں دے پا رہا ہے اس لیے اس وقت پوری توجہ اسی طرف مرکوز تھی۔ آج صبح ہی اس نے عبدالمنان کو یہ احکامات بھی جاری کر دیے تھے کہ وہ اللہ آباد اور نور پور کے دورے کرے گا چنانچہ گاڑی تیار رکھوائی جائے۔ اس دورے پر وہ مشاہرم خان کو اپنے ساتھ نہیں لے جا رہا تھا کیونکہ مشاہرم کو اس نے اس سے اہم ذمے داری سونپ رکھی تھی جسے نبھانے کے لیے وہ صبح صادق سے بھی پہلے روانہ ہو گیا تھا۔ اب یہ عبدالمنان کا مسئلہ تھا کہ وہ اس کی جگہ کے ڈرائیونگ کی ذمے داری سونپتا۔ ایک متبادل ڈرائیور تو بہرحال دفتر میں موجود ہی تھا۔

"ایک بجنے میں چند منٹ ہی باقی ہیں سر! آپ کی ہدایت کے مطابق میں نے آپ کے لیے گاڑی تیار کروا دی ہے۔ آپ ٹھیک ایک بجے یہاں سے روانہ ہو سکتے ہیں۔" وہ نہایت انہماک سے فائلوں میں الجھا ہوا تھا کہ عبدالمنان نے اسے مؤدبانہ اطلاع دی۔

"ٹھیک ہے۔ تم یہ فائلیں بھی گاڑی میں رکھوا دو۔ راستہ لمبا ہے۔ میں راستے میں انہیں دیکھ لوں گا۔" اس نے ہدایات جاری کیں۔ دو منٹ بعد ہی وہ گاڑی کی پچھلی نشست پر براجمان تھا۔ اپنی غیر موجودگی میں کچھ ضروری کاموں کی نگرانی کی خاطر وہ عبدالمنان کو اپنے ساتھ نہیں لے جا رہا تھا۔ اس کی طرف سے اشارہ ہوتے ہی گاڑی آگے بڑھ گئی اور وہ ایک بار پھر فائلوں میں کھو گیا۔ ڈرائیور ماہر تھا اس لیے گاڑی بڑی سبک رفتاری سے آگے بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ اپنے انہماک کی وجہ سے وہ وقت اور فاصلے کا تعین رکھنے سے قاصر تھا لیکن جب کھیتوں کے ایک سلسلے کے درمیان سے گزرتے ہوئے گاڑی ایک جھٹکے سے رکی تو وہ چونک گیا۔

"کیا مسئلہ ہے؟" اس نے ڈرائیور سے دریافت کیا۔

"میں دیکھتا ہوں سر!" ڈرائیور جواب دیتا ہوا فوراً نیچے اتر گیا اور بونٹ اٹھا کر کھڑا ہو گیا۔ شہریار کے لیے بڑی کوفت میں مبتلا کر دینے والی صورت حال تھی۔ اس نے شروع ہی سے اپنے عملے کو ان معاملات میں تاکید کر رکھی تھی کہ کہیں کسی قسم کی بدنظمی نہ ہو لیکن جانے کیسے اس ڈرائیور نے غفلت برت دی تھی کہ گاڑی بیچ راستے میں داغ مفارقت دے گئی تھی۔

"انجن گرم ہو گیا ہے سر! میں ابھی قریبی ٹیوب ویل وغیرہ سے پانی لاتا ہوں۔" ڈرائیور نے اسے اطلاع دی اور اسے تاؤ کھانے کا موقع دیے بغیر بوتل اٹھا کر سیدھا کھیتوں میں گھس گیا۔ کوفت زدہ شہریار کے پاس فی الحال برداشت سے کام لینے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ نظریں گھما کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ ڈرائیور مڑ کر دیکھے بغیر آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ شاید اسے ڈر تھا کہ مڑ کر دیکھا تو شہریار کی غضب ناک نگاہوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ انتہائی کوفت محسوس کرنے کے باوجود اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ ادھر ڈرائیور کافی فاصلہ طے کر چکا تھا اور کھیت میں موجود اس کنوئیں کے قریب پہنچ گیا تھا جہاں دو کھیت مزدور پہلے ہی سے کھڑے شاید کسی موضوع پر آپس میں تبادلہ خیال کر رہے تھے اور ان کی توجہ ابھی تک اس کی طرف مبذول نہیں ہوئی تھی۔ ڈرائیور ان سے بہ مشکل دو قدم کے فاصلے پر ہی ہوگا کہ فضا میں ایک کان پھاڑ دھماکا گونجا۔ ڈرائیور سمیت ان دونوں کھیت مزدوروں نے بھی اپنے قدموں تلے زمین لرزتی ہوئی محسوس کی۔ چند ثانیوں بعد جب وہ اپنے حواسوں میں واپس آئے تو ان کی نظروں نے جو پہلی چیز فوکس کی، وہ دور سڑک پر بلند ہوتے آگ کے شعلے تھے۔ آگ کے یہ شعلے اس گاڑی سے بلند ہو رہے تھے جس سے ابھی کچھ دیر قبل ہی ڈرائیور اتر کر کھیتوں کی طرف آیا تھا اور جس کی پچھلی نشست پر شہریار براجمان تھا۔

"صاحب...!" ڈرائیور دیوانہ وار چیختا ہوا اس سمت بھاگا جہاں گاڑی کے جلتے ہوئے ڈھانچے کے سوا شاید اب کچھ بھی نہیں بچا تھا۔

یہ پُرپیچ و سنسنی خیز داستان جاری ہے
مزید واقعات آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں۔

چودھری کو اس کے جتنے کے کارخانے میں ہیروئن کی تیاری کے لیے لیب قائم کرنے پر آمادہ کر لیتا ہے۔ اسلم، ماہ بانو اور لقی سفر کے دوران ایک جگہ رکتے ہیں۔ وہاں بھرو پہنچ جاتا ہے اور اسلم اور بھرو کے درمیان خونی تصادم ہوتا ہے۔ لقی اس تصادم میں بھرو کی گولی کا شکار بنتی ہے۔ بھرو، اسلم کے چاقو کا نشانہ بن کر اپنے انجام کو پہنچتا ہے۔ ادھر پولیس والے شبانہ کے ذریعے آفتاب کا فون نمبر ٹریس کر کے اس کی قیام گاہ کا پتا لگا لیتے ہیں اور چودھری سے تعاون کے عوض اس کا پتا بتا دیتے ہیں۔ سفر کے دوران ماہ بانو اور اسلم کی ملاقات شفقت راؤ نامی شخص سے ہوتی ہے۔ وہ انہیں اپنے بہنوئی کا پتا سمجھا دیتا ہے جو ان کے لیے پناہ کا بندوبست کر دیتا ہے۔ ادھر چودھری افتخار لندن پہنچتا ہے اور ہیروئن کی تیاری کے لیے لیب کے قیام والے معاملات طے کر لیتا ہے۔ ماہ بانو اور اسلم، شفقت راؤ کے بتائے ہوئے گاؤں تک پہنچ جاتے ہیں۔ وہ لوگ حامد راؤ کے گھر آ جاتے ہیں۔ ادھر شہریار شہزادی نامی عورت سے مردہ بچیوں کی بڈیاں وصول کرنے والے شخص سے تفتیش کرتا ہے اور کافی کچھ اگلوانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اسلم اور ماہ بانو ایک ہی کمرے میں رات گزارتے ہیں۔ صبح ان کی روانگی کا پروگرام ہوتا ہے۔ تاہم رات میں کچھ لوگ ان کے مکان کو گھیر لیتے ہیں۔ پھر وہاں دو بدو مقابلہ شروع ہو جاتا ہے۔ تاہم وہ سب دشمنوں کا گھیرا توڑ کر فرار ہو جاتے ہیں اور حامد راؤ کے شہر میں واقع فلیٹ میں آ جاتے ہیں۔ ادھر مشابہم خان شہریار کو خانقاہ کی رپورٹ دیتا ہے اور اس گاؤں میں ہونے والے مقابلے کی خبر دینے کے ساتھ وہاں اسلم اور ماہ بانو کی موجودگی اور پھر فرار کا بتاتا ہے۔ شہریار کی خبر سن کر چونک جاتا ہے۔ بہرحال وہ مشابہم خان کو دوبارہ ٹالی والا جا کر تحقیقات کرنے کا حکم دیتا ہے۔ مشابہم خان وہاں پہنچ کر ایک بوڑھے شخص سے معلومات حاصل کرتا ہے۔ ادھر ماہ بانو اسلم کے گاؤں اس کی ماں کو لینے پہنچتی ہے مگر زینت بی بی انتقال کر جاتی ہیں۔ وہ اس کی تدفین کر کے واپس اسلم کے پاس پہنچ جاتی ہے۔ تاہم نواز چانڈیو اور اس کا بھائی وہاں پہنچ جاتے ہیں اور ماہ بانو اور اسلم کو وہاں سے لے کر ویرانے میں آ جاتے ہیں مگر اسلم اچانک حملہ کر کے انہیں ناکوں چنے چبوا دیتا ہے۔ وہ دونوں شہر چھوڑ دیتے ہیں۔ ادھر شہریار کی ملاقات میجر ذیشان سے ہوتی ہے تو وہ اسے بتاتا ہے کہ ایک اسپیشل فورس قائم کر لی گئی ہے اور وہ خود اس میں شامل ہو گیا ہے۔ یہ فورس ایک سیکیورٹی ایجنسی کے طور پر خفیہ کام کرتی ہے۔ واپسی میں شہریار کو ماہ بانو کا فون موصول ہوتا ہے تو وہ چونک جاتا ہے۔ وہ اسے ایک ریسٹورنٹ میں ملتی ہے اور اسلم سے شادی کی خبر سنا کر اس سے اپنے شناختی کاغذات بنوانے کے لیے اس کی مدد چاہتی ہے۔ شہریار کو مشابہم خان کے ذریعے ٹالی والا میں مشکوک اشیا کے پہنچائے جانے کی اطلاع ملتی ہے۔ شہریار میجر ذیشان کے ذریعے وہاں کارروائی کرواتا ہے اور خود بھی اس کے ہمراہ ٹالی والا پہنچتا ہے۔ وہاں اسے پتا چلتا ہے کہ اس کی جاسوسی کی جا رہی ہے تو وہ اپنے گھر میں جاسوسی کے لیے استعمال ہونے والی ڈیوائس کو ڈھونڈتا ہے جو اسے کرسٹل کے پیالے میں رکھے موتیوں میں سے ایک موتی کی شکل میں مل جاتی ہے۔ شہریار کو ماریا پر شبہ ہوتا ہے۔ ماریا لاہور جانے کے لیے نکلتی ہے تو شہریار مشابہم خان کو اس کی نگرانی کرنے کی ہدایت دیتا ہے۔ ادھر شہریار کو ماہ بانو کے نکاح کے سلسلے میں خود بھی لاہور جانا پڑتا ہے۔ راستے میں اسے اپنے تعاقب کا احساس ہوتا ہے۔ وہ تعاقب کرنے والے کو قابو کر لیتا ہے اور اسے لے کر ذیشان کے آفس پہنچ جاتا ہے۔ وہ لوگ ماہ بانو اور اسلم کو بھی وہیں بلا لیتے ہیں۔ اسلم اور ماہ بانو شادی کے بندھن میں بندھ جاتے ہیں۔ ماریا، کرنل توحید کو بھگانے کی کوشش میں پکڑی جاتی ہے تاہم راستے میں را کے ایجنٹوں کی فائرنگ سے گاڑی میں آگ لگنے کے سبب ماریا بُری طرح جھلس جاتی ہے اور اسپتال میں پوچھ گچھ کے دوران دم توڑ دیتی ہے۔ شہریار اس کی لاش کو لاوارثوں میں شامل کرنے کا حکم دیتا ہے۔ ادھر ماریا کی ماں سکھیا جزوقتی بیٹی کی موت پر شدید غم و غصے کا شکار ہوتی ہے اور درما سے انتقامی کارروائی کرنے کا مطالبہ کرتی ہے۔ کرنل توحید پر قاتلانہ حملہ ہوتا ہے تاہم وہ بچ جاتا ہے۔ ادھر شہریار اسلام آباد اور نور پور دورے کے لیے نکلتا ہے۔ مشابہم خان کو اس نے کوئی دوسری ذمہ داری سونپ رکھی ہوتی ہے۔ اس کی جگہ وہ دوسرے ڈرائیور کے ساتھ نکلتا ہے۔ راستے میں گاڑی خراب ہو جاتی ہے۔ ڈرائیور قریبی ٹیوب ویل سے پانی لانے کے لیے گاڑی سے اترتا ہے۔ وہ کھیتوں میں پہنچتا ہے تو ایک کان پھاڑ دھماکا سنائی دیتا ہے۔ وہاں اب شہریار کی گاڑی کے جلتے ہوئے ڈھانچے کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

بیچ راستے میں خراب ہونے والی گاڑی نے شہریار کو سخت کوفت میں مبتلا کر دیا۔ ڈرائیور کی غفلت پر برہم ہونے کے باوجود اس نے ضبط سے کام لیا تھا اور خود اس کی گوشمالی کرنے کے بجائے واپس جانے کے بعد یہ کام عبدالمنان کے لیے چھوڑ دیا تھا۔ اس کے خیال میں یہی مناسب تھا کہ عملے کی کارکردگی کو عبدالمنان خود منظم کرے، چنانچہ ڈرائیور کو خاموشی سے پانی لانے کی اجازت دے دی اور خود ادھر اُدھر کا جائزہ لینے لگا۔ وہ جس کوفت کا شکار ہوا تھا، اس کے باعث زیرِ مطالعہ فائل پر سے بھی فی الحال توجہ ہٹ گئی تھی اس لیے اردگرد کے مناظر کا جائزہ لینے کے سوا اس کے پاس کوئی دوسرا کام تھا ہی نہیں۔ اس کی گاڑی جس کچی پکی سڑک پر رکی تھی، اس کے دونوں طرف کھیت پھیلے ہوئے تھے۔ اس کا ڈرائیور پانی لینے کے لیے بائیں طرف کے کھیت میں گیا تھا۔ اس خاموش اور پُرسکون مقام پر پھیلے ان ہرے بھرے کھیتوں کا نظارہ آنکھوں کو عجیب سی ٹھنڈک اور تازگی کا احساس بخش رہا تھا۔

بے ساختہ ہی اس کا دل مچلا کہ وہ گاڑی میں چلتے ائرکنڈیشنر کی مصنوعی خنکی سے نکل کر آنکھوں کو ٹھنڈک کا احساس بخشتی کھیتوں کی ہریالی میں اتر جائے۔ یہ خواہش اتنی شدید تھی اور اتنی تیزی سے اس کے اندر پیدا ہوئی تھی کہ وہ اسے نظرانداز نہیں کر سکا اور گھٹنوں پر رکھی فائل کو سیٹ پر رکھ کر دروازہ کھول کر باہر نکل گیا اور دائیں طرف پھیلے کھیتوں کا رخ کیا۔ ائرکنڈیشنر گاڑی کو چھوڑ کر باہر نکلنے کی صورت میں اسے اپنے چہرے پر گرم ہوا کا تھپیڑا سا لگتا ہوا محسوس ہوا لیکن اسے کی مصنوعی ٹھنڈک کے مقابلے میں یہ گرم ہوا زیادہ

فرحت بخش تھی۔ وہ دل ہی دل میں قدرت کی بالادستی کو تسلیم کرتا ہوا کھیتوں میں آگے بڑھتا چلا گیا۔ اب تک اسے وہاں کوئی ذی نفس دکھائی نہیں دیا تھا۔ وہ چند قدم اور آگے بڑھا۔ دفعتاً اسے مدھم انسانی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ وہ ساعت پر زور دے کر آوازوں کو سننے لگا۔ وہ مرد و زن کا کوئی جوڑا تھا جو سرگوشیوں میں ایک دوسرے سے محوِ گفتگو تھا۔

''چھوڑو نا کمال! کیا کرتے ہو۔ مجھے گھر جانے میں دیر ہو گئی تو میری اماں کی دس باتیں سننی پڑیں گی۔ پہلے ہی وہ الزام لگاتی ہے کہ میں نے اُلّو کا گوشت کھلا کر اس کا پتر اس سے چھیا لیا ہے۔'' اسے عورت کی ناز بھری آواز سنائی دی۔ آواز دھیمی ہونے کے باوجود اتنی صاف تھی کہ اسے ایک ایک لفظ واضح سنائی دیا جس کا مطلب تھا کہ وہ دونوں اس کے بالکل قریب ہی موجود ہیں۔ اس نے کھڑی فصل کے دو نازک تنوں کو ہاتھوں سے دائیں بائیں کرتے ہوئے آواز کی سمت میں دیکھا۔ اسے وہ دونوں نظر آ گئے۔ عورت نے زرد رنگ کے شلوار قمیص پر کئی رنگوں پر مشتمل دوپٹا اوڑھ رکھا تھا جبکہ مرد کے جسم پر نیلا کرتا اور سفید دھوتی تھی۔ دھوتی کی سفیدی پر مٹی کے داغ دھبے نمایاں تھے۔

''میری اماں غلط تو نہیں بولتی۔ تُو نے اس کا پتر تو واقعی چھیا لیا ہے۔ اب تیرے سوا میرا کسی چیز میں جی ہی نہیں لگتا۔'' مرد شوخی پر مائل تھا۔ بولتے بولتے اس نے عورت کے ''نہ نہ'' کرنے کے باوجود اسے اپنی بانہوں میں بھر لیا۔ یہ منظر دیکھ کر شہریار کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ مرد اور عورت دونوں ہی نوجوان تھے جس سے اس نے یہ اندازہ لگایا تھا کہ وہ کوئی نو بیاہتا جوڑا ہے۔ اس پریمی جوڑے کی تنہائی میں مخل نہ ہونے کا سوچ کر اس نے اپنے ہاتھوں میں جکڑے نازک تنوں کو چھوڑ دیا۔ عین اسی لمحے فضا میں ایک کان پھاڑ دینے والا دھماکا گونجا۔ ساتھ ہی اسے عورت کی خوف و دہشت میں ڈوبی سریلی چیخیں بھی سنائی دیں لیکن اس وقت اس کی توجہ پوری طرح آگ کا گولہ بنی اپنی گاڑی کی طرف مبذول تھی۔ مشکل سے دو ڈھائی منٹ پہلے وہ اس گاڑی میں موجود تھا۔ اگر اپنے اندر پیدا ہونے والی شدید خواہش پر اس نے گاڑی نہ چھوڑی ہوتی تو خود بھی یقیناً اس جلتی گاڑی کا ایک حصہ ہوتا۔ شدید شاک میں ہونے کے باوجود اسے احساس ہوا کہ گاڑی سے اتر کر کھیتوں میں آنے کی خواہش درحقیقت غیبی مدد تھی۔ وہ جو زندگی اور موت کا مالک ہے، اسے ابھی اس کی موت منظور نہیں تھی۔ جب ہی اس نے ایک معمولی سی خواہش کے ذریعے اس کے جینے کی سبیل پیدا کر دی تھی۔

دل ہی دل میں وہ ربِ کائنات کا شکر ادا کرتا ہوا پنجوں کے بل نیچے بیٹھ گیا۔ موجودہ صورتِ حال میں اس کا ذہن بہت تیزی سے کام کر رہا تھا۔ اسے یہ نتیجہ اخذ کرنے میں قطعی دیر نہیں لگی کہ جو کچھ ہوا، وہ ایک طے شدہ منصوبے کے تحت ہوا ہے اور اس سازش میں اس کے ڈرائیور کے بھی شامل ہونے کا قوی امکان تھا۔ اس لیے ضروری تھا کہ وہ ڈرائیور کی نظروں میں نہ آئے اور وہ یہی سمجھتا رہے کہ دھماکے سے اڑنے والی گاڑی کے ساتھ ساتھ اسے ہی شہریار عادل کے بھی پرخچے اڑ گئے ہیں اور اب آگ میں اس کی باقیات جل رہی ہیں۔

وہ بیٹھے بیٹھے ہی کھیت میں پیچھے کی طرف سرکنے لگا۔ اتفاقاً اس کا رخ اسی طرف تھا جہاں وہ پریمی جوڑا موجود تھا۔ دھماکے نے ان دونوں کو خاصا خوف زدہ کر دیا تھا۔ اب جو انہوں نے کھیتوں میں سے ایک سوٹڈ بوٹڈ آدمی کو برآمد ہوتے دیکھا تو اور بھی متوحش ہو گئے۔

''ششش... شور مت کرنا۔ مجھے تم لوگوں کی مدد کی ضرورت ہے۔'' اس نے نوجوان عورت کو ایک بار پھر چیخنے کے ارادے سے منہ کھولتا دیکھ کر ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے خاموش رہنے کا اشارہ کیا تو اس نے اپنا کھلا ہوا منہ سختی سے بند کر لیا اور پھر یوں مرد کی طرف دیکھنے لگی جیسے کہہ رہی ہو کہ اس صورتِ حال سے تم ہی نمٹ سکتے ہو۔ میرے دماغ نے تو کام کرنا چھوڑ دیا ہے۔

''آپ کون ہو باؤ جی؟ ادھر کھیتوں میں کیا کر رہے ہو؟'' مرد ہمت کر کے دو قدم آگے بڑھا اور اس سے دریافت کرنے لگا۔

''یہ جو گاڑی تباہ ہوئی ہے، میری ہی ہے اور میرے دشمنوں نے تباہ کی ہے۔ اگر تم میری مدد کرو تو میں اپنے دشمنوں سے بچ کر یہاں سے نکل سکتا ہوں۔'' اس نے مختصر الفاظ میں کمال نامی اس مرد کو بتایا تو وہ تفہیمی انداز میں سر کو جنبش دینے لگا۔ اس کی طرف سے مطمئن ہو کر شہریار نے گردن موڑ کر سڑک کی طرف دیکھا۔ اس کی گاڑی اب تک آگ کا گولہ بنی ہوئی تھی۔ البتہ اب وہ اس آگ کے گولے کے پس منظر میں اپنے ڈرائیور اور کچھ کھیت مزدوروں کو دیکھ سکتا تھا۔ ان سب کے چہروں پر تشویش تھی لیکن وہ جلتی ہوئی گاڑی کے زیادہ نزدیک آنے کی ہمت نہیں کر پا رہے تھے۔ شاید انہیں ڈر تھا کہ گاڑی کے جلتے ہوئے ڈھانچے میں سے کوئی جلتا ہوا ٹکڑا ان کے اوپر نہ آ گرے۔ گاڑی جس طرح

جل رہی تھی، یہ امکان کم ہی تھا کہ آگ جلد بجھ سکے گی۔ جب تک آگ جلتی رہتی اور کوئی قریب سے آکر جلی ہوئی گاڑی کا جائزہ لینے کے قابل نہ ہوتا، یہ بات صیغۂ راز میں رہ سکتی تھی کہ وہ حادثے کے وقت گاڑی میں موجود نہیں تھا اور اسے اسی غیر یقینی مہلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یہاں سے نکلنا تھا۔ اس کا جائے حادثہ سے جلد از جلد دور نکل جانا سب سے زیادہ ضروری تھا چنانچہ اس نے مرد کو تولتی ہوئی نظروں سے دیکھا اور پھر اس سے مخاطب ہوا۔

”کیا تم مجھے کسی کی نظروں میں آئے بغیر اپنے گاؤں سے باہر نکال سکتے ہو؟“

”نکال تو سکتا ہوں باؤ جی... پر راستہ بہت لمبا ہے۔ پیدل آپ کو دیر بھی لگے گی اور تھکن بھی بہت ہو جائے گی، پر مجبوری یہ ہے کہ میرے پاس کوئی سواری نہیں ہے۔“ مرد نے جواب دیا تو اس کے ماتھے پر تفکر کی لکیریں ابھر آئیں۔ پیدل چلنا یا تھکن ہو جانا اس کے لیے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ پورے عیش و عشرت کے ساتھ زندگی گزارنے کے باوجود وہ شروع ہی سے ایسی عادات کو اپنائے ہوئے تھا کہ اس کا اسٹیمنا خاصا مضبوط ہو گیا تھا۔ طالب علمی کے دور میں اس نے کرکٹ، فٹ بال، ٹینس اور گھڑ سواری سمیت ایسے ہر کھیل میں حصہ لیا تھا جس میں جسمانی مشقت کے بغیر کامیابی ممکن ہی نہیں تھی۔ وہ لڑائی بھڑائی کے فن سے بھی واقف تھا اور آج بھی پابندی سے ورزش اور جاگنگ کو اپنا معمول بنائے ہوئے تھا۔ لیکن اس وقت اس کے لیے سب سے زیادہ اہمیت وقت کی تھی۔ اسے یہاں سے نکلنے میں جتنا کم وقت لگتا، اس کے حق میں اتنا ہی بہتر ہوتا۔

”سواری تو مل سکتی ہے کمال... تو میرے ابا سے جا کر ان کا تانگا مانگ لے۔“ اب تک خاموش کردار بنی عورت نے ان کی گفتگو میں دخل دیتے ہوئے تجویز پیش کی۔ لگتا تھا، وہ دھماکے کے اثر سے نکل آئی ہے اور اب گفتگو میں حصہ لینے کے قابل ہے۔

”تیرا ابا اتنی آسانی سے تانگا دینے والا نہیں ہے۔ پہلے دس سوال کرے گا فیر ہی گل مانے گا۔“ کمال نامی مرد نے منہ بناتے ہوئے جواب دیا۔

”تو اس سے کہنا کہ شاہدہ کی طبیعت خراب ہے، اسے اسپتال لے کر جانا ہے۔ وہ میری طبیعت کا سنے گا تو فوراً راضی ہو جائے گا۔“ اس کے لہجے میں وہی مان تھا جو ایک بیٹی کو اپنے میکے پر ہوتا ہے۔

”چل ٹھیک ہے۔ میں کوشش کر کے دیکھ لیتا ہوں۔ تو باؤ جی کو لے کر ادھر پرلی طرف آ جانا۔ میں تانگا لے کر ادھر ہی آؤں گا۔“ کمال نہ صرف راضی ہو گیا بلکہ فوراً ہی وہاں سے روانہ بھی ہو گیا۔

”آ جاؤ باؤ صاحب! کمال ابھی تانگا لے کر آ جائے گا۔ میرا ابا مجھے بہت چاہتا ہے۔ میری طبیعت کی خرابی کا سن کر وہ تانگا ضرور دے گا۔“ یقین سے بولتے ہوئے اس نے شہریار کا ہاتھ پکڑ کر اسے کھینچا تو وہ خود کار انداز میں اس الھڑ مٹیار کے ساتھ چل پڑا جو شاید خود بھی اپنے وجود کی حشر سامانیوں سے پوری طرح واقف نہیں تھی۔ مناسب مقامات سے بھرے ہوئے جسم کے ساتھ لچکیلی پتلی کمر اور اس کمر کے دائیں بائیں گھٹری کے پینڈولم کی طرح جھولتی اس کی سیاہ موٹی سی چٹیا میں ایسا جادو تھا کہ دیکھنے والا مبہوت رہ جائے۔ لیکن وہ مکمل طور پر بے نیاز تھی اور ہرے بھرے کھیتوں میں اپنے زرد لباس کے ساتھ سرسوں کے پھول کی شبیہ بنی متحرک تھی۔ وہ شاید عورتوں کی اس قسم میں سے تھی جنھیں اپنے خاوند کے علاوہ نہ تو کسی دوسرے مرد کی ستائش کی چاہت ہوتی ہے، نہ وہ کسی کی للچائی نظروں سے خوف کھاتی ہیں۔ جن کے لیے اپنے کردار کی مضبوطی ہی سب سے بڑی حفاظتی ڈھال ہوتی ہے اور انھیں یقین ہوتا ہے کہ کتنا ہی بڑا سورما مقابل آ جائے، انھیں زیر نہیں کر سکے گا۔ ایسی عورتوں میں اپنی جان دے کر بھی اپنی عزت کی حفاظت کرنے کا حوصلہ ہوتا ہے۔

وہ تیزی سے سوچتا ہوا شاہدہ کے رحم و کرم پر آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ کھیت کے جس حصے سے وہ اسے گزار کر لے جا رہی تھی، وہاں کھڑی فصل کی قامت اتنی بلند تھی کہ سیدھے کھڑے ہو کر چلنے کے باوجود دور سے انھیں دیکھ لیے جانے کا امکان نہیں تھا۔

”آپ ادھر ہی رکو باؤ جی، میں ابھی آئی۔“ چلتے چلتے شاہدہ نے اس کا ہاتھ چھوڑا اور تیز تیز قدم اٹھاتی اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے وہیں کھڑا رہ گیا۔ اب جو بھی تھا اسے ان دونوں میاں بیوی پر ہی تکیہ کرنا تھا۔

انتظار کے چند لمحے ہی گزرے تھے کہ سرسراہٹ کی آواز کے ساتھ شاہدہ دوبارہ نمودار ہوئی۔ اس نے اپنے ہاتھوں میں کچھ تھام رکھا تھا۔

”میں آپ کے لیے یہ کپڑے لائی ہوں۔ کمالے کی دھوتی اور کرتہ ہے۔ میں نے ادھر نہر پر دھو کر کھیتوں میں سوکھنے کے لیے ڈالا تھا۔ آپ یہ بدل لو۔ کوٹ پینٹ پہن کر نکلو گے تو فوراً ہی سب کی نظروں میں آ جاؤ گے۔“ اس نے ہاتھوں میں تھامے ہوئے کپڑے اس کی طرف بڑھائے اور خود پیٹھ پھیر کر کھڑی ہو گئی۔ شہریار نے دیکھا۔ وہ سبز رنگ کا کڑھائی والا کرتہ اور خوب اجلی سفید دھوتی تھی۔ کپڑوں کی حالت سے ظاہر تھا کہ وہ کئی بار کے پہنے اور دھلے ہوئے ہیں لیکن ان کا اجلاپن شاہدہ کے نازک ہاتھوں کی محنت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ شاہدہ کی دلیل کی معقولیت کو تسلیم کرتے ہوئے اس نے وہ لباس پہننے کا فیصلہ کر لیا۔ کوٹ، ٹائی اور شرٹ اتار کر کرتہ پہننے کا مرحلہ تو آسانی سے طے ہو گیا لیکن دھوتی کو پینٹ کی جگہ دینا دشوار تھا۔ دھوتی پہننے کا تجربہ اسے تو کیا شاید اس کے آباؤ اجداد میں سے بھی کسی کو نہ تھا۔ وہ جتنا اس نامعقول لباس کو قابو میں کرنے کی کوشش کر رہا تھا، وہ اس کے ہاتھ سے نکلی جا رہی تھی۔

”جلدی کریں باؤ صاحب! کمال تانگا لے کر پہنچتا ہی ہوگا۔“ تاخیر ہوئی تو پیٹھ موڑ کر کھڑی شاہدہ نے اسے پکارا۔

”کیا کروں، یہ دھوتی کسی طرح بندھ کر ہی نہیں دے رہی۔“ اس نے جھنجلا کر جواب دیا تو شاہدہ کی کھنکھناتی ہوئی ہنسی نے فضا میں جلترنگ سا بکھیر دیا پھر وہ آہستہ سے اس کی طرف پلٹی۔

”لائیں میں آپ کی مدد کروں۔“ اس نے خود ہی آگے بڑھ کر قرینے سے اس کی دھوتی باندھنی شروع کر دی۔ وہ جھینپا ہوا سا اس کی کارگزاری دیکھتا رہا۔ شاہدہ تروتازہ کھلے ہوئے گلاب کی طرح چڑھے بھرپور شباب کی مالک تھی اور اس کی قربت کسی بھی مرد کو مسحور کر سکتی تھی۔ لیکن اپنی ازلی شرافت کے باعث شہریار نے اسے کسی بری نیت سے نہیں دیکھا۔ وہ خود ہی اپنا کام مکمل کر کے ذرا پیچھے ہٹی اور تحسین بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”واہ باؤ جی! اپنے کمالے کے بعد آپ دوسرے مرد ہو جس پر میں نے یہ لباس اتنا سجتا ہوا دیکھا ہے۔“

شہریار اس کے ریمارکس پر مسکرا دیا۔ دیکھا جائے تو کمال اور اس کا کوئی مقابلہ ہی نہیں تھا۔ کمال اس کی نسبت کافی دبتی ہوئی شخصیت کا مالک تھا لیکن وفا شعار شاہدہ نے اپنے شوہر کو ہی پہلا نمبر دیا تھا... یا شاید یہ اس محبت کا کمال تھا جسے نظروں میں بھر کر وہ کمال کو دیکھتی ہوگی اور وہ اسے دنیا کا سب سے خوب رو مرد دکھائی دیتا ہوگا۔

”بڑی محبت کرتی ہو تم کمال سے؟“ اس نے انتظار کے لمحات بتانے کے لیے شاہدہ سے پوچھا۔

”بالکل جی! پیدا ہوتے ہی چاچا نے مجھے کمال کے لیے مانگ لیا تھا۔ آپ یوں سمجھو کہ کمال کا نام سن کر ہی بڑی ہوئی ہوں۔ ابھی چار ماہ پہلے ہی ہمارا ویاہ ہوا ہے۔ کمال بھی مجھ سے وڈی محبت کرتا ہے، پر چاچی کو اچھا نہیں لگتا۔ وہ سمجھتی ہے میں نے اس سے اس کا پتر چھین لیا ہے۔ گھر میں ہمیں وہ گھڑی ایک دوسرے کے ساتھ نہیں بیٹھنے دیتی۔ میں کمال کو روٹی دینے ادھر آتی ہوں تو ہم تھوڑی دیر دل کی بات کر لیتے ہیں۔ چاچی کے گوڈوں گٹوں میں اتنی دور چل کر آنے کے لیے دم ہوتا تو وہ مجھے روٹی بھی نہیں لانے دیتی۔ بس گھر بیٹھ کر ایک ایک منٹ گنتی رہتی ہے۔ ہور جو مجھے کچھ دیر زیادہ لگ جائے تو خوب منہ بھر کے گالیاں دیتی ہے، پر میں برا نہیں مانتی جی۔ میرے لیے میرے کمال کی محبت کافی ہے۔ باقی چاہے بھلے کوئی کچھ کہتا رہے، مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ اس کے پوچھنے کی دیر تھی، وہ فوراً شروع ہو گئی اور اس کے سامنے اپنی زندگی کا خاکہ کھینچ کر رکھ دیا۔ باوجود پریشانی میں مبتلا ہونے کے، وہ اس کی بے ساختگی پر مسکرا دیا۔ وہ بڑی زندہ دل لڑکی تھی جس کی آواز میں زندگی کی چہکار اور سرمستی بھری ہوئی تھی۔

”آج تو تمہاری چاچی بہت ناراض ہوگی۔ میری وجہ سے تمہیں یہاں بڑی دیر لگ گئی ہے۔“ اس نے مسکراتے لبوں کے ساتھ اسے چھیڑا۔

”کوئی گل نہیں جی! کسی کے کام آنا بھی نیکی ہے۔“ اس نے بے نیازی سے جواب دیا۔ اسی وقت انھیں گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سنائی دی۔

”لو جی کمال آ گیا۔ میں نے کہا تھا نا کہ میرا ابا مجھ سے وڈی محبت کرتا ہے۔ میری بیماری کا سن کر وہ فوراً اپنا تانگا دے دے گا۔“ شاہدہ کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی جس سے اس کی گندمی رنگت کچھ اور بھی دمکتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ ان دونوں نے آواز کی سمت جھانک کر دیکھا۔ وہ واقعی کمال تھا جو تانگے میں سوار اس طرف آ رہا تھا۔

”چلیں باؤ جی، ادھر سے نکلتے ہیں۔“ شاہدہ جوش سے کھڑی ہو گئی۔ اس نے اپنے ہاتھوں میں وہ گٹھڑی بھی تھام رکھی تھی جس میں اس نے باتوں کے دوران اس کا پینٹ کوٹ اور شرٹ وغیرہ تہ کر کے باندھ دیا تھا۔ گٹھڑی باندھنے کے لیے اس نے کندھے پر ڈالے جانے والے بڑے سے مردانہ رومال کو استعمال کیا تھا۔ وہ دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے اس مقام پر پہنچ گئے جہاں کمال نے تانگے کو روکا تھا۔ تانگے کے پچھلے حصے میں چادر لگا کر پردہ سا باندھ دیا گیا تھا جسے دیکھ کر وہ خوش ہو گیا۔ اب اس کے لیے کسی کی نظروں میں آئے بغیر یہاں سے نکل جانا مزید آسان ہو گیا تھا۔ وہ اور شاہدہ دونوں تانگے کے پچھلے حصے میں سوار ہو گئے اور

کمال نے تانگا آگے بڑھا دیا۔

"چاچا روٹی کھانے گھر آیا ہوا تھا۔ میں نے تانگا مانگا تو تیری طبیعت کی خرابی کا سن کر خود بھی ساتھ آنے کے لیے اٹھنے لگا۔ میں نے دلاسا دیا کہ زیادہ پریشانی کی گل نہیں ہے۔ تو آرام سے بیٹھ کر روٹی کھا، میں اور شاہدہ چار چھ گھنٹے میں واپس آجائیں گے۔" وہ تانگا بھگاتے ہوئے بلند آواز میں اپنی بیوی کو حالات سے باخبر کرنے لگا۔

"میرے خیال میں یہاں سے پکی سڑک پر پہنچنے کے لیے اتنا زیادہ وقت تو نہیں لگے گا۔ تانگے میں دو ڈھائی گھنٹے سے زیادہ نہیں لگنے چاہئیں۔" اس کی بات سن کر شہریار نے گفتگو میں مداخلت کی۔

"وہ تو آپ اپنے حساب سے سوچ رہے ہو باؤجی! مجھے اسپتال میں لگنے والے وقت کا بھی تو حساب رکھنا تھا اس لیے اتنی دیر کا بولا ہے۔ آپ کو لاری اڈے پر چھوڑ کر ہم دونوں کہیں چھپ کر بیٹھ جائیں گے اور تھوڑی گپ شپ کر لیں گے۔" شہریار نے دیکھا کہ اس کی بات پر اس کے ساتھ بیٹھی شاہدہ کے رخساروں پر سرخی دوڑ گئی ہے۔ یقینی طور پر کمال نے اس سے اسی زبان میں گفتگو کرنی تھی جس سے کچھ دیر قبل وہ اسے کھیتوں میں مستفید کر رہا تھا۔ اس نے دونوں میاں بیوی کے نجی معاملے پر بات کرنا مناسب نہ سمجھا اور گفتگو کا موضوع بدلتے ہوئے پوچھنے لگا۔

"دھماکے کی آواز تمہارے گاؤں میں نہیں سنی گئی کیا؟"

"نہیں جی، گاؤں کی آبادی ذرا دور ہے اس لیے وہاں اتنی زور کی آواز نہیں گئی۔ البتہ کھیتوں میں کام کرنے والے لوگوں نے ضرور آواز سنی ہوگی۔ میں نے کئی لوگوں کو بھاگ کر ادھر سڑک کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تھا اسی لیے میں آپ کو پرلی طرف سے گھما کر لے جا رہا ہوں۔ ادھر سے راستہ تھوڑا لمبا تو ضرور ہو جائے گا لیکن آپ حفاظت سے نکل جاؤ گے۔" کمال نے اسے بتایا۔

"تمہارا بہت بہت شکریہ کمال! مجھے تم دونوں میاں بیوی کا یہ احسان ہمیشہ یاد رہے گا۔ ہو سکا تو میں کبھی تم سے ملنے یہاں ضرور آؤں گا، ورنہ یہ تو مجھے ہمیشہ یاد ہی رہے گا کہ اس چھوٹے سے گاؤں میں ایک حسن کا پیارا سا جوڑا تھا جس نے صرف مجھ پر ہی نہیں بلکہ اپنے وطن پر بھی ایک احسان کیا ہے۔" وہ دل کی گہرائیوں سے بولا۔

"احسان وحسان کی کوئی گل نہیں جی۔ بندہ بندے کے کام آتا ہے تو دنیا کا کاروبار چلتا ہے۔ ہمیں خوشی ہے کہ ہم آپ کے کام آئے۔ باقی آپ کی مرضی ہے کہ آپ ہم سے ملنے آؤ یا نہ آؤ۔ اگر آئے تو ہمیں آپ کی خدمت کر کے خوشی ہوگی ورنہ تو کوئی شکایت بھی نہیں ہوگی۔" اس نے نہایت سادگی سے جواب دیا تو شہریار دل میں اسے سراہے بغیر نہ رہ سکا۔ آج کے دور میں اس طرح کے بے غرض لوگ تقریباً ختم ہی ہوتے جا رہے تھے لیکن بہرحال اس دنیا میں موجود تھے۔ جب ہی اب تک دنیا سلامت تھی ورنہ شاید قیامت ہی برپا ہو چکی ہوتی۔

"میں ایک بار پھر تمہارا شکرگزار ہوں۔ مجھے امید ہے کہ جس طرح تم مجھے رازداری سے یہاں سے نکال رہے ہو، اسی طرح آگے بھی یہ راز اپنے سینوں میں ہی رکھو گے کہ تم نے مجھے یہاں سے نکالنے میں مدد دی تھی۔ اس میں تمہاری اور میری دونوں کی بھلائی ہے، ورنہ ہو سکتا ہے کہ میرے دشمن اپنی ناکامی پر جھلا کر تم دونوں کو سزا دینے کے لیے کچھ الٹا سیدھا کر گزریں۔" اسے افسوس تھا کہ وہ اس سادہ لوح جوڑے کو ڈرا رہا ہے لیکن اپنے یہاں سے نکلنے کی بات کو راز میں رکھنے کے لیے ایسا کرنا ضروری تھا۔

"ٹھیک ہے باؤجی! آپ کو لاری اڈے چھوڑنے کے بعد ہم ایسے آپ کو بھول جائیں گے جیسے کبھی آپ سے ملے ہی نہیں تھے۔" کمال نے اس سے فوراً ہی وعدہ کر لیا۔ جب سے اس کے اور شہریار کے درمیان مذاکرات شروع ہوئے تھے، شاہدہ نے گفتگو میں قطعی دخل نہیں دیا تھا اور خاموشی سے بیٹھی اپنی لمبی چوٹی کو ہاتھوں سے بل دیتی رہی تھی۔ باقی کا راستہ بھی چھوٹی موٹی باتوں میں گزرتا چلا گیا۔ ان باتوں سے شہریار کے علم میں ان کے سارے حالات آگئے۔ وہ غریب لوگ تھے۔ شاہدہ کا باپ تانگا چلاتا تھا جبکہ کمال، اس کا باپ اور بھائی کھیتوں میں کام کرتے تھے۔ کھیت ان کی ملکیت نہیں تھے اس لیے محنت کے مقابلے میں انہیں بہت کم آمدنی ہوتی تھی۔ کم آمدنی کے باوجود وہ قناعت وصبر کی وجہ سے شکرگزاری سے زندگی گزار رہا تھا۔ انہیں کاتب تقدیر سے کوئی شکوہ نہیں تھا۔ وہ اپنی چھوٹی چھوٹی خوشیوں میں مست تھے۔ خصوصاً کمال، شاہدہ سے شادی کے بعد بہت خوش تھا۔ یہی حال شاہدہ کا تھا۔ اپنی گھریلو ذمے داریوں کو نبھانے کے ساتھ ساتھ وہ سلائی کڑھائی وغیرہ کرتی تھی تاکہ شوہر کی ذمے داریوں میں ہاتھ بٹا سکے۔

اسے یہ دونوں میاں بیوی بہت اچھے لگے۔ تھکا دینے والے سفر کو ختم کر کے وہ لوگ لاری اڈے

قریب پہنچے تو اس کے دل پر ان دونوں کا بہت خوب صورت سا نقش ثبت ہو چکا تھا۔ "میرے لیے یہاں سے لاہور تک کا ٹکٹ لادو۔" اس نے تانگے میں بیٹھے بیٹھے ہی کرتے کی جیب میں ہاتھ ڈال کر اپنا پرس باہر نکالا اور اس میں سے ایک نوٹ نکال کر کمال کے حوالے کیا۔ موجودہ حالات میں اسے براہ راست نورکوٹ واپس جانا مناسب نہیں لگ رہا تھا۔ لاہور جانے کے متعلق بھی اس نے کوئی حتمی فیصلہ نہیں کیا تھا بلکہ سوچنے کے لیے زیادہ سے زیادہ وقت حاصل کرنے کے لیے وہاں کا ٹکٹ منگوایا تھا۔ اس موقع پر وہ ذیشان سے مشاورت کرنا چاہتا تھا کیونکہ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ ذیشان نے پہلے ہی اس خدشے کا اظہار کیا تھا کہ کرنل توحید کے بعد دشمنوں کا دوسرا نشانہ خود اس کی اپنی ذات ہو سکتی ہے۔ ماریا کی موت کے بعد وہ دونوں ہی ممکنہ ہدف تھے جو دشمن کے سامنے تھے اور جنہیں انتقامی کارروائی کا نشانہ بنایا جا سکتا تھا۔ کرنل توحید ذیشان کی بہتر حکمت عملی اور سیکیورٹی کی وجہ سے خود پر ہونے والے حملے سے محفوظ رہے تھے جبکہ وہ ماضی کی طرح اب بھی صرف اور صرف اپنی خوش قسمتی کے بل بوتے پر زندہ تھا اور ایک بار پھر یہ سوچنے پر مجبور تھا کہ قدرت کو اس سے کچھ اہم کام لینے منظور ہیں، جب ہی اس کی زندگی کی حفاظت کا انتظام خودبخود ہی ہوتا چلا جاتا ہے۔

تانگے کے سفر کے دوران میں وہ مسلسل اپنے موبائل پر سگنلز بھی چیک کرتا رہا تھا لیکن کہیں بھی اسے سگنلز نہیں ملے تھے۔ لاری اڈے پر پہنچ کر اس نے ایک بار پھر اپنا موبائل چیک کیا تو یہ دیکھ کر خوش ہو گیا کہ کمزور ہی سہی لیکن سگنلز ملنے شروع ہو گئے ہیں۔ اس نے فوراً ہی ذیشان کا نمبر ڈائل کیا۔ بیل جانے کی مخصوص آواز سنائی دی پھر کال ریسیو کر لی گئی۔ دوسری طرف سے ذیشان کی بہت دھیمی آواز سنائی دے رہی تھی۔

"تمہارا اندیشہ درست ثابت ہوا ہے۔ مجھ پر بھرپور قاتلانہ حملہ ہوا ہے اور میری گاڑی راکھ کا ڈھیر بن چکی ہے۔" ذیشان کی آواز سنتے ہی اس نے بولنا شروع کر دیا لیکن جب ریسیور میں مسلسل ذیشان کی "ہیلو ہیلو" ہی سنائی دیتی رہی تو سمجھ گیا کہ کمزور سگنلز کی وجہ سے اس کی آواز اس تک نہیں پہنچ پا رہی۔ مایوس ہو کر اس نے سلسلہ منقطع کر دیا اور ذیشان کو کچھ دیر بعد دوبارہ کال کرنے کا ٹیکسٹ میسج کر دیا۔ اس دوران میں کمال اس کے لیے ٹکٹ لے آیا تھا اور ساتھ ہی یہ اطلاع بھی کہ دس منٹ بعد لاری وہاں سے روانہ ہو جائے گی۔ اس نے ٹکٹ شہریار کے حوالے کرنے کے ساتھ ساتھ باقی ماندہ رقم بھی اس کی طرف بڑھا دی تھی۔

"رہنے دو یار! یہ تم رکھ لو بلکہ یہ کچھ رقم اور بھی ہے میرے پاس۔ یہ بھی تم لے لو۔" اس نے انکار کرتے ہوئے اپنا پرس نکالنا چاہا۔

"معاف کرنا باؤجی! ہم کوئی اسٹیشن پر مزدوری کرنے والے قلی نہیں ہیں جو صاحب لوگوں سے بخشش لے کر خوش ہوں۔ آپ کو ہم نے اپنا پروہنا سمجھا تھا اور پروہنے کی ہم خدمت کرتے ہیں، ان سے کچھ لیتے نہیں۔" کمال اس کی بات کا اچھا خاصا برا مان گیا تو اس کا جیب کی طرف بڑھتا ہاتھ رک گیا اور اس نے خاموشی سے ہاتھ بڑھا کر اس غریب لیکن خوددار دیہاتی سے باقی رقم واپس لے لی۔ اگر غربت کے باوجود اس کی خودداری سلامت تھی تو اسے کوئی حق نہیں پہنچتا تھا کہ اسے اس نعمت سے محروم کرے۔

"آپ ٹھہرو، میں ذرا گنے کے رس والے سے تین گلاس پکڑ لاؤں۔ حلق خشک ہو گیا ہے، رس پی کر ذرا سکون ملے گا۔" کمال نے بھی اس کے رقم واپس لینے کو کافی جانا اور فوراً ہی بولتا ہوا واپس پلٹ گیا۔ شہریار ابھی تک تانگے کی پچھلی نشست پر ہی بیٹھا ہوا تھا اور اس کے ساتھ ہی شاہدہ بھی موجود تھی۔

"اچھا کیا کہ آپ نے روپے واپس لے لیے۔ ویسے تو کمال وڈا چنگا بندہ ہے لیکن کسی گل وچ مزاج بگڑ جائے تو فیر کسی کے قابو میں نہیں آتا۔" کمال کے جاتے ہی شاہدہ نے اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔

"اگر تم مناسب سمجھو تو میں روپے تمہیں دے دیتا ہوں۔ بہت زیادہ نہیں ہیں پھر بھی تم لوگوں کے کام آسکتے ہیں۔" اس نے شاہدہ کو پیشکش کی۔

"توبہ کریں جی۔ میں کوئی ایسی زنانی تھوڑی ہوں جو اپنے شوہر کے پیٹھ پیچھے غیر مردوں سے روپے لیتی پھروں۔" اس نے باقاعدہ اپنے کان پیٹ ڈالے اور تھوڑی ناراض نظر آنے لگی۔ اس دوران کمال گنے کے رس سے لبالب بھرے سنگ سائز کے گلاس لے کر واپس آچکا تھا اس لیے اسے مزید کچھ کہنے کا موقع نہیں ملا اور اس نے کمال کا بڑھایا ہوا گلاس تھام لیا۔ کھانے پینے کے معاملے میں بے حد کانشس ہونے کے باوجود وہ اس کے خلوص کی وجہ سے کسی صورت انکار نہیں کر سکا تھا ورنہ یوں راہ چلتے ایسی کسی جگہ سے کچھ لے کر کھانا یا پینا اس کی فطرت و تربیت دونوں ہی کے سخت خلاف تھا۔ اب یہ اتفاق تھا کہ گنے کا رس سچ مچ بہت مزے دار تھا یا اسے پیاس ہی شدید لگ رہی تھی کہ وہ تین چار منٹ میں پورا گلاس خالی کر گیا۔ کمال نے اس سے بھی زیادہ پھرتی

کا مظاہرہ کیا تھا البتہ ناراض سی شاہدہ کچھ پیچھے رہ گئی تھی۔ اس نے بھی اپنا گلاس خالی کر لیا تو کمال پھرتی سے گلاس سمیٹ کر واپس کر آیا۔ اب گاڑی روانہ ہونے کا بھی وقت ہو گیا تھا اس لیے کمال نے اسے تانگے سے اترنے کو کہا اور شاہدہ کو وہیں بیٹھے رہنے کا اشارہ کیا۔

''اپنی بیوی کی ہمیشہ بہت قدر کرنا کمال۔ اس جیسی نفیس اور نیک عورت تمہیں دوسری نہیں مل سکتی۔ مجھے جب بھی موقع ملا، میں اپنی اس چھوٹی بہن کا حال معلوم کرنے ضرور تمہارے پنڈ کا چکر لگاؤں گا۔'' تانگے سے اترنے سے قبل اس نے کمال سے کہا اور شاہدہ کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے اپنی جگہ چھوڑ دی۔ اس کے الفاظ و انداز نے شاہدہ کی ناراضی دور کر دی اور اس کے ہونٹ مسکرانے لگے۔

''اللہ کی امان میں جاؤ بھرا۔ تمہاری بہن تمہارے لیے دعا کرتی رہے گی۔'' اس نے اسے دعاؤں سے نوازتے ہوئے رخصت کیا۔ گاڑی وہاں سے روانہ ہوئی تو بھی اس کا ذہن اپنی زندگی میں آنے والے ان دو کرداروں میں الجھا ہوا تھا جنہیں مشکل گھڑیوں میں اس کا مددگار بنا کر بھیجا گیا تھا۔ بہت معمولی حیثیت رکھنے والے ان دو کرداروں نے اسے باور کروایا تھا کہ را اور موساد جیسے طاقتور ادارے کتنی ہی کوشش کر لیں، اللہ کو جب تک اس کی زندگی منظور ہے وہ اسی طرح اس کی مدد کرتا رہے گا۔ وہ بھی ان لوگوں کے ذریعے جن کی اتنی بڑی قوتوں کے مقابلے میں کوئی حیثیت ہی نہیں تھی کیونکہ کوئی انسان بظاہر کتنا بھی قوی نظر آئے، اس ہستی کے سامنے ہرگز نہیں ٹھہر سکتا جو طاقت و قوت کا اصل سرچشمہ ہے اور جس کے قبضۂ قدرت میں عزت، ذلت، موت، زندگی سمیت ہر ہر شے موجود ہے۔

☆☆☆

قیمتی فرنیچر اور نازک آرائشی اشیا کی نہایت توجہ سے جھاڑ پونچھ کرتی شہزادی کو اندازہ بھی نہیں ہوا کہ کب کمرے کا دروازہ کھلا اور کسی نے بے آواز قدموں سے اندر داخل ہو کر چٹخنی چڑھا دی۔ وہ کرسٹل کے ایک نازک سے گل دان کو اچھی طرح چمکانے کے بعد تپائی پر رکھنے کے لیے پلٹی تو اس درشت چہرے والے مرد کو دیکھ کر بری طرح چونک گئی اور گل دان اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گیا۔ سامنے موجود شخص اس کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ وہ کئی بار اسے بالے کے ساتھ دیکھ چکی تھی جس کا صاف مطلب تھا کہ وہ چودھری کا ہی نمک خوار ہے اور چودھری کے کسی نمک خوار کی فاریسٹ آفیسر کے بنگلے میں موجودگی خاصی معنی خیز تھی۔ شہریار نے اس کے ذمے کام بھی لگایا تھا کہ وہ کسی طرح چودھری اور فاریسٹ آفیسر کے گٹھ جوڑ کی وجہ کا کھوج لگا کر بتائے۔ خوش قسمتی سے اس کی درخواست پر منشی اللہ رکھا نے اسے نوکری دلائی بھی تو فاریسٹ آفیسر کے بنگلے پر... ورنہ وہ تو زیادہ سے زیادہ یہی سوچ رہی تھی کہ اسے حویلی میں کوئی کام مل جائے گا اور اسے وہاں رہ کر شہریار کی سونپی گئی ذمے داری اٹھانی پڑے گی۔ لیکن بنگلے پر کام ملنے سے جہاں اس کی راہیں آسان ہوگئی تھیں، وہیں یہ بھی ثابت ہو گیا تھا کہ بظاہر چودھری سے الگ نظر آنے والے عابد انصاری کے حویلی والوں سے خصوصی مراسم ہیں ورنہ منشی اللہ رکھا اتنی آسانی سے اسے یہاں کیونکر ملازمت دلا پاتا۔ چودھری کے ایک نمک خوار کی یہاں موجودگی نے اس تعلقِ خصوصی کو مزید ثابت کر دیا تھا لیکن فی الحال وہ ان معاملات پر نہیں سوچ رہی تھی۔ اس وقت تو ایک عورت کی حیثیت سے بند کمرے میں کسی آدمی کے ساتھ موجودگی نے اسے سراسیمہ کر دیا تھا اور وہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ وہ اس سے کیا چاہتا ہے۔

''جی لگ گیا تیرا یہاں؟ کام زیادہ مشکل تو نہیں ہے؟'' اس کی کیفیت کو سمجھتے ہوئے وہ لطف اندوز ہونے والے انداز میں مسکرایا تو اس کا کریہہ چہرہ کچھ اور بھی مکروہ لگنے لگا۔

''جی سب ٹھیک ہے، کام بھی ٹھیک ہے۔'' اس نے عجیب سی گھٹن محسوس ہونے کے باوجود شہزادی نے سنبھلے ہوئے لہجے میں جواب دیا کہ اس قسم کے سوال جواب کوئی بااختیار بندہ ہی کر سکتا تھا۔

''میرا نام بہرام ہے۔ میں یہاں کا سرپرواتر ہوں۔ تُو نے دیکھ ہی لیا ہوگا کہ ادھر کام کرنے والوں کی کوئی کمی نہیں ہے لیکن میں نے منشی جی کے کہنے پر صاحب سے تیری خاص سفارش کر کے تجھے ادھر رکھوایا ہے... اور میں جب چاہوں تجھے یہاں سے نکلوا بھی سکتا ہوں اس لیے ذرا ہوشیار رہنا کہ مجھے تجھ پر غصہ نہ آئے۔'' وہ گویا اسے دھمکا رہا تھا۔

''چنگا جی۔'' اس نے مختصر جواب دے کر اپنی جان چھڑانا مناسب سمجھا پھر اجازت طلب کرنے والے انداز میں بولی۔ ''میں ادھر باورچی خانے میں جا کر خانساماں سے پوچھتی ہوں کہ اسے کوئی کام تو نہیں کروانا۔''

''ادھر کا کام بعد میں دیکھ لینا، پہلے یہ پھیلاوا تو سمیٹ۔ علوم ہے تُو نے کتنا قیمتی گل دان توڑ ڈالا ہے؟ سال بھر بھی تیری تنخواہ سے کٹوتی کرواؤں تو قیمت ادا نہیں ہوگی۔ پر جانے دے، تیری خاطر میں صاحب سے شکایت نہیں

کروں گا۔'' وہ اطمینان سے ایک صوفے پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔

''شکریہ جی۔'' شہزادی نے اس کا احسان تسلیم کرتے ہوئے نیچے بیٹھ کر ٹوٹ جانے والے گل دان کی کرچیاں سمیٹنی شروع کر دیں۔

''تیرا حال دیکھ کر دل ہی کڑھتا ہے۔ بالے سے تیرا ویاہ ہوا تھا جب تُو کتنی سوہنی کڑی تھی لیکن بدبخت نے تیرا سارا حسن ہی برباد کر ڈالا۔ میں نے پہلی واری تجھے دیکھا تھا تو دیکھتا ہی رہ گیا تھا۔ ہور سچ بولوں تو اگر بالے کی جگہ تُو مجھے ملی ہوتی تو میں تجھے سچ مچ کی شہزادی بنا کر رکھتا۔ خیر، اب تو تجھے موقع مل گیا ہے۔ تُو یہاں آرام سے رہ۔ چنگی طرح کھا پی۔ کام کی زیادہ فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تھوڑا بہت بھی کر لے گی تو کافی ہوگا۔ میں نے سب کو سمجھا دیا ہے کہ تیرے ساتھ کوئی زور زبردستی نہ کریں۔ تُو دیکھنا، یہاں کے آرام اور کھلائی پلائی سے تیرا حسن چند دن میں ہی دوبارہ واپس آجائے گا۔'' بظاہر تو وہ اس سے بڑی نرمی سے بات کر رہا تھا لیکن ایک عورت کی جبلت اسے بتا رہی تھی کہ یہاں اس کی عزت خطرے میں ہے اور بہرام شاید قربانی کے بکرے کی طرح اسے کھلا پلا کر اپنی مرضی کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کر رہا ہے۔ موقع ملتے ہی وہ اسے ذبح کرنے میں دیر نہیں کرتا۔ کسی عورت کے لیے اپنی عزت کا گوہر کھو دینا ذبح ہونے کے برابر ہی ہوتا ہے بلکہ شاید اس سے بھی بڑھ کر۔

''آپ کا شکریہ جی، پر میں نے نوکری کی ہے تو حلال کر کے ہی کھاؤں گی۔ بڑے صاحب کے ساتھ ساتھ مجھے اللہ کو بھی منہ دکھانا ہے۔'' اس نے ایک ہی جملے میں واضح کر دیا کہ اس کے لیے بہرام کی پیشکش میں کوئی کشش نہیں ہے۔ نیز یہ کہ وہ خود کو بہرام کی نہیں بلکہ فاریسٹ آفیسر کی ملازمہ سمجھتی ہے۔

''ادھر تھوڑے دن رہے گی تو حلال حرام سب بھول جائے گی۔ یہ فاریسٹ آفیسر صاحب کا بنگلا ہے اور وہ ادھر جنگل کا قانون ہی چلاتے ہیں۔ جنگل کا قانون تو تجھے علوم ہی ہوگا۔ جس میں دم ہوتا ہے، وہ اپنے سے کمزور کو شکار کر کے کھا جاتا ہے۔'' وہ مونچھوں پر تاؤ دیتا ہوا کھڑا ہوا اور اس کے عین سامنے آکر رک گیا۔

''ساری فکریں وکریں چھوڑ دے۔ موج سے رہ۔ بےفکری سے رہے گی تو پھر سے پہلے والی گلاب سی شہزادی بن جائے گی۔ ہور مجھے اسی وقت کا انتظار ہے۔'' اس کی کلائی پکڑ کر اسے جھٹکے سے اپنے قریب کرتے ہوئے اس نے کہا اور پھر اس کے ہونٹوں کو اپنی کھردری انگلیوں سے چھوتے ہوئے گویا افسوس کا اظہار کیا۔

''کم بخت نے تیرا سارا رس ہی چوس لیا ہے، پر کوئی گل نہیں، ادھر رہے گی تو تھوڑے دن میں فیر دوبارہ نکھر جائے گی۔'' اس بار وہ اپنی بات کہہ کر وہاں مزید رکا نہیں اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا دروازہ کھول کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ شہزادی اپنی جگہ سن سی کھڑی رہ گئی۔ بہرام کے الفاظ نے واضح کر دیا تھا کہ وہ ایک عرصے سے اس پر نظر رکھے ہوئے تھا لیکن ظاہر ہے بالے کو چودھری کے نزدیک جو مقام حاصل تھا، اس کے باعث وہ کبھی اپنی بدنیتی کو ظاہر نہیں کر سکا تھا۔ لیکن اب بالے کی موت اور اسے یہاں ملازمت دلانے کے بعد وہ اسے اپنے لیے تر نوالہ سمجھ رہا تھا اس لیے فوری طور پر جھپٹ پڑنے کے بجائے انتظار کے لیے بھی راضی تھا۔ وہ خوف زدہ سی سمیٹی ہوئی کرچیاں ہاتھ میں لیے کمرے سے باہر نکل آئی۔ کرچیاں کچرے کے ڈبے میں ڈالنے کے بعد اس نے سیدھا اس کمرے کا رخ کیا جو بنگلے کی مرکزی عمارت سے ذرا ہٹ کر اسے رہائش کے لیے دیا گیا تھا۔ اس کمرے میں اس کا سب سے چھوٹا بیٹا ابھی تک بےخبر سو رہا تھا۔ اسی بچے کے لیے اس نے خصوصی اجازت حاصل کی تھی جبکہ باقی بچے اپنی دادی کے ساتھ گاؤں میں ہی رہ رہے تھے۔ بچے کے قریب بیٹھ کر اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتی ہوئی وہ اپنے حالات پر غور کرنے لگی۔ شہریار نے اسے جو کام سونپا تھا، وہ ابتدا میں ہی اس کے لیے خطرناک صورت اختیار کر گیا تھا۔ بس اطمینان تھا تو اتنا کہ بہرام فوری طور پر اس کو نقصان پہنچانے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ چنانچہ وہ چاہتی تو اپنی کارکردگی کی رفتار تیز رکھتے ہوئے جلد اصل مقصد حاصل کر سکتی تھی۔ مقصد کے حصول کے بعد اسے مزید یہاں رکنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ وہ جب چاہتی، آرام سے نوکری چھوڑ جاتی کیونکہ مالی مسائل حل کرنے کا تو شہریار نے وعدہ کر ہی رکھا تھا اور اسے یقین تھا کہ اسی ایک ایمان دار آدمی ہے جو اپنا وعدہ ضرور پورا کرے گا۔

اپنے حالات کا سرسری سا جائزہ لینے کے بعد اس نے فی الحال پریشان کن سوچوں کو جھٹک دیا اور آئندہ کے لیے لائحہ عمل طے کرنے لگی۔

☆☆☆

''خوش آمدید... خوش آمدید۔ تمہیں اپنے سامنے صحیح سلامت دیکھ کر جو دلی خوشی ہو رہی ہے اسے میں لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا۔'' وہ ذیشان کے دفتر میں داخل ہوا تو اس

نے اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کا والہانہ استقبال کیا اور پھر مزید پیش رفت کرتے ہوئے اسے اپنے سینے کے ساتھ بھینچ لیا۔ اس کا یہ انداز اتنا بے ساختہ تھا کہ شہریار کو اپنا دل گداز ہوتا محسوس ہوا۔ وہ اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ والدین کی وفات کے بعد ماموں، ممانی نے پرورش کی اور سجاد رانا کزن سے بڑھ کر بڑے بھائی کی حیثیت سے محبت و شفقت سے نوازتے رہے۔ سجاد رانا کی موت کے بعد وہ خود کو بہت تنہا محسوس کرنے لگا تھا لیکن آج ذیشان کی بے ساختگی دیکھ کر اسے بالکل ایسا لگا تھا جیسے وہ اس کا سگا بھائی ہو... جسے اپنے بھائی کے کسی مصیبت سے بچ سلامت بچ نکلنے کی اتنی بے تحاشا خوشی تھی کہ وہ اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ پا رہا تھا۔

شاہدہ اور کمال کی معاونت سے ان کے گاؤں سے نکلنے کے بعد اس نے راستے میں ایک بار پھر ذیشان سے رابطہ کیا تھا اور اس نے اسے سیدھا لاہور آنے کے بجائے فیصل آباد چلے جانے کا مشورہ دیا تھا۔ فیصل آباد کے ایک درمیانے درجے کے ہوٹل میں قیام کرنے کے بعد اس نے پہلا کام یہ کیا کہ اپنے لیے بازار سے ایک سلا سلایا شلوار قمیص کا جوڑا خریدا اور خود کو دھوتی کرتے سے نجات دلائی۔ عادی نہ ہونے کے سبب وہ لباس اس کے لیے بڑا دشوار ثابت ہوا تھا۔ لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ شاہدہ نے اسے یہ لباس فراہم کر کے اس پر بڑا احسان کیا تھا اور وہ دیہاتی ماحول میں اپنے پینٹ کوٹ کی وجہ سے نمایاں ہونے سے بچ کر آسانی سے وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ کمال کا دھوتی کرتا اس نے احتیاط سے تہ کر کے اپنے پاس محفوظ کر لیا تھا تا کہ اگر کبھی اس کے گاؤں جانے کا موقع ملے تو اس کی امانت واپس کر دے۔ فیصل آباد کے ہوٹل میں اسے زیادہ دیر قیام نہیں کرنا پڑا تھا۔ وہاں پہنچ کر اس نے ذیشان کو اپنے پتے ٹھکانے سے آگاہ کر دیا تھا اور ذیشان نے فوراً ہی کچھ ایسا بندوبست کر دیا تھا کہ ایک آرام دہ گاڑی ڈرائیور سمیت اسے لینے کے لیے پہنچ گئی تھی اور اسی گاڑی کی مدد سے وہ لاہور میں واقع سی ایف پی کے دفتر پہنچ گیا تھا جہاں ذیشان کھلی بانہوں سے اس کا استقبال کرنے کے لیے تیار تھا۔

”تمہارے خلوص کا شکریہ یار! موت اور زندگی کی یہ آنکھ مچولی تو ہمارے ساتھ چلتی ہی رہتی ہے۔ جب تک اللہ کو منظور ہے، موت کو اسی طرح شکست ہوتی رہے گی ورنہ وقت پورا ہو گیا تو پھر کوئی بھی معمولی سا سبب موت کا بہانہ بن جائے گا۔“ اس نے ذیشان سے علیحدہ ہو کر مسکراتے ہوئے کہا تو وہ بھی اپنے جذبات پر قابو پا کر مسکرا دیا اور بولا۔

”بات تو تمہاری ٹھیک ہے لیکن کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کی زندگیاں ذرا زیادہ قیمتی محسوس ہوتی ہیں۔ کرنل توحید اور تمہارا شمار ایسے ہی لوگوں میں ہوتا ہے۔ اور مجھے خوشی ہے کہ تم دونوں ہی پے در پے ہونے والے حملوں سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے ہو اور یقیناً دشمن اس وقت اپنی ناکامیوں پر اپنے سر کے بال نوچ رہا ہوگا۔“

”دشمن کی ناکامی کی خوشی اپنی جگہ لیکن ہمارے لیے اصل لمحۂ فکریہ تو یہ ہے کہ ہمارا دشمن اتنا مضبوط ہے کہ ہمارے گھر میں ہی گھس کر ہم پر حملے کرنے کی جرأت رکھتا ہے۔ کسی خاص فرد کا خوش قسمتی سے بچ نکلنا باعث خوشی سہی لیکن قوم کی تقدیر پر تو سوالیہ نشان لگا ہوا ہے۔ ہم کب، کہاں اور کس نوعیت کا نقصان اٹھا بیٹھیں، ہمیں معلوم ہی نہیں ہے جبکہ دشمن یقیناً مکمل منصوبہ بندی کے ساتھ میدان میں اترا ہوا ہے۔“ اس نے نہایت تفکر سے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

”یہ تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ تمہارے ساتھ ہونے والے حادثے کے بعد بھی ماضی کی طرح ہمارے ہاتھ کچھ نہیں آسکا ہے حالانکہ میں فوری طور پر حرکت میں آ گیا تھا اور خوش قسمتی سے ہم نے تمہارے ڈرائیور کو بھی گرفتار کر لیا ہے لیکن حسب معمول وہ صرف کرائے کا آدمی ثابت ہوا ہے۔ اس سے تفتیش کے نتیجے میں ہمیں جو معلومات حاصل ہوئی ہیں، ان کے مطابق کسی اجنبی نے اس سے ملاقات کر کے ایک بڑی رقم کے عوض اس کام کے لیے آمادہ کیا تھا۔ اسے ایک پیکٹ دیا گیا تھا کہ جب بھی مشابرم خان کی غیر موجودگی کے باعث وہ تمہاری گاڑی ڈرائیو کرے تو یہ پیکٹ گاڑی کی ڈگی میں رکھ دے اور پھر موقع دیکھ کر کسی مناسب جگہ پر گاڑی روک کر خود دور جا کر ریموٹ کنٹرول کی مدد سے بم بلاسٹ کر دے۔ ہم نے اس سے ریموٹ کنٹرول برآمد کر لیا ہے اور ساتھ ہی ہمارے آدمیوں نے موقع کا جائزہ بھی لیا ہے۔ دھماکا اتنا شدید تھا کہ تمہاری گاڑی کے پرخچے اڑ گئے ہیں اور زمین پر کئی فٹ گہرا گڑھا بن گیا ہے۔ اب تم خود سوچ لو کہ اگر تم گاڑی میں موجود ہوتے تو تمہارا کیا حشر ہوتا۔ میرے خیال میں تو ہمارے لیے تمہارے سارے ٹکڑوں کو یکجا کرنا بھی ممکن نہیں ہو پاتا۔“ ذیشان نے اس کے سامنے صورت حال واضح کی جس کے بارے میں وہ پہلے ہی اندازہ قائم کر چکا تھا۔ البتہ اس وقت اسے ذیشان کی ٹیم کی کارکردگی نے خوش کیا تھا کہ ایک طرف انہوں نے اسے سہولت سے فیصل آباد سے لاہور پہنچا دیا تھا تو دوسری طرف جائے وقوعہ پر بھی کام کرتے رہے تھے۔

"چلو، یہ اچھا ہوا کہ میں نے بم کے ساتھ پھٹنے سے بچ کر تمہیں زحمت سے بچا لیا ورنہ واقعی اس وقت تم میرے ٹکڑے جمع کرنے کی فکر میں ہلکان ہو رہے ہوتے۔" اس نے ہلکے پھلکے انداز میں مذاق کیا۔

"بکواس مت کرو۔ تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ اگر سچ مچ ایسی نوبت آجاتی تو مجھ پر کیا گزرتی۔" ذیشان نے اسے تنبیہ کی اور پھر ہولی سی دستک کی آواز کے ساتھ کمرے میں آنے والے ملازم کی طرف متوجہ ہو گیا جو اس کے حکم پر ہی چائے اور دیگر لوازمات سے بھری ٹرے لیے وہاں پہنچا تھا۔ ملازم چائے تیار کر کے ان کے سامنے پیالیاں رکھ کر واپس چلا گیا تو گفتگو کا سلسلہ ایک بار پھر شروع ہو گیا۔

"میں نے کرنل توحید کو بھی اس واقعے کی رپورٹ دے دی تھی۔ انہوں نے مجھے حکم دیا تھا کہ تم جیسے ہی پہنچو، انہیں اطلاع دی جائے۔ وہ خود تم سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے تمہاری گاڑی دفتر کے سامنے پہنچتے ہی انہیں اطلاع کر دی تھی اور انہوں نے جو وقت دیا تھا، اس کے مطابق وہ ٹھیک دس منٹ بعد یہاں موجود ہوں گے۔ اس دوران میں تم چائے وغیرہ پی کر فارغ ہو جاؤ تاکہ ان سے اطمینان سے ملاقات کر سکو۔"

ذیشان کی دی ہوئی اطلاع اس کے لیے اہم تھی۔ یہ ٹھیک تھا کہ اس پر شدید قاتلانہ حملہ ہوا تھا لیکن وہ اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ کرنل توحید اس سے بنفس نفیس ملاقات کے لیے کیوں تشریف لا رہے ہیں۔ فی الحال وہ ذیشان کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے چائے اور اسنیکس سے مستفید ہونے لگا۔ لاری اڈے پر کمال کے پلائے ہوئے گنے کے رس کے بعد کھانے پینے کی کوئی شے اس کے حلق سے نیچے نہیں اتری تھی۔ وہ اتنی بری طرح الجھ گیا تھا کہ کھانے پینے کا ہوش ہی نہیں رہا تھا۔ پھر یوں بھی اسے فیصل آباد کے ہوٹل میں کچھ دیر کے قیام کے سوا کہیں سکون سے بیٹھنا نصیب ہوا ہی کب تھا۔ زیادہ تر وقت تو سفر میں ہی گزر گیا تھا چنانچہ اس وقت جو کچھ سامنے تھا، اس سے فیض یاب ہونا مناسب تھا۔ دس منٹ کا دورانیہ کھانے پینے اور ذیشان سے گفتگو کرنے میں تیزی سے گزر گیا۔ ذیشان کو خود بھی کوئی اندازہ نہیں تھا کہ کرنل توحید اس سے کس مقصد کے تحت ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔ وہ خود اپنی جگہ شدید تجسس کا شکار تھا۔

دسواں منٹ گزرتے ہی کرنل توحید وہاں پہنچ گئے۔ انہوں نے بلیک ٹراؤزر پر سرمئی اور نیلی دھاریوں والی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی اور شہریار اپنے دل میں یہ اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکا کہ اگر وہ ملتان میں اسے فل فوجی یونیفارم میں بہت باوقار لگے تھے تو اس رف سے حلیے میں بھی شاندار... لگ رہے تھے۔ یقینی طور پر وہ ان لوگوں میں سے تھے جو کچھ بھی پہن لیں، ان پر جچنے لگتا ہے یا دوسرے لفظوں میں وہ جو لباس پہن لیں، اس لباس کی شان بڑھ جاتی ہے۔ ان دونوں نے اپنی نشستوں سے اٹھ کر ان کا استقبال کیا اور ذیشان نے فی الفور اپنی نشست ان کے لیے خالی کر دی۔

"اوہو، تو یہاں چائے کا دور چل رہا تھا... بہت خوب۔" انہوں نے نشست پر براجمان ہوتے ہوئے ایک نظر میز پر ڈالی اور بے تکلفی سے بولے۔ سی ایف پی کے اس دفتر آتے ہوئے وہ صرف اپنی فوجی یونیفارم ہی نہیں چھوڑ کر آئے تھے بلکہ لہجے کا وہ کلف بھی غائب تھا جو ایک فوجی افسر کی شان کا اظہار کرتا ہے۔

"جی سر! اصل میں شہریار کافی لمبا سفر کر کے آیا تھا تو میں نے اسے ریفریش کرنے کے لیے یہ بندوبست کروا دیا۔ آپ پسند کریں تو میں آپ کے لیے چائے منگوا لوں۔" ذیشان نے انہیں جواب دیتے ہوئے فوراً پیشکش کی۔

"نہیں بھئی۔ میرا اس وقت چائے کا موڈ نہیں ہے۔ میرے لیے تم لائم جوس منگوا دو۔" انہوں نے اسی بے تکلفی سے جواب دیا جسے سن کر ذیشان فوراً ہی انٹرکام پر مصروف ہو گیا۔

"اور ینگ مین! تم سناؤ... کیسا لگ رہا ہے ایک اور قاتلانہ حملے سے بچ نکلنا؟" انہوں نے مسکراتے ہوئے براہ راست شہریار سے سوال کیا۔

"تھوڑی سی الجھن کا شکار ہوں۔ میری فیملی یہ خبر سن کر بری طرح ڈسٹرب ہو گئی ہو گی۔ دفتر میں بھی ہلچل مچی ہوئی ہو گی لیکن میں نے ذیشان کی ہدایت پر اب تک کسی سے رابطہ کر کے تسلی نہیں دی ہے اور اپنا موبائل فون بھی آف کر دیا ہے۔" اس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"یہ ضروری تھا۔ دشمنوں کو اس الجھن میں رہنے دو کہ تم کہاں ہو اور خود فی الحال جہاں آرام سے رہو۔ رہی تمہاری فیملی کی بات تو انہیں اطمینان دلا دیا جائے گا۔ دفتر کے عملے کو مطمئن کرنا اتنا ضروری نہیں ہے۔" انہوں نے دوٹوک لہجے میں اسے جواب دیا۔

"اوکے... ایز یو وش۔" شہریار نے شانے اچکا کر بے فکری کا اظہار کیا اور مودبانہ بولا۔ "میرے لیے مزید کیا حکم ہے؟"

جواب میں کرنل توحید اسے بغور دیکھنے لگے۔ ان کا انداز ایسا تھا جیسے اسے اندر تک کھنگال لینا چاہتے ہوں۔

اپنے اس جائزے سے فارغ ہو کر انہوں نے ایک ہنکارا بھرا اور پھر اچانک ہی بولے۔ "تمہارے لیے اے سی شہریار عادل کی کتنی اہمیت ہے؟"

سوال عجیب تھا اور وہ اس سوال کا مقصد بھی نہیں سمجھ سکا تھا لہٰذا الجھے ہوئے لہجے میں بولا۔ "ہر انسان کے لیے اس کی شخصیت اہم ہوتی ہے کیونکہ وہ اسی حوالے سے پہچانا اور شناخت کیا جاتا ہے۔ میرے والدین نے میرا نام شہریار عادل رکھا تھا اس لیے مجھے یہ نام دل و جان سے عزیز ہے۔ رہی اے سی کے عہدے کی بات تو یہ عہدہ میں نے رعب داب یا افسری کی چاہ میں حاصل نہیں کیا ہے۔ میں اپنے ملک کے لیے کچھ کرنا چاہتا ہوں اور اپنی اس خواہش کی تکمیل کے لیے ہر صورت کوشاں رہوں گا۔ اب چاہے میں ترقی پا کر اے سی سے ڈی سی بن جاؤں یا اس عہدے سے محروم ہو کر کوئی نچلے درجے کا کام کرنے لگوں... میرا مقصد کسی صورت تبدیل نہیں ہو گا۔"

"مجھے تم سے اسی جواب کی امید تھی اور اس جواب کو ذہن میں رکھ کر میں تمہارے سامنے دو تجاویز لے کر آیا ہوں۔" کرنل توحید اپنی نشست پر پیچھے اور اطمینان سے بیٹھ گئے لیکن شہریار مسلسل ان کی نظروں کے حصار میں تھا۔ اسی وقت ملازم دستک دے کر اندر آیا اور ان کا فرمائش کردہ لائم جوس کا گلاس ان کے سامنے لا کر رکھا۔ ملازم کی واپسی تک کمرے میں خاموشی رہی پھر شہریار نے اس خاموشی کو توڑا۔

"آپ نے مجھے بے حد تجسس میں مبتلا کر دیا ہے سر۔"

جواباً کرنل توحید دھیرے سے مسکرائے اور پھر بولے۔ "بات یہ ہے ینگ مین کہ تمہاری کارگزاریاں دیکھتے ہوئے میرے دل میں یہ خیال آیا ہے کہ تم بیوروکریسی کے گورکھ دھندے کو چھوڑو اور ہمارے ساتھ شامل ہو جاؤ۔ لیکن اس کے لیے تمہیں شہریار عادل کی شناخت سے محروم ہونا پڑے گا کیونکہ تم پیچھے جو کچھ کر چکے ہو، اس کے نتیجے میں دشمنوں کے براہ راست نشانے پر ہو۔ شخصیت کی تبدیلی سے دو فائدے ہوں گے۔ ایک تو تم ان کے سامنے سے غائب ہو جاؤ گے اور دوسرے کھل کر ملک کی سلامتی کے لیے کام کر سکو گے۔ تمہارے جذبے کو دیکھتے ہوئے مجھے اتنا تو یقین ہے کہ تم ہم میں شامل ہونے سے انکار نہیں کرو گے اسی لیے میں نے دو تجاویز کا ذکر کیا ہے۔" وہ ایک بار پھر اسے جانچتی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگے۔

"میں ہمہ تن گوش ہوں سر۔" اس نے ایک طرح سے ان کے یقین کو پختگی بخشی۔

"ایک تجویز تو یہ ہے کہ تم حالیہ واقعے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے منظر سے غائب ہو جاؤ اور دشمن کو اس الجھن میں رہنے دو کہ تم کہاں گئے؟ دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ تم خود کو منظر پر لا کر یہ بیان دو کہ کچھ نامعلوم افراد کی طرف سے تم پر مسلسل قاتلانہ حملے ہو رہے ہیں جن کی وجہ سے تمہیں اپنی جان خطرے میں محسوس ہو رہی ہے۔ تمہارا یہ بیان ریکارڈ پر آجانے کے بعد ہم تم پر ایک جعلی قاتلانہ حملہ کروائیں گے اور اس کے بعد یہ تمہاری مرضی پر ہے کہ ہم تمہیں مردہ ظاہر کر دیں یا یہ اعلان کر دیں کہ حملے میں تمہیں کچھ ایسے کاری زخم آئے ہیں جن کے باعث تم کومے میں چلے گئے ہو۔ تمہارے نام پر کوئی بھی مریض اسپتال میں زیر علاج رہے گا اور تم اپنا کام کرتے رہو گے۔ یہ دوسرا طریقہ اختیار کرنے میں تمہیں یہ ایڈوانٹیج حاصل ہو گا کہ تم جب بھی منظر پر آنا چاہو گے، تمہارے ہوش میں آنے اور تندرست ہونے کا اعلان کیا جا سکتا ہے۔" وہ بولتے جا رہے تھے اور شہریار ان کا ایک ایک لفظ غور سے سن رہا تھا۔ ان کی گفتگو کے ساتھ ساتھ اس کا اپنا ذہن بھی حساب کتاب کرنے میں لگا ہوا تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ اپنی موجودہ پوزیشن میں وہ دشمنوں کے لیے ایک کھلا نشانہ بنا ہوا تھا اور اس کے لیے آنے والے دنوں میں آزادی سے کام کرنا مزید دوبھر ہو جاتا۔ اس لیے اگر وہ ملک کے لیے کچھ کرنا چاہتا تھا تو سی ایف پی میں شمولیت کی پیشکش بے حد پرکشش تھی، صرف اسے طریقہ کار کا انتخاب کرنا تھا۔ پہلی صورت میں اس کے دشمن کسی طور چین سے نہیں بیٹھتے اور مسلسل اس تگ و دو میں لگے رہتے کہ اگر وہ اپنی گاڑی کے ساتھ ٹکڑوں میں تقسیم ہو کر جلنے سے بچ گیا ہے تو کہاں ہے۔ اس صورت میں وہ اپنے خلاف ہونے والی ہر کارروائی کے پیچھے اس کا وجود تلاشنے کی کوشش کرتے۔ اس لیے بہتر تھا کہ وہ اس طریقے کو استعمال کر کے دشمن کو ہر لمحہ اپنی کھوج میں لگائے رکھنے سے گریز کرے۔ دوسرا طریقہ منظر پر آ کر دوبارہ کسی حادثے میں مرنے یا کومے میں چلے جانے کا ڈراما کرنا تھا۔ فطری طور پر اسے مرنے والی بات پسند نہیں آئی کیونکہ اس طرح وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے شہریار عادل کو کھو بیٹھتا۔ البتہ کومے میں چلے جانے کا ڈراما کرنے کی صورت میں اس کے پاس یہ موقع تھا کہ وہ کسی ایسے موقع پر جب اسے محسوس ہوتا کہ سی ایف پی کو اس کی ضرورت نہیں رہی، یا وہ اب مزید ان کے لیے کام کرنے کے قابل نہیں رہا، اپنی اصل حیثیت سے منظر پر آ سکتا تھا۔

"مجھے آپ کی سب سے آخری تجویز منظور ہے۔" اس

نے بہت تیزی سے اپنا تجزیہ مکمل کرتے ہوئے اپنا فیصلہ سنایا۔ اس کے فیصلے کو سن کر کرنل توحید کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ جاگی جبکہ ذیشان کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔

"مجھے یقین ہے کہ سی ایف پی میں تمہارا اضافہ بڑا خوش آئند ثابت ہوگا اور ہم مل کر دشمن کے دانت کھٹے کر دیں گے۔" ذیشان نے بے ساختہ ہی اپنی خوشی کا اظہار کیا۔

"تمہاری خوش امیدی واقعی سچ ثابت ہوئی تو میں اسے اپنے لیے باعث فخر سمجھوں گا لیکن بہرحال ہمارا دشمن بھی کم نہیں ہے۔ چالاکی اور عیاری کے ساتھ ساتھ اسے ٹیکنالوجی میں بھی ہم پر فوقیت حاصل ہے۔ خصوصاً موساد کے بارے میں تم بھی سمجھ سکتے ہو کہ وہ ہمارے لیے کتنا سخت حریف ثابت ہوگا۔" وہ بہت سنجیدہ تھا چنانچہ ذیشان کی بات کا جواب دے کر ایک بار پھر کرنل صاحب کی طرف متوجہ ہوگیا۔

"میرے خیال میں آپ میرے گھریلو حالات سے واقف ہوں گے۔ سجاد بھائی اور ان کی بیٹی علینا کی ڈیتھ کے بعد ماموں اور ممانی میں اتنی سکت نہیں رہی ہے کہ وہ کوئی اور صدمہ برداشت کر سکیں۔ ان کی زندگی کا محور و مرکز میری ذات ہی ہے۔ میری زندگی میں ایک بڑا حادثہ ماریا کی صورت میں گزر چکا ہے جس سے وہ لوگ بھی متاثر ہوں گے۔ ایسے میں اگر کوئی ڈراما پلے کرنے سے پہلے انہیں قبل از وقت مطلع نہیں کیا گیا تو خدانخواستہ صدمے سے خود انہیں بھی کوئی نقصان پہنچ سکتا ہے۔ اس لیے تمام تر رازداری کے باوجود ہمیں انہیں لازماً شریک راز کرنا ہوگا۔"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ رانا صاحب اور ان کی مسز کو میں پرسنل جانتا ہوں۔ رانا صاحب کا شمار گنتی کے ان چند سیاست دانوں میں ہوتا ہے جو خوش قسمتی سے محب وطن ہیں اور میں ان سے یہ امید رکھتا ہوں کہ وہ اس اہم ملکی راز کو راز ہی رکھیں گے لیکن ساتھ ہی میرے کچھ تحفظات بھی ہیں۔ نمبر ایک یہ کہ تم انہیں سی ایف پی کے بارے میں کچھ نہیں بتاؤ گے اور دوسرے یہ کہ تمہیں آپس میں آزادانہ رابطے کی اجازت نہیں ہوگی۔ ہم رانا صاحب کی فیملی کی خیر خبر رکھیں گے اور موقع اور وقت کی مناسبت سے تمہاری آپس میں بات چیت یا ملاقات کا بندوبست کروا دیں گے۔" کرنل توحید بھی اب ہلکے پھلکے موڈ کو بھول کر پوری سنجیدگی اختیار کر چکے تھے اور اسے شرائط و ضوابط سے آگاہ کر رہے تھے۔ یہ شرائط سخت ہونے کے باوجود غلط اس لیے نہیں تھیں کہ ایک اہم قومی ادارے کا تحفظ اسی میں تھا۔ شہریار نے لمحہ بھر کے لیے سوچا اور ہامی بھر لی۔

"مجھے منظور ہے لیکن ساتھ ہی میں ایک دوسرا مسئلہ بھی آپ کے گوش گزار کرنا چاہتا ہوں۔ بطور اے سی میں نے اپنے علاقے کے کئی دیہاتوں میں ترقیاتی پروجیکٹس شروع کر رکھے تھے۔ خوش قسمتی سے ایک صاحب حیثیت شخص نے اپنی ساری پراپرٹی مرنے سے قبل میرے اختیار میں دے دی تھی اس لیے مجھے اپنے منصوبوں پر کام کرنے کے لیے حکومتی فنڈ کے علاوہ بھی کافی سہولت حاصل تھی۔ میں نہیں چاہتا کہ میرے بعد یہ سارے منصوبے کھٹائی میں پڑ جائیں اس لیے آپ کو یہ بھی دھیان رکھنا ہوگا کہ میری جگہ جو دوسرا شخص تعینات ہو وہ اتنا مخلص ضرور ہو کہ ان منصوبوں کو جاری رکھ سکے۔ نیز آپ کو وقتاً فوقتاً اس کی کارکردگی کا جائزہ بھی لینا ہوگا۔"

"ٹھیک ہے۔ تمہارا یہ کام بھی ہو جائے گا۔۔۔ اور کچھ؟" انہوں نے سنجیدگی کو برقرار رکھتے ہوئے اس سے دریافت کیا۔

"نہیں بس اتنا ہی۔ آگے میں آپ کے حوالے ہوں۔" وہ مسکرایا۔

"اعتماد کے لیے شکریہ۔ اب سب سے پہلے تو تمہیں یہ کرنا ہے کہ میڈیا والوں سے رابطہ کرو اور اپنے زندہ ہونے کا اعلان کر دو کیونکہ تمہاری گاڑی کے ساتھ ہونے والے حادثے کی خبر میڈیا پر آ چکی ہے اور ہر چینل تمہاری پراسرار گمشدگی کے بارے میں اپنی اپنی قیاس آرائیاں کر رہا ہے۔ تم سامنے آ کر حقائق بیان کر دو گے تو سب اپنی اپنی بولیاں بند کر دیں گے۔ اس دوران میں ہمارے سادہ پوش آدمی تمہاری حفاظت کرتے رہیں گے۔ اس مرحلے کے بخیر و خوبی طے ہو جانے کے بعد اس ایکسیڈنٹ کا بندوبست کیا جائے گا جس میں تمہارا انتہائی خراب حالت میں ہاسپٹل پہنچنا شو کیا جا سکے۔ پھر دو ایک روز میں تمہارے کومے میں چلے جانے کا اعلان کر دیا جائے۔ اس دوران میں تم بالکل انڈر گراؤنڈ رہو گے اور پلاسٹک سرجری اور کاسمیٹک سرجری کے ذریعے تمہارے حلیے میں اتنی تبدیلی کر دی جائے گی کہ خود تمہارے قریبی لوگوں کے لیے تمہیں پہچاننا آسان نہیں ہوگا۔" اس کی طرف سے گرین سگنل ملتے ہی کرنل توحید نے اسے تفصیلات سے آگاہ کرنا شروع کر دیا۔

"آپ کی باتوں سے تو مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ آپ مجھے کسی خصوصی مشن پر بھیجنے کی تیاری کر رہے ہیں۔" وہ ذہین تھا اس لیے یہ تو کسی صورت تسلیم نہیں کر سکتا تھا کہ صرف اس کی جان کی حفاظت کے لیے اتنا کھٹ راگ پھیلایا جا رہا ہے۔ اسی لیے ذہن میں ابھرنے والے خیال کو زبان پر لے آیا۔ اس

کا سوال سن کر کرنل توحید نے ایک گہرا سانس لیا اور اپنی جگہ پر پہلو بدلتے ہوئے بولے۔

"کسی حد تک تمہارا اندازہ درست ہے لیکن فوری طور پر میں تمہیں کہیں بھیجنے کا نہیں سوچ رہا ہوں۔ بس ذہن میں ایک اندیشہ سا ہے کہ جس طرح کے حالات پیش آ رہے ہیں اور ان کے پیچھے را اور موساد جیسی ایجنسیاں موجود ہیں، آنے والے وقت میں ہمیں اور بھی سخت امتحانوں سے گزرنا ہوگا۔ اس لیے بہتر ہے کہ پہلے سے اپنے دفاع کے لیے کچھ تیاریاں کر لی جائیں۔"

"او کے سر! مجھے کسی بھی صورت میں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ میرے آباؤ اجداد میں سے بھی کئی لوگوں نے اس وطن کے لیے اپنے لہو کی قربانی دی تھی اور میں بھی اپنے خون کا آخری قطرہ تک اس پاک سرزمین کی خاطر بہانے کے لیے تیار ہوں۔ اس لیے مجھ سے جیسے بھی طریقے سے کام لیا جائے میں انکار نہیں کروں گا۔" اس کی آواز میں میدان جنگ میں اترنے والے سپاہی کا سا عزم و حوصلہ تھا جسے کرنل توحید اور ذیشان دونوں ہی نے پوری طرح محسوس کیا اور اس بار ذیشان اسے گلے لگانے کی خواہش کو ضبط نہیں کر سکا اور بانہیں پھیلائے اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ اس نے خود بھی ذیشان کی گرم جوشی کا جواب گرم جوشی سے ہی دیا۔ لیکن اس وقت تک گیا جب ذیشان سے الگ ہونے کے بعد اس نے کرنل توحید کی بانہیں بھی اپنے لیے وا دیکھیں۔ دل میں فخر و خوشی کی لہر کو محسوس کرتا ہوا وہ اس شاندار شخص کے چوڑے سینے سے جا لگا جو شاید ہر محب وطن کے لیے اپنی بانہیں وا رکھتا تھا۔

☆☆☆

ماہ بانو نے ٹی وی اسکرین پر نظر آتے چہرے کو دیکھا تو اس پر ایسا شادیٔ مرگ طاری ہو گیا کہ بصارت کے سوا سارے قویٰ عارضی طور پر مفلوج سے ہو کر رہ گئے۔ وہ جہاں جس انداز میں بیٹھی تھی، بیٹھی رہ گئی اور ایک ٹک ٹی وی اسکرین کو تکتی رہی۔ یہ کام وہ اتنی یکسوئی سے کر رہی تھی کہ لگتا نظر آنے والے چہرے کے صرف نقوش ہی نہیں بلکہ ایک ایک رُواں تک حفظ کر لینا چاہتی ہو۔ وہ اس کے ہلتے لب تو دیکھ رہی تھی لیکن وہ کیا کہہ رہا ہے، یہ سننے سے قاصر تھی۔ اپنی کیفیت میں اسے اندازہ ہی نہیں ہوا کہ کب اسلم کمرے میں داخل ہوا اور اس کے برابر میں بیٹھ گیا۔

"ریلیکس ماہ! اللہ کا شکر ہے کہ اے سی صاحب منظر عام پر آ گئے ہیں اور صحیح سلامت ہیں۔" بہت دھیرے سے اس کے گرد اپنا دایاں بازو پھیلاتے ہوئے اسلم نے اسے خود سے قریب کیا اور بائیں ہاتھ سے اس کی نم ہتھیلیوں کو سہلانے لگا۔ اسلم کی اس مداخلت پر وہ اپنے حواسوں میں واپس آئی تو احساس ہوا کہ اس کا پورا چہرہ آنسوؤں سے تر ہے۔ شہریار کی گاڑی کے بم دھماکے میں تباہ ہو جانے کے ساتھ اس کی پراسرار گمشدگی کی خبر سننے کے بعد سے وہ بُری طرح بے کل رہی تھی۔ اس کا رُواں رُواں شہریار کی سلامتی کی دعا مانگتا رہا تھا۔ کہیں کسی شے میں دل نہیں لگ رہا تھا۔ یہاں تک کہ وہ یہ بھی فراموش کر بیٹھی تھی کہ اس کی اسلم سے ابھی حال میں ہی شادی ہوئی ہے اور وہ بہ حیثیت شوہر اس کی توجہ اور محبت کا متقاضی ہوگا۔ حیرت انگیز طور پر اس کی اس کیفیت کے دوران اسلم نے بھی اسے نہیں چھیڑا تھا اور بغیر کسی گلے شکوے کے خود اس کا خیال رکھ رہا تھا۔ اس وقت بھی اس نے اس کی کیفیت کو محسوس کر لیا تھا اور بہت ہی نرمی سے اسے اتنی بڑی خوش خبری کے شاک سے نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کا یہ جذباتی سہارا بڑا جادو اثر تھا۔ ماہ بانو اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے ہی اس سے لپٹ گئی اور ہچکیوں سے رونے لگی۔

"بس کرو میری جان! اس طرح آنسو بہا کر ناشکری مت کرو۔ یہ تو مقام شکر ہے کہ بغیر کسی نقصان کے اے سی صاحب کی زندگی سلامت ہے۔" اب وہ اس کی پشت سہلا رہا تھا لیکن سینے کے مقام پر ماہ بانو کے آنسوؤں سے تر ہوتی قمیص نے اس کے دل میں کیا طوفان اٹھا رکھا تھا، یہ تو بس وہ خود ہی جانتا تھا۔

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ میں ابھی شکرانے کے نفل پڑھ کر آتی ہوں۔" وہ یک دم ہی اس سے الگ ہوئی اور رندھی ہوئی آواز میں کہتی ہوئی باہر نکل گئی۔ وہ خود اپنی جگہ بیٹھا رہ گیا۔ اسے معلوم تھا کہ شکرانے کے یہ نفل خاصے طویل ثابت ہوں گے۔ اس خوش خبری کے ملنے سے قبل وہ صلوٰۃ الحاجات میں بھی اس کے طویل سجدوں اور دعاؤں کو دیکھتا رہا تھا اور دل ہی دل میں شہریار کی خوش نصیبی پر رشک بھی کیا تھا جس کے لیے ماہ بانو جیسی لڑکی کے اخلاص کا یہ عالم تھا کہ وہ اس سے کوئی رشتہ نہ ہوتے ہوئے بھی یوں شدت سے اس کے لیے محو دعا رہی تھی۔ خود اس کے لیے ماہ بانو دنیا کی ہر شے سے بڑھ کر قیمتی تھی جسے پا کر وہ بے حد مسرور تھا لیکن خود کو بہرحال اس شخص سے کچھ کم ہی خوش قسمت سمجھتا تھا جس نے ظاہری طور پر تو ماہ بانو کو نہیں پایا تھا لیکن جو اس کے دل و دماغ پر حکمرانی کرتا تھا۔ ماہ بانو اور شہریار کے تعلق کی نوعیت سے تو وہ جنگل میں ہی اس وقت واقف ہو گیا تھا جب اس نے ماہ بانو کے سامنے شہریار عادل کی بیوی کا ذکر کیا تھا اور وہ اس کی شادی ہو جانے کی خبر

سن کر پہلے تو صدمے سے بے ہوش ہو گئی تھی پھر بعد میں بالکل ہی اچانک خود اس سے شادی کی ہامی بھر لی تھی۔ بعد میں بھی وقتاً فوقتاً ان دونوں کی حرکات و سکنات سے اسے اندازہ ہوتا رہا کہ وہ ایک دوسرے کے لیے دل میں محبت کے گہرے جذبات رکھتے ہیں لیکن کسی وجہ سے اس محبت کو اظہار کا موقع نہیں مل سکا۔ اسے ان کی محبت کی پاکیزگی کا بھی اندازہ تھا۔ سفلی جذبات سے محروم محبت کا وہ جذبہ جسے یقیناً اللہ نے ان کے دلوں پر اتارا تھا، کسی طور قابلِ گرفت نہیں تھا کہ وہ ماہ بانو سے کوئی شکوہ کرتا۔

اس نے تو شہریار کا نام لیے بغیر بہت پہلے ہی اسے آگاہ کر دیا تھا کہ اس کا دل کسی اور کا اسیر ہے۔ اس کے باوجود اگر اس نے ماہ بانو سے شادی کرنے کے فیصلے کو برقرار رکھا تھا تو یہ اس کا اپنا انتخاب تھا اور اسے اپنے اس انتخاب پر کوئی پچھتاوا یا ملال نہیں تھا۔ ازدواجی زندگی کے اس مختصر سے عرصے میں ماہ بانو نے خود کو ایک وفادار بیوی ثابت کیا تھا اور اس کی ہر ضرورت اور خواہش کا جی جان سے خیال رکھتی رہی تھی۔ بدلے میں وہ اتنا تو کر ہی سکتا تھا کہ جہاں آ کر وہ بے بس ہو جاتی تھی اور خود پر سے اختیار کھو بیٹھتی تھی، وہاں اسے تھوڑی سی رعایت دیتے ہوئے گرفت کرنے سے گریز کرے۔ اور اس نے یہی کیا بھی تھا لیکن خود اس کے اپنے دل کو جو تکلیف پہنچی تھی، وہ بھی فطری تھی اور اس تکلیف کو وہ وسیع القلبی سے نظرانداز تو بے شک کر سکتا تھا لیکن اتنا با اختیار نہیں تھا کہ دل کو اس تکلیف میں مبتلا ہی نہ ہونے دے۔

موجودہ حالات میں اس نے اس بات پر بھی شکر کیا تھا کہ حامد راؤ کی فیملی کے تمام افراد واپس اپنے گاؤں تالی والا چلے گئے ہیں ورنہ ماہ بانو کی یہ کیفیت خواتین کو لازماً کھٹکا دیتی۔ حامد راؤ کی طرف سے ان کے لیے گاؤں یا شہر میں مرضی کے مطابق قیام اور ملازمت کی پیشکش اب بھی برقرار تھی لیکن ماہ بانو کے ایما پر اس نے یہ پیشکش قبول نہیں کی تھی اور خالی فلیٹ میں بیکار بیٹھا شہریار کی طرف سے گرین سگنل ملنے کا انتظار کر رہا تھا۔ ایسے میں جب یہ خبر سننے کو ملی کہ شہریار کی گاڑی کو بم دھماکے سے اڑا دیا گیا ہے اور وہ خود پراسرار طور پر موقع سے لاپتا ہے تو قدرتی طور پر ان دونوں ہی کو شاک لگا لیکن ماہ بانو کی کیفیت ہی الگ تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ جب تک شہریار کی خیریت کی خبر نہیں ملے گی، وہ خود سولی پر لٹکی رہے گی۔ اور اب وہ خوش خبری مل گئی تھی تو بھی اس کی حالت دیدنی تھی۔ اس کے ہوش دلانے پر وہ سنبھلی تھی اور اب شکرانے کے نفل ادا کر رہی تھی جبکہ وہ خود عجیب سی کیفیت میں گھرا بالکل ساکت بیٹھا تھا۔ ڈور بیل کی آواز نے اسے اس کیفیت سے باہر نکالا۔ وہ ہڑبڑاتا ہوا بیرونی دروازے کی طرف بڑھا۔

''کون؟'' دروازے کے قریب پہنچ کر اس نے دریافت کیا۔

''کوریئر سروس۔'' باہر سے مختصر جواب دیا گیا تو اس نے دروازہ کھول دیا۔ دروازہ کھولتے ہی اس کی نظر صاف ستھرے لباس میں کھڑے جس شخص پر پڑی، وہ کہیں سے بھی کسی کوریئر سروس کا نمائندہ نہیں لگ رہا تھا لیکن بہرحال اس کے ہاتھ میں ایک کافی پھولا ہوا لفافہ موجود تھا جو اس نے فوراً ہی آگے بڑھا دیا۔

''اسلم صاحب۔۔۔؟'' اس کا انداز تصدیق کرنے والا تھا۔

''جی ہاں۔'' اس نے لفافہ تھام لیا۔

''یہ آپ کے لیے شہریار عادل صاحب نے بھجوایا ہے۔ تفصیلات آپ کو لفافہ کھول کر معلوم ہو جائیں گی۔'' اس نے سپاٹ سے انداز میں اسے بتایا اور پھر اس کی طرف سے کسی ردِعمل کا انتظار کیے بغیر تیزی سے پلٹ گیا۔ اسلم نے تفہیمی انداز میں سر ہلاتے ہوئے دروازہ بند کر لیا۔ اس کا اندازہ درست تھا۔ وہ شخص واقعی کسی کوریئر سروس کا نمائندہ نہیں تھا۔ وہ لفافہ ہاتھ میں لیے واپس اسی کمرے میں آ گیا جہاں اب بھی ٹیلی وژن چل رہا تھا لیکن خبروں کا سلسلہ روک کر اب کمرشلز چلائے جا رہے تھے۔ کچھ دیر قبل شہریار سے متعلق جو خبر چلی تھی، اس میں اسے لائیو دکھایا گیا تھا جس کا مطلب تھا کہ وہ اپنے کام میں مصروف ہونے سے پہلے ان لوگوں کا کام نمٹا کر گیا تھا۔

''کیا ہوا اسلم۔۔۔ کون تھا دروازے پر؟'' اسی وقت ماہ بانو نماز کے مخصوص انداز میں دوپٹا لپیٹے ہوئے وہاں چلی آئی۔ اب وہ کافی پُرسکون اور مطمئن محسوس ہو رہی تھی۔

''شہریار صاحب نے یہ لفافہ بھجوایا ہے۔'' اس نے بتایا۔

''اچھا، لائیں دکھائیں کیا ہے اس میں؟'' اس کا چہرہ کھل اٹھا اور وہ اس کے ہاتھ سے لفافہ لے کر اشتیاق سے دیکھنے لگی۔ لفافے میں ان دونوں کے پاسپورٹ اور کچھ دیگر سفری کاغذات کے علاوہ ایک مختصر سا خط بھی موجود تھا جس میں شہریار نے دونوں میں سے کسی ایک کو بھی مخاطب کیے بغیر یہ اطلاع دی تھی کہ ان کی روانگی کے سلسلے میں تمام ممکنہ کارروائی کی جا چکی ہے اور اب انہیں ویزے کے حصول کے لیے کل اسلام آباد میں امریکی سفارت خانے پہنچ کر انٹرویو دینا تھا۔ اس اطلاع کے ساتھ لاہور سے اسلام آباد تک کے ائر ٹکٹ بھی موجود تھے اور ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا گیا تھا کہ ویزا مل جانے کے بعد ان کے سفر کے لیے دیگر انتظامات بھی کر دیے جائیں گے۔ ان دونوں کے لیے یہ اطلاع جہاں خوش کن تھی، وہیں یہ احساس بھی دلا گئی تھی کہ اپنی تمام تر مصروفیات اور مشکلات کے باوجود شہریار ان کی طرف سے غافل نہیں ہے اور شاید اس وقت تک سکون سے نہیں بیٹھے گا جب تک ماہ بانو کو اس کی فرمائش کے مطابق یہاں سے بیرونِ ملک روانہ نہیں کر دیتا۔

☆☆☆

''السلام علیکم سر! کیا حال ہے آپ کا؟ میری طرف سے آپ کو نئی زندگی مبارک ہو۔ میں آپ سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن آپ کا نمبر بند تھا پھر خبروں سے پتا چلا کہ آپ کی گاڑی کو بم دھماکے سے اڑا دیا گیا ہے اور آپ پراسرار طور پر لاپتا ہیں۔ اب خبروں ہی کے ذریعے یہ اطلاع ملی کہ آپ اللہ کے کرم سے خیر خیریت سے ہیں تو میں نے سوچا ایک بار پھر آپ سے رابطہ کرنے کی کوشش کر لی جائے۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس بار میری کوشش کامیاب رہی اور آپ کی آواز سننے کو مل گئی۔'' وہ اس وقت رانا ہاؤس میں موجود تھا اور مسلسل جاننے والوں اور عزیز و اقارب کی فون کالز نمٹا رہا تھا۔ کچھ قریبی لوگ اس سے ملنے کی خواہش میں رانا ہاؤس بھی چلے آئے تھے لیکن سوائے آئی جی مختار مراد کے کسی پر بھی اس کی یہاں موجودگی کو ظاہر نہیں کیا گیا تھا اور آنے والے مہمانوں کو آفرین رانا خود ہی مناسب خاطر مدارات کے ساتھ نمٹاتے ہوئے خوش اسلوبی سے روانہ کرتی جا رہی تھیں۔ ایسے میں جگو کی کال آنا کوئی ایسی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ ٹیلی وژن پر خبریں دیکھ کر وہ اس سے تعلق کی بنیاد پر فون کر سکتا تھا، لیکن اہم بات یہ تھی کہ وہ کوئی بھی خبر منظر پر آنے سے پہلے ہی اس سے رابطے کی ناکام کوششوں کا ذکر کر رہا تھا جس کا مطلب تھا کہ اسے کوئی اہم بات کرنی تھی ورنہ اس سے خاصی محبت کرنے کے باوجود جگو نامی وہ غنڈا غیر ضروری طور پر رابطہ نہیں کرتا تھا۔ اب جانے ایسا احترام میں تھا یا وہ احتیاط پسند واقع ہوا تھا لیکن فی الحال اس کے لیے غور طلب بات یہ تھی کہ جگو اس سے کیوں بات کرنا چاہتا تھا۔

''ٹھیک ہے جگو! یہ بتاؤ کہ تم مجھ سے بات کرنے کے لیے اتنے بے چین کیوں تھے؟'' اس نے فوراً ہی اپنا تجسس دور کرنے کے لیے اس سے پوچھا۔

''میرے پاس آپ کے لیے ایک اہم اطلاع تھی سر! اطلاع ایسے شخص کے بارے میں ہے کہ مجھے یقین ہے آپ اس میں خصوصی دلچسپی لیں گے۔''

''ایسی بات ہے تو فوراً وہ اطلاع مجھے دے دو۔'' اس نے اپنی جگہ پر پہلو بدلا۔

''آپ تو جانتے ہی ہیں سر کہ میرا تعلق کس قسم کے لوگوں سے ہے، البتہ میں ایک اہم سیاسی جماعت سے وابستہ ہونے کی وجہ سے اپنے بھائی بندوں سے ذرا اونچے لیول کا بندہ ہوں پھر بھی میری یہ کوشش رہتی ہے کہ سیاسی حلقوں سے ہٹ کر زیرِ زمین دنیا میں ہونے والے واقعات سے آگاہ رہوں۔ میرے چند قابلِ اعتماد مخبر میرے لیے یہ کام کرتے رہتے ہیں۔ اپنے انہی مخبروں کے ذریعے مجھے اطلاع ملی ہے کہ چودھری افتخار عالم منشیات کے دھندے میں شامل ہو گیا ہے۔ یہ کام بہت ہوشیاری سے کر رہا ہے اور نچلے درجے کے مجرموں اور منشیات فروشوں کے بجائے ایسے تاجروں سے گٹھ جوڑ کر رکھا ہے جو ظاہری طور پر عزت دار ہیں لیکن پیسے کے حصول کے لیے ناجائز دھندوں میں لگے رہتے ہیں۔ چودھری ان تاجروں کو مال بچوں کے ڈائپرز میں چھپا کر بھجواتا ہے اور سوائے اعتماد کے بندوں کے کسی کو اندازہ ہی نہیں ہو پاتا کہ ڈائپرز کے کاروبار کی آڑ میں کون سا دھندا کیا جا رہا ہے۔ میرے مخبر کو بھی اس حقیقت کا علم نہیں ہو پاتا لیکن اتفاق سے چودھری نے مال کی اس طریقے سے ترسیل کے لیے تیاری کے سلسلے میں جن کاریگروں کو ہائر کیا، ان میں سے ایک میرے مخبر کا دوست ہے اور اسی کے ذریعے اسے یہ ساری اطلاعات ملی ہیں۔ خبر دلچسپ تھی اس لیے اس نے مجھ تک بھی پہنچا دی اور اب میں آپ کو بتا رہا ہوں۔'' جگو کی دی ہوئی اطلاع واقعی چونکا دینے والی تھی جسے وہ کسی صورت نظرانداز نہیں کر سکتا تھا۔

''چودھری ڈائپرز کی تیاری کا کام کہاں کروا رہا ہے؟'' اس نے فوراً ہی جگو سے پوچھا۔

''یہ معلوم نہیں ہو سکا۔ اصل میں جس کاریگر سے میرے آدمی کو یہ اطلاع ملی ہے، اس کا کہنا ہے کہ اسے اور دیگر کاریگروں کو آنکھوں پر پٹی باندھ کر اس جگہ لے جایا اور لایا جاتا ہے اس لیے وہ صحیح پتا تو کیا علاقے کا نام بھی نہیں بتا سکتا۔ اس جگہ ان پر اتنی پابندی ہے کہ انہیں اپنے سونے اور کام کرنے کی جگہ کے علاوہ کہیں بھی آزادانہ حرکت کی اجازت نہیں ہے۔ چھٹی بھی ہفتے میں صرف ایک دن بارہ گھنٹے کے لیے ملتی ہے، اس کے علاوہ وہ لوگ دن رات وہیں رہتے ہیں۔ البتہ اس نے اتنا اندازہ ضرور لگایا ہے کہ جس جگہ وہ کام

کرتا ہے، وہ کسی بڑی عمارت کا تہ خانہ ہے جہاں شاید اوپری منزل پر بھی کوئی کام ہوتا ہے کیونکہ اوپر سے انھیں مسلسل چلنے پھرنے، مشینوں کے چلنے اور سامان وغیرہ کے گھسیٹے جانے کی آوازیں آتی رہتی ہیں۔ اس کے علاوہ خود تہ خانہ بھی دو حصوں میں تقسیم ہے۔ ایک حصے میں وہ اور اس کے ساتھی کاریگر عام ڈائپرز کی تیاری کے علاوہ کچھ مخصوص ڈائپرز میں ہیروئن بھرنے کا کام کرتے ہیں۔ ان کے اس کام کی نگرانی کوئی غیر ملکی کرتا ہے البتہ عام ڈائپرز کی تیاری کے وقت وہ موجود نہیں رہتا اور تہ خانے کے دوسرے حصے میں چلا جاتا ہے۔ اس حصے میں جانے کی کاریگروں کو اجازت نہیں ہے البتہ انھوں نے وہاں چند غیر ملکیوں کو دیکھا ہے اور وہاں سے آنے والی آوازوں سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اس حصے میں بھی کوئی کام ہو رہا ہے۔ شاید وہاں ہیروئن ذخیرہ کی جاتی ہے کیونکہ انھیں اسی جگہ سے نکال کر یہاں ڈائپرز میں بھرنے کے لیے دیا جاتا ہے۔" جگنو نے اسے تفصیلی جواب دیا جسے سن کر اس کے ذہن میں بہت سی باتیں تازہ ہونے لگیں۔ ان باتوں پر غور کرنے کے لیے اسے ارتکاز کی ضرورت تھی اس لیے جگنو سے اجازت لینا ضروری تھا۔

"ٹھیک ہے جگنو! تم نے مجھے بہت کام کی باتیں بتائیں۔ میں دیکھتا ہوں کہ اس سلسلے میں کیا کیا جاسکتا ہے۔ تمھیں بھی کچھ اور یاد آئے یا کوئی نئی بات معلوم ہو تو مجھے اطلاع ضرور دینا فی الحال میں انھی اطلاعات پر کام کرتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے سر! میں ہر لمحے آپ کی خدمت کے لیے حاضر ہوں۔" اس نے فرماں برداری سے جواب دیا۔ وہ شخص بھی اپنی نوعیت کا انوکھا ہی کردار تھا۔ شہریار کی وجہ سے ایک بار اس کے بیٹے کی جان کیا بچی، وہ اس کا بے دام غلام بن کر رہ گیا۔ کہنے کو وہ ایک غنڈا تھا اور ایک بڑی سیاسی جماعت کے لیے کام کرتا تھا لیکن شہریار کی طرف سے ملنے والے معمولی سے معمولی احکامات کی تعمیل یوں کرتا تھا جیسے یہی اس کا اصل فریضہ ہو۔ اس بار تو اس نے کچھ اور بھی آگے بڑھ کر کام کیا تھا اور اس کی فرمائش یا حکم پر میدان میں اترنے کے بجائے صرف یہ جاننے کے باعث کہ وہ چودھری کے خلاف کارروائیاں کرتا رہتا ہے، اسے اس کے ایک انتہائی اہم راز سے آگاہ کر دیا تھا۔ اب اسے جگنو کی دی ہوئی اطلاعات پر غور کرنا تھا۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ ذیشان نے بھی اس کے سامنے چودھری کے تاجر حلقے میں بڑھتے ہوئے ربط ضبط کا ذکر کیا تھا لیکن اس کے آدمی اب تک یہ جاننے میں کامیاب نہیں ہو سکے تھے کہ وہ کسی غیر قانونی دھندے میں ملوث ہے۔ انھوں نے تو اب تک سیدھے سادے کاروبار کی ہی اطلاع دی تھی کیونکہ وہ ان تاجروں کے لیے بس سیکیورٹی گارڈ کا کام کرتے تھے اور ان میں سے کسی نے بھی انھیں اپنا شریکِ راز نہیں کیا تھا۔ سی ایف پی کے لیے کام کرنے والے ان دوسرے درجے کے اہلکاروں کے علاوہ کچھ اور بھی لوگ تھے جو آج کل لاہور میں ہی واقع چودھری کے جوتوں کے کارخانے کی دیکھ بھال کر رہے تھے۔ چودھری نے ان سیکیورٹی گارڈز کو اس لیے ہائر کیا تھا کہ اسے خدشہ تھا، کچھ عرصہ قبل اس کے کارخانے میں لگنے والی آگ کسی دشمن کی کارروائی تھی۔ کارخانے کی ازسرِنو تعمیر کے بعد اس نے وہاں اپنے آدمیوں کے علاوہ ان تربیت یافتہ سیکیورٹی گارڈز کی موجودگی ضروری سمجھی تھی اور ان گارڈز کے لیے کمپنی کو بھاری معاوضہ ادا کر رہا تھا۔ اسے لگا کہ ہو نہ ہو، اس میں کوئی راز ہے۔ اس نے فوراً ہی ذیشان سے رابطہ کر کے اسے ساری بات بتائی۔ وہ اس کی بات سن کر پُرجوش ہو گیا۔

"تم بالکل صحیح خطوط پر سوچ رہے ہو شہریار... واقعی وہاں کچھ گڑبڑ ہے۔ ہمارے آدمیوں نے جو ڈیلی رپورٹ دی ہے، اس میں اس بات کا تذکرہ ہے کہ چودھری کے جوتوں کے کارخانے کے تہ خانے میں ڈائپرز بنانے کا کام کیا جاتا ہے لیکن ظاہری طور پر یہ کوئی قابلِ گرفت بات نہیں تھی اس لیے میں نے توجہ نہیں دی۔ تمھاری دی ہوئی اطلاع کی روشنی میں، میں وہاں ڈیوٹی دینے والے گارڈز سے خود معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہوں، اس کے بعد ہی ہم کوئی ایکشن لے سکیں گے۔" وہ جس جگہ کا پتا جگنو سے معلوم نہیں کر سکا تھا، ذیشان سے بات کرنے کے نتیجے میں منٹوں میں اس سے آگاہ ہو گیا۔

"میرے خیال میں تم ساتھ ساتھ فوری ایکشن کی تیاری بھی کر لو کیونکہ تمھارے آدمی جو بھی بتائیں، اب اس بات میں کوئی شک نہیں رہا ہے کہ قبلہ چودھری صاحب ہیروئن کے کاروبار سے بھی منسلک ہیں، اس لیے اب اس شخص کو کوئی رعایت دینا ممکن نہیں ہے۔ کارخانے پر ریڈ کے ساتھ ہی ہمیں چودھری کی گرفتاری کا کام بھی کرنا ہوگا۔ تم نے ای سی ایل میں اس کا نام تو ڈلوا دیا تھا نا؟" ذیشان کو مشوروں سے نوازتے ہوئے اس نے ایک اہم سوال کیا۔

"سوری یار! مجھے تمھیں بتانا یاد نہیں رہا تھا۔ اصل میں ہوا یہ کہ ہمارے ای سی ایل میں نام ڈلوانے سے پہلے ہی چودھری یہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ ہمارے پاس جو

انفارمیشن تھیں، اس کے مطابق وہ امریکا جانے کے لیے پر تول رہا تھا لیکن پھر شاید کسی طرح اس نے خطرے کو بھانپ لیا اور اچانک ہی دبئی روانہ ہو گیا۔ وہاں سے اس کے امریکا جانے کی اطلاع بھی ہمارے پاس ہے۔ یعنی اگر ہم صاف لفظوں میں بات کریں تو چودھری ہماری حد سے نکل چکا ہے اور فی الحال ہم اس پر ہاتھ نہیں ڈال سکتے۔" ذیشان نے اسے جو اطلاع دی، اسے سن کر اس کا جوش و خروش ماند پڑ گیا۔ چودھری کے فرار کی صورت میں اب وہ صرف اس کے کارخانے پر ریڈ ہی کر سکتے تھے۔ وہاں کتنے فیصد کامیابی حاصل ہوتی، یہ ابھی واضح نہیں تھا۔ کچھ امید تھی تو وہاں غیر ملکیوں کی موجودگی کی وجہ سے تھی۔ یقیناً وہ غیر ملکی کچھ اہم لوگ رہے ہوں گے جو خفیہ طریقے سے تہ خانے کے خفیہ حصے میں رہائش پذیر تھے۔

"ٹھیک ہے پھر جو مناسب سمجھو کرو۔ میں بہرحال ہر وقت خدمت کے لیے تیار ہوں۔" اس نے کچھ بجھے ہوئے انداز میں ذیشان سے کہا۔ چودھری کو قانون کی گرفت میں لینے کا ایک اہم موقع ہاتھ سے نکل جانے پر وہ حقیقتاً بہت رنجیدہ تھا۔ وہ شخص اگر گرفت میں آ جاتا تو بہت سارے لوگوں کی تقدیریں بدلنے کا امکان پیدا ہو جاتا کیونکہ پیر آباد اور اس کے گرد و نواح کے علاقوں میں اس کا گہرا اثر رسوخ تھا اور وہ اپنے اس اثر رسوخ کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے وہاں کے لوگوں کا مسلسل استحصال کر رہا تھا۔ وہ درمیان سے ہٹ جاتا تو وہاں کے لوگوں کی تعلیم و ترقی کے لیے راہیں کھل جاتیں لیکن شاید ابھی ان بے چاروں کی قسمت میں مزید انتظار لکھا تھا۔

"تمھیں اس مشن سے عملی طور پر علیحدہ رہنا ہوگا کیونکہ ہم تمھارے لیے جو منصوبہ بندی کر رہے ہیں، اس کے مطابق اب تمھارا کہیں بھی نظر آنا مناسب نہیں ہے۔ آج کے دن تم اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ دل بھر کر باتیں کرو، ان کے ساتھ وقت گزارو پھر بعد میں شاید تمھیں ایسے مواقع بہت مشکل سے دستیاب ہو سکیں۔ میں ان شاء اللہ جلد تمھیں کامیابی کی نوید سناؤں گا۔"

"اوکے، وِش یو گڈ لک۔" ذیشان کا جواب سن کر اس نے کسی قسم کی بحث نہیں کی اور اس کے لیے نیک خواہشات کا اظہار کرتے ہوئے فون بند کر دیا۔ اسی وقت دروازے پر دستک دے کر آفرین رانا اندر داخل ہوئیں، ان کے پیچھے آئی جی مختار مراد بھی تھے۔

"السلام علیکم انکل! آہاؤ آر یو؟" اس نے فوراً اپنی جگہ سے کھڑے ہو کر ان کا تپاک سے استقبال کیا۔

"جیتے رہو برخوردار... اور یہ بتاؤ کہ آج کل تم کیا کرتے پھر رہے ہو؟ تمھارے ماموں، ممانی تمھارے لیے بہت پریشان ہیں اور بھابی نے خاص طور پر مجھے تاکید کی ہے کہ تمھیں سمجھاؤں کہ ایسے کام نہ کرو جن سے تمھاری جان خطرے میں پڑ جائے۔" وہ اس کے شانے پر ایک شفقت بھری تھپکی دیتے ہوئے اس کے ساتھ ہی ایک صوفے پر بیٹھ گئے جبکہ آفرین رانا نے ان دونوں کے سامنے والا صوفہ سنبھال لیا۔

"فکر نہ کریں ممانی جان! آدمی کی جان طے شدہ وقت پر ہی جاتی ہے۔ زندگی ہو تو آدمی میدانِ جنگ سے بھی صحیح سلامت لوٹ آتا ہے اور زندگی ہی کم لکھی ہو تو پھر ائرکنڈیشنڈ دفتر میں بھی کوئی فرشتۂ اجل کو روح قبض کرنے سے نہیں روک سکتا۔" مختار مراد کی بات سن کر اس نے آفرین رانا کو تسلی دی۔

"زیادہ فلسفہ مت جھاڑو۔" انھوں نے اسے خفگی سے گھورا۔ "میں خود بھی الحمدللہ مسلمان ہوں اور یہ بات سمجھتی ہوں لیکن ساتھ ہی مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اپنی زندگی کی حفاظت کرنا ہر انسان پر فرض ہے اور ایسا کوئی شخص نہیں ہوتا جو جان بوجھ کر ریل کی پٹریوں پر جا لیٹے کہ زندگی ہوگی تو بچ جاؤں گا ورنہ ریل کو خود پر سے گزر جانے دے۔ اگر کوئی شخص ایسی حماقت کرتا ہے تو اسے دیوانہ ہی سمجھا جائے گا اور میں بھی تمھیں تمھاری دیوانگی سے باز رہنے کی نصیحت کر رہی ہوں۔" وہ خفا خفا سی بولتی چلی گئیں۔ اس نے مدد طلب نظروں سے مختار مراد کی طرف دیکھا۔

"میری طرف مت دیکھو بھئی، اس وقت میں بھابی کا وکیل ہوں۔" انھوں نے فوراً ہاتھ اٹھا کر اس کی مدد سے انکار کر دیا۔

"تو پھر ٹھیک ہے، میں خود ہی اپنی وکالت کا فریضہ انجام دوں گا۔ آپ لوگ مجھ پر فردِ جرم عائد کریں۔" وہ بھی گویا کمر کس کر میدان میں اتر آیا۔

"فردِ جرم کیا عائد کرنی ہے بیٹا... بس ہمیں تم سے شکوہ ہے کہ تم اپنا ذرا بھی خیال نہیں رکھتے اور بے خوف و خطر ہر معاملے میں کود پڑتے ہو۔ ایسا کرتے ہوئے تمھیں یہ بھی خیال نہیں رہتا کہ تمھارے پیچھے بھی کچھ لوگ ہیں جو پہلے ہی سے زخم خوردہ ہیں اور جن کے دل تمھیں کچھ ہو جانے کے خیال سے دہلتے رہتے ہیں۔ پچھلے کچھ عرصے سے تم نے ہمیں اعتماد میں لینا چھوڑ دیا ہے اور بالا ہی بالا جانے کن

سرگرمیوں میں مصروف ہو۔ اپنی سرگرمیوں سے تم اس لیے انکار نہیں کر سکتے کہ یہ تو کسی صورت ممکن نہیں ہے کہ تم چھپ کر رہے ہو اور تم پر اتنا زبردست قاتلانہ حملہ کر دیا جائے۔ اگر خوش قسمتی تمہارا ساتھ نہ دیتی تو شاید آج تم ہمارے سامنے نہیں بیٹھے ہوتے۔ اور ہاں... تم مجھے اتنا بے خبر بھی نہ جانو۔ میں جانتا ہوں کہ حادثے کے وقت تمہارے قابلِ اعتماد ڈرائیور کے بجائے دوسرا ڈرائیور گاڑی چلا رہا تھا اور دھماکے کے وقت وہ گاڑی میں موجود نہیں تھا۔ بعد میں بھی وہ منظر سے غائب ہے اور صرف اتنا معلوم ہوا ہے کہ کچھ نامعلوم لوگ اسے اٹھا کر لے گئے تھے۔ حادثے کی تحقیقات کے لیے پولیس کو بہت دیر بعد اجازت دی گئی اور کسی خفیہ ادارے کے لوگ وہاں منڈلاتے پائے گئے۔ ان ساری باتوں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ تم کسی ایسے معاملے میں انوالو ہو جو تمہاری پیشہ ورانہ ذمے داریوں سے ہٹ کر ہے اور یقینی طور پر خطرناک بھی۔"

مختار مراد ایک تجربہ کار آدمی تھے جنہوں نے بہ حیثیت ایک پولیس آفیسر جانے زمانے کے کتنے سرد و گرم دیکھے تھے۔ اس کے معاملے میں ان کا تجزیہ غلط ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اور وہ اس سے شکوہ کرنے میں بھی بالکل حق بجانب تھے کیونکہ انہوں نے اس سے کوئی خونی رشتہ نہ ہونے کے باوجود ہمیشہ اس کا بہت ساتھ دیا تھا۔ وہ مرحوم سجاد رانا کے سسر تھے اور اس رشتے سے بھی بڑھ کر انہوں نے اس کی خلوصِ نیت کو دیکھتے ہوئے ہمیشہ اس کی معاونت کی تھی۔ ایسے میں وہ ان سے بالکل کٹ کر رہ گیا تھا تو ان کا محسوس کرنا لازمی تھا۔ اور اب اس کا فرض بنتا تھا کہ ان کی دل جوئی کرے چنانچہ کسی حیلے بہانے سے کام لینے کے بجائے سچ بتانے کا فیصلہ کرتے ہوئے ان سے معذرت کرنے لگا۔

"آئی ایم رئیلی سوری انکل! واقعی آپ کے معاملے میں مجھ سے کوتاہی ہوئی ہے لیکن بس اچانک ہی حالات کچھ ایسا رخ اختیار کرتے چلے گئے کہ میرا آپ سے رابطہ ٹوٹ گیا ورنہ آپ نے میری جس قدر مدد کی ہے اس کے لیے میں آپ کا دل سے شکر گزار ہوں۔"

"ان سب باتوں کو رہنے دو بیٹا! میں نہیں سمجھتا کہ میں نے کسی بھی معاملے میں تمہاری مدد کر کے تم پر احسان کیا ہے۔ تم نے جو کچھ کیا، وہ ملک کی خاطر کیا یا پھر سجاد اور شیبا کے قاتلوں کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کے لیے... اور یہ دونوں ہی معاملات ایسے ہیں جن سے مجھے خود بھی ذاتی طور پر دلچسپی تھی اور اگر ایک طرح سے دیکھا جائے تو میں نے تمہاری نہیں بلکہ تم نے میری مدد کی تھی۔ خاص طور پر جنگل میں آپریشن کے نتیجے میں ڈاکوؤں کے اتنے بڑے گروہ کی گرفتاری کے بعد تو میرے محکمے کا سر فخر سے بلند ہو گیا ہے اس لیے میں خود تمہارا احسان مند ہوں۔ لیکن یہ میں بھی سمجھتا ہوں اور تم بھی کہ ہمارے درمیان ایک دوسرے پر احسان جتانے کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہمارے مفادات بھی ایک ہیں اور مقاصد بھی۔ سجاد اور شیبا کے قاتل کیفرِ کردار کو پہنچ گئے تو ہم سب کے سینوں میں ٹھنڈ پڑ جائے گی لیکن اس مقصد کے لیے ہم تمہیں کسی صورت داؤ پر نہیں لگانا چاہتے۔ تم ہم سب کے لیے بہت اہم ہو۔" بات گھوم پھر کر وہیں پہنچ گئی تھی جہاں سے شروع ہوئی تھی۔ اس کا خاندان مل کر کوشاں تھا کہ وہ جس راہ پر چل رہا ہے وہاں سے واپس پلٹ آئے۔ اس ساری گفتگو میں بغیر مداخلت کے وہاں بیٹھی رہنے والی آفرین رانا کی خاموشی بھی تائید کر رہی تھی کہ جو کچھ مختار مراد کہہ رہے ہیں، وہی ان کی بھی خواہش ہے... بلکہ مختار مراد کے الفاظ یقینی طور پر ان کی خواہش کے ہی عکاس تھے۔ اس نے نہایت سنجیدگی سے ان دونوں کے چہروں کے تاثرات کا جائزہ لیا اور پھر ٹھہر ٹھہر کر بولنا شروع کیا۔

"میں آپ لوگوں کی اپنے لیے بے تحاشا محبت سے واقف بھی ہوں اور اس کے لیے اللہ تعالیٰ کا شکر گزار بھی کہ اگر اس نے مجھے بچپن میں ماں باپ جیسی نعمت سے محروم کیا تھا تو آپ بزرگوں کی صورت میں اس محرومی کا بہت اچھی طرح ازالہ بھی کیا۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی عار بھی نہیں ہے کہ آپ کی محبتوں میں اتنی طاقت ہے کہ اگر آپ مجھے حکم دیں تو میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر خود کو اس چار دیواری تک محدود کرنے کے لیے تیار ہوں لیکن اس کے بعد کیا ہوگا؟ میں، میں نہ رہوں گا، بس ایک ایسا چلتا پھرتا مُردہ بن جاؤں گا جو روح اور دل دونوں سے محروم ہو۔ یہ میں بھی جانتا ہوں کہ زندگی انسان کو صرف ایک بار ہی ملتی ہے اور ہمیں اس کی قدر کرنی چاہیے لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ ہم چاہے کتنی بھی احتیاط سے کام لیں، لیکن ایک دن بہرحال مرنا ہے... تو پھر کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ ہم کچھ اس طرح جی کر مریں کہ جینے کا حق ادا ہو جائے اور ہمارے مرنے پر لوگوں کو یہ نہ لگے کہ زمین کو ایک ناکارہ بوجھ سے نجات مل گئی۔" اس نے اپنے حق میں بہت مختصر دلائل دیے تھے لیکن لہجے میں کچھ ایسی تاثیر تھی کہ مختار مراد اور آفرین رانا اپنی جگہ خاموش بیٹھے رہ گئے۔

"میرا بیٹا بالکل درست کہہ رہا ہے۔ یہ وہ نمائشی پرندہ نہیں ہے جسے آپ سنہری پنجرے میں قید کر کے خود کو اور

اپنے مہمانوں کو اس کی خوب صورتی سے محظوظ کر سکیں۔ یہ شاہین ہے جس کی شان ہی اونچی اڑان بھرنے میں ہے اور یہ خوش رنگ و قیمتی پنجرے کے بجائے چٹانوں کی سخت زندگی میں ہی خود کو زیادہ خوش اور آرام دہ محسوس کرتا ہے۔" ان تینوں کو معلوم ہی نہیں ہو سکا تھا کہ کب لیاقت رانا وہاں پہنچے تھے۔ ان کی آواز نے کمرے میں چھایا سکوت توڑا تو ہی وہ تینوں چونک کر ان کی طرف متوجہ ہوئے۔ شہریار لپک کر ان کے قریب پہنچ گیا اور انہیں سہارا دیا۔ پے در پے صدموں اور طویل علالت نے انہیں بہت کمزور کر دیا تھا چنانچہ وہ اپنے کمرے سے یہاں تک آنے اور تھوڑا سا بولنے میں ہی بُری طرح ہانپ گئے تھے۔

"آپ کو یہاں اس طرح نہیں آنا چاہیے تھا۔ ہم لوگوں کو اپنے کمرے میں بلوا لیتے۔ خدانخواستہ اگر چکرا کر گر جاتے تو کیا ہوتا۔" آفرین رانا بھی ان کے قریب پہنچیں اور خفگی کا اظہار کرتے ہوئے ان کا دوسرا بازو تھام لیا۔ شہریار اور وہ مل کر انہیں صوفے تک لے آئے۔ انہوں نے بیگم کی خفگی کے جواب میں انہیں صرف ایک مسکراہٹ سے نوازنے کے سوا کچھ نہیں کہا اور ان کا پیش کردہ پانی کا گلاس تھام کر اس میں سے دو گھونٹ بھرے اور گلاس واپس کرتے ہوئے براہِ راست انہیں مخاطب کرتے ہوئے بولے۔

"تمہیں معلوم ہے آفرین... ابھی جب شہریار نے مجھے اپنے بازوؤں کا سہارا دیا تھا تو مجھ بوڑھے کو یہ سہارا بہت اچھا لگا تھا لیکن پھر بھی میں نے یہ نہیں سوچا کہ اپنے لیے اسے اس کے مشن سے روک لوں کیونکہ اگر میں نے اس وقت یہ قربانی دے دی تو یقیناً مجھ جیسے بہت سے دوسرے بوڑھے والدین سے ان کے سہارے چھننے سے بچ جائیں گے۔" ان کے الفاظ نے آفرین رانا کو نظریں جھکا دینے پر مجبور کر دیا۔

"ٹھیک ہے رانا صاحب! ہمیشہ کی طرح آپ جیتے میں ہاری۔ میں نے اپنا مشقتوں سے پالا بیٹا آپ کے کہنے پر دوسری ماؤں کے کلیجے ٹھنڈے کرنے کے لیے آزاد کیا۔" ان کی آواز اگرچہ صاف تھی لیکن شہریار جانتا تھا کہ ان کی بھیگی آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک ہوگی۔ اس نے بے ساختہ ہی انہیں گلے سے لگا لیا۔ وقت کے ان لمحوں میں لفظ خاموش تھے لیکن قربانی کی ایک ایسی لازوال داستان رقم ہو رہی تھی جسے شاید کبھی تاریخ کے صفحوں کا حصہ نہیں بننا تھا لیکن وقت خود گواہ رہتا کہ شہریار عادل کے خاندان نے ارضِ وطن کے لیے کیا داؤ پر لگا دیا تھا۔

☆☆☆

"فصل کا کام کیسا چل رہا ہے بہرام؟"

"ایک دم فسٹ کلاس صاحب۔ زمین بالکل تیار ہے۔ آپ چاہو تو راؤنڈ مار کر دیکھ سکتے ہو۔" بہرام کی خوشامدانہ آواز سنائی دی۔

"ہاں، راؤنڈ تو مجھے مارنا پڑے گا۔ معلوم ہوا ہے کہ چودھری صاحب ملک سے باہر ہیں اور ان کی غیر موجودگی میں مجھے ہی سب کچھ دیکھنا ہوگا۔" یہ عابد انصاری تھا۔ ہمیشہ کی طرح بے شکن لباس اور آنکھوں پر لگے خوب صورت فریم کے چشمے کے ساتھ نہایت معزز اور نفیس نظر آنے والا آدمی... جس سے ملتے ہی لوگ اس کے لیے اپنے دل میں پسندیدگی کے جذبات محسوس کرتے تھے۔ شہزادی کو بھی وہ کافی اچھا آدمی لگا تھا اور اس کے بنگلے پر ملازمت کے مختصر عرصے میں وہ یہی سوچتی رہی تھی کہ شہریار نے آخر اسے عابد انصاری پر نظر رکھنے کی ذمے داری کیوں سونپی ہے؟ اس کا ذہن تسلیم ہی نہیں کر سکا تھا کہ یہ اتنا اچھا نظر آنے والا آدمی بھی کوئی مجرم ہو سکتا ہے۔ لیکن بہرحال وہ حتی الامکان شہریار کے حکم کی پیروی کر رہی تھی۔ یہاں اسے خصوصیت سے کوئی بہت بڑی ذمے داری نہیں سونپی گئی تھی اور ایسا بہرام کی وجہ سے ہوا تھا لیکن وہ بنگلے کے مختلف حصوں میں اپنی موجودگی کا جواز بنائے رکھنے کے لیے ہاتھ میں صفائی کا کپڑا اٹھائے فرنیچر وغیرہ کی جھاڑ پونچھ میں لگی رہتی تھی۔ اس کی کوشش ہوتی تھی کہ بنگلے کے اس حصے میں رہے جہاں عابد انصاری موجود ہو۔ اب تک اس کی تگ و دو کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا تھا۔ البتہ اس نے اپنی کوشش جاری رکھی تھی۔

اب بھی وہ عابد انصاری کے کمرے کی کھڑکی کے بالکل قریب کھڑی ایک شوپیس کو کپڑے سے رگڑ کر چمکاتی ہوئی اس کی بہرام کے ساتھ جاری گفتگو پر کان لگائے ہوئے تھی اور ابتدا میں ہی حیران ہو گئی تھی کہ عابد انصاری کو کسی فصل سے کیا غرض ہے؟ چودھری اگر گاؤں میں موجود نہیں بھی تھا تو یہ کوئی ایسی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ اس کا اکثر ہی ادھر اُدھر آنا جانا لگا رہتا تھا اور اس کی عدم موجودگی میں بخشی اللہ رکھا اس خوبی سے سارے انتظامات سنبھالتا تھا کہ کسی مزارعے کو ذرا بھی تساہل کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ چودھری کی موجودگی کی صورت میں بھی عموماً سارا انتظام اسی کے ہاتھ میں ہوتا تھا اور خود چودھری کو بھی کسی نے ان معاملات میں زیادہ سر کھپاتے نہیں دیکھا تھا چنانچہ اب چودھری کی عدم موجودگی میں عابد انصاری کا فصل کے لیے فکر مند ہونا اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ ویسے سمجھ تو اسے چودھری اور انصاری کی دوستی کی وجہ بھی

نہیں آئی تھی۔ اس کے نزدیک وہ دونوں ایک دوسرے سے قطعی مختلف لوگ تھے۔ اس لیے ان کی دوستی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا لیکن پھر بھی ان کی دوستی تھی تو اس کی کوئی نہ کوئی وجہ بھی تھی اور اسے اسی وجہ تک پہنچنا تھا۔ دوسری طرف بہرام اور عابد انصاری کے درمیان گفتگو جاری تھی۔

"آپ فکر مند مت ہوں صاحب! پہلے کی طرح سب کام ٹھیک چل رہا ہے۔ آپ چودھری صاحب کو تو جانتے ہی ہیں، اگر ذرا بھی گڑبڑ ہوئی تو وہ سب کی چمڑی کرادیں گے۔"

بہرام جو کہہ رہا تھا اس میں کوئی شک نہیں تھا۔ بالے کی بیوی کی حیثیت سے شہزادی خود ایسے کئی واقعات سے واقف تھی۔ چودھری کے اکثر معتوبین کو بالے ہی کے ہاتھوں سزا ملتی تھی۔ وہ تھا بھی ذرا اذیت پسند آدمی چنانچہ دل کھول کر ظلم ڈھاتا تھا۔ بعد میں اللہ نے اس کی رسی کھینچی تو وہ دردناک انجام سے دوچار ہوا۔ شہزادی کو اس کی معذوری کے وہ دن یاد تھے جب وہ بے بس سا اپنی چارپائی پر پڑا رہتا تھا۔ ان دنوں اس سے دن رات کام لینے والے چودھری نے بھی اسے فراموش کر دیا تھا اور اس کے علاج معالجے کے لیے کسی قسم کی مدد نہیں کی تھی۔ مایوسی بالے کو تاطی والا کے جعلی پیر کی خانقاہ تک لے گئی اور وہ خانقاہ میں لگائی جانے والی آگ میں جل کر بھسم ہو گیا۔ یوں اسے اپنے ڈھائے گئے مظالم کی ٹھیک ٹھاک سزا دنیا ہی میں مل گئی۔ آگے حشر میں اس کے ساتھ کیا سلوک ہونا تھا، یہ تو اللہ ہی جانتا تھا۔

"یہ بات تو میں بھی اچھی طرح جانتا ہوں کہ چودھری صاحب کتنے سخت مزاج بندے ہیں لیکن تم یہ نہیں جانتے کہ مجھے جنھیں جواب دینا ہوتا ہے، وہ کیسے لوگ ہیں۔ اسی لیے میں ذرا سی بھی کسر نہیں چھوڑنا چاہتا۔" عابد انصاری خاصا متفکر محسوس ہو رہا تھا پھر اس کی بات بھی چونکا دینے والی تھی۔ بھلا چودھری کی فصل کے سلسلے میں عابد انصاری کس کے سامنے جواب دہ تھا، یہ شہزادی الجھن میں پڑ گئی۔

"ہم تو اپنی طرف سے پورا خیال رکھتے ہیں صاحب، آگے آپ خود بھی اپنی تسلی کر سکتے ہیں۔" اس بار بہرام کا جواب بھی خاصا محتاط تھا۔ گویا وہ خود بھی اپنے اوپر مکمل ذمے داری لینے سے ڈر رہا تھا۔

"ہوں..." عابد انصاری نے ہنکارا بھرا اور ذرا سے توقف کے بعد بولا۔

"پہرے کا کام تو صحیح طریقے سے چل رہا ہے نا؟ یہ نہ ہو کہ اس لڑکے اکو کی طرح پھر کوئی کھیتوں کی طرف آ نکلے۔ اکو کا تو کوئی والی وارث نہیں تھا اس لیے اس کی موت پر زیادہ ہنگامہ بھی نہیں ہوا لیکن ہر بار ایسا نہیں ہوگا۔ جنگل میں آنے والا کوئی اور شخص بھی اکو جیسے انجام سے دوچار ہوا تو لوگوں کی توجہ اس طرف ہو جائے گی اور یہ ہم نہیں چاہتے۔ تمھیں خود بھی معلوم ہے کہ فصل کو خفیہ رکھنے کے لیے ہی چودھری صاحب نے اپنے نمک خوار ڈاکوؤں کی قربانی دی تھی۔ انھیں جان بوجھ کر اپنے آدمی کے ذریعے پولیس کو مخبری کروانی پڑی تھی کہ ڈاکو جنگل کے کس حصے میں رہ رہے ہیں، ورنہ اگر پولیس خود منہ اٹھا کر چلی آتی تو ڈاکوؤں کی تلاش میں جنگل کا چپا چپا چھان مارتی اور اسے ہمارے اتنے اہم راز سے آگاہی ہو جاتی۔ ایسا ہو جاتا تو ہم سب بے موت مارے جاتے۔ ایک طرف قانون پکڑ کرتا تو دوسری طرف وہ لوگ خون کے پیاسے ہو جاتے جن کے لیے ہم کام کر رہے ہیں۔ اس علاقے میں افیون کی کاشت کرنا کوئی مذاق نہیں ہے۔ شمالی پہاڑی علاقوں کی اس فصل کو یہاں اگانے کے لیے جو تجربات کیے گئے ہوں گے، ان پر بے اندازہ سرمایہ خرچ ہوا ہوگا اور ہماری غفلت سے اگر ان کا سرمایہ ڈوب جاتا ہے تو سمجھو ہماری خیر نہیں ہے۔" اپنے مخصوص نرم و دھیمے لہجے میں بولتا عابد انصاری جو انکشافات کر رہا تھا، انہوں نے شہزادی کو انگشت بدنداں کر دیا تھا۔

اسے غریب اکو کی موت یاد تھی۔ اپنی منگیتر رانی کی پراسرار موت کے بعد وہ نیم دیوانہ سا ہو گیا تھا۔ پھر ایک روز معلوم ہوا کہ اکو غائب ہے اور گاؤں میں کہیں دکھائی نہیں دے رہا۔ اگلے روز جنگل سے اس کی لاش ایسی حالت میں ملی کہ جانوروں نے اس کے جسم کو بھنبھوڑ ڈالا تھا۔ لوگوں نے یہی خیال کیا کہ دیوانہ اپنی دھن میں جنگل میں جا نکلا ہوگا اور حادثے کا شکار ہو گیا لیکن یہ تو عابد انصاری کی زبان سے سن کر اسے معلوم ہو رہا تھا کہ اکو کسی حادثے کا شکار نہیں ہوا تھا بلکہ اسے قتل کیا گیا تھا اور وہ بھی اس جرم کی پاداش میں کہ اس نے جنگل میں بنائے گئے افیون کے کھیت دیکھ لیے تھے۔ شہزادی لاکھ سادہ لوح اور ان پڑھ سہی لیکن یہ بات تو جانتی تھی کہ اس طرح چھپ کر افیون کاشت کرنا غیر قانونی کام ہے۔ ساتھ ہی اسے یہ بھی احساس ہو گیا کہ وہ ایک نہایت اہم راز سے واقف ہو گئی ہے، ایک ایسے راز سے جس کو جاننے کی پاداش میں اکو کو اپنی زندگی سے ہاتھ دھونے پڑے تھے اور شاید یہی وہ کام تھا جو شہریار نے اسے سونپا تھا۔ وہ جان گئی تھی کہ چودھری اور عابد انصاری میں کس قسم کا گٹھ جوڑ تھا اور اب اس کا مزید اس بنگلے میں رہنا ضروری نہیں تھا جہاں بہرام اس کی عزت کے درپے تھا۔ فیصلہ کرتے ہی وہ

تیزی سے اپنی جگہ سے حرکت میں آئی لیکن اس لمحے وہ یہ فراموش کر بیٹھی تھی کہ اس کے ہاتھ میں ایک نازک ڈیکوریشن پیس موجود ہے۔ اس کی ذرا سی غفلت سے ڈیکوریشن پیس اس کے ہاتھ سے پھسلا اور فرش پر گر کر چھناکے سے چکنا چور ہو گیا۔ فوراً ہی عابد انصاری کے کمرے کا دروازہ کھلا اور بہرام کسی خون خوار درندے کی طرح باہر نکلا۔

"تو یہاں کیا کر رہی ہے؟" شہزادی کو دروازے کے قریب پا کر اس نے غرا کر پوچھا۔

"صفائی... صفائی کر رہی تھی۔" اس نے شدید گھبراہٹ کے عالم میں جواب دیا۔

"تجھے کس نے کہا تھا صفائی کرنے کو؟ ابھی دو گھنٹے پہلے ہی تو سارے بنگلے کی صفائی ہوئی تھی۔" بہرام کے لہجے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔

"م... میں خود ہی کر رہی تھی۔ کاکا سویا ہوا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کروں تو ایسے ہی جھاڑ پونچھ کرنے لگی۔" اس نے خاصا معقول جھوٹ گھڑا لیکن گھبراہٹ پر قابو نہ پا سکی کہ اکو کی سوختہ لاش اب بھی اس کی یادداشت میں تازہ تھی۔

"جب تجھ سے کسی نے نہیں کہا تھا تو تجھے کیا لوڑ پڑی تھی۔ آئندہ زیادہ اپنی مرضی چلائی تو گردن سے پکڑ کر نوکری سے باہر کر دوں گا۔" بہرام نے آنکھیں نکالتے ہوئے اسے دھمکی دی۔

"بس کرو بہرام! کیوں بے چاری کو ڈانٹے جا رہے ہو۔" اچانک ہی عابد انصاری نے درمیان میں مداخلت کرتے ہوئے اس کی گلوخلاصی کروائی اور پھر براہ راست اس سے مخاطب ہو کر بولا۔ "جاؤ، ذرا میرے لیے اچھی سی چائے تو بنوا لاؤ۔"

"جی چنگا صاحب۔" شہزادی کی گویا جان میں جان آئی۔ وہ حکم ملتے ہی سرپٹ باورچی خانے کی طرف بھاگی۔

"اسے تم نے ملازمت پر رکھا تھا نا بہرام؟" اس کے جانے کے بعد عابد انصاری نے پُرخیال انداز میں بہرام سے دریافت کیا۔

"جی صاحب! آپ کو بتایا تھا نا کہ منشی اللہ رکھا نے اس کی سفارش کی تھی۔" اس نے جواب دیا۔

"مجھے یہ عورت گڑبڑ لگتی ہے۔" عابد انصاری نے اپنا شک ظاہر کیا۔

"ارے نہیں صاحب! ایسے ہی بے وقوف سی عورت ہے۔ پہلے اس کا گھر والا چودھری صاحب کے پاس کام کرتا تھا۔ ان کا بڑا خاص بندہ تھا۔ وہ مر گیا تو اس پر فاقوں کی نوبت آ گئی اسی لیے منشی جی نے سفارش کر کے اسے یہاں کام دلوا دیا۔" بہرام نے فوراً ہی اس کے خیال کی تردید کی۔

"وہ سب اپنی جگہ ہے لیکن میں بلاجواز اس پر شک نہیں کر رہا۔ یہ دیکھو کہ ڈیکوریشن پیس میرے کمرے کے دروازے کے بالکل قریب ٹوٹا ہے جبکہ جس کارنس پر یہ رکھا تھا، وہ یہاں سے کافی دور ہے۔ اس بات کا یہ مطلب بھی تو ہو سکتا ہے کہ صفائی کے بہانے وہ تمہاری اور میری باتیں سننے کی کوشش کر رہی ہو۔" عابد انصاری کے پُر دلیل شک پر بہرام کا منہ کھل گیا اور خود یقین نہ ہونے کے باوجود وہ شہزادی کے دفاع میں کچھ نہ کہہ سکا۔

"فی الحال خاموش رہو اور اس عورت پر نظر رکھو۔ جو بھی حقیقت ہوگی، وہ خود ہی کھل کر سامنے آ جائے گی۔" عابد انصاری نے اسے مشورہ دیا جس کو سن کر اس نے غائب دماغی سے سر ہلا دیا۔ شہزادی کو پانے کی تمنا برسوں سے اس کے سینے میں پل رہی تھی اور اب جبکہ یہ موقع ملنے والا تھا تو یہ مسئلہ سامنے آ گیا تھا۔ انصاری کا شک درست ثابت ہونے کی صورت میں اسے ہر حال میں شہزادی کو موت کے گھاٹ اتارنا پڑتا اور یوں اس کی ساری تمنائیں اور آرزوئیں اپنی موت آپ مر جاتیں۔ وہ سخت بے مزہ ہو گیا اور اس سمت دیکھنے لگا جہاں سے شہزادی چائے کی ٹرے ہاتھوں میں اٹھائے اسی طرف آتی دکھائی دے رہی تھی۔

☆☆☆

"یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔ جوتوں کے کارخانے کی آڑ میں چودھری جو گھناؤنا کام کر رہا تھا، وہ اس کے وارنٹ جاری کروانے کے لیے کافی ہے۔" شہریار اس وقت ایس ایس پی کے دفتر میں موجود تھا اور ذیشان کی زبانی چودھری کے کارخانے پر مارے جانے والے چھاپے کی تفصیلات سن کر اس نے یہ تبصرہ کیا تھا۔ چھاپا بہت کامیاب رہا تھا اور انھیں اپنی توقعات سے بڑھ کر کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ تہ خانے میں اتر کر تو وہ لوگ دنگ رہ گئے تھے کیونکہ وہ تو صرف یہ خیال کر رہے تھے کہ وہاں بڑی مقدار میں ہیروئن کا ذخیرہ موجود ہوگا جسے ڈائپرز میں چھپا کر خفیہ طریقے سے مارکیٹ میں بھیجا جاتا ہوگا... لیکن وہاں صرف اتنا معاملہ نہیں تھا۔ انھیں وہاں تیار شدہ ہیروئن کے علاوہ اس کی تیاری میں استعمال ہونے والے خام مال کی بھی بھاری مقدار ملی تھی اور ساتھ میں ایسے آلات و مشینری بھی جن کی مدد سے ہیروئن سازی کی جا سکتی۔ یعنی وہ کارخانہ صرف ہیروئن کی ایک ذخیرہ

گاہ ہی نہیں تھا بلکہ ہیروئن سازی کے لیے بھی استعمال ہورہا تھا اس لیے وہ کہہ سکتے تھے کہ انہوں نے دشمن پر بے حد کاری وار کیا تھا اور یقینی طور پر اسے اس وار سے اپنی کمر ٹوٹتی ہوئی محسوس ہوئی ہوگی۔

"وارنٹ تو بے شک جاری ہو جائیں گے لیکن گرفتاری کے لیے چودھری دستیاب بھی تو ہو۔ وہ چالاک لومڑ تو پہلے ہی خطرہ دیکھ کر بھاگ نکلا ہے۔" اس کی بات کے جواب میں ذیشان نے اسے یاد دلایا۔

"کوئی بات نہیں۔ وہ کب تک بھاگے گا۔ لوٹ کر اسے واپس تو یہیں آنا ہے اور اگر نہیں بھی آیا تو ہم انٹرپول کے ذریعے اسے گرفتار کرنے کی کوشش کریں گے۔ منشیات کے کاروبار سے منسلک کسی شخص کو دنیا میں کہیں بھی پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ جب ہم چودھری کے خلاف اتنے ٹھوس ثبوت پیش کریں گے تو امریکا خود اسے کان سے پکڑ کر ہمارے حوالے کرے گا۔ اگر فرض کرو کہ ایسا نہ بھی ہوا تو اب کم از کم چودھری ساری زندگی یہاں واپس نہیں لوٹ سکے گا۔ اگر ہم نے ڈھنگ سے کوشش کی تو اتنے خطرناک مجرم کی املاک بحق سرکار ضبط بھی کی جا سکتی ہیں۔ تم سوچو کہ ایسا ہو گیا تو کتنوں کا بھلا ہو جائے گا۔ میری تو پوری کوشش ہوگی کہ ساری زمینیں غریب مزارعوں میں تقسیم ہو جائیں تاکہ وہ اپنی محنت کا ڈھنگ سے معاوضہ تو حاصل کر سکیں۔" وہ اب بھی بے حد پرجوش اور پُرامید تھا۔ اس کے منصوبے سن کر ذیشان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی اور وہ اس کی طرف کسی بزرگ کی سی شفقت سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"میری دعا ہے کہ تمہاری ہر خواہش پوری ہو لیکن سچ کہوں تو میں خود بہت زیادہ پُرامید نہیں ہوں۔ میرا اصلی جنس کا تجربہ مجھے بتاتا ہے کہ چودھری جیسا ہر بڑا مجرم اپنے بچاؤ کے لیے پہلے سے ہی کوئی نہ کوئی تدبیر سوچ رکھتا ہے۔ حالات بھی اس بات کی نشاندہی کر رہے ہیں کہ چودھری کو خطرے کا ادراک تھا جب ہی وہ خود پر کوئی برا وقت آنے سے پہلے ملک سے فرار ہو گیا اور یہ مت سوچنا کہ وہ عجلت میں اپنا سارا مال و متاع یونہی چھوڑ کر بھاگ نکلا ہوگا۔ جو آدمی پیسے سے اتنی محبت کرے کہ اس کی خاطر اپنے ضمیر کا سودا کر ڈالے وہ کبھی بھی ایسی غلطی نہیں کر سکتا کہ اپنی کسی چوک کے نتیجے میں اپنی دولت سے محروم ہو جائے۔ چودھری نے بھی اس بات کا معقول انتظام کر رکھا ہوگا کہ جو کچھ، چاہے جس بھی طریقے سے اس نے کمایا ہے، اس کا ہی رہے۔ رقم تو یقیناً اس نے ویسے بھی ایک حد سے زیادہ اپنی حویلی میں نہیں رکھی ہوگی اور کہیں باہر کے ملک میں منتقل کر دی ہوگی۔ رہے کھیت اور باغات وغیرہ تو دیکھتے ہیں ان کا کیا معاملہ ہے۔" ذیشان نے اپنے خیالات سے اسے آگاہ کیا تو وہ بھی کچھ فکرمند نظر آنے لگا لیکن پھر فی الحال اس موضوع کو آئندہ کے لیے چھوڑ کر درپیش صورت حال پر گفتگو کرنے لگا۔

"موقع سے جو غیر ملکی گرفتار ہوا ہے اس نے کچھ بتایا؟"

"وہ کچھ بتانے کے لائق ہی نہیں ہے۔ تمہیں یہ جان کر حیرت ہوگی کہ وہ شخص مکمل طور پر گونگا اور بہرا ہے۔ ہم نے اسے دوسرے دو غیر ملکیوں کی لاشیں دکھا کر دھمکایا ہے جس کے نتیجے میں اس نے ایک کاغذ پر لکھ کر جواب دیا ہے۔ اپنے جواب میں اس نے بتایا ہے کہ وہ ہیروئن سازی کا ایک بہت بڑا ماہر ہے جو ایک پارٹی کے کہنے پر اپنے دو معاونین کی مدد سے وہاں ہیروئن کی تیاری کر رہا تھا۔ اس نے جب دیکھا کہ اس کے ساتھی گرفتار ہونے لگے ہیں تو یہی مناسب سمجھا کہ انہیں ہمیشہ کے لیے خاموش کر دے۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے اپنے دونوں معاونین کو گولی ماردی تھی اور اب ہیروئن تیار کرنے کا فارمولا صرف اس کے ذہن میں موجود ہے اور ہم اس لیے اس کی زبان نہیں کھلوا سکتے کہ وہ بول ہی نہیں سکتا۔ تشدد کے ذریعے بھی اسے کاغذ پر سب کچھ لکھ کر دینے کے لیے اس لیے مجبور نہیں کیا جا سکتا کہ وہ خاصا سن رسیدہ ہے اور چار برس پہلے اوپن ہارٹ سرجری سے گزر چکا ہے۔ زبردستی کی صورت میں وہ اپنی جان سے چلا جائے گا اور ہمارے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا۔"

"لاحول ولا قوۃ۔" ذیشان کی بات سن کر وہ منہ بنا کر بڑبڑایا۔ "دنیا بھی عجیب ہی لوگوں سے بھری پڑی ہے۔ بڈھا جب کسی قابل ہی نہیں ہے تو قبر میں لٹکے ہوئے پیروں کے ساتھ یہ سب کیوں کر رہا ہے... اس عمر میں دولت کما کر وہ کیا کرے گا؟" اسے گویا شدید شکوہ تھا۔

"ضروری نہیں کہ وہ یہ سب پیسے کے لیے کر رہا ہو۔ وہ کسی کاز سے بھی منسلک ہو سکتا ہے۔ وطن اور مذہب کے نام پر بعض دفعہ لوگ اپنا سب کچھ داؤ پر لگانے میں بھی حرج نہیں سمجھتے۔ تم اپنی مثال سامنے رکھو۔ ہم نے تم سے کتنی بڑی قربانی مانگی ہے لیکن تم بغیر کسی لالچ کے صرف اس لیے تیار ہو گئے کہ تم اپنے ملک و قوم کی خاطر کچھ کرنا چاہتے ہو۔ ایسے ہی وہ بھی کسی مقصد سے جڑا ہوگا۔"

"میرا معاملہ الگ ہے۔ میں کسی کا برا نہیں چاہتا بلکہ صرف برائی کا خاتمہ چاہتا ہوں۔" اس نے ذیشان کے خیال سے اختلاف کیا۔

"ایسا تم سوچ رہے ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایک قوم کا ہیرو عام طور پر دوسری قوم کا ولن ہوتا ہے۔ را اور موساد والے ایسے ہی تو تمہاری جان کے در پے نہیں ہو گئے۔ ان کے نزدیک تم ایسے شخص ہو جس نے انہیں نقصان پہنچایا ہے اور جس سے انہیں مزید نقصان پہنچنے کا احتمال ہے اسی لیے وہ تمہیں صفحۂ ہستی سے مٹا دینا چاہتے ہیں۔" ذیشان نے دلیل دی تو اسے قائل ہونا ہی پڑا اور وہ ہار مانتے ہوئے بولا۔

"ٹھیک ہے۔ میں تمہاری بات سے اتفاق کرتا ہوں لیکن اب یہ سوچو کہ اگر وہ گونگا بہرا ہمیں کچھ نہیں بتائے گا تو ہم مزید آگے کس طرح بڑھیں گے؟ ہماری اصل جنگ تو ان لوگوں سے ہے جو اس سارے کھیل کے پیچھے ہیں لیکن ہر بار ایسا ہوتا ہے کہ ہم چند مہروں کو پیٹنے کے بعد پھر اندھیرے میں آ کھڑے ہوتے ہیں۔ اسٹیشن کی گرفتاری ہو یا نالی والا میں کی جانے والی کارروائی، ہمارے ہاتھ دو چار کرائے کے ٹٹوؤں کے سوا کچھ بھی نہیں آیا تاب۔" وہ کچھ جھنجلایا ہوا تھا۔

"دشمن چالاک ہو تو ایسے ہی حالات پیش آتے ہیں۔ مجھے اور کرنل صاحب کو بھی احساس ہے کہ ہماری اب تک کی کارروائیاں زیادہ سودمند ثابت نہیں ہوئی ہیں۔ ہم ان کی صفوں میں انتشار پیدا کرنے میں تو بے شک کامیاب رہے ہیں لیکن انہیں جڑ سے اکھاڑ کر نہیں پھینک سکے ہیں۔ ہماری تمام تر کوشش کے باوجود واقعی ایسا ہوتا ہے کہ ہم چند قدم چلنے کے بعد اندھیرے میں جا کھڑے ہوتے ہیں۔ اور شاید اسی ناکامی کے سدباب کے لیے کرنل صاحب نے تمہیں اندھیرے کا تیر بنانے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہاں سے روانگی سے قبل کرنل صاحب نے مجھے مختصراً جو کچھ بتایا ہے، اس سے مجھے یہی اندازہ ہو سکا ہے کہ وہ تمہاری صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے بہت خاموشی سے تمہیں دشمن کے خلاف استعمال کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ یہ مت سمجھنا کہ وہ تمہارے ساتھ کوئی دھوکا کر رہے ہیں اور اپنی فورس کے جوانوں کو بچانا چاہتے ہیں۔ میری ان سے تمہارے سلسلے میں جو گفتگو ہوئی ہے، اس میں انہوں نے تمہارے خلوص کو بے حد سراہا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ جو اسپرٹ انہوں نے تمہارے اندر دیکھی ہے، وہ ہر کسی میں نہیں ہوتی۔ اور یہ ہے بھی حقیقت... تمہاری جگہ اگر کوئی اور بندہ ہوتا تو سکون سے اپنی بندھی ٹکی نوکری کرتا۔ یہ جو تم ہر جگہ اپنی ٹانگ اڑاتے پھرتے ہو تو ایسا تمہاری بے چین روح کی وجہ سے ہے جسے ایک اے سی کی کرسی نہیں سنبھال سکی۔ تم جیسا بندہ آزاد رہ کر جس طرح اپنی صلاحیتوں کو استعمال کر سکتا ہے، بندھی ٹکی نوکری میں اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" ذیشان کھل کر اس کی صلاحیتوں کا اعتراف کر رہا تھا۔

"یہ سب تو تم لوگوں کا خیال ہے لیکن میں اتنا بھی آزاد نہیں ہوں۔ کچھ رشتے اور لوگ دنیا میں ایسے ہیں جن کی فکر سے میں چاہتے ہوئے بھی خود کو آزاد نہیں کر سکتا اس لیے تم لوگوں کو میری عدم موجودگی میں ان کا خاص خیال رکھنا ہوگا۔" اس نے نہایت صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے واضح کر دیا کہ وہ کوئی سپرمین نہیں ہے جو انسانی کمزوریوں سے آزاد ہو۔

"اس سلسلے میں تم فکر نہ کرو۔ کرنل صاحب پہلے ہی تمہیں یقین دہانی کروا چکے ہیں۔ میں خود بھی ذاتی طور پر تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ جن لوگوں کی تمہیں فکر ہے، سی ایف پی ہر ممکن طریقے سے ان کا خیال رکھے گی۔" ذیشان نے فوراً اس سے وعدہ کیا۔

"مجھے یقین ہے اسی لیے تو میں اتنی بڑی بازی کھیلنے کے لیے تیار ہو گیا ہوں... لیکن بار بار یقین دہانی اس لیے چاہ رہا ہوں کہ مجھے لگتا ہے، میں ایک گرداب میں داخل

ہونے والا ہوں جس سے بآسانی باہر نہیں آسکوں گا اور نہ ہی مجھے اتنی مہلت مل سکے گی کہ میں اپنے پیاروں کا ذاتی طور پر خیال رکھ سکوں، اس لیے ان کی طرف سے مطمئن ہونا چاہتا ہوں۔‘‘ اس نے اس بار بھی صاف گوئی سے کام لیا تھا۔

’’میری اور تمہاری دوستی اگرچہ بہت پرانی نہیں ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس دوستی کی بنیاد اتنی مضبوط ہے کہ تم مجھ پر اعتماد کرسکو۔ تمہیں یا تمہارے پیاروں کو کسی بھی صورت میں تنہا نہیں چھوڑا جائے گا۔ کم از کم مجھے تم ہر صورت میں اپنا خیر خواہ پاؤ گے۔‘‘ ذیشان اس کی کیفیت کو سمجھ سکتا تھا۔ وہ اپنی شخصیت کی قربانی دینے جارہا تھا تو اسے اتنا تو حق حاصل تھا کہ اپنے لیے کچھ یقین دہانیاں جمع کرلے اس لیے ہر ممکن طریقے سے اسے مطمئن کرنے کی کوشش کررہا تھا۔

’’اگر تمہیں لگتا ہے کہ تمہارے لیے یہ کام ناممکن ہے یا تم کسی قسم کے شکوک و شبہات کا شکار ہو تو میرے سامنے کھل کر اس کا اعتراف کرسکتے ہو۔ ابھی صرف ایک منصوبہ بنایا گیا ہے، عملی طور پر کوئی خاص اقدامات نہیں کیے گئے ہیں۔ اس لیے تم اگر چاہو تو پیچھے بھی ہٹ سکتے ہو۔ کرنل صاحب سے میں خود بات کرلوں گا۔‘‘ ذیشان نے ایک ایسی بھی بات کہہ دی کہ اگر اس کے دل میں کہیں کوئی شک ہو تو کھل کر سامنے آجائے اور وہ مجبوری میں کوئی قدم نہ اٹھائے۔

’’مجھے اگر پیچھے ہٹنا ہوتا تو ہامی ہی نہیں بھرتا۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو وقتی جذبات کے تحت بلا سوچے سمجھے کمزور فیصلے کرتے ہیں۔‘‘ اس کا لہجہ خود بخود سرد ہوگیا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ ذیشان کی پیش کش میں اس نے اپنے لیے ہتک محسوس کی ہو۔ بہرحال، اس نے سلسلۂ کلام جاری رکھا۔

’’میں نے کرنل صاحب سے جو وعدہ کیا اس پر قائم ہوں اسی لیے اپنی کچھ ذمے داریاں نمٹانے کی کوشش کررہا ہوں۔ اپنی فیملی کے مفادات کے بارے میں سوچنے کے علاوہ میں نے اپنے دو خاص بندوں مشابرم خان اور جگنو کو تمہارا نمبر اس ہدایت کے ساتھ نوٹ کروا دیا ہے کہ اگر میں دستیاب نہ ہوں یا کسی حادثے وغیرہ کا شکار ہوجاؤں تو وہ ہر وہ اطلاع جو مجھے دی جانے والی ہو تمہیں دے دیں۔ میں نے انہیں یہ بھی ہدایت کردی ہے کہ وہ تم سے ہر ممکن تعاون کریں اور تمہارے احکامات کی بھی اسی طرح پیروی کریں جیسے میرے کہے پر عمل کرتے ہیں۔‘‘

’’ٹھیک یو سو مچ شہریار! تمہارے اس خلوص کو میں ہمیشہ یاد رکھوں گا۔‘‘ ذیشان نے فوراً اس کا شکریہ ادا کیا۔

’’تمہیں شکریہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے صرف اپنا فرض ادا کیا ہے۔‘‘ اس کا لہجہ اب بھی روکھا تھا۔

’’آئی ایم ویری سوری یار! مجھے معلوم ہے کہ تم ہرٹ ہوئے ہو لیکن بعض باتوں کا وقت پر ہی واضح ہوجانا بہتر ہوتا ہے، ورنہ آنے والے وقت میں آدمی کے پاس صرف پچھتاوا ہی رہ جاتا ہے۔‘‘ ذیشان نے کھلے دل سے اس سے معذرت طلب کرلی۔

’’اٹس او کے۔ اب ہمیں یہ باتیں چھوڑ کر اصل موضوع پر بات کرنی چاہیے۔ چودھری کے کارخانے پر کامیاب ریڈ اپنی جگہ لیکن میں حیران ہوں کہ وہاں سی ایف پی کے گارڈز ہونے کے باوجود معاملہ پہلے کیوں نہیں کھلا اور ہمیں اطلاع باہر سے کیوں ملی؟‘‘ اس نے تیزی سے موضوع بدل دیا۔

’’میں نے تمہیں پہلے بھی بتایا تھا کہ سی ایف پی ایک پرائیویٹ سیکیورٹی ایجنسی کی آڑ میں کام کررہی ہے۔ چنانچہ یہاں ہمارے خاص آدمیوں کے علاوہ بہت سے عام لوگ بھی ملازمت کرتے ہیں۔ چودھری نے جب اپنے کارخانے کی سیکیورٹی کے لیے گارڈز کی درخواست کی تو اسے ایک عام نوعیت کا معاملہ سمجھا گیا چنانچہ خاص ملازمین کے بجائے عام افراد کو ہی ڈیوٹی پر بھیج دیا گیا۔ چودھری نے ان گارڈز میں سے دو کو پیسے کے بل بوتے پر خرید لیا۔ یہ گارڈز دن اور رات کی شفٹوں میں تہ خانے والے حصے کے باہر ڈیوٹی دیتے تھے۔ انہوں نے ہمیں اپنی ڈیلی رپورٹ میں اس بات سے تو آگاہ کردیا کہ کارخانے کے تہ خانے کو بچوں کے ڈائپرز کی تیاری کے لیے استعمال کیا جارہا ہے لیکن دیگر مشکوک حرکات و سکنات کے بارے میں کوئی رپورٹ نہیں دی... بلکہ یہ سمجھو کہ وہ وہاں چودھری کے مفادات کا بھرپور تحفظ کررہے تھے اور ان کی موجودگی کے باعث کسی کی مجال نہیں تھی کہ بلا اجازت تہ خانے میں داخل ہوسکے۔‘‘ ذیشان نے اس پر صورتِ حال واضح کی۔

’’ٹھیک ہے یہ تو میں سمجھ گیا لیکن ابھی تک مجھ پر اپنے کام کی نوعیت واضح نہیں ہوئی ہے، میرا نام اور حلیہ بدل کر آخر مجھ سے کیا کام لیا جائے گا؟‘‘ اس نے بے شک کرنل صاحب کے سامنے ہامی بھرلی تھی لیکن فطری طور پر ذہن میں پیدا ہونے والے تجسس کی وجہ سے سوال کرنے پر مجبور تھا۔

’’کام تم وہی کرو گے جو اب تک کرتے رہے ہو لیکن تمہارا دائرۂ کار اور اختیارات بڑھ جائیں گے۔ ہمارے سامنے سب سے بڑا اور واضح ہدف تو چودھری کی شکل میں ہی ہے۔ وہ وطن واپس آجاتا ہے تو اس بار ہم نے اس پر براہِ راست ہاتھ ڈالنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ کسی بھی سطح کے ردِعمل کی پروا کیے بغیر ہم اسے خاموشی سے اٹھالیں گے اور پھر اس سے حاصل ہونے والی معلومات کی روشنی میں کارروائی کی جائے گی جس میں تم کلیدی کردار ادا کرو گے... کیونکہ یہ بات تو بالکل واضح ہے کہ چودھری کے انکشافات کی روشنی میں جو لوگ سامنے آئیں گے، ہم ان پر قانونی طریقے سے ہاتھ نہیں ڈال سکیں گے اور جو بھی کیا جائے گا خفیہ طریقے سے ہی کیا جائے گا۔ دوسری صورت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ چودھری یہاں کے حالات اپنے لیے ناموافق دیکھ کر واپس ہی نہ آئے، ایسے میں تمہیں اس کے پیچھے جانا ہوگا۔ ہر دو صورتوں میں تمہیں تمہاری ڈیمانڈ کے مطابق افرادی قوت اور دیگر سہولیات فراہم کرنے کی پوری کوشش کی جائے گی۔‘‘

ذیشان نے پہلی بار کھل کر اسے بتایا تو اس پر بہت کچھ واضح ہوگیا۔ اپنی اصل شخصیت کے ساتھ وہ دشمن عناصر کے خلاف برسرِپیکار تو تھا لیکن ان کی نظروں میں آنے کی وجہ سے ایک طرف تو جہاں اس کے لیے خطرات بہت زیادہ بڑھ گئے تھے، وہیں وہ کھل کر ان کے خلاف کچھ کرنے سے معذور ہوگیا تھا۔ پچھلے دنوں نور کوٹ سے لاہور آتے ہوئے اس کی گاڑی کا تعاقب اور اس کی سرگرمیوں سے واقف رہنے کے لیے مسلسل استعمال کی جانے والی ڈیوائس اس حقیقت کا بین ثبوت تھے۔ ماریا کے اپنے انجام تک پہنچنے کے باوجود وہ یقین سے یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ آئندہ بھی اسے گھیرنے کے لیے کوئی اور حربہ استعمال نہیں کیا جائے گا۔ وہ کسی صورت نہیں بھول سکتا تھا کہ موساد نے اسے قابو میں رکھنے کے لیے اپنی خوب رو اور ذہین ایجنٹ کلارا اینڈرسن کو ڈاکٹر ماریا کے روپ میں کس چالاکی کے ساتھ اس کی زندگی میں شامل کیا تھا۔ اگر کچھ ایسے اتفاقات نہ ہوتے کہ وہ ماریا کی ذات پر شک نہ کرپاتا تو آج بھی وہ نہایت چالاکی سے اپنا کام انجام دیتی رہتی۔ یہ وہی تو تھی جس کی سفارش پر اس نے عابد انصاری کی بطور فاریسٹ آفیسر تعیناتی کی حمایت کی تھی۔ عابد انصاری کی ظاہری شخصیت کچھ ایسی تھی کہ وہ دھوکا کھا گیا تھا اور اس کے ساتھ پچھلے فاریسٹ آفیسر باجوہ کی طرح کی سختیاں روا نہ رکھی تھیں۔ یہاں تک کہ اس نے چند درختوں کو قانون کے مطابق کاٹ کر ضلع سے باہر بھیجنے کی اجازت چاہی تھی تو اس نے اس پر بھروسا کرتے ہوئے معمول کی چیکنگ بھی نہیں کروائی تھی۔ اب یہ تو عابد انصاری اور اس کے ساتھی ہی جانتے تھے کہ بظاہر قانون کے دائرے میں رہ کر وہ لوگ کون سے گل کھلا رہے تھے لیکن جو بھی بات تھی، یہ طے تھا کہ گڑبڑ خاصی بڑی نوعیت کی ہے ورنہ اتنا بڑا گیم نہ کھیلا جاتا۔

ماریا کا خیال ذہن میں آتے ہی اسے یاد آیا کہ ابھی تک اس نے اس کے سلسلے میں کوئی قدم نہیں اٹھایا ہے۔ وہ ساری دنیا کو اس کی حقیقت نہیں بتا سکتا تھا البتہ ماموں اور ممانی کو شریکِ راز کرلیا تھا... اور اب انہیں اعتماد میں لیتے ہوئے ذیشان کی مدد سے باقی منصوبے پر بھی عمل کیا جاسکتا تھا چنانچہ کافی غور و خوض کے بعد ذیشان سے مخاطب ہوا۔

’’بات کافی واضح ہوگئی ہے اس لیے میں بھی تمہیں ایک مشورہ دے سکتا ہوں۔ وہ یہ کہ مجھے میدانِ عمل سے غائب ظاہر کرنے کے لیے مجھ پر قاتلانہ حملے کا ڈراما کرنے کے مقابلے میں اتفاقی حادثے کا سہارا لینا زیادہ مناسب رہے گا کیونکہ میرے جتنے بھی دشمن ہیں، ان سب کا کسی نہ کسی طور ایک دوسرے سے گٹھ جوڑ ہے اس لیے جعلی قاتلانہ حملہ ظاہر کرنے کی صورت میں وہ فوراً اندازہ لگالیں گے کہ ہم کوئی گہری منصوبہ بندی کررہے ہیں۔ اتفاقی حادثے نے اگر انہیں چونکایا بھی تو بالآخر وہ یقین کرنے پر مجبور ہوجائیں گے۔ انہیں یقین دلانے کے لیے ٹھوس ثبوتوں کی فراہمی تو تم نے یقینی بنانے کا سوچ ہی لیا ہوگا۔‘‘

’’ہاں، اس سلسلے میں ہماری تیاری مکمل ہے۔ اتفاق سے قسمت نے بھی ہمارا ساتھ دیا ہے۔ میں تمہیں بتانے ہی والا تھا کہ اشیش کمار نے ہماری کسٹڈی میں خودکشی کی کوشش کی ہے۔ خودکشی کے لیے اس کے پاس کوئی ذریعہ تو تھا ہی نہیں اس لیے اس نے دیواروں سے ہی بے طرح اپنا سر اور چہرہ ٹکرا کر مرنے کی کوشش کی۔ اس کوشش میں وہ کامیاب تو نہیں ہوسکا لیکن سر پر ایسی شدید ضرب لگی کہ وہ کوما میں چلا گیا۔ اپنی کوشش کے نتیجے میں اس نے چہرے کے خدوخال الگ خراب کروا لیے لیکن ہمارے لیے خاصی آسانی ہوگئی ہے۔ اس کا قد و قامت ایسا ہے کہ ہم آسانی سے اسے تمہاری جگہ دے سکتے ہیں۔ اس کے فنگر پرنٹس پہلے ہی تفتیش کی سختیوں سے گزرتے ہوئے ضائع ہوچکے ہیں۔ غرضیکہ ہم اسے تمہاری جگہ دے دیں گے تو ثبوت کی تلاش کرنے والوں کو کسی طور یہ نہیں معلوم ہوسکے گا کہ اسپتال میں داخل شخص تمہاری جگہ کوئی اور ہے۔ باقی نگرانی وغیرہ سخت رکھی جائے گی تو کسی کو زیادہ مداخلت کا موقع ہی نہیں مل سکے گا۔‘‘

ذیشان خاصا مطمئن لگ رہا تھا البتہ اس کے لیے اشیش کمار کے بارے میں ملنے والی اطلاع تھوڑی سی مایوس کن تھی لیکن پھر اس نے خود کو یہ سمجھا کر مطمئن کرلیا کہ اتنے عرصے میں اشیش سے جتنی معلومات حاصل کی جاسکتی تھیں کی

جا چکی تھیں اور وہ معلومات اس اعتبار سے زیادہ سودمند بھی ثابت نہیں ہوئی تھیں کہ اشیش کے بتائے ہوئے کسی بھی ٹھکانے پر وہ اس کے کسی ساتھی کو گرفتار کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے تھے۔ چالاک دشمن نے اپنے ساتھی کے پکڑے جانے کی خبر ملتے ہی اپنا ہر ٹھکانا چھوڑ دیا تھا۔

"او کے... یہ تمہارے مسائل ہیں۔ تمہاری مرضی ہے کہ تم انہیں کس طرح ہینڈل کرو۔ مجھے اپنے مسائل سے نمٹنا ہے اور ان مسائل میں سے ایک اہم مسئلہ ماریا کی غیر موجودگی کا جواز پیش کرنا ہے۔ میں نے پچھلی تاریخوں میں اس کا طلاق نامہ تیار کروا لیا ہے۔ اس طلاق نامے کی کاپی میں بھائی جان کو دے دوں گا اس طرح وہ بعد میں لوگوں کو ماریا کی عدم موجودگی کا جواز آسانی سے دے سکیں گے۔ میڈیا کی انوالمنٹ کی صورت میں بھی ایک مربوط کہانی تیار ملے گی اور میری فیملی کو زیادہ پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔" ذیشان کی دی ہوئی اطلاع پر کوئی بھی تبصرہ کرنے کے بجائے اس نے گفتگو کو اپنی ذات تک ہی محدود رکھا۔

"میں تمہیں ایک بار پھر یقین دلاتا ہوں کہ تمہارے پیچھے ہم تمہاری فیملی سے غافل نہیں رہیں گے۔ سی الیف بی کے ملازم کے علاوہ میں اپنی ذاتی حیثیت میں بھی ان لوگوں کا پورا پورا خیال رکھوں گا اور کسی صورت تمہارے مفادات پر ضرب نہیں پڑنے دوں گا۔" ذیشان کی پُرخلوص یقین دہانی نے اسے خاصا مطمئن کر دیا۔ حالانکہ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اس کا خاندان اتنا کمزور نہیں ہے کہ آسانی سے کوئی ان پر دباؤ ڈال سکے یا کسی طرح کا نقصان پہنچا سکے لیکن پھر بھی اسے اپنی فیملی کے لیے بے تحاشا محبت کی وجہ سے ان کی فکر تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ بڑھاپے اور صدموں سے کمزور ہو جانے والے ماموں اور بھائی کو زیادہ امتحانوں سے گزرنا پڑے۔ اس لیے بار بار ان کی فکر دامن گیر ہو جاتی تھی لیکن اس وقت اس نے خود کو خاصا مطمئن محسوس کیا۔ بہت دنوں بعد ایسا تھا کہ اس کے ذہن پر کوئی بوجھ بھی نہیں تھا۔ شاید ایسا اس لیے تھا کہ وہ اپنے لیے ایک راہ کا تعین کر چکا تھا ورنہ ذیشان کی بتائی ہوئی مختصر تفصیل سے ہی واضح تھا کہ آنے والا وقت اپنے جلو میں اس کے لیے بہت سے جھمیلے اور ہنگامے لے کر آ رہا ہے... پھر بھی وہ خوش تھا کہ اپنی فطرت کے مطابق کھل کر وہ سب کچھ کر سکے گا جو کرنا چاہتا ہے۔ اس کی مہم جو فطرت اسے سی این کے خول کو توڑ کر باہر نکل آنے کے خیال سے بہت خوش تھی۔

☆☆☆

پاکستان سے ملنے والی خبریں چودھری کے لیے پریشان کن تھیں۔ اس کی فیکٹری سیل کر دی گئی تھی اور ساتھ ہی اس کی گرفتاری کے وارنٹ جاری ہو گئے تھے۔ منشی اللہ رکھا نے اسے فون پر تفصیلات سے آگاہ کرتے ہوئے بتایا تھا کہ چھاپا کسی خفیہ سرکاری ایجنسی کے اہلکاروں نے مارا تھا جنہوں نے اپنی شناخت ظاہر نہیں کی اور اپنی کارروائی کرنے کے بعد یک دم ہی پس منظر میں چلے گئے تھے۔ ظاہری طور پر اب یہ کیس پولیس کے پاس تھا لیکن یہ بات بھی جا سکتی تھی کہ خفیہ ایجنسی نے اس معاملے پر اپنی نگاہ رکھی ہوئی۔ منشی خود احتیاطاً روپوش ہو گیا تھا۔ ورنہ کچھ بعید نہ تھا کہ چودھری کی غیر موجودگی میں اسے ہی گرفتار کر لیا جاتا۔ جیسا کہ فیکٹری کے منیجر... کو حراست میں لے کر زیر تفتیش رکھا گیا تھا۔ چودھری کو اس کی فکر نہیں تھی کیونکہ منیجر کچھ جانتا ہی نہیں تھا اور اس کا دائرہ کار جوتوں کے کاروبار تک ہی محدود تھا لیکن وہ خود اپنی فکر میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اس کے پاس دولت کی بے شک کوئی کمی نہیں تھی اور فارن بینکوں میں بھی ٹھیک ٹھاک رقوم موجود تھیں لیکن اصل راج پاٹ تو پاکستان میں ہی تھا۔ سونا اگلنے والی زمینیں اور نوٹوں کی بارش کرنے والے کارخانے اور فیکٹریاں چھوڑ کر وہ کس طرح کہیں اور رہ سکتا تھا۔ پھر دولت کمانے کی جو ایک اور راہ اسے ملی تھی، اس کا انحصار بھی اسی بات پر تھا کہ وہ پاکستان میں رہتا۔ ہیروئن کی تیاری اور اسمگلنگ کے لیے اس کی خدمات لینے والوں نے اس کا انتخاب کیا ہی اس لیے تھا کہ وہ پیر آباد کا بڑا چودھری تھا جس کا اثر و نفوذ اپنے گاؤں کے علاوہ ارد گرد کے علاقوں تک بھی پھیلا ہوا تھا۔ اگر اس سے پیر آباد کے چودھری اور مطلق العنان حاکم ہونے کا اعزاز ہی چھن جاتا تو پھر اسے ڈھیروں کے حساب سے ڈالرز سے نوازنے والے کیوں کر گھاس ڈالتے؟ اس صورت حال میں وہ الفا سے بات کر کے اسے مطلع کرنے کی ہمت بھی نہیں کر پا رہا تھا ورنہ ممکن تھا کہ وہی کوئی راہ سجھا دیتا۔

پریشانی کے عالم میں وہ کمرے میں ادھر سے ادھر ٹہلتا رہا۔ نیو یارک پہنچ کر اس نے حسب وعدہ مراد شاہ کے ساتھ ہی رہائش رکھی تھی اور اس وقت بھی اسی کے اپارٹمنٹ میں تھا۔ ٹہلتے ٹہلتے اسے دروازے پر دستک کی آواز سنائی دی تو پیشانی پر ناگواری کی شکن پڑ گئی۔

"گڑیا! کیوں دادا ابو کے کمرے کا دروازہ ناک کر رہی ہو۔ وہ ڈسٹرب ہوں گے۔" دستک کے جواب میں کوئی ردعمل ظاہر کرنے سے قبل ہی اسے دروازے کے پار سے اپنی بہو کی آواز سنائی دی۔

"مجھے دادا ابو کے پاس جانا ہے ماما... ان سے پاری (پیار) لینی ہے۔" ننھی سی آواز میں معصوم سا مطالبہ سنائی دیا۔

"دادا ابو خود باہر آ گئیں تو آپ ان سے پاری لے لینا۔ ابھی آپ نے انہیں تنگ کیا تو وہ آپ سے ناراض ہوں گے اور ماما کو بھی بہت ڈانٹیں گے۔" شاہدہ نے بچی کو سمجھایا اور پھر کچھ ایسی آوازیں سنائی دیں جیسے شاہدہ زبردستی بچی کو دروازے سے دور لے جا رہی ہو۔ چودھری نے اس مسئلے کے ٹل جانے پر زور سے سر جھٹکا اور ایک بار پھر ٹہلنا شروع کر دیا۔

اس کی جگہ کوئی عام آدمی ہوتا تو اپنی معصوم پوتی کی خواہش سن کر فوراً ہی دروازہ کھول دیتا اور اسے اپنی بانہوں میں بھر کر خوب پیار کرتا لیکن وہ چودھری افتخار عالم شاہ تھا جو عام انسانی جذبات اور رشتوں کی قدر کرنا جانتا ہی نہیں تھا خصوصاً اگر ان رشتوں اور جذبات کا تعلق عورت سے ہو۔ ماں، بیوی، بہن، بیٹی، بہو اور پوتی کسی بھی رشتے میں اس نے کبھی عورت کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔ اس کے نزدیک عورت ہر روپ میں پیر کی جوتی ہی تھی جس سے وہ اپنے حساب کتاب کے مطابق ہی برتاؤ کرتا تھا۔ کشور کے فرار کے بعد تو اس کا دل اور بھی زیادہ سخت ہو گیا تھا۔ اس نے کبھی یہ نہیں سوچا تھا کہ اس کے بنائے ظالمانہ قوانین اور فیصلے بیٹی کے فرار کا سبب بنے تھے۔ اسے یہی لگتا تھا کہ اس نے اپنی باقی دونوں بیٹیوں کی نسبت کشور کو جو تھوڑی سی آزادی دی تھی۔ اس نے اس کا دماغ خراب کیا تھا اور وہ اس کی عزت کو روند کر حویلی کی دہلیز پار کر گئی تھی۔

اس نے یہ بھی نہیں سوچا تھا کہ بنیادی انسانی حقوق کو چھین کر بدلے میں دی جانے والی تھوڑی سی سہولیات نعم البدل ثابت نہیں ہو سکتیں۔ اپنی جاہلانہ اور جاگیردارانہ سوچ کے زیر اثر کشور والے واقعے کے بعد اس کے دل میں عورت کے لیے نفرت مزید گہری ہو گئی تھی۔ جب تک نفرت کا یہ زہر کشور اور آفتاب کی رگوں میں اتار کر وہ انہیں زندگی سے محروم نہ کر دیتا، اسے کسی صورت سکون نہیں ملتا۔ لیکن وہ دونوں اس کی دسترس میں آ ہی نہیں رہے تھے اور فی الحال تو وہ دوسرے سنگین نوعیت کے مسائل میں الجھا ہوا تھا۔ اس الجھن کا حل ہی سوچنے کے لیے وہ جلے پیر کی بلی کی طرح کمرے میں ادھر سے ادھر ٹہل رہا تھا۔ حل تو نہیں سوجھا مگر اس کے خاص موبائل کی گھنٹی بج اٹھی۔

گھنٹی کی آواز سن کر اس کے چہرے کی رنگت بدل گئی۔ یقینی طور پر دوسری طرف الفا ہی ہو سکتا تھا اور اس وقت اس کے لیے اس سے بات کرنا بہت مشکل تھا۔ لیکن بات نہ کرنے کی بھی کوئی گنجائش نہیں تھی اس لیے با دل ناخواستہ کال ریسیو کر لی۔

"کیا کر رہے ہو چودھری؟" الفا نے سرد لہجے میں اس سے پوچھا۔

"کچھ نہیں سر۔" وہ اتنا ہی جواب دے سکا۔

"یہ جانتے کے باوجود کہ تمہارے کارخانے پر ریڈ ہو چکا ہے اور وہاں سے مشینوں، آلات اور مال کی برآمدگی کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر ہنری کو بھی گرفتار کر کے کسی نامعلوم مقام پر منتقل کر دیا گیا ہے... تم کچھ نہیں کر رہے؟" الفا کے لہجے میں سانپ کی سی پھنکار تھی۔

"میں اس خبر پر بہت پریشان ہوں سر اور سمجھ نہیں آ رہا کہ کس طرح اس صورت حال سے نمٹوں۔ آپ کا جو نقصان ہوا ہے سو ہوا ہے، مجھے خود ذاتی طور پر ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے۔ میں تو واپس اپنے وطن بھی نہیں جا سکتا۔" اس کے لیے الفا کا لہجہ خاصا ناگوار تھا چنانچہ اس سے کافی حد تک دبنے کے باوجود وہ اسے اپنا نقصان جتائے بغیر نہ رہ سکا۔

"تمہیں ایسا کوئی نقصان نہیں ہوا ہے جس کی تلافی نہ ہو سکے۔ ہم جب کسی سے کام لیتے ہیں تو اس کے معاملات پر بھی نظر رکھتے ہیں۔ تمہارے جس کارخانے پر ریڈ پڑا ہے، قانون کی رو سے وہ تمہاری ملکیت ہی نہیں ہے اس لیے کوئی تم پر گرفت بھی نہیں کر سکتا۔"

"کیا مطلب؟" الفا کے الفاظ نے اسے چونکا دیا۔

"ہم نے یہ انتظام کر دیا ہے کہ کاغذات کے ذریعے تم یہ ثابت کر سکو کہ کچھ عرصہ قبل تم نے اپنا کارخانہ فروخت کر دیا تھا۔ کارخانے کے نئے مالک کا نام سردار وہاب خان درج ہے جو ریکارڈ کے مطابق بیرون ملک رہائش پذیر ہے۔ اس طرح تم اس سارے بکھیڑے سے مکمل طور پر بری الذمہ ہو جاؤ گے۔ سردار وہاب خان کا کوئی وجود نہیں ہے اس لیے اسے کوئی گرفتار بھی نہیں کر سکتا۔ یوں معاملہ آسانی سے رفع دفع ہو جائے گا۔ اب تم بتاؤ کہ تمہارا ذاتی نقصان کہاں ہوا؟ تم تو مکمل طور پر محفوظ ہو۔" الفا کی بات سن کر چودھری حیرت اور خوشی سے دم بخود رہ گیا۔

"یہ سب کیسے ہوا؟" الفاظ بہت مشکل سے اس کی زبان سے نکلے۔

"تمہارے ملک میں سب کچھ ہو سکتا ہے۔ جتنے بے ایمان تم لوگ ہو، پیسے کے بل بوتے پر تم سے کچھ بھی کروایا جا سکتا ہے۔" الفا نے گویا اس کے منہ پر طمانچہ مارا لیکن چودھری جیسے ہوس پرست کے لیے اس قسم کی طعنہ زنی کی کوئی

اہمیت نہیں تھی۔ وہ اپنے مفادات سے آگے کچھ بھی سوچنے کا اہل نہیں تھا۔

"میری سمجھ نہیں آرہا کہ میں کس طرح آپ کا شکریہ ادا کروں۔ آپ نے تو میرا مسئلہ ہی حل کردیا۔" اس نے اپنی شکرگزاری اور خوشی کا اظہار کیا۔

"تم پہلے اپنی پوزیشن کلیئر کرو پھر ہم آگے کے معاملات دیکھیں گے۔ ایک کارخانے پر پڑنے والے ریڈ سے ہونے والے نقصان کی تلافی کی جاسکتی ہے، ہمارا اصل پروجیکٹ محفوظ رہنا چاہیے... تم اس کی فکر کرو۔ افیون کے کھیت کسی طور کسی کی نظر میں نہیں آنے چاہئیں۔ ان کی حفاظت کے لیے کچھ بھی کرنا پڑے، کرگزرنا۔ ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔" خلافِ توقع الفا نے بہت جلد اپنا لہجہ نرم کرلیا تھا اور اس سے ابتدائی ترش روئی سے بات نہیں کررہا تھا۔

"ٹھیک ہے سر... جیسا آپ کا حکم۔" چودھری خوشی میں کچھ اور بھی فرماں برداری کا مظاہرہ کررہا تھا۔ فون بند ہوا تو اس کی پیشانی پر پھیلا تفکر کا جال سٹ چکا تھا اور اس کی جگہ شادابی نے لے لی تھی۔

☆☆☆

بچے کو تھپک تھپک کر سلاتی شہزادی کی نظریں اپنے مختصر سے کوارٹر کا جائزہ لے رہی تھیں۔ اس نے آج رات ہی یہاں سے نکلنے کا مصمم ارادہ کرلیا تھا اس لیے دیکھ رہی تھی کہ اس کا کوئی سامان تو اِدھر اُدھر نہیں رہ گیا ہے۔ ویسے تو وہ بہت مختصر سامان کے ساتھ یہاں آئی تھی۔ اس سامان میں اس کے اور بچے کے کپڑوں کے علاوہ بچے کی ضروریات کے حوالے سے ہی چند چیزیں موجود تھیں جنہیں وہ پہلے ہی سمیٹ کر رکھ چکی تھی اور اب بس اس بات کی منتظر تھی کہ رات کا اندھیرا پھیلتے ہی یہاں سے نکل جائے۔ بنگلے سے نکل کر اسے بس تھوڑی ہی دیر کی پریشانی ہوتی پھر آگے ایک مخصوص مقام پر اسے مشابرم خان مل جاتا۔ اسے یہاں بھیجنے سے قبل ہی شہریار نے سارا منصوبہ طے کردیا تھا۔ مشابرم خان کو ہر رات مخصوص اوقات میں بنگلے سے نزدیک ایک محفوظ مقام پر موجود رہنا تھا۔ شہزادی کو کوئی خاص معلومات حاصل ہوتیں یا وہ خود کسی وجہ سے ضرورت محسوس کرتی تو اس جگہ پہنچ کر مشابرم خان سے مل سکتی تھی۔ ابھی تک اسے ملاقات کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی لیکن اتفاق سے آج وہ جو کچھ معلوم کرنے میں کامیاب ہوگئی تھی، وہ اطلاع بہت خاص تھی جسے وہ بلاتاخیر مشابرم خان تک پہنچا دینا چاہتی تھی۔ دوسری پریشانی اسے بہرام کی طرف سے تھی۔ یوں تو اس نے اسے اپنی صحت بہتر کرنے اور رنگ و روپ نکھارنے تک مہلت دی تھی لیکن بدنیت آدمی کا کیا بھروسا ہوتا ہے کہ کب اس کی نیت خراب ہوجائے اور وہ موقع ملتے ہی شب خون مار بیٹھے۔ وہ بہرام... کی نیت بدل جانے کا خطرہ مول لیے بغیر یہاں سے نکل جانا چاہتی تھی۔ اسے یہاں جو کام کرنا تھا، وہ کرچکی تھی اس لیے مزید رکنا بیکار تھا۔ اپنے اچانک فرار کی وجہ وہ منشی اللہ رکھا کی بیوی کو بتا کر معذرت طلب کرسکتی تھی۔ مالی مسائل کے حل کے لیے پہلے ہی شہریار نے وعدہ کر رکھا تھا اس لیے ملازمت کی تو اسے ویسے بھی پروا نہیں تھی۔ بس اسے کسی طرح یہاں سے نکلنا تھا اور وہ بھی فوری طور پر کیونکہ اردگرد بظاہر کوئی بڑا خطرہ نظر نہ آنے کے باوجود وہ اس بنگلے میں عجیب سی وحشت محسوس کررہی تھی اور یہاں سے نکل بھاگنے کی خواہش اتنی شدت سے اسے بےچین کررہی تھی کہ اس کے لیے مزید ایک دن بھی یہاں رکنا ممکن نہیں رہا تھا۔

اس کی تھپکیوں اور ہلکوروں سے معصوم بچہ جونہی نیند کی آغوش میں پہنچا، وہ اسے چارپائی پر لٹا کر خود اٹھ کھڑی ہوئی اور کوارٹر کی واحد کھڑکی کا پٹ تھوڑا سا کھول کر باہر کا جائزہ لینے لگی۔ معمول کے مطابق رات کے ابتدائی حصے میں ہی بیرونی حصے کی لائٹیں بند کردی گئی تھیں اور ملازمین کی آمدورفت کا سلسلہ بھی موقوف ہوچکا تھا۔ عابد انصاری صبح جلدی اٹھنے اور رات کو جلدی سونے کا عادی تھا اور اس نے یہی معمول اپنے ملازمین کے لیے بھی مقرر کیا تھا، اس لیے رات کے کھانے کے بعد بنگلے میں چہل پہل ختم ہوجاتی تھی۔ اپنے چند دن کے قیام میں اس معمول سے واقف ہوجانے والی شہزادی نے احتیاطاً کھڑکی سے جھانک کر اپنی مزید تسلی کرلی تو پٹ بند کرکے واپس چارپائی کے قریب آئی اور پہلے سے وہاں باندھ کر رکھی اپنے سامان کی گٹھری اٹھا کر اپنے کندھے سے لٹکائی پھر سوئے ہوئے بچے کو بھی اپنی آغوش میں بھر لیا۔ بچہ گہری نیند میں تھا۔ اٹھائے جانے پر تھوڑا سا کسمسایا تو ضرور لیکن ماں کے وجود کی گرمی محسوس کرکے ایک بار پھر بےخبر ہوگیا۔ شہزادی بنا آواز کے محتاط قدموں سے باہر نکلی اور کوارٹر کے دروازے پر کھڑے ہوکر ایک بار پھر اِدھر اُدھر کا جائزہ لیا۔ اندھیرے میں اسے وہاں اپنے سوا کسی دوسرے شخص کی موجودگی کا احساس نہیں ہوا اور تسلی ہوجانے پر اس نے اپنے قدموں کو ایک بار پھر حرکت دے دی۔ اس کا رخ بنگلے کے مین گیٹ کے بجائے پچھلی جانب تھا کیونکہ وہ جانتی تھی کہ مین گیٹ پر ہر وقت مسلح چوکیدار موجود رہتا ہے جبکہ اس کے مقابلے میں عقبی حصے میں موجود ایک چھوٹا سا

دروازہ عموماً صرف کنڈی لگا کر بند کر دینے پر ہی اکتفا کیا جاتا تھا۔ اس دروازے کو عموماً ملازمین جنگل میں آمد و رفت کے لیے استعمال کرتے تھے۔ یہ آمد و رفت لکڑی کے حصول، چھوٹے جانوروں کے شکار یا جنگل سے گزرتی نہر سے مچھلیاں پکڑنے کے سلسلے میں ہوتی تھی اور کوئی ان ملازمین سے پوچھ گچھ بھی نہیں کرتا تھا۔ شہزادی خود بھی ایک بار خانساماں کی بیوی کے ساتھ اس راستے سے لکڑیاں چننے جنگل میں جا چکی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ اس طرف سے جانے میں اسے بنگلے کا پورا چکر کاٹ کر اس راستے پر جانا پڑے گا جہاں سے اسے مشاہرم خان تک پہنچنا ہے۔ لیکن مجبوری یہ تھی کہ وہ رات کے اس پہر مین گیٹ سے کسی طور نہیں گزر سکتی تھی اس لیے یہی راستہ اختیار کرنا بہتر تھا۔

ہر اٹھتے قدم کے ساتھ اس کا دل بے طرح دھڑک رہا تھا۔ دل کے دھڑکنے کی آواز اتنی بلند تھی کہ اسے واہمہ سا ہو رہا تھا کہ وہ یہ آواز اپنے کانوں سے سن رہی ہے۔ اندھیرے میں پھونک پھونک کر قدم اٹھاتی وہ دروازے پر پہنچی اور احتیاط سے دروازے کی بھاری کنڈی کھولی۔ خاموش فضا میں کنڈی کھولے جانے سے ارتعاش سا پیدا ہوا۔ وہ اپنی جگہ بری طرح سہم گئی لیکن جب کہیں سے کوئی ردعمل ظاہر نہیں ہوا تو اس کا حوصلہ بڑھ گیا اور وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ آگے گھور جنگل پھیلا ہوا تھا جسے دیکھتے ہوئے خوف محسوس ہو رہا تھا۔ وہ جنگل کی ہولناک تاریکی سے نظر چراتی ہوئی بنگلے کی دیوار کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔ سامنے کے رخ پر ایک پگڈنڈی تھی جس پر سے وہ بغیر ٹھوکر کھائے گزر سکتی تھی۔ اس پگڈنڈی کے اختتام پر اسے پانچ منٹ مزید چلنا پڑتا پھر وہ اس مقام تک پہنچ جاتی جہاں اس کی مشاہرم خان سے ملاقات ہو جاتی۔ بچے کو سینے سے لگائے وہ کبھی کبھی اس راستے پر سے گزرتی رہی۔ پگڈنڈی پر قدم رکھنے سے قبل اس نے بنگلے کے گیٹ پر موجود اسلحہ بردار چوکیدار کا سایہ دیکھا تھا لیکن غنیمت یہ تھا کہ چوکیدار اس طرف متوجہ نہیں تھا۔ پگڈنڈی کے اختتام پر جب اسے یہ اطمینان ہو گیا کہ وہ چوکیدار کی حدِ نگاہ سے نکل آئی ہے تو اس نے اپنی گٹھڑی میں ہاتھ ڈالا اور ٹٹول کر کچھ نکالا۔ یہ ایک پنسل ٹارچ تھی جو اسے مشاہرم خان نے ہی ایسے کسی موقع کے لیے فراہم کی تھی۔ پنسل ٹارچ کی روشنی نے اس کے لیے آسانی پیدا کر دی۔ پگڈنڈی کے صاف اور ہموار راستے کی طرح وہ اس مقام سے صرف اندازے کی بنیاد پر نہیں گزر سکتی تھی۔ یہ راستہ ناہموار و کچا تھا جہاں پتھر اور جھاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔

غنیمت یہ تھا کہ یہاں تک جنگلی جانوروں کی پہنچ نہیں تھی اور وہ جنگل سے نکل کر یہاں کا رخ نہیں کرتے تھے۔ بہت سے بہت خرگوش، گلہری اور چوہوں جیسے چھوٹے اور بے ضرر جانور اس حصے میں پھدکتے پھرتے تھے... اور گاؤں کی پروردہ شہزادی اتنی بزدل نہیں تھی کہ ان بے ضرر جانوروں سے خوف زدہ ہو جاتی۔ وہ سنبھل سنبھل کر قدم اٹھاتی پنسل ٹارچ کی محدود روشنی میں آگے بڑھتی رہی اور آخرکار اس مقام تک پہنچ گئی جہاں برگد کے تین گھنے اور سن رسیدہ درخت پہلو بہ پہلو کھڑے تھے۔

ان درختوں میں سے ایک پر مشاہرم خان نے مچان نما ٹھکانا بنا رکھا تھا۔ شہزادی نے حسبِ ہدایت ٹارچ کا رخ اوپر کی طرف کر کے اسے تین بار جلایا بجھایا۔ طے شدہ پروگرام کے مطابق اس کے بعد مشاہرم خان کو اپنی کمین گاہ سے نکل کر اس کے سامنے آ جانا چاہیے تھا لیکن جب چند منٹ کے انتظار کے باوجود اس کی وہاں موجودگی کے کوئی آثار نظر نہ آئے تو اس پر شدید گھبراہٹ طاری ہو گئی۔ وہ سو فیصدی اس یقین کے ساتھ بنگلے سے نکلی تھی کہ مشاہرم خان وہاں موجود ہوگا۔ یہاں آتے وقت اس نے ایک بار بھی نہیں سوچا تھا کہ اگر مشاہرم خان مخصوص مقام پر موجود نہ ہوا تو وہ کیا کرے گی؟ گھبراہٹ کے عالم میں اس نے ایک بار پھر ٹارچ کا رخ اوپر کی طرف کر کے سگنل دینا شروع کیا لیکن اگلے ہی لمحے اس کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ اس کی پنسل ٹارچ کی محدود روشنی کے ساتھ ہی وہاں بہت تیز روشنی پھیل گئی تھی اور وہ دیکھ سکتی تھی کہ یہ روشنی اس طاقت ور سرچ لائٹ سے نکل رہی ہے جسے بہرام نے اپنے ہاتھ میں تھام رکھا ہے۔ بہرام کے ساتھ ہی اس کا ایک اسلحہ بردار ساتھی بھی کھڑا ہوا تھا۔

"کیا کر رہی ہے تو یہاں؟" بہرام نے کرخت آواز میں اس سے پوچھا لیکن شہزادی اس لائق کہاں تھی کہ اس کے سوال کا جواب دے سکتی۔ خوف کی زیادتی سے اس کا پورا وجود تھر تھر کانپ رہا تھا۔

"حق نواز! روشنی کر کے دیکھ کہ اوپر یہ اپنے کس ماں کے یار کو ڈھونڈ رہی تھی پھر اسے لے کر واپس بنگلے چلتے ہیں۔" شہزادی کی طرف سے کوئی جواب نہ ملنے پر اس نے اپنے ساتھی سے کہا اور خود شہزادی کی گدی پکڑ کر اس کے بال کھینچے۔ وہ تکلیف سے بلبلا کر چیخ پڑی۔ اس بار اس کی آغوش میں سوئے بچے کی نیند برقرار نہ رہ سکی اور وہ بلند آواز میں رونے لگا۔ بچے کی آواز سن کر وہ اور بھی سراسیمہ ہو گئی۔ اسے اپنی نازک پوزیشن کا اور بھی شدت سے اندازہ ہوا۔ اس کے ساتھ

ساتھ اس کا ننھا بچہ بھی شدید خطرے کی زد میں تھا۔ اس نے اضطراری طور پر وہاں سے بھاگنے کی کوشش کی لیکن اس کے بال اب بھی بہرام کی گرفت میں تھے۔ بھاگنے کی کوشش میں اسے بس ایک زوردار جھٹکا ہی لگ سکا اور وہ جہاں کی تہاں ہی رہی، البتہ بہرام کا طیش مزید بڑھ گیا اور اس نے اس کے منہ پر ایک زوردار تھپڑ دے مارا۔ خوف سے ادھ موئی ہوئی شہزادی کے لیے یہ تھپڑ بھی بہت تھا۔ وہ اس کے بعد مزید کوئی کوشش نہیں کر سکی اور وہیں بیٹھتی چلی گئی۔ اس دوران حق نواز نامی کارندے نے اپنی کارروائی مکمل کر لی تھی۔

"ادھر درخت پر تو وڈی زبردست مچان بندھی ہوئی ہے بہرام! لگتا ہے کوئی بندہ پابندی سے ادھر وقت گزارتا ہے۔ مچان پر پانی کا برتن اور بھنی ہوئی مکئی بھی رکھی ہے۔ برتن میں رکھا پانی زیادہ باسی نہیں لگتا۔ اس کا مطلب ہے کہ جو بھی ادھر آ کر بیٹھتا ہے، وہ کل یا پرسوں بھی ادھر آیا ہوگا اور برتن میں تازہ پانی بھرا ہوگا۔" ٹارچ سمیت درخت کے اوپر چڑھنے والا حق نواز پُرجوش انداز میں بہرام کو رپورٹ دینے لگا جسے سن کر شہزادی مزید اندر ہی اندر لرزتی رہی۔۔۔ اس کی بنگلے سے رات کے اس پہر چوری چھپے نکل کر یہاں تک پہنچنے والی حرکت کے لیے ایسے ثبوت ملنے شروع ہو گئے تھے کہ وہ کوئی جھوٹا بہانہ بھی نہیں گھڑ سکتی تھی۔

"ٹھیک ہے تو اُدھر ہی رہ کر نگرانی کر۔ ہو سکتا ہے کہ اس کی ماں کا خصم تھوڑی دیر میں یہاں پہنچ جائے۔ میں اسے لے کر بنگلے جاتا ہوں پھر وہاں سے تیری مدد کے لیے کسی ہور کو بھی بھیج دوں گا۔" بہرام نے رپورٹ سن کر حکم صادر کیا اور پھر شہزادی کے پہلو میں ایک زوردار ٹھوکر لگا کر بولا۔ "چل اٹھ، بنگلے پہنچ کر تیرا حساب کتاب کرتا ہوں۔" ٹھوکر کھا کر شہزادی بُری طرح بلبلا گئی لیکن بہرام کے حکم سے سرتابی کی مجال نہیں تھی اس لیے تکلیف پر قابو پاتے ہوئے کھڑی ہوئی اور سارے منظر میں بیک گراؤنڈ موسیقی کی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے ایک جیسے سُر میں روتے اپنے بچے کو چپ کروانے کی کوشش کرنے لگی۔ معصوم بچے کے لیے نیند میں پڑنے والا خلل خاصا تکلیف دہ تھا اس لیے وہ آسانی سے بہلنے کو راضی نہیں تھا۔

"اگر یہ تجھ سے چپ نہیں ہو رہا تو مجھے بتا، میں اس کا گلا دبا کر ہمیشہ کے لیے آواز بند کر دیتا ہوں۔" اسے بازو سے پکڑ کر بنگلے کی طرف جانے والے راستے پر گھسیٹتے ہوئے بہرام غرایا۔ شہزادی نے گھبرا کر اپنا ہاتھ بچے کے منہ پر رکھ لیا تاکہ اس کی آواز بہرام کے کانوں تک نہ پہنچ سکے۔ اس وقت وہ اتنی دہشت زدہ تھی کہ یہ سوچنے کے لائق بھی نہیں رہی تھی کہ اس کا عمل بچے کے لیے تکلیف دہ ثابت ہو سکتا ہے۔ یہ تو اچھا ہوا کہ بنگلے تک کا مختصر راستہ جلدی طے ہو گیا اور وہ گیٹ پر الرٹ کھڑے چوکیدار کے سامنے پہنچ گئے۔

"آ گئے بہرام! لگتا ہے یہ یہاں سے نکل کر زیادہ دور نہیں گئی تھی۔" اسے اپنے سامنے دیکھ کر چوکیدار نے تبصرہ کیا۔

"جا بھی کیسے سکتی تھی۔ اس جنگل میں اپنا کا راج ہے۔ یہاں وہی آتا ہے اور یہاں سے وہی واپس جاتا ہے جسے ہم اجازت دیں۔ یہ ہماری اجازت سے آئی تھی تو ہم اسے اپنی اجازت کے بغیر جانے کیسے دیتے۔" چوکیدار کو جواب دیتے ہوئے بہرام نے اسے اندر دھکیلا۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی دوبارہ اس قید خانے میں داخل ہو گئی جہاں سے کچھ دیر قبل اپنے تئیں بڑی آسانی سے فرار ہو گئی تھی۔ لیکن اب اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کے صیاد اتنے بھی غافل نہیں تھے جتنا اس نے سمجھ لیا تھا۔ ان کی فی الفور برگد کے درختوں کے نیچے آمد سے ظاہر تھا کہ وہ ابتدا ہی سے اس کے پیچھے لگے ہوئے تھے ورنہ انہیں کیسے پتا چلتا کہ وہ بنگلے سے نکل کر سیدھی کہاں گئی ہے۔

"اب بتاؤ کہ تم کہاں اور کیوں گئی تھیں؟" اسے گھسیٹ کر بنگلے کے ایک کمرے میں لے جانے کے بعد بہرام نے درشت لہجے میں پوچھا۔ وہ خاموش رہی۔

"تیری زبان کھلوانا میرے لیے زیادہ مشکل نہیں ہے لیکن میں نہیں چاہتا کہ تجھ سے زبردستی سچ اگلوانے کے چکر میں تیری ہڈیاں شڈیاں ٹوٹ جائیں۔" بہرام نے اسے دھمکی دی جسے سن کر وہ ٹس سے مس نہیں ہوئی تو اس نے اس کے منہ پر ایک زوردار تھپڑ مارا۔ تھپڑ اتنا زوردار تھا کہ شہزادی نے اپنے منہ میں خون کا ذائقہ محسوس کیا اور بے اختیار ہی حلق کے بل چیخنے لگی۔ یہ اس کی چیخوں کا ہی اثر تھا کہ عابد انصاری اپنے بیڈ روم سے نکل کر گاؤن کے بند باندھتے ہوئے سیدھا اسی کمرے میں چلا آیا۔

"یہاں کیا ہو رہا ہے؟" ماں اور بچے دونوں کو ایک تسلسل سے روتے دیکھ کر اس نے سوال کیا۔

"آپ کا خیال بالکل ٹھیک تھا صاحب۔ یہ موقع دیکھ کر بنگلے سے بھاگنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اگر میں آپ کے کہنے پر پہلے سے ہی اس کی نگرانی نہ کروا رہا ہوتا تو یہ یہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتی۔" بہرام نے اسے اطلاع دی۔

"اس نے اپنے بارے میں کچھ بتایا بھی یا نہیں؟ یہ کس کے لیے کام کر رہی ہے؟" اس نے فوراً ہی دوسرا سوال داغا۔

"یہ تو اس سے اگلوانا پڑے گا صاحب۔ ہم نے اسے ادھر برگد کے درختوں کے پاس سے پکڑا ہے۔ وہاں شاید کوئی اس سے ملنے کے لیے آنے والا تھا۔" بہرام نے جواب دیا۔

"تم رہنے دو، یہ کام میں خود ابھی دو منٹ میں کر لیتا ہوں۔" وہ ایک دیوار گیر الماری کی طرف بڑھ گیا۔ اس اثنا میں شہزادی بچے کو اپنی چھاتی سے لگا کر خاموش کروا چکی تھی۔

"اس سے بچہ لے لو بہرام۔ جن سوالوں کے جواب دینے میں اسے مشکل ہو گی، ان کا جواب ہم بچے کی مدد سے آسانی سے لے لیں گے۔" الماری کھول کر اس میں سے کچھ نکالتے ہوئے عابد انصاری نے اپنے مخصوص مدھم لہجے میں بہرام کو حکم دیا تو اس نے فوراً ہی آگے بڑھ کر بچے کو اس کی بانہوں سے کھینچ لیا۔ ماحتا کی ماری نے بچہ دینے میں مزاحمت کی کوشش کی۔ اس کوشش کا نتیجہ یہ نکلا کہ بچے کا اوپری دھڑ بہرام کی گرفت میں چلا گیا اور وہ خود اس کی ٹانگیں پکڑی رہ گئی۔ دونوں طرف کی کھینچا تانی میں بچے کے نازک بدن میں زبردست کھچاؤ پیدا ہوا اور وہ تکلیف سے بلبلا کر رونے لگا۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر شہزادی نے بچے کے پیر چھوڑ دیے۔ بچہ پوری طرح بہرام کی گرفت میں چلا گیا اور مچل مچل کر رونے لگا۔

"اللہ کے لیے صاحب! مجھے معافی دے دو۔ مجھے میرے بچے کے ساتھ یہاں سے جانے دو۔" وہ تڑپ کر عابد انصاری کے قدموں میں جا گری جو بالکل پتھرائے ہوئے چہرے کے ساتھ دونوں ہاتھوں میں بڑے سائز کی گہرے رنگ کے شیشے والی بوتل لیے کھڑا تھا۔

"اس بوتل کو غور سے دیکھو شہزادی۔ اس میں ایک بڑا زہریلا سانپ موجود ہے۔ اسے میں جس پر چھوڑ دوں، اسے ڈس ڈالتا ہے۔ یہ بھی نہیں دیکھتا کہ اس کے نشانے پر کوئی معصوم ننھا منا سا بچہ ہے۔" وہ اسے بڑی واضح دھمکی دے رہا تھا۔

"مجھے معافی دے دو صاحب! مجھے میرے بچے کی زندگی بخش دو۔ بدلے میں آپ جو حکم دو گے، میں مانوں گی۔" قدموں میں تو وہ پہلے ہی جھکی ہوئی تھی، اب اپنا سر بھی اس کے پیروں پر رکھ کر زمین پر بیٹھ گئی۔

"یہ اتنا زہریلا سانپ ہے کہ اگر کسی کڑیل جوان کو کاٹ لے تو اسے بھی پانی تک مانگنے کی مہلت نہیں مل پاتی۔ چھوٹے بچے کی تو ایک سے دوسری سانس بھی نہ آ سکے گی۔" اس کی التجاؤں سے بے نیاز وہ اپنی ہی بکواس میں لگا تھا جسے سن سن کر وہ بے چاری اور بھی ہول رہی تھی۔

"رحم کرو صاحب! رحم کرو، میرے بچے کو کچھ مت کہو۔ تم جو پوچھو گے میں بتاؤں گی، جو کہو گے وہ کروں گی۔ بس تم میرے بچے کو چھوڑ دو۔" وہ بُری طرح بلبلا رہی تھی۔

"تم کس کے لیے کام کر رہی ہو؟" بوتل کو ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کرتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"اے سی صاحب کے لیے۔ انہوں نے مجھے ڈیوٹی دی تھی کہ بنگلے میں رہ کر مجھے جو کچھ معلوم ہو سکتا ہے، معلوم کر کے انہیں بتاؤں۔ ادھر برگد کے درخت کے پاس ان کے ڈرائیور کو میری مدد کے لیے موجود رہنا تھا پر معلوم نہیں وہ کدھر چلا گیا۔"

اس نے رونے سے سُڑسُڑ کرتی ناک کو اوڑھنی کے پلّو سے صاف کرتے ہوئے جواب دیا تو عابد انصاری نے بے ساختہ ایک گہرا سانس لیا اور مجھتے ہوئے پوچھنے لگا۔ "آج تم نے میری اور بہرام کی باتیں سن لی تھیں نا؟"

جواب میں شہزادی نے اثبات میں سر ہلایا اور لجاجت بھرے لہجے میں بولی۔ "مجھے معافی دے دو صاحب! میں مجبور تھی۔ اے سی صاحب بڑے آدمی ہیں۔ میں پہلے ہی مشکل میں پھنسی ہوئی تھی، اگر ان کی گل نہ مانتی تو اپنے بچوں کو رلتا چھوڑ کر جیل کی سلاخوں کے پیچھے رہنا پڑتا۔"

"ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ اے سی تو بڑا انصاف پسند مشہور ہے۔" عابد انصاری حیران ہوا۔

"وہ گل اپنی جگہ ہے، پر میری بھی مجبوری تھی۔ اگر میں ان کی گل نہ مانتی تو قبر کھود کر اس میں سے مُردہ بچے کی ہڈیاں نکالنے کے جرم میں جیل میں بند رہتی۔ اے سی صاحب نے اس شرط پر مجھے وہاں سے نکلوایا کہ میں ان کی مدد کروں گی۔" اس نے بتایا۔

"تو تم قبر سے مُردوں کی ہڈیاں بھی چراتی ہو؟" عابد انصاری نے حیرت کا اظہار کیا۔

"نہ جی، پر وہ جرم بھی الگ مجبوری میں ہو گیا تھا۔" وہ تفصیل بتانے لگی کہ کس طرح ہالے کی ماں ڈاکٹری علاج سے مایوس ہو کر ٹالی والا گاؤں کی خانقاہ پہنچ گئی تھی جہاں کے جعلی پیر نے علاج کے لیے مُردہ بچے کی ہڈیوں کا مطالبہ کیا تھا۔ اس کی ساس نے ہڈیوں کی فراہمی کا کام جبراً اسے سونپ دیا تھا اور اسے مجبوراً اپنے بچھڑے ہوئے بچوں کے حصول کے لیے وہ نازیبا حرکت کرنی پڑی تھی۔ بدقسمتی سے وہ قبر کھودتے ہوئے پکڑی گئی اور گاؤں والے اس کی جان کے درپے ہو گئے۔ ڈاکٹر ماریا اور اے سی شہریار کی مداخلت سے اس کی گلوخلاصی ہوئی لیکن تھانے کچہری کے چکر نے اسے خوار کر کے رکھ دیا۔

اس چکر سے نکلنے کے لیے اس نے شہریار سے تعاون کی ہامی بھر لی اور اب اس کے لیے ایک اہم اطلاع لے کر یہاں سے فرار ہو رہی تھی۔ جس مقام پر اسے پکڑا گیا تھا، وہاں اصولاً اے سی کے ڈرائیور مشا برم خان کو موجود ہونا چاہیے تھا لیکن وہ نہیں تھا اور وہ خود بہرام کے ہاتھوں پکڑی گئی تھی۔

اس سے ساری تفصیلات سن کر عابد انصاری نے زوردار ہنکارا بھرا۔ شہزادی کے بارے میں اس کے اندیشے درست ثابت ہوئے تھے۔ آج ہی اسے شک ہوا تھا کہ وہ اس کی اور بہرام کی گفتگو سننے کی کوشش کر رہی تھی اور آج ہی ثبوت بھی مل گیا تھا لیکن اس کے لیے اصل تشویش کی بات یہ تھی کہ اس کی تمام تر احتیاط کے باوجود شہریار کو اس پر شک ہو گیا تھا جب ہی اس نے ملازمہ کے روپ میں اپنا ایک جاسوس اس کے بنگلے تک پہنچا دیا تھا۔ یہ ملازمہ اس تک کوئی کام اطلاع پہنچانے سے قبل پکڑی گئی تھی لیکن اب آئندہ اسے اور بھی زیادہ محتاط رہنا تھا۔ ان خطوط پر سوچتے ہوئے اس نے شہزادی کو تیز نظروں سے گھورا تو وہ جھرجھری سی لے کر رہ گئی۔ ہمیشہ نرم خو اور مہذب نظر آنے والے عابد انصاری کی آنکھوں میں اس وقت کسی درندے کی سی سفاکی تھی۔ اس سے قبل کہ وہ کچھ سمجھتی، عابد انصاری نے بوتل کا ڈھکن کھولا اور اس میں سے نہایت مہارت سے سیاہ چمکتی جلد والے سانپ کو نکال کر اس پر پھینک دیا۔ سانپ کو دیکھ کر وہ دہشت سے چیخی اور پھر لگاتار چیختی چلی گئی لیکن چیخوں کا یہ سلسلہ زیادہ دراز نہیں ہو سکا۔ سیاہ کوڑیالے سانپ کے نکیلے دانتوں سے بدن میں اتر جانے والے زہر نے منٹوں میں ہی اسے چت پٹ کر دیا اور اس کی پتھرائی ہوئی آنکھیں یہ دیکھنے کے لائق بھی نہیں رہیں کہ اس کی زندگی کا چراغ گل کرنے والا وہ سیاہ عفریت اب اس کے جگر گوشے سے زندگی کی حرارت چھیننے جا رہا ہے۔

☆☆☆

شام کا وقت تھا۔ مشا برم خان نے گرما گرم چائے کی پیالی ختم کرنے کے بعد باہر کا رخ کیا۔ شہریار نے اسے ذمے داری سونپی تھی کہ ہر روز شہزادی کی خبرگیری کے لیے جایا کرے۔ اس نے شہزادی کو مطلع کر کے فاریسٹ آفیسر کے بنگلے سے ممکنہ حد تک قریب اپنا ٹھکانا بنا لیا تھا۔ برگد کے گھنے درخت پر خاصی اونچائی پر بنائی جانے والی وہ مچان اسے خاصا محفوظ رکھتی تھی۔ وہاں وہ کسی کی نظروں میں نہیں آتا تھا اور اب تک کا سارا عرصہ عافیت میں گزرا تھا لیکن روزانہ کی یہ کڑی ڈیوٹی اس اعتبار سے خاصی کوفت کا باعث تھی کہ ابھی تک اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا تھا اور شہزادی نے ایک بار بھی اس سے رابطہ نہیں کیا تھا۔ لیکن بہرحال اسے اپنی ڈیوٹی تو انجام دینی ہی تھی اس لیے حسبِ عادت وہ..... روانگی سے قبل گاڑی کا تیل پانی چیک کرنے لگا۔ اس کی خصوصی توجہ کی وجہ سے ہمیشہ کی طرح اس وقت بھی گاڑی فرسٹ کلاس حالت میں تھی۔ اس طرف سے مطمئن ہونے کے بعد وہ واپس پلٹا تاکہ وقت گزاری اور تھکن کے توڑ کے لیے تیار کروایا جانے والا چائے کا تھرماس لا کر گاڑی میں رکھ سکے۔ عمارت کے اندر داخل ہوا تو وہاں اسے عجیب سی ہلچل محسوس ہوئی۔ وہ پریشان ہو گیا کہ ابھی چند منٹ قبل تو وہاں سب ٹھیک تھا پھر اب لوگ کیوں پریشان سے نظر آ رہے ہیں؟

"خان اصاحب کی گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ وہ بہت بُری حالت میں اسپتال میں داخل ہیں۔" اس کے کچھ پوچھنے سے قبل ہی ایک نائب قاصد نے اسے اطلاع دی تو وہ بھاگتا ہوا اندر کی طرف بڑھا۔ پریشان عبدالستان فون پر کسی سے باتوں میں مصروف تھا۔

"سرائے کی صاحب..." اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں عبدالستان سے بس اتنا ہی کہا۔

وہ فون بند کر کے اس کی طرف متوجہ ہوا اور اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "دعا کرو مشا برم خان! میری لاہور میں آئی جی صاحب کے پی اے سے بات ہوئی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ ایکسیڈنٹ بہت خطرناک تھا۔ ٹرک تقریباً گاڑی پر چڑھ ہی گیا تھا۔ گاڑی کی جو حالت ہوئی ہے، اسے دیکھ کر ہی اندازہ ہوتا ہے کہ اندر موجود شخص کا کیا حال ہوا ہو گا۔ اے سی صاحب کو سخت تشویش ناک حالت میں سروسز اسپتال میں پہنچایا گیا ہے۔ ڈاکٹرز نے فی الحال ان کی زندگی کی کوئی امید نہیں دلائی ہے۔ اس وقت انہیں سب کی دعاؤں کی اشد ضرورت ہے۔" عبدالستان نے سخت افسردہ لہجے میں اسے اطلاع دی جسے سن کر مشا برم خان جیسے اونچے پورے مرد کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور اس نے اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔

"میں لاہور جا رہا ہوں ستان صاحب!" اگلے ہی پل اس نے فیصلہ کیا اور بغیر کچھ سنے تیزی سے باہر کی طرف دوڑ گیا۔ گاڑی میں بیٹھ کر پوری قوت سے ایکسلریٹر کو دباتے ہوئے اسے صرف یہ معلوم تھا کہ اسے جلد از جلد شہریار کے پاس لاہور پہنچنا ہے۔ وہ شہزادی سمیت دنیا کے ہر کام کو فراموش کر چکا تھا۔

یہ پُرپیچ و سنسنی خیز داستان جاری ہے
مزید واقعات آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں

"تم لوگ حامد راؤ کی فیملی سے ملاقات کے لیے نابلی والا تو نہیں جا سکتے۔ بہتر تھا کہ فون پر انہیں اپنی روانگی کی اطلاع دے دیتے۔" ماہ بانو اور اسلم دونوں اس کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے اور اس نے کسی بھی ایک کو مخاطب کیے بغیر یہ بات کہی تھی۔ اس وقت وہ حامد راؤ کے چھوٹے سے فلیٹ کے لاؤنج میں بیٹھا ان دونوں کے ساتھ چائے پی رہا تھا۔ ابتدا میں جب حامد راؤ اور اس کے اہلِ خانہ بھی اسی فلیٹ میں مقیم تھے تو ماہ بانو نے اسے یہاں کا پتا نہیں دیا تھا۔ اسلم سے نکاح کے بعد جب تیزی سے ان دونوں کے امریکا جانے کی کارروائی ہونے لگی تو مختلف امور کے لیے رابطے کی ضرورت کو سمجھتے ہوئے ماہ بانو نے خود ہی اسے یہاں کا پتا دے دیا لیکن وہ آج پہلی بار ہی یہاں آیا تھا۔ اس سے قبل جو بھی کام پڑتا تھا، سی آئی ایف پی کا کوئی اہلکار آکر نمٹا دیتا تھا۔ اس نے خود یہاں آنے سے گریز اس لیے کیا تھا کہ ایک تو وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے پیچھے لگے دشمنوں میں سے کسی کی یہاں تک رسائی ہو سکے۔ ایسی صورت میں ماہ بانو اور اسلم مشکل میں پڑ جاتے۔ دوسرے یہ کہ وہ خود اتنا مصروف اور الجھا ہوا تھا کہ اس کے پاس کسی سے ملاقات کے لیے وقت کی شدید قلت تھی۔ اور ان سب باتوں سے بڑھ کر مسئلہ یہ تھا کہ اپنی تمام تر سمجھداری اور اخلاص کے باوجود ماہ بانو کو اسلم کی بیوی کی حیثیت سے اس کے ساتھ دیکھنا ایک تکلیف دہ عمل تھا اس لیے وہ اس عمل سے گزرنے سے گریز کرتا رہا لیکن آج کی یہ ملاقات ناگزیر تھی۔

چند گھنٹوں بعد ہی ان دونوں کو نیویارک کے لیے روانہ ہو جانا تھا اور وہ نہیں جانتا تھا کہ اب آئندہ زندگی میں پھر کبھی ان سے ملاقات ہو سکے گی یا نہیں... اس لیے ہر بات کو بھول کر اس الوداعی ملاقات کے لیے پہنچ گیا تھا۔ ان دونوں کے یہاں سے نکلتے ہی اس کے ایکسیڈنٹ کا ڈراما پلے کر دیا جاتا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ جاتے جاتے ماہ بانو اپنے ساتھ کوئی ایسا دکھ یا پریشانی لے کر جائے جو بعد میں بھی اسے بے قرار رکھے اس لیے بہت سوچ سمجھ کر ذیشان کے ساتھ پلاننگ طے کی تھی اور خود یہاں ایک مختصر سی ملاقات کے لیے پہنچ گیا تھا۔ ماہ بانو اور اسلم کے سفری بیگ بالکل تیار حالت میں لاؤنج میں ہی رکھے تھے اور انہیں دس پندرہ منٹ بعد یہاں سے نکل جانا تھا۔ انہیں ائرپورٹ پہنچانے کے لیے بھی سی آئی ایف پی کا ہی کوئی اہلکار گاڑی سمیت باہر پارکنگ میں منتظر تھا اور شہریار کے یہاں سے جاتے ہی انہیں بھی روانہ ہو جانا تھا۔

"میں نے راؤ صاحب کو فون کر دیا تھا۔ افسردہ ہو رہے تھے کہ ہم بغیر ملاقات کے جا رہے ہیں۔ مسعود نے تو خواہش بھی ظاہر کی تھی کہ وہ خود ملاقات کے لیے ائرپورٹ پہنچ جائے گا لیکن میں نے اسے ٹال دیا کہ کہاں اتنی لمبی ڈرائیو کر کے آؤ گے۔ فون اور انٹرنیٹ کا دور ہے۔ ہمارے امریکا جانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا، ہم وہاں جا کر بھی تم لوگوں سے رابطے میں رہیں گے۔ وہ سمجھ دار لڑکا ہے، زیادہ اصرار نہیں کیا۔ ہمارے حالات بھی کسی حد تک ان لوگوں کے علم میں ہیں اس لیے یقیناً وہ سمجھ گیا ہوگا کہ ہم ائرپورٹ پر اپنے ارد گرد کسی جاننے والے کو نہیں دیکھنا چاہتے تاکہ بعد میں کسی اتفاق کی وجہ سے ان کے ذریعے ہمارا سراغ لگانے کی کوشش نہ کی جا سکے۔" اسلم نے سنجیدگی سے اس کی بات کا جواب دیا۔

"بالکل صحیح۔ مجھے خوشی ہے کہ تمہیں خود بھی اپنی سیکیورٹی سے متعلق احتیاطی تدابیر کا احساس ہے۔" اس نے فوراً ہی اسلم کو سراہا۔ ماہ بانو سے اس کی شادی کا سخت مخالف ہونے کے باوجود وہ اس سے چند ملاقاتوں میں ہی قائل ہو گیا تھا کہ اسلم ایک عمدہ انسان ہے جسے معاشرے کی ستم ظریفی ڈاکو نہ بناتی تو یقیناً وہ اتنا اہل تھا کہ خود اس کے لیول کی کوئی ملازمت کر رہا ہوتا اور اس کا اپنا ایک مقام ہوتا۔ اسے خوشی تھی کہ ماہ بانو کی فرمائش پر اس نے اسلم کے ڈاکو ہونے کو نظرانداز کرنے کی جو غیر قانونی حرکت کی تھی، آج وہ اسے اپنے اوپر بوجھ نہیں لگتی تھی۔ اس نے ایک اچھے انسان کی زندگی کے مزید ماہ و سال برباد ہونے سے بچا کر اسے نئے سرے سے زندگی کے آغاز کا موقع دے دیا تھا۔ یہ تو طے تھا کہ نئی زندگی اس کے لیے بہت خوش گوار ثابت ہوگی۔ ماہ بانو جیسی لڑکی کے ساتھ زندگی کے ناخوش گوار ہونے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔

"تمہیں یاد ہے نا کہ نیویارک سے تمہیں کنیکٹڈ فلائٹ سے آرلینڈو جانا ہے اور وہاں میرے اس دوست سے ملنا ہے جس کا ایڈریس میں نے تمہیں دیا ہے۔ میرا وہ دوست آرلینڈو میں سیٹل ہونے میں تمہاری مدد کرے گا۔ لیکن یاد رکھنا کہ تم لوگ نہ تو خود وہاں جا کر مجھ سے رابطہ کرو گے اور نہ ہی اس کے ذریعے رابطے میں رہنے کی کوشش کرو گے۔ بس سمجھ لو کہ آج ہماری آخری ملاقات ہے۔ بعد میں کبھی قسمت نے سامنا کروا دیا تو الگ بات ہے، ورنہ جانتے بوجھتے نہ تو میں تم سے رابطہ کروں گا اور نہ ہی تم دونوں کو رابطے کی اجازت دوں گا۔ ہمارے حالات ایسے ہیں کہ ایک دوسرے سے کٹ کر رہنے میں ہی ہماری بقا ہے۔" اس نے دیکھا کہ اس کے الفاظ نے ماہ بانو کی خوب صورت آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک پیدا کر دی ہے لیکن اس نے جان کر نظرانداز کر دیا۔ وہ اسے جن تکالیف سے بچانا چاہتا تھا اس کے لیے یہ تکلیف سہہ جانا اس کے حق میں بہتر تھا۔

"ہم آپ کی ہدایات پر پورا پورا عمل کریں گے لیکن ساتھ میں یہ امید بھی رکھیں گے کہ ایک نہ ایک روز ہماری پھر سے ملاقات ضرور ہو گی۔ وہ کہتے ہیں نا کہ یار زندہ صحبت باقی... تو بس جب تک سانس ہے، ملنے کی آس بھی رہے گی۔" آج ماہ بانو بالکل خاموش تھی اور گفتگو کی ساری ذمے داری اسلم نبھا رہا تھا۔

"ٹھیک کہا تم نے لیکن اس دنیا میں زندگی سے زیادہ بے بھروسا کوئی اور شے نہیں ہے۔ سانسوں کا سلسلہ کب کہاں ٹوٹ جائے، کوئی اندازہ بھی نہیں لگا سکتا اس لیے اس زندگی سے زیادہ امیدیں بھی نہیں لگانی چاہئیں۔" وہ جو پیش بندیاں کر رہا تھا، اس کی وجہ تو ماہ بانو کو سمجھ نہیں آ رہی تھی لیکن وہ اپنے دل میں سخت تکلیف محسوس کر رہی تھی۔ تکلیف کی اس شدت کو خاموشی سے برداشت کرنے کے لیے اس نے اپنے نچلے ہونٹ کو بیدردی سے دانتوں تلے دبا ڈالا۔

"جانے دیں سر! اس موضوع پر ہمارے درمیان ایک طویل بحث چھڑ سکتی ہے لیکن فی الحال اس کا موقع نہیں ہے اس لیے میں ہی ہار تسلیم کر لیتا ہوں۔" اسلم نے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ اسے جواب دیا تو وہ بھی مسکرا دیا۔

"او کے، پھر مجھے اجازت دو۔ تم لوگوں کی سہولت کے لیے جو ممکنہ انتظامات میں کر سکتا تھا، وہ میں نے کر دیے ہیں۔ کوئی کمی بیشی رہ گئی ہو تو اس کے لیے ابھی معذرت کر لیتا

ہوں۔ آگے تو مجھے اس کا بھی موقع نہیں ملے گا۔'' اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے اس نے جو الوداعی جملے ادا کیے، ان سے بھی صاف ظاہر تھا کہ وہ مستقبل میں واقعی ان سے کوئی رابطہ نہیں رکھنا چاہتا۔ اس بار ماہ بانو خود پر قابو نہیں رکھ سکی اور دو آنسو اس کی آنکھوں سے نکل کر رخساروں پر ڈھلک گئے۔ وہ فوراً ہی نظر چرا گیا۔

''شرمندہ مت کریں شہریار صاحب! آپ نے جس بے غرضی سے ہماری مدد کی ہے اس کے لیے تو ہمارے پاس شکریے کے الفاظ تک نہیں ہیں۔ آپ سے کسی قسم کا شکوہ ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہاں، میں ذاتی طور پر آپ سے ان تکالیف کے لیے معذرت خواہ ہوں جو میری ذات سے آپ کو پہنچیں۔ میں جانتا ہوں کہ میں جانے انجانے میں آپ کے لیے بار بار تکلیف کا باعث بنتا رہا ہوں۔'' اسلم کے الفاظ بہت سادہ لیکن لہجہ بہت خاص تھا۔ الفاظ سے تو یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا تھا کہ اس کا اشارہ ان واقعات کی طرف ہے جب وہ ایک ڈاکو کی حیثیت سے چودھری کا آلۂ کار بن کر اس کے خلاف کام کر رہا تھا... لیکن لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ کسی اور تکلیف کا ذکر کر رہا ہے۔

اس کے لہجے نے شہریار کو چونکا دیا اور وہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ کیا اسلم اس کے اور ماہ بانو کے درمیان موجود تعلقِ خصوصی سے واقف تھا؟ اپنے ذہن میں ابھرنے والے اس خیال کی تصدیق کے لیے اس نے بغور اسلم کے چہرے کا جائزہ لیا لیکن اب وہ اس سے بالکل انجان بنا اس چھوٹے سے ہینڈ بیگ کا جائزہ لے رہا تھا جس میں ان دونوں کے سفری کاغذات موجود تھے۔

شہریار ایک گہرا سانس لے کر رہ گیا۔ اسلم کا یہ انجان بنتا ہی بھید کھول گیا تھا کہ معاملہ وہی ہے جو اس نے سمجھا ہے۔ اب معلوم نہیں کہ اسلم کی یہ آگاہی اس کی اپنی ذہانت اور زبردست قوتِ مشاہدہ کی وجہ سے تھی یا ماہ بانو نے خود اس کے ساتھ اپنے جذبات کو شیئر کر لیا تھا... کیونکہ بعض صاف گو لڑکیاں ایسی ہوتی ہیں جو سمجھتی ہیں کہ اپنے ماضی کی وابستگیوں کو اپنے شوہر سے چھپانا بددیانتی کے زمرے میں آتا ہے۔ لیکن وہ خود اپنی جگہ یہ سمجھتا تھا کہ ماہ بانو کو اس قسم کی شیئرنگ کی کوئی ضرورت نہیں تھی کیونکہ ان دونوں کے درمیان جو کچھ بھی تھا، وہ ہمیشہ اَن کہا رہا تھا اور اس اَن کہے جذبے کا تقدس اسی میں تھا کہ اسے کہیں بھی عیاں نہ کیا جائے۔

''ٹھیک ہے تو پھر مجھے اجازت۔ تم لوگوں کو بھی اب فوری طور پر روانہ ہو جانا چاہیے۔ میں نیچے جا کر ڈرائیور کو اوپر بھیجتا ہوں تاکہ وہ سامان وغیرہ گاڑی تک پہنچانے میں تم لوگوں کی مدد کر سکے۔'' اس معاملے پر مزید سوچنا بیکار سمجھتے ہوئے اس نے اپنا سر جھٹکا اور اسلم کی طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔ اس نے اس کا بڑھا ہوا ہاتھ گرم جوشی سے تھام لیا۔

''اللہ حافظ سر! سی یو اگین۔'' اس کی آنکھوں میں جھانک کر کہتا وہ گویا اسے باور کروا رہا تھا کہ چاہے وہ کچھ بھی کہے لیکن خود وہ دوبارہ ملنے کی امید رکھتا ہے۔ اس کے انداز پر شہریار دھیرے سے مسکرایا اور لحظہ بھر کے لیے ماہ بانو کی طرف متوجہ ہوا۔

''اللہ حافظ۔''

''اللہ حافظ۔'' جواب میں اس کے لبوں نے جنبش ضرور کی لیکن کپکپاتے لبوں سے نکلنے والے الفاظ شہریار کے کانوں تک نہ پہنچ سکے۔ اسے اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ وہ بنا سنے بھی اس کی ہر بات سمجھنے کی صلاحیت رکھتا تھا... لیکن اب ان کے بیچ کہنے سننے کو رہ بھی کیا گیا تھا۔ حالات انھیں جس موڑ پر لے آئے تھے، وہاں سے کچھ کہے سنے بغیر ہی ہمیشہ کے لیے جدا ہو جانا بہتر تھا۔ چنانچہ وہ مزید رکے بغیر وہاں سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

ٹی وی اسکرین پر نظر آنے والا منظر خاصا توجہ کھینچ لینے والا تھا۔ اسکرین پر ایک گاڑی اس حال میں نظر آ رہی تھی کہ اس کی باڈی بُری طرح تباہ ہو گئی تھی اور کھڑکیوں کے شیشوں کے علاوہ ونڈ اسکرین بھی بالکل غائب تھی۔ بُری طرح اندر دھنسے بونٹ اور ٹیڑھے ہو جانے والے اسٹیئرنگ وہیل کو دیکھ کر کوئی بھی اندازہ کر سکتا تھا کہ گاڑی کو چلانے والے شخص کا حشر خراب ہو گیا ہوگا۔ ٹوٹی پھوٹی گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ اور پائدان میں پھیلا ڈھیروں خون اس اندازے کو تقویت بخش رہا تھا۔ منظر کے ساتھ ساتھ بیک گراؤنڈ سے سنائی دیتی نیوز رپورٹر کی آواز وضاحت کر رہی تھی کہ کیا حادثہ پیش آیا ہے۔ شہریار کے اپنے ذاتی حوالوں کے ساتھ ساتھ اس کے لیاقت رانا کے خاندان سے تعلق کا بھی حوالہ دے کر بتایا جا رہا تھا کہ جواں سال اسسٹنٹ کمشنر شہریار عادل کی کار کو لاہور سے نور کوٹ جاتے ہوئے بدترین حادثہ پیش آیا ہے۔ گاڑی ایک ہیوی ٹرک کی زد میں آنے کی وجہ سے بُری طرح تباہ ہو گئی ہے اور گاڑی کو خود ڈرائیو کرتا شہریار عادل بے حد نازک حالت میں سروسز اسپتال منتقل کر دیا گیا ہے۔ ٹرک ڈرائیور کے بارے میں حسبِ معمول یہی رپورٹ تھی کہ وہ موقع سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا ہے۔

اسکرین پر دکھائے جانے والے مناظر ایسے تھے کہ ٹی وی اسکرین کے سامنے صحیح سلامت بیٹھے شہریار کو بھی گمان ہونے لگا تھا کہ واقعی اس کا شدید ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ رہی سہی کسر نیوز رپورٹر کے الفاظ اور لہجے کی سنسنی سے پوری ہو رہی تھی۔ وہ بتا رہا تھا کہ حادثہ کس وقت پیش آیا اور شہریار عادل کی حالت اس وقت کتنی نازک ہے۔ ڈیڑھ دو منٹ پر محیط اس رپورٹ کے بعد اسٹوڈیو میں موجود نیوز اینکر اسکرین پر نظر آنے لگی تھی۔ فل میک اپ اور لہراتے بالوں والی خوش پوش نیوز اینکر ناظرین کو بتا رہی تھی کہ اس واقعے پر بات کرنے کے لیے لیاقت رانا سے رابطہ کرنے کی کوشش کی گئی تھی لیکن وہ اتنے صدمے اور پریشانی میں مبتلا تھے کہ انہوں نے میڈیا کے کسی بھی فرد سے بات کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

لیاقت رانا کی طرف سے انکار ہونے کے بعد انہوں نے آئی جی مختار مراد سے رابطہ کیا جنہوں نے زیادہ تفصیلی بات کرنے کے بجائے صرف مختصراً اتنا ہی کہا کہ حادثے کے ذمے دار ٹرک ڈرائیور کو گرفتار کرنے کی پوری کوشش کی جائے گی۔ ساتھ ہی انہوں نے شہریار کی زندگی اور صحت کے لیے دعا کی بھی درخواست کی۔ نیوز اینکر کے اس سوال کا کہ کیا یہ حادثہ شہریار پر ہونے والے قاتلانہ حملوں کا تسلسل ہے، انہوں نے کوئی واضح جواب نہیں دیا اور اپنی لاعلمی ظاہر کی۔ ان کا جواب سن کر نیوز اینکر نے دو تین جملوں میں شکوک و شبہات کا اظہار کیا اور پھر دوسری خبریں پڑھنے لگی۔

اپنے متعلق چلنے والی خبر ختم ہوتے ہی اس نے ریموٹ کی مدد سے ٹی وی بند کر دیا لیکن تاریک پڑی اسکرین پر بھی گویا اسے وہی مناظر نظر آ رہے تھے۔ اسے اندازہ تھا کہ یہ مناظر اس کے چاہنے والوں کے لیے کتنے تکلیف دہ ہوں گے۔ حقیقت سے واقف لیاقت رانا اور آفرین کو اس نے پہلے ہی خبریں دیکھنے سے منع کر دیا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ سب کچھ جانتے بوجھتے بھی ان لوگوں کو اس چیز سے تکلیف ہو گی۔

وہ اس بات پر بھی مطمئن تھا کہ اس نے یہ سب سامنے آنے سے پہلے ماہ بانو کو پاکستان سے روانہ کر دیا تھا۔ ماہ بانو اور اسلم یقینی طور پر اس وقت نیویارک کی طرف جانے والی پرواز میں سفر کر رہے تھے اس لیے ان تک یہ خبر نہیں پہنچ سکتی تھی۔ وہاں سے انہیں مزید آگے کا سفر کرنا تھا اور پھر اس کے بعد نئے سرے سے زندگی شروع کرنے کی جدوجہد۔ اس لیے اس بات کا امکان کم ہی تھا کہ یہ خبر کبھی ماہ بانو کے کانوں تک پہنچ سکے اور جب خبر نہیں پہنچتی تو اسے تکلیف بھی نہ ہوتی۔ اپنے قریبی فیملی ممبرز اور ماہ بانو کو تکلیف سے بچانے کے بعد بھی وہ جانتا تھا کہ ان کے علاوہ بھی ایسے دوسرے بہت سے لوگ ہیں جن پر یہ خبر بجلی بن کر گرے گی۔ مشاہرم خان، عبدالمنان اور ملازمین کے علاوہ اس فہرست میں وہ دیہاتی بھی شامل تھے جو تھوڑے سے عرصے میں اسے اپنا نجات دہندہ سمجھنے لگے تھے۔ رشتے داروں اور دوست احباب کی ایک اچھی خاصی تعداد ان کے علاوہ تھی لیکن وہ مجبور تھا۔ اسے اپنے پیاروں کو یہ تکلیف دینی ہی تھی کہ اسے اب ان کے لیے بہت کچھ نہیں بلکہ بہت کچھ کرنا تھا۔

آج سے شہریار عادل کا وجود دنیا کے لیے میدانِ عمل سے نکل گیا تھا۔ اب نہ جانے کتنی مدت تک اسپتال کے کمرے میں ہوش و حواس سے بیگانے، بگڑے چہرے والے بے شناخت اشخاص کار کو شہریار عادل سمجھا جانا تھا اور خود شہریار عادل شخصیت کی تبدیلی کے عمل سے گزرنے کے لیے سی آئی اے پی کے ایک خفیہ ٹھکانے پر موجود تھا۔ آج سے اسے بیرونی دنیا سے اپنا تعلق ختم کر دینے کا پابند کر دیا گیا تھا۔ اس کے دونوں سیل فون آف تھے اور اب وہ ایک خاص مدت تک یہاں سے باہر نہیں نکل سکتا تھا۔ اسے یہاں پہنچانے کے بعد ایک طے شدہ شیڈول تھما دیا گیا تھا جس میں تفصیل سے ساری ہدایات درج تھیں۔ یہاں اسے مخصوص اوقات میں سونا جاگنا، کھانا پینا تھا۔ ورزش، مارشل آرٹ کی مشقوں، لب و لہجے اور چال ڈھال میں تبدیلی کی تربیت، جدید اسلحے اور جاسوسی کے لیے استعمال ہونے والے آلات کا استعمال سکھانے کے لیے باقاعدہ ایک انسٹرکٹر مقرر کیا گیا تھا جس نے یہاں پہنچتے ہی اس سے ملاقات کی تھی اور مختصری اس ملاقات میں ہی شہریار کو اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ خاصا سخت گیر اور خشک مزاج آدمی ہے۔ اس نے اپنی نپی تلی گفتگو میں اسے آگاہ کر دیا تھا کہ اسے دیے ہوئے شیڈول کی سختی سے پابندی کرنی ہوگی اور چند سیکنڈوں کی تاخیر بھی قابلِ گرفت سمجھی جائے گی۔ ان تربیتی مراحل سے گزرنے کے ساتھ ساتھ اسے اپنے خدوخال کی تبدیلی کے عمل سے بھی گزرنا تھا۔ اسے بتا دیا گیا تھا کہ چند دن کے بعد ایک ماہر سرجن اس کے اوپر کام شروع کر دے گا اور جب وہ شہریار عادل کے چولے سے نکل کر ایک نئی شخصیت میں ڈھل جائے گا تو دوسرا اور اصل مرحلہ شروع ہوگا۔ اس مرحلے میں وہ اپنے اہداف کے ساتھ میدانِ عمل میں اترے گا اور وہ سب کچھ کر سکے گا جو شاید اس کے لیے اسسٹنٹ کمشنر شہریار عادل کے روپ میں

کرنا کسی صورت بھی ممکن نہ ہو پاتا۔

☆☆☆

شہزادی اور اس کے معصوم بچے کی لاشیں گھر کے صحن میں بچھی چارپائیوں پر رکھی ہوئی تھیں۔ ان لاشوں کے گرد اس کے بڑے بچے بیٹھے زار و قطار رو رہے تھے اور بار بار ماں کو آواز دے کر جگانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ایک طرف اس کی ساس بھی بیٹھی دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔ اسے یہ غم ستا رہا تھا کہ اس بڑھاپے میں جبکہ وہ خود دوسروں کی محتاج تھی، کیسے شہزادی کے بچوں کو پالے گی۔ بیٹے کی زندگی میں بڑے ٹھسے سے رہنے والی وہ عورت جس نے مظلوم بہو کی زندگی اجیرن کر رکھی تھی، اب بہو کے مرنے کے بعد اپنی زندگی کے بچے کھچے دن مشقت و پریشانی کی نذر ہوتے دیکھ کر خوف زدہ تھی اور یہ خوف ہی اسے رونے اور بین کرنے پر مجبور کر رہا تھا۔

آج صبح ہی بہرام اور فاریسٹ آفیسر کے تین مزید ملازمین نے یہ لاشیں شہزادی کے گھر پہنچائی تھیں۔ ان کے بیان کے مطابق شہزادی اور اس کے بچے کو رات کے کسی پہر زہریلے سانپ نے ڈس لیا تھا۔ صبح جب شہزادی مقررہ وقت پر کوارٹر سے نہیں نکلی تو بنگلے کی ایک ملازمہ اسے جگانے کے لیے گئی تھی اور اسی نے ماں بچے کی منہ سے جھاگ نکلتی لاشیں دیکھی تھیں۔ دونوں کے جسموں پر سانپ کے کاٹنے کے واضح نشانات ملے تھے۔ اس لیے موت کی وجہ کا فوراً ہی تعین ہو گیا اور لاشیں تعزیتی پیغام اور کچھ رقم کے ساتھ گاؤں بھجوا دی گئیں۔ شہزادی کو قابلِ نفرت سمجھنے کے باوجود گاؤں کی عورتیں اس کے گھر پہنچ گئی تھیں اور اب مختلف ٹولیوں میں بیٹھی تبصرے اور تجزیے کر رہی تھیں۔ کسی کو اس کی جوان جہان موت پر افسوس تھا تو کوئی اس کے تنہا رہ جانے والے بچوں کے لیے فکرمند تھی۔ البتہ اس بات پر ان میں سے ہر ایک متفق تھی کہ شہزادی کو اس کے کیے کی سزا ملی ہے۔ کچھ عرصے قبل چاہے مجبوری اور دباؤ کے باعث ہی اس نے قبر سے مُردہ بچے کے اعضا چوری کرنے کی جو قبیح حرکت کی تھی، اسے کسی نے فراموش نہیں کیا تھا اور سب کا یہی خیال تھا کہ اس پر اپنی حرکت کی وجہ سے اللہ کا عذاب نازل ہوا تھا۔

تبصرے کرتی عورتیں بار بار اپنے کانوں اور گالوں کو ہاتھ لگا کر استغفار پڑھ رہی تھیں۔ عورتوں کے علاوہ گھر کے باہر مرد بھی جمع تھے اور ان کی گفتگو بھی تقریباً انہی نکات پر مشتمل تھی۔ انہی میں سے کسی نے یہ شوشہ بھی چھوڑ دیا تھا کہ ایسی گناہ گار عورت کی تجہیز و تکفین ایک مسلمان کی حیثیت سے نہیں کی جا سکتی، نہ ہی اسے مسلمانوں کے قبرستان میں جگہ دی جا سکتی ہے۔ اس خیال کے سامنے آتے ہی بہت سے لوگ فوراً ہی قائل ہو گئے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ میتوں کے پہنچائے جانے کے بعد کئی گھنٹے گزرنے کے باوجود ابھی تک دونوں لاشیں بے غسل و کفن پڑی ہوئی تھیں۔ آخرکار بات گاؤں کے تھانے تک بھی پہنچ گئی۔ تھانیدار نے سمجھ داری سے کام لیتے ہوئے دو کام کیے۔ اول یہ کہ اس نے لاشوں کی حفاظت کے لیے دو سپاہی بھیج دیے۔ دوم واقعے کی اطلاع اے ہی آفس میں کر دی۔ وہاں سے اسے ہدایت ملی کہ لاشیں مرکزِ صحت منتقل کر کے ان کی کڑی نگرانی کی جائے اور اس وقت تک کسی کو وہاں پھٹکنے نہ دیا جائے جب تک ان کی طرف سے بھیجی جانے والی ایمبولینس وہاں پہنچ کر لاشوں کو وصول نہ کر لے۔ تھانیدار نے فوراً اس حکم پر عمل درآمد کروایا جبکہ دوسری طرف حکم جاری کرنے والا عبدالمنان اس اطلاع کو سن کر پریشانی اور تشویش کا شکار تھا۔ اسے معلوم تھا کہ شہزادی، شہریار کے لیے کام کر رہی تھی اور مشابرم خان اسی کام کی وجہ سے ہر شام ہیرآباد تک دوڑ لگانے پر متعین تھا لیکن کل شہریار کو پیش آنے والے حادثے کا سن کر وہ اپنے حواسوں کو قابو میں نہیں رکھ سکا اور اپنی ڈیوٹی بھول کر لاہور کے لیے روانہ ہو گیا۔

اس وقت وہ لاہور میں ہی موجود تھا اور ڈاکٹرز کی طرف سے مریض کو دیکھنے کی پابندی کے باوجود اسپتال میں ہی ڈیرا ڈالے ہوئے تھا۔ خود عبدالمنان کی بھی دلی خواہش یہی تھی کہ وہ لاہور پہنچ جائے لیکن اس کا نورکوٹ میں رہ کر یہاں کے معاملات پر نظر رکھنا بھی ضروری تھا۔ چنانچہ وہ خود پر جبر کر گیا تھا لیکن مشابرم خان سے مسلسل رابطہ رکھے ہوئے تھا جس کے پاس کوئی امید افزا خبر نہیں تھی اور ہر بار اس کے استفسار کے جواب میں وہ یہی بتاتا تھا کہ شہریار کو ہنوز ہوش نہیں آیا ہے۔ پریشانی کے اس عالم میں شہزادی کی حادثاتی موت کی خبر نے اسے مزید تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ شہزادی کو کیا ٹاسک دے کر فاریسٹ آفیسر کے بنگلے پر بھیجا گیا تھا لیکن یہ واضح تھا کہ مشابرم خان کی پہلی ہی غیر حاضری میں وہ اپنی جان سے چلی گئی تھی۔ اب معلوم نہیں کہ یہ کوئی اتفاق تھا یا وہ جان بوجھ کر شکار بنائی گئی تھی۔ حقائق جاننے کے لیے اس نے لاشیں نورکوٹ منگوانے کا فیصلہ کر لیا تھا تاکہ لاشوں کے پوسٹ مارٹم کے بعد صورتِ حال واضح ہو سکے۔ ساتھ ہی اس نے مشابرم خان کو بھی اس واقعے کی اطلاع دے دی تھی۔ اطلاع سن کر وہ بھی سخت پریشان ہوا تھا اور تھوڑی سی شرمندگی بھی محسوس کر رہا تھا کہ اس کی بے توجہی کی وجہ سے شہزادی کی جان چلی گئی۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ شہریار کے حادثے کے بعد اسے یہ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ موجودہ حالات میں وہ کیا لائحہ عمل اختیار کرے۔

اس وقت تو وہ سب سے زیادہ شہریار کے لیے فکرمند تھا اور مسلسل ایسی کیفیت میں مبتلا تھا کہ اسے لگتا تھا کوئی اس کے دل کو چھری طرح مسل رہا ہے۔ اس کیفیت سے وہ پہلے بھی گزر چکا تھا۔ اپنے چھوٹے بھائی اکرام خان کی موت اور صدمے سے کومے میں چلی جانے والی ماں کی حالت پر بھی اس کی یہی کیفیت ہوئی تھی۔ وہ اس وقت بھی پوری طرح ہاتھ پیر مارنے کے باوجود اپنے پیاروں کے لیے کچھ نہیں کر سکا تھا اور اب بھی بے بسی کا شکار تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ شہریار کے ساتھ پیش آنے والا حادثہ صرف حادثہ نہیں بلکہ قاتلانہ حملہ تھا لیکن ابھی تک شہریار کے کسی قریبی رشتے دار نے اس کے خیال کی تائید نہیں کی تھی۔ وہ سب اسے حادثہ ہی سمجھ رہے تھے اور اسی خیال کے مطابق پولیس بھی اپنا کام کر رہی تھی۔

مشابرم خان اس صورتِ حال پر مطمئن نہیں تھا لیکن فی الحال اسپتال سے ہٹ کر کہیں جا بھی نہیں سکتا تھا۔ جب تک اسے شہریار کے بارے میں کوئی حتمی اطلاع نہیں مل جاتی، اس کے لیے کچھ بھی کرنا ممکن نہیں تھا۔ پریشانی اور دکھ کے عالم میں ادھر سے اُدھر ٹہلتے ہوئے البتہ اسے اتنا ضرور یاد آ گیا کہ کسی خاص موقع پر اپنی عدم دستیابی کی صورت میں شہریار نے اسے ذیشان سے رابطہ کرنے کی ہدایت کی تھی۔ یہ بات یاد آتے ہی اس نے فوراً اپنے موبائل میں فیڈ ذیشان کا ..... نمبر ڈائل کیا اور اسے واقعے کی اطلاع دے دی۔

”ٹھیک ہے۔ میں اس معاملے کو دیکھ لیتا ہوں۔ تم میری طرف سے کوئی ہدایت ملنے سے قبل اپنی مرضی سے کوئی قدم نہیں اٹھانا۔“ ساری بات سن کر ذیشان نے اسے سنجیدگی سے حکم دیا جس کے جواب میں وہ صرف ”یس سر“ ہی کہہ سکا۔ فی الحال تو اس کا خود بھی یہاں سے ہٹ کر کہیں جانے اور کچھ کرنے کا پروگرام نہیں تھا۔

☆☆☆

”مبارک ہو سنتھیا! اب تو تم خوش ہو گی۔ جس کا ہم اور تم مل کر کچھ نہیں بگاڑ سکے، اس سے اوپر والے نے انتقام لے لیا۔ میں نے اپنے ذرائع سے معلوم کروایا ہے۔ شہریار کی حالت بہت نازک ہے۔ پورے جسم پر شدید زخموں کے علاوہ اس کے سر پر بھی چوٹ آئی ہے جس کی وجہ سے وہ مستقل بے ہوش ہے اور ڈاکٹرز اس کی زندگی کی طرف سے خاصی تشویش کا شکار ہیں۔ خدشہ ظاہر کیا جا رہا ہے کہ اس کی زندگی بچا بھی لی گئی تو وہ کسی دوسرے بڑے نقصان سے دوچار ہو سکتا ہے۔ اس نقصان میں اس کا ذاتی توازن بگڑ جانے سے لے کر طویل مدت کے لیے کوما میں چلے جانے تک کچھ بھی شامل ہو سکتا ہے۔ تاہم ابھی کوئی حتمی رائے دینے سے گریز کیا جا رہا ہے۔ بہرحال جو بھی ہو، یہ طے ہے کہ ہماری راہ کا ایک کانٹا نکل گیا ہے اور اب تم اس بات پر غم زدہ نہیں رہو گی کہ تمہاری بیٹی کو موت کے منہ میں دھکیلنے والا شخص مزے سے زندہ ہے۔“ سنتھیا نے ٹھٹکتی آواز میں بولتے ورما کا ہر لفظ بہت سکون سے سنا اور جب وہ خاموش ہوا تو نہایت سنجیدگی سے بولی۔

”کیا تمہیں یقین ہے کہ جو کچھ کہا اور دکھایا جا رہا ہے وہ سچ ہے؟“

”کیا مطلب؟“ ورما گویا اچھل پڑا۔ ”کیا تمہیں شک ہے کہ یہ کوئی ڈراما ہے؟“

”نہیں، میں نے یہ نہیں کہا لیکن اتنی آسانی سے کسی بات کو قبول کر لینا ہماری تربیت کا حصہ نہیں۔ اس لیے مجھے امید ہے کہ تم نے میڈیا پر نشر کی جانے والی خبر کی اپنے ذرائع سے بھی تصدیق کی کوشش کی ہو گی۔“ وہ ہنوز سنجیدہ تھی۔

”آف کورس..... میں نے ایسا کیا ہے اور اس سلسلے میں کافی معلومات اکٹھی کر لی ہیں۔ حادثہ جس سڑک پر پیش آیا، وہاں سے صرف پرائیویٹ گاڑیاں اور لوڈرز وغیرہ ہی گزرتے ہیں۔ شہریار کی گاڑی کو ایک ایسے ٹرک نے ٹکر ماری جس پر دوسرے شہر بھجوایا جانے والا الیکٹرونک کا سامان لوڈ تھا۔ حادثے کی اطلاع بعد میں وہاں پہنچنے والے معیز نامی ایک کار سوار نے دی۔ میں نے اس شخص کا بھی پورا بائیو ڈیٹا معلوم کر لیا ہے۔ وہ ایک عام سا کاروباری شخص ہے جس نے اپنی کار میں وہاں سے گزرتے ہوئے دیکھا کہ ایک کار کو ٹرک سے زبردست حادثہ پیش آ گیا ہے اور ٹرک ڈرائیور موقع سے مفرور جبکہ کار سوار شدید زخمی ہے۔ اس نے سب سے پہلے ایمبولینس کے لیے کال کی اور پھر پولیس کو حادثے کی اطلاع دی۔

”ایمبولینس اور پولیس کی گاڑی دونوں آگے پیچھے وہاں پہنچیں اور اسپتال پہنچنے سے پہلے پہلے ہی انہیں معلوم ہو گیا کہ حادثے کا شکار ہونے والا کون ہے؟ اس لیے انہوں نے اسی حساب سے معاملے کو ہینڈل کیا۔ میں نے ایمبولینس

سروس کے دفتر کے ریکارڈ سے بھی حادثے کے وقت کی تصدیق کرلی ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ حادثے کا ذمے دار مفرور ٹرک ڈرائیور پہلے بھی کوئی اچھا ریکارڈ نہیں رکھتا ہے۔ اس سے پہلے بھی اس پر دو اس قسم کے حادثات کا الزام ہے لیکن وہ جس ٹرانسپورٹر کے لیے کام کرتا ہے، وہ بہت پہنچ والا ہے اس لیے دونوں بار اس نے اپنے آدمی کو بڑی دیدہ دلیری سے بچالیا۔ اسے اپنے کام میں زیادہ مشکل اس لیے بھی پیش نہیں آئی کہ ان دونوں حادثات کا شکار ہونے والے متوسط طبقے کے لوگ تھے جن میں اتنا دم نہیں تھا کہ اس ٹرانسپورٹر کے سامنے ٹک سکتے۔ اس لیے اس کا چہیتا ڈرائیور بغیر کسی سزا اور حساب کتاب کے آرام سے سڑکوں پر دندناتا رہا لیکن ظاہر ہے اب سچویشن مختلف ہے۔ پولیس اس ڈرائیور کو گرفتار کرنے کے لیے پورا زور لگا دے گی اور وہ پکڑا گیا تو سزا سے بھی نہیں بچ سکے گا۔ دوسری صورت یہ ہوسکتی ہے کہ اس کا آقا اسے بچانے کے لیے علاقہ غیر کی طرف بھگا دے اور وہ پھر بھی منظر پر ہی نہ آئے۔" ورما نے اسے اپنی کارگزاری کے بارے میں تفصیل سے بتایا لیکن وہ جواب میں کچھ نہیں بولی اور خاموشی سے بیٹھی کسی سوچ میں ڈوبی رہی۔

"مجھے بتاؤ کہ تمہارے دماغ میں کیا چل رہا ہے؟ اتنا سب کچھ سن لینے کے بعد بھی مجھے تم مطمئن نہیں لگ رہیں۔" پیپر ویٹ کو اضطراری طور پر گھماتے ہوئے ورما بولا تو اس کے لہجے سے جھنجلاہٹ عیاں تھی۔

"صاف بات ہے کہ مجھے یہ معاملہ اتنا سیدھا نہیں لگ رہا۔ خبروں میں بتایا گیا ہے کہ حادثہ اتنا شدید تھا کہ شہریار کے ہاتھ پیر بری طرح کچلے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ چہرے پر بھی گہرے زخموں کا بطورِ خاص ذکر کیا گیا ہے اور یہ چیز مجھے شک میں مبتلا کررہی ہے۔ تم اگر دماغ پر ذرا زور دو تو یہ بھی تو سوچ سکتے ہو کہ اس طرح کی انجریز کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ شناخت کو چھپایا جاسکے۔ فرض کرو، انہوں نے شہریار کے بجائے کسی دوسرے بندے کو قربانی کا بکرا بنادیا ہو تو وہ اس کی شناخت چھپانے کے لیے کیا اقدامات کریں گے۔ آدمی کی سب سے پہلی شناخت ہوتی ہے اس کا چہرہ۔ جب چہرہ ہی مسخ ہوگیا تو اسپتال میں پڑے بندے کو دیکھ کر کون جان سکے گا کہ وہ شہریار ہی ہے یا اس کی جگہ کوئی اور۔ اب آگے آئیں ہم تصدیق کے دوسرے ذریعے یعنی فنگر پرنٹس کی طرف تو مجھے یقین ہے کہ ہم ان کے ذریعے بھی تصدیق نہیں کرسکیں گے کیونکہ حادثے میں اس کے ہاتھ پیر بری طرح کچلے گئے ہیں۔" وہ جوں جوں بولتی جارہی تھی، ورما کی آنکھیں پھیلتی جارہی تھیں۔

"یو آر جینئس سنتھیا! واقعی ایسا ممکن تو ہے لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ اس سارے ڈرامے کی کیا ضرورت تھی؟"

"وہ کسی بھی وجہ سے یہ ڈراما کرسکتا ہے۔ سب سے پہلی وجہ تو یہی ہوسکتی ہے کہ اس طرح وہ ہماری نظروں سے چھپ کر خود کو محفوظ رکھنا چاہتا ہو کیونکہ آدمی کتنا ہی بہادر کیوں نہ ہو، اپنی جان اسے بہرحال پیاری ہوتی ہے۔ اس نے سوچا ہوگا کہ جب وہ سامنے ہی نہیں ہوگا تو ہم اسے نشانہ کیسے بنائیں گے۔ دوسرا مقصد یہ ہوسکتا ہے کہ وہ چھپ کر وہ بہ آرام سے ہمارے خلاف کارروائی کرتا رہے اور ہمارا دھیان اس کی طرف نہ جاسکے۔ اصل وجہ جو بھی ہوگی وہ تو وہ خود جانتا ہوگا... اور ہونے کو یہ بھی ہوسکتا ہے کہ میرے سارے شکوک و شبہات غلط ہوں اور واقعی وہ حادثے کا شکار ہوکر اسپتال میں پڑا ہو۔ لیکن اس بات کو بغیر تصدیق کے میں نہیں مان سکتی۔ ہمیں ہر حال میں تصدیق کرنی ہوگی کہ وہ شخص شہریار ہی ہے یا نہیں، اس کے بعد ہی میں مطمئن ہوسکوں گی۔" اس کا انداز بڑا دوٹوک تھا اور ورما اس سے سینئر ہونے کے باوجود دل میں تسلیم کرتا تھا کہ وہ دوسروں کی نسبت زیادہ ذہین اور بیدار مغز عورت ہے۔ اس لیے اس کے کسی بھی اندازے سے اختلاف کرنے کے بجائے میز پر ذرا آگے کی طرف جھک کر بیٹھتے ہوئے اس سے استفسار کیا۔

"پھر تم نے کیا سوچا ہے؟ کس طرح چیک کرو گی کہ وہ بندہ شہریار ہی ہے یا نہیں؟"

"میں اس کا ڈی این اے ٹیسٹ کرواؤں گی۔ تم جانتے ہو کہ ماریا ایک ڈاکٹر تھی اور بیوی کی حیثیت سے اس کے پاس موقع تھا کہ شہریار کا ڈی این اے ریکارڈ حاصل کرسکے اس لیے اس نے احتیاطاً یہ کام کر ڈالا۔ خوش قسمتی سے میرے پاس اب بھی وہ ریکارڈ موجود ہے اس لیے تصدیق کرنا مشکل نہیں ہے۔ ہم کوشش کرکے اسپتال میں داخل شخص کا ڈی این اے سیمپل حاصل کرلیں تو سارا مسئلہ حل ہوجائے گا۔" اس کا ذہن پوری طرح کام کررہا تھا اور زخمی کے شہریار ہونے یا نہ ہونے کی تصدیق کے لیے اس نے جو تدبیر سوچی تھی، وہ بھی بالکل درست تھی۔

"ٹھیک ہے ڈارلنگ! میں سمجھ گیا۔ اب تم بے فکر ہوجاؤ۔ اسپتال سے بلڈ وغیرہ کے نمونے حاصل کرنا میرا کام ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ جلد از جلد یہ کام نمٹالوں تاکہ ہماری الجھن دور ہو اور آگے کی پلاننگ کی جاسکے۔" ورما نے

اسے اطمینان دلایا تو پہلی بار اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ نظر آئی۔

ورما کے ڈارلنگ کہہ کر مخاطب کرنے پر بے ساختہ ہی اسے ماضی کے وہ روز و شب یاد آگئے تھے جب وہ جوان تھی اور اپنے نام نہاد شوہر کی لاعلمی میں ورما کے ساتھ کتنے ہی رنگین و سنگین لمحات گزار چکی تھی۔ اس کے حسن اور ذہانت کے سامنے ورما ہمیشہ ہی ہتھیار ڈال دیتا تھا اور ورما کے ایسے کئی راز اس کے علم میں آجاتے تھے جنہیں عالمِ ہوش میں ورما کبھی اپنی زبان پر نہ لاتا۔ ورما کے علاوہ دوسرے اور بھی افسران تھے جنہیں اس نے اپنے ان ہتھیاروں سے زیر کررکھا تھا لیکن پھر جب وقت نے اپنی چال چلی اور وہ جوانی کے ساتھ ساتھ اس کی حشر سامانیوں سے بھی محروم ہوگئی تو اس کے چاہنے والے بھی بھیڑ کی طرح چھٹ گئے۔ اس موقع پر اس نے اپنی ذہانت کا ہتھیار اور بھی تیز کرلیا اور کئی ایسے کارنامے انجام دیے کہ را میں اس کی حیثیت پہلے سے بھی زیادہ مستحکم ہوگئی۔ باقی جن معاملات میں حسن و جوانی کی محتاج تھی، وہ ماریا نے سنبھال لیے لیکن اس کی بدقسمتی کہ وہ بہت جلد ماری گئی اور اپنی ماں کی طرح موساد کے لیے اَن گنت خدمات انجام نہیں دے سکی۔ ماریا کا خیال ذہن میں آتے ہی اس کے ہونٹ سختی سے بھنچ گئے اور وہ ورما کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"تمہیں معلوم ہے ورما کہ شہریار نے ماریا کے بارے میں کیا موقف اختیار کیا تھا؟ اس کے فیملی ممبرز ماریا کے بارے میں لوگوں کے استفسار کے جواب میں بتارہے ہیں کہ شہریار اس حادثے سے کئی دن قبل ذہنی ہم آہنگی نہ ہونے کی وجہ سے ماریا کو طلاق دے چکا تھا اور اب ان میں سے کسی کو نہیں معلوم کہ ماریا کہاں ہے۔ لیاقت رانا نے خیال ظاہر کیا ہے کہ شاید ماریا اپنی کسی کے ساتھ ملک سے باہر چلی گئی ہے۔ دیکھی تم نے اس کی چالاکی... کتنی آسانی سے اس نے خود کو میری بیٹی کے قتل کے الزام سے بچالیا۔ ایسے شخص کے بارے میں کسی بھی بات کو کیسے آسانی سے تسلیم کیا جاسکتا ہے۔ جب وہ اتنے اہم رشتے سے اتنی آسانی سے اپنی جان چھڑا سکتا ہے تو کچھ بھی کرسکتا ہے۔ اس لیے اس شخص کے زندہ یا مُردہ دونوں حالتوں میں مجھے یہ ثبوت چاہیے کہ وہ شہریار عادل ہے یا نہیں۔ نہ ہونے کی صورت میں، میں اسے ہر صورت تلاش کروں گی اور ویسی ہی دردناک موت دوں گی جو میری بیٹی کے حصے میں آئی۔" فرطِ جوش سے اس کا وجود کانپنے لگا۔

"ریلیکس سنتھیا! جو تم چاہو گی اور جیسا چاہو گی ویسا ہی ہوگا۔ اب تم جاؤ اور جاکر آرام کرو۔ جیسے ہی کوئی اچھی خبر ملی، میں تمہیں اطلاع دے دوں گا۔" پرانے تعلقات کے لحاظ میں ورما اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے قریب آیا اور اس کا شانہ تھپکتے ہوئے تسلی دی۔ خود سنتھیا کو بھی احساس ہوگیا کہ وہ اپنی عادت سے کہیں زیادہ بڑھ کر جذباتیت کا مظاہرہ کرچکی ہے، چنانچہ فوراً ہی خود کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگی اور بہت تیزی سے اس کوشش میں کامیاب بھی ہوگئی۔

"سوری، میں ذرا جذباتی ہوگئی تھی۔" ورما سے مختصر سی معذرت کرکے وہ اٹھ کر اس کے کمرے سے باہر نکلی تو وہی باوقار اور باحوصلہ سنتھیا لگ رہی تھی جسے سب جانتے تھے۔ لیکن وہ خود یہ بات جانتی تھی کہ اپنی اکلوتی بیٹی کلارا اینڈرسن المعروف ماریا جوزف کی موت نے اسے اندر سے کس بُری طرح توڑ پھوڑ کر رکھ دیا ہے۔

☆☆☆

"میرے پاس آپ کے لیے ایک اہم اطلاع ہے سر!" اسپتال کے اس کمرے میں جہاں اشیش کمار، شہریار کے نام سے داخل تھا، باری باری ڈیوٹی دینے والی دو نرسوں میں سے ایک نے ڈیشان سے رابطہ کرکے یہ الفاظ ادا کیے تو وہ چونک گیا۔ حقیقتاً اس خاص کمرے میں شفٹوں میں ڈیوٹی دینے والی دونوں ہی نرسیں سی آئی ایف بی کا حصہ تھیں اور انہیں حکم تھا کہ روزانہ کی رپورٹ دینے کے علاوہ اگر کوئی بات بہت خاص محسوس ہو تو فوری طور پر رابطہ کریں۔ اس وقت نائٹ شفٹ میں کام کرنے والی نرس نے اس سے رابطہ کیا تھا اور بتارہی تھی کہ اس کے پاس کوئی اہم اطلاع ہے۔

"بتاؤ۔" اس نے نرس کو صرف ایک لفظی حکم دیا۔

"کچھ دیر پہلے مجھ سے کسی آدمی نے میرے موبائل پر رابطہ کیا ہے۔ اس نے مجھے آفر کی ہے کہ اگر میں اسے مسٹر شہریار کے بال اور بلڈ سیمپل پرووائڈ کردوں تو مجھے بدلے میں پانچ لاکھ روپے مل سکتے ہیں۔"

"گڈ، اچھی آفر ہے۔ تم نے اسے کیا جواب دیا؟"

"میں رشوت خور نہیں ہوں سر!" وہ گویا بُرا مان گئی لیکن پھر سنبھل کر بتانے لگی۔ "فی الحال میں نے سوچنے کا وقت لے کر اس آدمی کو ٹال دیا ہے۔ ایک گھنٹے بعد وہ مجھے پھر فون کرے گا۔ اب آپ جیسا کہیں، میں اسے ویسا جواب دے دیتی ہوں۔"

"تم اس کی آفر قبول کرلو بلکہ چاہو تو رقم پر تھوڑی سی بحث کرکے اس میں اضافہ بھی کرواسکتی ہو۔ اس طرح اسے

یقین ہو جائے گا کہ تم کوئی لالچی عورت ہو اور پیسے کی خاطر اس کا کام کرنے کے لیے تیار ہو۔"

"او کے سر! جیسی آپ کی مرضی۔" اس نے فرمانبرداری سے جواب دیا۔

"اس آدمی نے تمہیں جس نمبر سے کال کی تھی، اس کے بارے میں تم کیا کہتی ہو؟"

"وہ کسی پبلک کال آفس کا نمبر تھا اور اس سے اسے ٹریس کرنے میں کسی کامیابی کا امکان نہیں ہے۔" اس نے ذیشان کے سوال کے جواب میں دوٹوک رائے دی۔

"میرا بھی یہی اندازہ تھا۔ اگلی کال وہ یقیناً پھر کسی نئے نمبر سے کرے گا۔ بہرحال، تم اسے اثبات میں جواب دے دینا۔ بال اور خون کے نمونے تھوڑی دیر میں تم تک پہنچا دیے جائیں گے۔ پہنچانے والا خود باہر ہی موجود رہے گا۔ تم نمونوں اور رقم کے تبادلے کا طریقہ کار طے ہوتے ہی مجھے انفارم کر دینا۔ آگے کے معاملات میں خود سنبھال لوں گا۔" وہ نرس کو ہدایات دینے لگا۔

"ٹھیک ہے سر! میں سمجھ گئی۔"

"کوئی اور خاص بات تو نہیں ہے؟" ذیشان نے فون بند کرنے سے پہلے اس سے دریافت کیا۔

"نو سر! کوئی اور بات ہوئی تو میں آپ کو انفارم کر دوں گی۔" اس نے سنجیدگی سے جواب دیا تو ذیشان نے کال منقطع کر دی اور تیزی سے اپنی جگہ چھوڑ دی۔ اب وہ اس جگہ جا رہا تھا جہاں شہریار رہائش پذیر تھا۔ راستے میں فون کر کے اس نے وہاں موجود انچارج کو فون کر کے دونوں نمونے حاصل کر کے اسپتال کی طرف روانہ کرنے کا حکم دے دیا تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ ان چیزوں کا مطالبہ کرنے والا نرس کو کتنی مہلت دے گا اس لیے بہتر تھا کہ اس کے دوبارہ رابطہ کرنے سے پہلے دونوں چیزیں اسپتال پہنچ جائیں۔ بیس سے پچیس منٹ کی ڈرائیو کر کے وہ وہاں پہنچا تو شہریار اس کا منتظر تھا۔

"میرے بالوں اور خون کی اچانک کیا ضرورت پڑ گئی تھی جو تم نے مجھے کھانے کی میز پر سے اٹھوا دیا؟" رسمی علیک سلیک کے بعد شہریار نے اس سے پہلا سوال یہی کیا۔

"مجھے خیال نہیں تھا کہ تم اس وقت کھانا کھا رہے ہو گے۔ ویسے اگر معلوم بھی ہوتا تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ دو چار بال اور چٹکی بھر خون لینے کے لیے میں تمہارے ڈنر ختم کرنے کا انتظار ہرگز نہیں کرتا کیونکہ دونوں کام تو کھانا کھاتے ہوئے ڈائننگ ٹیبل پر بھی آسانی سے نمٹائے جا سکتے تھے۔ کرنا کیا تھا، ایک بندہ تمہاری کرسی کے قریب کھڑا ہو کر تمہارے سر سے دو چار بال نوچتا اور پھر ایک ہاتھ میں سوئی گھسا کر سرنج بھر لیتا۔ تمہیں کھانا روکنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی، آرام سے کھاتے رہتے۔" مختصر عرصے کی دوستی میں ہی وہ شہریار کی عادت و اطوار سے واقف ہو گیا تھا اور جانتا تھا کہ وہ خاصا نفاست پسند بندہ ہے اس لیے اسے چھیڑنے کے لیے مزے سے بولا۔

"وہ جو گھڑی کی سوئیوں سے بندھا اپنی کیشش کا مارا انسٹرکٹر تم نے میرے سر پر مسلط کیا ہوا ہے، وہ مجھے ایسی حرکت کرنے دے سکتا تھا؟ تمہارا فون ملتے ہی اس نے مجھے ٹیبل سے اٹھایا اور سیدھا لے جا کر لیب میں بٹھا دیا۔ میں تو ڈر گیا کہ کہیں مجھے بتائے بغیر بالکل اچانک ہی تو میرے کل پرزوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ شروع نہیں ہونے والی۔" وہ ذیشان کا مذاق سمجھ گیا تھا اس لیے خود بھی اسی کے انداز میں جواب دیا۔

"ہاں یار! اس انسٹرکٹر کا ساتھ تو تمہارے لیے کریلا اور وہ بھی نیم چڑھا والا حساب ہو گیا ہے۔ تم پہلے ہی ماشاءاللہ کم نہیں تھے، اب اس کی تربیت کے بعد جانے کیا بن جاؤ گے۔" ذیشان نے اس طرح منہ لٹکا کر کہا کہ اس کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"اب یہ اداکاری بند کرو اور بتاؤ کہ اصل کہانی کیا ہے؟ تھوڑی دیر بعد میری اگلی کلاس کا ٹائم ہو جائے گا تو انسٹرکٹر صاحب تمہاری موجودگی کی پروا کیے بغیر مجھے یہاں سے اٹھا کر لے جائیں گے۔" اس نے ذیشان کو دھمکایا تو وہ پہلے تو بُرے بُرے منہ بنانے لگا پھر سنجیدہ ہو کر بتانا شروع کیا۔

"ہمارے خدشات درست ثابت ہوئے ہیں۔ دشمنوں نے ہماری طرف سے جاری کی جانے والی حادثے کی خبر کو کافی نہیں سمجھا اور وہ اپنے طور پر تصدیق کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ حادثے کا شکار ہونے والا شخص شہریار عادل ہی ہے یا نہیں۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے تمہارے بال اور خون کا نمونہ حاصل کرنے کی کوشش کی ہے اور میں انہیں اس کوشش میں کامیاب کروا کر ان کی تسلی کا انتظام کر رہا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ اس کے بعد انہیں یقین ہو جائے گا کہ اسپتال کے بستر پر بے بس پڑا آدمی شہریار عادل ہی ہے اور اس کے بعد تم ان کے دل و دماغ سے نکل جاؤ گے۔"

"مجھے معلوم تھا کہ وہ لوگ جتنے مکار ہیں، آسانی سے

ہماری چال میں نہیں آئیں گے۔ تم نے اچھا کیا کہ ان کی تسلی کا سامان کر دیا۔ ویسے انھوں نے اس کام کے لیے رابطہ کس سے کیا تھا؟" اس نے ذیشان کی بات پر تبصرہ کرتے ہوئے اس سے پوچھا تو جواب میں اس نے تفصیل کہہ سنائی۔

"بالکل ٹھیک۔ آگے یقیناً تمہارے آدمی اس شخص کا تعاقب کرنے کے لیے تیار ہوں گے جو اس نرس سے سیمپل لینے آئے گا۔" اس نے اندازہ لگایا۔

"یقیناً موجودہ حالات میں جبکہ ہم تقریباً اندھیرے میں کھڑے ہیں، وہ شخص ہمیں دشمنوں میں سے کسی اہم شخص تک پہنچا سکتا ہے۔" ذیشان نے جواب دیا۔

"تم ٹھیک سوچ رہے ہو لیکن اپنے آدمی سے کہنا کہ بے حد محتاط رہے کیونکہ اگر کوئی گڑبڑ ہوئی تو نہ صرف یہ کہ ہمارے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا بلکہ بنا بنایا کھیل بھی بگڑ جائے گا۔ دشمن یہ جاننے کے بعد کہ نرس سے رابطہ کرنے والے آدمی کے ذریعے اس تک پہنچنے کی کوشش کی جا رہی ہے، ایک بار پھر شکوک و شبہات میں گھر جائے گا۔" اس نے ذیشان کو مشورہ دیا۔

"میں خود بھی یہ بات سمجھتا ہوں۔ اس لیے اپنے بہت قابل اور ہوشیار ماتحت کو یہ ڈیوٹی سونپی ہے۔ اب دیکھو کہ کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ بہرحال، تم جاؤ جا کر اپنی کلاس لو، میں آج کی رات یہیں ہوں۔ جیسے جیسے میرے پاس اطلاعات آتی رہیں گی، میں تمھیں بتاتا رہوں گا۔ اس سارے کھیل میں چونکہ تمھیں سب سے اہم کردار ادا کرنا ہے، اس لیے تمہارا ہر بات سے باخبر رہنا سب سے زیادہ ضروری بھی ہے۔" ذیشان نے ایک طرح سے اس پر اپنے یہاں تک دوڑے چلے آنے کی وجہ بھی ظاہر کر دی۔

"ٹھیک ہے۔ میں کلاس لے کر آتا ہوں جب تک تم اس معاملے کو ہینڈل کرو۔" شہریار وہاں سے چلا گیا۔ اس کے جانے کے تھوڑی دیر بعد ہی ذیشان کے سیٹ پر کال آنے لگی۔

"ہاں تہمینہ کیا رپورٹ ہے؟" اس نے نمبر دیکھ کر فوراً ہی کال ریسیو کی۔

"اس نے دوبارہ کال کی تھی سر! میں نے بحث کر کے چھ لاکھ کے عوض کام کرنے کی ہامی بھر لی ہے۔ اس نے مجھے آدھے گھنٹے کی مہلت دی ہے۔ آدھے گھنٹے بعد مجھے دونوں چیزیں لے کر اسپتال کے اس حصے میں جانا ہوگا جہاں عموماً مریضوں کے عزیز و اقارب رات گزارتے ہیں۔ اس شخص کا کہنا ہے کہ وہ مجھے پہچانتا ہے اور خود ہی مجھ سے مل کر دونوں نمونے وصول کرے گا۔ رقم بھی وہ نمونے میرے حوالے کرے گا۔" نرس نے اسے بتایا۔

"ٹھیک ہے۔ اس نے تمھیں جو ہدایات دی ہیں، ان پر عمل کرو۔ باقی معاملات ہم خود دیکھ لیں گے۔" اس نے تہمینہ کو ہدایت دے کر سلسلہ منقطع کر دیا اور اس آدمی سے رابطہ کرنے لگا جس کی اس نے اسپتال میں ڈیوٹی لگائی تھی۔ اسے ضروری ہدایات دینے کے بعد فارغ ہوا تو کافی کی طلب ہونے لگی۔ وہاں موجود خدمت گار کو گھنٹی بجا کر بلانے کے بعد اسے کافی بنانے کا حکم دیا اور خود اس لیپ ٹاپ پر مصروف ہو گیا جو وہ اپنے ساتھ لے کر آیا تھا۔ اس مصروفیت کے دوران کافی بن کر آ گئی۔ وہ گرم گرم کافی سے لطف اندوز ہوتا ہوا اپنا کام نمٹاتا رہا۔

کام کے دوران بھی اسے گھڑی کی سوئیوں کے سفر کا دھیان تھا۔ آدھا گھنٹا گزرا تو اس کا ذہن حساب کتاب کرنے لگا کہ اب تہمینہ اس خصوصی پرائیویٹ روم سے نکل پڑی ہوگی جس میں بظاہر شہریار لیکن حقیقتاً اشیش کمار داخل تھا اور جس کے دروازے پر ایک مسلح پہرے دار ہمہ وقت موجود رہتا تھا۔ اس مسلح پہرے دار کے علاوہ بھی سی ایف پی کا کوئی نہ کوئی اہلکار غیر محسوس طور پر اس اسپیشل روم کے ارد گرد ٹہلتا رہتا تھا تاکہ کوئی غیر معمولی بات محسوس ہونے پر فوراً حرکت میں آ جائے۔ اس انتظام کی وجہ سے تہمینہ کی غیر موجودگی میں وہاں کسی گڑبڑ کا کم ہی احتمال تھا۔ اس نے اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے اس بات کا بھی اندازہ لگایا کہ تہمینہ کو مقررہ مقام تک پہنچنے میں کتنی دیر لگی ہوگی۔ پھر وہ تصوری آنکھ سے کسی اجنبی کو اس سے ملتا اور چیزوں کا تبادلہ کرتا دیکھنے لگا۔ اس کے بعد اسے اپنے تخیل پر مزید زور دینے کی ضرورت نہیں پڑی اور اس کے ماتحت کی کال آ گئی۔

"میں نے تہمینہ سے ملنے کے لیے آنے والے آدمی کو دیکھ لیا ہے سر اور اب اس کے پیچھے جا رہا ہوں۔" ماتحت عجلت میں تھا اس لیے مختصر رپورٹ دے کر سلسلہ منقطع کر دیا۔ اس کال کو وصول کرنے کے بعد ذیشان کا جوش اور اعصابی تناؤ دونوں ہی بڑھ گئے۔ اپنے ماتحت کی کامیابی کی صورت میں وہ اس لائق ہو سکتا تھا کہ دشمن پر ہاتھ ڈال سکے کیونکہ تہمینہ سے شہریار کے بالوں اور خون کے نمونے وصول کر کے لے جانے والا یقیناً کسی خاص شخص کا ہی نمائندہ ہو سکتا تھا۔ وہ لوگ اس خاص شخص تک پہنچ جاتے تو پھر آگے بہت سی راہیں کھلتی جاتیں۔ ذہن کو مصروف رکھنے کی کوشش کے باوجود وہ بے چینی سے اگلی رپورٹ کا انتظار کرتا رہا۔ انتظار کو سہل کرنے کے لیے اس نے ایک پیالی کافی مزید منگوالی۔ اس دوران شہریار بھی واپس آ گیا۔

"کیا خبریں ہیں؟" آنے کے ساتھ ہی اس نے ذیشان سے پوچھا۔ وہ اسے اب تک کی صورتِ حال سے آگاہ کرنے لگا۔ شہریار نے بغیر کسی تبصرے کے اس کی پوری بات خاموشی سے سنی اور پھر خود بھی انتظار میں شامل ہو گیا۔ تقریباً پچیس منٹ بعد ذیشان کے پاس اس کے ماتحت کی کال آئی۔

"میں اس وقت لبرٹی کے علاقے میں ہوں سر! میں جس بندے کا پیچھا کرتے ہوئے یہاں آیا ہوں، وہ ایک بڑے جنرل اسٹور پر آ کر رکا ہے اور وہاں جا کر کاؤنٹر سنبھال لیا ہے۔ جنرل اسٹور میں اس کے علاوہ دو لڑکے اور بھی ہیں۔ لیکن اس شخص کے انداز سے ایسا لگتا ہے کہ وہ اسٹور کا مالک یا کم از کم انچارج ضرور ہے۔ اسٹور پر پہنچنے کے بعد اس نے کوئی غیر معمولی حرکت نہیں کی ہے اور شاید حساب کتاب میں مصروف ہو گیا ہے۔ اسٹور خاصا چلتا ہوا ہے اور یہاں مسلسل گاہکوں کی آمد و رفت جاری ہے۔ علاقے کی رونق اور ارد گرد کی کھلی ہوئی دکانوں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ گیارہ بجے سے پہلے اسٹور بند نہیں ہوگا۔ شاید اسٹور بند ہونے کے بعد ہی وہ مال کی ڈلیوری کے لیے جائے۔" ماتحت نے اسے تفصیلی رپورٹ مع اپنی رائے کے دی۔

"ٹھیک ہے، تم اس پر نظر رکھو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص اسٹور پر آ کر ہی اس سے وصولی کر لے۔ دوسری صورت میں تمھیں اسٹور بند ہونے کے بعد بھی اس کا پیچھا کرنا ہوگا۔ وہاں سے نکل کر وہ کسی جگہ یہ چیزیں پہنچانے جا سکتا ہے یا کوئی اس کے گھر پر بھی وصولی کے لیے آ سکتا ہے۔ تم ہر امکان کو ذہن میں رکھ کر نگرانی کرو اور یاد رکھنا کہ ہمارا اصل ہدف یہ شخص نہیں بلکہ وہ ہوگا جو اس سے وصولی کرے گا۔ میں ایسا کرتا ہوں کہ تمہاری مدد کے لیے شاہد کو بھی بھیج دیتا ہوں۔ تم دو بندے ہو گے تو کسی مشکل سچویشن سے نمٹنے میں آسانی رہے گی۔ بس یاد رکھنا کہ تمھیں جنرل اسٹور والے کو قطعی نہیں چھیڑنا ہے اور نہ ہی کسی طرح اس کی نظروں میں آنا ہے۔ وہ ریلیکس رہے گا تو ہمارے لیے بھی آسانی رہے گی۔" وہ رپورٹ سن کر اپنے ماتحت کو ہدایات دینے لگا۔

اس کال سے فارغ ہونے کے بعد اس نے شاہد نامی ماتحت کو کال کر کے اسے بھی وہاں پہنچنے کا حکم دیا جہاں پہلے والا ماتحت موجود تھا۔ شاہد کو کال کرنے کے بعد اس نے سیٹ ہاتھ سے رکھا بھی نہیں تھا کہ اس پر کال آنے لگی۔ نمبر دیکھ کر وہ چونکا اور شہریار کو اطلاع دی۔

"مشابرم خان کال کر رہا ہے۔" پھر خود کال ریسیو کر لی۔

"ادھر اسپتال میں گڑبڑ ہے سر! وہ خانہ خراب نرس جو شہریار صاحب کے کمرے میں ڈیوٹی دیتی ہے، ادھر ایک بندے سے ملی ہے اور اسے کچھ دے کر اس سے کالے رنگ کا ایک بیگ وصول کیا ہے۔ مجھے وہ صورت حرام بندہ گڑبڑ لگ رہا تھا اس لیے میں نے فوراً آپ کو اطلاع دینے کے بجائے اس کا پیچھا کیا اور اب ادھر لبرٹی کے علاقے میں موجود ہوں۔ میرا بس نہیں چل رہا کہ گدی پکڑ کر اس صورت حرام بندے سے ساری تفصیل معلوم کر لوں لیکن سوچا پہلے آپ کی اجازت لینا ضروری ہے۔ میں بڑی دیر سے آپ سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہا ہوں لیکن آپ کا نمبر ہی مصروف جا رہا تھا۔" مشابرم خان نے بڑے جوش و خروش کے ساتھ اس سے جو کچھ کہا، اسے سن کر اس کی کھوپڑی ناچ اٹھی۔ اگر مشابرم خان اپنے کہے پر عمل کرنے کھڑا ہو جاتا تو سارا بنا بنایا کھیل بگڑ جاتا۔

"تم کچھ نہیں کرو گے خان! اس معاملے سے بالکل الگ رہو اور وہاں سے ہٹ جاؤ۔" اس نے سرد اور جھلائی ہوئی آواز میں مشابرم خان کو حکم دیا۔

"لیکن صاحب ......" مشابرم خان اس کا حکم سن کر متذبذب ہوا۔

"کوئی لیکن ویکن کچھ نہیں۔ تم سے جو کہا جا رہا ہے اس پر عمل کرو۔ یہ بہت نازک معاملہ ہے اور میرے بندے خود اسے دیکھ رہے ہیں۔ تمہاری وجہ سے کوئی گڑبڑ ہوئی تو میں کسی صورت تمھیں نہیں بخشوں گا۔" ذیشان کا لہجہ مزید سخت ہو گیا۔

"میں کوئی گڑبڑ نہیں کروں گا۔ آپ مجھے بتائیں کہ کیا کرنا ہے۔ آپ جیسا کہیں گے میں ویسا ہی کروں گا۔" وہ اب بھی وہاں سے لوٹنے کے لیے آمادہ نہیں تھا۔

"تم صرف یہ کرو کہ وہاں سے اپنی شکل گم کر لو۔ اگر دو منٹ بعد بھی تم وہاں دکھائی دیے تو میں اپنے آدمی سے کہوں گا کہ تمھیں گولی مار دے۔" ذیشان کی جھنجلاہٹ عروج پر پہنچ گئی۔

"ٹھیک ہے سر! آپ ناراض نہ ہوں۔ میں اسپتال چلا جاتا ہوں۔" آخرکار مشابرم خان نے ہتھیار ڈال دیے۔

"تمہاری مرضی ہے، ویسے میری مانو تو اب اسپتال کا پیچھا چھوڑ دو۔ اسپتال میں سوائے وقت برباد کرنے کے تم کچھ نہیں کر رہے ہو۔ تمہارے صاحب کا علاج ڈاکٹرز کر سکتے

ہیں اور وہ کررہے ہیں۔ تمہارا وہاں کوئی کام نہیں ہے۔"
ذیشان نے اسے تلخی سے جواب دیا۔

"میں آپ کی یہ بات نہیں مان سکتا سر! مجھے معلوم ہے کہ میں کچھ نہیں کرسکتا لیکن پھر بھی میں صاحب کے قریب رہنا چاہتا ہوں۔" مشابرم خان نے نہایت جذباتی لہجے میں کہا تو ذیشان نے اس سے مزید کچھ کہے بغیر لائن کاٹ دی اور لاؤڈ اسپیکر آن ہونے کی وجہ سے ساری بات سنتے شہریار کی طرف متوجہ ہوا۔

"ایک تو یہ بڑا مسئلہ ہے۔ تمہارے دشمنوں کے ساتھ ساتھ تمہارے چاہنے والوں سے بھی نمٹنا پڑتا ہے۔ یہ شخص تو تمہارے لیے بالکل پاگل ہے۔ حال سے بے حال مستقل اسپتال میں ڈیرا ڈالے ہوئے ہے۔ میرا تو اس کی طرف دھیان ہی نہیں گیا تھا۔ شکر ہے کہ اس نے کچھ کرنے سے پہلے مجھ سے رابطہ کرلیا ورنہ بنا بنایا کھیل بگاڑ کر رکھ دیتا۔" وہ ابھی تک جھلاہٹ کا شکار تھا۔

"اجی یار! مشابرم خان بڑے کام کا بندہ ہے۔ فی الحال وہ میرے ساتھ حادثہ پیش آنے کا سن کر شاک میں ہے۔ تھوڑے دنوں میں سنبھلے گا تو تم دیکھنا تمہارے لیے بڑے کام کا بندہ ثابت ہوگا۔ تم نے عدم کا وہ شعر تو سنا ہوگا

خلوص کے بندوں میں ایک ہی کمی ہے عدم
ستم ظریف بڑے جلد باز ہوتے ہیں

تو بس سمجھو کہ خان کے ساتھ بھی یہی مسئلہ ہے ورنہ آدمی وہ زبردست ہے۔" وہ ذیشان کو سمجھانے لگا۔

"ہمارے کام میں یہ جذباتیت نقصان دہ ہوتی ہے۔ میں تمہیں بتانے والا تھا کہ اس آدمی کے جذباتی پن نے کہیں اور بھی گڑبڑ کردی ہے۔ تمہیں وہ عورت شہزادی تو یاد ہوگی نا جسے تم نے فاریسٹ آفیسر کے بنگلے پر معلومات حاصل کرنے کے لیے بھیجا تھا؟"

"ہاں ہاں، بالکل یاد ہے... بلکہ میں منتظر تھا کہ اس کی طرف سے کوئی رپورٹ ملے۔"

"انتظار کا کوئی فائدہ نہیں کیونکہ شہزادی مرچکی ہے۔" ذیشان نے انکشاف کیا۔

"کیوں؟ کیسے؟" وہ چونک پڑا۔

"زیادہ تفصیل نہیں معلوم۔ بس یہ معلوم ہوا کہ رات کو سوتے ہوئے اس کو اور اس کے بچے کو سانپ نے کاٹ لیا تھا۔ صبح لاشیں گاؤں پہنچا دی گئیں۔ عبدالستار نے لاشیں اپنی تحویل میں لے کر پوسٹ مارٹم کے لیے اسپتال بھجوادیں اور پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے بھی اس بات کی تصدیق ہوگئی ہے کہ ہلاکت کا سبب وہی ہے جو بیان کیا گیا ہے۔ لیکن مجھے جس بات نے تشویش میں مبتلا کر رکھا ہے وہ یہ ہے کہ یہ حادثہ اسی رات پیش آیا ہے جس روز تمہارے ایکسیڈنٹ کی خبر نشر کی گئی اور مشابرم خان جذبات میں آکر اپنی ڈیوٹی انچارج کو بیچ کے لیے جانے کے بجائے لاہور بھاگا آیا۔ اب اگر اس معاملے کو شک کی نظر سے دیکھو تو یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ شہزادی کوئی خاص اطلاع دینے کے لیے بنگلے سے نکلی ہو اور پکڑی گئی ہو۔ مشابرم خان وہاں موجود ہوتا تو اس کی کچھ مدد کر پاتا۔ کمزور عورت کو پکڑ کر انہوں نے آسانی سے سب کچھ اگلوا لیا ہوگا اور پھر اس کی موت کو حادثاتی رنگ دینے کے لیے سانپ سے ڈسوانا کون سا مشکل کام تھا۔ میں یہ سب اس لیے کہہ رہا ہوں کہ میں نے اپنے ایک آدمی کے ذریعے اس کیس کی جو تھوڑی بہت تحقیق کروائی ہے، اس سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ بے شک شہزادی کے جسم پر تشدد وغیرہ کے نشانات نہیں تھے لیکن اس کے پیروں پر چند ایسی خراشیں تھیں جن سے اندازہ ہورہا ہے کہ وہ جھاڑیوں وغیرہ سے گزری ہو۔ ان کے علاوہ اس کے کپڑوں پر مٹی اور تھوڑی سی گھاس پھوس بھی پائی گئی ہے جس سے یہ شک ہوتا ہے کہ وہ بنگلے سے باہر نکلی تھی۔ سب سے اہم اور قابلِ غور جو کلیو ملا ہے، وہ یہ کہ برگد کے جس درخت پر مشابرم خان نے اپنے لیے مچان باندھی تھی، اس کے اطراف میں ایک سے زیادہ افراد کے قدموں کے نشانات پائے گئے ہیں جس سے یہ معلوم ہوتا ہے، وہاں مشابرم خان کے علاوہ بھی کچھ لوگ آئے تھے۔ اب اگر سوچو تو یہ تصویر سامنے آتی ہے کہ ہوسکتا ہے اس رات شہزادی کوئی اہم اطلاع لے کر پہنچی ہو لیکن مشابرم خان وہاں نہیں تھا۔ چنانچہ جب وہاں اسے کچھ لوگوں نے دھرا تو اس کی مدد کرنے والا بھی کوئی نہیں تھا اور وہ بے چاری بے موت ماری گئی۔ اس طرح کے قتل جو بظاہر حادثہ لگیں، کوئی نئی بات نہیں ہے اس لیے میں حالات کو دیکھتے ہوئے یہی سمجھتا ہوں کہ شہزادی حادثے کا شکار نہیں ہوئی بلکہ اسے سوچ سمجھ کر قتل کیا گیا ہے اور وہ بھی اس وجہ سے کہ وہ ہمارے لیے کام کر رہی تھی۔"

ذیشان نے بے لاگ تجزیے اور تبصرے پر مبنی تفصیل اسے کہہ سنائی جسے سن کر وہ خود سخت افسوس میں مبتلا ہوگیا۔ جذبات میں آکر مشابرم خان سے جو کوتاہی ہوئی، وہ اپنی جگہ تھی لیکن اس وقت وہ خود کو شہزادی اور اس کے معصوم بچوں کا مجرم سمجھ رہا تھا۔ وہ چودھری اور عابد انصاری کے درمیان تعلق ڈھونڈنے کے چکر میں اتنا دیوانہ ہورہا تھا کہ اس نے

ایک کمزور عورت کو بھیڑیوں کی کچھار میں اترنے پر مجبور کردیا تھا۔ اب اگر ذیشان کا تجزیہ درست تھا تو پھر بے چاری شہزادی ان بھیڑیوں کی سفاکی کا شکار ہوگئی تھی اور اس کے پیچھے اس کے باقی بچ رہنے والے بچے ظالم دنیا میں تنہا رہ گئے تھے۔

"ایک کام کرنا ذیشان! کوشش کرکے شہزادی کے بچوں کو حکومتی تحویل میں لے لینا اور انہیں ایسے کسی ادارے میں داخل کروا دینا جہاں ان کی تعلیم و تربیت کا مناسب بندوبست ہوسکے۔" وہ مرنے والی کو تو واپس نہیں لاسکتا تھا اس لیے اب مداوے کی واحد صورت یہی تھی کہ شہزادی کے بچوں کا مستقبل محفوظ کرنے کی کوشش کی جاتی۔

"تم فکر نہیں کرو۔ یہ کام ہوجائے گا۔" ذیشان نے اس کی کیفیت بھانپ لی تھی چنانچہ فوراً ہی اپنے جارحانہ لہجے کو تبدیل کرلیا اور تسلی آمیز لہجے میں بولا۔ ساتھ ہی اس نے اس تکلیف دہ موضوع کو مزید جاری رکھنے کے بجائے اس کے دوسرے پہلو کو چھیڑ دیا۔

"شہزادی کے انجام سے ظاہر ہے کہ وہ کسی خاص راز تک پہنچ گئی تھی اور چونکہ وہ عابد انصاری کے بنگلے میں ملازمت کررہی تھی، اس لیے یہ بات بھی خود بخود ہی ثابت ہوجاتی ہے کہ وہ بندہ گڑبڑ ہے۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ حالات میں ہم معاملات تک خفیہ طور پر پہنچنے کی کوشش ترک کرکے براہِ راست ایکشن لیں اور عابد انصاری کو اٹھالائیں۔ جب میرے آدمیوں کے ہاتھوں پیٹ بھر کر مار کھائے گا تو خود ہی سب اگل دے گا۔" ذیشان نے جو تجویز پیش کی، وہ اسے قابلِ غور لگی اور وہ سنجیدگی سے اس کی تائید کرتے ہوئے بولا۔

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو کیونکہ اگر عابد انصاری واقعی کسی خطرناک کام میں ملوث ہے تو پھر اس نے اپنے اردگرد ایسے ہی لوگوں کو جمع کر رکھا ہوگا جو اس کے نزدیک قابلِ بھروسا ہوں گے۔ اس کے بھروسے کے کسی آدمی کو توڑنا ہمارے لیے مشکل ہے اور اپنے کسی آدمی کو اس کی صفوں میں شامل کرنا بھی ممکن نہ ہوگا کیونکہ شہزادی والے واقعے کے بعد اب وہ بہت زیادہ محتاط ہوگیا ہوگا۔"

"پھر طے ہوگیا کہ ہمیں عابد انصاری کو اٹھانا ہے۔ ابھی جو قصہ چل رہا ہے، اسے نمٹالیں پھر آگے کی پلاننگ کریں گے کہ انصاری کو اٹھانے کے لیے کیا طریقۂ کار استعمال کیا جائے۔" ذیشان ابھی یہ الفاظ ادا کرہی رہا تھا کہ لمبے قد اور مضبوط جسامت کا ایک آدمی اندر داخل ہوا۔

صورت ہی سے بارعب نظر آنے والا یہ آدمی شہریار کا انسٹرکٹر تھا اور جس جگہ وہ لوگ موجود تھے، وہاں اسی کا حکم چلتا تھا۔ یہاں موجود افراد کو ہر کام کے لیے اس کی اجازت کی ضرورت پڑتی تھی۔

"آیئے عمر فاروق صاحب! کہیں آپ اپنے شاگرد کو ڈانٹ ڈپٹ تو کرنے نہیں آئے کہ یہ بنا اجازت اتنی دیر تک یہاں کیوں بیٹھا ہوا ہے اور اصولاً اسے اب تک سو جانا چاہیے۔" اس آدمی کو دیکھتے ہی ذیشان نے شوخی سے پوچھا لیکن شہریار محسوس کرسکتا تھا کہ اس کی شوخی میں بھی احتیاط اور احترام موجود ہے۔

"میرا شاگرد اتنا نالائق نہیں ہے کہ بغیر اجازت لیے ہی قواعد وضوابط کے خلاف عمل کرسکے۔ رہی بات روٹین خراب ہونے کی تو یاد رکھو، روٹین کی پابندی کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ وقت کے حساب کتاب میں گڑبڑ سے کسی کا وقت برباد نہ ہو ورنہ یہ تو میں بھی سمجھتا ہوں کہ تم لوگ جس نوعیت کا کام کرتے ہو، اس میں ہمیشہ کسی طے شدہ معمول پر چلنا ممکن نہیں ہوتا... بلکہ بعض اوقات تو دن رات کا فرق بھی مٹ جاتا ہے اور بغیر کھائے پیے اور سوئے ہوئے کئی کئی دن تک نامساعد حالات سے گزرنا پڑتا ہے۔" عمر فاروق کے نام سے پکارے جانے والے انسٹرکٹر نے نرم سی سنجیدگی کے ساتھ ذیشان کی بات کا جواب دیا تو وہ کھسیانی سی ہنسی ہنس کر اپنے سیٹ کی طرف متوجہ ہوگیا۔

"ہاں بھئی، کیا رپورٹ ہے؟ اب تو گیارہ سے اوپر کا وقت ہوگیا ہے۔ کیا اب تک اس نے اسٹور بند نہیں کیا؟" رابطہ قائم ہوتے ہی اس نے اپنے ماتحت سے دریافت کیا۔

"میں خود آپ کو کال کرنے والا تھا سر! اسٹور بند ہوگیا ہے اور اس کا مالک اپنے گھر جاچکا ہے۔ میں بھی اس کا پیچھا کرتا ہوا اس کے گھر تک پہنچ گیا ہوں۔ یہ ایک دو منزلہ عمارت ہے جس کے رنگ وروغن کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ مالک مکان اچھا خاصا خوش حال آدمی ہے۔ میں نے دروازے پر لگی نیم پلیٹ بھی دیکھی ہے۔ نیم پلیٹ پر اس کا نام رائے چند لکھا ہوا ہے۔ رائے چند نے نہ تو اسٹور میں کسی سے ملاقات کی تھی اور نہ ہی وہ راستے میں کہیں رکا ہے، اس لیے مجھے لگتا ہے کہ اس سے وصولی کے لیے آنے والا یہیں گھر پر ہی کسی وقت آئے گا۔" ماتحت نے فوراً تفصیلی رپورٹ دے دی۔

"تم اپنا کام جاری رکھو۔ ایک لمحے کے لیے بھی اس کے گھر کی نگرانی سے غافل نہیں ہونا۔ صبح چھ بجے تک تمہاری

وہاں پر ڈیوٹی ہے۔ اس دوران اگر کچھ نہیں ہوا تو دوسرا بندہ تمہاری جگہ سنبھال لے گا۔" ذیشان نے اپنے ماتحت کو حکم دے کر سلسلہ منقطع کر دیا اور پھر مسکراتا ہوا شہر یار کی طرف متوجہ ہوا۔

"لو بھئی، اپنی تو رات کالی ہونے کا بندوبست ہو گیا۔ تم ایسا کرو کہ جا کر آرام سے سو جاؤ۔ جو بھی حالات ہوں گے، میں صبح تمہیں آگاہ کر دوں گا۔ صبح سے تمہیں پھر عمر فاروق صاحب کی مشقِ ستم کا سامنا کرنا ہے اس لیے بہتر ہے کہ نیند لے کر فریش ہو جاؤ۔"

"نہیں، آج رات شہر یار کو سونا نہیں ہے۔ یہ بھی تمہارے ساتھ ہی جاگیں گے اور صبح جب روٹین کا آغاز ہو گا تو انہیں بالکل ویسا ہی فریش نظر آنا ہو گا جیسے کوئی شخص بھرپور نیند لینے کے بعد نظر آتا ہے۔" اس سے قبل کہ شہر یار کی طرف سے کوئی ردِعمل ظاہر ہوتا، عمر فاروق اچانک ہی بول پڑے۔ اور یہ تو طے تھا کہ ان کا کہا اٹل تھا۔ ویسے بھی ان دونوں میں سے کوئی بھی ان سے اختلاف کا ارادہ نہیں رکھتا تھا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ عمر فاروق کی ہر ہدایت اور حکم پر عمل کر کے ہی شہر یار کندن بن سکے گا۔

☆☆☆

"عابد انصاری کو آف کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا ہے ایس جے! اس کی جگہ کوئی دوسرا آدمی لانے کی کوشش کی جائے گی۔"

"لیکن وہ کیوں؟ انصاری تو کام کا بندہ تھا اور اب تک سب اس کی طرف سے مطمئن تھے۔" سنتھیا جو موساد میں عموماً ایس جے کے مخفف سے ہی پکاری جاتی تھی، اس فیصلے کو سن کر حیران ہوئی۔

"انصاری نے القا کو رپورٹ دی تھی کہ شہزادی نامی ایک عورت کے ذریعے اس کے بارے میں حقائق کھوجنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ اتفاق سے اسے اس عورت پر شک ہو گیا اور اس نے اس کی نگرانی شروع کروا دی۔ نگرانی اور بعد کی تفتیش کے نتیجے میں یہ بات سامنے آئی کہ اس عورت کو شہر یار نے وہاں جاسوسی کے لیے بھجوایا تھا اور اس عورت نے ایسی معلومات حاصل کر لی تھیں کہ اگر وہ شہر یار تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاتی تو ہمارا سارا کھیل بگڑ جاتا۔" یہ ڈیوڈ تھا، موساد کا وہی خطرناک ایجنٹ جو لنڈا نامی قاتلہ کے ساتھ امریکا میں بیٹھ کر اس سارے کھیل کی نگرانی کر رہا تھا۔ عمر میں کم ہونے کے باوجود وہ سنتھیا سے عہدے میں کچھ اوپر تھا لیکن سنتھیا کو اپنی برسوں کی خدمات کے صلے میں جو اہمیت حاصل تھی، اس کے سبب اس کے اوپر کے عہدیدار بھی اس سے عزت و احترام سے ہی بات کرتے تھے۔

"اب تو شہر یار والا باب ہی بند ہو گیا۔ وہ اسپتال میں جس حالت میں پڑا ہے، اس کے بعد یہ امید نہیں رکھی جا سکتی کہ وہ کبھی میدانِ عمل میں اتر سکے گا۔ شہر یار کے نان ایکٹو ہو جانے کے بعد اس کے ہرکاروں کی بھی کوئی اہمیت نہیں رہ جاتی۔" سنتھیا نے ایک گہرا سانس لیتے ہوئے ملنے والی اطلاع پر تبصرہ کیا۔ شہر یار کے نام کے ساتھ ہی اسے ماریا کی دردناک موت یاد آ جاتی تھی۔ ہر ممکنہ طریقے سے تصدیق کر لینے کے باوجود کہ اسپتال میں پڑا مریض شہر یار ہی ہے، اس کے اندر بے چینی اور بے قراری تھی۔ اسے لگتا تھا کہ اس کی بیٹی کی موت کے ذمے داروں میں سے ایک شہر یار کو وہ سزا نہیں مل سکی جس کا وہ مستحق تھا۔ خصوصاً یہ بات سامنے آنے پر کہ شہر یار نے حادثے سے قبل ہی ماریا کو طلاق دے دی تھی اور اس کے بارے میں مکمل طور پر لاتعلقی اور لاعلمی کا اظہار کیا تھا کہ وہ کہاں ہے، اس کے دل میں موجود شہر یار کی نفرت کو مزید بڑھا دیا تھا۔

"شہر یار کے باب کو اس لیے بند نہیں سمجھا جا سکتا کہ وہ خود تو بے شک میدان سے باہر ہو گیا ہے لیکن اس کے انٹیلی جنس والوں سے روابط کوئی رنگ دکھا سکتے ہیں۔ ہمیں نہیں معلوم کہ اس کے نان ایکٹو ہونے کے باوجود اس کا کون سا آدمی اب تک کام کر رہا ہے اور انٹیلی جنس کو معلومات دے رہا ہے۔ اس لیے بہتر ہے کہ ہم اس بندے کو ہی اڑا دیں جس کے ذریعے ہم تک پہنچا جا سکتا ہے۔" ڈیوڈ نے اسے صورتِ حال سمجھائی۔ وہ لوگ اس وقت اسی طرح کے اسپیشل سیٹ پر بات کر رہے تھے جو چودھری کو القا نے فراہم کیا تھا اس لیے انہیں کال ٹریس ہونے کا کوئی خدشہ نہیں تھا۔

"اگر ایسا ہے تو انصاری کے ساتھ ساتھ چودھری بھی ایسے ہی سلوک کا حق دار ہے۔ اس کے کارخانے پر ہونے والے ریڈ کے بعد تو وہ واضح طور پر منشیات کے کاروبار میں ملوث ثابت ہو چکا ہے۔ اور اگر کسی نے اس پر ہاتھ ڈال دیا تو وہ انصاری سے زیادہ حقائق اگل سکتا ہے۔" اس نے فوراً ہی اعتراض کیا۔

"چودھری کی قانونی حیثیت مضبوط ہے۔ وہ اپنے وکیل کے ذریعے ثابت کر چکا ہے کہ جس کارخانے پر ریڈ کر کے منشیات کا ذخیرہ اور اسے تیار کرنے والی مشینیں وغیرہ پکڑی گئی ہیں، وہ اصل میں اس کا ہے ہی نہیں اور وہ کافی عرصہ قبل اسے فروخت کر چکا ہے۔"

"یہ بات اپنی جگہ لیکن انٹیلی جنس والے ایسی چالوں سے خوب واقف ہوتے ہیں اس لیے وہ کسی صورت چودھری کا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔" سنتھیا نے اسے ٹوکا۔

"یہ بات ہم بھی سمجھتے ہیں اس لیے چودھری کو فی الحال واپس جانے سے روک دیا گیا ہے۔ وہ یہاں بیٹھ کر بھی ہمارے لیے بہت کام کر سکتا ہے۔ اس کے پیچھے اس کے وفادار سارا کام سنبھال لیں گے۔ اب بھی انصاری کو قتل کرنے کی ذمے داری چودھری کے ایک وفادار بہرام کو ہی سونپی گئی ہے۔ بہرام اسے بالکل اسی طریقے سے قتل کرے گا جیسے اس نے شہزادی اور اس کے بچے کو مروا دیا تھا۔ اس طرح شہزادی کی موت ہی کی طرح اس کی موت پر بھی قتل کا شبہ کرنا مشکل ہو گا۔"

"تمہارا کام تم ہی جانو، مجھے یہ بتاؤ کہ مجھے اب کیا کرنا ہے؟ کلارا کے بعد مجھے جس طرح اپنے پروجیکٹ سے الگ ہونا پڑا ہے، میں اپنے آپ کو بالکل بیکار سمجھ رہی ہوں۔ اس بیکاری میں مجھے کلارا کی موت کا غم اور بھی زیادہ ستاتا ہے۔" وہ افسردہ ہو گئی۔

"خود کو ناکارہ مت سمجھو ایس جے! تم آج بھی ہمارے لیے بہت قیمتی ہو۔ بس تمہیں وقتی طور پر اس لیے روپوش ہونے کا کہا گیا ہے کہ تم پریشانی سے بچ سکو۔ باقی را والوں سے تو تم رابطے میں ہو ہی۔ ان کے ساتھ رہ کر ماضی کی طرح عظیم اسرائیل کے لیے کام کرتی رہو۔ ہاں اگر تم خود یہ سمجھتی ہو کہ اب تمہیں آرام کی ضرورت ہے اور تمہارے لیے یہ کام کرنا ممکن نہیں رہا تو کسی کو تمہاری ریٹائرمنٹ پر اعتراض نہیں ہو گا اور عظیم اسرائیل میں کھلی بانہوں سے تمہارا استقبال کیا جائے گا۔" ڈیوڈ نے اسے کھلی پیشکش کی۔

"ابھی میں نے ایسا کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے۔ میں اپنی بیٹی کے قاتلوں کو ان کے انجام تک پہنچانا چاہتی ہوں۔ شہر یار کا حساب تو خود بخود ہی بے باق ہو گیا لیکن ابھی کرنل توحید باقی ہے۔ اس کا انجام ہونے سے پہلے میں ریٹائرمنٹ نہیں لے سکتی۔" وہ نہایت عزم سے بولی۔

"او کے، جیسی تمہاری مرضی۔ میں نے تو صرف ایک پیشکش کی تھی۔" ڈیوڈ نے بات ختم کر دی اور نیا موضوع چھیڑتے ہوئے بولا۔ "ہمیں پروفیسر ہنری کی طرف سے خاصی تشویش ہے۔ چودھری کے کارخانے پر ہونے والے ریڈ میں ہمارا سب سے بڑا نقصان ہی یہ ہوا ہے کہ پروفیسر ہنری کو وہاں سے گرفتار کر لیا گیا ہے۔ اگرچہ اس گرفتاری کو کسی بھی سطح پر تسلیم نہیں کیا گیا لیکن حالات بتاتے ہیں کہ وہ انٹیلی جنس والوں کے قبضے میں ہیں کیونکہ موقع پر ان کے معاونین کی گولیوں سے ہلاک شدہ لاشیں تو ملی ہیں لیکن خود ان کا کوئی اتا پتا نہیں ہے۔ اگر وہ وہاں سے زندہ بچ نکلنے میں کامیاب ہو جاتے تو ہم سے رابطہ ضرور کرتے۔ ان کے رابطہ نہ کرنے کی صورت میں یہی بات سمجھ میں آتی ہے کہ وہ انٹیلی جنس والوں کے قبضے میں ہیں اور یقیناً ان کی تفتیش کے مراحل سے گزر رہے ہیں۔"

"رہنے دو۔ کوئی فرق نہیں پڑتا۔ انٹیلی جنس والے سر کے بل کھڑے ہو کر بھی ان سے کچھ اگلوانے کی کوشش کریں گے تو کامیاب نہیں ہو سکیں گے۔ تم خود پروفیسر کو اچھی طرح جانتے ہو کہ وہ ذہین ہونے کے ساتھ ساتھ کتنے ضدی آدمی ہیں۔ تشدد کے نتیجے میں تو کچھ اگلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ کسی اور طریقے سے بھی اپنی زبان نہیں کھولیں گے۔ تم جانتے ہو کہ انہیں اپنے برین کو بلاک کر لینے کی کتنی حیرت انگیز صلاحیت حاصل ہے۔ ایسے بندے پر نہ تو ہپناٹزم اثر کر سکتا ہے اور نہ ہی کسی قسم کی دوا۔ وہ مر جائیں گے لیکن کچھ نہیں بتائیں گے۔" اس کے لہجے میں گہرا یقین تھا۔

"یہ تو میں بھی جانتا ہوں لیکن اصل پریشانی یہ ہے کہ بعض لوگوں کی طرف سے انہیں آزاد کروانے کا مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ اس وقت میں نے تم سے اسی امکان پر گفتگو کرنے کے لیے رابطہ کیا ہے۔ تم بتاؤ کہ کیا ہم پروفیسر کو انٹیلی جنس کے قبضے سے چھڑا سکتے ہیں؟" ڈیوڈ نے اس سے پوچھا۔

"سوری، یہ ممکن نہیں ہے۔ ہمارے پاس اتنے وسائل نہیں ہیں کہ ہم براہِ راست انٹیلی جنس سے ٹکر لے سکیں۔ ابھی تک تو ہمیں یہ بھی معلوم نہیں ہو سکا کہ پروفیسر کو کہاں رکھا گیا ہے لیکن یقینی سی بات ہے کہ وہ جگہ خاصی محفوظ ہو گی جہاں سے انہیں نکالنے کے لیے خاصی جدوجہد کرنی پڑے گی۔ اور تم جانتے ہو کہ یہاں ہمارے پاس اپنا ذاتی مسلح جتھا نہیں ہے۔ عموماً ہم اپنے مقاصد کے لیے کرائے کے لوگوں یا پھر را والوں سے مدد لیتے ہیں۔ یہ معاملہ ایسا ہے کہ کرائے کے لوگوں کی صلاحیتوں پر بھروسا نہیں کیا جا سکتا اور را والوں کو ملوث کرنا ممکن نہیں ہے۔ بہت سے معاملات میں ان کے ساتھ شراکت کرنے کے باوجود یہ راز ان کے ساتھ کسی طور شیئر نہیں کیا جا سکتا کہ ہم یہاں کسی مفید مقام پر افیون کی کاشت کر کے ہیروئن تیار کروا رہے ہیں۔" اس نے دوٹوک جواب دیا۔

"یہ سب میرے بھی علم میں ہے اسی لیے میں پریشان

ہوں کہ کیا کروں؟'' ڈیوڈ نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے پریشانی کا اظہار کیا۔

''کچھ مت کرو۔ پروفیسر کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔ ہم لوگ برسوں سے عظیم اسرائیل کے لیے قربانیاں دیتے آئے ہیں۔ پروفیسر بھی بخوشی یہ قربانی دے دے گا۔ جب میری جوان بیٹی، جس نے ابھی اس دنیا میں بہت کچھ دیکھنا تھا، اپنی جان کی قربانی دے سکتی ہے تو پروفیسر جیسا بوڑھا جو کہ زندگی کی ساری خوشیاں اور لطافتیں کشید کرچکا ہے، کیوں قربانی نہیں دے سکتا۔'' اس کا لہجہ بے حد سفاک ہونے کے باوجود اس کی بات ڈیوڈ کے دل کو لگی۔ سنتھیا جیسی سفاکی سے نہ سہی لیکن کچھ منطقی دلائل کے ساتھ وہ پروفیسر کی بازیابی کے لیے مطالبہ کرنے والوں کو قائل کرسکتا تھا اور کچھ نہیں تو تاخیری حربے تو ضرور ہی آزما سکتا تھا۔

☆☆☆
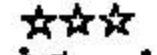
''یہ بہت عجیب خبر ہے۔ سمجھ نہیں آرہا کہ اسے اتفاق سمجھا جائے یا طے شدہ منصوبہ۔ شہزادی کے بعد عابد انصاری کی بھی بالکل اسی طریقے سے ہلاکت نے میرے ذہن کو الجھن میں ڈال دیا ہے۔ میں سوچنے پر مجبور ہوں کہ جو کچھ ہم سوچ رہے تھے، وہ غلط بھی ہوسکتا ہے۔ ممکن ہے کہ وہاں بیچ بیچ کوئی ایسا موذی سانپ موجود ہے جو انسانوں کی ہلاکت کا باعث بن رہا ہو اور اس سانپ نے پہلے شہزادی اور اس کے بچے کو پھر اب عابد انصاری کو اپنا نشانہ بنالیا ہو۔'' ذیشان کی زبانی عابد انصاری کی سانپ کے ڈسنے سے ہلاکت کا سن کر وہ اپنی جگہ دم بخود رہ گیا۔ وہ لوگ تو اپنی جگہ پوری منصوبہ بندی کرکے بیٹھے ہوئے تھے اور اگلے ایک آدھ دن میں عابد انصاری کے اغوا کے منصوبے پر عمل درآمد ہونے والا تھا لیکن یہاں تو کہانی ہی الٹ گئی تھی۔ ان کے کچھ کرنے سے قبل عابد انصاری خود لقمۂ اجل بن گیا اور پوسٹ مارٹم رپورٹ نے ثابت کردیا تھا کہ اس کی موت سانپ کے ڈسنے سے ہوئی ہے۔

''اس طرح سے سوچا تو جاسکتا ہے لیکن میرا ذہن اس بات کو ماننے کے لیے راضی نہیں ہے۔ شہزادی کی موت حادثاتی نظر آنے کے باوجود جو چند چھوٹی موٹی واقعاتی شہادتیں ہمیں ملی تھیں، وہ اس بات پر دلیل دے رہی تھیں کہ معاملہ گڑبڑ ہے اور اس کے بعد اب انصاری کی بھی بالکل ویسی ہی موت نے مجھے چونکا دیا ہے۔ میں سوچنے پر مجبور ہوں کہ ایسا بھی تو ہوسکتا ہے کہ ہمارا دشمن ہمارے دماغ سے ہی سوچ رہا ہو۔ انھیں نظر آرہا ہو کہ چودھری کی غیر موجودگی میں جو واحد ٹارگٹ ہمارے سامنے ہے، وہ انصاری ہے اور ہم کسی بھی وقت اس پر ہاتھ ڈال سکتے ہیں۔ اس لیے اس نے ہمارا راستہ مسدود کرنے کے لیے خود اپنے ہاتھ سے اپنا مہرہ پیٹ ڈالا ہو۔ تم خود دیکھو کہ انصاری کی موت کے بعد ہمارے پاس اب کون سا راستہ رہ گیا ہے۔ ایک راستہ چندا کا کھلا تھا لیکن اس کی مسلسل نگرانی کے باوجود ہمارے آدمی یہ جاننے میں کامیاب نہیں ہوسکے کہ وہ جیپ سے بالوں اور خون کے جو نمونے لے کر گیا تھا، وہ اس نے کس کے حوالے کیے۔ ظاہر ہے، یہ دونوں چیزیں وہ اب تک اپنے پاس تو نہیں رکھ کر بیٹھا ہوگا۔ اس نے کسی نہ کسی کو تو وہ چیزیں دی ہوں گی لیکن نہ جانے کس ہوشیاری سے یہ کام کیا کہ نگرانی کرنے والوں کو پتا ہی نہیں چل سکا۔ بظاہر تو نہ ہی کوئی اس سے ملنے آیا اور نہ ہی وہ خود کسی سے ملنے گیا۔ اب یہی ہوسکتا ہے کہ اس سے یہ دونوں چیزیں لے جانے والا اس کے اسٹور پر گاہک کے روپ میں آیا ہو اور اس نے اتنی اچھی اداکاری کی ہو کہ نگرانی کرنے والے کو پتا ہی نہ چل سکا ہو کہ وہ روزمرہ استعمال کی اشیا کے ساتھ کچھ اور بھی وصول کرکے لے گیا ہے۔ بہرحال، دس طرح کے امکان ہوسکتے ہیں لیکن اصل بات یہ ہے کہ ہمیں ہمیشہ یہ یاد رکھنا پڑے گا کہ ہمارا دشمن ہماری سوچ سے زیادہ چالاک اور شاطر ہے۔ اس لیے کوئی معاملہ چاہے کتنا ہی سیدھا نظر آئے، وہ مشکوک ہی سمجھا جانا چاہیے۔'' ذیشان نے فوراً ہی اپنے دلائل سے اس کے خیال کو رد کردیا۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن ہماری مجبوری یہ ہے کہ ہم راستے چندا کو بھی فی الحال نہیں چھیڑ سکتے۔ اس کے ذریعے دشمن تک پہنچنے کی کوئی فوری کوشش کرنا ہمارے اپنے حق میں بہتر نہیں ہوگا۔ اسے تو فی الحال نگرانی میں ہی رکھو اور وہ بھی اس طرح کہ اسے شک نہ ہوسکے۔ آگے کہیں جاکر اس کی نگرانی ہمارے لیے سودمند ثابت ہوسکتی ہے۔ فی الحال اسے چھیڑنا کچا پھل توڑنے کے مترادف ہوگا۔'' ذیشان سے متفق ہوتے ہوئے اس نے اپنی رائے دی۔

''ہم سب کا اس بات پر اتفاق ہے۔ اب آجاتے ہیں اپنے سامنے موجود دوسرے ٹارگٹ چودھری کی طرف... تو اس کا رویہ بھی ہم دیکھ رہے ہیں۔ کارخانے کے بارے میں یہ ثابت کرکے کہ وہ کافی عرصہ قبل اسے فروخت کرچکا ہے، اس نے اپنی قانونی پوزیشن محفوظ کرلی ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ وہ یہ بات سمجھتا ہے کہ وہ جو کچھ بھی کہے، ہم اس کی بات پر یقین نہیں کریں گے اور وہ جب بھی پاکستان واپس آیا، اس کے گرد گھیرا تنگ کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ اس لیے وہ یہاں کا رخ ہی نہیں کر رہا ہے اور آرام سے نیو پارک میں بیٹھا ہوا ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ اس کی مستقبل قریب میں واپسی کا کوئی امکان بھی نہیں ہے۔''

''وہ نہیں آیا تو ہم اس تک پہنچ جائیں گے۔'' شہریار نے کہا۔

''رائٹ، کرنل صاحب! اور میرا بھی یہی خیال ہے لیکن اس کے لیے ہمیں تھوڑا انتظار کرنا پڑے گا۔ یہ ٹاسک تمہیں ہی دیا جائے گا اور تم خود فی الحال انڈر پروسس ہو۔ تمہارے حلیے میں ابھی مزید تبدیلیاں لائی جانی ہیں۔ کرنل صاحب خود ڈاکٹر یوسفی اور ڈاکٹر پاشا سے رابطے میں ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ابھی تمہاری ایک دو سرجریز اور ہوں گی۔ اس کے بعد بالوں اور جلد کی رنگت کی تبدیلی کا پروسس ہے تو تم فوراً تو اٹھ کر امریکا نہیں جاسکتے۔ اس کے لیے ہمیں انتظار کرنا ہوگا۔ بہت سی کاغذی کارروائیاں بھی کرنی ہیں۔ تمہارے یہاں کے ریکارڈ میں سے تمہارے فنگر پرنٹس وغیرہ میں تبدیلی کا پروسس بھی جاری ہے تاکہ آئندہ بھی کسی طور تمہیں شہریار عادل کے طور پر شناخت نہیں کیا جاسکے۔ میرا مطلب ہے کہ اس وقت تک جب تک تم اپنے اس بہروپ کو چھوڑ کر دوبارہ واپس اپنے روپ میں آنے کا فیصلہ نہیں کرلیتے۔ اس وقت پھر تمہارے لیے نئے سرے سے زندگی گزارنے کے مواقع پیدا کیے جائیں گے اور وہ سارے ضروری اقدامات کیے جائیں گے جو تمہارے مفاد میں ہوں۔'' ذیشان نے اس کے سامنے ساری صورت حال کھول کر رکھی تو وہ بے بسی سے ہاتھ مل کر رہ گیا پھر جیسے اچانک کوئی خیال آنے پر بولا۔

''ذیشان! ایسا کرو کہ خواجہ سراؤں اور کال گرلز پر ایک بار پھر کام شروع کرواؤ۔ سجاد بھائی اپنے قتل سے پہلے جولی نامی ایک کال گرل سے ملاقات کرکے آئے تھے۔ اس کال گرل نے بھی اگلے ہی دن خودکشی کرلی تھی لیکن حالات و واقعات کے تجزیے سے یہ بات سمجھ آگئی تھی کہ جولی کی خودکشی اصل میں اس کے قتل پر پردہ ڈالنے کی کوشش تھی۔ اسے اپنے اشاروں پر نچانے والے سمجھ گئے تھے کہ سجاد بھائی اس کے ذریعے ان کے نیٹ ورک تک پہنچنے کی کوشش کر رہے ہیں اور شاید بہت کچھ جان بھی چکے ہیں۔ چنانچہ ایک طرف انھوں نے ان کی زندگی کا چراغ گل کیا تو دوسری طرف اپنی اس ساتھی کو بھی ٹھکانے لگا دیا جس کے ذریعے ان کا سراغ لگایا جاسکتا تھا۔ خواجہ سراؤں کا قصہ بھی میں تمہیں سنا چکا ہوں۔ راولوں نے معاشرے کے اس مظلوم طبقے کو ان کی محرومیوں کی مدد سے خوب استعمال کیا ہے۔ ایک طرف وہ مذہب کی بنیاد پر انھیں تقسیم کرنے میں کامیاب ہوئے تو دوسری طرف ان کے ذہنوں میں ایسی خرافات بھر دیں کہ وہ انتہا پسندی کو ہی اپنا مذہب سمجھنے لگے۔ مذہب ہی کی وجہ سے ہندو خواجہ سراؤں نے پاکستانی شہری ہونے کے باوجود را کا آلۂ کار بننا منظور کرلیا۔ میرے اتفاقاً ان لوگوں تک پہنچنے کی وجہ سے وہ انتہا پسند گروہ منظر سے غائب ہوگیا تھا لیکن میرا خیال ہے کہ گروہ کا وجود اب بھی باقی ہوگا اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کافی عرصے سے ہمارے اس طرف متوجہ نہ ہونے کی وجہ سے یہ سمجھ لیا گیا ہو کہ اب ہماری ان میں کوئی دلچسپی نہیں رہی ہے اس لیے وہ ایک بار پھر اپنی سرگرمیاں شروع کرچکے ہوں۔'' وہ دور کی کوڑی لایا تھا لیکن ذیشان فوراً ہی اس سے متفق ہوگیا کیونکہ اس کی سجھائی راہ اندھیرے میں ابھرنے والی روشنی کی کرن کے مانند تھی۔

''تم نے اچھی تجویز دی ہے۔ واقعی ہم ان دونوں گروپس پر کام کرکے کامیابی حاصل کرسکتے ہیں۔ میں اپنے جوانوں کو براہِ راست ان کے درمیان داخل کردوں گا تو وہ کچھ نہ کچھ کامیابی ضرور حاصل کریں گے۔'' ایک راہ دکھائی دیتے ہی ذیشان پُرجوش نظر آنے لگا۔

''مشابرم خان اور جگنو کی صلاحیتوں کو بھی وقتِ ضرورت کام میں لاتے رہنا۔ مشابرم خان کو تو میں نے خود تاکید کردی تھی کہ میری عدم موجودگی میں تمہاری ہدایات پر عمل کرے، البتہ جگنو نے تمہیں خود رابطہ کرکے اس سے فائدہ اٹھانا ہوگا۔ مشابرم خان کا معاملہ الگ ہے۔ وہ سرکاری ملازم ہے اور ملک سے وفاداری اس کے خون میں رچی بسی ہے،

البتہ جگو ذرا مختلف بندہ ہے۔ وہ جن لوگوں کے لیے کام کرتا ہے، وہ ظاہری طور پر تو ملک کے خدمت گار اور خیر خواہ ہیں لیکن حقیقت میں ان کا کام ملک کی جڑیں کھوکھلی کرنا ہے۔ ان کا اصل مذہب پیسا ہے۔ وہ پیسے کو پوجتے ہیں اور اسی سے وفاداری نبھاتے ہیں، چاہے اس چکر میں انسانیت کا خون ہو جائے۔ جگو ان جتنا بڑا بدمعاش نہیں ہے کیونکہ اس نے اپنی بدمعاشی کو چھپانے کے لیے شرافت کا چولا نہیں چڑھا رکھا ہے لیکن ایک طرح سے ہے تو وہ بھی پیسے ہی کا غلام جو پیسے کی خاطر اپنے آقا کا ہر حکم آنکھ بند کر کے بجالاتا ہے۔ البتہ اس کی ہوس کا برتن حکمرانوں کی عمرو عیار کی زنبیل جیسا نہیں ہے۔ مجھے امید ہے کہ اگر تم میرے حوالے سے کسی موقع پر اس سے مدد مانگو گے تو وہ انکار نہیں کرے گا۔" وہ جس جگہ رہ رہا تھا، وہاں ذیشان کے سوا اس سے بات چیت کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ ملازمین صرف احکامات کی تعمیل کرتے تھے اور انسپکٹر عمر فاروق احکامات کا اجرا... اس لیے وہ خود نسبتاً کم گو ہونے کے باوجود کسی سے گفتگو کے لیے ترس جاتا تھا۔ ذیشان سے بھی روز روز ملاقات نہیں ہو پاتی تھی چنانچہ جب بھی وہ میسر آتا، وہ اپنی زبان کی گرہیں خوب خوب کھولتا اور یقین کر لیتا کہ اس کے جبڑے جام نہیں ہوئے ہیں۔ گفتگو کی یہ طوالت اس کی محرومی ہی کی دین تھی۔ ذیشان بھی سمجھتا تھا کہ خاندان، دوستوں، ملازمت اور دیگر عملی سرگرمیوں سے محروم یہ بالکل تنہا زندگی اس کے اعصاب کے لیے امتحان تھی اس لیے اس سے کسی قسم کا تعرض نہیں کرتا تھا۔

"میری جگہ کسی دوسرے بندے کی تعیناتی عمل میں آئی یا نہیں؟" خاموشی کے ایک مختصر وقفے کے بعد اس نے ذیشان سے دریافت کیا۔

"بندے کا انتخاب ہو چکا ہے لیکن ابھی اسے پوسٹ نہیں کیا گیا۔ ابھی کچھ دن تو ہمیں اس بات کا انتظار کرنا ہوگا کہ ڈاکٹروں کی طرف سے تمہارے لیے مکمل ناامیدی کا اعلان کر دیا جائے پھر اس کے بعد اس بندے کو وہاں بھیجا جائے گا۔" ذیشان نے جواب دیا۔

"عمیر آفندی نام ہے۔ اچھا پُرجوش جوان ہے۔ فیملی بیک گراؤنڈ بھی بہت ٹھیک ٹھاک ہے اس لیے فی الحال تو یہ امید نہیں کی جارہی کہ پیسے کی خاطر بک جائے گا۔ باقی اس پر چیک رکھنے اور اسے مورل سپورٹ فراہم کرنے کی ہر ممکن کوشش کی جائے گی۔" ذیشان نے اسے مزید آگاہ کیا۔

"اور جیا فاریسٹ آفیسر... انصاری کے بعد نئے فاریسٹ آفیسر کی تعیناتی کے لیے کچھ ہوا یا نہیں؟"

"نہیں، ابھی کچھ نہیں ہوا۔ چند نام زیرِ غور ہیں لیکن کسی کے بارے میں ابھی قابلِ فیصلہ نہیں ہوا ہے۔ باجوہ اور انصاری دونوں فاریسٹ آفیسر اتنے مختصر عرصے اور مشکوک حالات میں موت کا شکار ہوئے ہیں کہ لوگوں کے ذہن میں کئی سوالات نے جنم لے لیا ہے۔ پھر جنگل میں ڈاکوؤں کی سرکوبی کے لیے کیا جانے والا آپریشن بھی کوئی پرانی بات نہیں ہے۔ یہ سب باتیں ایسی ہیں جن سے واقف کوئی بھی شخص یہ اندازہ لگا سکتا ہے کہ اگر اسے اس جگہ پوسٹ کیا گیا تو اس کا مطلب ہوگا، اسے خاصے مشکل حالات میں کام کرنا ہوگا اس لیے ہوسکتا ہے کہ ہم کسی شخص کو وہاں بھیجنے کی کوشش کریں تو وہ انکار کر دے۔ اس لیے اس معاملے کو ذرا دیکھنا پڑے گا۔ پھر دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ ہمیں اطلاع ملی ہے کہ عابد انصاری کی ڈیتھ کے باوجود ڈاک بنگلے پر ابھی تک چودھری افتخار کے آدمی موجود ہیں۔ غیر سرکاری لوگوں کا کسی سرکاری عمارت میں اس حد تک عمل دخل خاصا قابلِ غور ہے اور ان شکوک کو اور بھی تقویت دے رہا ہے کہ کوئی نہ کوئی گڑبڑ ہے۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ ہم اپنے آدمی تحقیق کے لیے وہاں بھیجتے ہیں تو وہ فوراً ہی نظر میں آجائیں گے اور کچھ حاصل ہونے کے بجائے الٹا ہمارے لوگوں کی جان خطرے میں پڑ جائے گی۔ ہمارے لوگ بے شک وطن پر اپنی جان قربان کر دینا فخر سمجھتے ہیں لیکن ساتھ ہی ہمیں یہ بھی یاد رکھنا ہوتا ہے کہ ہمارا ہر آدمی بہت قیمتی ہے اور ہم اسے آسانی سے نہیں گنوا سکتے۔" ذیشان نے بہت تفصیل سے اس کی بات کا جواب دیا۔

"یہ تو میں خود بھی سمجھتا ہوں۔ البتہ میرے پاس ایک دو تجاویز ہیں جو اگر تمہیں قابلِ عمل لگیں تو ان پر عمل کر دیکھنا۔" اس نے کچھ دیر قبل ملازم کی پہنچائی جانے والی چائے کا گھونٹ بھر کر کپ واپس میز پر رکھا اور خود صوفے پر قدرے پیچھے ہوتے ہوئے پشت گاہ سے ٹیک لگالی۔ اس کے سامنے بیٹھا ذیشان بھی چائے پی رہا تھا اور ساتھ ساتھ ان چھوٹی چھوٹی تبدیلیوں کا جائزہ بھی لیتا جارہا تھا جو اس عرصے میں اس کی شخصیت میں کی گئی تھیں۔ یہ تبدیلیاں بہت معمولی نوعیت کی تھیں لیکن وہ پہلے سے قدرے مختلف محسوس ہونے لگا تھا۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ یہاں صرف اس کے خدوخال یا حلیے کو ہی تبدیل کرنے کی کوشش نہیں کی جارہی تھی بلکہ نشست و برخاست اور دیگر عادات و اطوار میں بھی تبدیلیاں لائی جارہی تھیں تاکہ وہ ہر طرح سے ایک مختلف روپ میں ڈھل جائے اور قریب سے اسے جاننے والے بھی اندازہ نہ لگا سکیں کہ وہ شہریار عادل ہے۔

"تم اپنے لوگوں کو براہِ راست چھان بین کے لیے بھیجنے کے بجائے کوئی کور دے کر بھیج سکتے ہو۔ مثلاً پیشہ ور شکاریوں یا جنگلی حیات کا مطالعہ کرنے والی تحقیقاتی ٹیم کے روپ میں... ورنہ ایک صورت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ ہم ایک بار پھر پولیس کو جنگل میں اتاریں کہ پچھلے آپریشن میں ڈاکوؤں کی مکمل سرکوبی نہیں ہوسکی اس لیے جنگل میں سرچ آپریشن کیا جارہا ہے۔" اس نے اپنی تجاویز پیش کیں۔

"ایسا ہو تو سکتا ہے لیکن میرے خیال میں پہلی دو تجاویز میں سے کسی ایک پر عمل کرنا مناسب رہے گا۔ اس معاملے میں پولیس کی انوالومنٹ کو میں مناسب نہیں سمجھتا۔ نہ ہی مجھے ان کی صلاحیتوں پر زیادہ اعتبار ہے۔ ہم لوگ کسی معاملے میں انھیں اسی وقت شامل کرتے ہیں جب دیگ پک کر تیار ہو اور وہ جا کر دعوت اڑائیں جبکہ یہاں یہ عالم ہے کہ ہمیں خود بھی اندازہ نہیں ہے کہ گڑبڑ کیا ہے اور کس چیز کی تلاش کرنی ہے؟ ہمارے آدمیوں کے تربیت یافتہ ذہنوں کی بات الگ ہے، وہ صحیح جگہ پر پہنچ گئے تو خود گڑبڑ کی بو سونگھ لیں گے۔ پھر مجھے ان میں سے کسی کے کرپشن کا بھی ڈر نہیں ہے۔ انھیں کچھ ملا تو وہ مجھ تک اطلاع ضرور پہنچائیں گے جبکہ پولیس والوں کا ریکارڈ تمہارے سامنے ہے۔ ان کا منہ بند کرنا کبھی بھی مجرموں کے لیے مشکل ثابت نہیں ہوتا۔"

ذیشان جو کہہ رہا تھا، وہ سو فیصد نہ سہی لیکن پھر بھی بڑی حد تک صحیح تھا۔ راشی اور بے ایمان لوگوں کی اکثریت نے پولیس کے محکمے کا تاثر اتنا خراب کر دیا تھا کہ وہاں موجود مٹھی بھر ایماندار افراد بھی انہی جیسے سمجھے جاتے تھے۔

"میں نے تو صرف تجاویز پیش کی ہیں۔ کس پر عمل کرنا ہے اور کس پر نہیں، اس کا اختیار کلی طور پر تمہارے ہاتھ میں ہے۔ میرے اختلاف کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ تم اپنا کام مجھ سے بہتر جانتے ہو۔" اس نے کھلے دل سے ذیشان کو جواب دیا۔

"نہیں بھئی، اب ایسا بھی نہیں ہے کہ تم کچھ جانتے ہی نہیں یا میں تم سے بہت زیادہ قابل ہوں۔ ہمیں باہمی افہام و تفہیم سے ہی مسائل کا حل نکالنا ہے۔ ایک بات جو تمہیں بہتر لگتی ہے، تم کہہ دیتے ہو اور جو مجھے مناسب لگتا ہے، وہ میں بتا دیتا ہوں۔ تمہیں خود سے کم تر سمجھنے کا تو میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ تم میں کچھ خاص ہے جب ہی تو کرنل صاحب جیسے جہاندیدہ شخص نے تمہارا انتخاب کیا ہے۔ وہ ایسے شخص نہیں ہیں جو سی ایف پی کے فنڈز کو ضائع کرنے کا سوچ بھی سکیں۔ وہ تم پر کثیر سرمایہ کاری کر رہے ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ انھیں تم پر بھروسا ہے اور وہ تم سے بہت سی امیدیں رکھتے ہیں۔ اس لیے میں تو خود بخود ہی تمہارے "متاثرین" میں شامل ہو گیا ہوں۔" آخری جملہ اس نے شوخی سے مسکراتے ہوئے کہا جسے سن کر شہریار بھی ہنس پڑا اور بولا۔

"اب میں جواب آں غزل کے طور پر تمہاری تعریف ہرگز نہیں کروں گا۔ ویسے بھی وقت ہو گیا ہے کہ میں اپنے انسٹرکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں ورنہ ان کا بھروسا نہیں کہ وہ مجھے نااہل قرار دے دیں اور میں خدا طاعت و وصالِ صنم ہوا کی تصویر بن جاؤں۔ مستقبل میں کمشنر وغیرہ بننے کا تو ویسے ہی اب کوئی امکان نہیں رہا، یہ نہ ہو کہ جو کرنل صاحب مجھے بنانا چاہ رہے ہیں، میں وہ بھی نہ بن سکوں۔"

"وہ تو خیر تمہیں بننا ہی پڑے گا۔ عمر فاروق صاحب وہ بندے ہیں جو کسی کام کو ہاتھ میں لے لیں تو مکمل کیے بغیر چھوڑتے نہیں ہیں۔ رہی تمہیں نااہل قرار دینے کی پریشانی تو یہ بھی ممکن نہیں ہے۔ عمر فاروق صاحب نے تمہیں اپنی شاگردی میں قبول کر لیا ہے تو سمجھ لو کہ تمہیں اہلیت کا سرٹیفکیٹ ٹریننگ سے پہلے ہی مل چکا۔ نااہل بندے کو تو وہ ایک دن بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔" ذیشان نے نہایت سچائی سے حقیقت بیان کی تو وہ طمانیت کے ساتھ ساتھ ذمے داری کا ایک کوہِ گراں اپنے شانوں پر محسوس کرتا ہوا وہاں سے اٹھ گیا۔

☆☆☆

"یہ دیکھیں آفتاب! یہ ریڈ فراک کتنی خوب صورت ہے۔ امید پہنے گی تو بہت پیاری لگے گی۔"

"فراک پہن کر پیاری لگے گی سے کیا مراد؟ میری بیٹی ویسے ہی بہت پیاری ہے۔ ہاں، تم یہ کہہ سکتی ہو کہ اگر میری بیٹی نے یہ فراک پہن لی تو اس فراک کی شان بڑھ جائے گی۔"

"ہاں بھئی۔ آپ کی بیٹی کے کیا کہنے۔ آپ کی بیٹی جیسا دوسرا کوئی اس دنیا میں ہے ہی کہاں؟"

"نہیں خیر ایسی بھی بات نہیں ہے۔ اس جیسا ایک پیس اللہ میاں نے بہت سال پہلے اس کی ماں کی صورت میں اس دنیا میں اتارا تھا۔ مجھے تو آج بھی اپنی زندگی کا وہ دن نہیں بھولتا جب سرخ عروسی جوڑے میں ایک آسمانی تحفہ مجھے عطا کیا گیا تھا۔ تمہیں بھی تو یاد ہوگا نا وہ وقت.....؟" اس چھوٹے سے سوال نے جواں سال عورت کے چہرے پہ گلال بکھیر دیا۔

"بس یہی ادا تو ہے جو میری بیٹی کی ماں کو سب سے

ممتاز کر دیتی ہے۔" وہ بے ساختہ ہنسی کے ساتھ بولتا ہوا اسے ایک ٹک گھورتا رہا۔

"میرے خیال میں ہم شاپنگ کے لیے آئے ہیں اور اس قسم کی گفتگو کے لیے یہ جگہ قطعی ناموزوں ہے۔" وہ اس کی نظروں سے پزل ہوئی۔

"یہ نیویارک ہے میری جان! یہاں گفتگو چھوڑ اگر میں اپنے جذبات کا عملی مظاہرہ بھی شروع کر دوں تو کسی کو اعتراض نہیں ہوگا۔" اس نے اس کی کیفیت سے حظ اٹھایا۔

"آپ اس بات کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔ کسی کو تو اعتراض ہوگا۔" وہ سمجھ گئی تھی کہ سامنے والا اسے پزل کرنے کی کوشش کر رہا ہے، یک دم ہی خود کو سنبھال کر بھرپور اعتماد سے بولی۔

"اچھا... کون ہے وہ جو اعتراض کرے گا؟"

"میں۔" اس نے نہایت اعتماد سے جواب دیا تو فضا میں زوردار مردانہ قہقہہ گونج اٹھا جس میں نسوانی ہنسی کی مدھر جھنکار بھی شامل تھی۔ یوں ہنستے مسکراتے، ایک دوسرے سے گفتگو کرتے جوڑے کو قطعی احساس نہیں تھا کہ وہ نیویارک کے اس معروف شاپنگ سینٹر میں کسی کی نگاہوں کا خصوصی مرکز ہیں۔ وہ اپنی بچی کو گود میں اٹھائے ایک دوسرے کے ساتھ بے حد مگن اور خوش تھے۔

"اچھا یہ پنک ٹاپ اور فراؤزر دیکھیں۔ یہ تو امید پہ بہت ہی اچھا لگے گا۔" ایک ایک لباس کو تنقیدی نظروں سے جانچتی وہ ایک اور بے بی سوٹ پر رکی تو رائے کے لیے پیچھے مڑ کر دیکھا اور اپنی جگہ پتھر ہو گئی۔ وہ جس کی توقع نہیں کر رہی تھی، وہ چہرہ سامنے تھا۔

"آپ.....؟" اس کے تھرتھراتے لب بس یہی ایک لفظ ادا کر سکے۔

"کیسی ہو کشور؟" بہت ٹھہرے ہوئے لہجے میں اس سے پوچھا گیا۔

"اچھی ہوں... اور آپ؟" وہ بے حد نروس تھی اور سامنے کھڑے شخص کے عقب میں آفتاب کو تلاشنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ اس سے بہت دور امید کو گود میں اٹھائے کھلونوں سے بھرے شوکیس کی طرف متوجہ تھا اور یقیناً بیٹی کے پاس کھلونوں کا ایک اچھا خاصا ڈھیر ہونے کے باوجود اسے کوئی نیا کھلونا دلانا چاہتا تھا۔ کشور کو ٹھنڈے پسینے آنے لگے۔ بے شک یہ نیویارک تھا جہاں قانون سے ہر شخص ڈرتا تھا لیکن ہیرآباد کی جاگیر کا وارث اگر غیرت میں آ کر اسے قتل کرنے پر تل جاتا تو یہ سب نہیں سوچتا۔ بہت دن پہلے جب اس نے آفتاب سے محبت اور خفیہ شادی کی تھی، پھر اس کی خاطر حویلی بھی چھوڑ دی تھی تو اس وقت اسے مرنا اتنا مشکل نہیں لگتا تھا۔ وہ سوچتی تھی کہ خوشیوں بھری زندگی کے ان چند دنوں کے بدلے میں اگر موت کا سامنا کرنا پڑا تو خوشی خوشی اس کی آغوش میں سما جائے گی لیکن اب جبکہ اپنی خوشیوں کی پائیداری پر یقین آنے لگا تھا اور لگتا تھا کہ وہ سب کی پہنچ سے بہت دور آ گئی ہے تو اب اچانک پھر موت کو اپنے سامنے دیکھ کر حالت غیر ہونے لگی تھی۔ اتنی پیاری زندگی کو چھوڑ کر قبر کے اندھیروں میں سو جانے کے خوف سے ٹھنڈے پسینے آنے لگے تھے۔ سامنے والے سے اس کی حالت پوشیدہ نہیں رہی اور وہ نہایت رسان سے بولا۔

"ڈرو مت کشور! میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ میں تو بس تمہیں دیکھ کر بے اختیار ہی ملاقات کے لیے چلا آیا۔ میں کافی دیر سے تم لوگوں کو دور سے دیکھ رہا تھا۔ تمہیں اپنے شوہر اور بچی کے ساتھ خوش دیکھ کر مجھے بے حد خوشی ہوئی ہے ورنہ تو دل ڈرتا ہی تھا کہ جانے جس کے لیے تم نے اتنا بڑا قدم اٹھایا، وہ تمہیں خوش بھی رکھتا ہوگا یا نہیں۔"

"آفتاب بہت اچھے انسان ہیں بھائی! اگر مجھے اباجی کے ہاں مان جانے کی ایک فیصد بھی امید ہوتی تو میں اس طرح سے کبھی حویلی سے قدم نہ نکالتی۔ آفتاب نے میری خاطر بڑی پریشانیاں اٹھائی ہیں۔ وہ تو اللہ کا کرم ہے اور ہمیں ملک سے باہر نکل آنے کا موقع مل گیا ورنہ اباجی تو ہماری جان کے درپے ہو گئے تھے۔ اگر ہم کچھ دن اور پاکستان میں ہی رہتے تو شاید اباجی مجھے اور آفتاب کو بچی سمیت ختم کروانے میں کامیاب ہو جاتے۔" اس نے ضبط سے سرخ ہوتی آنکھوں کے ساتھ مراد شاہ کے سامنے اپنی صفائی پیش کی۔

"میں جانتا ہوں۔ اباجی کا مزاج اور ہمارے خاندان میں رائج الٹی سیدھی رسموں سے میں جتنا الرجک ہوں، وہ تمہیں بھی معلوم ہے۔ میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ تمہارا قدم سخت ناپسندیدہ ہونے کے باوجود تمہارے حالات کے اعتبار سے ناگزیر تھا۔ لیکن یاد رکھو کہ تمہیں اپنی ساری زندگی نہایت احتیاط سے گزارنی ہوگی اس لیے کہ اباجی آج بھی تمہاری جان کے درپے ہیں۔ ان کے دل میں تمہارے لیے بھڑکتا نفرت کا الاؤ اس وقت تک سرد ہونے کے لیے تیار نہیں جب تک اس پر تمہارے خون کے چھینٹے نہ پڑیں۔ وہ اس سلسلے میں میری بھی کوئی بات سننے کو راضی نہیں ہوتے۔ ان کے خیال میں بے شرم فرنگیوں کی صحبت میں رہ کر میں خود بھی بے غیرت ہو گیا ہوں۔ بہرحال، تم محتاط رہو... خصوصاً اس لیے بھی کہ اباجی آج کل نیویارک میں ہی ہیں۔ جس طرح آج تم میری نظروں میں آئی ہو، کل کو اتفاقاً ان سے بھی سامنا ہو سکتا ہے۔" مراد شاہ نے بہن کو سمجھایا۔

"اباجی نیویارک میں ہیں... لیکن کیوں؟ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، وہ کچھ عرصہ پہلے بھی یہاں آ چکے ہیں اور ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا کہ انہوں نے اتنے مختصر عرصے میں دوبارہ آپ کے پاس چکر لگایا ہو۔" مراد شاہ کے نرم لہجے کی وجہ سے اس کی حالت سنبھل گئی تھی اس لیے ذہن بھی ٹھیک ٹھاک کام کرنے لگا اور اس نے برملا اپنی حیرت کا اظہار کر ڈالا۔

"ہاں، اصل میں حالات ہی کچھ ایسے ہیں۔ تمہیں تو یقیناً معلوم نہیں ہوگا کہ اماں کا انتقال ہو گیا ہے اور بقول اباجی، اماں کے بعد ان کا حویلی میں دل نہیں لگ رہا اس لیے وہ گھبرا کر میرے پاس یہاں آ گئے ہیں۔" مراد شاہ نے اسے بتایا تو وہ پل بھر کے لیے چپ ہو گئی اور پھر آہستہ سے بولی۔

"وڈی ماں جی کے بارے میں مجھے معلوم ہے۔ اصل میں آفتاب کا کام ایسا ہے کہ وہ حالاتِ حاضرہ سے ہمیشہ باخبر رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پاکستان سے متعلق خبروں پر ان کی خصوصی توجہ رہتی ہے اس لیے انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ وڈی ماں جی کا اچانک ہی انتقال ہو گیا ہے۔ انہوں نے مجھ سے کہا بھی تھا کہ اگر میں چاہوں تو اپنی بہنوں وغیرہ کو فون کر کے ان سے تعزیت کر سکتی ہوں لیکن میں نے خود ہی رابطہ نہیں کیا۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ میرے فون کرنے سے اباجی کو پتا چلے کہ میں نیویارک میں ہوں۔ ہم تو اتنے محتاط رہتے ہیں کہ اپنے دوستوں اور محسنوں سے بھی رابطے میں احتیاط ہی کرتے ہیں۔" وہ کچھ شرمندہ سی تھی۔

"میں تمہاری مجبوری سمجھ سکتا ہوں۔ مجھے تم سے کوئی شکوہ بھی نہیں ہے۔ میں تو بس تمہیں تمہارے سوال کا جواب دے رہا تھا۔"

"اور میں آپ کا جواب سن کر حیران ہوں۔ اباجی ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جنہیں کسی کے مرنے سے کوئی فرق پڑتا ہو۔ آپ مانیں یا نہ مانیں، معاملہ کوئی اور ہے۔ شاید وہ اپنے کارخانے پر پڑنے والے چھاپے کی وجہ سے یہاں منہ چھپا کر بیٹھے ہیں۔ واپس جائیں گے تو قانون کا سامنا کرنا پڑے گا۔" اس کا لہجہ بتدریج تلخ ہوتا چلا گیا۔ ساتھ ہی یہ بھی واضح ہو گیا کہ وہ نیویارک میں رہتے ہوئے بھی پاکستان سے متعلق معاملات پر بے خبر نہیں ہے۔

"شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو لیکن میری اس سلسلے میں

اباجی سے بات ہوئی تھی۔ میں نے ان سے اس خبر کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ یہ سب کچھ غلط فہمی کی وجہ سے ہوا۔ کارخانہ وہ پہلے ہی کسی کو فروخت کر چکے تھے لیکن نئے مالک نے نہ تو اس کا نام تبدیل کیا اور نہ ہی ملازمین پر اس تبدیلی کو ظاہر کیا گیا اس لیے ان کا نام اس معاملے میں آ گیا۔ میں نے اس بارے میں خود بھی معلوم کروایا تھا۔ اباجی کے اس بیان کی تصدیق ہو چکی ہے اور اب اس بندے کی جو کارخانے کا موجودہ مالک ہے، تلاش کی جا رہی ہے لیکن وہ غائب ہے۔"

"اور یقیناً تاقیامت غائب ہی رہے گا کیونکہ مجھے یقین ہے کہ ایسے کسی بندے کا وجود ہی نہیں ہے۔" مراد شاہ کے عقب سے آواز ابھری تو اس نے مڑ کر بولنے والے کو دیکھا۔ آفتاب بچی کو گود میں لیے وہاں کھڑا تھا۔

"ماموں جان کو سلام کرو بیٹا۔" خود مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے اس نے بچی کو بھی نصیحت کی لیکن بچی ابھی بہت چھوٹی تھی۔ باپ کی بات پر عمل کرنے کے بجائے ٹکر ٹکر اپنے سامنے موجود اجنبی شخص کو گھورتی رہی۔

"آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ یہ میرے بھائی ہیں؟" ادھر کشور بھی حیران تھی۔

"ان کی شکل چودھری صاحب سے بہت ملتی ہے۔ پھر تم مجھ سے ذکر بھی کر چکی تھیں کہ تمہارے بھائی یہاں نیویارک میں ہی رہتے ہیں اس لیے میں انہیں تمہارے قریب کھڑا دیکھ کر سمجھ گیا کہ محترم کون ہیں۔ مداخلت اس لیے نہیں کی کہ چلو بہن بھائی پہلے اکیلے میں مل کر ایک دوسرے سے حال احوال پوچھ لیں... لیکن آپ دونوں کی گفتگو کا سلسلہ تو دراز ہی ہوتا جا رہا تھا اس لیے میں نے سوچا کہ میں اپنی اور اپنی بیٹی کی موجودگی کا احساس دلا دوں۔ یہ نہ ہو کہ آپ ہمیں بھول کر بھائی صاحب کی محبت میں انہی کے ساتھ چل پڑیں۔"

وہ مسکراتے ہوئے بہت خوش گوار لہجے میں یہ سب کہہ رہا تھا اس لیے مراد شاہ کو اس کی گفتگو پر طنز کا شائبہ نہ ہوا، ورنہ لہجے کی ذرا سی تبدیلی سے اس کے الفاظ کو دوسرے معنوں میں بھی دیکھا جا سکتا تھا۔

"خیر، یہ تو ممکن نہیں ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ میری بہن آپ کے ساتھ کتنی خوش ہے۔ اسے اتنا خوش میں نے زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ اور میں جانتا ہوں کہ کوئی بھی شخص اپنی اچھی بھلی خوشیوں بھری زندگی کو چھوڑنے کی حماقت نہیں کر سکتا۔" مراد شاہ نے مسکرا کر اس کی بات کا

جواب دیا۔ اس کا تجزیہ کچھ غلط بھی نہیں تھا۔ آف وائٹ اور براؤن کمبی نیشن کے لباس میں ملبوس بڑا سا دوپٹا اچھی طرح سر پر اوڑھے کھڑی کشور... جس نے لباس کے ہی ہم رنگ آویزے اور چوڑیاں پہن رکھی تھیں، اتنی نکھری ہوئی اور آسودہ محسوس ہو رہی تھی کہ کوئی بھی شخص اس کی خوشیوں بھری زندگی کا اندازہ لگا سکتا تھا۔

"اٹس آ کمپلیمنٹ فار می۔ آئیں چلیں کہیں بیٹھ کر اطمینان سے بات کرتے ہیں۔ یہاں اس طرح کھڑے کھڑے کب تک بات کرتے رہیں گے؟" آفتاب کو ہی خیال آیا تو ان لوگوں کو بھی احساس ہوا کہ وہ بلاوجہ شاپنگ ایریا میں کھڑے گپیں ہانک رہے ہیں۔ احساس ہوتے ہی انھوں نے وہاں سے ایک ریستوران کا رخ کیا۔

"تمہاری بیٹی بہت پیاری ہے کشور! اسے دیکھ کر تمہارا بچپن یاد آ رہا ہے۔ نام کیا رکھا ہے تم نے اپنی بیٹی کا؟" ریستوران میں پہنچ کر انھوں نے ایک میز سنبھالی تو مراد شاہ نے بچی کے رخساروں کو چھوتے ہوئے پوچھا۔

"امید... ہم نے اپنی بیٹی کا نام بہت سوچ سمجھ کر امید رکھا ہے۔ اس وقت جب موت ہمارے تعاقب میں بھاگی آ رہی تھی اور ہمیں لگتا تھا کہ ہم کبھی بھی لمحے اس کے ہاتھوں زیر ہو جائیں گے، ہماری بیٹی ہمارے لیے زندگی کی امید بن کر آئی تھی۔ اس کے آنے سے خاص طور پر میں نے اپنے اندر ایک نیا حوصلہ محسوس کیا تھا اور اب بھی مجھے امید ہے کہ میری بیٹی کی تقدیر مجھ سے بہت اچھی ہوگی۔ یہ میری طرح اپنی زندگی کے بہت سے سال بے جا پابندیوں اور بندشوں میں گزارنے کے بجائے ایسے ماحول میں گزارے گی جہاں اسے اپنی تمام تر صلاحیتوں کو نکھارنے اور بروئے کار لانے کے مواقع مل سکیں گے۔ مجھے امید ہے کہ ایک عرصہ گزرنے کے بعد جب میں اپنی "امید" کو لے کر اباجی کے سامنے کھڑی ہوں گی تو میری آنکھوں میں فخر ہوگا اور میں ان سے کہہ سکوں گی کہ میں نے اپنی بیٹی کو اس سے بہت اچھا ماحول اور تربیت دی ہے جو آپ نے اپنی بیٹیوں کو دی تھی۔ اباجی کی کوئی بھی بیٹی مجھ سمیت میری بیٹی کے مقابلے کی نہیں ہوگی۔" وہ گویا مستقبل کو کسی جادوئی آئینے میں دیکھ رہی تھی۔

"اللہ تمہاری ساری نیک امیدیں اور خواہشات پوری کرے۔" مراد شاہ نے اسے ڈھیروں دعا دی۔ اس کے بعد بھی وہ لوگ کافی اور اسنیکس سے لطف اندوز ہوتے ہوئے دیگر بہت سی باتیں کرتے رہے۔ آفتاب کی دلچسپی کا تو اصل مرکز تھا ہی پاکستان اور وہ صرف مجبوری میں جلاوطنی کی

زندگی گزار رہا تھا اسی لیے اس کی پاکستان کے بارے میں معلومات قابلِ رشک تھیں جبکہ مراد شاہ بھی آبائی وطن ہونے کے حوالے سے وہاں کے متعلق باخبر رہنے کی کوشش کرتا تھا، اس لیے وہ آپس میں گفتگو کرنے بیٹھے تھے۔ باہمی دلچسپی کے بہت سے موضوعات نکلتے ہی چلے گئے۔ البتہ آفتاب نے دوبارہ چودھری افتخار کے موضوع کو نہیں چھیڑا۔ وہ اس بات کو سمجھتا تھا کہ مراد شاہ لاکھ روشن خیال اور باپ کا مخالف سہی لیکن باپ کی بُرائی سننا اس کے لیے تکلیف دہ ہوگا۔

"تم لوگ میرا فون نمبر اور ایڈریس رکھ لو۔ فی الحال تو اباجی یہاں ہیں اس لیے میں تمہیں اپنے گھر آنے کی دعوت نہیں دے سکتا البتہ فرصت ہو تو فون پر رابطہ رکھنا اور اباجی کے واپس جانے کے بعد ملنے بھی آنا۔ شاہدہ کو بھی تم سے مل کر خوشی ہوگی۔" ملاقات آخری مرحلے میں داخل ہونے لگی تو مراد شاہ نے ایک کارڈ آفتاب کی طرف بڑھایا۔ اس موقع پر کشور کا بھی دل چاہا کہ وہ بڑے بھائی کو اپنا فون نمبر اور پتا نوٹ کروا دے۔ اتنے عرصے بعد اس کے میکے سے ملنے والا وہ پہلا فرد تھا اور خوش قسمتی سے اس نے اسے لعنت ملامت کرنے کے بجائے اس کی مجبوریوں کو سمجھنے کی کوشش کی تھی اس لیے قدرتی طور پر وہ اس کی طرف اپنا جھکاؤ محسوس کر رہی تھی لیکن جب اس نے دیکھا کہ آفتاب نے خاموشی سے مراد شاہ کا کارڈ لے کر رکھ لیا ہے اور جواب میں ایسی کوئی اخلاقیات نہیں دکھائی تو دل پر جبر کر کے خاموش بیٹھی رہی۔

"یہ میری طرف سے امید کے لیے رکھ لو۔ آج پہلی بار میں نے اسے دیکھا ہے لیکن یہ ملاقات اتنی اچانک ہے کہ رواج کے مطابق میرے پاس اپنی بھانجی کو دینے کے لیے کوئی تحفہ نہیں ہے۔ میری طرف سے یہ تحفہ تم لوگ خود لے لینا، البتہ اگلی ملاقات پر انشاءاللہ میں خالی ہاتھ اس سے نہیں ملوں گا۔" ٹیبل سے اٹھنے سے قبل مراد شاہ نے اپنا پرس نکالا اور بغیر گنے بہت سے ڈالرز نکال کر کشور کی طرف بڑھا دیے۔ وہ لاکھ انکار کرتی رہی لیکن مراد شاہ کے آگے اس کی ایک نہیں چلی۔ آفتاب نے بھی بہن بھائی کے درمیان دخل انداز ہونا مناسب نہیں سمجھا۔ مراد شاہ ان سے رخصت ہو کر گیا تو کشور کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔

"آپ نے تو ثابت کر دیا کہ شوہر بے چارہ چاہے بیوی کو خوش رکھنے کی کتنی بھی کوشش کرے لیکن عورت کو اصل خوشی میکے والوں سے مل کر ہی ہوتی ہے۔" آفتاب نے اس کے دمکتے چہرے کو دیکھ کر مسکراتی آنکھوں سے چھیڑا۔

"میکے کا مان کیا ہوتا ہے، یہ ایک شادی شدہ عورت ہی

سمجھ سکتی ہے آفتاب! آپ نے مجھے جتنی خوشیاں دی ہیں، ان سے میں انکار کر ہی نہیں سکتی لیکن خونی رشتوں کی محبت تو انسان کے خمیر میں شامل ہوتی ہے۔ ہم عورتیں کسی مجبوری کے تحت اپنے ان رشتوں سے دور رہ تو لیتی ہیں لیکن وجود میں ایک خلا، ایک ادھورا پن سا رہتا ہے۔ آج بھائی سے مل کر میرے اندر کا وہ احساس ہلکا ہو گیا ہے۔" کشور نے نہایت سچائی سے اعتراف کر لیا پھر ذرا شاکی لہجے میں بولی۔ "بھائی نے اتنی محبت سے آپ کو اپنے گھر آنے کی دعوت دی لیکن آپ نے نہ تو جواب میں انھیں ایسی کوئی دعوت دی نہ ہی اپنا فون نمبر اور پتا وغیرہ بتایا؟"

"سوری، مجھے احساس ہے کہ آپ کو میری یہ حرکت بُری لگی لیکن میری بھی مجبوری تھی۔ بے شک فی الحال ہمیں لگتا ہے کہ ہم خطرے کی حد سے نکل آئے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہم کبھی بھی احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑ سکتے۔ مراد شاہ ہم سے جتنی محبت اور خلوص سے ملے، اس نے مجھے بھی متاثر کیا ہے لیکن آپ جانتی ہیں کہ میں صحافی ہوں اور ایسے بے شمار قصوں سے واقف ہوں جہاں اپنوں نے ہی پیٹھ میں چھرا گھونپ دیا۔ میں مانتا ہوں کہ میرے دل نے ننانوے فیصد مراد شاہ کو اچھا آدمی تسلیم کیا ہے لیکن ایک فیصد شک بہرحال مجھے ہے۔ کیا معلوم کب ان کا جاگیردار خون جوش میں آ جائے یا پھر ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ آپ کے اباجی کے مقابلے میں زیادہ عقل مند ہوں اور خوامخواہ بڑھکیں مار کر اور غصہ دکھا کر دشمن پر حملہ کرنے کے بجائے پیار سے اپنا مقصد پورا کر لینے کے قائل ہوں۔ اس لیے میں نے اپنی مکمل تسلی سے پہلے کسی قسم کا رسک لینا مناسب نہیں سمجھا۔" آفتاب کی دلیل میں وزن تھا اس لیے کشور نہ صرف یہ کہ کچھ کہہ نہ سکی بلکہ بجھ سی گئی۔ بھائی سے ہونے والی ملاقات کی خوشی کو اس مہیب اندیشے نے مٹا دیا تھا کہ کیا معلوم واقعی وہ دشمن ہو کر دوست کے روپ میں ملا ہو۔

"اتنی اداس نہ ہوں۔ میں نے جو بھی خدشات بیان کیے، وہ بس ایک احتیاط تھی ورنہ جب تک امید ہمارے ساتھ ہے، ہمیں یہی سوچنا ہے کہ ایک نہ ایک دن حالات ہمارے حق میں بہتر ہو جائیں گے۔ اللہ نے اب تک ہماری مدد کی ہے، کیا آگے وہ ہماری اس امید کو پورا نہیں کرے گا؟ وہ بہت مہربان ہے اور انشاءاللہ ہمیشہ اپنے رحم و کرم کے سائے میں ہی رکھے گا۔ بس اس کے لیے ہمیں اس کی نافرمانی سے بچنا ہوگا۔ باقی چھوٹی موٹی خطاؤں اور غلطیوں کے لیے ہم اس کی بخشش اور بے پایاں رحم کی امید نگاہ کر رکھیں گے۔" آفتاب نے مایوسی

میں گھرتے اس کے دل میں امید کا ایک دیا روشن کر دیا۔

☆☆☆

"کیا بات ہے، بہت اداس لگ رہی ہو؟" وہ ایک بہت روشن صبح تھی۔ زمین پر ہر سو پھیلی ہریالی اور کہیں کہیں سفید بادلوں سے سجے نیلے آسمان کو دیکھ کر کسی خوب صورت پینٹنگ کا گمان ہوتا تھا لیکن اس منظر کو بے جان پینٹنگ اس لیے قرار نہیں دیا جا سکتا تھا کہ بار بار فضا میں اڑان بھرتے پرندوں کے غول منظر کو متحرک کر دیتے تھے۔ ماہ بانو اپنی قیام گاہ کی کھڑکی میں کھڑی کب سے اس منظر کو دیکھ رہی تھی۔ یہ آئرلینڈ کی صبح تھی اور وہ شہریار کے دوست کے اچھے خاصے وسیع گھر کی انیکسی میں مقیم تھے۔ شہریار کے اس دوست کا نام مصطفیٰ خان تھا اور وہ خاصے طویل عرصے سے یہاں مقیم تھا۔ ماہ بانو اور اسلم کو یہاں بھیجتے ہوئے شہریار نے نہ صرف انھیں مصطفیٰ خان کا پتا دیا تھا بلکہ ساتھ ہی ایک خط بھی دیا تھا۔ اس خط کو پڑھنے کے بعد مصطفیٰ خان نے ان سے کوئی سوال نہیں کیا تھا اور انھیں اپنے گھر کی انیکسی میں ٹھہرا دیا تھا۔ اگلے دو دن میں وہ ان کے لیے ایک سپر اسٹور میں ملازمت کا بھی بندوبست کر چکا تھا۔ ان دو دنوں کے دوران مصطفیٰ خان کی بیوی انھیں باقاعدگی سے کھانا بھجواتی رہی تھی۔ وہ ایک خوش شکل اور خوش مزاج عورت تھی جس نے ماہ بانو کو گھرداری شروع کرنے اور ملازمت کے ساتھ اسے منظم کرنے کے کئی مفید مشورے دیے تھے۔ اس کے مشوروں پر عمل کرتے ہوئے ماہ بانو، اسلم کے ساتھ جا کر کئی ایسی اشیا خرید کر لے آئی تھی جنھیں کم وقت میں پکایا جا سکے۔ یہاں انھیں نامعلوم مدت کے لیے رہنا تھا اس لیے انھوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ مصطفیٰ خان اور اس کی بیوی بلقیس کو زیادہ زحمت نہیں دیں گے اور خود سے اپنی ذمے داریاں نبھانے کی کوشش کریں گے۔ اس کوشش کا آغاز انھوں نے اپنی ملازمت کے پہلے دن سے ہی کر دیا تھا اور آج ماہ بانو نے خود ہی ناشتا تیار کیا تھا۔ ہلکے پھلکے ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد وہ اپنا چائے کا کپ لے کر انیکسی کی ایک کھڑکی میں آ کھڑی ہوئی تھی۔ اس کھڑکی سے بہت دور تک کا منظر صاف دکھائی دیتا تھا۔ اس منظر کو دیکھتے دیکھتے ہی وہ اداسی میں گھر گئی تھی اور اس کے پیچھے ہی وہاں آ کھڑے ہونے والے اسلم نے اس کی اداسی کو بھانپ کر اس سے سوال کیا تھا۔

"یہ ہریالی اور شفاف آسمان دیکھ کر مجھے ہیرآباد کی یاد آ گئی ہے۔ میں فیصل آباد میں جس جگہ رہتی تھی، وہ بہت تنگ محلہ تھا۔ گھر سے باہر نکلو تو گندے پانی کی نالیوں اور بجربجہ

کے ڈھیر ہی دیکھنے کو ملتے تھے۔ میں نے اپنے ذوق کی تسکین کے لیے گھر کے آنگن میں ایک کیاری بنا رکھی تھی۔ اس کے علاوہ چھ سات گملے بھی تھے جنہیں دیکھ کر مجھے خوشی تو ہوتی تھی لیکن جب میں اس کا مقابلہ پیر آباد کی ہریالی سے کرتی تھی تو کچھ اداس ہو جاتی تھی۔ پیر آباد میں اپنے ماں باپ اور بھائی بہنوں کی موجودگی کے باوجود مجھے بہت زیادہ دلچسپی نہیں تھی لیکن میں جب بھی وہاں جاتی تھی، وہاں کی ہریالی میں کھو جاتی تھی۔ اس وقت مجھے گمان بھی نہیں تھا کہ میں وہاں سے اتنی دور امریکا کی ایک ریاست میں پہنچ جاؤں گی اور وہ جگہ پیر آباد سے کئی گنا زیادہ خوب صورت ہوگی۔ آبادی سے بس ذرا سے ہی فاصلے پر موجود اس جنگل نے مجھے پیر آباد سے متصل جنگل کی یاد دلا دی ہے۔ اس جنگل میں، میں نے اپنی زندگی کے جو شب و روز بتائے تھے، انہوں نے میری زندگی کا دھارا ہی بدل کر رکھ دیا۔ وہاں مجھے آپ ملے اور آپ کے ساتھ میں یہاں تک پہنچ گئی۔ نہ جانے اب بھی مجھے اپنے وطن کی فضاؤں میں سانس لینا نصیب ہوگا بھی یا نہیں؟ میں اپنے پیاروں کی شکلیں دوبارہ دیکھ بھی سکوں گی یا نہیں؟'' اس کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے تھے جس کی وجہ سے سامنے کا منظر دھندلا گیا تھا۔

''تمہاری اداسی بالکل درست ہے۔ ہم جن حالات میں وہاں سے نکلے ہیں، ان کو دیکھتے ہوئے تو یہی سوچا جا سکتا ہے کہ شاید اب ہمیں ساری زندگی اس دیارِ غیر میں ہی گزارنی ہوگی لیکن میرا وجدان کہتا ہے کہ ایسا نہیں ہوگا۔ کبھی نہ کبھی حالات ایسی کروٹ ضرور لیں گے کہ ہم اپنے وطن واپس لوٹ سکیں گے۔'' اسلم نے اس کے شانوں پر اپنا بازو پھیلاتے ہوئے اسے تسلی دی۔

''مجھے بہلانے کی کوشش کر رہے ہیں؟'' ماہ بانو کے ہونٹوں پر ایک اداس سی مسکراہٹ چمکی۔

''نہیں، اپنے دل کی بات بتا رہا ہوں۔'' اس نے فوراً ہی تردید کر دی۔

''دل بھی کبھی خوش گمانی میں بھی تو مبتلا ہو جاتا ہے۔''

''میرے خیال میں تو دل کو ہمیشہ خوش گمانی میں ہی مبتلا رکھنا چاہیے۔ کہتے ہیں کہ اچھا سوچو گے تو اچھا ہوگا۔'' وہ دونوں بہت سویرے جاگ گئے تھے۔ فجر کی نماز کے بعد انہوں نے فوراً ہی ناشتا بھی کر لیا تھا اس لیے ملازمت پر جانے کے لیے ابھی ان کے پاس خاصا وقت تھا اور وہ مزے سے اپنی گفتگو جاری رکھے ہوئے تھے۔

''اچھا سوچنے کے ساتھ ساتھ انسان کو عمل کرنے کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اب یہی دیکھ لیں کہ قدرت نے کتنی فیاضی کے ساتھ ہمیں اور یہاں والوں کو نوازا ہے۔ قدرتی ماحول کے اعتبار سے اس جگہ اور پیر آباد میں کتنی مماثلت ہے۔ جنگل، ہریالی، بہتا پانی، انواع و اقسام کے چرند پرند... کیا ہے جو یہاں ہے اور وہاں نہیں ہے؟ لیکن فرق یہ ہے کہ یہاں والوں نے اپنی ہر چیز کو سنبھالا اور سنوارا ہے جبکہ ہم نے صرف اور صرف اپنی چیزوں کو اجاڑا ہے۔ بلقیس باجی بتا رہی تھیں کہ یہاں جانوروں کے تحفظات کا اتنا خیال رکھا جاتا ہے کہ اگر ڈرائیو کے دوران کوئی جانور سڑک پر آ جائے تو ڈرائیور گاڑی روک کر پہلے اسے گزرنے کا موقع دیتا ہے۔ حکومت بھی اس معاملے میں بہت سخت ہے اور کسی جانور کو نقصان پہنچانے کی صورت میں بھاری جرمانہ عائد کر دیتی ہے۔ ادھر ہمارے ہاں کیا ہوتا ہے؟ جو قرے دار ہوتے ہیں نگہبان اور محافظ کے، وہی لوٹنا کھسوٹنا شروع کر دیتے ہیں۔ غیر قانونی شکار سے لے کر لکڑی اور کھالوں کی اسمگلنگ تک ایسا کون سا کام ہے جو اربابِ اختیار کی زیر نگرانی نہیں ہوتا۔ تعمیر و ترقی سے تو گویا ہمارے اوپر مسلط لوگوں کو چڑ ہے۔ میں اس جگہ کو دیکھتے ہوئے پیر آباد کو سوچتی ہوں تو افسوس ہوتا ہے۔ یہاں سب کچھ کتنا منظم اور صاف ستھرا ہے اور ادھر پیر آباد کا یہ حال ہے کہ پرائمری اسکول اور مرکزِ صحت قائم کرنے کے لیے بھی شہریار صاحب کو باقاعدہ ایک جنگ لڑنی پڑی تھی۔ گاؤں تک پہنچنے والے راستے کو بھی انہوں نے اپنی ذاتی کوششوں سے پختہ کروایا تھا۔ امید تھی کہ وہ چند سال اپنی سیٹ پر ٹک گئے تو پیر آباد سمیت پورے ضلع کا نقشہ بدل دیں گے لیکن حالات کو دیکھتے ہوئے مجھے ڈر لگتا ہے کہ جانے کب وہ ہمت ہار بیٹھیں۔ آخر ان کا بھی گھر بار ہے۔ ان کے عزیز و اقارب اور بیگم سے کب تک برداشت ہوگا کہ وہ یوں اپنی جان ہتھیلی پر لیے پھرتے رہیں۔'' وہ بولنے پر آئی تو بولتی ہی چلی گئی۔ یہ سب بولتے ہوئے اسے علم نہیں تھا کہ شہریار کی ازدواجی زندگی کا اختتام اسی روز ہو گیا تھا جس روز وہ اسلم کی دلہن بنی تھی۔ بعد کے حالات بھی اس کے علم میں نہیں تھے ورنہ سب کی طرح اس وقت اسے بھی یہی معلوم ہوتا کہ شہریار شدید زخمی ہو کر کومے کی حالت میں اسپتال میں پڑا ہوا ہے۔ شہریار نے اس پر اپنے حالات کو کھوجنے اور رابطہ کرنے پر پابندی ہی اس لیے عائد کی تھی کہ وہ کسی بری خبر کو سن کر ڈسٹرب نہ ہو اور سکون سے اپنی نئی زندگی کی شروعات کر سکے۔

''تم نے جو کچھ کہا، وہ غلط نہیں ہے۔ تمہاری طرح میں بھی حالات گزیدہ ہوں۔ تمہاری ہی طرح میں نے بھی دربدری کا عذاب سہا ہے لیکن زندگی جس طرح مجھ پر مہربان ہوئی ہے، میں نے جان لیا ہے کہ گھٹا ٹوپ اندھیرے میں بھی روشنی کی ایک کرن کہیں سے نمودار ہو کر سب کچھ بدل سکتی ہے۔ میں وہ وقت کبھی نہیں بھول سکتا جب حالات کے جبر نے میرے ہاتھ سے قلم چھین کر بندوق تھما دی تھی۔ میں اپنے باپ کی خواہشات کو بھول کر ڈاکو بنا لوگوں کو لوٹتا پھر رہا تھا اور گمان تھا کہ اب مرتے دم تک یہی کام کرتا رہوں گا... لیکن پھر تم میری زندگی میں چلی آئیں۔ تمہاری وجہ سے میں نے برائی کی دلدل سے باہر نکلنے کی ہمت کی اور بعد میں شہریار صاحب نے سہارا دے کر اس قابل کر دیا کہ میں اپنے ارادے پر قائم رہ سکوں۔ یہ سب کہنے کا مطلب یہ ہے کہ بے شک ہمارے ملک میں بہت ظلم اور بے ایمانی ہے لیکن ان بُرے لوگوں کے درمیان شہریار صاحب جیسے چند اچھے لوگ بھی تو ہیں۔ اور جب تک ایسے لوگ موجود ہیں، ہم اپنے ملک کے مستقبل سے ناامید نہیں ہو سکتے۔ انشاء اللہ ایک وقت آئے گا جب ہمارے ملک کے حالات بدلیں گے۔ وہاں بھی تعمیر و ترقی ہوگی اور ظالموں اور بے ایمانوں کا احتساب ہوگا۔''

اسلم کے لہجے میں وہ اعتماد بول رہا تھا جو وقت نے اسے عطا کیا تھا۔ بہت سے مایوس کن دن گزارنے کے بعد زندگی نے اسے اپنا جو رخ دکھایا تھا، وہ اس کے لیے اتنا خوش گوار تھا کہ وہ ماضی کی ہر تلخی کو فراموش کر بیٹھا تھا۔

''چلیں بھئی، آپ جیتے میں ہاری کیونکہ ایک تو آپ کا زندگی کے بارے میں تجربہ مجھ سے زیادہ ہے، دوسرے اب ہمیں اسٹور کے لیے روانہ ہونے کی تیاری کرنی ہے۔ میں پہلے ہی دن تاخیر سے پہنچ کر وہاں اپنا تاثر خراب نہیں کرنا چاہتی۔ ویسے بھی ہم بحیثیت قوم اس معاملے میں خاصے بدنام ہیں اور میرے دل میں بے شک پاکستانیوں کے لیے بہت سے شکوے ہیں پھر بھی میں نہیں چاہتی کہ ایک پاکستانی ہو کر اپنے وطن کی بدنامی میں کوئی کردار ادا کروں۔'' ماہ بانو نے ہنس کر کہتے ہوئے خود ہی ماحول کا بوجھل پن دور کرنے کی کوشش کی اور پھر وہ دونوں ہی تیار ہونے کے لیے سامنے پھیلے خوب صورت منظر کو چھوڑ کر کھڑکی سے ہٹ گئے۔

☆☆☆

''آپ میری بات سمجھ رہی ہیں نا بوبی جی...؟''

نہایت نرمی سے پوچھے گئے سوال پر زرق برق لباس، گہرے میک اَپ اور بھاری زیورات سے لدے وجود کے

چہرے پر استہزائیہ مسکراہٹ ابھری۔ پھر وہ اپنی بھاری آواز میں بولا یا شاید بولی۔ ”ابھی تو میں قدرت کے رنگ دیکھ رہی ہوں۔ میں ناکارہ وجود جسے تم لوگ کسی قابل نہیں سمجھتے اور جسے جسم سے سانسوں کا رشتہ جوڑے رکھنے کے لیے کبھی بھری سڑک پر تمہاری تفریح کا سامان بننا پڑتا ہے تو کبھی گڑگڑا کر بھیک مانگنی پڑتی ہے، آج اس لائق کیسے ہوگئی کہ حکومت کی کسی خفیہ ایجنسی کو میری ضرورت پڑ گئی؟“

”دیکھیں بوبی جی! آپ لوگوں کے ساتھ ہمارے معاشرے کا جو رویہ ہے، اسے میں خود بھی قابلِ مذمت سمجھتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ ہر تعلیم یافتہ اور باشعور فرد میرا ہم خیال ہوگا... لیکن اس کے باوجود میں نہایت شرمندگی سے اعتراف کرتا ہوں کہ... آپ جو کہہ رہی ہیں وہ واقعی درست ہے۔“ سی ایف پی کا وہ نوجوان اہلکار خواجہ سراؤں کے اس پُراعتماد گرو کے سامنے بیٹھا خود کو خاصا چھوٹا محسوس کر رہا تھا پھر بھی اس کی کوشش تھی کہ کسی طرح اس کو اپنے حق میں ہموار کرسکے۔

”درست نہ ہوتا تو میں کہتی ہی کیوں؟“ لائٹر کی مدد سے سگریٹ سلگاتے ہوئے بوبی صاحبہ نے اپنی دائیں ٹانگ کو بائیں پر جمایا اور ایک زوردار کش لیتے ہوئے اچھے خاصے پُراعتماد بندے کا اعتماد متزلزل کرنے کی کوشش کی۔

”بے شک۔“ نوجوان اہلکار نے اس کی تردید کرنے کی جرأت نہیں کی۔ وہ اس وقت ضرورت کے وقت گدھے کو باپ بنا لینے کے مقولے پر عمل پیرا تھا۔

”اصل میں بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں لوگوں کو اس بات کا شعور ہی نہیں ہے کہ ایک شخص جو قدرت کی طرف سے کسی کمی بیشی کو لے کر دنیا میں آیا ہے، بالکل ناکارہ نہیں ہوتا۔ اس کے اندر بھی صلاحیتوں کا ایک خزانہ چھپا ہوتا ہے اور ضرورت صرف اس امر کی ہوتی ہے کہ اس خزانے کو دریافت کر کے اسے استعمال میں لایا جائے۔“ اس نے کھنکھارتے ہوئے ایک بار پھر اسے قائل کرنے کے لیے اپنی تمہید کا آغاز کیا۔

”اور تم آج یہ کام کرنے آئے ہو۔“ بوبی نے اس کی بات کاٹ کر طنز کیا۔

”نہیں، میں ایسا کچھ نہیں کر رہا۔ میں تو آپ سے صرف درخواست کر رہا ہوں کہ چاہے آپ سے یہاں کتنی ہی ناانصافیاں کی گئی ہوں، آپ کے حقوق کو پامال کیا گیا ہو لیکن آپ اس بات سے انکار تو نہیں کرسکتیں ناکہ یہ ملک آپ کا بھی ہے... اور آج جب اس ملک کو آپ کی ایک چھوٹی سی خدمت کی ضرورت ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ آپ کو انکار نہیں کرنا چاہیے، ورنہ آج اگر آپ مظلوموں میں شامل ہیں تو کل ظالموں میں شامل ہوں گی۔ میری بات نہ مان کر بحیثیت ایک انسان اور ایک پاکستانی آپ کو کبھی سکون نہیں ملے گا۔ آپ جب بھی کسی دھماکے، کسی تخریب کاری کے بارے میں سنیں گی تو آپ کو پچھتاوا ہوگا کہ کاش ان ملک دشمن عناصر کی بیخ کنی کے لیے آپ نے ہمارا ساتھ دیا ہوتا تو یقیناً کئی انسانی زندگیاں بچ جاتیں۔“ وہ بہت ٹھہر ٹھہر کر اور سلجھے ہوئے لہجے میں بات کر رہا تھا۔ بوبی کے سخت چہرے پر اس کی بات سن کر مسکراہٹ پھیل گئی۔

”تم بہت چالاک ہو لڑکے۔“

”وہ تو ہوں۔ اگر نہ ہوتا تو میرا محکمہ اس کام کے لیے میرا انتخاب کیوں کرتا۔“ پہلی بار نوجوان کے چہرے پر بھی شوخ مسکراہٹ جگمگائی۔

”تو چلو پھر ایک بار اور بتاؤ کہ تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟“ بوبی نے شاہانہ انداز میں اس سے پوچھا۔

”میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ ایک مصدقہ اطلاع کے مطابق خواجہ سراؤں کے مختلف گروہوں میں سے ایک گروہ ایسا ہے جو شدت پسند ہندو خواجہ سراؤں پر مشتمل ہے۔ سابق ڈی آئی جی سجاد رانا صاحب کی نوعمر بیٹی اس گروہ کے ہاتھ لگ کر اپنی جان سے چلی گئی تھی۔ انہوں نے اپنی کسی ظالمانہ رسم کی ادائیگی کے لیے اسے ایک دیوی کے چرنوں میں بھینٹ چڑھا دیا تھا۔ پولیس اپنی کوشش کے باوجود اس گروہ تک اس لیے نہیں پہنچ سکی کہ اس واقعے میں ملوث جن خواجہ سراؤں کے نام سامنے آئے، ان سب کو زہر دے کر ہلاک کر دیا گیا۔ بعد میں ڈی آئی جی سجاد رانا بھی ٹارگٹ کلنگ کا نشانہ بن گئے اور ان کے بعد اس کیس کی تحقیقات میں وہ تیزی نہ رہی جو ہونی چاہیے تھی۔ شاید پولیس خود بھی ایک طرح سے مجبور رہی ہے کہ ابھی ایک واقعے سے فرصت نہیں پاتی کہ دوبارہ پھر کہیں اسی نوعیت کا یا اس سے بھی بڑا سانحہ پیش آجاتا ہے۔ بہرحال، اس کیس میں جو سب سے اہم بات سامنے آئی تھی، وہ یہ تھی کہ انتہا پسند خواجہ سراؤں کے اس گروہ کے رابطے را جیسی بدنام بھارتی ایجنسی سے بھی ہیں اور یہ بات ہر محبِ وطن پاکستانی سمجھ سکتا ہے کہ اگر کسی جگہ را کام کر رہی ہے تو اس کا مطلب ہے وہاں پاکستان کی سالمیت کو نقصان پہنچانے کی کارروائیاں بھی ضرور کی جارہی ہیں۔

”ایک پاکستانی اور مسلمان ہونے کی حیثیت سے آپ کا فرض بنتا ہے کہ ان ملک دشمن عناصر سے نمٹنے میں

ہماری مدد کریں۔ آپ چاہیں تو میں آپ کی اس مدد کو ذاتی طور پر آپ کا احسان بھی تسلیم کرلوں گا۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ میں سمجھتا ہوں اگر کوئی بھی شخص پاکستان کی خاطر کوئی کام کرتا ہے یا قربانی دیتا ہے تو یہ اس کا اپنے وطن پر احسان نہیں بلکہ ایک فرض اور ضرورت ہے۔ میرا یہ بھی ماننا ہے کہ اگر کسی شخص کو اس کے حقوق نہ بھی مل رہے ہوں، تب بھی اس پر سے اپنے وطن کی سلامتی اور حفاظت کی ذمے داری ختم نہیں ہوجاتی... کیونکہ وطن سلامت رہے گا، تب ہی تو وہ یہ امید کر سکے گا کہ کبھی نہ کبھی اسے اس کا حق مل جائے گا۔“

”تم یہ بات کرسکتے ہو لڑکے کیونکہ تم نے زندگی میں کبھی محرومیوں کو نہیں دیکھا ہوگا۔“ بہت غور سے اس کی بات سنتا بوبی نامی وہ خواجہ سرا اس کے آخری جملوں پر بدمزہ ہو کر بولا۔

”آپ نے بالکل صحیح کہا کہ میں یہ بات کہہ سکتا ہوں لیکن اس لیے نہیں کہ میں نے زندگی میں کبھی محرومیوں کو نہیں دیکھا بلکہ اس لیے کہ بہت سی محرومیوں کے ساتھ زندگی گزارنے کے باوجود میرا جذبۂ حب الوطنی زندہ ہے۔ میرے والد پاکستانی آرمی میں تھے۔ میں جب صرف چار سال کا تھا تو انہیں سیاچن کے محاذ پر بھیج دیا گیا اور پھر وہ کبھی وہاں سے واپس نہ آسکے۔ قاتل پہاڑ پر چلائی جانے والی دشمن کی ایک گولی نے انہیں شہید، میری ماں کو بیوہ اور مجھے یتیم کر دیا۔ آپ نے شاید یہ تو سنا ہو کہ شہید ہمیشہ زندہ رہتے ہیں لیکن آپ نے کبھی ان کے پیچھے جیتے جی مرجانے والوں کو نہ دیکھا ہوگا۔ میرا باپ کوئی لاوارث شخص نہیں تھا لیکن اس کے بعد میں لاوارث ہوگیا۔ میرے چچاؤں نے بجائے مجھ یتیم کے سر پر ہاتھ رکھنے کے میرے والد کے حصے کی زمین بھی ہتھیالی اور میری ماں کو مجھ سمیت دھکے دے کر گھر سے نکال دیا۔ ایک جوان بیوہ عورت کے لیے تنہا زندگی کی جنگ لڑنا ہمارے معاشرے میں کتنا مشکل ہے، یہ ہر شخص جانتا ہے۔ میری ستم رسیدہ ماں نے رزقِ حلال کے حصول کی جدوجہد کے ساتھ ساتھ جانے کتنی مشکلوں سے پالا ہوگا۔ اپنی ماں کی قلیل آمدنی کی وجہ سے میں ہمیشہ موسم کے پھلوں، اچھے کپڑوں، جوتوں اور بے شمار خواہشات کے لیے ترستا رہا لیکن پھر بھی اس وطن سے نفرت نہ کرسکا جس کی حفاظت کی خاطر مجھ سے میرا باپ چھن گیا تھا۔ میری بہادر ماں نے مجھے محرومیوں سے لڑ کر جینا سکھایا اور ساتھ ہی میرے دل میں جذبۂ حب الوطنی کی آبیاری کرتی رہی۔ وہ اتنی حوصلہ مند تھی کہ اس وطن کے دفاع پر اپنا سہاگ قربان کر دینے کے باوجود اپنے اکلوتے بیٹے کو فوج میں بھیجنا چاہتی تھی لیکن بدقسمتی سے ہر طرح کی اہلیت اور بہت سا جذبہ رکھنے کے باوجود میں اپنی ماں کی یہ خواہش اس لیے پوری نہیں کرسکا کہ میرا قد مطلوبہ معیار سے صرف آدھا انچ کم تھا۔ میں بہت رویا، بہت گڑگڑایا لیکن پھر بھی پاکستان آرمی میں شمولیت کا حق دار نہ ٹھہر سکا لیکن پھر زندگی میں پہلی بار تقدیر کو مجھ پر رحم آگیا۔ جانے کیسے میں ایک خفیہ ایجنسی کے ذمے داروں کی نظر میں آگیا اور انہوں نے ضروری تربیت کے بعد مجھے اپنے ساتھ شامل کرلیا۔ میری بدقسمتی دیکھیں کہ میری ماں کو میری یہ کامیابی دیکھنے کا موقع نہیں مل سکا اور وہ کینسر کے موذی مرض سے لڑتے لڑتے آخرکار موت کی گود میں جاسوئی۔ آج میں دنیا میں بالکل تنہا ہوں۔ کوئی رشتہ، کوئی محبت میرے ساتھ نہیں ہے لیکن پھر بھی میں کسی کو اپنے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کے لیے مجرم نہیں ٹھہراتا اور صرف اکیس سال کی عمر میں اس بات کے لیے تیار ہوں کہ اگر دفاعِ وطن کی خاطر میری جان جاتی ہے تو چلی جائے۔“ بہت تسلسل سے بولتا وہ یک دم خاموش ہوا تو دیکھا کہ بوبی کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے ہیں۔

”تم نے میرا دل جیت لیا لڑکے۔“ اس نے رندھی ہوئی آواز میں یہ جملہ کہا پھر بولی۔

”جو چاہتے ہو بتاؤ، میں تمہارا ساتھ دینے کے لیے تیار ہوں۔“

”مجھے ہندو خواجہ سراؤں کے اس گروہ تک رسائی حاصل کرنی ہے۔ آپ بس مجھے ان تک پہنچادیں۔“

”میں اس کام میں تمہاری پوری مدد کروں گی۔ اس کے علاوہ اور کوئی خدمت چاہیے تو بتاؤ؟“ بوبی نے جواب دیا۔

”بس اتنا ہی کافی ہے۔“ سی ایف پی کا اہلکار جاوید علی مسکرا کر بولا۔ بوبی پر کی گئی اپنی محنت کو رنگ لاتا دیکھ کر وہ بہت خوش تھا۔

☆☆☆

رنگ، روشنی، خوشبو، قہقہے، خمار، مستی اور جانے مزید کیا کیا تھا جو اس محفل کا حصہ تھا اور کیوں نہ ہوتا کہ یہ ایک صوبائی وزیر کے بیٹے کی تقریبِ ولیمہ تھی۔ وزیرِ موصوف نے...... شراب، شباب اور کباب جیسے سارے لوازمات اس محفل میں جمع کرنے کے ساتھ ساتھ ہر قابلِ ذکر آدمی کو مدعو کر رکھا تھا۔ وزیرِاعظم سے لے کر ہر شعبۂ زندگی سے تعلق رکھنے والے اہم افراد اس محفل میں شریک تھے اور ظاہر ہے

اسی حساب سے سیکیورٹی بھی درکار تھی۔ حکومتی محکموں پر اچھا خاصا اختیار رکھنے کے باوجود اس خاص موقع پر سرکاری آدمیوں کے علاوہ پرائیویٹ سیکیورٹی گارڈز کا بھی انتظام کر رکھا تھا۔ یقیناً وہ خود بھی سرکاری محکموں کی ناقص کارکردگی سے اچھی طرح واقف تھے اس لیے اس موقع پر کوئی رسک لینا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ اور اس وقت وہاں سی ایف پی کے جوان اپنی مخصوص یونیفارم کے علاوہ سادہ لباس میں بھی ادھر اُدھر بکھرے اپنا فریضہ انجام دے رہے تھے۔ موقع کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے ذیشان خود بھی وہاں موجود تھا اور ایک ایک شے کو اپنی نظر میں رکھے ہوئے تھا، چنانچہ وہ شعلۂ جوالہ جلد ہی اس کی نظروں میں آ گئی جو تتلی بنی پوری محفل میں منڈلاتی پھر رہی تھی۔ اس نے نہایت مہین کپڑے کا سیاہ فراک نما لباس زیب تن کر رکھا تھا جو اس کے گھٹنوں سے ذرا نیچے جا کر ختم ہو گیا تھا اور اس کے بعد اس کی سفید سڈول پنڈلیاں تھیں جو ہر ایک کی توجہ کا مرکز بن رہی تھیں۔ توجہ کا مرکز بننے کے لیے اس نے اور بھی بہت اہتمام کر رکھا تھا۔ آستینوں کے تکلف سے آزاد اس کی گوری باہنوں میں ایسی کشش تھی کہ ہر کس و ناکس کو ہم آغوشی کی دعوت دیتی محسوس ہو رہی تھیں۔ کانوں میں موجود بڑے بڑے دلکش آویزے جب اس کی کسی جنبش کے نتیجے میں اس کے عریاں شانے کو پل بھر کو چھوتے تو دیکھنے والی آنکھوں کو خود بخود ہی ان بے جان موتیوں سے بنے آویزوں پر رشک آنے لگتا۔ لیکن پھر فوراً ہی وہ اس کے گلے میں پڑے نازک سے نیکلس کے اس موتی کی خوش بختی پر رشک کرنے لگتے جو اس مقام تک رسائی حاصل کر رہا تھا جہاں سیاہ مہین لباس کے پردے نے صاف چھپتے بھی نہیں اور سامنے آتے بھی نہیں کی تفسیر بن کر آتشِ شوق کو بھڑکانے کا خوب انتظام کر رکھا تھا۔ اسے دیکھ کر کہا جا سکتا تھا کہ قدرت نے اگر اسے بے حساب حسن کی دولت سے نوازا ہے تو وہ اس حسن کی نمائش کا سلیقہ بھی خوب رکھتی ہے۔ یاقوتی ہونٹوں کی دلکش مسکراہٹ، ابروؤں کا چڑھانا، آنکھوں کی رنگین جھیلوں کو ادھر سے ادھر گھمانا اور لہروں کی شکل میں کٹے بالوں کو جھٹکنا... سب کچھ اتنے ردھم میں تھا کہ کہیں کسی ادا پر بازاری پن کا گمان نہیں ہو رہا تھا۔ لیکن وہ کوئی شریف زادی بھی نہیں ہو سکتی تھی کہ شریف زادیوں کو کہاں ایک ساتھ اتنے گروں پر کمال حاصل ہوتا ہے۔ یقینی طور پر وہ کوئی بہت ہائی لیول کی کال گرل تھی جو عام بازاری عورتوں اور شریف زادیوں کا حسین امتزاج بنی بے حساب دلوں کو لبھا رہی تھی۔

یہ بھی طے تھا کہ وہ بازار میں رکھی کسی عام جنس کی طرح ہر ایک کے لیے برائے فروخت نہیں ہو گی۔ نہ ہی نوٹوں سے بھرا پرس جیب میں رکھنے والا ہر شخص اسے خرید سکتا ہو گا۔ وہ ایسی انوکھی شے تھی جسے منتخب کرنے والے گاہک تو بہت سے ہو سکتے تھے لیکن خود کو خوش نصیب وہی گردانتا جس کے ہاتھ بکنے کو وہ خود راضی ہوتی۔ اس کی انہی خوبیوں کی وجہ سے ذیشان کی نظر اس پر گئی تھی۔

سی ایف پی کے اہلکار سیکیورٹی گارڈز کے بہروپ میں جس قسم کے لوگوں کی تلاش میں رہتے تھے، وہ انہی میں سے محسوس ہو رہی تھی۔ عورتوں کے ناز و ادا اور چلتروں کی کارستانیوں کی تو تاریخ گواہ تھی۔ عورت کے پیچھے جانیں بھی لٹائی گئی تھیں، جنگیں بھی لڑی گئی تھیں، مال و اسباب بھی داؤ پر لگائے گئے تھے اور بڑی بڑی یادگاریں بھی تعمیر ہوئی تھیں۔ بڑے بڑے سورماؤں کے دلوں پر راج کرنے والی وہ عورتیں کچھ ایسی ہی خوبیوں کی مالک ہوتی ہوں گی جیسی اس وقت ایک خوش رنگ تتلی کی طرح ادھر اُدھر گھومتی پھر رہی تھی۔ ایسی عورت تو بڑے بڑے زاہدوں کے قدم ڈگمگا سکتی تھی پھر یہاں اس محل میں جہاں ایک سے بڑھ کر ایک عیاش گھوم رہا تھا، اس کا داؤ کیسے نہ چلتا۔ یہاں تو وہ جس کی طرف اشارہ کر دیتی، وہ اس کا بندۂ بے دام بن کر سب کچھ نچھاور کرنے کے لیے تیار ہو جاتا، چاہے اس سب کچھ میں ملکی سلامتی و امن بھی شامل ہوتا۔

سیکیورٹی کے انتظامات پر نظر رکھنے کے بہانے وہ اس قتالہ سے مل بیٹھنے کا موقع تلاش کرتا رہا۔ آخر اسے یہ موقع اس وقت مل گیا جب وہ اسے تقریب کے میزبان وزیر اور آئی جی مختار مراد کے ساتھ کھڑی دکھائی دی۔ وہ خود بھی مسکراتا ہوا اس ٹکڑی کی طرف بڑھ گیا۔ میزبان وزیر نے اسے جوابی مسکراہٹ سے نوازا۔ ممکن تھا کہ اس مسکراہٹ کے بعد وہ اسے نظرانداز کر دیتا لیکن ذیشان کمال ڈھٹائی کا مظاہرہ کرتا ہوا ان تینوں کے ساتھ جا کھڑا ہوا۔

"آپ ہماری کارکردگی سے مطمئن ہیں نا سر... کہیں کوئی کمی تو نظر نہیں آ رہی؟" اس نے وزیر موصوف سے دریافت کیا۔

"نہیں بھئی، آپ لوگوں نے تو سیکیورٹی کا صحیح معنوں میں فول پروف انتظام کیا ہے۔ میں دوسروں سے بھی سفارش کروں گا کہ اہم موقعوں پر آپ کی سیکیورٹی ایجنسی سے رابطہ کریں۔" وزیر صاحب نے خوش مزاجی سے کہا۔

"آپ دیکھ رہے ہیں مختار صاحب! آپ کے محکمے

کے ہوتے ہوئے یہ ایک غیر سرکاری ادارے کے گن گا رہے ہیں۔" اس سے قبل کہ ذیشان تعریف کے بدلے میں شکریہ ادا کرتا، اس حسینہ نے چڑانے والے انداز میں مختار مراد کو چن کیا۔

"شرارت نہیں موہنی! مختار صاحب ہمارے دوست ہیں۔ ہمیں ان کے محکمے سے کوئی شکایت نہیں ہے لیکن ان کے لوگوں پر کام کا بوجھ اتنا ہے کہ میں نے مناسب نہیں سمجھا کہ ان پر مزید بوجھ ڈالا جائے۔" وزیر صاحب نے جہاں اسے بہت پیار سے ٹوکا، وہیں مختار مراد کی دل جوئی میں ایک نیا نکتہ گھڑ دیا۔

"یہ اچھی بات ہے کہ محکموں کے درمیان اختلاف کا شور سننے والے ہمارے کان اس وقت باہمی اتفاق اور خیال داری پر مبنی کوئی جملہ سن رہے ہیں۔ مختار صاحب کو اس وقت اطمینان محسوس ہو رہا ہو گا کہ کوئی تو ہے جو ان کے محکمے کی مجبوریوں کو سمجھتا ہے اور ان کے جوانوں سے ہمدردی رکھتا ہے۔" اپنے وہاں کھڑے رہنے کا جواز بنائے رکھنے کے لیے اس نے گفتگو میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ من موہنی صورت رکھنے والی موہنی اسے دلچسپی سے دیکھنے لگی۔

"آپ کی تعریف...؟"

"مجھے ذیشان کہتے ہیں۔ پہلے آرمی میں ہوا کرتا تھا لیکن وہاں کی گھٹی بندھی زندگی سے طبیعت اوب گئی تو ملازمت چھوڑ کر ایک سیکیورٹی ایجنسی کو جوائن کر لیا۔ آج کل وہیں کام کر رہا ہوں اور اسی ملازمت کی بدولت آج ایک ایسی محفل میں شامل ہوں جہاں من موہنے چہروں کا راج ہے۔" اس نے دوستی انداز سے موہنی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ جواباً وہ اتنی دلکشی سے مسکرائی کہ ہونٹوں کے ساتھ ساتھ اس کی آنکھیں اور چہرے کا ایک ایک نقش مسکرانے لگا۔

"دیکھیں ذیشان صاحب! بات یہ ہے کہ رائی ہوتی ہے تو پہاڑ بنتا ہے۔ پولیس کی کارکردگی پر لگا سوالیہ نشان یونہی نہیں ہے۔ مختار صاحب کو بُرا نہ لگے تو میں نہایت صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہی کہوں گی کہ جس محکمے کا ایک اعلیٰ افسر اپنے داماد اور نواسی کے قاتلوں تک آج تک نہ پہنچ سکا، وہ بھلا دوسروں کے لیے کیا کر سکے گا؟ چلیں اس قصے کو جانے دیں۔ یہ ماضی کا حصہ ہوا لیکن ابھی حال ہی میں ان کے ایک عزیز شہریار عادل صاحب کو ایک ٹرک ڈرائیور ہٹ کر کے فرار ہو گیا اور یہ ابھی تک اس معمولی ٹرک ڈرائیور کو گرفتار نہیں کر سکے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہی مختار صاحب! کیا اس مفرور ڈرائیور کے بارے میں کوئی سن گن ملی ہے آپ کے محکمے کو؟" وہ بڑے کٹیلے لہجے میں پوچھ رہی تھی اور ذیشان نہایت غور سے اس کے اور مختار مراد کے چہروں کا جائزہ لے رہا تھا۔ مختار مراد کی سرخ پڑتی رنگت سے ظاہر تھا کہ وہ بے پناہ ضبط سے کام لے رہے ہیں جبکہ موہنی کا انداز ایسا تھا جیسے وہ انہیں اکسا کر ان سے کچھ اگلوانے کی خواہش مند ہو۔ مشکوک وہ اسے پہلے ہی لگی تھی، اس انداز پر وہ مزید چونک گیا۔

"ہمارا محکمہ اپنا کام کر رہا ہے۔ بہت جلد ہم مفرور ڈرائیور کو گرفتار کر کے منظر پر لے آئیں گے اور آپ سمیت بہت سوں کی تسلی ہو جائے گی۔ لیکن مس موہنی! میں آپ کو بتا دوں کہ اس ٹرک ڈرائیور کو پھانسی کے پھندے پر لٹکا کر بھی اس نقصان کا ازالہ نہیں ہو سکے گا جو ہمیں شہریار کو کھو کر ہوا ہے۔ وہ ایک نہایت ذہین شخص تھا جسے کومے کی حالت میں پڑا دیکھ کر مجھ سمیت ہمارے خاندان کے ہر فرد کا دل خون کے آنسو روتا ہے۔ اسے اس حالت میں پہنچانے والے کو انجام تک پہنچانے کی خواہش جس شدت سے میرے دل میں ہے، یہ میں ہی جانتا ہوں... لیکن پولیس کے محکمے کے پاس کوئی الٰہ دین کا چراغ نہیں ہے کہ چٹکی بجاتے ہی ہر کام ہو جائے۔ ہم اپنی بہترین کوشش کر رہے ہیں، نتیجہ بھی ان شاء اللہ جلد سامنے آ جائے گا۔"

مختار مراد کے جواب اور فطری اداکاری نے ذیشان کا دل خوش کر دیا۔ وہ اسے اس کی اصل حیثیت میں نہیں جانتے تھے لیکن وہ جانتا تھا کہ وہ ان چند گنے چنے لوگوں میں شامل ہیں جنہیں اس بات کا علم تھا کہ اسپتال کے کمرے میں بستر پر پڑا شخص شہریار عادل نہیں ہے۔ شہریار عادل کسی بڑے مقصد کے لیے منظر سے غائب ہو گیا ہے۔ اس پر بھی ان کا انداز بالکل حقیقی تھا اور وہ ایک طرح نارِ حسینہ کو بھی اپنے مقابل پا کر زیادہ خفت کا شکار نہیں ہوئے تھے۔

"ایکسکیوزمی! مجھے کچھ اور لوگوں سے بھی ملنا ہے۔" وہ مزید ٹھہرے بغیر وہاں سے ہٹ گئے۔

"تم بھی کبھی کبھی حد کر دیتی ہو موہنی! میں نے تمہیں اپنا پی آر او اس لیے تو نہیں بنایا کہ تم لوگوں سے میرے تعلقات بہتر بنانے کے بجائے انہیں ختم کر دو۔ اب تمہاری وجہ سے مجھے مختار صاحب سے معذرت کرنی پڑے گی۔" صورت حال پر ہکا بکا وزیر نے اپنی پبلک ریلیشنگ آفیسر سے شکوہ کیا اور پھر خود بھی مختار مراد کے پیچھے روانہ ہو گیا۔ موہنی کھڑی اسی مطمئن انداز میں مسکراتی رہی۔

"نائس... میں پہلی بار حسن اور جرأت مندی کو یکجا

دیکھ رہا ہوں۔ آئی جی پولیس کے منہ پر ایسی بات کہنے کی حماقت تو سچ کے علم بردار نیوز اینکرز بھی بہت سوچ سمجھ کر کرتے ہوں گے۔“ ذیشان نے اسے سراہا۔

”لیکن میں کہہ دیتی ہوں کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ میری بات کا لوگ مشکل ہی سے برا مانتے ہیں۔“ اس نے ہنستے ہوئے ایک ادا سے بالوں کو جھٹکا اور قریب سے گزرتے ویٹر کو اشارہ کیا۔ ویٹر فوراً ہی ٹرالی لیے نزدیک چلا آیا۔ ٹرالی میں انواع و اقسام کی شرابوں کے ساتھ ساتھ سوفٹ ڈرنکس کی بھی بڑی مقدار موجود تھی۔ موہنی نے اپنے لیے ایک سنہری سیال سے بھرا جام منتخب کیا جبکہ ذیشان کا انتخاب اورنج جوس تھا۔

”ڈرنک نہیں کرتے آپ؟“ اس نے تیکھے انداز میں پوچھا۔

”جہاں مدہوش کرنے کا پہلے ہی اتنا سامان ہو، وہاں مزید پینا بیکار ہے۔“ اس نے ذو معنی لہجے میں جواب دیا تو وہ مسکرا دی۔ یہ مسکراہٹ بتا رہی تھی کہ وہ حسین کے ساتھ ساتھ ذہین بھی ہے اور اس کا اشارہ سمجھ گئی ہے۔

”ڈرتے ہیں؟“

”ڈرنا بھی چاہیے۔ میں غافل ہو گیا تو بہت سوں کی زندگیاں داؤ پر لگ جائیں گی۔“ اس کا جواب اب بھی ذو معنی ہی تھا لیکن موہنی نہیں سمجھ سکتی تھی۔ وہ اسے ایک سیکیورٹی ایجنسی کے ذمے دار کا بیان ہی سمجھی تھی۔ اسے کیا معلوم تھا کہ سی الیف پی اصل میں کیا بلا ہے۔

”ٹھیک ہے تو پھر آپ سوفٹ ڈرنک پی کر ہوش میں رہتے ہوئے اپنی ڈیوٹی انجام دیں۔ ہم ان کے پاس جاتے ہیں جو مدہوش ہو کر ہی خوشی محسوس کرتے ہیں۔“ وہ اٹھلا کر کہتی ہوئی وہاں سے جانے لگی۔

”کوئی نشانی اور پتا تو دیتی جائیں کہ کبھی ہمیں مدہوش ہونے کی فرصت ہو تو آپ سے رابطہ کر سکیں۔“ ذیشان نے اسے پکارا۔

”جانے دیں کیونکہ ہم خود بڑے معروف لوگ ہیں۔ ممکن ہے کہ آپ کو فرصت ملے تو ہم خود مصروف ہوں۔“ وہ اسے ٹرخا دے گئی۔ ظاہر ہے اس کے معیار پر کسی سیکیورٹی ایجنسی کا ملازم کیونکر پورا اتر سکتا تھا۔ وہ جو چند لمحے اس کے ساتھ گزار گئی تھی تو وہ بھی شاید اس لیے کہ شاندار تیاری کے ساتھ ذیشان اس وقت جتنا پُرکشش لگ رہا تھا، صنفِ مخالف کے لیے اسے نظر انداز کر دینا آسان نہیں تھا۔

”ابھی بلیک ڈریس والی جس عورت کے ساتھ میں کھڑا تھا، اس پر نظر رکھنی ہے۔ فنکشن ختم ہونے کے بعد بھی تاحکم ثانی اس کی نگرانی کرتے رہنا ہے۔ رپورٹ ڈائریکٹ مجھے دینا۔“ موہنی کے ہٹتے ہی وہ ٹہلنے کے انداز میں اپنے ایجنسی اہلکار کے قریب پہنچا اور اسے یہ حکم دے کر پلٹ گیا۔

☆☆☆

”میں تمہیں جس گرو سے ملانے لے جا رہی ہوں، ان کا نام شالنی ہے۔ ذرا تنک چڑھی اور نخریلی ہے اور مشکل سے ہی کسی کو منہ لگاتی ہے لیکن میرا لحاظ کرتی ہے کیونکہ میں کوئی معمولی خواجہ سرا نہیں ہوں۔ سارے لاہور کے خواجہ سرا مجھے جانتے اور میری عزت کرتے ہیں۔ اگر مالنی یا اس جیسی کوئی دوسری میرے ساتھ بدتمیزی سے پیش آئے تو میرے سارے چاہنے والے مل کر اس کا جینا دوبھر کر دیں گے۔“

بوبی اپنے چہرے پر جلدی جلدی پاؤڈر کا پف مارتے ہوئے سی الیف پی کے نوجوان اہلکار جاوید علی کی معلومات میں اضافہ کر رہی تھی۔ جاوید علی جانتا تھا کہ وہ غلط نہیں کہہ رہی۔

بوبی نے خواجہ سراؤں کے حقوق کی آواز اٹھانے میں بڑا اہم کردار ادا کیا تھا۔ وہ مسلسل لوگوں کو یہ احساس دلانے کی کوشش کرتی رہتی تھی کہ خواجہ سرا بھی عام انسانوں جیسے احساسات اور جذبات رکھنے والے لوگ ہوتے ہیں جنہیں قدرت کی طرف سے دی گئی ایک کمی کی وجہ سے خود کو تماشا بنا کر جینے میں خوشی نہیں ملتی۔ وہ چاہتے ہیں کہ انہیں عام لوگوں کی طرح پڑھنے لکھنے، رہنے سہنے اور ملازمتیں کرنے کا حق ملے۔ اس نے خواجہ سراؤں کو اچھوتوں کی طرح معاشرے سے کاٹ کر رکھ دینے کے عمل کی شدید مذمت کی تھی اور لوگوں کو یہ احساس دلانے کی کوشش کرتی رہتی تھی کہ محرومی کا شکار یہ انسان پہلے ہی کٹے دکھی ہیں، اس لیے انہیں مزید اپنے رویّوں سے دکھ دینے سے گریز کریں۔

اس کی ان کوششوں کو خواجہ سراؤں کے حلقے کے علاوہ عام باشعور افراد کی طرف سے بھی سراہا جا رہا تھا اور اس کی کوششوں کا اتنا نتیجہ تو سامنے آیا تھا کہ میڈیا کی آواز اس کی آواز کے ساتھ شامل ہو گئی تھی۔ بوبی کو امید تھی کہ اس کی زندگی میں نہ سہی، آنے والے وقت میں ہی لوگ اتنے باشعور ہو جائیں گے کہ ان کے ساتھ انسانوں جیسا سلوک کر سکیں گے۔ جاوید علی نے اس کی رہائش گاہ پر مختصر قیام کے عرصے میں ہی اسے بہت قریب سے جان لیا تھا۔ بطور انسان بوبی کی اچھائی اور نیک دلی سے انکار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وہ بہت ہمدرد فطرت کی مالک تھی اور اپنے دکھوں کو بھلا کر ہر وقت ہنستی مسکراتی رہتی تھی۔ اس نے جاوید علی کو اپنی درد بھری داستان بھی سنائی تھی۔ وہ اپنے والدین کی پہلوٹی کی اولاد تھی۔ اس کا

جاگیردار باپ اس کی دنیا میں آمد سے قبل بہت خوش تھا کہ اس کی جاگیر کا وارث آنے والا ہے۔ جب اس کے دنیا میں آنے کا وقت ہوا تو جہاں زچگی کے لیے دستیاب ماہر دائیوں کو حویلی میں جمع کرلیا گیا، وہیں ڈومنیاں وغیرہ بھی پہلے سے حویلی کے آنگن میں آبیٹھیں اور مبارک سلامت کے گیت گانے لگیں۔ انہیں یقین تھا کہ وارث کی پیدائش کے بعد وہ اپنی جھولیاں بھر کر حویلی سے روانہ ہوں گی۔ آثار بھی بتا رہے تھے۔ بچہ ابھی دنیا میں آیا نہیں تھا اور اپنی ماں کو درد زہ سے تڑپا رہا تھا لیکن حویلی کے باہر مبارک بادی کے لیے آنے والے مہمانوں کی ضیافت اور عام لنگر کے لیے دیگیں چڑھ گئی تھیں۔ حلوائی کو بھی تازہ مٹھائیاں بنانے کا حکم جاری کردیا گیا تھا اور جاگیردار صاحب شام کو حویلی میں دیسی گھی کے چراغ جلا کر اپنی خوشی اور امارت کا بیک وقت اظہار کرنے کی منصوبہ بندی کر رہے تھے۔ ایسے میں بچہ دنیا میں آیا تو سب خاک میں مل گیا۔ کہاں کا لنگر اور کہاں کی مٹھائی؟ زچگی کروانے والی دائیوں کو یہ بھی ہمت نہ رہی تھی کہ وہ باپ کو بچے کی پیدائش کی خبر دے دیں۔ وہ تو اپنا معاوضہ وصول کرنے کے لیے بھی نہ رکیں اور خاموشی سے حویلی سے روانہ ہوگئیں۔

خوش خبری کے منتظر جاگیردار صاحب کا ماتھا ٹھنکا کہ ایسا کیا ہوگیا کہ دائیوں کی زبانوں کو مہر لگ گئی۔ دل میں خدشہ سا جاگا کہ کہیں نومولود کو کچھ ہو تو نہیں گیا۔ گھبرائے ہوئے اپنی خواب گاہ کی طرف دوڑے۔ بچے کے رونے کی آواز پہلے ہی قدم پر سنائی دے گئی اور پہلا اندیشہ خود بخود ہی دور ہوگیا۔ پھر خیال آیا کہ کہیں بیٹے کی جگہ بچی تو پیدا نہیں ہوگئی۔ یہ ایک ایسی بات تھی جو انہیں مایوسی میں مبتلا کرسکتی تھی لیکن اس صورت میں بھی بہرحال انہیں خبر تو دی جانی چاہیے تھی۔ لمحوں میں بہت کچھ سوچتے ہوئے وہ بیوی کے پلنگ کے قریب پہنچ گئے۔ وہ چت لیٹی ہوئی تھی اور بازو آنکھوں پر رکھے ہچکیوں سے رو رہی تھی۔ نومولود بھی اس کے پہلو میں پڑا ماں کے سروں سے سر ملا رہا تھا۔ کسے معلوم تھا کہ ماں بیٹا دونوں اپنی تقدیر پر گریہ کر رہے ہیں۔ پھر جاگیردار صاحب کو وہ خبر ملی جو ان کے گمان میں دور تک بھی نہیں تھی۔ غصے اور بے بسی کے ملے جلے احساس کے ساتھ وہ یوں منہ موڑ کر کمرے سے نکلے کہ پھر کبھی ماں اور بچے کی طرف توجہ دینا بھی گوارا نہیں کیا۔

پیدائش سے قبل بچے کا نام بابر سوچا گیا تھا۔ اگر وہ نارمل بچہ ہوتا تو اس کا یہی نام رکھا جاتا لیکن وہ نہ تو لڑکا تھا نہ لڑکی۔ ممتا کی ماری دکھی ماں نے اسے بوبی کا نام دے دیا۔

بوبی حویلی کا پہلا بچہ ہونے کے باوجود کسی کی محبت اور توجہ کا نہ وارث ٹھہرا۔ جاگیردار صاحب کا حکم تھا کہ اسے اس کی ماں کے کمرے تک محدود رکھا جائے، سوائے اپنے باپ کے گھر میں ہی قید تنہائی دے دی گئی۔ ماں کو ایسا بچہ پیدا کرنے کی یہ سزا ملی کہ اس پر سوکن آگئی۔ سوکن بھی ایسی کہ اس نے آتے ہی سال کے سال بیٹوں کی لائن لگا دی۔ بوبی کی پیدائش سے پہلے حویلی پر راج کرنے والی اس کی ماں یہ سب دیکھتی تو بھی اسے گلے سے لگا کر رو پڑتی اور کبھی معصوم بچے کو بُری طرح پیٹ ڈالتی جس کی وجہ سے اس کا راج پاٹ چھن گیا تھا۔

معصوم بوبی کی زندگی پیدائش کے فوراً بعد ہی درد والم کا شکار ہوگئی تھی۔ اس کی مصیبتوں میں اس وقت مزید اضافہ ہوا جب اس کے سوتیلے بھائیوں نے چلنا سیکھا۔ بچے لاکھ روکنے پر بھی نہ رکتے اور بوبی کے ساتھ کھیلنے کے لیے پہنچ جاتے۔ پھر جیسا کہ معمول ہوتا ہے، بچے کھیلتے ہیں تو لڑتے جھگڑتے بھی ہیں لیکن بوبی کی بدقسمتی یہ تھی کہ وہ پیدائشی ہی معتوب تھا۔ اس لیے قصور چاہے جس بھی بچے کا ہوتا، سزا اسی کے حصے میں آتی۔ یوں بہت کم عمر میں ہی اسے جسمانی اذیت سے آگہی ہوگئی لیکن اسے نہیں معلوم تھا کہ اس اذیت سے بھی بڑی ایک اذیت اس کی منتظر ہے۔ باپ کی سنائی قید تنہائی کو روندتا وہ باغی ہو کر کمرے سے باہر بھی نکل کر کھیلنے لگا۔ نتیجے میں ایک طرف اسے جہاں باپ کی ڈانٹ پھٹکار کا سامنا کرنا پڑتا تو دوسری طرف وہ تضحیک کا نشانہ بھی بنایا جاتا۔ رفتہ رفتہ اسے ادراک ہوگیا کہ وہ عام لوگوں جیسا نہیں ہے اور نہ ہی یہ لوگ اسے قبول کرسکتے ہیں۔ وہ اپنی ذات میں گھٹ کر رہ گیا۔ اسے ماں کے رویوں کے تضادات کی وجہ بھی سمجھ آنے لگی اور یوں وہ اس کی طرف سے زیادتی ہونے کے باوجود بھی اس سے پہلے سے زیادہ محبت کرنے لگا اور خود کو اسی تک محدود کرلیا۔ لیکن سکون اب بھی اس سے دور تھا۔ وہ جس ماں کو کائنات مان کر بیٹھا تھا، وہی ایک رات سوتے میں اسے چھوڑ کر دنیا سے چلی گئی۔

ماں کے بعد حویلی کے در و دیوار اس کے لیے اور بھی تنگ ہوگئے اور اس کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ وہ حویلی چھوڑ کر اپنے جیسوں میں شامل ہوجائے۔ خواجہ سراؤں کے ایک گروہ کے ساتھ رہتے ہوئے اس نے بھیک بھی مانگی۔ پیر میں گھنگھرو باندھ کر ناچا بھی اور فاقے بھی کیے۔ یہ سب کرتے اس کا دل خون کے آنسو روتا رہا کہ وہ ایک ایسا بدنصیب تھا جس کے باپ کی زمینوں پر ڈھیروں

بے حساب سے اناج پیدا ہوتا تھا اور وہ اس کی جائداد کے حق داروں میں سے ایک حق دار ہوتے ہوئے چند لقموں کے لیے در بدر پھرتا تھا۔

وقت نے کروٹ لی اور بڑھتی عمر کے ساتھ اور اس نے غم کو مسکراہٹ کے پردے میں چھپا کر جینے کا ہنر سیکھ لیا۔ اس نے اس بات پر کڑھنا بھی چھوڑ دیا کہ اللہ نے اسے ایسا کیوں پیدا کیا ہے؟ وہ اپنی منفی سوچوں کو قابو میں رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے اس جدوجہد میں مصروف ہوگیا کہ اسے اور اس جیسوں کو معاشرے میں ان کے بنیادی حقوق مل سکیں۔ اور آج وہی بوبی جسے اس معاشرے سے بہت سے شکوے تھے، بی ایف پی کے ایک نوجوان کی تحریک پر اس معاشرے اور ملک کو بچانے کے لیے ایک فریضہ انجام دینے چلا تھا۔

"آپ یہ بتائیں کہ شالنی مجھے اپنے ساتھ شامل کرنے کے لیے تیار تو ہوجائے گی نا؟ باقی اور کسی قسم کا مسئلہ نہیں ہے۔ میں سب برداشت کرلوں گا۔" اس کی معروفیت کا دلچسپی سے جائزہ لیتے ہوئے جاوید علی نے اس سے پوچھا۔

"وہ تو اسے کرنا ہی پڑے گا لیکن اس بات کی کوئی گارنٹی نہیں ہے کہ شالنی کے پاس جا کر تمہارا کام بن جائے گا۔ میں نے صرف اس وجہ سے اس کا انتخاب کیا ہے کہ خواجہ سراؤں کے جتنے گروہ یہاں کام کر رہے ہیں، ان میں سب سے زیادہ آسودہ اسی کا گروہ ہے... اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اس کے گروہ کے خوب صورت اور نوعمر خواجہ سرا عیاش لوگوں کی دل بستگی کے لیے جاتے رہتے ہیں۔"

"تو بس ٹھیک ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہاں میرا کام بن جائے گا ورنہ میں بہانے سے اس کا گروہ چھوڑ کر کسی اور گروہ میں شامل ہونے کے لیے آپ کے پاس چلا آؤں گا۔" جاوید علی نے جو کہ اس وقت خود بھی زنانہ لباس اور میک اپ وغیرہ کے ساتھ ایک خوب صورت خواجہ سرا لگ رہا تھا، شوخی سے اسے جواب دیا۔ اس کا جواب سن کر بوبی نے اسے گھورا اور ہنس پڑی۔

"میں نے تمہارے بارے میں بالکل صحیح رائے دی تھی لڑکے... تم واقعی بہت چالاک ہو۔"

"میں نے آپ کی رائے سے اختلاف کیا بھی نہیں تھا۔" اس نے فوراً ہی جواب دیا۔

"تو چلو چلتے ہیں شالنی سے ملنے۔ دیکھتی ہوں کہ تم کیسے اسے چالاکی سے اپنے قابو میں کرتے ہو۔" ساڑی کا پلو شانے پر ڈالتی ہوئی بوبی کھڑی ہوگئی۔ جاوید علی نے فوراً اس کی پیروی کی پھر وہ دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے بوبی کی رہائش گاہ سے باہر نکل آئے۔

شالنی کی قیام گاہ تک کا سفر انہوں نے ہلکی پھلکی گفتگو میں گزارا۔ جس علاقے میں شالنی رہتی تھی، وہ تنگ و تاریک گلیوں پر مشتمل تھا لیکن شالنی کا گھر اندر سے اس سے بہت مختلف ثابت ہوا جیسا کہ ان گلیوں میں موجود کسی گھر کے متعلق خیال کیا جاسکتا تھا۔ باہر سے پرانا اور خستہ حال نظر آنے والا گھر اندر سے بہت خوب صورت اور سجا ہوا تھا۔ فرش پر بچھے قالین سے لے کر کارنس پر سجے آرائشی گل دانوں تک ہر چیز خوب صورت اور بیش قیمت تھی۔ جاوید علی نے اس بات کو خاصی حیرت کے ساتھ نوٹ کیا کیونکہ ابھی کچھ دیر قبل وہ بوبی جیسے خواجہ سرا کے گھر سے اٹھ کر آیا تھا۔ خواجہ سراؤں کے گرو اور لیڈر کے طور پر بوبی خاصی مشہور شخصیت تھی لیکن اس کے گھر میں اسے یہ سج دھج نظر نہیں آئی تھی۔ بوبی کے گھر کی تزئین و آرائش میں معمولی اشیا استعمال کی گئی تھیں جبکہ اس گھر کو دیکھ کر احساس ہی نہیں ہوتا تھا کہ یہاں معاشرے کے ستائے ہوئے محروم طبقے کا کوئی فرد رہتا ہوگا۔ سوچنے کی بات یہ تھی کہ آخر ایک خواجہ سرا کے ذرائع آمدنی کیا تھے جن کی وجہ سے یہ ٹھاٹ باٹ ممکن ہوسکے تھے۔

اپنے ذہن میں یہ سارا حساب کتاب جوڑتا وہ بوبی کے ساتھ ایک نرم ملائم آرام دہ صوفے پر بیٹھا شالنی کی آمد کا انتظار کرتا رہا۔ ڈرائنگ روم کی طرز پر سجے اس کمرے تک انہیں شالنی کا ایک ملازم خواجہ سرا بٹھا کر گیا تھا۔ وہ خواجہ سرا بوبی کو اچھی طرح پہچانتا تھا اور نہایت عزت و احترام سے انہیں یہاں بٹھانے کے بعد خود شالنی کو ان کی آمد کی اطلاع دینے گیا تھا۔ ذرا دیر میں شالنی وہاں چلی آئی۔

"او مائی گاڈ! یہ میں کیا دیکھ رہی ہوں۔ بوبی دیدی خود چل کر میرے گھر تک آئی ہیں؟" کمرے میں قدم رکھتے ہی شالنی نے اپنی خوشی اور حیرت کا مظاہرہ کیا لیکن جاوید علی نے محسوس کیا کہ اس کے انداز میں مصنوعی پن نمایاں ہے۔

"میں کوئی پہلی بار تو یہاں نہیں آئی ہوں۔" بوبی نے اپنی جگہ سے اٹھ کر اس سے ملتے ہوئے کہا۔

ان دونوں کے گلے ملنے کا منظر دیکھتے ہوئے جاوید علی نے ایک ہی نظر میں جائزہ لے لیا تھا کہ شالنی کا لباس اور زیورات بوبی کے مقابلے میں زیادہ قیمتی ہیں۔ شکل صورت کے اعتبار سے بھی وہ بوبی سے زیادہ خوب صورت تھی۔

"بن بلائے تو پہلی بار ہی آئی ہیں۔ اس سے پہلے تو بس ہولی، دیوالی کے فنکشن پر میرے بلانے پر ہی آئی

تھیں۔" شالنی نے شکوہ کیا۔

"تمہیں تو میری مصروفیت کا معلوم ہی ہے۔ ہر وقت گھن چکر بنی رہتی ہوں۔ آج یہاں ہوں تو کل کہیں اور۔ دن کہاں گزر جاتے ہیں، کچھ معلوم ہی نہیں ہوتا۔" ببلی نے جواب دیا۔

"یہ تو آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں دیدی۔ آپ کی مصروفیت کا تو ہمیں بھی پتا چلتا رہتا ہے۔ دو تین بار آپ کو ٹی وی پر بھی دیکھا ہے۔ بڑا کام کر رہی ہیں آپ اپنی برادری کے لیے۔ بھگوان آپ کی مدد کرے۔ آپ کامیاب ہو گئیں تو ہم سب کا بھلا ہو جائے گا۔"

"بس تم لوگ دعا کرتے رہو، ایک نہ ایک دن ہمارے دن بھی پھر ہی جائیں گے۔" ببلی نے بڑی متانت سے جواب دیا۔ اب وہ لوگ آمنے سامنے صوفوں پر بیٹھے ایک دوسرے سے گفتگو میں مصروف تھے۔ جاوید علی نے گفتگو میں دخل نہیں دیا تھا اور خاموشی سے ببلی کے پہلو میں بیٹھا ہوا تھا۔

"یہ کون ہے دیدی؟" وقفے وقفے سے جاوید علی کو پُرتجسس نگاہوں سے دیکھتی شالنی نے آخر کار اس کے بارے میں پوچھ ہی لیا۔

"یہ رنجی ہے۔ اسی کی خاطر وقت نکال کر تمہارے پاس آئی ہوں۔ امید ہے کہ تم اس کے سلسلے میں میری فرمائش کو رد نہیں کرو گی۔" ببلی بھی موقع کی تلاش میں تھی، فوراً ہی اپنا کام شروع کر دیا۔

"آپ حکم دیں دیدی! آپ کو انکار کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" شالنی کے لہجے میں بناوٹ صاف محسوس ہو رہی تھی۔

"رنجی جھنگ سے آئی ہے۔ اس کا سارا کنبہ وہیں رہتا ہے۔ یہ بھی اپنے گھر والوں کے ساتھ رہتی تھی لیکن تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ ہم لوگوں کا اپنے گھر والوں کے ساتھ رہنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ اس کے گھر والے اسے لڑکا بنا کر رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ پرچون کی دکان بھی کھول کر دے رکھی تھی لیکن گھر والوں کی کوشش سے کیا فرق پڑتا ہے، جب اللہ نے ہی اسے مکمل مرد نہیں بنایا تو یہ کیسے عام مردوں جیسا برتاؤ کر سکتی تھی۔ اوپر سے محلے کے لڑکے الگ ہی اس کے پیچھے پڑے رہتے تھے۔ ایک طرف بے چاری شریر لڑکوں کے مذاق کا نشانہ بنتی تو دوسری طرف گھر میں باپ تھی اور مار کٹائی کرتا کہ لڑکیوں والے ناز و ادا چھوڑ دے۔ روز کی کل کل جھک جھک بے چاری کے لیے عذاب بن گئی۔ جب تک کم عمر تھی پھر بھی گھر سے نکلنے کی ہمت نہیں کر پائی تھی لیکن آخر کار اس کی برداشت جواب دے گئی اور ایک دن یہ گھر چھوڑ کر نکل بھاگی۔ جھنگ سے نکل کر مجھ تک پہنچنے تک بے چاری بڑی خوار ہوئی اور دھکے کھائے۔ میری ہی ایک شاگرد اسے لے کر میرے پاس آئی تھی۔ میں نے رحم کھا کر رکھ لیا کہ سماج کے دھتکاروں کو اگر ہم ہی سہارا نہیں دیں گے تو یہ بے چاریاں کہاں جائیں گی۔ اپنے طور پر میں نے کوشش بھی کی کہ یہ میرے پاس آرام سے رہے لیکن میرے ہاں کا ماحول تمہیں معلوم ہے۔ لڑکیاں چاہے کچھ کریں لیکن نماز روزے کی پابند ہیں۔ یہ بے چاری ٹھہری ہندو ذات۔ میرے پاس نہ اس کے لیے بھگوان کی مورت ہے نہ تصویر۔ کرنے کو میں انتظام کر دیتی لیکن میری والیوں کو اچھا نہیں لگتا۔ دوسرے یہ خود بھی وہاں ان سب کے بیچ عجیب سا محسوس کرتی ہے۔ میں نے کہا چل تجھے شالنی کے پاس لے چلتی ہوں۔ اگر اس نے تجھے قبول کر لیا تو تیری مشکل آسان ہو جائے گی۔ اب تو بتا کہ میری بات رکھ کر اسے قبول کرے گی یا نہیں؟" ببلی نے سوچی سمجھی کہانی سناتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"کیوں نہیں دیدی! آپ اسے اپنے ساتھ لے کر آئی ہیں تو مجھے تو اسے سویکار کرنا ہی ہے۔ آپ اسے میرے پاس چھوڑ جائیں۔ میں اس کا پورا خیال رکھوں گی۔" شالنی نے فوراً ہی ہامی بھر لی۔

"لو بھئی رنجی! مبارک ہو۔ تمہارا کام تو بن گیا۔ یہاں آرام سے رہو۔ میری یاد آئے تو شالنی کو بتا دینا، یہ تمہیں مجھ سے ملوانے کے لیے لے آئے گی۔" ببلی نے فوراً جاوید علی کی طرف رخ کر کے اسے مبارک باد دی۔

"دھنیواد جی۔" جاوید علی نے شرمیلے انداز میں شکریہ ادا کیا۔ اس کی آواز اور انداز دونوں میں خواجہ سراؤں والی بات تھی اور یہ ببلی کی کروائی مشق کا نتیجہ تھا۔ اس نے جاوید کو قلیل عرصے میں اچھی خاصی ٹریننگ دے دی تھی۔ وہ تھا بھی ذہین اس لیے جلد ہی بہت کچھ سیکھ گیا تھا۔

"تیرا نام شروع سے رنجی تو نہیں ہوگا۔ گھر والے لڑکا بنا کر رکھنا چاہتے تھے تو کوئی مردانہ نام ہی رکھا ہوگا؟" شالنی نے براہ راست اس سے پوچھ گچھ شروع کر دی۔

"جی۔ پتا جی نے میرا نام رنجیت رکھا تھا اسی لیے میں نے اسے بدل کر رنجی کر لیا۔" جاوید علی نے شرمیلے لہجے میں جواب دیا۔

"جھنگ میں کس جگہ رہتے ہیں تمہارے گھر والے؟" کائیاں شالنی، ببلی سے ہامی بھرنے کے باوجود اس طرح تفتیش کر رہی تھی جیسے اپنی تسلی کرنا چاہتی ہو۔"

"کیوں جی، آپ کہیں مجھے ان کے پاس واپس تو نہیں بھیج دیں گی؟" جاوید علی بھی کم نہیں تھا۔ خوف زدہ نظر آنے کی اداکاری کرتے ہوئے سوال کا جواب گول کر دیا۔ اس موقع پر بوبی نے بھی اس کی مدد کی اور بیچ میں دخل دیتے ہوئے بولی۔

"تو فکر نہ کر شالنی! میں نے اس کا سب آگا پیچھا معلوم کر لیا ہے، جب ہی تو یہاں لے کر آئی ہوں۔ اگر مجھے اس کی طرف سے اطمینان نہیں ہوتا تو اسے لے کر آتی بھلا۔"

"ٹھیک ہے دیدی! آپ اس کی گارنٹی دے رہی ہو تو پھر میں کچھ نہیں پوچھتی۔ اسے رکھنے کے لیے تو میں پہلے ہی ہاں کر چکی ہوں۔" شالنی نے سوال جواب کا سلسلہ روک دیا۔ اسی وقت اس کی ملازمۂ خاص لوازمات اور چائے سے لدی ٹرالی لیے اندر داخل ہوئی۔

"اس تکلف کی کیا ضرورت تھی شالنی!" بوبی نے بھری ٹرالی دیکھ کر اسے ٹوکا۔

"ایسا کوئی خاص اہتمام نہیں کیا ہے دیدی! آپ اطلاع دے کر آتیں تو میں آپ کے لیے خصوصی پکوان تیار کرواتی۔ ابھی تو جو کچھ گھر میں تھا، وہ سیوا کے لیے حاضر کر دیا ہے۔" شالنی کی انکساری لوازمات سے بھری ٹرالی کے ساتھ میل نہیں کھا رہی تھی اور وہاں انکساری تھی بھی کہاں؟ ایک جتاتی ہوئی سی کیفیت تھی کہ دیکھو ہم بن بلائے اچانک چلے آنے والے مہمانوں کی بھی کیسی ضیافت کرتے ہیں۔

"چلیں بس اب تکلف نہ کریں اور میری خوشی کے لیے اچھی طرح کھائیں پئیں۔" اسی بناوٹی لہجے میں اس کا اصرار جاری تھا کہ ایک اور خدمت گار اجازت لے کر اندر داخل ہوئی اور جھک کر اس کے کان میں کچھ کہا۔

"شما کیجیے گا دیدی! ایک ضروری فون آیا ہے، سن کر ابھی حاضر ہوتی ہوں۔ آپ جب تک آرام سے چائے وغیرہ پئیں۔" ملازمہ کی سرگوشی سن کر وہ تیزی سے کھڑی ہوئی اور رسمی سا جملہ بول کر باہر نکل گئی۔ اس کی غیر موجودگی میں اس کی ملازمۂ خاص نے میزبانی کے فرائض سنبھال لیے اور اصرار کر کے بوبی اور جاوید علی کو مختلف اشیا کھلاتی رہی۔ شالنی کی فون کال خاصی طویل ثابت ہوئی تھی۔ وہ کئی منٹ گزار کر واپس آئی تو ایک بار پھر معذرت کرنے لگی۔

"کوئی بات نہیں شالنی! مجھے معلوم ہے کہ کوئی ضروری فون ہوگا جب ہی تم نے اتنا وقت لگا دیا۔ بہر حال، اب تم مجھے اجازت دو۔ مجھے کچھ دوسرے کام بھی ہیں۔ رجنی کی ذمے داری اب تمہارے حوالے۔" بوبی نے وقار سے اس کی معذرت قبول کرتے ہوئے اجازت طلب کی۔

"آپ کو اتنی جلدی جانے دینے کو من تو نہیں چاہ رہا لیکن مجھے اندازہ ہے کہ آپ کا وقت کتنا قیمتی ہے۔ بس یہی کہوں گی کہ یہاں سے بالکل شانت ہو کر جائیں۔ رجنی آپ نے میرے حوالے کی ہے۔ میں اسے من سے لگا کر رکھوں گی۔" شالنی نے جواباً ایک بار پھر اس سے اپنی عقیدت مندی کا مظاہرہ کیا اور پھر اسے رخصت کرنے کے لیے باہر تک اس کے ساتھ گئی۔ بوبی کے جانے کے بعد وہ واپس ڈرائنگ روم میں آئی۔ جاوید علی ابھی تک وہیں بیٹھا تھا۔ شالنی اس کے روبرو بیٹھ گئی اور اپنا دایاں ہاتھ میز پر رکھ دیا پھر سگریٹ کیس سے ایک سگریٹ نکال کر سلگایا اور دھواں فضا میں چھوڑا۔ اس سارے عمل کے دوران اس کی نظر ایک پل کے لیے بھی جاوید علی پر سے نہیں ہٹی تھی۔ سر جھکا کر سامنے بیٹھا جاوید علی کن انکھیوں سے اس کی ایک ایک حرکت کا جائزہ لے رہا تھا۔

"رجنی...." شالنی نے ایک اور کش لینے کے بعد اسے پکارا تو وہ زبان سے کچھ بولنے کے بجائے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"میں آج شام کی فلائٹ سے کراچی جا رہی ہوں۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ تجھے بھی اپنے ساتھ لے کر چلوں گی۔ تجھے وہاں ہماری دوسری ساتھیوں کے ساتھ رہنا۔" اس کی بات سن کر جاوید علی کو جھٹکا لگا۔ وہ تو یہاں پہلے ان کے نیٹ ورک کو ٹریس کرنے کے لیے ان میں شامل ہوا تھا اور وہ اسے کراچی بھیجنے کی بات کر رہی تھی۔

"چنتا نہ کر۔ وہاں یہاں سے اچھا ماحول ہے۔ ویسے بھی میں گرو ہوں اور تجھے یہ تو بوبی نے بتا ہی دیا ہوگا کہ گرو کی بات ماننی کتنی ضروری ہوتی ہے۔ گرو کو انکار کرنے والوں کی گروہ میں کوئی جگہ نہیں ہوتی۔" اس کا لہجہ دھمکی آمیز تھا۔ ادھر جاوید علی کو گمان بھی نہیں تھا کہ پہلے ہی مرحلے پر ایسی صورت حال کا سامنا کرنا پڑے گا۔ بوبی کے جاتے ہی شالنی کے تیور یک دم ہی بدل گئے تھے اور وہ اس سے کچھ عجیب ہی طرح برتاؤ کر رہی تھی۔

"کہیں شالنی کو مجھ پر شک تو نہیں ہو گیا؟" اچانک ہی یہ خیال اس کے دماغ میں ابھرا اور وہ خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتا ہوا اس صورت حال سے نکلنے کی تدبیر سوچنے لگا۔

شالنی اسے تولتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہی تھی جبکہ جاوید علی سوچ رہا تھا کہ کسی طرح کراچی جانے سے بچنے کی تدبیر سوجھ جائے۔

"کیا بات ہے رنجی! تو کس سوچ میں پڑ گیا ہے؟ تجھے کراچی جانے والی بات پسند نہیں آئی کیا؟" شالنی نے اس کے چہرے پر تذبذب کی کیفیت دیکھ کر چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"یہ بات نہیں ہے دیدی! آپ کا حکم سر آنکھوں پر لیکن میرا لاہور چھوڑنے کو من نہیں کرتا۔ یہاں رہوں گی تو جب من کرے گا بوبی دیدی سے ملنے چلی جایا کروں گی۔ کراچی تو اتنی دور ہے۔ وہاں سے یہاں آنا تو بڑا مشکل ہو گا۔" اس نے ایک عذر لنگ پیش کیا۔

"بڑا پریم ہو گیا ہے تجھے بوبی سے۔" شالنی نے طنزاً تیر پھینکا۔

"پریم تو ہو گا ہی جی۔ انھوں نے اتنے تھوڑے سے دنوں میں میرا اتنا خیال رکھا، اتنا تو میری سگی بہن بھی نہیں رکھتی تھی۔ اگر دھرم کا مسئلہ نہیں ہوتا تو میں کبھی ان کا گھر نہ چھوڑتی۔" جاوید علی نے جواب دیا۔

"یہ اچھی بات ہے کہ تجھے دھرم کا اتنا خیال ہے۔ دھرم کو سب سے اوپر رکھنے والے بھگوان کو بڑے پیارے ہوتے ہیں۔ تو دھرم کی ایسی ہی پابندی کرے گی تو مرنے کے بعد سورگ میں تیرا ٹھکانا ہو گا۔ پر مجھے یہ اچھا نہیں لگا کہ تو ہندو جاتی کی ہو کر ایک مسلمان سے اتنا پریم جتا رہی ہے۔ تجھے معلوم نہیں کہ مسلمان پلید ہوتے ہیں۔" شالنی نے پہلے اسے سراہا اور پھر ملامت کی۔

اس بار جاوید علی محتاط ہو گیا۔ اسے یاد تھا کہ اس نے خواجہ سراؤں کے ایسے گروہ تک پہنچنا تھا جو ہندو شدت پسندوں پر مشتمل ہو اور شالنی کی بات سن کر اسے لگا تھا کہ وہ پہلے ہی مرحلے میں کامیابی کے قریب پہنچ گیا ہے۔

"بھگوان مجھے شما کرے۔ میں واقعی بھول گئی تھی کہ پلید مسلوں سے دور رہنا کتنا ضروری ہے۔ اصل میں بوبی دیدی نے مجھ سے جو برتاؤ کیا تھا، اس نے مجھے یہ بات بھلا ہی دی تھی کہ وہ مسلمان ہیں۔" وہ جلدی سے اپنی صفائی پیش کرنے لگا۔

"بوبی کے بھولے پریم کے چکر میں نہ پڑنا۔ اس کا پریم وریم سب دکھاوا ہے۔ بڑی ڈرامے باز ہے۔ اپنے چیلوں کو بھی دکھاوے کے لیے نمازوں کی عادت ڈال رکھی ہے۔ اصل میں تو وہ ان سے دھندا کرواتی ہے۔ تجھے بھی اتنے لاڈ سے اس لیے اپنے پاس رکھا ہو گا کہ تو بڑی سوہنی ہے۔ تو رام ہو جاتی تو وہ تجھے بھی دھندے میں لگا دیتی، پر اسے دن اس نے تجھے اپنے پاس رکھ کر دیکھ لیا ہو گا کہ تو اس کے لیے کام کرنے کو تیار نہیں ہو گی اس لیے اپنا بوجھ میرے اوپر پھینک گئی، پر تو چنتا نہ کر۔ میں تجھے بوجھ تھوڑا ہی سمجھوں گی۔ یہاں تیری بڑی اچھی دیکھ بھال ہو گی۔" بوبی کے سامنے اس کے قدموں میں بچھ جانے کو تیار شالنی اب اس کے خلاف زہر اگل رہی تھی۔ سگریٹ کے دھوئیں کے پیچھے سے نظر آنے والا میک اپ سے لتھڑا اس کا چہرہ اس نفرت کی وجہ سے بگڑا ہوا لگ رہا تھا۔

"پر آپ تو مجھے خود سے دور کراچی بھجوا رہی ہیں۔" جاوید علی نے باقی کسی بھی بات پر تبصرہ کیے بغیر اس کے آخری جملوں کو پکڑ کر شکوہ کیا۔

"وہ تو میں تیرے بچنے کے لیے بھجوا رہی ہوں۔ تو جھنگ کی رہنے والی ہے اور وہاں سے بھاگ کر یہاں آئی ہے۔ اگر تیرے گھر والے تیری تلاش میں نکلے تو سب سے پہلے لاہور ہی کا رخ کریں گے اس لیے میں چاہتی ہوں کہ تو یہاں سے دور چلی جائے۔ رہی تجھے خود سے دور بھجوانے کی بات تو اس کی تو چنتا نہ کر۔ میرا کراچی آنا جانا لگا رہتا ہے۔ تجھ سے میری ملاقات ہوتی رہے گی۔ پھر فون کس لیے ہے۔ تجھے وہاں کوئی پریشانی ہو یا دل گھبرائے تو فون پر مجھ سے بات کر لینا۔" شالنی نے اس پر فرار کے سارے راستے مسدود کر دیے تھے۔

"ٹھیک ہے دیدی! اگر آپ سمجھتی ہیں کہ کراچی جانے میں ہی میری بھلائی ہے تو میں راضی ہوں۔"

آخرکار جاوید علی نے ہامی بھر ہی لی۔ اس سے زیادہ بحث شالنی کو بدگمان بھی کر سکتی تھی اور وہ طیش میں آ کر اسے اپنے گروہ میں شامل کرنے سے انکار کر دیتی تو یہ اس کے حق میں کسی طرح مناسب نہیں ہوتا کیونکہ اس کا قیافہ تھا کہ وہ درست جگہ پر پہنچ گیا ہے اور یہاں اسے کامیابی ملنے کا امکان ہے۔ رہی بات کراچی جانے کی تو یہ کیا ضروری تھا کہ وہ لاہور میں رہ کر ہی کام کرتا۔ اگر شالنی کا گروہ ہی اس کا مطلوبہ گروہ تھا تو ان کی سرگرمیاں صرف لاہور تک ہی تو محدود نہیں ہوں گی۔ وہ کراچی میں رہ کر بھی وہی سب کر رہے ہوتے بلکہ امکان تھا کہ زیادہ بڑے پیمانے پر کر رہے ہوں... کراچی جیسا گنجان آبادی والا شہر بہت سی وجوہات کی بنا پر مجرموں کے لیے جنت بنا ہوا تھا۔

☆☆☆

ذیشان نے اپنے سامنے بیٹھے مشابرم خان کا جائزہ لیا۔ اس کا حلیہ بے حد خراب ہو رہا تھا۔ کئی دن کی بڑھی ہوئی شیو، بکھرے بال، شکن آلود لباس، سرخ آنکھیں اور چہرے پر چھائی تھکن اور اداسی کو دیکھ کر کوئی بھی اندازہ لگا سکتا تھا کہ یہ شخص کسی شدید دکھ یا مشکل میں گرفتار ہے۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر جہاں اسے افسوس ہوا، وہاں شہر یار کی خوش بختی پر رشک بھی ہوا کہ ایسا کیا تھا اس شخص میں کہ لوگ اسے اتنا بے تحاشا چاہتے تھے، ورنہ اس نفسانفسی کے دور میں تو یہ عالم ہو چلا تھا کہ لوگ اپنے خونی رشتوں سے بھی دور ہوتے جا رہے تھے۔ ترقی کی چاہ میں لگائی جانے والی دوڑ نے ہر ایک کو اتنا مصروف کر دیا تھا کہ ڈھنگ سے اپنی خوشیاں اور غم بھی منانے کی فرصت نہیں رہی تھی۔

مشابرم خان کی حالت اتنی خستہ لگ رہی تھی کہ ایک دفعہ تو اس کا دل چاہا کہ اس شخص کو حقیقت سے آگاہ کر دے لیکن پھر اس نے فوراً ہی خود کو سنبھال لیا۔ وہ جس شعبے سے وابستہ تھا اور اس کے شانوں پر جو بھاری ذمے داریاں تھیں، وہ اسے اس قسم کی جذباتیت کی اجازت نہیں دیتی تھیں چنانچہ اس نے مشابرم خان کی حالت پر مزید غور کرنے کے بجائے اسے یہاں بلانے کے مقصد کو پورا کرنے کے لیے گفتگو کا آغاز کرنا مناسب سمجھا۔

"کیسے ہو مشابرم خان؟" لہجے کو بے حد سرسری بناتے ہوئے اس نے پوچھا اور براہ راست اسے دیکھنے کے بجائے اِدھر اُدھر نظروں کو بھٹکاتا رہا۔ اس وقت وہ لوگ ایک معمولی درجے کے ہوٹل میں موجود تھے۔ ملاقات کے لیے اس ہوٹل

کا تعین اس نے خود کیا تھا اور جگہ کے اعتبار سے معمولی سا شلوار قمیص زیب تن کر رکھا تھا۔ مشابرم خان کو تو خیر کسی ہدایت کی ضرورت تھی ہی نہیں، اپنی خستہ حالت میں وہ ویسے ہی اس ہوٹل کے معمولی حیثیت کے گاہکوں سے میل کھا رہا تھا۔

"مجھے کیا ہونا ہے سر! میں ٹھیک ہوں لیکن مجھے شہریار صاحب کی فکر لگی ہوئی ہے۔ اتنے دن ہو گئے ان کے ایکسیڈنٹ کو لیکن ابھی تک ڈاکٹروں نے کوئی اچھی خبر نہیں سنائی ہے۔ جب بھی پوچھو یہی سننے کو ملتا ہے کہ ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ میں کہتا ہوں کہ اگر یہاں کے نالائق ڈاکٹر کچھ کہنے کے لائق نہیں ہیں تو رانا صاحب، شہریار صاحب کو علاج کے لیے باہر کیوں نہیں بھجوا دیتے؟ وہ تو اتنی حیثیت والے آدمی ہیں۔ ان کے لیے باہر کے ملک سے علاج کروانا کیا مشکل ہے؟ ایسی مجبوریاں تو ہم غریبوں کے ساتھ ہوتی ہیں۔" اس کے انداز میں غصہ اور حسرت دونوں تھے۔ ایک طرف شہریار کے لیے اپنی بے تحاشا محبت کے سبب جہاں وہ اس کے لیے پریشان تھا، وہیں شاید اسے عرصے سے اسپتال میں داخل اپنی ماں بھی یاد آ گئی تھی۔ اس کے بھائی اکرم خان کی جوان موت کے بعد وہ صدمے کے باعث جو کومے میں گئی تھی تو ابھی تک ہوش میں نہیں آ سکی تھی۔ اس کے علاج پر اسپتال میں جو بھی اخراجات آتے تھے، ان کا بل اب تک شہریار ہی ادا کرتا رہا تھا ورنہ حقیقت یہ تھی کہ اپنی معمولی تنخواہ کے ساتھ وہ ماں کے علاج پر اتنا خرچ نہیں کر سکتا تھا۔

"مجھے تمہارے جذبات کا احساس ہے خان! میں جانتا ہوں کہ تم شہریار سے بہت محبت کرتے ہو لیکن تمہیں اس سے وابستہ دوسرے لوگوں کی محبت پر بھی شک نہیں ہونا چاہیے۔ رانا صاحب کو بھی اس کا بہت خیال ہے۔ وہ خود بھی اسے لندن یا امریکا کے کسی بڑے اسپتال میں شفٹ کرنے کی خواہش کا اظہار کر چکے ہیں لیکن اس کی جو کنڈیشن ہے، اسے دیکھتے ہوئے ڈاکٹرز نے اجازت نہیں دی۔ ان کے خیال میں شہریار کے لیے کسی بھی قسم کا سفر نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ سب ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہوں۔ یہاں کے ڈاکٹرز کا لندن کے قابل ترین ڈاکٹرز سے رابطہ ہے۔ شہریار کی ساری رپورٹس انہیں بھی جا چکی ہیں اور ان کے مشوروں کی روشنی میں اس کی صحت یابی کے لیے کوششیں کی جا رہی ہیں۔ لیکن یہ بات تو تم بھی سمجھتے ہو کہ انسان کے اختیار کی بہرحال ایک حد ہوتی ہے، اس حد کے آگے وہ قدرت کے سامنے بے بس ہو جاتا ہے۔ تم جو جملہ سن کر یہاں کے ڈاکٹروں سے ناراض ہو، وہی رائے لندن کے ڈاکٹرز کی بھی ہے۔ وہ بھی شہریار کی حالت کے بارے میں کوئی حتمی رائے دینے سے قاصر ہیں اور انہوں نے اسے [illegible] سے منع کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ تفصیل سن کر تمہاری تسلی ہو گئی ہو گی کہ شہریار کے علاج کے سلسلے میں کسی قسم کی کوتاہی یا بے پروائی نہیں برتی جا رہی... لیکن قدرت کے سامنے ہم سب مجبور اور بے بس ہیں۔"

وہ نہایت نرم لہجے میں مشابرم خان کو سمجھانے کی کوشش کرتا رہا۔ یہ سب جو اس نے مشابرم خان کو بتایا تھا، تکنیکی اعتبار سے غلط بھی نہیں تھا۔ ڈرامے کو حقیقت کا رنگ دینے کے لیے یہ سارا سلسلہ سچ مچ جاری تھا۔ شہریار کے کوائف کے ساتھ بہت سی جعلی رپورٹس لندن کے ماہرین کو بھجوائی گئی تھیں اور نہایت سنجیدگی سے ان رپورٹس پر ماہرین سے تبادلۂ خیال بھی ہوتا رہتا تھا۔

"میری تسلی تو صرف اسی صورت ہو سکتی ہے کہ شہریار صاحب صحت یاب ہو کر اسپتال سے باہر آ جائیں اور دوبارہ سے اپنی سیٹ سنبھال لیں۔ اس ملک کو ان کی بہت ضرورت ہے۔ ان جیسا ایمان دار اور بہادر افسر میں نے اپنی ملازمت میں پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ ان کے ساتھ کام کر کے دل کو خوشی ہوتی تھی کہ کوئی تو ہے جسے اس ملک اور اس کے لوگوں کا خیال ہے، ورنہ یہاں تو زیادہ تعداد انہی لوگوں کی ہے جو ملک بیچ کر بھی اپنی تجوریاں بھرنے میں حرج نہیں سمجھتے۔" مشابرم خان نے شہریار کے لیے اپنے خالص جذبات کا اظہار کیا پھر بات کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ "اتنے سارے بے ایمانوں اور چوروں میں ایک ایمان دار آدمی آ جائے تو وہ انہیں اپنے لیے خطرہ محسوس ہونے لگتا ہے اور سارے مل کر اسے اس کی جگہ سے ہٹانے کی کوشش کرنے لگتے ہیں۔ شہریار صاحب کے ساتھ بھی یہی مسئلہ تھا۔ ان کے دشمنوں نے بار بار انہیں نشانہ بنانے کی کوشش کی اور وہ قسمت سے بچتے رہے لیکن آخر دشمنوں کا داؤ چل ہی گیا۔" اس کی آواز بھرّانے لگی۔

"حوصلے سے کام لو مشابرم خان! جو کچھ ہوا، وہ واقعی بے حد افسوس ناک ہے لیکن ابھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ واقعہ کسی دشمن کی کارروائی تھی یا شہریار حقیقتاً حادثے کا شکار ہوا ہے۔ جو بھی معاملہ ہوا اسے ہم کھوج نکالیں گے لیکن میں نے تم سے بڑی حقیقت سمجھانے کے لیے اس وقت میں نے تمہیں اپنے پاس بلایا ہے، وہ یہ ہے کہ شہریار کے میدان عمل سے نکل جانے سے دنیا کا کاروبار ختم نہیں ہو گیا ہے۔ یہاں ازل سے خیر و شر کی جنگ جاری ہے اور یہ ممکن نہیں کہ ہم شہریار کے

ساتھ پیش آنے والے حادثے کے بعد حوصلہ ہار دیں اور اپنی اپنی ذمے داریاں بھول کر ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ جائیں... بلکہ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ ہمیں پہلے سے بھی زیادہ شدومد سے ان کے خلاف برسرپیکار ہو جانا چاہیے۔ اس جنگ کو جاری رکھنے کے لیے ہی فیصلہ کیا گیا ہے کہ شہریار کی جگہ ایک نئے بندے کو دے دی جائے۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ شہریار نے اپنے علاقے پر بہت زیادہ محنت کی تھی اس لیے کوشش کی گئی ہے کہ اس کی جگہ ایک ایسا شخص لایا جائے جو اس کے شروع کیے پروجیکٹس کو محنت اور ایمان داری سے جاری رکھ سکے۔ ہمارا انتخاب ایک ینگ افسر عمیر آفندی ہے اور میں چاہتا ہوں کہ تم عمیر کے لیے بھی ویسی ہی محنت سے کام کرو جیسے اب تک شہریار کے لیے کرتے رہے ہو۔ مجھے امید ہے کہ ان شاء اللہ اس کے ساتھ کام کر کے تم ناامید نہیں ہو گے۔" اس نے مشابرم خان کو بلانے کا مقصد بیان کیا۔

"میرا دل شہریار صاحب کی جگہ کسی اور کو دینے کے لیے راضی نہیں ہوتا۔" مشابرم خان نے اداسی سے جواب دیا۔

"اگر تم ایک سچے اور محب وطن پاکستانی ہو تو اس انداز سے سوچنا تمہیں زیب نہیں دیتا کیونکہ وطن کی محبت کسی فرد واحد سے مشروط نہیں ہوتی۔ مانا کہ تم شہریار کی شخصیت اور اس کی خوبیوں سے بہت متاثر ہو لیکن شہریار کوئی واحد شخص تو نہیں ہے جسے اس وطن سے محبت تھی۔ آٹے میں نمک کے برابر ہی سہی لیکن اس کے علاوہ کچھ اور لوگ بھی ہیں جو وطن سے محبت کرتے ہیں اور اس کے بھلے کے لیے کچھ کرنا چاہتے ہیں۔ عمیر کو شہریار کی جگہ دی ہی اس یقین کی بنیاد پر جا رہی ہے کہ وہ شہریار کے مشن کو لے کر چلنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔" اس بار ذیشان نے جان بوجھ کر اپنے لہجے میں تھوڑی سی تلخی بھر لی۔ وہ جانتا تھا کہ بعض اوقات لوگوں کے ذہن میں لگی گرہ کو کھولنے کے لیے نشتر زنی مفید ثابت ہوتی ہے۔ مشابرم خان کے چہرے کا بدلتا تاثر گواہ تھا کہ اس کی حکمت عملی ناکام نہیں رہی ہے۔ اس نے گرم لوہے پر چوٹ لگانے کے خیال سے اپنی گفتگو کا سلسلہ جاری رکھا۔

"شہریار نے ہمیشہ مجھ سے تمہاری بہت تعریف کی۔ وہ تمہیں آخری سانس تک لڑنے والا سپاہی قرار دیتا تھا اور اس کا کہنا تھا کہ اس کی غیر موجودگی میں بھی اگر میں ملکی مفاد میں تمہیں کوئی کام کرنے کا کہوں گا تو تم کبھی انکار نہیں کرو گے۔"

"انہوں نے غلط نہیں کہا تھا۔" مشابرم خان نے بجھے بجھے لہجے کے ساتھ اسے جواب دیا۔

"تو بس اس وقت ملکی مفاد میں سب سے اچھی خدمت جو تم انجام دے سکتے ہو، وہ یہی ہے کہ تم اپنی ڈیوٹی پر واپس چلے جاؤ۔ عمیر کی کامیابی کے لیے یہ بہت ضروری ہے کہ اسے پہلے سے ایک مضبوط ٹیم تیار ملے اور اس کا وقت ناقابل اعتبار لوگوں کی تلاش میں برباد نہ ہو۔ دوسرے تم وہاں رہو گے تو عمیر پر چیک بھی رہے گا۔ اس کے ڈرائیور کی حیثیت سے تم ہر جگہ اس کے ساتھ رہو گے تو اس کی کوئی بھی بے ضابطگی فوراً ہی تمہاری نظروں میں آ جائے گی۔" اب پھر وہ اپنے لہجے کو اعتدال پر لے آیا تھا اور نہایت متانت سے اسے سمجھا رہا تھا۔

"آپ کی بات مجھے سمجھ تو آ رہی ہے لیکن یہاں سے جانے کو دل بھی نہیں مان رہا۔ میں ہر وقت اسپتال میں موجود رہتا ہوں تو مجھے تسلی سی رہتی ہے۔ ڈیوٹی پر چلا جاؤں گا تو یہاں کی فکر لگی رہے گی۔" اس نے جھجکتے ہوئے اپنا مسئلہ بیان کیا۔

"میں سمجھ رہا ہوں کہ تم کیا کہنا چاہ رہے ہو۔ اپنے تئیں تم دن رات اسپتال میں ڈیرا ڈال کر شہریار کی سیکیورٹی کے فرائض انجام دے رہے ہو لیکن یقین کرو کہ تمہیں یہ تکلیف اٹھانے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔ شہریار کے معالجین سمیت وہاں موجود پورا اسٹاف ہمارے لیے قابل اعتبار ہے۔ اس کے باوجود ہم نے اس کی سیکیورٹی کا مناسب انتظام کر رکھا ہے۔ اس بات کا اندازہ تم اس دن کے واقعے سے بھی لگا سکتے ہو جب میں نے تمہیں فون کر کے معاملے سے الگ رہنے کی ہدایت کی تھی۔" ذیشان نے اسے اس واقعے کا حوالہ دیا تھا جب رائے چند نامی را کا ایک مبینہ ایجنٹ اشیش کمار کے کمرے میں ڈیوٹی دینے والی نرس سے رقم کے عوض شہریار کے بالوں اور خون کے نمونے لے گیا تھا۔

"اس واقعے نے تو ابھی تک مجھے الجھن میں ڈال رکھا ہے۔ اچھا ہوا کہ آپ نے خود مجھ سے ذکر کر دیا۔ ورنہ میں آپ سے پوچھنا ہی چاہ رہا تھا کہ وہ سب کیا تھا اور اس رات وہاں کیا ہو رہا تھا؟"

مشابرم خان فوراً ہی ذہن میں اٹکا وہ سوال جسے اب تک ذیشان کے لحاظ میں نہیں پوچھ سکا تھا، زبان پر لے آیا۔

"کچھ مجبوریوں کی وجہ سے میں تمہیں اس واقعے کی تفصیلات اور حقائق سے آگاہ نہیں کر سکتا لیکن اتنا یقین دلا سکتا ہوں کہ اس واقعے سے شہریار کو کوئی نقصان نہیں پہنچا بلکہ وہ فائدے میں ہی رہا ہے۔" ذیشان نے نہایت سنجیدگی سے اس انداز میں اس کے سوال کا جواب دیا کہ اسے مزید اس موضوع پر جرح کرنے کی ہمت نہیں ہوئی اور وہ گویا ہتھیار

ڈالتے ہوئے بولا۔

''ٹھیک ہے سر! میں آپ کے حکم پر واپس ڈیوٹی پر جانے کے لیے تیار ہوں۔ شہریار صاحب آپ کو جو اہمیت دیتے تھے، اس کی وجہ سے میں آپ کے حکم سے انکار کی جرأت نہیں رکھتا۔''

''گڈ... مجھے تم سے اسی فیصلے کی امید تھی۔'' ذیشان نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے اپنے سامنے دھری چائے کی پیالی پر نظر ڈالی۔ پہلے سے کپ میں ٹھنڈی ہو جانے والی چائے کسی طور اس لائق نہیں تھی کہ وہ اسے پینے کی جرأت کرسکتا۔ مشابرم خان نے بھی اس چائے کو منہ نہیں لگایا تھا۔ اب معلوم نہیں کہ ایسا اس نے ناپسندیدگی کی وجہ سے کیا تھا یا ذیشان کو چائے کو ہاتھ نہ لگاتے دیکھ کر خود بھی احتراماً اس کی تقلید کی تھی۔

''کام جو میں نے تمہیں بتایا ہے، تم آسانی سے کر لو گے کیونکہ تمہیں اس کا خاصا تجربہ ہے۔ البتہ ہوسکتا ہے کہ میں وقتاً فوقتاً تم سے کچھ اور بھی کام لیتا رہوں۔ امید ہے کہ تم اس صورت میں بھی مجھے مایوس نہیں کرو گے۔'' ذیشان نے بات کو آگے بڑھایا۔

''فی الحال آپ میرے لیے شہریار صاحب کے قائم مقام ہیں، میں نے صاحب کو کبھی کسی کام سے انکار نہیں کیا اس لیے آپ کو بھی نہیں کروں گا۔'' مشابرم خان کا جواب بہت سادہ اور واضح تھا۔

''میں بھی تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ شہریار ہی کی طرح میری بھی کسی ہدایت پر عمل کر کے تمہیں کبھی پچھتاوا یا افسوس نہیں ہوگا البتہ خیال رکھنا کہ اپنے فرائض کو انجام دیتے ہوئے جذباتیت کا شکار نہ ہو۔ میں تمہیں جتانا نہیں چاہتا لیکن شہزادی کی موت کی مثال دے کر یہ سمجھانا ضرور چاہتا ہوں کہ جذباتیت سے بعض اوقات بہت بڑے بڑے نقصان ہو جاتے ہیں۔ اگر تم ٹھنڈے دماغ سے غور کرو تو اس روز تم نے شہریار کے ایکسیڈنٹ کی خبر سن کر لاہور کی طرف دوڑ لگا کر کوئی عقل مندی نہیں کی تھی کیونکہ یہاں جو کچھ بھی ہوا تھا، تم اس میں اپنا کوئی کردار ادا نہیں کرسکتے تھے جبکہ یہاں آنے کے بجائے اگر تم اس روز اپنی ڈیوٹی پر پہنچ گئے ہوتے تو ہو سکتا تھا، شہزادی کی زندگی بچ جاتی۔ مارنے والوں نے اس کے قتل کو حادثے کی شکل دینے کی بے شک بہت بھرپور کوشش کی تھی لیکن ہمیں بہت سے ایسے واقعاتی ثبوت ملے ہیں جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس بے چاری کو قتل کیا گیا ہے۔ سوچو کہ اگر اس رات تم اپنی جگہ پر موجود ہوتے تو اس کی زندگی بچانے کی کوشش کرسکتے تھے اور کچھ نہیں تو شاید تمہیں وہ معلومات پہنچانے میں کامیاب ہو جاتی جنہیں اسی کے سینے میں ہی دفن کر دینے کی خاطر اسے اور اس کے معصوم بچے کو قبر کے اندھیروں میں اتار دیا گیا۔'' ذیشان بول رہا تھا اور مشابرم خان منہ کھولے سن رہا تھا۔ شہزادی کے ساتھ پیش آنے والے حادثے کی خبر اس تک بھی پہنچی تھی اور اسے شک بھی ہوا تھا کہ کہیں وہ کسی سازش کا شکار نہ ہوگئی ہو لیکن بعد میں پوسٹ مارٹم کی رپورٹ منظر پر آنے پر اس نے اس شک کو اپنے ذہن سے جھٹک دیا تھا۔ ویسے بھی اس کا دماغ شہریار کی وجہ سے اتنی بُری طرح الجھا ہوا تھا کہ وہ بہت زیادہ اس معاملے پر غور نہیں کرسکا تھا۔

''جو ہوا اسے بھول جاؤ۔ گیا وقت دوبارہ واپس نہیں آسکتا لیکن آئندہ کے لیے خود کو سنبھال کر تم اپنی غلطی کی تلافی کرسکتے ہو۔'' اس کی کیفیت دیکھ کر ذیشان نے نرمی سے اسے سمجھایا۔ جواب میں وہ صرف اثبات میں سر ہی ہلا سکا۔ ذیشان اس کی ایک ایک حرکت کا غور سے جائزہ لے رہا تھا اور مطمئن تھا کہ مشابرم خان پر کی جانے والی اس کی محنت ضائع نہیں جارہی ہے۔

''تم جگنو سے بھی اچھی طرح واقف ہو گے۔ میری خواہش ہے کہ تم اس سے رابطے میں رہو اور اس سے ملنے والی کوئی بھی اطلاع فوراً مجھ تک پہنچا دیا کرو۔ ویسے تو میں خود براہِ راست بھی اس سے رابطہ کرسکتا ہوں لیکن مناسب یہی ہے کہ بلاضرورت میں کسی کے سامنے نہ آؤں۔ شہریار کے بعد اس کے حصے کی ذمے داریاں بھی میرے شانوں پر آگئی ہیں اس لیے میں بزدل نہ ہونے کے باوجود تھوڑا سا محتاط رہنا مناسب سمجھتا ہوں۔'' مشابرم خان کو ایک اور نئی ہدایت دیتے ہوئے اس نے جان بوجھ کر ایک ایسی بات کہی جس سے اسے یہ پیغام مل سکے کہ شہریار کی عدم موجودگی میں اب وہی سب سے اہم ہے تاکہ نادانستہ بھی وہ کہیں کسی کوتاہی کا مرتکب نہ ہوسکے۔

''ٹھیک ہے سر! میں آپ کی ہر بات پر عمل کروں گا۔'' مشابرم خان کا لہجہ و انداز... گفتگو کے آغاز کے مقابلے میں کافی تبدیل ہوگیا تھا جو اس بات کا ثبوت تھا کہ اس کے اندر کام کرنے کی آمادگی پیدا ہوگئی ہے۔

''میں بھی تمہیں ناامید نہیں کروں گا۔'' ذیشان نے اس سے مصافحے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا اور سیٹ چھوڑ کر کھڑا ہوگیا۔ مشابرم خان نے بھی اس کی تقلید کی۔

''تمہارے لیے میرے پاس ایک خبر اور تھی۔ وہ یہ کہ

اے سی کی حیثیت سے شہریار جو کچھ کر رہا تھا، وہ سب تو انشاء اللہ عمیر سنبھال لے گا البتہ اس کے ذاتی پروجیکٹس کو خود رانا صاحب نے اپنی نگرانی میں لینے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ تمہاری والدہ کے علاج کی ذمے داری بھی اب رانا صاحب ہی اٹھائیں گے۔ اس لیے تمہیں اس سلسلے میں آئندہ بھی پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' اس کا ہاتھ تھام کر کھڑے کھڑے ہی اس نے یہ اطلاع دی اور پھر یک دم ہی اس کا ہاتھ چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔ مشابرم خان پُرنم آنکھوں سے اسے جاتا ہوا دیکھتا رہا۔ ان حالات میں بھی شہریار کی ذات سے اسے پہنچنے والے فیض کا سلسلہ رکا نہیں تھا تو پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اس کے لیے اپنے دل کو گداز ہوتا محسوس نہیں کرتا۔ وہ پورے خلوص اور محبت سے دل ہی دل میں اس کی صحت یابی کے لیے دعائیں کرنے لگا۔ شہریار دوبارہ میدانِ عمل میں آجاتا تو اس سے زیادہ کوئی اس بات پر خوش نہیں ہوسکتا تھا۔

☆☆☆

شالنی اور جاوید علی لاہور سے بائی ائر کراچی پہنچے تھے۔ اس سفر کے دوران جاوید علی کو اپنی زندگی کا ایک انوکھا تجربہ ہوا تھا۔ لاہور ائرپورٹ سے لے کر کراچی تک اسے لوگوں کی جو نظریں، معنی خیز جملے اور مسکراہٹیں برداشت کرنی پڑی تھیں ان کی وجہ سے وہ اچھی خاصی جھنجلاہٹ کا شکار ہو گیا تھا اور اسے بڑی شدت سے احساس ہوا تھا کہ معاشرہ اس تیسری جنس کے ساتھ کتنا بے ہودہ سلوک روا رکھے ہوئے ہے۔ اس موقع پر اس نے ان خواجہ سراؤں کو بھی تھوڑا قصوروار سمجھا تھا۔ انہوں نے زندگی گزارنے کے لیے جن بھڑکیلے کپڑوں، میک اپ اور چال ڈھال کا سہارا لیا تھا، اس کی وجہ سے خود ہی تماشا بن بیٹھے تھے۔ اتنے بھڑکتے حلیے میں تو کوئی عام عورت بھی لوگوں کی توجہ کا مرکز بن جاتی تھی تو پھر وہ کیسے محفوظ رہ سکتے تھے۔ اسے یقین تھا کہ اس نے اور شالنی نے جس حلیے میں سفر کیا تھا، اگر اس کے بجائے وہ عام سے سادہ لباس پہنے ہوتے تو اتنا زیادہ مرکزِ نگاہ نہ بنتے۔ بہرحال، موجودہ حالات میں وہ اپنے ان خیالات کا اظہار نہیں کرسکتا تھا چنانچہ ساڑی کا پلو لہرا کر بے نیازی سے چلتی شالنی کے ساتھ خاموشی سے چلتا رہا۔ ان دونوں کے پاس کوئی قابلِ ذکر سامان نہیں تھا۔ اس نے اپنے کپڑے اور ضرورت کا دوسرا سامان ایک چھوٹے سے بیگ میں رکھا ہوا تھا اور یہ بیگ اس کے شانے سے لٹک رہا تھا جبکہ شالنی کے پاس بھی ایک بڑے ہینڈ بیگ کے سوا کچھ اور نہیں تھا اس لیے انہیں... لاؤنج سے نکل کر پارکنگ میں جانے کے لیے کسی ٹرالی وغیرہ کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ وہ دونوں جیسے ہی باہر نکلے، ایک سفید رنگ کی ہنڈا اکارڈ رینگ کر ان کے قریب آگئی جس کی ڈرائیونگ سیٹ پر باوردی ڈرائیور موجود تھا۔ ڈرائیور گاڑی روک کر تیزی سے باہر نکلا اور ''نمستے دیدی'' کہتا ہوا شالنی کے قدموں میں جھک گیا۔ شالنی نے بڑی شفقت سے اسے آشیرباد دیا البتہ جاوید علی دلچسپی سے ڈرائیور کا جائزہ لیتا رہا۔

نوجوان اور خوب صورت ڈرائیور کو مخصوص یونیفارم اور سر پر موجود کیپ کی وجہ سے پہلی نظر میں دیکھ کر کسی نوعمر لڑکے کا تاثر پیدا ہوتا تھا لیکن جب وہ بولا تو جاوید علی پر اس کی اصلیت ظاہر ہوگئی تھی اور پھر گہری نظروں سے لیے جانے والے جائزے نے شک کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑی تھی کہ ڈرائیور کی یونیفارم میں در حقیقت وہ ایک خواجہ سرا تھا۔

''ٹھیک تو ہے آشا؟'' شالنی ڈرائیور کے گال کو پیار سے تھپتھپاتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

''جی دیدی اچھی ہوں۔ آپ کے آنے کی خبر سن کر تو من ویسے ہی بہت خوش ہو جاتا ہے۔'' ڈرائیور نے شرماتے ہوئے انداز میں شالنی کی بات کا جواب دیا تو اس کے چہرے پر ایک معنی خیز مسکراہٹ پھیل گئی لیکن زبان سے کچھ بھی کہے بغیر وہ کھلے ہوئے دروازے سے گزر کر گاڑی کی پچھلی نشست پر بیٹھ گئی اور جاوید علی کو ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ اپنا بیگ سنبھال کر فوراً ہی گاڑی میں بیٹھ گیا۔

''یہ رنجنی ہے۔ یہ بھی اب ادھر تم لوگوں کے ساتھ ہی رہے گی۔'' گاڑی چلی تو شالنی نے تعارف کی رسم نبھائی۔

''خوشی ہوئی تم سے مل کر۔'' آشا نے جاوید علی پر سرسری سی نظر ڈالتے ہوئے رسمی سے لہجے میں کہا۔

''رنجنی بہت دکھی ہے۔ تم سب کو اس کا بہت خیال رکھنا ہوگا۔ خاص طور پر تجھے آشا! تجھے معلوم ہے کہ میں تجھ پر سب سے زیادہ وشواس رکھتی ہوں۔'' اس کا انداز دیکھ کر شالنی نے تاکیدی انداز اختیار کیا۔

''آپ چنتا نہیں کریں دیدی! رنجنی کا کھلی باہنوں سے سواگت ہوگا۔ اس کا خیال رکھنے کے لیے اتنی بات کافی ہے کہ اسے آپ اپنے ساتھ لے کر آئی ہیں۔'' آشا نے سنبھل کر فوراً یقین دہانی کروائی پھر جاوید علی کی طرف رخ کر کے مسکراتے ہوئے بولی۔ ''آج سے تو اور میں سکھی ہیں۔ تو اپنا ہر دکھ سکھ مجھ سے بانٹ سکتی ہے۔ دیکھ، تکلف کر کے شالنی دیدی کے سامنے میرا سر نہ جھکانا۔''

"دیکھو ادا آشا! بھگوان نے مجھ پر کرپا کی ہے کہ یہاں آتے کے ساتھ مجھے اتنی پیاری سکھی مل گئی ہے۔ میں بھی ہمیشہ تیری قدر کروں گی۔" جاوید علی نے فوراً ہی نہایت انکساری کے ساتھ اسے جواب دیا۔ وہ ایک خواجہ سرا کا کردار بڑی خوبی سے نبھا رہا تھا۔ اس کی چال ڈھال سے لے کر بول چال تک میں کوئی ایسی کسر نہیں رہ گئی تھی کہ اس پر شک کیا جا سکتا۔ اس کامیابی میں اس کی فطری ذہانت اور صلاحیت کے علاوہ ببولی کی تربیت کا بھی دخل تھا اس لیے وہ دل ہی دل میں متعدد بار اس کا شکریہ ادا کرچکا تھا۔

"ارے بھئی کہیں یہ نہ ہو کہ دونوں سکھیاں مل کر مجھ تھوڑی کو بھول جائیں۔" شالنی نے یوں تو بڑے ہلکے پھلکے انداز میں ان کی گفتگو میں حصہ لیا تھا لیکن آشا کو گویا کرنٹ لگ گیا۔

"ایسا سوچنا بھی نہیں دیدی! ایسی سو سکھیاں آپ پر سے وار کر پھینک دوں۔ آپ کی جو جگہ میرے من میں ہے، وہ کسی دوسرے کو کبھی نہیں مل سکتی۔" وہ بڑی تڑپ کے ساتھ شالنی کے آگے وضاحت کررہی تھی۔

"تو بھی نہ آشا... بس ذرا سی بات من پر لے لیتی ہے۔ میں تو ایسے ہی مذاق کررہی تھی ورنہ کیا مجھے معلوم نہیں ہے کہ تو مجھے کتنا چاہتی ہے اور میری جگہ کسی کو نہیں دے سکتی۔" پچھلی نشست پر بیٹھی شالنی نے ذرا جھک کر آشا کا شانہ تھپتھپایا تو اس کے چہرے کے تاثرات نارمل ہوئے اور وہ ایک بار پھر پوری توجہ سے گاڑی چلانے لگی۔ جاوید علی بہت گہری نظروں سے یہ سب دیکھ رہا تھا۔ آشا کی شالنی سے والہانہ محبت کی کیا وجہ تھی؟ وہ سمجھ نہیں سکا تھا لیکن اس کے دل میں ایک عجیب بے نام سا احساس ضرور جاگ گیا تھا۔ ہوسکتا تھا کہ آنے والے وقت میں اسے وجہ بھی سمجھ آجاتی، ابھی تو ابتدا تھی۔ وہ جس بھید بھری دنیا میں داخل ہونے والا تھا، وہاں جانے اسے کن کن حقائق اور حیرتوں کا سامنا کرنا تھا۔

سبک رفتار سے دوڑتی گاڑی نے بہت آرام سے انہیں ایک پوش علاقے میں پہنچا دیا۔ اپنی جنس سے قطع نظر آشا بہت اچھی ڈرائیور ثابت ہوئی تھی اور اس نے کراچی کے منہ زور ٹریفک میں اتنی مہارت سے گاڑی چلائی تھی کہ کہیں انہیں ایک جھٹکا تک لگنے نہ دیا تھا۔ پوش علاقے میں داخل ہونے کے بعد گاڑی جلد ہی ایک بڑی کوٹھی کے گیٹ کے سامنے جا رکی۔ کوٹھی باہر سے ہی اتنی خوب صورت نظر آرہی تھی کہ مکینوں کی امارت کے بارے میں کسی شک وشبہے کی گنجائش نہیں تھی۔ حقیقتاً یہاں پہنچ کر جاوید علی کو تھوڑی حیرت بھی ہوئی تھی کیونکہ اس کے خیال میں تو شالنی اسے یہاں بھی ایسے کسی تنگ گلیوں والوں والے محلے کے کسی گھر میں لے جانے والی تھی، جیسے گھر میں وہ لاہور میں رہتی تھی لیکن اس کے اندازے کے بالکل برعکس وہ ایک عالی شان کوٹھی تک پہنچ چکا تھا۔ آشا نے ہارن بجایا تو کوٹھی کا جہازی سا آہنی گیٹ فوراً ہی کھل گیا۔

اس بار اس نے گیٹ کے قریب کھڑے چوکیدار کے حلیے اور لباس سے کوئی دھوکا نہیں کھایا۔ وہ بھی سو فیصدی ایک خواجہ سرا ہی تھا۔ یعنی وہ ایک ایسی دنیا میں داخل ہوگیا تھا جہاں خواجہ سراؤں کی حکمرانی تھی لیکن کوٹھی کے گیٹ پر لگی نیم پلیٹ پر موجود نام نے اسے الجھن میں ڈال دیا تھا۔ وہاں کسی نواب نوازش علی کا نام لکھا تھا۔ نام سے جنس اور مذہب دونوں ہی کی وضاحت ہورہی تھی لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ کسی مسلمان نواب صاحب کا ہندو خواجہ سراؤں کے اس ہجوم سے کیا تعلق تھا؟ ڈرائیور اور چوکیدار کو دیکھ کر اسے یقین ہوگیا تھا کہ کوٹھی کے دوسرے ملازمین بھی اسی صفت سے تعلق رکھنے والے ہوں گے۔

گاڑی آہستگی سے دوڑتی سرخ بجری سے بنی روش سے گزر کر کوٹھی کی مرکزی عمارت کے سامنے جا رکی۔ وہاں استقبال کے لیے پہلے ہی ایک خواجہ سرا موجود تھا۔ یہ خواجہ سرا بہت خوب صورت تھا اور اس نے چوڑی دار پاجامے اور فراک پر مشتمل نہایت خوب صورت و بیش قیمت لباس زیب تن کر رکھا تھا۔ جاوید علی کا یہاں پہنچنے کے بعد تیسرے خواجہ سرا سے سامنا ہورہا تھا اور تینوں میں یہ خصوصیت مشترک تھی کہ وہ بہت خوب صورت تھے۔ خود جاوید علی نے اپنی ذات پر غور کیا تو اس پر اس حقیقت کا انکشاف ہوا کہ اس کے انتخاب کی بھی وجہ یہی ہے کہ قدرت کی طرف سے اسے بڑی فراوانی سے خوب صورتی عطا کی گئی تھی۔ اسی خوب صورتی اور اپنی کم عمری کا فائدہ اٹھا کر اس نے خود کو نہایت آسانی سے خواجہ سرا کے روپ میں ڈھال لیا تھا اور اب ایسی جگہ پہنچ گیا تھا جہاں شاید کسی نے خواجہ سراؤں کی اندرسبھا سجا رکھی تھی۔

"پرنام شالنی جی! نواب صاحب کی طرف سے میں آپ کا سواگت کرتی ہوں۔" آشا نے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھولا تو شالنی باہر نکلی اور وقار سے چلتی ہوئی سامنے آنے والے ہیجڑے کے قریب پہنچ کر رک گئی۔ جاوید علی بھی ان کے پیچھے تھا اور دلچسپی سے اس پروٹوکول آفیسر نما شے کو دیکھ رہا تھا جس کے شوخ لباس کے باوجود لہجے میں خاصی متانت تھی۔

"کیا نواب صاحب کوٹھی میں تشریف نہیں رکھتے ہیں؟" شالنی نے پوچھا۔ اس وقت وہ اس بے تکلفی سے گریز

کررہی تھی جس کا مظاہرہ اس نے ڈرائیور آشا کے ساتھ کیا تھا۔

"نواب صاحب ابھی ابھی ایک میٹنگ سے واپس آئے ہیں اور فریش ہورہے ہیں۔ آپ کے لیے ان کی تاکید تھی کہ آپ کو ڈرائنگ روم میں بٹھا کر ان کے آنے تک خاطر مدارت کی جائے۔" اس نے احترام سے شالنی کے سوال کا جواب دیا۔

"ٹھیک ہے پھر وہیں چلتے ہیں۔" اس کا جواب سن کر شالنی نے قدم آگے بڑھا دیے۔ جاوید علی کو تو اس کی تقلید ہی کرنی تھی اور اس کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ اس کا اس کوٹھی میں آنا جانا لگا رہتا ہے اور وہ یہاں کے چپے چپے سے واقف ہے۔ کوٹھی کا ڈرائنگ روم شان دار اور ان تمام لوازمات سے مزین تھا جن سے صاحب خانہ کی امارت اور خوش ذوقی کا اظہار ہوسکے۔ ان دونوں کے وہاں بیٹھتے ہی مشروبات پیش کردیے گئے۔ شالنی خاموشی سے ایک گلاس تھام کر اس میں سے گھونٹ گھونٹ مشروب اپنے حلق سے نیچے اتارتی رہی۔ اس کی خاموشی کی صورت میں جاوید علی نے بھی تکلم کو نامناسب جانا۔ اس کے ذہن میں بے شک بہت سے سوالات اٹھ رہے تھے لیکن ان سوالوں کے جواب کے لیے صبر سے انتظار کرنا ہی مناسب تھا۔ ابھی اسے ان میں شامل ہوئے دیر ہی کتنی گزری تھی۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ کب اور کیا بات کرنا مناسب ہے۔ البتہ اس نے اتنا ضرور محسوس کرلیا تھا کہ گاڑی سے اترتے ہی شالنی نے شوخی اور بے تکلفی کو بھلا کر سنجیدگی کا لبادہ اوڑھ لیا تھا اور اس وقت بھی ڈرائنگ روم کی فضا کچھ بوجھل سی محسوس ہورہی تھی۔ یہ بوجھل سی خاموشی کے چند منٹ رینگ رینگ کر گزرے تو ڈرائنگ روم کے دروازے پر آہٹ سی محسوس ہوئی اور پھر سرخ وسپید رنگت والا ایک پچپن سے ساٹھ سال کے درمیان وجیہہ آدمی اندر داخل ہوا۔ اس کے وجیہہ سراپا پر سفید کرتہ پاجامہ خوب کھل رہا تھا اور بغیر کسی تعارف کے بھی یہ بات سمجھی جاسکتی تھی کہ وہی نواب نوازش علی ہے۔ شالنی نے اپنی جگہ سے کھڑے ہوکر نواب صاحب کو تعظیم دی۔ جاوید علی کو بھی اس کی پیروی کرنی پڑی۔

"تشریف رکھیں شالنی جی۔" نواب صاحب نے ہاتھ سے اشارہ کیا اور خود بھی ایک گداز صوفے پر نشست سنبھال لی اور گمبھیر لہجے میں گفتگو کا آغاز کیا۔

"ہمیں افسوس ہے کہ اس بار آپ کی آمد کی وجہ... خوش گوار نہیں ہے۔"

"افسوس تو مجھے بھی ہے نواب صاحب! پر بھگوان کی مرضی کے آگے کس کی چل سکتی ہے۔ وہ جیون دیتا ہے تو واپس بھی لے لیتا ہے۔ بس غم ہے تو یہ کہ رتی بڑی بھری جوانی میں سنسار چھوڑ کر سورگ باشی ہوگئی۔ ابھی تو اس کے کھیلنے کھانے کے دن تھے۔" شالنی کے چہرے پر غم کے سائے اور آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی نظر آنے لگی تھی۔ جاوید علی نے ان دونوں کے مابین ہونے والی گفتگو سے اندازہ لگایا کہ کسی خواجہ سرا کی موت واقع ہوگئی ہے اور یقینی طور پر وہ خواجہ سرا اس کوٹھی میں ہی مقیم تھا۔ اب معلوم نہیں کہ اس خواجہ سرا سے شالنی کا کیا تعلق تھا کہ وہ اس کے مرنے کی اطلاع سن کر اتنی ایمرجنسی میں لاہور سے کراچی پہنچ گئی۔ تعلق جو بھی تھا، وہ تو بالآخر اسے معلوم ہو ہی جاتا لیکن اس وقت وہ شالنی کے رویوں میں لمحہ بہ لمحہ ہوتی تبدیلیوں پر حیران تھا۔ لاہور میں جب اس نے اسے کراچی جانے کا فیصلہ سنایا تھا، اس وقت سے لے کر دوران سفر اور آشا سے لاڈ بھری گفتگو تک کہیں اس کے چہرے پر ایسا کوئی تاثر نہیں ابھرا تھا کہ وہ کسی المناک خبر کو سن کر یہاں آئی ہے اور کسی بات پر دکھی ہے لیکن اب وہ سراپا غم نظر آرہی تھی۔ کمال یہ تھا کہ نہ تو اس نے آنسو بہائے تھے، نہ لبوں سے سسکی نکلی تھی اور نہ ہی زبان پر کوئی حرف شکایت لائی تھی... پھر بھی مجسم غم نظر آرہی تھی۔

"ہمیں خود بھی رتی کی جوان موت پر بہت دکھ ہے۔ اس نے تھوڑے سے عرصے میں ہمیں بہت سکھ دیا تھا اور ہمارے بہت قریب ہوگئی تھی۔ ہم نے بھی بدلے میں اسے نوازنے میں کسی بخل کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ اس نے ہمیں جتنا نہال کیا تھا، ہم نے اسے اس سے زیادہ نوازا تھا لیکن ہم کسی کی قسمت بدلنے پر قادر نہیں ہیں۔ وہ جتنی عمر لکھوا کر لائی تھی، اتنا ہی جی۔ ڈینگی بخار تو سمجھو کہ موت کا بہانہ بن گیا۔ ورنہ تو ہم نے کتنوں کو اس مرض میں مبتلا ہونے کے بعد صحت یاب ہوتے دیکھا ہے۔ ان میں سے بہت سوں کو تو اتنا اچھا ٹریٹمنٹ بھی نہیں ملا جتنی توجہ سے ہم رتی کا علاج کروا رہے تھے۔"

"میں سب جانتی ہوں نواب صاحب! آپ کی میری کوئی آج کی جان پہچان نہیں ہے جو میں آپ کی دریا دلی کو نہ جانتی ہوں۔ پر جب اس بے چاری کا وقت ہی پورا ہوگیا تھا تو آپ کیا کرسکتے تھے۔" شالنی نے فوراً نواب صاحب کی دل جوئی کی ذمے داری سنبھال لی۔ خاموش سامع بنے جاوید علی نے اس بار غور کیا تو اسے نواب صاحب، شالنی سے بھی بڑھ کر دکھی نظر آئے۔ اگر یہ ان کی شان کے خلاف نہ ہوتا تو شاید اس وقت وہ دھاڑیں مار مار کر رو رہے ہوتے۔

"ہم رتی کی کمی کو بہت محسوس کریں گے۔" شالنی کے تسلی دینے کے باوجود نواب صاحب سخت آزردہ نظر آرہے تھے۔

"مجھے آپ کے دل کی حالت معلوم ہے نواب صاحب! اسی لیے رتی کا بدل لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی ہوں۔" شالنی کے الفاظ نے جاوید علی کے وجود میں سنسناہٹ سی دوڑا دی۔ صورت حال خاصی حد تک اس کے سامنے واضح تھی۔ بظاہر وجیہہ اور بارعب نظر آنے والا نواب نوازش علی یقینی طور پر اخلاقی ابتری کا شکار تھا اور اپنی اس اخلاقی پستی کو چھپانے کے لیے اس نے اپنے گرد ملازموں کے روپ میں خوب صورت خواجہ سراؤں کا ہجوم جمع کر لیا تھا۔

"یہ تو وقت بتائے گا کہ یہ رتی کا بدل ثابت ہوتی ہے یا نہیں۔ فی الحال آپ جائیں اور آرام کریں۔ رتی کی آخری رسومات کی ادائیگی کے لیے آپ کا تازہ دم ہونا ضروری ہے۔" نواب صاحب نے اس پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے شالنی کو جواب دیا۔ اس ایک نظر میں جو کچھ تھا، اسے محسوس کر کے جاوید علی مرد ہونے کے باوجود اندر سے کٹ کر رہ گیا۔

"دھنیواد نواب صاحب! واقعی مجھے کچھ دیر آرام کی ضرورت ہے بلکہ میرا خیال ہے کہ آپ بھی آرام کریں۔ اگر کہیں تو رنجنی خدمت کے لیے آپ کے ساتھ آپ کی خواب گاہ میں چلی جائے گی۔" اس سے کچھ بھی پوچھے یا اسے بتانے کی زحمت کیے بغیر شالنی نے فراخ دلی سے نواب صاحب کو پیشکش کی۔

"نہیں، اس کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ تین دن تک رتی کے مرنے کے سوگ میں اپنے ہر شغل سے دور رہیں گے۔" نواب نوازش علی نے اپنی بات میں زور پیدا کرنے کے لیے ہاتھ سے بھی اشارہ کیا۔ اس کا جواب سن کر جاوید علی کے وجود میں سکون کی لہری دوڑ گئی ورنہ تو وہ ڈر گیا تھا کہ سر منڈاتے ہی اولے پڑنے والی صورت حال سامنے آ کھڑی ہوئی ہے۔

"جیسے آپ کی اچھا۔ بندی تو حکم کی غلام ہے۔" شالنی نے سینے پر ہاتھ رکھ کر درباری انداز میں اپنی تابع داری کا اظہار کیا۔

"ہم اب آرام کریں گے۔ رتی کے کریا کرم کے لیے آپ کو جس قسم کی بھی ضرورت ہو، ہمارے سیکریٹری کو بتا دیجیے گا۔ وہ آپ سے مکمل تعاون کرے گا۔" نواب صاحب اتنا کہنے کے بعد کمرے میں مزید نہیں رکے۔ جاوید علی نے اس بار ان کا دوسرے زاویے سے جائزہ لیا تو ان کے قدم غم کے باعث بوجھل محسوس ہوئے۔

"چل رنجنی تو بھی چل کر تھوڑا آرام کر لے۔ رات کو رتی کا کریا کرم کرنا ہے اس لیے آرام کا سمے ملنا مشکل ہو گا۔" نواب صاحب کے جاتے ہی شالنی نے جاوید علی کے شانے پر ہاتھ رکھ کر خود بھی باہر کا رخ کیا۔ باہر ان کا اسی خوب رو خواجہ سرا سے سامنا ہوا جسے جاوید علی نے یہاں کا پروٹوکول آفیسر قرار دیا تھا۔

"میں اپنے کمرے میں جا رہی ہوں کاجل! تم رنجنی کے لیے کسی کمرے کا انتظام کر دو۔" شالنی نے اس خواجہ سرا کو دیکھتے ہی اس سے کہا۔

"ٹھیک ہے شالنی جی! میں ایسا کرتی ہوں کہ اسے ابھی آشا کے کمرے میں بھیج دیتی ہوں۔ بعد میں اسے رتی کا کمرا دے دیا جائے گا۔" کاجل نے اسی متانت سے جواب دیا جس کا مشاہدہ جاوید علی یہاں آتے وقت ہی کر چکا تھا۔ اسے کاجل کے حوالے کرنے کے بعد شالنی خود آگے بڑھ گئی۔ اس کے جانے کے بعد کاجل نے کسی ملازمہ کو آواز دی اور اسے رنجنی یعنی جاوید علی کو آشا کے کمرے تک پہنچانے کی ہدایت کی۔ ملازمہ فوراً ہی اسے لے کر چل پڑی۔ جاوید علی کی توقع کے خلاف وہ اسے کوٹھی کی مرکزی عمارت سے ہٹ کر کسی سرونٹ کوارٹرز وغیرہ پر مشتمل حصے میں نہیں لے گئی تھی بلکہ مرکزی عمارت کی ایک بغلی گلی سے گزر کر اس کے پچھلے حصے میں لے گئی تھی۔ اس حصے میں قطار سے آمنے سامنے بنے کمروں کے دروازے نظر آ رہے تھے۔ انہی دروازوں میں سے ایک پر اس نے دستک دی تو دروازہ کھول کر آشا سامنے آ گئی۔ وہ اس وقت بھی ڈرائیور کے یونیفارم میں تھی۔ البتہ سر پر کیپ موجود نہیں تھا اور اس کے بوائے کٹ بال نظر آ رہے تھے۔ یونیفارم کے ساتھ یہ ہیئر اسٹائل اس پر خاصا جچ رہا تھا۔

"کاجل دیدی نے اسے تمہارے پاس بھیجا ہے۔ آج یہ تمہارے کمرے میں ہی رہے گی پھر کل سے اسے رتی کا کمرا دے دیا جائے گا۔" ملازمہ نے آشا کو پیغام دیا۔

"ٹھیک ہے۔" اس نے ملازمہ کو مختصر جواب دیا اور مسکراتے ہوئے جاوید علی کا ہاتھ تھام لیا۔

"آؤ رنجنی! اندر آ جاؤ۔ تمہیں یہاں دیکھ کر بہت اچھا لگ رہا ہے۔ میں خود یہاں اکیلے رہتے رہتے گھبرا رہی تھی۔ بہت اچھا ہوا کہ کاجل دیدی نے آج کے لیے تمہیں میرا مہمان بنا دیا۔" وہ ہاتھ تھامے تھامے اسے اندر لے گئی۔ یہاں موجود خواجہ سراؤں کا جو عجیب و غریب کردار ذرا سی دیر میں اس کے سامنے آیا تھا، اس کے پیش نظر اسے آشا کے ہاتھ میں موجود اپنے ہاتھ کی وجہ سے بڑی الجھن ہو رہی تھی لیکن مصلحت کا

تقاضا تھا کہ وہ کسی ناگواری کا اظہار کیے بغیر برداشت کرے۔

"بڑے سخت ہاتھ ہیں تمہارے؟ کیا اب تک اینٹیں ڈھونے کا کام کرتی رہی ہو؟" وہ سی آئی ایف کا ایک تربیت یافتہ نوجوان تھا جسے لڑائی بھڑائی اور ہتھیار چلانے جیسے مردانہ اوصاف سکھائے گئے تھے، اس کے ہاتھوں کو سخت تو ہونا ہی تھا اور یہ بات آشا نے فوراً ہی محسوس کر کے اسے ٹوک دیا تھا۔

"اینٹیں تو نہیں ڈھوئیں لیکن بڑی مشقت میں جیون بتایا ہے اس لیے ہاتھ تو سخت ہونے ہی تھے۔" جاوید علی نے مظلومیت سے بھرپور لہجے میں اسے جواب دیا۔ ساتھ ساتھ وہ آشا کے کمرے کا جائزہ بھی لیتا جا رہا تھا۔ فرد واحد کی ضروریات کے اعتبار سے سجایا گیا یہ کمرا کسی بھی طرح ایک ملازم کا کمرا نہیں لگ رہا تھا۔ وہاں ٹی وی، فریج سے لے کر روم ریفریجریٹر تک ہر سہولت موجود تھی۔ فرش پر بچھا قالین اور کھڑکیوں پر پڑے پردے بھی خاصے بیش قیمت تھے۔ فرش بغیر تعارف کے اس کمرے میں داخل ہونے والا کوئی شخص سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ کسی ملازم کے کمرے میں آیا ہے۔

"دکھیاری معلوم ہوتی ہو۔ خیر، کوئی بات نہیں۔ یہاں تھوڑے دن رہو گی تو سارے غم بھول جاؤ گی۔ یہاں جیون کا ہر سکھ موجود ہے۔ بس ایک نواب صاحب کا من جیت لو پھر کوئی پریشانی تمہارے قریب بھی نہیں پھٹکے گی۔" اسے بیڈ پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے آشا نے خود ایک کرسی سنبھال لی۔

"ان کا من جیتنے کا گر تم ہی مجھے سکھانا۔ میرے لیے تو یہ بڑی الجھن کی بات ہے اور مجھے یہاں کی کچھ سمجھ ہی نہیں آ رہی۔ شالنی دیدی اتنی جلدی میں مجھے یہاں لے کر آئی ہیں کہ انہیں کچھ بتانے اور مجھے پوچھنے کا سمے ہی نہیں ملا۔ مجھے تو نام کے علاوہ نواب صاحب کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں ہے۔" اس نے پلکیں جھپکا کر نہایت معصومیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے احتیاط سے آشا کو ٹٹولنے کی کوشش کی۔

"یہ کون سی بڑی بات ہے۔ میں تمہیں بتا دیتی ہوں نواب صاحب کے بارے میں۔ نواب صاحب کا تعلق بھارت کی ایک ریاست سے ہے۔ ان کے آبا و اجداد وہاں رہتے تھے۔ پاکستان بنا تو ان کے ماتا پتا اپنا سب مال اسباب سمیٹ کر یہاں چلے آئے۔ نواب صاحب اپنے ماتا پتا کی اکلوتی اولاد ہیں۔ ماتا پتا دونوں کا ہی دیہانت ہو چکا ہے۔ نواب صاحب اپنے سورگ باشی ماتا پتا دونوں سے ہی بڑا پریم کرتے تھے اس لیے دونوں کو خوش کرنے کے لیے ان کی پسند سے دو الگ الگ عورتوں سے بیاہ کرنے پر مجبور ہو گئے۔ نواب صاحب کی دونوں بیگمات کوٹھی کے اوپر والے پورشن میں رہتی ہیں۔ بڑی بیگم کے دو بیٹے ہیں اور دونوں مری کے کسی کالج میں پڑھتے ہیں۔ چھوٹی بیگم کی ایک بیٹی اور ایک بیٹا ہے۔ بیٹی یہیں رہتی ہے جبکہ بیٹا مری میں پڑھ رہا ہے۔ نواب صاحب کے پریوار میں عورتوں کو پردہ کروانے کا رواج ہے اور شروع ہی سے یہ ریت چلی آ رہی ہے کہ زنان خانے میں کسی مرد ملازم کو جانے کی اجازت نہیں ہوتی بلکہ ان کی جگہ خواجہ سراؤں سے کام لیا جاتا ہے۔ نواب صاحب نے اپنے پرکھوں کی اس ریت کو قائم رکھا اور اس حد تک آگے بڑھ گئے کہ پوری کوٹھی میں کسی مرد ملازم کا گزر نہیں ہے۔ ڈرائیور، خانساماں، مالی، چوکیدار سب کے سب خواجہ سرا ہیں۔ نواب صاحب کے علاوہ یہاں کوئی دوسرا مرد رہتا ہے تو وہ ان کا بڈھا سیکریٹری ہے۔ اسے بھی بغیر نواب صاحب کی اجازت کے کوٹھی کی مرکزی عمارت میں داخل ہونے کی اجازت نہیں اور وہ پیچھے انیکسی کے ایک کمرے میں رہتا ہے۔ نواب صاحب کے بہت کم دوست ایسے ہیں جنہیں انہوں نے کوٹھی پر آنے کی اجازت دے رکھی ہو۔ جنہیں اجازت ہے، وہ بھی انیکسی میں بنے ڈرائنگ روم تک ہی آتے ہیں۔ باقی پوری کوٹھی میں ہم لوگوں ہی کا راج ہے۔" آشا نے مسکراتے ہوئے اس کی معلومات میں جو اضافہ کیا، اس سے نواب نوازش علی کا کردار اور بھی الجھ گیا۔ وہ عجیب ہی آدمی تھا جس نے دو دو بیویوں اور بچوں کے ہوتے ہوئے کوٹھی میں یہ اندر سبھا سجا رکھی تھی۔ شاید بیٹوں کو یہاں سے دور مری میں رکھ کر تعلیم دلوانے کا مقصد بھی یہی تھا کہ ان کے سامنے باپ کا کردار نہ کھل سکے۔ رہی بیٹی اور بیویاں تو یقینی طور پر ان خواتین کو اس نے اتنی پابندیوں میں جکڑ رکھا ہو گا کہ وہ کوٹھی کے اوپری پورشن سے نیچے اترنے کی بھی جرأت نہ کر پاتی ہوں گی۔

"پہلی بار ایسے کسی آدمی کے بارے میں سنا ہے۔ سن کر بڑا عجیب لگ رہا ہے۔" اس نے آشا کے سامنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

"نواب صاحب عجیب ہیں پر بڑے دیالو ہیں۔ ایسا عیش تمہیں یہاں کے سوا کہیں اور نہیں ملے گا۔ یہ میرا کمرا تم دیکھ رہی ہو۔ اس کوریڈور میں موجود سارے کمرے ایسے ہی بلکہ بعض ایسے سے بھی زیادہ شان دار ہیں۔ میرے سامنے والا کمرا رتی کا ہے۔ آئندہ تم وہاں رہو گی اور جانتی ہو کہ رتی

کلی کمرا میرے کمرے سے بہت زیادہ خوب صورت ہے۔ رتی، نواب صاحب کی بہت لاڈلی تھی اور یہ تمہاری لک ہے کہ تم بغیر کسی محنت کے اس کی جگہ لے رہی ہو۔" آشا کے لہجے میں اس کے لیے ایک غیر محسوس سا حسد تھا۔

"یہ تو شالنی دیدی کی مہربانی ہے۔ وہ ہی مجھے رتی کی جگہ لے کر آئی ہیں۔" اس نے عاجزی سے جواب دیا۔

"جب ہی تو کسی نے کوئی شکایت نہیں کی۔ شالنی دیدی ہم سب کی محسن ہیں۔ انہی کی وجہ سے ہم سڑکوں پر ماری ماری پھرنے کے بجائے یہاں عیش آرام سے رہ رہی ہیں۔ وہ یہاں جس کو جو چاہے، جگہ دلوا دیں، ہم میں سے کوئی ان کے سامنے منہ نہیں کھولتا۔" آشا نے اسے بتایا اور پھر اپنی جگہ سے اٹھ کر ریفریجریٹر کی طرف بڑھ گئی۔

"شما کرنا، باتوں باتوں میں خیال ہی نہیں رہا کہ تمہاری کچھ خاطر کرنی چاہیے۔ کہو تو اورنج جوس دے دوں؟ کیونکہ میرے خیال میں ابھی تم کچھ اور تو پینے کی عادی نہیں ہوئی ہو گی؟" اس نے معنی خیز لہجے میں پوچھا۔

"اورنج جوس ٹھیک ہے۔" اس کی بات پر کوئی کمنٹ دیے بغیر جاوید علی نے محتاط جواب دیا۔ وہ ان کے لیے اورنج جوس کا ٹن پیک نکال کر لے آئی جبکہ خود اپنے لیے اس نے جس سنہری سیال کا انتخاب کیا تھا، اس کے بارے میں کسی شبے کی گنجائش ہی نہیں تھی کہ وہ ام الخبائث ہے۔

"ڈیوٹی ٹائم میں مجھے پینے کی اجازت نہیں ہے لیکن نواب صاحب نے بتا دیا ہے کہ اب وہ کل دوپہر سے پہلے کہیں نہیں جائیں گے اس لیے میں آزاد ہوں۔" وہ اپنے لیے جام تیار کرتے ہوئے بتانے لگی۔

"نواب صاحب رتی کی موت پر بہت دکھی معلوم ہوتے ہیں۔" جاوید علی نے مزید جاننے کی خواہش میں یہ چھوٹا سا فقرہ ادا کیا۔

"چھتا نہ کرو۔ چند دن کا دکھ ہے۔ تم نے انہیں سنبھال لیا تو پھر وہ بھول کر بھی دوبارہ رتی کا نام نہیں لیں گے۔ یہاں تو یہی چلتا ہے۔ جو موجود ہے، وہ سب کچھ ہے۔۔۔ جو چلا گیا اسے کوئی یاد نہیں کرتا۔" آشا نے ایک آنکھ کا کونا دباتے ہوئے اسے جواب دیا۔

"یہ رتی کیا شالنی دیدی کی کوئی رشتے دار ہے جو وہ اتنی دور سے اس کے کریا کرم کے لیے آئی ہیں؟" آشا کو شغل میں مصروف ہوتا دیکھ کر اس نے اس سے زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کا فیصلہ کیا کیونکہ وہ ترنگ میں آ کر اسے جتنا بتا دیتی وہ جاننے کے لیے شاید اسے یہاں کئی دن سر کھپانا پڑتا اور یہاں کے جو حالات تھے، انہیں دیکھتے ہوئے وہ سمجھ گیا تھا کہ اس کے پاس زیادہ مہلت نہیں ہے۔ نواب صاحب اسے رتی کی جگہ دینے پر تل جاتے تو وہ ان سے اپنی اصلیت کیونکر چھپا پاتا اور اصلیت کھل جانے کے بعد اس کا یہاں ایک پل کے لیے بھی ٹکنا ممکن نہیں تھا۔

"شالنی دیدی کا ہم میں سے کسی سے بھی کوئی رشتہ ناتا نہیں ہے لیکن وہ ہمارے لیے رشتے داروں سے بڑھ کر ہیں۔ وہی ہیں جن کے کارن ہم میں سے کئی کا جیون بدلا۔ تمہیں یہاں جو ملازمائیں نظر آ رہی ہیں، ان میں سے زیادہ تر شالنی دیدی کی مہربانی سے ہی یہاں پہنچی ہیں۔ تم ہم میں سے ہو اس لیے اچھی طرح جانتی ہو گی کہ سماج ہمارے ساتھ کتنا برا سلوک کرتا ہے اور ہمیں کیسے ترس ترس کر جیون بتانا پڑتا ہے۔ یہاں آ کر ہمارا ہر دکھ سکھ میں بدل گیا اور اس احساس کے بدلے اگر ہمیں شالنی دیدی پر اپنا جیون بھی وارنا پڑے تو ہم انکار نہیں کر سکتے۔" آشا کچھ زیادہ ہی شالنی سے متاثر نظر آ رہی تھی۔

جاوید علی کو اندازہ تھا کہ چالاک اور مکار شالنی کے لیے ان ٹھکرائی ہوئی انسانوں کو اپنا گرویدہ بنا لینا کتنا آسان ثابت ہوا ہو گا اور یقیناً اس کی یہ ساری جدوجہد بے مقصد نہیں تھی۔ اس سارے سیٹ اپ کے پیچھے کوئی نہ کوئی راز ضرور تھا اور اسے اسی راز تک پہنچنا تھا۔

"مجھے تو شالنی دیدی اور نواب صاحب کی دوستی بھی عجیب لگ رہی ہے۔ نواب صاحب اتنے کٹر مسلمان ہیں کہ اس دور میں بھی اپنے گھر کی عورتوں کو پردہ کرواتے ہیں۔ ایسے میں ان کی ایک ہندو خواجہ سرا سے اتنی دوستی سمجھ نہیں آتی۔" اورنج جوس کا گلاس خالی کرتے ہوئے اس نے آشا کے سامنے اپنی حیرت کا اظہار کیا۔

"کٹر مسلمان۔۔۔" آشا استہزا سے ہنسی۔ "اپنے نواب صاحب کی ساری مسلمانی بس عورتوں کو پردہ کروانے تک ہی ہے۔ عیدوں کے علاوہ میں نے کبھی انہیں نماز کے لیے جاتے نہیں دیکھا۔ روزوں کو وہ اپنی صحت کے لیے نقصان دہ سمجھتے ہیں۔ شراب ان کا پسندیدہ مشروب ہے۔ باقی بھی ہر وہ شغل فرماتے ہیں جس سے انہیں ان کا دھرم روکتا ہے۔ یہاں ہم خواجہ سراؤں کی اتنی بڑی تعداد دیکھ کر بھی کیا تمہیں نواب صاحب کے مزاج کی سمجھ نہیں آئی؟" نواب صاحب کی شخصیت پر سے پردہ اٹھاتے ہوئے آشا نے اس سے چبھتا ہوا سوال کیا۔

"ہم پہ تو تم ٹھیک کہہ رہی ہو لیکن پیسے والوں کے اپنے ڈھنگ ہوتے ہیں۔ میں نے تاریخ میں ایسے کئی سورماؤں کے قصے پڑھے ہیں جو کہنے کو تو اسلام کی سربلندی کے لیے ساری عمر لڑتے رہے لیکن ان کے سارے شوق و مشاغل وہی تھے جو تم نے جناب نواب صاحب کے بتائے ہیں۔" جاوید علی کے پاس معقول جواب موجود تھا۔

"بس تو سمجھ لو کہ نواب صاحب بھی انہی دو نمبر لوگوں میں سے ہیں۔ شالنی دیدی سے انہیں ان کے کسی دوست نے ملوایا تھا۔ دیدی کو معلوم پڑا کہ نواب صاحب اپنی کوٹھی پر صرف جوان اور خوب صورت خواجہ سراؤں کو ملازم رکھنا پسند کرتے ہیں تو انہوں نے اپنے پاس سے انہیں دو ملازمائیں تحفے میں بھیج دیں۔ بس اس کے بعد سے یہ سلسلہ چل پڑا۔ اب نواب صاحب بس اسی خواجہ سرا کو ملازم رکھتے ہیں جس کی سفارش شالنی دیدی نے کی ہو۔ نواب صاحب پچیس چھبیس سے اوپر کی ملازمہ کو پسند نہیں کرتے اس لیے یہاں آنے والوں کو جلدی ریٹائرمنٹ مل جاتی ہے۔ اس کے علاوہ بھی اگر کسی ملازمہ سے نواب صاحب کا دل بھر جائے تو وہ اسے عمر سے پہلے بھی ریٹائر کر دیتے ہیں۔ لیکن یہ ہے کہ ریٹائرمنٹ سے پہلے ہر ایک اتنا کما لیتی ہے کہ بعد میں بھی زیادہ پریشانی نہیں اٹھانی پڑتی۔ خود شالنی دیدی یہاں سے ریٹائر ہونے والیوں کو اپنے پاس رکھ لیتی ہیں یا پھر اپنے جاننے والوں میں سے کسی کے ہاں جگہ دلوا دیتی ہیں۔" آشا اسے بڑی کارآمد معلومات فراہم کر رہی تھی۔

"تمہاری زبانی شالنی دیدی کے بارے میں سن کر میں تو ان کی گرویدہ ہو گئی ہوں۔ وہ واقعی مہان ہیں جو انہیں اپنی برادری کا اتنا خیال ہے۔ اب دیکھا جائے تو یہ کوئی معمولی بات تو نہیں ہے کہ وہ کوئی ناتا نہ ہونے کے باوجود اتنی دور سے رتی کے کریا کرم میں شامل ہونے کو آئی ہیں۔" جاوید علی نے جان بوجھ کر ایسے جملے ادا کیے جن سے آشا کو لگے کہ واقعی وہ شالنی سے بہت متاثر ہو گیا ہو۔

"دیدی ایسی ہی ہیں۔ میں جب سے یہاں ہوں یہی دیکھ رہی ہوں کہ وہ ہمارے ہر دکھ سکھ میں تن جان سے شریک ہوتی ہیں۔ انہیں تو ہماری ان ضرورتوں کا بھی خیال ہے جنہیں عام لوگ سمجھ بھی نہیں سکتے۔ ہمیں تیسری صنف میں رکھنے والوں کو لگتا ہے کہ ہم ہر جذبے سے عاری ہیں اور ہمیں کسی آسودگی کی ضرورت ہی نہیں ہے لیکن دیدی اس بات کو سمجھتی ہیں۔ ہم میں سے کسی کو بھی نواب صاحب سے تعلق پر اعتراض نہیں ہے۔ جواب میں دیدی نے ہمیں ان سے اجازت دلوا رکھی ہے کہ وہ ہمارے آپس کے تعلق پر کوئی اعتراض نہیں کریں گے۔ اس طرح ہم میں سے ہر ایک خوش ہے۔ نواب صاحب اگر ہمیں اپنے کسی دوست کے پاس بھیجیں تو بھی ہمیں انکار نہیں ہوتا کیونکہ وہاں سے بھی ہم خالی ہاتھ نہیں لوٹتے۔ میں بائیس سال کی ہوں۔ ابھی میرے پاس تین سے چار سال اور ہیں۔ اس عرصے میں، میں جتنا کما سکتی ہوں کما لوں گی۔ کمائی کے علاوہ دوسرے مزے اپنی جگہ ہیں۔ پھر بعد میں تو مجھے شالنی دیدی کے چرنوں میں ہی جا کر بیٹھنا ہے۔ ان کا ساتھ جو مزہ دیتا ہے وہ آج تک مجھے کہیں نہیں ملا۔" آشا نے آنکھیں میچ کر چٹخارا لیا تو جاوید علی نے دل ہی دل میں لاحول پڑھی۔ وہ ہوبلی کے پاس کئی دن رہا تھا لیکن اس کی رہائش گاہ پر اسے ایسی کسی خرافات کی ذرا سی بھی سن گن نہیں ملی تھی بلکہ اپنے اخلاق و کردار کی وجہ سے ہوبلی نے اس کے دل میں اپنے لیے خاصی عزت بنالی تھی جبکہ شالنی کو اس نے ملاقات کے پہلے لمحے میں ہی ناپسند قرار دے دیا تھا۔ اس ناپسندیدگی کی وجہ اسے یہاں آ کر سمجھ آ رہی تھی۔ شیطانی کھیل کھیلنے والی شالنی حقیقی طور پر شیطان کے ان چیلوں میں سے تھی جن کی کارکردگی پر شیطان جھوم جھوم اٹھتا ہو گا لیکن پاکیزہ روحوں کے لیے تو ان کے وجود کی بو بھی ناگوار تھی۔

"باتوں میں بہت سے بیت گیا۔ تو تھوڑی دیر آرام کر لے۔ تیری وجہ سے میرا من کھل گیا ورنہ سامنے رتی کے خالی کمرے سے تو مجھے ہول آ رہے تھے۔ لگتا تھا ابھی اس کا بھوت نکل کر یہاں آ گھسے گا۔" جاوید علی کی طرف سے مزید کوئی سوال نہ اٹھائے جانے پر خاموشی کا وقفہ آیا تو آشا کو اس کے آرام کا خیال آیا۔

"کیا رتی کی لاش ابھی اس کے کمرے میں رکھی ہے؟" اس کی بات سن کر جاوید علی نے پوچھا۔ اسے معلوم تھا کہ آشا جس دھرم سے تعلق رکھتی ہے، وہاں مُردوں سے بڑا ڈرا جاتا ہے اور وہ لوگ مرنے کے بعد اپنے ہی پیاروں کا بھوت پریت جانے کے خوف میں مبتلا رہتے ہیں۔ ان سے یہ بدعقیدگی مسلمانوں میں بھی منتقل ہوئی تھی اور اس نے ایسے کئی مسلمانوں کو دیکھا تھا جو مُردے کے ساتھ تنہا کمرے میں بیٹھے ہوئے خوف کھاتے تھے حالانکہ روح نکل جانے کے بعد باقی رہ جانے والے خاک کے پتلے میں تو اتنی سکت بھی نہیں ہوتی کہ اپنے جسم پر بیٹھنے والی مکھی کو ہی اڑا سکے۔ کسی کو نفع و نقصان پہنچانے کا تو کیا ہی سوال تھا۔

"رتی کی لاش سامنے کمرے میں رکھی ہوتی تو میں تمہیں ہرگز بھی یہاں نظر نہیں آتی۔ اسے تو تم لوگوں کے آنے سے پہلے ہی شالنی دیدی کے کچھ جاننے والے اپنے ساتھ

لے گئے تھے۔ وہ اسے اشنان وغیرہ کروا کر پوری تیاری کے ساتھ رات کو ادھر لائیں گے پھر یہاں سے ہم سب اسے اپنے ساتھ شمشان گھاٹ لے جا کر اگنی دیں گے۔" آشا کے جواب سے اس پر باقی کا پروگرام بھی واضح ہو گیا۔

"اچھا تو آرام کر، میں جا کر شانتی دیدی سے پوچھ لوں کہ انھیں کوئی کام تو نہیں ہے۔" باتونی آشا اسے خاصی معلومات فراہم کر چکی تھی اس لیے اس نے اسے روکا نہیں۔ یوں بھی اسے اندازہ تھا کہ شانتی اور اس کے درمیان جس نوعیت کے تعلقات ہیں، وہ اس سے ملنے کے لیے بے چین ہوگی اور روکے نہیں رکے گی۔ اسے ائرپورٹ پر ہونے والی ان دونوں کی ملاقات میں عجیب و غریب رویے کی وجہ بھی اب اچھی طرح سمجھ آ گئی تھی۔ اب معلوم نہیں کہ آشا اپنے باتونی پن کی وجہ سے اسے اتنا سب کچھ بتا گئی تھی یا پھر شانتی نے خاص طور پر اسے آگاہ کرنے کی ذمے داری آشا کو سونپی تھی کہ اگر اس کی طرف سے کوئی اعتراض یا رکاوٹ ہو تو اس کے علم میں آ جائے۔ لیکن جاوید علی نے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی جس سے اس کی ناگواری کا اظہار ہو سکتا۔ وہ ان لوگوں کو اپنے تعاون کا یقین دلا کر ہی ان کے درمیان رہ سکتا تھا لیکن یہ تھا بہت نازک کام۔ اسے اپنی حقیقت کھلنے سے بچنے کی ہر ممکن کوشش کرنی تھی تاکہ زیادہ سے زیادہ مہلت حاصل کر سکے لیکن پھر بھی وہ جانتا تھا کہ اس کے پاس بہت کم مہلت ہے۔ وہ مصنوعی سہاروں سے بہت دن تک انھیں دھوکا دے کر ان کے درمیان نہیں رہ سکتا تھا۔

☆☆☆

ہینگرز میں لگے ملبوسات کو ادھر سے ادھر سرکاتے ہوئے ذیشان نے کچھ فاصلے پر موجود حسینہ کو دیکھا۔ وہ موہنی تھی۔ وہی ڈالا جس سے وہ ایک وزیر موصوف کے بیٹے کی دعوت ولیمہ پر ملا تھا اور اس کی حرکات و سکنات دیکھتے ہوئے اسے شک گزرا تھا کہ یہ عورت دشمن کی جاسوس بھی ہو سکتی ہے کیونکہ یہود و ہنود دونوں کا ہی یہ وتیرہ تھا کہ وہ مردانہ وار مقابلہ کرنے کے بجائے عورتوں کے حسن اور مکارانہ اداؤں کو جنگی حکمت عملی سمجھتے ہوئے ان کا بے دریغ استعمال کرتے تھے۔ موہنی اسے اسی قبیل کی فرد لگی تھی اس لیے اس نے اپنے آدمیوں کو اس کی مستقل نگرانی پر مامور کر دیا تھا اور نگرانی کے نتیجے میں یہ حقائق سامنے آئے تھے کہ اس کا اہم حکومتی شخصیات اور سیاست دانوں سے قریبی تعلق تھا۔ وہ ان میں سے کئی کے ساتھ تواتر سے دیکھی گئی تھی اور بعض ملاقاتوں کے بعد کچھ ایسی باتیں سامنے آئی تھیں جنھیں سامنے رکھتے ہوئے یہ نہیں سوچا جا سکتا تھا کہ وہ ان بارسوخ شخصیات کو صرف داد عیش دینے کے لیے ان سے ملتی تھی۔ وہ محض پیسے کے لیے کام کرنے والی کال گرلز سے کہیں اوپر کی چیز لگتی تھی۔ آخری بار اس نے جس شخصیت سے ملاقات کی تھی، اس نے پاکستان اور بھارت کے مابین قیدیوں کے تبادلے کے سلسلے میں بڑا کلیدی کردار ادا کیا تھا۔ اس تبادلے کا جو سب سے قابلِ اعتراض نکتہ تھا، وہ یہ تھا کہ پاکستان کی طرف سے چودہ قیدیوں کو رہا کیا جا رہا تھا جبکہ بھارت جواب میں صرف چھ قیدی رہا کر رہا تھا۔ ذیشان نے بھارت کے رہا کیے جانے والے قیدیوں کی فہرست اپنے پاس منگوائی تھی اور ان کے بارے میں دیگر معلومات بھی۔ یہ دیکھ کر اس کا خون کھول اٹھا تھا کہ رہائی کے لیے جن قیدیوں کا انتخاب کیا گیا ہے، ان میں دو نام ایسے بھی ہیں جن پر جاسوس ہونے کا شک کیا جاتا رہا تھا لیکن خاطر خواہ ثبوت حاصل نہ ہونے کی وجہ سے ان کے خلاف کوئی بڑی کارروائی نہیں کی گئی۔

ان دونوں کا کہنا تھا کہ وہ ماہی گیر کی حیثیت سے ملک میں داخل ہوئے تھے۔ ان کا بیان کتنے فیصد درست تھا، یہ نہیں کہا جا سکتا تھا لیکن یہ تو طے تھا کہ وہ مبینہ طور پر دشمن کی حیثیت سے ملک میں داخل ہوئے تھے اور انھیں موقع ملتا تو وہ ایسی کارروائی کرتے جس سے ملک کو نقصان پہنچایا جا سکتا۔ اس قسم کے لوگوں کو اگر سخت سزا نہ بھی دی جاتی تو بہرحال وہ اس لائق تو نہیں تھے کہ انھیں آزاد کر دیا جاتا۔ اس طرح تو دشمن کے حوصلے بلند ہو جاتے کہ وہ جب چاہتے شرپسند عناصر کو پاکستان کی حدود میں داخل کر دیتے اور جب چاہتے نکال کر لے جاتے۔ اس واقعے کے بعد ضروری ہو گیا تھا کہ موہنی کو اچھی طرح ٹھونک بجا کر دیکھ لیا جائے۔ انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ موہنی جیسی ساحروں کے توڑ کے لیے ابھی کچھ لوگ پاکستان میں موجود ہیں اور یہ وہ لوگ ہیں جو اپنی آخری سانس تک پاکستان کی سلامتی کے لیے لڑتے رہیں گے۔

آج وہ موہنی جیسے فتنے کے سدباب کے لیے ہی اس شاپنگ مال میں موجود تھا۔ موہنی کی نگرانی پر مامور افراد کو اس کی ہدایت تھی کہ جب بھی انھیں موہنی کسی پبلک پلیس پر تنہا نظر آئے، اسے آگاہ کر دیا جائے۔ اتفاق سے یہ موقع جلد ہی مل گیا تھا اور اب وہ یہاں اس کے قریب موجود تھا۔ ملبوسات دیکھتی ہوئی موہنی قدم اٹھاتی اسی جانب آ رہی تھی جہاں وہ ایک ہینگر اسٹینڈ کے پیچھے کھڑا تھا۔ موقع دیکھ کر وہ اسٹینڈ کے پیچھے سے نکل کر سامنے آ گیا۔

"واٹ اے فنٹاسٹک سرپرائز! آپ کو یہاں دیکھ کر اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا۔" اس کا حیرت و خوشی کا ملا جلا اظہار بڑا بے ساختہ تھا۔ موہنی نے اس کی آواز پر سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور چند ثانیوں میں پہچان کے مراحل طے کر گئی۔

"یقین نہ آنے کی کیا بات ہے؟ ساری خواتین کی طرح مجھے بھی شاپنگ کا شوق ہے اس لیے میرا کسی شاپنگ سینٹر میں موجود ہونا کوئی اتنا ناقابلِ یقین واقعہ نہیں ہے۔" اس نے مسکرا کر دھیمے لہجے میں جواب دیا۔

"مجھے آپ کی یہاں موجودگی پر حیرت نہیں ہے بلکہ میں اس اتفاق پر خوش ہو رہا ہوں کہ ہم دونوں ایک وقت میں یہاں موجود ہیں ورنہ اس رات فنکشن میں جس طرح آپ نے مجھے بری جھنڈی دکھائی تھی، مجھے امید نہیں رہی تھی کہ میں پھر بھی آپ سے مل سکوں گا۔" اس نے ڈھٹائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی خوشی کا اظہار جاری رکھا۔

"یہ تو آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں کہ ہمارا دوبارہ ملنا اس اتفاق کے سوا ذرا مشکل ہی تھا۔ [illegible] میں بہت مصروف رہتی ہوں۔ آج بھی بڑی مشکل سے شاپنگ کے لیے وقت نکال سکی ہوں... بلکہ سچ پوچھیں تو سب سے چھپ کر بھاگ نکلی ہوں ورنہ کوئی نہ کوئی جان کو اٹک ہی جاتا ہے۔ بے شک میں بہت سوشل ہوں لیکن کبھی کبھی تو بندے کا اکیلے رہنے کا بھی دل چاہتا ہے، خصوصاً شاپنگ میں اکیلے کسی کے عمل دخل کے بغیر کرنا پسند کرتی ہوں۔" وہ جس لیول کی عورت تھی، ایک سیکیورٹی ایجنسی کے منیجر کی حیثیت سے ذیشان اس کے سامنے کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا اس لیے صاف لفظوں میں بہت کچھ جتا گئی۔

"اوہ..." اس کی بات سن کر ذیشان نے افسردگی سے چہرہ لٹکا لیا۔ "میں تو خوش ہو گیا تھا کہ اگر آپ یہاں شاپنگ کر رہی ہیں تو میری بھی تھوڑی سی ہیلپ کر دیں گی۔ اصل میں، میں اپنی سسٹر کے لیے کوئی اچھا ڈریس خریدنے کے لیے آیا تھا۔ آپ کو دیکھ کر میں نے سوچا کہ ایک خاتون کی پسند مجھ سے بہتر ہوگی۔" موہنی کا موڈ دیکھنے کے باوجود اس نے کوشش کی کہ کسی طرح اس کے قریب رہنے کا موقع نکال سکے۔

"سوری مسٹر! ایک تو میرے پاس خود اپنی شاپنگ کے لیے زیادہ وقت نہیں ہے اس لیے آپ کی ہیلپ کرنا میرے لیے مشکل ہے۔ دوسرے میرا اندازہ ہے کہ میرے اور آپ کی سسٹر کے ٹیسٹ میں بہت فرق ہوگا۔ مجھ جیسی ماڈرن لڑکی کے لیے کسی گھریلو خاتون کے ڈریس کی خریداری میں مدد دینا کسی طور ممکن نہیں ہے۔" اس نے صاف انکار کیا۔ اب ذیشان کے لیے ممکن نہیں تھا کہ مزید اصرار کر سکتا چنانچہ "بہت بے آبرو ہو کر تیرے کوچے سے ہم نکلے" کی تفسیر بنے اس سے رخصت لینا ہی مناسب سمجھا۔

"ٹھیک ہے موہنی جی! جیسی آپ کی خوشی۔ آپ آرام سے اپنی شاپنگ کیجیے، میں بھی کچھ نہ کچھ لے ہی لوں گا۔" مایوسی کا اظہار کرتے ہوئے وہ وہاں سے چل پڑا اور اس حد تک دور ہٹ گیا کہ موہنی کو نظر نہ آ سکے لیکن حقیقتاً اب بھی اس کی نظریں موہنی کی نگرانی کر رہی تھیں اور وہ نیا لائحہ عمل طے کر رہا تھا۔ اصل میں اس نے طے کر لیا تھا کہ اب موہنی کو مزید ڈھیل دینا مناسب نہیں ہے اس لیے آج اسے اغوا کرنے کا سوچ کر ہی روانہ ہوا تھا۔ اس کا پروگرام تھا کہ کسی بہانے موہنی کے ساتھ نتھی ہو جائے گا اور ادھر اس کے آدمی پارکنگ میں کھڑی موہنی کی گاڑی میں کوئی خرابی پیدا کر دیں گے۔ موہنی کے ساتھ ہونے کی صورت میں وہ اس کے ساتھ ہی پارکنگ تک پہنچتا اور جب وہ گاڑی کی خرابی کی وجہ سے اسے اسٹارٹ کرنے میں ناکام رہتی تو وہ فوری طور پر اسے لفٹ کی پیشکش کر دیتا۔ اس طرح بغیر کسی ہنگامے کے بہت آسانی اور خاموشی سے اس کا اغوا عمل میں آ جاتا لیکن موہنی نے تو پروں پر پانی ہی نہیں پڑنے دیا تھا اور کسی صورت اسے اپنے ساتھ رکھنے کے لیے تیار نہیں ہوئی تھی۔ موجودہ صورتِ حال میں اسے نئی حکمت عملی سے کام لینا تھا۔ ہنگامی بنیادوں پر کام کرنے کے عادی اس کے دماغ نے فوراً ہی متبادل حل سوچ لیا اور وہ باہر موجود اپنے آدمیوں کو کوڈ ورڈ میں احکامات جاری کرنے لگا۔

اس دوران بھی اس کی نظریں موہنی سے نہیں ہٹی تھیں اور وہ اسے مسلسل نظر میں رکھے ہوئے تھا۔ اس لیے یہ بات نوٹ کی تھی کہ پے در پے کئی ملبوسات دیکھنے کے باوجود ابھی تک اس نے کسی کا انتخاب نہیں کیا تھا۔ اس کے باوجود وہ ایک مخصوص حصے سے باہر نہیں نکل رہی تھی اور بار بار انھی ملبوسات کو الٹ پلٹ کر دیکھنے میں مصروف تھی۔ حالانکہ چاہیے تو یہ تھا کہ اگر اسے یہاں کچھ پسند نہیں آ رہا تھا تو وہ کسی اور پورشن کا رخ کر لیتی۔ اتنے بڑے شاپنگ سینٹر میں یہ واحد جگہ نہیں تھی جہاں زنانہ ملبوسات دستیاب تھے اور بھی کئی جگہ اس سے اچھی ورائٹی موجود تھی لیکن جب سے شاپنگ سینٹر پہنچی تھی، ایک خاص حصے تک ہی محدود تھی۔ اگلے دو تین منٹوں میں اس کی یہ الجھن بھی سلجھ گئی۔ وہ درمیانی عمر کا جینز اور ٹی شرٹ میں ملبوس ایک آدمی تھا جو بظاہر وہاں خریداری کی غرض سے ہی آیا تھا لیکن جب وہ اس اسٹینڈ پر پہنچا جہاں

موہنی ملبوسات دیکھ رہی تھی تو اس نے موہنی سے کچھ کہا۔ موہنی نے مسکرا کر اسے جواب دیا۔ اس آدمی کے وہاں پہنچتے ہی اس کے چہرے پر موجود کوفت بھرے تاثرات غائب ہو گئے تھے اور ان کی جگہ اطمینان نے لے لی تھی۔ موہنی کی مسکرا کر کہی بات کے جواب میں وہ ایک بار پھر کچھ بولا اور اس بار موہنی نے کچھ کہے بغیر اپنے شانے پر لٹکے اسٹائلش سے پرس کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ پرس کی زپ کھولنے کے بعد اس کا ہاتھ رینگتا ہوا اندر گیا اور پھر پرس میں سے کوئی شے نکل کر جینز والے کے ہاتھ میں منتقل ہو گئی۔ وہ کیا چیز تھی، یہ تو ذیشان نہیں دیکھ سکا لیکن اسے اس بات کا یقین ہو گیا کہ دراصل اسی شے کی منتقلی کے لیے موہنی شاپنگ کے بہانے یہاں پہنچی ہوئی تھی۔ ملاقات کا مقام طے ہوگا اس لیے وہ ایک مخصوص ایریے سے باہر نہیں نکلی تھی اور جو کچھ اسے آنے والے کو دینا تھا وہ کوڈ ورڈز کے تبادلے کے بعد دے چکی تھی۔ وہ آدمی انٹیلی جنس سے براہِ راست سی ایف پی میں آیا تھا اس لیے خاص اشیا کے تبادلے کے لیے اس قسم کا طریقہ کار اس کے لیے کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ اس نے فوراً ہی اپنے ماتحت سے رابطہ کیا۔

"نیلی جینز اور خاکی ٹی شرٹ میں ایک بندہ یہاں موجود ہے۔ اس کی ناک کی پھننگ پر ایک موٹا سا مسّا ہے۔ اس شخص پر پوری نظر رکھنی ہے اور موقع ملتے ہی قابو کر کے ہیڈ کوارٹر پہنچا دینا ہے۔ ہو سکتا ہے اس کام کے لیے تمہیں زیادہ افراد کی ضرورت پڑے اس لیے پلان نمبر دو پر کام کرنے کے لیے میں خود آرہا ہوں۔ یوسف سے کہو کہ وہ گاڑی سے باہر نکل آئے۔" اس نے صرف وقت بچانے کے لیے آپریشن کا استعمال کیا تھا ورنہ اس کے قدم تیزی سے باہر کی طرف بڑھ رہے تھے۔ بات پوری ہونے تک وہ سیڑھیاں طے کر کے نیچے پہنچ چکا تھا اور اب تقریباً بھاگتا ہوا پارکنگ کی طرف جا رہا تھا۔ اپنے ماتحت کو اس نے ہدایت کر دی تھی کہ وہ شاپنگ سینٹر کی سیڑھیوں تک آجائے تاکہ مطلوبہ شخص نظر میں آئے بغیر وہاں سے نکل نہ سکے۔ پارکنگ ایریا میں رک کر انتظار کرنے میں یہ خطرہ بھی تھا کہ ممکن ہے وہ شخص کسی سواری پر نہ آیا ہو اور پیدل ہی یہاں سے نکل جائے۔ وہ سیڑھیوں سے اتر کر پارکنگ ایریا کی طرف بڑھ رہا تھا تو اس نے اپنے ماتحت کو سیڑھیوں کے قریب دیکھ لیا تھا۔ وہ خود تیزی سے پارکنگ میں پہنچا۔ وہاں اس کا ماتحت موجود تھا۔

"وہ بلیک کرولا سرا۔" اس نے موہنی کی گاڑی کی نشاندہی کی۔ ذیشان تیزی سے آگے بڑھا اور پچھلا دروازہ کھول کر اندر داخل ہونے کے بعد اپنے جسم کو سمیٹ کر پائدان میں سما گیا۔ گاڑی کے دروازے کا لاک کھولنے کا کارنامہ یقیناً اس کے کسی ماتحت نے ہی انجام دیا تھا۔ پہلے ان کا پروگرام یہ تھا کہ اس کا کوئی ماتحت موہنی کی گاڑی میں چھپ جائے گا اور موقع دیکھ کر راستے میں اسے قابو میں کر لے گا۔ باقی لوگ الگ گاڑی میں ان کا پیچھا کرتے تاکہ کسی گڑبڑ کی صورت میں مدد کر سکیں لیکن شاپنگ سینٹر میں موہنی سے ملنے والے مشکوک شخص کے سامنے آنے کے بعد اس نے پروگرام میں تھوڑی تبدیلی کر لی تھی۔ اب وہ اکیلا موہنی کو قابو میں کرتا جبکہ اس کے ساتھی اس دوسرے آدمی سے نمٹتے۔ پائدان میں پڑا وہ پوری طرح سے چوکنا تھا اور موہنی کی آمد کا انتظار کر رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ جلد ہی آجائے گی کیونکہ اس کے اندازے کے مطابق وہ جس مقصد کے تحت شاپنگ سینٹر آئی تھی، وہ پورا ہو چکا تھا۔

اس کا اندازہ غلط نہیں نکلا۔ چند منٹ کے انتظار کے بعد ہی اس نے گاڑی کے قریب قدموں کی آواز سنی۔ پھر یوں محسوس ہوا کہ کوئی فرنٹ ڈور کا لاک کھول رہا ہے۔ لاک کھلتے ہی اس کے نتھنوں سے وہ خوشبو ٹکرائی جو تھوڑی دیر پہلے وہ شاپنگ سینٹر میں موہنی کے وجود سے اٹھتی محسوس کر چکا تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ سنبھالنے کے بعد اس نے اطمینان سے انجن اسٹارٹ کیا اور گاڑی پارکنگ سے باہر لے آئی۔ ذیشان چپ چاپ پائدان میں دبکا رہا۔ وہ پُرہجوم جگہوں سے نکلنے سے قبل اسے نہیں چھیڑنا چاہتا تھا ورنہ ممکن تھا کہ وہ شور مچا دیتی اور خواتین کی ہمدردی میں مبتلا کچھ سورما خوامخواہ اس معاملے میں کود پڑتے۔

وہ اس قسم کی کسی الجھن سے بچنا چاہتا تھا چنانچہ انتظار کرتا رہا۔ موہنی خاصے خوش گوار موڈ میں تھی اور ٹیپ ریکارڈر پر انگریزی گانوں کا کیسٹ لگائے خود بھی ساتھ ساتھ گنگنا رہی تھی۔

"مجھے سمجھ نہیں آرہا کہ آپ جیسی خوش ذوق خاتون نے مجھ جیسے ہینڈسم آدمی کے ساتھ بے رخی کیوں برتی؟ آپ کو تو فوراً سے پیشتر مجھ سے دوستی کر لینی چاہیے تھی۔" مناسب مقام دیکھ کر وہ پائدان سے نکل کر پچھلی نشست پر براجمان ہو گیا اور شکوہ کرنے کے انداز میں بولا۔ موہنی نے اس کے بولنے سے قبل اسی وقت اس کو دیکھ لیا تھا جب وہ پائدان سے نکل کر سیٹ پر بیٹھا تھا۔ یقیناً وہ چونکی بھی تھی لیکن کمال پھرتی سے خود کو سنبھال لیا تھا اور اس کی بات سننے کے بعد اب چہرے پر ناگواری کے تاثرات سجائے اسے بیک ویو مرر میں

دیکھ رہی تھی۔

"آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا؟" اسے خاموش دیکھ کر ذیشان نے اسے چھیڑا۔

"اس طرح لفنگوں جیسی حرکتیں کرنے والے کسی شخص سے دوستی کرنا میرے لیے ممکن نہیں ہے۔" اس نے تلخ لہجے میں جواب دیا اور آواز میں مزید سختی پیدا کرتے ہوئے بولی۔ "میں گاڑی سائڈ میں کر کے روکتی ہوں۔ آپ کے حق میں بہتر ہے کہ آپ خاموشی سے نیچے اتر جائیں اور آئندہ میرے قریب آنے کی کوشش نہ کریں، ورنہ آپ کو ساری عمر کے لیے جیل کی سلاخوں کے پیچھے پہنچا دینا میرے لیے بہت آسان ہے۔"

"میں تمہاری پہنچ کو جانتا ہوں لیکن گاڑی روکنے کی کوشش مت کرنا ورنہ مجھے بھی تمہارے خوب صورت بدن میں چھید کرتے ہوئے سخت افسوس ہوگا۔" اس نے پستول کی نال اطمینان سے موہنی کے پہلو سے لگا دی۔

"اس کھلونے کی تباہ کاری سے تو تم اچھی طرح واقف ہوگی۔ اس میں سے نکلنے والی چند انچ کی گولی کئی فٹ کے انسان کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ٹھنڈا کر دیتی ہے... اور یہ تو تم بھی جانتی ہو کہ جن کے بل بوتے پر تم مجھے دھمکی دے رہی ہو ان کی ساری دلچسپی تمہارے خوش نما بدن کی گرمی تک محدود ہے۔ تم نہ رہیں تو وہ چند دن تمہارے لیے اداس رہیں گے اور پھر کسی دوسرے حسین بدن کے ساتھ مصروف ہو جائیں گے۔" وہ اس سے ایسے لہجے میں بات کر رہا تھا جیسے واقعی اس کا کوئی جنونی عاشق ہو اور اس کے دوستی سے انکار پر اسے اغوا کر کے لے جا رہا ہو مگر مقابل بھی موہنی تھی۔ سینہ طور پر تربیت یافتہ سیکرٹ ایجنٹ جو کسی طور بھی اس امکان کو رد نہیں کر سکتی تھی کہ کسی دشمن کی نظر میں آگئی ہے چنانچہ بیک ویو مرر میں اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے پوچھنے لگی۔

"کون ہو تم اور کیا چاہتے ہو؟"

"تعارف میں پہلے بھی کروا چکا ہوں اور فی الحال صرف اتنا چاہتا ہوں کہ تم میری ہدایات کے مطابق گاڑی چلاتی رہو۔" اپنے لہجے میں تبدیلی لائے بغیر ذیشان نے جواب دیا۔

"اگر تم میری قربت کے خواہش مند ہو تو میں وعدہ کرتی ہوں کہ جلد تم سے رابطہ کر کے تمہیں وقت دوں گی۔ فی الحال مجھے جانے دو۔ اگر میں واپس نہیں پہنچی تو جلد بڑے پیمانے پر میری تلاش شروع ہو جائے گی اور تم بہت بڑی مشکل میں گرفتار ہو جاؤ گے۔" وہ نرم گرم لہجے میں اسے سمجھانے لگی۔

"میں بے وقوف نہیں ہوں جو تمہارے وعدے پر اعتبار کر لوں۔ جو بھی مشکل پیش آئے گی، میں خود اس سے نمٹ لوں گا۔ تم صرف خاموشی سے میرے کہے پر عمل کرو۔ اور ہاں، اب جو چوراہا آئے، اس سے بائیں طرف گاڑی موڑ لینا۔" اس نے کسی جنونی ہی کی طرح بے لچک لہجے میں اسے جواب دیا۔ موہنی ہونٹ بھینچ کر اس کی ہدایت پر عمل کرنے لگی۔ لمحے بھر کے توقف کے بعد اس نے پینترا بدلا اور نرمی سے بولنے لگی۔

"تم واقعی ہینڈسم آدمی ہو۔ مجھے اچھے بھی لگتے ہو لیکن تم نے خود بھی دیکھا ہے کہ میرا کس لیول کے لوگوں سے ملنا جلنا ہے۔ بڑے بڑے عہدے دار اور وزرا میرے عاشق ہیں۔ میری وجہ سے وہ ایک دوسرے سے جلیس بھی ہوتے ہیں لیکن ہر ایک جانتا ہے کہ آپس میں دشمنی مول لینے کی صورت میں نقصان کسی ایک کا نہیں ہوگا۔ ان میں سے ہر ایک اتنا طاقتور ہے کہ خود ہی ٹکراؤ کا نتیجہ بھی جانتا ہے اس لیے میری وجہ سے دلوں میں بغض رکھنے کے باوجود اس بغض کو چھپا کر رکھتا ہے لیکن تمہارا معاملہ مختلف ہے۔ تم ان کی ٹکر کے آدمی نہیں ہو۔ اگر میں نے تم سے دوستی رکھی تو وہ سب کے سب تمہارے دشمن بن جائیں گے اور اس طرح سے تمہیں غائب کریں گے کہ مجھے یا تمہارے گھر والوں کو تمہارا نام و نشان نہیں ملے گا۔"

"میں جانتا ہوں اس لیے میں نے تم سے کھلے عام دوستی رکھنے کا فیصلہ تبدیل کر لیا ہے۔ اب میں تمہیں ایسی جگہ لے جاؤں گا کہ کسی کو کانوں کان بھی خبر نہیں ہو سکے گی۔ تم نے بتایا تھا نا کہ تم سب سے چھپ کر شاپنگ کے لیے نکلی ہو، یعنی کوئی نہیں جانتا کہ تم اس وقت کہاں ہو اور جب کسی کو یہ نہیں معلوم تو یہ بھی نہیں پتا چل سکتا کہ تم یہاں سے کہاں اور کس کے ساتھ گئیں۔" ذیشان نے مزے سے اسے جواب دیا۔

"پاگل مت بنو۔ وہ لوگ ہر حال میں تمہیں ڈھونڈ نکالیں گے۔" موہنی جھنجلائی۔

"ڈھونڈ نکالیں گے، تب بھی تمہارا کچھ نہیں بگڑے گا۔ وہ جو کچھ کریں گے میرے ساتھ کریں گے۔ تم آرام سے سارا بوجھ مجھ پر ڈال سکتی ہو کہ میں نے زبردستی تمہیں اغوا کیا تھا۔" اس کا اطمینان قابلِ دید تھا۔ جواباً موہنی نے عجیب حرکت کی۔ اس نے بالکل اچانک ہی گاڑی کو بریکیں لگا دیے۔ اچانک لگنے والے بریک کی وجہ سے زوردار جھٹکا لگا

اور ذیشان کا پستول اس کے پہلو سے ہٹ گیا۔ وہ کسی شیرنی کی طرح پلٹ کر اس پر جھپٹی اور اس کے پستول والے ہاتھ پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی۔ اچانک لگنے والے بریک کی وجہ سے ذیشان پہلے ہی اپنا توازن تھوڑا سا کھو چکا تھا، اس حملے کے نتیجے میں اس کے ہاتھ سے پستول نکل کر پائدان میں جا گرا۔

”اترو میری گاڑی سے باسٹرڈ ورنہ میں تمہارا بھیجا اڑا دوں گی۔“ اپنے گریبان میں ہاتھ ڈال کر ننھا سا پسٹل نکال کر اس نے ذیشان پر تانا اور غرائی۔

”گولی مت چلانا، میں اتر رہا ہوں۔“ حالات پلٹا کھا چکے تھے لیکن ذیشان نے اپنے حواس کو قابو میں رکھا اور نہایت خوف زدہ شخص کی اداکاری کرتے ہوئے بولا۔

”اگر تم نے ایک سیکنڈ کی بھی دیر کی اترنے میں تو میں گولی چلا دوں گی۔“ اسے خوف زدہ دیکھ کر وہ مزید شیر ہو گئی۔ اس وقت وہ اس انداز میں بیٹھی ہوئی تھی کہ اس کا ایک پیر گاڑی کے فرش پر تھا جبکہ دوسرے کا گھٹنا موڑ کر اس نے سیٹ پر رکھا ہوا تھا اور وہ عقبی نشست کی طرف منہ کیے ذیشان کو کور کیے ہوئے تھی۔ کسی بے انتہا خوف زدہ شخص کی اداکاری کو جاری رکھتے ہوئے ذیشان نے اس طرح حرکت کی جیسے وہ گاڑی سے اترنے والا ہو لیکن اس کی نظریں پوری طرح موہنی کو حصار میں لیے ہوئے تھیں۔ موہنی کی پسٹل پر گرفت اس کی مشاقی کو ظاہر کر رہی تھی لیکن وہ اس حد تک ہوشیار نظر نہیں آ رہی تھی جتنا اسے ایک سیکرٹ ایجنٹ کے مدمقابل ہونے کی صورت میں نظر آنا چاہیے تھا۔ وجہ صاف ظاہر تھی۔ اس نے ذیشان کو سیکرٹ ایجنٹ کے طور پر لیا ہی نہیں تھا۔ وہ اس سے ایک ایسے شخص کے طور پر نمٹ رہی تھی جو اس کے عشق میں دیوانہ ہو کر ایسی جنونی حرکت کر بیٹھا تھا اور وہ اسے اپنے لیے بہت بڑا خطرہ سمجھنے کو تیار نہیں تھی۔

ذیشان نے اس کی اس غلط فہمی کا بھرپور فائدہ اٹھایا اور اترتے اترتے پلٹ کر اس زور سے اس کے منہ پر ہاتھ مارا کہ وہ الٹ کر ڈیش بورڈ سے جا ٹکرائی۔ الٹنے سے اس کا پسٹل والا ہاتھ اوپر کی طرف ہو گیا تھا چنانچہ جھٹکا لگنے سے گولی چلی اور گاڑی کی چھت میں پیوست ہو گئی۔ موہنی نے کوشش کی کہ خود کو سنبھال کر دوسرا فائر ذیشان پر کر سکے لیکن ایک تو وہ اس پوزیشن میں گری تھی کہ سنبھلنا مشکل تھا، دوسرے ذیشان بھی برق بنا ہوا تھا۔ اس نے نہایت پھرتی سے موہنی کا پسٹل چھین کر اپنے قبضے میں کر لیا اور اس کی نال کا رخ اس کی طرف کرتے ہوئے بولا۔ ”آرام سے اٹھ کر بیٹھ جاؤ ورنہ مجھے تمہارے اس حسین بدن میں چھید کر کے کوئی دکھ نہیں ہو گا۔“

”تم کون ہو؟“ سیدھے ہو کر بیٹھتے ہوئے موہنی نے ایک بار پھر اس سے پوچھا۔ پچھلی بار اس نے یہ سوال کیا تھا تو ایسا لگتا تھا کہ صرف احتیاطاً پوچھ رہی ہو لیکن اب وہ پوری طرح اسے شک کی نگاہ سے دیکھ رہی تھی۔

”تعارف کی ایسی بھی کیا جلدی ہے، پہلے کسی مناسب جگہ پہنچ جائیں پھر ایک دوسرے کو اپنا اپنا مکمل تعارف بھی کروا دیں گے۔“ ذیشان نے طنز سے اسے جواب دیا۔

”یہ میری غلطی تھی۔ میں نے تمہیں انڈر اسٹیمیٹ کیا۔ تم وہ نہیں ہو جو خود کو ظاہر کرتے رہے۔“ وہ بڑبڑانے کے انداز میں بولی۔

”ہو تو تم بھی وہ نہیں جو خود کو ظاہر کرتی ہو۔ بہرحال فی الحال میں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا۔ ابھی تم گاڑی اسٹارٹ کرو اور یہاں سے چلو۔“ ذیشان نے بھی اب اپنا لہجہ بالکل تبدیل کر لیا تھا اور کسی محروم عاشق کی اداکاری کرنے سے گریز کر رہا تھا۔

”اگر میں تمہاری بات نہ مانوں تو...؟“ اس نے تیکھے لہجے میں سوال کیا۔

”تو اپنی مہلت کو کم کر لینے کی ذمے داری خود تمہارے اوپر ہی ہو گی۔ میں اتنا بااختیار ہوں کہ اگر اس سڑک پر کھڑے کھڑے تمہاری چمڑی بھی ادھیڑ دوں تو کوئی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اور ہاں، اس خیال میں نہ رہنا کہ تمہیں زندہ رکھنا میری مجبوری ہے۔ تم شاپنگ سینٹر میں جس شخص سے ملی تھیں، اب تک اسے میرے آدمیوں نے میرے ٹھکانے پر پہنچا دیا ہو گا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اپنے ساتھ ساتھ تمہارے بارے میں بھی ہمیں بہت کچھ بتا دے گا۔“ ذیشان نے غرائی ہوئی آواز میں اسے اس کے سوال کا جواب دیا۔

”دیکھو یقیناً تمہیں میرے بارے میں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں ایک عام سی کال گرل ہوں جو بڑے لوگوں کا دل بہلا کر اپنے لیے روزی روٹی کماتی ہے۔“ ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے اس نے اپنے بارے میں صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔

”گاڑی اسٹارٹ کرو۔ یہ ساری بکواس میں بعد میں آرام سے سن لوں گا۔“ ذیشان نے بنا کسی لچک کے اپنا حکم دہرایا۔ ناچار وہ اس کی طرف سے رخ موڑ کر گاڑی اسٹارٹ کرنے لگی۔ یہی وہ لمحہ تھا جب ذیشان نے پیروں میں پڑا اپنا

پستول اٹھایا اور اس کا بھاری دستہ موہنی کی کنپٹی پر لگا دیا۔ ضرب لگتے ہی وہ فوراً بے ہوش ہوگئی۔ ذیشان نے پھرتی سے اسے پسنجر سیٹ پر منتقل کیا اور خود اچک کر ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ اب وہ بغیر کسی الجھن میں پڑے آسانی سے موہنی کو اپنے ٹھکانے پر پہنچا سکتا تھا ورنہ اسے ہوش میں رکھنے کی صورت میں خدشہ تھا کہ وہ راستے میں کوئی نہ کوئی چال چلنے کی کوشش کرے گی۔ وہ اطمینان سے گاڑی چلاتا ہوا اس سنسان سڑک کو چھوڑ کر ٹریفک میں شامل ہوگیا۔ پسنجر سیٹ پر بے ہوش بیٹھی موہنی کو دور سے دیکھ کر یہی اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ خاتون تھک کر دوران سفر ہی سو گئی ہے۔ موہنی کو اس کی گاڑی سمیت لے کر وہ اپنے ٹھکانے پر پہنچا تو حسب توقع اس کے ساتھی شاپنگ سینٹر میں نظر آنے والے مشکوک شخص کو لے کر وہاں پہنچ چکے تھے۔ وہ بھی موہنی کی طرح بے ہوش تھا۔

''گڈ! پریشانی تو نہیں ہوئی تمہیں اسے یہاں تک لانے میں؟'' اپنے ماتحتوں کی کارکردگی کو سراہتے ہوئے اس نے ان سے پوچھا۔

''کوئی خاص نہیں سر! بس اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ اسے گھیرنے کی کوشش کی جارہی ہے اس لیے مزاحمت پر اتر آیا تھا۔ دونوں طرف سے کچھ گولیاں وغیرہ بھی چلیں لیکن ہم لوگ اسے قابو میں کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ تھوڑی سی پریشانی پولیس کی پیٹرولنگ کار کے موقع پر پہنچ جانے کی وجہ سے ہوئی۔ پولیس والوں کو ہم نے اپنا کارڈ دکھا کر جان چھڑائی، اس کے بعد باقی سب اطمینان سے ہوگیا۔'' یوسف نامی ماتحت نے اختصار کے ساتھ اسے بریفنگ دی تو وہ مسکرانے لگا۔ سی ایف پی ایک سیکیورٹی ایجنسی کے علاوہ ایسا کوئی ادارہ نہیں تھا جس کا ریکارڈ کہیں موجود ہو لیکن اس کے اہلکاروں کو تحفظ فراہم کرنے کے لیے ایسے خصوصی کارڈز دیے گئے تھے جو یہ ظاہر کرتے تھے کہ وہ ایجنسی جس سے متعلق ہیں اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کے عام اہلکار ان کے ساتھ کسی قسم کی روک ٹوک نہیں کر سکتے۔

''اس کی گاڑی کا کیا کیا؟ جامہ تلاشی وغیرہ لے لی ہے اس کی یا نہیں؟'' ذیشان نے اطمینان کے اظہار میں سر ہلاتے ہوئے پوچھا۔

''گاڑی ساتھ لائے ہیں سر! دو بندے اس کا پوسٹ مارٹم کر رہے ہیں۔ مطلب کی کوئی چیز برآمد ہوگئی تو ٹھیک ورنہ کسی ویرانے میں لے جا کر کھڑا کر دیا جائے گا۔ باقی جامہ تلاشی کے نتیجے میں اس کے پاس سے موبائل، پرس اور ایک سی ڈی برآمد ہوئی ہے۔ موبائل اور سی ڈی آپ کی ٹیبل پر پہنچا دیے گئے ہیں جبکہ پرس کا جائزہ لے لیا گیا ہے۔ اس میں صرف رقم اور ایک شناختی کارڈ موجود ہے۔ شناختی کارڈ پر بندے کی تصویر موجود ہے اور نام امداد علی لکھا ہے۔ قومیت پاکستان اور مذہب اسلام بھی درج ہے لیکن ہم نے چیک کر لیا ہے۔ موصوف کا مسلمان ہونا بے حد مشکوک ہے۔'' یوسف بولتا جارہا تھا اور اس کی پیشانی پر تفکر کی لکیریں کھنچتی جارہی تھیں۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ پکڑے جانے والے شخص کا مسلمان ہونا کس نشانی کے باعث مشکوک ٹھہرا ہوگا اور یہی اس کے لیے سب سے زیادہ تکلیف دہ بات تھی۔ اداروں میں پھیلی لاقانونیت اور بے ایمانی نے ملک دشمن عناصر کے ہاتھ مضبوط کرنے میں جو کردار ادا کیا تھا، وہ ہر سطح پر قابل مذمت تھا۔ اب تک ایسے کتنے کیس سامنے آچکے تھے جن میں غیر مسلم افراد مسلمانوں کا روپ دھار کر وطن عزیز کی جڑیں کاٹتے ہوئے ملے تھے۔ یہ سب اتنی آسانی سے اس لیے ہو جاتا تھا کہ یہاں چند ٹکوں کے عوض قومی شناختی کارڈ کا حصول چنداں مشکل نہیں تھا۔

پکڑے جانے والے شخص کے خدوخال سے تو یہی اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ کوئی بھارتی شہری ہے۔ پاکستان دشمنی میں پیش پیش رہنے والے بھارتی ایجنٹوں کو سب سے بڑا ایڈوانٹیج یہی ملتا تھا کہ ایک ہی خطے سے تعلق رکھنے کے باعث وہ آسانی سے پاکستانی معاشرے میں ضم ہو جاتے تھے اور اپنی تربیت کے بل بوتے پر آرام سے پاکستانیوں کے درمیان بیٹھ کر ہی پاکستان کی جڑیں کاٹتے رہتے تھے۔

''میں جس شکار کو اپنے ساتھ لایا ہوں اس کے اور اس کی گاڑی کے ساتھ بھی یہی سلوک کرنا ہے۔ دونوں کو الگ الگ کمروں میں پہنچا کر تھوڑی خاطر مدارت کرو۔ میں تھوڑی دیر بعد ان سے مذاکرات شروع کرتا ہوں۔'' چند لمحوں میں ذہن میں پیدا ہونے والی تکلیف دہ سوچوں نے اس کا لہجہ زہر خند کر دیا اور حکم جاری کرنے کے بعد وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اپنے دفتر کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆
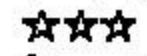
''لے ریحی! یہ کپڑے بدل کر تیار ہو جا۔ تھوڑی دیر میں ہم سب رتی کو لے کر شمشان گھاٹ چلیں گے۔'' آدھی رات سے کچھ قبل آشا کمرے میں داخل ہوئی اور بستر پر دراز جاوید علی کو مخاطب کر کے بولی۔ وہ خود ہی جاتے وقت اسے ہدایت کر کے گئی تھی کہ کچھ دیر آرام کر لو تا کہ رتی کی چتا کو آگ دینے کے وقت تازہ دم ہو۔ جاوید علی نے اس کی ہدایت پر یوں عمل کیا تھا کہ پہلی فرصت میں اٹیچڈ باتھ روم میں جا کر ہیڈ کوارٹر کو اب تک حاصل ہونے والی معلومات منتقل کرنے کے ساتھ ہی آج رات کے پروگرام سے بھی آگاہ کر دیا تھا اور پھر آرام کی غرض سے بستر پر دراز ہو گیا تھا۔ بستر بے حد آرام دہ تھا اور اس کے پاس کرنے کے لیے کوئی اور کام بھی موجود نہیں تھا چنانچہ آشا کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے اس نے آرام کرنے میں کوئی حرج نہیں سمجھا تھا لیکن وہ اتنی گہری نیند سویا تھا کہ آشا کے کمرے میں داخل ہونے سے قبل جب وہ دروازے کا ہینڈل گھما رہی تھی، اس کی آنکھ کھل گئی۔ آنکھ کھلتے ہی اس نے آشا کو ایک سیاہ لباس کے ساتھ اندر داخل ہوتے دیکھا اور اس کی زبان سے ادا ہونے والے لفظوں نے بتا دیا کہ وہ یہ لباس اسی کے لیے لے کر آئی ہے۔ شاید اسے اندازہ تھا کہ اس کے کپڑوں میں سیاہ رنگ کا کوئی لباس موجود نہیں تھا اس لیے از خود بندوبست کر دیا تھا۔

''رتی کی ڈیڈ باڈی کوٹھی پہنچ گئی ہے کیا؟'' وہ انگڑائی لیتا ہوا بستر سے اترا اور آشا سے پوچھا۔

''بس پہنچنے والی ہے۔ ابھی شالنی دیدی کے پاس فون آیا تھا کہ دس منٹ میں رتی کو یہاں پہنچا دیا جائے گا۔ سب لوگ تیار ہیں بس مجھے اور تمہیں ہی تیار ہونا ہے۔'' آشا نے اسے جواب دیا۔

''ابھی تیار ہو جاتے ہیں۔ کپڑے ہی تو بدلنے ہیں۔'' جاوید علی نے اسے تسلی دی اور اس کے ہاتھ سے لباس لے کر خود جلدی سے ملحقہ غسل خانے میں گھس گیا۔ اپنے کہے پر عمل کرتے ہوئے اس نے تیار ہونے میں پانچ منٹ سے زیادہ وقت نہیں لیا۔ آشا بھی اس دوران تیار ہو چکی تھی۔

''تو تو اس سیاہ لباس میں بھی بڑی پیاری لگ رہی ہے۔'' جاوید علی کو دیکھ کر اس نے تبصرہ کیا جس کے جواب میں لازماً اسے بھی کچھ نہ کچھ کہنا تھا اس لیے مسکراتے ہوئے لگاوٹ سے بولا۔

''تم خود کون سی کسی سے کم ہو...... سچ بولوں تو اگر میں نے تمہاری جگہ یہ بلیک پینٹ شرٹ پہن رکھا ہوتا تو ذرا اچھی نہیں لگتی۔ یہ تو بس تم ہی ہو جو مردانہ لباس میں بھی خوب جچتی ہو۔''

''کیا کروں، یہ لباس بھی میری مجبوری ہے۔ بے بی کی ڈرائیور ہوں نا اس لیے ایسے کپڑے پہننا پڑتے ہیں۔ ورنہ بے بی صاف کہتی ہے کہ میں کسی ہیجڑے کو اپنے ساتھ لے جا کر تماشا نہیں بننا چاہتی۔ زرق برق زنانہ لباس تو مجھے مشکل سے ہی پہننے کو ملتا ہے۔ ایک تو نواب صاحب خدمت کے لیے بلاتے ہیں جب اور دوسرے کسی خوشی کے موقع پر بے بی مجھے چھٹی دے دے تب۔'' آشا نے اداسی سے بتایا۔

''بے بی سے تمہاری مراد نواب صاحب کی بیٹی ہے؟'' جاوید علی نے پوچھا۔

''ہاں۔'' آشا نے سر ہلایا اور مزید بولی۔ ''اصل میں تو میں یہاں بے بی کی ڈرائیور کے طور پر ہی اپائنٹ ہوئی ہوں لیکن بے بی کوئی ہر وقت تو باہر آتی جاتی نہیں ہے اس لیے ضرورت پڑنے پر نواب صاحب مجھے دوسرے کام بھی سونپ دیتے ہیں۔ جیسے آج میں تم لوگوں کو ائیرپورٹ لینے گئی تھی۔ خود نواب صاحب کا ڈرائیور الگ ہے لیکن وہ یہاں کوٹھی میں نہیں رہتا۔ نواب صاحب کو جب کہیں جانا ہو تو اسے فون کر کے بلوا لیتے ہیں یا پھر کبھی کبھار خود بھی اپنی گاڑی ڈرائیو کر لیتے ہیں۔'' آشا نے اس کی معلومات میں مزید اضافہ کیا۔ اس موضوع پر کچھ اور بھی سوال تھے جو جاوید علی کے ذہن میں مچل رہے تھے لیکن وہ انہیں زبان پر اس لیے نہ لا سکا کہ کمرے کے باہر خاصی ہلچل محسوس ہونے لگی تھی۔ کسی نے دروازے پر دستک دے کر آشا کو آواز بھی دی تھی۔

''چلو، چلنے کا ٹائم ہو گیا ہے۔'' آشا اس کا ہاتھ تھام کر اسے کمرے سے باہر لے گئی۔ کوریڈور میں اس وقت سیاہ لباس پہنے کئی خواجہ سرا نظر آرہے تھے۔ یہ سب کے سب جوان اور خوب صورت تھے۔

''باہر گاڑی میں چل کر بیٹھو۔'' کوریڈور میں شالنی کی آواز گونجی اور وہ سب فوراً ہی متحرک ہو گئے۔ جاوید علی اور آشا بھی ان میں شامل تھے۔ باہر ایک میت بس کھڑی تھی۔ وہ لوگ بس کے قریب پہنچے تو اس میں سے نواب صاحب کو اترتے دیکھا۔ انہیں اس خواجہ سرا نے سہارا دے رکھا تھا جس نے کوٹھی آمد کے بعد ان لوگوں کا استقبال کیا تھا۔ وہ خواجہ سرا باقی سب کی طرح سیاہ لباس میں ملبوس نہیں تھا۔

''تم ہمارے ساتھ نہیں چلو گی؟'' شالنی نے قریب پہنچ کر استفسار کیا۔

''نہیں، میں نہیں جا سکوں گی۔ نواب صاحب اس وقت بہت دکھی ہیں اور انہیں تنہا چھوڑنا مناسب نہیں ہے۔'' اس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ اس کی بات ٹھیک بھی تھی۔ جاوید علی کو نواب صاحب کچھ گھنٹے قبل ہونے والی ملاقات کے مقابلے میں کہیں زیادہ مضمحل اور اداس لگ رہے تھے۔ شاید وہ میت بس میں رکھی رتی کی لاش کا آخری دیدار کرنے کے لیے یہاں تک آگئے تھے اور اسے مُردہ حالت میں دیکھ کر کچھ

زیادہ ہی دل گرفتہ ہو گئے تھے۔

"اچھی بات ہے۔ تم نواب صاحب کا دل بہلاؤ۔ ہم رتی کا کریا کرم کر کے آتے ہیں۔" شالنی نے اسے جواب دیا تو جاوید علی کو اس کا لہجہ کچھ عجیب کاٹ دار سا لگا لیکن ابھی اپنے محسوسات کی تصدیق کرنے کا موقع نہیں تھا۔ نواب صاحب کے وہاں سے نکلتے ہی ان سب کو میت بس میں بیٹھنے کا حکم دے دیا گیا تھا۔ ان سب نے ہی تیزی سے اس حکم کی تعمیل کی۔ بس کے درمیانی حصے میں ایک تابوت رکھا تھا جس میں یقینی طور پر رتی کی لاش موجود تھی۔ وہ سب خاموشی سے سیٹوں پر بیٹھ گئے۔ جاوید علی، آشا کے ساتھ ہی بیٹھا تھا لیکن اب وہ اس سے بات چیت کرنے کے بجائے منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ رہی تھی۔ باقی لوگ بھی اسے ہی کرتے ہوئے دکھائی دیے۔ اس لیے وہ دکھاوے کے لیے خود بھی وقفے وقفے سے ہونٹ ہلاتا رہا۔ بس تیزی سے اپنی سفر طے کرتی رہی۔ سی آئی ایف کے لاہور یونٹ میں شامل ہونے سے قبل جاوید علی کچھ عرصہ کراچی میں بھی رہ چکا تھا اس لیے اس کے لیے یہاں کے راستے اور علاقے اتنے اجنبی نہیں تھے۔ وہ اندازہ کر سکتا تھا کہ نواب صاحب کی کوٹھی سے روانہ ہونے والی بس اب کراچی اولڈ سٹی کی طرف رواں دواں ہے۔ بس کو ایک پستہ قد مگر صحت مند آدمی چلا رہا تھا اور اس کے علاوہ بھی چار تیم تیم افراد موجود تھے۔ ان میں سے ایک بس کے دروازے پر موجود تھا جبکہ تین نے خواجہ سراؤں سے الگ ڈرائیور کے قریب جگہ سنبھال رکھی تھی۔ بس ایم اے جناح روڈ پر پہنچی تو پولیس کی ایک پیٹرولنگ گاڑی نے اسے رکنے کا اشارہ کیا۔ ڈرائیور نے بغیر کسی حیل و حجت کے گاڑی روک دی اور پولیس والوں سے بات کرنے لگا۔ یقینی طور پر وہ انہیں یہی بتا رہا تھا کہ اندر ایک ڈیڈ باڈی موجود ہے جو کہ ایک خواجہ سرا کی ہے اور اس کے خواجہ سرا ساتھی اس کا کریا کرم کرنے شمشان گھاٹ لے جا رہے ہیں۔

ڈرائیور کی گفت و شنید کے باوجود ایک پولیس والا بس میں چڑھ آیا اور تابوت کے شیشے کے ڈھکنے میں سے جھانک کر اس بات کی تسلی کی کہ وہاں کوئی ڈیڈ باڈی موجود ہے۔ پولیس والے کے آنے اور تصدیق کر کے جانے تک سب لوگ خاموشی سے سر جھکائے بیٹھے رہے تھے۔ واحد شالنی تھی جو چوکنا نظروں سے پولیس والے کو دیکھتی رہی تھی۔ جاوید علی چوکنا انکھیوں سے اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ یہ دیکھ کر چونک گیا کہ پولیس والے کے اترتے ہی شالنی کے چہرے پر اطمینان کے تاثرات ابھر آئے ہیں۔ وہ الجھنے لگا کہ شالنی کے اس رویّے کے پیچھے کیا وجہ ہے؟ شہر کے حالات کے سبب رات کے سفر کرنے والی گاڑیوں کو روک کر پولیس کا چیکنگ کرنا اب اتنی غیر معمولی بات نہیں رہی تھی جس سے کوئی گھبراتا اور بعد میں مطمئن نظر آنے لگتا۔ ایسے تاثرات تو اسی شخص کے ہو سکتے تھے جو کسی گڑبڑ میں ملوث ہو اور جاوید علی کی چھٹی حس چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی کہ شالنی کا کردار بہت مشکوک ہے اور وہ اچھی خاصی گڑبڑ گھوٹالا چیز ہے۔

پولیس والوں سے خلاصی کے بعد گاڑی ایک بار پھر چل پڑی۔ اس بار سفر زیادہ طویل ثابت نہیں ہوا اور وہ لوگ ایک شمشان گھاٹ کے قریب پہنچ گئے۔ یہ ایک قدیم شمشان گھاٹ تھا۔ گاڑی شمشان گھاٹ پر رکی تو ڈرائیور اور اس کے ساتھی پھرتی سے حرکت میں آ گئے اور درمیان میں رکھے تابوت کو گاڑی سے نیچے اتارنے لگے۔ وہ چاروں اچھے خاصے طاقتور نظر آنے کے باوجود تابوت اتارتے ہوئے مشکل میں دکھائی دیے۔ یوں لگتا تھا کہ تابوت خاصا وزنی ہو اور انہیں اسے حرکت دینے کے لیے کافی مشقت کرنی پڑ رہی ہو لیکن بہرحال انہوں نے تابوت کو نیچے اتار لیا۔ جاوید علی اور بس میں موجود تمام خواجہ سرا شالنی کے حکم کے مطابق تابوت اتارے جانے تک اپنی اپنی جگہوں پر خاموشی سے بیٹھے رہے۔ البتہ شالنی خود بس سے نیچے اتر گئی تھی اور کسی سپروائزر کی طرح تابوت اتارنے والوں کی کارکردگی کا جائزہ لے رہی تھی۔

اس کے انداز میں واضح برتری تھی اور کہیں سے نہیں لگ رہا تھا کہ وہ ایک خواجہ سرا ہے جسے معاشرے کا سب سے زیادہ پسا ہوا اور مظلوم طبقہ سمجھا جاتا ہے۔ یہاں تو وہ ایک حکمراں محسوس ہو رہی تھی جس کے سامنے چاروں کرانڈیل مرد بس اشارے کے منتظر نظر آتے تھے۔ شالنی نے انہیں تابوت شمشان گھاٹ کے اندر لے جانے کا حکم دیا تو وہ فوراً ہی عمل پیرا ہو گئے۔ ان چاروں کے تابوت لے جانے کے بعد شالنی نے باقی خواجہ سراؤں کو اجازت دی کہ وہ بھی نیچے اتر سکتے ہیں۔ سب کے سب نہایت منظم انداز میں نیچے اتر آئے اور اسی تنظیم کا مظاہرہ کرتے ہوئے شالنی کی سربراہی میں شمشان گھاٹ میں داخل ہوئے۔ قبرستانوں اور شمشان گھاٹ وغیرہ کا جو مخصوص ماحول ہوتا ہے، اس سے گھبرا کر تو لوگ دن کے وقت بھی ایسے مقامات پر جانے سے گھبراتے ہیں۔ خصوصاً اکیلا آدمی خاصا عجیب محسوس کرتا ہے اور یہاں تو آدھی رات ہو چلی تھی۔ وہ لوگ تعداد میں کئی تھے اور ان کی آمد نے وہاں کے جامد سناٹے میں خاصی ہلچل بھی پیدا کر دی

تھی۔ اس کے باوجود وہاں موجود وحشت کا تاثر قائم تھا۔ دن میں جلائی جانے والی چتاؤں کی بو پوری طرح سے ماحول پر چھائی ہوئی تھی۔ جاوید علی کا کسی شمشان گھاٹ آنے کا یہ پہلا اتفاق تھا اس لیے اسے ہر شے اور بھی زیادہ شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔ اپنے مقابلے میں اسے باقی لوگ بالکل نارمل نظر آ رہے تھے۔ خود اس کی بھی کوشش تھی کہ اس کی ناگواری اس کے چہرے سے نہ جھلکنے پائے۔ اسے یاد رکھنا تھا کہ وہ ڈیوٹی پر تھا اور ڈیوٹی کے دوران میں تو شمشان گھاٹ کیا، مُردہ خانے میں بھی رہنا پڑتا تو وہ رہتا۔ اس نے اپنا دھیان ماحول کی وحشت سے ہٹایا اور وہاں ہونے والی کارروائی کا جائزہ لینے لگا۔

تابوت سے رتی کی لاش نکال لی گئی تھی اور اب اسے پہلے سے تیار چتا پر لٹایا جا رہا تھا۔ لاش کو چتا پر لٹائے جانے کے بعد شالنی آگے بڑھی اور اپنے ہاتھ میں موجود کھجور کی اکی سی ٹوکری میں سے گیندے اور گلاب کے پھولوں پر مشتمل بڑا سا ہار نکال کر رتی کی لاش کو پہنایا۔ دھان پان سی رتی کا سینہ اور پیٹ وغیرہ اس ہار سے ڈھک گئے۔ اس موقع پر جاوید علی کو تابوت اتارنے والوں کی محنت و مشقت یاد آ گئی۔ دھان پان سی رتی کا وزن ہی کتنا تھا کہ اس کا تابوت اتارنے والوں کو اتنی محنت کرنی پڑی۔ سوچنے کو یہ سوچا جا سکتا تھا کہ تابوت بھاری لکڑی کا بنا ہوا تھا لیکن جاوید علی نے خود جائزہ لیا تھا کہ تابوت کی لکڑی بہت زیادہ عمدہ کوالٹی کی نہیں ہے اس لیے اس کا غیر معمولی بھاری ہونا ایک معما سا تھا بلکہ ڈیڈ باڈی کو شمشان گھاٹ تک پہنچانے کے لیے تابوت کا استعمال بھی ایک طرح سے غیر ضروری تھا۔ تابوت تو عموماً وہ لوگ استعمال کرتے ہیں جو اپنے مُردوں کو تابوت سمیت قبر میں دفناتے ہیں۔ یہاں تو ایسا کوئی سلسلہ ہی نہیں تھا۔ وہ جوں جوں سوچتا جا رہا تھا، اس کے شکوک و شبہات بڑھتے جا رہے تھے۔

ادھر رتی کی آخری رسومات کی ادائیگی جاری تھی۔ خواجہ سراؤں کے مربی کی حیثیت سے شالنی کو ان میں سب سے خاص مقام حاصل تھا چنانچہ رتی کی چتا کو آگ دینے کا مقدس فریضہ اسی کے ہاتھوں انجام پایا۔ اس موقع پر جاوید علی نے وہاں موجود خواجہ سراؤں کو خاصا دکھی پایا۔ رتی کی چتا کو آگ لگتے دیکھ کر ان میں سے کئی اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ سکے تھے اور کچھ بلند آواز میں تو کچھ سسکیوں کے ساتھ رو رہے تھے۔ جاوید علی نے خود اپنے دل کو بھی اس ماحول میں بوجھل پایا۔ آگ کے شعلوں میں لپٹا وہ وجود کس کا تھا اور ان کے درمیان مذہب و معاشرت کی کیا تفریق تھی، اب یہ سب تفریق

نظر وہ اس وقت ایک انسان کی حیثیت سے دوسرے انسان کی زندگی کا سفر ختم ہونے پر اپنے دل کو آزردہ محسوس کر رہا تھا لیکن آزردگی کی اس کیفیت میں بھی وہ اپنی ڈیوٹی سے غافل نہیں تھا چنانچہ اس نے فوراً ہی نوٹ کر لیا کہ ان کے ساتھ میت گاڑی میں آنے والے چاروں مردوں نے نہایت خاموشی سے چتا سے کچھ فاصلے پر رکھا خالی تابوت اٹھایا اور وہاں سے جانے لگے۔ اب بھی ان کا انداز ایسا تھا جیسے تابوت میں خاصا وزن موجود ہو۔ ان چاروں کے حرکت میں آتے ہی اس نے شالنی کو بھی چپکے سے سب کے درمیان سے کھسکتے ہوئے دیکھا۔ وہ فوراً الرٹ ہو گیا اور خود بھی سب کے درمیان سے نکل کر خاموشی سے اس طرف چل پڑا جہاں شالنی گئی تھی۔ سوگوار خواجہ سراؤں نے ان میں سے کسی کی حرکت کو نوٹ نہیں کیا اور اپنی اپنی جگہ کھڑے رہے۔ شاید کسی نے اس حرکت کو محسوس بھی کیا ہو گا تو اس کے نزدیک اس کی وجہ جاننے کے مقابلے میں اپنی ساتھی کی جلتی چتا کے سامنے کھڑے ہو کر آنسو بہانا زیادہ اہم رہا ہو گا۔

دبے قدموں شالنی کے پیچھے جانے والے جاوید علی نے اسے کنوئیں کے قریب کھڑا دیکھ لیا۔ وہ اپنے گریبان میں ہاتھ ڈال کر موبائل فون نکال رہی تھی۔ جاوید علی کوشش کر کے بے آواز قدموں سے اس کے اتنے قریب پہنچ گیا کہ اس کی موبائل پر کی جانے والی گفتگو سن سکے۔

"ہاں بتائی ہوئی جگہ پر پہنچ گیا ہے۔ میرے آدمی صرف چالیس منٹ تک اس کی حفاظت کے لیے یہاں رہیں گے۔ اس کے بعد تم جانو اور تمہارے آدمی۔ اگر تم اس دوران یہاں پہنچ کر مال نہیں اٹھا سکے تو آگے ہم میں سے کوئی بھی ذمے دار نہیں ہو گا۔" شالنی فون پر کسی سے مخاطب تھی۔

"پروگرام کے مطابق سارا مال تابوت میں ہی ہے۔ تم میت گاڑی یا ایمبولینس لاؤ اور مزے سے اپنا مال لے جاؤ۔ اتنی چھترچھری کی کیا ضرورت ہے کہ یہ ہو گیا تو کیا ہو گا اور وہ ہو گیا تو کیا کرنا ہو گا۔ ہم نے جتنی پے منٹ لی ہے، اتنا ہی کام کریں گے نا۔" دوسری طرف سے شاید مزید تعاون کی درخواست کی گئی جس کے جواب میں شالنی نے بے مروتی کا مظاہرہ کیا لیکن پھر وہاں سے مزید کچھ کہا جانے لگا جسے سن کر شالنی نے اپنے رویّے میں ذرا سی لچک پیدا کی اور قدرے تحمل سے بولی۔

"چلو ٹھیک ہے۔ تابوت پرانے کنوئیں کے قریب ہی رکھا ہے۔ اگر تم لوگ وقت پر نہ پہنچ سکے یا کوئی اور گڑبڑ ہوئی تو میرے آدمی تابوت کو کنوئیں میں پھینک دیں گے۔ تم لوگ

بعد میں اسے لٹاتے رہنا۔ اور ہاں، یاد رکھو کہ پانچ منٹ تم مجھ سے بات چیت میں برباد کر چکے ہو اس لیے اب تمہارے پاس صرف پچیس منٹ باقی رہ گئے ہیں۔" اپنی بات مکمل کر کے شالنی نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

جاوید علی پھرتی سے لیکن بے آواز قدموں سے وہاں سے دور ہٹ گیا۔ شالنی کی یک طرفہ گفتگو سن کر ہی اس کے سارے وجود میں سنسنی کی لہریں پھیل گئی تھیں۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ اس کے شکوک و شبہات غلط نہیں تھے۔ تابوت کا بھاری پن اسی وجہ سے تھا کہ اس میں رتی کی لاش کے علاوہ بھی کچھ اور موجود تھا۔ یہ کچھ اور کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ قوی امکان اسلحے کا تھا کیونکہ ماضی میں بھی ایسی مثالیں ملتی رہی تھیں جب مجرموں نے اسلحے کی نقل و حمل کے لیے جنازوں کا سہارا لیا تھا۔ صورت حال کا تیزی سے تجزیہ کرتے ہوئے اس نے محفوظ مقام پر پہنچ کر ہیڈ کوارٹر سے رابطہ کیا اور جلدی جلدی انہیں حالات و واقعات کے ساتھ شمشان گھاٹ کی لوکیشن سے آگاہ کرنے لگا۔ اسے معلوم تھا کہ ہر گزرتا منٹ اس کے محکمے کے لوگوں کے پاس ٹھوس کارروائی کے لیے مہلت کم کرتا جا رہا ہے اس لیے کم سے کم وقت میں اختصار کے ساتھ جامع رپورٹ دے ڈالی۔

اس کام سے فارغ ہو کر اس نے اطمینان کا گہرا سانس لیا۔ اس کا کراچی آنا بیکار نہیں گیا تھا اور کراچی میں گزرنے والی پہلی شب ہی خاصی اہم ثابت ہوئی تھی۔ وہ جس ذمے داری کے ساتھ بھیجا گیا تھا، اسے اپنی استطاعت کے مطابق احسن طریقے سے پورا کر رہا تھا اور یقیناً آگے بھی اس کے لیے خاصا کام نکلنے والا تھا۔ لیکن یہ اسی صورت میں ممکن تھا کہ وہ خواجہ سراؤں کے جس گروہ میں شامل ہوا ہے، وہاں اپنی حیثیت مشکوک نہ ہونے دے، چنانچہ رپورٹ دے کر فارغ ہوتے ہی تیزی سے اس طرف رخ کیا جہاں سارے خواجہ سرا جمع رتی کی چتا کو جلتا ہوا دیکھ رہے تھے۔

"تو کہاں تھی رجنی؟" وہ ابھی اس گروہ میں شامل نہیں ہو سکا تھا کہ شالنی نے اسے پکڑ لیا۔ وہ یقینی طور پر فون کال سے فارغ ہو کر پہلے ہی وہاں پہنچ گئی تھی اور اس نے جاوید علی کی غیر موجودگی کو بھانپ لیا تھا اس لیے اب اس سے باز پرس کے لیے تیار کھڑی تھی۔

"وہ دیدی میں ذرا..." جاوید علی نے چھنگلی سے اشارہ کر کے اپنی مجبوری سے آگاہ کیا۔ کسی جگہ سے بے وقت غائب ہونے کا اس سے اچھا کوئی بہانہ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

"کوٹھی سے فارغ ہو کر نہیں نکل سکتی تھی... لے کر مجھے پریشان کر دیا۔" شالنی غصے سے بڑبڑائی لیکن ظاہر ہے اس سے زیادہ کیا کر سکتی تھی۔ اس فطری ضرورت کے آگے تو ہر انسان ہی مجبور ہوتا ہے۔ یہ موقع محل دیکھتی ہے نہ وقت و حالات۔

"چل، اب چل کر سب کے ساتھ کھڑی ہو۔ پانچ دس منٹ میں ہم یہاں سے واپس چلیں گے۔" جاوید علی کا جھکا ہوا سر اس کی شرمندگی کا اظہار تھا اس لیے شالنی نے مزید ڈانٹ پھٹکار سے گریز کرتے ہوئے جھنجلے دار لہجے میں اپنا حکم سنایا۔

"ابھی تو چتا بھی ٹھیک سے نہیں جلی دیدی! رتی کی استھیوں کا کیا ہوگا؟" جاوید علی نے جان کر اس سے پوچھا۔

"چتا جل کر ٹھنڈی ہو جائے گی تو صبح پنڈت مہاراج استھیاں جمع کر کے رکھ لیں گے۔ میں بعد میں ان سے منگوا لوں گی۔ ویسے بھی استھیوں کے لیے اتنی جلدی نہیں ہے۔ اگلے مہینے میری ایک جاننے والی آگرہ جانے والی ہے۔ میں اس کے ہاتھ سے رتی کی استھیاں گنگا میں بہانے کے لیے بھیجوں گی۔" شالنی نے جواب دیا۔

"یہ تو بہت اچھی بات ہے۔" جاوید علی نے اس کے فیصلے کو سراہا پھر لہجے کو ذرا سرسری بناتے ہوئے بولا۔ "پنڈت مہاراج چتا کو آگ دیتے سے نظر نہیں آئے۔ ان کو تو اس سمے یہاں ہونا چاہیے تھا۔"

"مہاراج کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اس لیے وہ نہیں آ سکے۔" جاوید علی کی سوال کرنے کی جسارت شالنی کو ناگوار گزری تھی اس لیے اسے ناگواری سے گھورتے ہوئے جواب دیا اور پھر قدم بڑھا کر جلتی ہوئی چتا کے گرد کھڑے خواجہ سراؤں کے نزدیک پہنچ گئی۔ وہاں پہنچ کر اس نے بہ آواز بلند ان سب کو بھی وہی بتایا جو ابھی جاوید علی کو بتا چکی تھی۔

اس کی طرف سے روانگی کا اعلان ہوتے ہی افسردہ و آبدیدہ کھڑے خواجہ سراؤں میں تحریک پیدا ہوئی اور وہ حسب حکم شمشان گھاٹ سے باہر نکلنے لگے۔ دس منٹ کے اندر اندر ان کی وہاں سے روانگی عمل میں آ چکی تھی۔ اس دوران جاوید علی گاہے بگاہے شالنی کا جائزہ لیتا جا رہا تھا۔ وہ بے چین تھی اور بار بار اپنی کلائی میں بندھی گھڑی میں وقت دیکھتی جا رہی تھی۔ میت گاڑی واپسی کے لیے روانہ ہوئی تو گویا اس نے اطمینان کا سانس لیا۔

گاڑی کو اس وقت بھی وہی شخص ڈرائیو کر رہا تھا جو یہاں آتے وقت اسے چلا کر لایا تھا۔ البتہ باقی تین آدمیوں

کا کہیں نام و نشان نہیں تھا۔ یقینی طور پر وہ تابوت میں موجود مال کی بہ حفاظت ڈلیوری کے لیے شمشان گھاٹ میں ہی رک گئے تھے۔ سی ایف پی کے ہیڈ کوارٹر میں اس کے رپورٹ کر دینے کے بعد اس بات کا امکان بہت کم تھا کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکیں۔ چشم تصور سے آگے پیش آنے والے واقعات کو دیکھتا جاوید علی متعدد خواجہ سراؤں کے ساتھ میت گاڑی میں سوار نواب نوازش علی کی کوٹھی کی طرف بڑھتا رہا جہاں ابھی اسے نامعلوم مدت کے لیے رجنی کا کردار ادا کرنا تھا۔

☆☆☆

موہنی سے شاپنگ مال میں ملنے والے مشکوک شخص سے برآمد ہونے والی سی ڈی دیکھ کر ذیشان کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ اس سی ڈی میں موہنی کے ساتھ وہی وزیر موجود تھا جس کی کوششوں سے پاکستان میں موجود بھارتی قیدیوں کی رہائی کا عمل انجام پا رہا تھا۔ چند منٹوں کی اس فلم میں موہنی اور وزیر صاحب جس حالت میں موجود تھے، وہ اتنی شرمناک تھی کہ اگر یہ فلم منظر عام پر آ جاتی تو وزیر صاحب کا برسوں کی محنت سے بنایا گیا کیریئر چند منٹوں میں تباہ ہو سکتا تھا۔ ذیشان سمجھ گیا کہ یہ اسی فلم کی ہی کرامت ہے کہ وزیر موصوف نے بھارتی قیدیوں کی رہائی میں اتنی سرگرمی دکھائی تھی اور اپنی عزت اور کیریئر بچانے کے لیے ملکی وقار و سالمیت کو داؤ پر لگانے کے لیے تیار ہو گئے تھے۔

ابھی ہوئی تھی کا ایک سرا ملنے پر وہ غصے سے کھول اٹھا اور انٹرکام اٹھا کر اپنے کسی ماتحت کو ہدایات دینے لگا۔ اس کام سے فارغ ہو کر وہ اپنے دفتر سے باہر نکلا اور اس ساؤنڈ پروف کمرے میں پہنچا جہاں موہنی کو اس کے حکم کے مطابق پوچھ گچھ کے لیے رکھا گیا تھا۔ موہنی اس کمرے کے وسط میں موجود ایک کرسی پر اس حالت میں بیٹھی ہوئی تھی کہ اس کے ہاتھ پیر مضبوط بندشوں میں جکڑے ہوئے تھے اور اس کے سر پر تیز روشنی والا بلب روشن تھا۔ ذیشان کمرے میں داخل ہوا تو اس نے فوراً ہی نوٹ کر لیا کہ موہنی کے چہرے پر فکر و پریشانی چھائی ہوئی ہے۔ اس پر نظر پڑتے ہی وہ بغور اس کا جائزہ لینے لگی۔ ذیشان بھی اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتا رہا۔

"کون ہو تم...؟" یہ سوال کرتے ہوئے موہنی کا لہجہ بہت گمبھیر تھا۔ وہ اس وقت جس ماحول میں موجود تھی، اس سے یہ اندازہ تو لگا سکتی تھی کہ وہ کسی عام شخص کی تحویل میں نہیں ہے۔ پھر اسے گاڑی میں ذیشان سے ہونے والا مقابلہ بھی یاد تھا۔ کوئی عام شخص اسے اتنی آسانی سے زیر نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اداؤں اور حسن کے بل بوتے پر مردوں کو زیر کر لینے کے ہتھیاروں سے لیس ہونے کے علاوہ لڑائی بھڑائی کے فن میں بھی خاصی ماہر تھی اور اپنے خیال کے مطابق ذیشان سے صرف اس لیے مات کھا گئی تھی کہ اسے عام شہری سمجھ کر اس کا اندازہ لگانے میں غلطی کر بیٹھی تھی۔

"تمہارا سوال اچھا ہے۔ مجھے خاصا پسند آیا ہے اس لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اس کا جواب بھی تم ہی دو گی۔ بغیر کسی بہانے بازی کے سچ سچ بتاؤ کہ تم کون ہو؟" ذیشان کا سرد لہجہ بتدریج سخت ہوتا چلا گیا۔

"تم مجھے جانتے ہو۔ ہمارا پہلے بھی تعارف ہو چکا ہے۔" موہنی نے ٹالنے کی کوشش کی۔

"محفل میں ہونے والا وہ تعارف ادھورا تھا۔ اب تم مجھے اس سی ڈی کی روشنی میں اپنا تعارف کرواؤ جو ہم نے تمہارے ساتھی سے حاصل کی ہے۔" ذیشان نے ہاتھ میں پکڑی سی ڈی اس کی نظروں کے سامنے نچائی جسے دیکھ کر پل بھر کے لیے اس کے چہرے کا رنگ اڑا لیکن پھر اس نے خود کو سنبھال لیا اور ذرا سے بے پروائی کا مظاہرہ کرتے ہوئی سخت لہجے میں بولی۔

"یہ تمہارے کام کی چیز نہیں ہے اس لیے تمہیں اس سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہیے۔"

"بکواس بند کرو اور اگر میرے بارے میں اب تک کسی غلط فہمی کا شکار ہو تو اسے بھی دور کر لو۔ میں اپنے وطن کی جڑوں کو کھوکھلا کرنے والے کسی شخص کو ذرہ برابر بھی رعایت دینے کا قائل نہیں ہوں۔" ذیشان غرایا۔

"تم یقیناً اسی وزیر کے ٹٹو ہو۔ اسی نے تمہیں اس کام پر لگایا ہوگا کہ میری نگرانی کرو اور موقع ملتے ہی مجھ سے یہ سی ڈی حاصل کر لو۔ اس کنجوس مکھی چوس نے وزارت میں رہ کر اتنا روپیا بنایا ہے لیکن اپنی ساکھ بچانے کے لیے بھی ایک ڈیڑھ کروڑ خرچ کرنے کے لیے تیار نہیں ہے اور غنڈوں سے کام لے رہا ہے۔" موہنی نے نفرت انگیز لہجے میں اس کی بات کا جواب دیا۔

"تم کیا کہہ رہی ہو، اس کی وضاحت کرو۔" اس کے جواب پر الجھ جانے والے ذیشان نے سختی سے حکم دیا۔

"وضاحت کیا کرنی ہے۔ وہ جمع دو چار کی طرح بات بالکل صاف ہے۔ میں ایک کال گرل ہوں اور ادائیں دکھا کر لوگوں کو لوٹنے کے علاوہ کوئی بہت زیادہ تگڑی پارٹی مل جانے پر اسے بلیک میلنگ کے سہارے بھی لوٹتی ہوں۔ مجھے

معلوم ہے کہ وہ بڑا دولت والا ہے۔ ملک میں جتنی پراپرٹی ہے اس سے دس گنا زیادہ مال باہر کے بینکوں میں جمع کر رکھا ہے۔ اس لیے اسے بلیک میل کرنے کی کوشش کی۔ خیال تھا کہ اپنی عزت بچانے کے لیے خاموشی سے سودے بازی کرے گا لیکن وہ تو سیانا نکلا اور غنڈوں کو میرے پیچھے لگا دیا حالانکہ میں نے اس پر ظاہر بھی نہیں ہونے دیا تھا کہ میں بھی بلیک میل کرنے والوں کے ساتھ شامل ہوں۔" وہ نہایت خوب صورتی کے ساتھ اسے ایک ایسی کہانی سنا رہی تھی جو قابل قبول ہو سکتی تھی لیکن وہ اس کی چال میں نہیں آیا اور اسے گھورتے ہوئے بولا۔

"تمہاری کہانی عمدہ ہے لیکن افسوس کہ میں کہانیاں سننے کے بجائے حقیقت جاننے میں زیادہ دلچسپی رکھتا ہوں اس لیے مجھے صاف صاف بتاؤ کہ اس ویڈیو اور بھارتی قیدیوں کی رہائی کے درمیان کیا لنک ہے؟" اس کے اتنے درست اندازے پر مشتمل سوال کو سن کر موہنی بھونچکی رہ گئی لیکن پھر بھی خود کو تیزی سے سنبھال لیا اور حیرت بھرے لہجے میں بولی۔

"تم یہ کس قسم کی باتیں کر رہے ہو؟ مجھے تو بالکل بھی کچھ سمجھ نہیں آرہا۔ میں ایک پاکستانی ہوں۔ میرے پاس پاکستان کا شناختی کارڈ اور پاسپورٹ موجود ہے۔ تم چاہو تو میرے بارے میں کہیں سے بھی تصدیق کر سکتے ہو۔ لیکن میں یہ الزام کسی صورت نہیں مانوں گی کہ تم بھارت کے ساتھ میرا تعلق جوڑنے کی کوشش کرو۔" نہایت عمدہ اداکاری کرتے ہوئے وہ اپنے حیرت بھرے لہجے میں غصے اور طیش کی آمیزش لا چکی تھی۔

"ٹھیک ہے۔ میں نے تمہیں موقع دیا تھا کہ تم بغیر تشدد کے اپنی زبان کھول دو لیکن تمہیں منظور نہیں تو مجھے بھی ملک دشمن عناصر سے کوئی ہمدردی نہیں ہے۔ اپنے اس ضدی پن کا خمیازہ تمہیں خود بھگتنا پڑے گا۔ مجھے تو بہر حال اپنے مطلوبہ نتائج سے غرض ہے۔" اس نے نہایت سرد لہجے میں موہنی سے کہا اور ابھی ابھی کمرے میں داخل ہونے والے اس شخص کی طرف متوجہ ہو گیا جو اپنے ساتھ ایک ٹرالی کھینچتا ہوا لے کر آیا تھا۔ ٹرالی میں ایک شیشے کا جار اور چھوٹی سی ٹرے رکھی ہوئی تھی۔ شیشے کے جار میں کوئی ایسا محلول موجود تھا جس سے گرم گرم بھاپیں اڑ رہی تھیں جبکہ ٹرے میں پینٹنگ میں استعمال ہونے والے مختلف برش رکھے ہوئے تھے۔

"یہ خرم ہے۔ اسے انسانی اعضا خصوصاً چہرے پر نقش و نگار بنانے کا بہت شوق ہے اور اس شوق کو پورا کرنے کے لیے یہ اپنے برش کو رنگوں کے بجائے تیزاب میں ڈبونے کا عادی ہے۔ تمہارے حسین چہرے پر کام کرنے کے لیے اس نے خصوصی طور پر گندھک کا خالص تیزاب منگوایا ہے۔ امید ہے تمہیں اس کا کام پسند آئے گا۔" وہ ٹرالی لانے والے کا نہایت دوستانہ لہجے میں موہنی سے تعارف کروانے لگا لیکن لہجے کے برعکس اس کی آنکھوں میں جو سفاکی تھی، اس نے موہنی کو جھرجھری لینے پر مجبور کر دیا۔

"پلیز! میرا یقین کرو۔ تمہیں میرے بارے میں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔" اس نے ہراساں لہجے میں ایک بار پھر اپنی صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔ اس خوف و دہشت کے عالم میں اس کا حسن کچھ اور بھی دمکنے لگا تھا لیکن ذیشان متاثر نہیں ہوا۔ وہ بس ایک بار ایجنسی پار کر نامی حسینہ کے حسن کے جال میں پھنسا تھا اور شباب و شراب کے نشے میں چور اسے اس کی مطلوبہ معلومات فراہم کر بیٹھا تھا۔ اس کے بعد اسے ایسے احساسِ شرمندگی نے گھیرا تھا کہ اب تا زندگی وہ کسی حسینہ کے جال میں پھنسنے والا نہیں تھا۔

"اپنا کام شروع کرو خرم!" موہنی کی درخواست پر کان دھرے بغیر اس نے سفاکی سے اپنے ماتحت کو حکم دیا۔ وہ کسی مشین کی طرح حرکت میں آیا اور دیوار پر لگے سوئچ پینل کی طرف ہاتھ بڑھا کر ایک بٹن دبا دیا۔ بٹن دبتے ہی موہنی کی کرسی کے عین اوپر چھت سے ایک لوہے کا شکنجہ برآمد ہوا اور اس کے سر اور گردن کو اس طرح گرفت میں لے لیا کہ وہ اپنے سر کو دائیں بائیں جنبش دینے سے بھی محروم ہو گئی۔

"میری بات سنو، ایسا مت کرو۔ میرا ایسے کسی معاملے سے تعلق نہیں ہے جس کا تم مجھ پر الزام لگا رہے ہو۔" گردن و سر کے شکنجے میں پھنستے ہی موہنی کی رنگت زرد پڑ گئی اور وہ چیخ چیخ کر اپنی بے گناہی کا یقین دلانے لگی لیکن کمرے میں موجود وہ دونوں نفوس تو ایسا لگتا تھا کہ قوتِ سماعت سے ہی محروم ہو چکے ہوں۔ ذیشان بالکل پتھرائے ہوئے چہرے کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا جبکہ مشینی انداز میں حرکت کرتا خرم ٹرالی کو موہنی کے بالکل قریب لے گیا تھا اور ٹرے میں سے اپنی پسند کا برش منتخب کر رہا تھا۔

"آؤٹ لائن کے لیے میں عام طور پر زیرو نمبر کا برش استعمال کرتا ہوں لیکن آپ اتنی حسین ہیں کہ میں آپ کے فیس پر آپ کی چوائس کے مطابق بھی کام کرنے کے لیے تیار ہوں۔" ٹرے میں سے ایک برش منتخب کر لینے کے بعد وہ موہنی سے کسی پیشہ ور مصور کی طرح مخاطب ہوا۔

"بند کرو یہ بکواس۔ دور لے جاؤ مجھ سے یہ سب کچھ۔" موہنی غصے اور دہشت سے ملی جلی آواز میں چیخی اور ٹرالی کو عملاً خود سے دور کرنے کی کوشش کی لیکن ہاتھ پاؤں جکڑے ہونے کی وجہ سے بس اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے ہی بل کھا کر رہ گئی۔

"اوکے، اگر آپ بتانا پسند نہیں کرتیں تو میں اپنی روٹین کے مطابق ہی کام کا آغاز کر دیتا ہوں۔" اس کے چیخنے کو خاطر میں لائے بغیر خرم نے نہایت آرام سے کہا، برش کو جار میں موجود محلول میں ڈبو کر موہنی کے چہرے کے قریب لے گیا۔ اس نے بے ساختہ ہی آنکھیں بند کر لیں لیکن اگلے ہی لمحے اس کی آنکھیں اور منہ دونوں ہی کھل گئے۔ چہرے کی شفاف جلد پر تیزاب میں ڈوبے برش سے پڑنے والی لکیر بہت واضح تھی اور موہنی تکلیف کے ساتھ ساتھ یقیناً اپنے حسین چہرے کے بگڑ جانے کے خوف سے بھی چلا رہی تھی۔

"پینٹنگ کی اس تکنیک کو استعمال کرنے میں اصل لطف ہی اس وقت آتا ہے جب ماڈل خوف سے چیختا ہے۔ آپ جتنی جنونی چیخیں مارتی رہیں گی میرے کام میں تیزی آتی رہے گی۔" سنجیدہ صورت خرم نے اسے آگاہ کیا اور برش کو ایک بار پھر گندھک کے تیزاب میں ڈبو کر اس کے دوسرے رخسار پر ڈھائی انچ کے قریب لکیر مار دی۔ موہنی کے حلق سے ایک بار پھر چیخیں برآمد ہو گئیں۔

"پلیز! مجھے گولی مار دو لیکن میرے ساتھ یہ ظلم نہ کرو۔" اس نے دیکھا کہ خرم کا ہاتھ تیسری بار بھی جار کی طرف بڑھ رہا ہے اور وہ اس کی چیخوں سے ذرا متاثر نہیں ہو رہا تو خود پر قابو پاتے ہوئے التجا آمیز لہجے میں بولی۔ تیزاب میں ڈوبے برش کی دو باریک سی لکیروں نے ہی اس کے سارے کس بل نکال دیے تھے اور مدہوش کر دینے والی آنکھوں کے ساغر آنسوؤں سے لبالب بھرنے کے بعد چھلک پڑے تھے۔ نمکین آنسوؤں کے قطرے رخساروں سے ڈھلک کے گزرتے، آگ کی ان دو لکیروں میں مزید جلن کا احساس پیدا کر رہے تھے۔

"گولی سے بننے والا چھید بالکل بھی آرٹسٹک نہیں ہوتا۔ کم از کم میں اتنے حسین چہرے اور جسم کے ساتھ یہ سلوک نہیں کر سکتا۔ مجھے تو برش سے کیا جانے والا کام ہی پسند ہے۔" خرم کے اطمینان میں سر مو فرق نہیں آیا اور وہ نہایت انہماک سے ایک بار پھر برش کو محلول میں ڈبونے لگا۔

"اسے روکو۔ پلیز! اسے روکو۔ یہ شخص پاگل ہو گیا ہے اور اپنے پاگل پن میں مجھے اذیت دے دے کر مار دے گا۔" خرم کی طرف سے مایوس ہو کر موہنی نے ذیشان سے رجوع کیا اور ہذیانی انداز میں چیختے ہوئے رحم کی اپیل کرنے لگی۔

"یہ شخص صرف اسی صورت میں رک سکتا ہے کہ تمہاری زبان سچ اگلنے لگے۔" ذیشان نے سرد مہری سے اس کی اپیل کا جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔ پوچھو جو پوچھنا چاہتے ہو۔" موہنی نے بالآخر ہتھیار ڈال دیے۔ کسی حسین عورت کے تشدد کا اس سے زیادہ اذیت ناک طریقہ کوئی نہیں ہو سکتا تھا کہ اس کا حسن برباد کر دیا جائے اور یہاں تو بہت ہی ہولناک ترکیب سے اس کے حسن کو داغا جا رہا تھا۔

"سب سے پہلے تو بتاؤ کہ تم کس ملک کے لیے کام کر رہی ہو؟" اسے لائن پر آتا دیکھ کر اس نے خرم کو ہاتھ سے رکنے کا اشارہ کیا اور خود سوال داغا۔ اس کا اشارہ پا کر خرم کسی معمول کی طرح ایک طرف سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ ادھر موہنی نے تھوک نگلتے ہوئے اس کے سوال کا ایک لفظی جواب دیا۔

"بھارت۔"

"اوہ..... تو را کی سورما ہو؟" ذیشان نے طنز سے پوچھا۔ جواباً وہ خاموش رہی۔

"کیا اس وزیر کے ذریعے پاکستانی اور بھارتی قیدیوں کے تبادلے کا مقصد ان دو قیدیوں کو رہا کروانا ہے جن پر بھارتی جاسوس ہونے کا شک کیا جاتا رہا ہے؟" اس نے اپنی معلومات کا اظہار کرتے ہوئے اس سے ایک ایسا سوال کیا جس کا مقصد محض اپنے اندازے کی تصدیق تھا، جواباً موہنی نے عجلت میں سر ہلا دیا۔ اس کا یہ عجلت بھرا انداز ذیشان کو کھٹکا گیا۔ اسے لگا کہ شاید وہ غلط سمت میں سوچ رہا ہے اور موہنی اس بات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اسے اسی سمت پر چلانے کی کوشش کر رہی ہے۔

"میرے پاس جو معلومات ہیں، ان کے مطابق وہ دونوں بہت پہلے جنگ ایج میں پاکستان پہنچے تھے اور یہاں پہنچتے ہی گرفتار کر لیے گئے تھے۔ دوسرے الفاظ میں وہ تمہارے ملک کے لیے کوئی قابلِ قدر کارنامہ انجام نہیں دے سکے تھے پھر تم لوگوں کو ان کی رہائی میں اتنی دلچسپی کیوں ہے؟" اس نے موہنی کو گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کٹیلے لہجے میں سوال کیا۔

"ہم اپنے دیش کی رکھشا کے لیے بلیدان دینے والوں کی قدر کرتے ہیں۔ وہ دونوں بے شک بھارت ماتا کے لیے کچھ نہیں کر سکے لیکن انہوں نے کوشش تو کی اور اس

آمد متوقع تھی۔ ذیشان فوری طور پر نمودار نہیں ہوا البتہ خرم ایک پورٹیبل میز کو کھینچتا ہوا اس کے قریب لے آیا۔ اس میز پر رکھی مشین کو دیکھ کر موہنی نے اپنے لب بھینچ لیے۔ وہ جانتی تھی کہ اس مشین کی موجودگی میں اس کے پاس جھوٹ بولنے کی گنجائش باقی نہیں رہے گی۔ اس کی کیفیت سے انجان بنا خرم نہایت مہارت سے اپنا کام کرتا رہا اور مختلف تاروں کو اس کے جسم سے اٹیچ کر دیا۔ اسی وقت ذیشان بھی کمرے میں چلا آیا اور اس کے عین سامنے موجود کرسی پر براجمان ہو گیا۔

"تو مس موہنی! آپ سچ بولنے کے لیے راضی ہیں۔ مجھے آپ کے اس عقلمندانہ فیصلے پر خوشی ہے اور مزید خوشی اس وقت ہو گی جب آپ اس پولی گراف مشین کی موجودگی کا خیال کرتے ہوئے مزید عقلمندی کا مظاہرہ کریں گی اور سچ میں جھوٹ ملانے کی کوشش نہیں کریں گی... ورنہ اس بات سے تو آپ بھی اچھی طرح واقف ہوں گی کہ یہ مشین دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کرنا خوب جانتی ہے۔ اب آپ کی زبان سے جھوٹ نکلے گا تو یہ فوراً ہی بتا دے گی۔" موہنی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتے ہوئے اس نے اسے آگاہ کرنا ضروری سمجھا۔

"مجھے سب معلوم ہے۔ تمہیں جو پوچھنا ہے پوچھو۔" وہ چڑچڑے پن سے بولی۔ دونوں رخساروں پر موجود تیز ابی لکیروں میں ہونے والی جلن سے زیادہ اس وقت وہ اپنے زیر ہونے پر جھلائی ہوئی تھی۔ لوگوں کو اپنے حسن اور اداؤں سے اشاروں پر نچانے والی کو اندازہ ہی نہیں تھا کہ کبھی وہ خود بھی زد پر آ جائے گی اور ایسے لوگوں کے درمیان پھنس جائے گی جن کے لیے اس کا حسن کوئی معنی ہی نہیں رکھتا تھا۔

"بات وہیں سے شروع کرتے ہیں۔ قیدیوں کا جو تبادلہ عمل میں آنے والا ہے اس میں ایسا کیا راز ہے جو سیاسی لیڈرز کے بجائے را کے سورماؤں کو میدان میں اترنا پڑا؟" اس وقت اس کے ذہن میں سب سے بڑی الجھن یہی تھی اس لیے اسی سوال سے آغاز کیا۔ ان دو مشکوک قیدیوں کی رہائی کے لیے اس ساری بھاگ دوڑ کے امکان کو تو اس نے خود ہی مسترد کر دیا تھا۔

"پہلی کوشش سیاسی سطح پر ہی کی گئی تھی لیکن تمہارے وزیر داخلہ فی الوقت اس معاملے میں انٹرسٹ لینے کو تیار نہیں تھے اس لیے ہمیں یہ کشٹ اٹھانا پڑا۔ اعوان صاحب کے وزیر داخلہ سمیت وزیراعظم اور آرمی چیف دونوں سے بہت اچھے تعلقات ہیں اس لیے ہم نے انہیں ٹریپ کرنے کا فیصلہ کیا اور ہماری ترکیب کامیاب بھی رہی۔ سی ڈی دیکھتے ہی اعوان صاحب کے ہوش اڑ گئے۔ انہوں نے مجھ سے کانٹیکٹ کر کے پوچھ گچھ کی تو میں نے لاعلمی کا اظہار کر کے رونا دھونا مچا دیا کہ کچھ بھی ہو، اس سی ڈی کو منظر پر نہیں آنا چاہیے ورنہ ان کے ساتھ ساتھ میں بھی برباد ہو جاؤں گی۔ انہوں نے میری بات کا یقین کر لیا اور اپنی اور میری جان بچانے کے لیے وہی کیا جو ان سے کہا گیا۔ انہوں نے ہماری توقع سے بھی زیادہ تیزی سے معاملات طے کروا دیے۔ ان سے وعدہ کیا گیا تھا کہ کام ہوتے ہی اوریجنل سی ڈی انہیں بھجوا دی جائے گی۔ سی ڈی میری کسٹڈی میں تھی اور آج میں اسے اپنے ایک مددگار ماتحت کے سپرد کرنے شاپنگ سینٹر گئی تھی جہاں تم نہ جانے کیسے میری جان سے چمٹ گئے۔" موہنی نے اسے تفصیلی جواب دیا۔

"او کے، یہ تفصیل تو ہو گئی کہ تم نے اعوان صاحب کو کس طرح قابو میں کر کے اپنا کام نکلوایا لیکن میرا اصل سوال اب بھی اپنی جگہ پر ہے۔ قیدیوں کے تبادلے کے پیچھے کون سی سازش چھپی ہوئی ہے جو را اس معاملے میں دلچسپی لے رہی ہے؟" اس نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے پوچھا۔ موہنی جو اسے باتوں باتوں میں گھمانے کی کوشش کر رہی تھی، اپنی کوشش میں ناکام ہونے پر مایوسی کا شکار نظر آئی لیکن جھوٹ بھی نہیں بول سکتی تھی چنانچہ مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق اسے اپنی زبان کھولنی پڑی۔

"قیدیوں کا یہ تبادلہ ایک خاص مقصد کے تحت کیا جا رہا ہے۔ اس مقصد کے لیے برسوں پہلے پلاننگ کر لی گئی تھی۔ اس تبادلے کا مقصد پاکستان کی قید میں موجود اپنے شہریوں کو آزادی دلوانا نہیں بلکہ بھارت کی قید میں موجود ایک پاکستانی کو پاکستان واپس پہنچانا ہے۔ اعوان سے لسٹ میں دو ایسے بھارتی قیدیوں کے نام شامل کروانا جو مشکوک ہیں، صرف ایک احتیاط تھی کہ اگر تمہاری ایجنسیاں اس معاملے میں دخل بھی دیں تو انہیں یہی شک ہو کہ ہم اپنے جاسوسوں کو چھڑوانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس صورت میں پاکستان صرف یہ کرتا کہ ان دونوں کے نام لسٹ سے خارج کر دیتا جس پر ہماری طرف سے ہلکا پھلکا ری ایکشن تو ظاہر کیا جاتا لیکن ڈیل ختم نہیں ہوتی کیونکہ ہمارا اصل مقصد کچھ اور تھا جو میں تمہیں پہلے ہی بتا چکی ہوں۔" موہنی نے بہت کچھ بتا دیا تھا پھر بھی صورت حال ابھی پوری طرح واضح نہیں تھی۔

"بھارت کو کسی مخصوص پاکستانی کو واپس پاکستان پہنچانے میں کیا دلچسپی ہے؟ مجھے اس پاکستانی کے بارے میں تفصیل بتاؤ؟" مبہم سی باتوں کی وضاحت کے لیے ابھی

کوشش میں اپنے جیون کے کئی قیمتی سال جیل کی سلاخوں کے پیچھے گزار دیے اس لیے ان کو قید سے رہائی دلوانا ہم پر قرض تھا۔" موہنی نے جذباتی لہجے میں اس کے سوال کا جواب دیا۔ اس کا یہ جذباتی پن بھی ذیشان کو مصنوعی لگا۔

"میں نہیں مان سکتا کہ تم جیوں کی قوم نے کوئی کام انسانی ہمدردی میں کیا ہو گا۔ پھر جس طرح تم لوگوں نے اس کو پھانسا وہ خاصا غور طلب ہے۔ پاکستان اور بھارت کے درمیان قیدیوں کا تبادلہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ماضی میں کئی بار یہ کام ہوتا رہا ہے۔ تم لوگ چاہتے تو ایسے کسی بھی موقع پر اپنے من پسند قیدیوں کو رہائی دلوا سکتے تھے لیکن آخر ایسی کیا ضرورت پڑی کہ ایک وزیر کو بلیک میل کر کے اچانک اس ڈیل کو طے کیا گیا؟" موہنی کے چہرے پر پیدا ہونے والی گھبراہٹ سے ظاہر تھا کہ اب وہ درست سمت میں جا رہا ہے۔

"مجھے جو کہا گیا، وہ میں نے کیا۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں جانتی۔" اس نے کنی کترانے کی کوشش کی۔

"ٹھیک ہے خرم! تم اس کے چہرے پر اپنا شوق پورا کرو۔ میں باقی معلومات اس کے پکڑے جانے والے دوسرے ساتھی سے حاصل کر لوں گا۔" اس کو تیزی سے بپھتے دیکھ کر وہ خرم سے مخاطب ہوا۔ اس کا جملہ ختم بھی نہیں ہو پایا تھا کہ بظاہر لاتعلق بنا خرم حرکت میں آ گیا۔ موہنی ہونٹ کاٹتے ہوئے اس کی حرکات کا جائزہ لینے لگی۔ اس بار اس نے نسبتاً بڑے سائز کے برش کا انتخاب کیا تھا جس کا مطلب تھا کہ اب اس کے چہرے پر پہلے کی طرح باریک لکیر کے بجائے نسبتاً موٹی لکیر ابھرے گی۔ لکیروں کی موٹائی اور گہرائی میں اضافے کا مطلب اذیت اور بدصورتی میں بھی اضافہ تھا لیکن وہ جس راز کو آشکار کرنے سے خوف زدہ تھی، وہ بھی بہت قیمتی تھا اس لیے وہ تذبذب کا شکار تھی۔

"جب تم اس پر پینٹنگ کا شوق پورا کر لو تو مجھے اطلاع کر دینا۔ میں اسے شہر کے سب سے مشہور چوک پر پھنکوا دوں گا۔ مجھے یقین ہے کہ اس کے چاہنے والوں کو اس کا نیا روپ حیران کر دے گا۔" اسے تذبذب کا شکار دیکھ کر ذیشان اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا اور خرم کو مخاطب کر کے سفاکی سے کہتا ہوا جانے کے لیے پلٹنے لگا۔

"تم راون کے چیلے ہو۔ تم میں انسانیت ہے نہ عورتوں سے برتاؤ کی تمیز۔" اسے پلٹتے دیکھ کر موہنی چیخی اور پھر ایک سانس میں اسے کئی گالیوں سے نوازنے کے بعد زور زور سے رونے لگی۔

"تم رک کیوں گئے خرم! اپنا کام شروع کرو اور اب اسی وقت رکنا جب کام مکمل ہو جائے۔" موہنی کے چیخنے چلانے کے دوران اس نے قدم آگے نہیں بڑھائے تھے۔ مغلظات بکنے کے بعد جب وہ بے بسی سے رونے لگی تو اس نے گرم لوہے پر ایک اور ضرب لگانے کے خیال سے خرم سے کہا۔ اسے اندازہ تھا کہ موہنی اندر سے ٹوٹ چکی ہے اور کسی بھی لمحے ڈھیر ہو جائے گی اس لیے اس پر نفسیاتی حربے استعمال کر رہا تھا۔ خرم اور اس کے درمیان اس وقت غضب کی انڈر اسٹینڈنگ نظر آ رہی تھی اور وہ بالکل اسی طرح عمل کر رہا تھا جیسا کہ ذیشان خواہش مند تھا۔ اس وقت بھی وہ آہستگی سے برش لہراتا ہوا موہنی کے چہرے کے قریب لے گیا اور کسی عظیم مصور کی طرح اس کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے بڑبڑایا۔

"تمہاری ناک بہت خوب صورت ہے۔ اگر میں اس کھڑی ناک کی نوک سے لے کر پیشانی پر آنکھوں کے درمیان تک ایک لکیر بناؤں اور پھر اس لکیر کے دائیں بائیں باریک لکیریں بناتا چلا جاؤں تو ایسا لگے گا کہ میں نے کسی درخت کا چاپ پینٹ کیا ہو۔"

"شٹ اپ۔ بند کرو اپنی بکواس۔" اس کے خوفناک ارادے سن کر موہنی رونا چھوڑ کر غصے اور خوف سے چیخی لیکن اب اس کی آواز میں پہلے جیسا دم خم نہیں رہا تھا۔

"سوری میڈم! میں اپنے باس کے حکم کا غلام ہوں اس لیے یا تو تم ان کی بات مان لو یا پھر اس حلیے میں آنے کے لیے تیار ہو جاؤ جس کا انہوں نے مجھے حکم دیا ہے۔" خرم پر اس کے چیخنے کا کوئی اثر نہیں ہوا اور نہایت اطمینان سے اسے آگاہ کرتے ہوئے برش کی نوک اس کی ناک کی طرف بڑھائی۔ ذیشان اس دوران کمرے سے باہر نکل چکا تھا۔

"اپنا ہاتھ دور ہٹاؤ مجھ سے اور بلاؤ اپنے ڈیول باس کو۔ میں اسے سب کچھ بتانے کے لیے تیار ہوں۔" وہ رسی جل گئی پر بل نہیں گئے کے مصداق تلملاتے ہوئے بولی تو خرم اس سے دور ہٹ گیا اور برش واپس شیشے میں رکھنے کے بعد دیوار میں نصب انٹرکام پر ذیشان کو موہنی کی رضامندی سے آگاہ کرنے لگا۔ دوسری طرف سے ذیشان نے اس سے کچھ کہا جس کے جواب میں "او کے سر" کہہ کر اس نے ریسیور رکھا اور کمرے میں اس جانب بڑھ گیا جس طرف موہنی کی پشت تھی اور وہ بری طرح جکڑی ہوئی ہونے کی وجہ سے مڑ کر نہیں دیکھ سکتی تھی کہ خرم وہاں کیا کرنے گیا ہے۔ چنانچہ دروازے پر نظریں جمائے رہی جہاں سے ذیشان بجلی

سوال کا جواب بہت ضروری تھا۔

"وہ قیدی ایک پاکستانی مچھیرا تھا جسے صرف چودہ سال کی عمر میں بھارتی سمندری حدود کی خلاف ورزی کرنے والی ایک لانچ پر سے دوسرے مچھیروں کے ساتھ گرفتار کیا گیا تھا۔ لڑکے کا نام سلیم عرف سلو ہے اور اس کی گرفتاری کو پورے پانچ سال گزر جانے کے باوجود اب بھی اس کے گھر میں اس کا انتظار ہو رہا ہے۔ پچھلے دنوں تمہارے ایک پرائیویٹ ٹی وی چینل پر اس کے متعلق ایک رپورٹ بھی دکھائی گئی تھی جس میں سلو کی ماں اور بہن روتے ہوئے حکومت پاکستان سے سلو کی رہائی کے سلسلے میں کچھ کرنے کی درخواست کر رہی تھیں۔ ہم نے سوچا تمہاری حکومت ملکی خزانے کو فارن اکاؤنٹس میں منتقل کرنے میں اتنی بری طرح مصروف ہے، سلو کی ماں بہن کی درخواست پر کہاں کان دھرے گی تو چلو ہم خود اسے رہائی دلوا دیتے ہیں۔" وہ طنزیہ اور استہزا کے ساتھ اس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے بولی۔

"اب تم مجھ سے یہ بکواس مت کرنا کہ تمہاری حکومت نے انسانی ہمدردی کی بنیاد پر سلو کی رہائی کا فیصلہ کیا ہے۔ تم اعتراف کر چکی ہو کہ جو کچھ ہو رہا ہے، اس کی پلاننگ برسوں پہلے کی جا چکی تھی۔" موہنی کے انداز گفتگو پر وہ بُری طرح تلملایا چنانچہ نہایت تلخ لہجے میں اس سے بولا۔ سوال جواب کے دوران اس کی نظر پولی گراف مشین کی طرف بھی تھی۔ وہ اگر ایک طرف اپنی تربیت یافتہ نظر سے اس کے چہرے پر سچ جھوٹ کو پرکھ رہا تھا تو دوسری طرف مشین کی موجودگی سے بھی استفادہ جاری تھا۔

"نہیں، میں یہ نہیں کہوں گی لیکن تمہیں یہ ضرور بتاؤں گی کہ سلو اب بس ظاہری شناخت کی حد تک ہی پاکستانی ہے ورنہ گزرے پانچ برسوں میں ہم اسے مکمل طور پر اپنا بنا چکے ہیں اور اب وہ پاکستان سے زیادہ بھارت ماتا کا وفادار ہے۔" اس نے فخریہ بتایا جبکہ ذیشان کا دماغ اس انکشاف پر جھنجھنا اٹھا... وہ سمجھ گیا کہ سلیم عرف سلو کے ساتھ کیا کیا گیا ہوگا۔ پانچ سال قبل صرف چودہ سال کی عمر میں گرفتار ہونے والے اس پاکستانی ماہی گیر لڑکے کو برین واشنگ اور مخصوص دواؤں کے استعمال سے ایسی شخصیت بنا دیا گیا ہوگا کہ وہ جذبۂ حب الوطنی تو کیا، انسانیت کو بھی فراموش کر چکا ہوگا اور صرف ان باتوں پر عمل کرتا جاتا ہوگا جس کا حکم اس کے زبردستی بن جانے والے آقا دیتے ہوں گے۔ بھارتیوں کا یہ ہتھکنڈا کوئی نیا نہیں تھا، اس سے قبل بھی وہ یہ ترکیب استعمال کر چکے تھے۔ وہ اب پھر اسی قسم کی ایک اور سازش سامنے آنے پر وہ سخت مشتعل ہو گیا۔ سازش کا بنیادی طریقۂ کار وہی تھا۔ ایک بار پھر پاکستان کے خلاف پاکستانی جوان کو استعمال کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ پہلے انہوں نے بھارت کی سرزمین پر دہشت گردی کا ڈراما رچا کر پاکستان کو دنیا بھر میں بدنام کرنے کی کوشش کی تھی اور اب وہ گھر کے چراغ سے گھر کو آگ لگانے کی پالیسی پر عمل پیرا تھے۔

"سلو یہاں پہنچنے کے بعد کس کے انڈر ہوگا؟" لمحوں میں بہت کچھ سوچ لینے کے بعد اس نے دانت کچکچاتے ہوئے پوچھا۔

"یہ مجھے نہیں معلوم۔ میرا کام بس یہیں تک تھا کہ میں سلو کی پاکستان واپسی کا بندوبست کر دوں۔ آگے وہ کیا کرے گا اور کس کے کہنے پر کرے گا، مجھے نہیں معلوم۔" موہنی نے صاف جواب دیا اور اس کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ سچ بول رہی ہے۔ ذیشان خود انٹیلی جنس کا بندہ تھا اور اس حقیقت کو خوب جانتا تھا کہ اس طرح کے کاموں میں موہنی جیسے افراد کو بس ایک حد تک ہی معلومات فراہم کی جاتی ہیں اور اصل مشن کو کوئی اور ہی ہینڈل کرتا ہے۔

"اوکے، تم ریسٹ کرو۔ میں دیکھتا ہوں کہ تمہارا کیا کرنا ہے۔" اس نے یک دم ہی موہنی سے سوال جواب کا سلسلہ موقوف کر دیا اور اپنی نشست سے کھڑا ہو گیا۔

"موت کے علاوہ تم مجھے کچھ نہیں دے سکتے، یہ تم بھی جانتے ہو اور میں بھی۔" وہ استہزائیہ بولی۔

ذیشان نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور باہر نکل گیا۔ کچھ دیر بعد دفتر میں خرم اس کے روبرو تھا۔

"موہنی کا کیس تمہارے حوالے ہے۔ اسے اچھی طرح کھنگال ڈالو۔ بس وقت زیادہ نہیں لینا۔ آٹھ دس گھنٹے میں اس کی لاش شہر کے کسی حصے میں ہونی چاہیے۔ لاش پھنکوانے کے بعد اس بات کا بھی انتظام کر دینا کہ باڈی پوسٹ مارٹم کے لیے جس ڈاکٹر تک پہنچے، وہ ہماری مرضی کی رپورٹ دے۔ میں چاہتا ہوں کہ موہنی کے اغوا اور موت کو ایسا رنگ دیا جائے جس سے یہ تاثر ابھرے کہ حسین اور تنہا عورت کو دیکھ کر کسی اوباش کی نیت خراب ہو گئی اور اس نے اپنا مطلب پورا کرنے کے بعد اسے قتل کر کے پھینک دیا۔"

"اوکے سر! میں سمجھ گیا۔ آپ جیسا چاہتے ہیں ویسا ہی ہوگا۔" خرم نے اعتماد کے ساتھ جواب دیا۔ سی ایف پی کا یہ جوان ایسا ہی تھا۔ پُرعزم، حوصلہ مند اور دیے ہوئے ٹاسک کو پورا کرنے کی اہلیت رکھنے والا۔

"ضمیر سے کہہ دو کہ اس دوران موانی کے ساتھی سے بھی تفتیش مکمل کر لے۔ وہ زبان کھولے گا تو موانی سے حاصل ہونے والی معلومات کی مزید تصدیق ہو جائے گی۔ لیکن خیال رکھنا کہ بندہ ایکسپائر نہیں ہونا چاہیے۔ میں نہیں چاہتا کہ موانی اور اس کی لاشیں ایک وقت میں سامنے آ کر دشمن کو ہوشیار کرنے کا سبب بنیں۔" اس نے ایک اور ہدایت اسے دی۔

"ٹھیک ہے سر!" خرم کا جواب اب بھی مختصر لیکن نیا تلا اعتماد سے بھرپور تھا۔ اس طرف سے مطمئن ہونے کے بعد ذیشان نے اسے اپنے دفتر سے جانے کی اجازت دی اور خود دیگر مصروفیات میں الجھ گیا جس میں سب سے اہم مصروفیت کرنل توحید کو موجودہ صورتِ حال سے آگاہ کرنا تھا۔

☆☆☆

"واپسی کے بارے میں آپ کا کیا پروگرام ہے سرکار! اب تو رادی ہر طرف چین ہی چین لکھ رہا ہے۔ کارخانے کی ملکیت سے انکار کا ثبوت دینے کے بعد پولیس کی مجال نہیں کہ آپ پر ہاتھ ڈال سکے اور وہ اے سی کا بچہ بھی اپنے انجام کو پہنچ گیا ہے۔ اس کی جگہ جو نیا اے سی آیا ہے، کافی ڈھنگ کا بندہ ہے۔ میں نے رواج کے مطابق اس کی آمد کے دن اے سی ہاؤس میں اس کا استقبال کیا تھا اور بہت سے تحفے تحائف بھی ساتھ لے گیا تھا۔ وہ اپنے استقبال پر بہت خوش ہوا۔ تحائف بھی اسے بہت پسند آئے۔ میں نے اسے آپ کی غیر موجودگی کی وجہ بتا کر کان میں یہ بات ڈالی تھی کہ چودھری صاحب امریکا سے واپس آ جائیں تو پھر حویلی میں اس کی شاندار دعوت کی جائے گی۔ اس نے اسی وقت دعوت قبول کرنے کی ہامی بھر لی۔ اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ بندہ اپنے مطلب کا ہے اور آگے ہمارے لیے خاصی آسانی رہے گی۔" منشی اللہ رکھا چودھری کا سب سے زیادہ سرچڑھا اور مقرب ملازم تھا اس لیے اس سے اتنی طویل بات کرنے کی جرأت رکھتا تھا۔ اس کے ذریعے چودھری کو حویلی، کاروبار اور فصل ہر شے کے بارے میں رپورٹ ملتی رہتی تھی۔

"تو ٹھیک کہہ رہا ہے منشی! پہلے کے مقابلے میں حالات اب کافی بہتر ہو گئے ہیں۔ میں آنا چاہوں تو واپس آ سکتا ہوں لیکن جانے کیوں میرا من راضی نہیں ہو رہا۔ ادھر میرے دوستوں کا بھی یہی مشورہ ہے کہ فی الحال کچھ دن نیویارک میں ہی رہوں اس لیے ابھی واپسی کا کچھ بتا نہیں سکتا تجھے۔ ویسے مجھے معلوم ہے کہ میرے پیچھے تو چنگی طرح سب سنبھال لے گا۔ نئے اے سی کی طرف سے بھی تو نے جو خبر سنائی ہے، اسے سن کر دل خوش ہو گیا ہے۔ اچھا ہے کہ بندہ اپنے مزاج کا ہے ورنہ خوامخواہ نخروں میں پڑ کر ناک میں دم کر دیا ہوتا ہے۔" چودھری نے اپنے منشی کی کارکردگی پر اعتماد کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"میری سات نسلیں آپ پر قربان چودھری صاحب! میرا تو کام ہی آپ کی خدمت ہے۔ آپ جو حکم دیں گے میں بجا لاؤں گا۔ کہیں کوتاہی ہوئی بھی تو قسمت کی خرابی سے ہوگی، میں غفلت بہرحال نہیں کر سکتا۔" منشی نے اپنی روایتی خوشامد سے کام لیتے ہوئے چودھری کو اپنی وفاداری کا یقین دلایا۔

"میں بھی یہی سوچ کر ہمیشہ تجھے چھوٹ دے دیتا ہوں ورنہ ابھی جو شہزادی والا معاملہ ہوا ہے، وہ ایسا معمولی نہیں تھا۔ بس بال بال ہی بچے ہیں سب۔ اگر وہ نکلنے میں کامیاب ہو جاتی تو سب ختم ہو جاتا۔ اس کی وجہ سے انصاری جیسے کام کے بندے سے بھی ہاتھ دھونے پڑے۔ اب نہ جانے نیا فاریسٹ آفیسر کون آتا ہے۔ اگر اپنے مطلب کا بندہ نہیں آ سکا تو وڈی مشکل پڑ جائے گی۔" منشی کو اس کی کوتاہی جتانے کے ساتھ اس نے تشویش کا بھی اظہار کیا۔

"میں اپنی غلطی تسلیم کرتا ہوں چودھری صاحب! بس میں خوامخواہ شہزادی سے ہمدردی کے چکر میں دھوکا کھا گیا۔ اصل میں اسے ڈاک بنگلے پر نوکری دلواتے ہوئے مجھے بابے کی خدمات کا خیال آ گیا تھا۔ میں نے سوچا مرنے والا اتنے عرصے تک جان ہتھیلی پر رکھ کر ہمارے کام آتا رہا، اب اس کے بیوی بچے بھوکے مر رہے ہیں تو چلو ان کی روٹی کا کوئی بندوبست کر دوں۔ مجھے کیا خبر تھی کہ نمک حرام شہزادی در پردہ اے سی سے مل بیٹھی ہے اور ہمیں فاقوں کی کہانی سنا کر خود اے سی ہاؤس سے وظیفے وصول کر رہی ہے۔" منشی کو شرمندگی کے ساتھ ساتھ شہزادی پر غصہ بھی تھا جس کا اظہار چودھری کے سامنے کرنے میں اس نے کوئی حرج نہ سمجھا۔

"چل خیر جو ہوا سو ہوا۔ آگے کے لیے احتیاط کر۔ یہ خوامخواہ کی ہمدردیاں آدمی کو ایسی ہی مہنگی پڑتی ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اگر کوئی ہمارے لیے کام کرتا ہے تو اس کی تنخواہ بھی تو لیتا ہے پھر ہم اس سے بعد میں کس لیے ہمدردی کریں؟"

"درست فرمایا چودھری صاحب! آئندہ میں ایسی غلطی دوبارہ ہرگز نہیں کروں گا۔" منشی نے چودھری کے زریں خیالات سے اتفاق کرنا ضروری سمجھا۔

"یہ چنگی گل ہے کہ تو ایک ہی واری میں سمجھ گیا ہے۔ اب ذرا خیال سے میری گل سن۔۔۔! میرے پیچھے اب سب کچھ تیرے ہی ہاتھ میں ہے۔ ادھر تیری مدد کے لیے فاریسٹ آفیسر بھی نہیں ہے اس لیے جنگل کی طرف کا خاص دھیان رکھنا۔" اس کی کوتاہی کو کمال فیاضی سے معاف کرتے ہوئے چودھری نے اسے تاکید کی۔

"ادھر کی آپ فکر نہ کریں۔ میں برابر وہاں کی دیکھ بھال کر رہا ہوں۔ پہرا بھی پہلے سے سخت کر دیا ہے۔ ویسے بھی جب تک نیا فاریسٹ آفیسر نہیں آ جاتا، جنگل اور ڈاک بنگلے میں ہمارا مکمل راج ہے۔ فاریسٹ آفیسر آ گیا تو پھر اس کے آنے کے بعد بندہ دیکھ کر ہی پلاننگ بھی کر لیں گے۔" منشی اپنی جگہ مطمئن تھا۔

"ٹھیک ہے پھر۔۔۔ تو مطمئن ہے تو تیرے کہنے پر میں بھی فکر نہیں کرتا اور کچھ دن ہور ادھر ہی رہ کر موج مستی کر لیتا ہوں۔" چودھری نے اپنی بات کے اختتام پر بلند آہنگ قہقہہ لگایا۔

"چھوٹے سرکار کو بھی خادم کا سلام بول دیں گا۔" فون بند کرنے سے پہلے منشی نے چودھری سے درخواست کی۔ وہ عقل مند آدمی تھا۔ مراد شاہ کی حویلی اور گاؤں سے عملاً بے نیازی کے باوجود یہ بات سمجھتا تھا کہ وہ مستقبل کا مالک ہے اس لیے اس کی گڈ بک میں رہنے کی کوشش کرتا تھا۔

"چنگی گل ہے۔ میں بول دوں گا۔ تو ذرا حویلی کے اندر کا بھی خیال رکھنا۔۔۔ فریدہ کی طرف سے میرا دل مطمئن نہیں رہتا۔۔۔ وہ چودھری مختیار کی بہن ہے اس لیے اس سے مجھے خطرہ ہی لگا رہتا ہے کہ جانے کب ہاتھ دکھا جائے۔" فون بند کرتے کرتے بھی اس نے منشی کو ایک اور ہدایت کر ڈالی۔

"میرا دھیان ہے اس طرف۔ آپ فکر نہ کریں۔ پچھلے دنوں نور پور سے ایک بندہ آیا تھا کہ فریدہ بی بی کو کچھ دن کے لیے میکے جانے کی اجازت دے دی جائے۔ میں نے اسے ٹال دیا کہ جب تک چودھری صاحب نہیں آ جاتے یہ ممکن نہیں ہے۔ ویسے فریدہ بی بی آرام سے رہ رہی ہے۔ اس کا زیادہ وقت تو بچے کے ساتھ ہی گزر جاتا ہے۔ تھوڑا بہت خیال سائیں بہزاد شاہ کا بھی رکھ لیتی ہے۔ ابھی تک اس کی طرف سے ایسی کوئی بات سامنے نہیں آئی ہے کہ جس کی شکایت کی جا سکے۔" منشی کے پاس یہاں بھی اپنی کارکردگی کی رپورٹ دینے کی گنجائش موجود تھی۔ چودھری مزید مطمئن ہو گیا کہ غلط بندے پر بھروسا نہیں کیا ہے۔ منشی اللہ رکھا واقعی کام کا بندہ ہے۔ اس نے فون بند کیا تو بہت ہلکا پھلکا تھا۔ فراغت اور اطمینان کے اس احساس نے اس کے اندر تفریح کی خواہش کو جگا دیا۔ اس کی پسندیدہ تفریحات میں سے سرفہرست دو تھیں۔ اول شراب، دوم شباب۔۔۔! شراب تو ہمہ وقت اس کے پاس موجود ہی رہتی تھی البتہ بیٹے کے اپارٹمنٹ میں رہ کر وہ شباب کا لطف نہیں لے سکتا تھا۔ اس کے لیے اسے باہر کا رخ کرنا پڑتا تھا۔ اس وقت موج میں آیا تو لنڈا سے رابطہ کر بیٹھا۔

"کیسے ہیں مسٹر چودھری؟ فرمایئے کیسے یاد کیا آپ نے مجھے؟" لنڈا نے فوراً ہی اس کی کال ریسیو کر لی اور خوش گوار لہجے میں پوچھنے لگی۔

"یاد تو ہم تمہیں چوبیس گھنٹے ہی کرتے رہتے ہیں لیکن فون کر کے بتانے کی کوشش اس لیے نہیں کرتے کہ تمہاری مصروفیت کا احساس ہے اور تمہیں زیادہ ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں لگتا۔" اس نے بھی جواباً خوش مزاجی کا اظہار کرتے ہوئے اس کی بات کا جواب دیا۔

"شکریہ، یہ اچھی بات ہے کہ آپ کو میرا اتنا خیال ہے۔" دوسری طرف سے لنڈا کی مسکراتی ہوئی کھنک دار آواز سنائی دی۔

"تم بھی تو ہمارا کچھ خیال کرو۔ اتنے دنوں سے میں نیویارک میں ہوں لیکن تم سے تفصیلی ملاقات ہی نہیں ہو پا رہی۔ ایسا کرتے ہیں کہ آج کسی اچھے سے ہوٹل میں ساتھ ڈنر کرتے ہیں اور پھر ایک دوسرے کے ساتھ کچھ اچھا وقت گزارتے ہیں۔" چودھری کی خواہش اس کے لفظوں سے زیادہ لہجے سے ٹپک رہی تھی۔ لنڈا فوراً ہی سنجیدہ ہو گئی۔

"سوری چودھری صاحب! فی الحال آپ سے ملاقات ممکن نہیں۔ آج کل مسٹر الفا یہاں آئے ہوئے ہیں اس لیے میں بہت مصروف ہوں۔" اس کی طرف سے صاف انکار تھما دیا گیا تھا لیکن چودھری کے لیے اس وقت اس کے انکار سے زیادہ الفا کی نیویارک میں موجودگی کی خبر اہمیت کی حامل تھی۔ اپنے اس ان دیکھے آقا سے وہ خاصا مرعوب رہتا تھا اور اس کی طرف سے اپنی حاکمانہ فطرت کو بار بار لگنے والی چوٹوں کے باوجود دل ہی دل میں یہ تسلیم کرتا تھا کہ الفا کے اندر گُر ہے کہ وہ اس جیسے شخص پر حکم چلا سکے۔

"یہ تو تم نے اچھی خبر سنائی۔ کیا مسٹر الفا مجھ سے بھی ملاقات کریں گے؟" اس نے اشتیاق سے پوچھا۔

"میں کچھ کہہ نہیں سکتی۔ وہ کیا کریں گے اور کیا نہیں، یہ خود انہی کو معلوم ہوتا ہے۔ اگر وہ ملاقات کرنا چاہیں گے تو پہلے سے انتظام کر دیں گے۔" لنڈا کا جواب محتاط تھا اور ایسا لگتا تھا کہ وہ خود بھی الفا سے خائف اور مرعوب ہے۔

"ٹھیک ہے۔ میں انتظار کروں گا۔ مسٹر الفا سے ملاقات کا بھی اور تمہاری فراغت کا بھی۔" چودھری نے خوش دلی سے جواب دے کر سلسلہ منقطع کر دیا۔ الفا کی موجودگی

میں سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ وہ لینڈا سے ملاقات پر زور دے سکتا۔ حقیقتاً اس وقت تو اس کے دل سے تفریح کا خیال ہی نکل گیا تھا اور وہ سوچ رہا تھا کہ انقا سے اگر ملاقات ہوئی تو وہ کس طرح پیش آئے گا۔ وہ لندن میں صرف ایک بار اس سے ملا تھا، وہ بھی نقاب میں۔ اس وقت بھی اس نے اس کا لینڈا کے ساتھ وقت گزارنے کا منصوبہ خاک میں ملا دیا تھا اور اب بھی وہ اس کی وجہ سے ملاقات سے انکاری ہو گئی تھی۔ یعنی انقا اس کا رقیب ثابت ہو رہا تھا اور رقیب بھی ایسا کہ وہ اس سے دوبدو مقابلہ کرنا تو دور کی بات، فون پر اس کی آواز سن کر ہی خائف ہو جاتا تھا۔ پنگوڑے سے نکلنے سے بھی پہلے حکمرانی کی لت میں مبتلا ہو جانے والے چودھری کو انقا نے عمر کے اس حصے میں زندگی کے ایک ایسے ذائقے سے آشنا کیا تھا جس کا اس نے کبھی خواب میں بھی تصور نہیں کیا تھا۔

☆☆☆

"اور بھی کیا خبریں ہیں؟" حسب معمول ذیشان موقع ملتے ہی شہریار سے ملاقات کے لیے پہنچ گیا تھا۔ شہریار کو حالات و واقعات سے آگاہ رکھنا بھی ایک طرح سے اس کی ذمے داری تھی۔ اگر وہ لوگ اس سے کوئی کام لینا چاہتے تھے تو اس کا صورت حال سے لمحہ بہ لمحہ واقف رہنا بھی ضروری تھا۔ چنانچہ دوستانہ خواہش کے علاوہ وہ اپنی پیشہ ورانہ ذمے داری نبھانے کے لیے بھی گاہے بگاہے اس سے ملتا رہتا تھا۔ خود شہریار عملاً محدود ہو جانے کی وجہ سے اس کا منتظر رہتا تھا چنانچہ اس وقت بھی مصافحے کے بعد کوئی دوسری رسمی بات کرنے کے بجائے یہ سوال کیا۔

"خبریں خاصی ہیں اور زوردار بھی ہیں۔" ذیشان نے ایک صوفے پر جگہ سنبھالتے ہوئے اسے بتایا اور پھر ملازم کو بلانے کے لیے گھنٹی کا بٹن دبانے لگا۔

"چائے کا موڈ ہو رہا ہے۔ مسلسل بھاگ دوڑ میں لگے رہنے سے بعض اوقات کھانے پینے کی بھی فرصت نہیں ملتی۔ آج بھی دوپہر کا کھانا گول ہو گیا تھا اس لیے رات کا کھانا ذرا جلدی کھا لیا۔ چائے البتہ نہیں پی تھی کہ یہاں پہنچ کر تمہارے ساتھ پیوں گا۔" ملازم کی آمد تک اس نے شہریار کو یہ کتھا سنائی اور پھر ملازم کے نمودار ہونے پر اسے چائے کا آرڈر دینے لگا۔

"کیا کارنامہ انجام دے آئے ہو؟" ملازم کے جانے کے بعد شہریار نے مسکراتے ہوئے تجسس سے پوچھا۔

"کارنامہ تو نہیں لیکن یہ ہے کہ کچھ بڑے معاملات سامنے آئے ہیں۔ تمہیں میں نے بتایا ہی تھا کہ تمہارے مشورے پر میں نے خواجہ سراؤں اور کال گرلز پر کام شروع کروا دیا ہے۔ دونوں ہی جانب کام کرنے سے خاصی پیش رفت ہوئی ہے اور بڑے بڑے انکشافات ہونے لگے ہیں۔ میرا ماتحت جاوید علی خواجہ سرا کے روپ میں ایک گروہ میں جگہ بنانے میں کامیاب ہو گیا ہے اور پہلے ہی قدم پر اس نے بہت کچھ کھوج نکالا ہے۔ یہاں سے وہ شالنی نامی ایک خواجہ سرا کے ساتھ کراچی پہنچ گیا ہے۔ کراچی میں اس کا قیام نواب نوازش علی نامی ایک عجیب و غریب شخص کی کوٹھی میں ہے۔ نوازش علی نے اپنی کوٹھی میں ہر کام کے لیے خوب صورت اور جوان خواجہ سرا بھرتی کر رکھے ہیں اور حیرت انگیز طور پر وہ سب کے سب ہندو ہیں۔ شالنی، نواب کے ہاں ملازم ایک رتی نامی خواجہ سرا کی آخری رسومات میں شرکت کے لیے لاہور سے کراچی گئی تھی۔ اس کام کے لیے آدھی رات کا وقت چنا گیا کیونکہ شالنی کے مطابق یہ خواجہ سراؤں کا رواج ہے کہ وہ دن کی روشنی میں اپنے مُردوں کا کریا کرم نہیں کرتے۔ بہرحال، جاوید علی جو کہ وہاں ریکھی بن کر رہ رہا ہے، پوری طرح چوکنا تھا اس لیے وہ یہ معلوم کرنے میں کامیاب رہا کہ رتی کو شمشان گھاٹ لے جانے کے لیے جو تابوت استعمال کیا گیا، وہ کسی خاص مقصد کے تحت استعمال کیا جا رہا ہے۔ اس نے موقع پر ہی ہیڈ کوارٹر اطلاع دی جس کے حکم پر کراچی میں موجود سی ایف پی کے یونٹ کو فوراً حرکت میں لایا گیا۔ جوانوں نے پوری تیاری کے ساتھ شمشان گھاٹ کا گھیراؤ کر کے تابوت سمیت اس کی لین دین کے لیے موجود افراد کو اپنی حراست میں لے لیا۔ تابوت کا معائنہ کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ دوہری تہ پر مشتمل تھا اور اس کے نچلے حصے میں جدید ساخت کے مہلک ہتھیار موجود تھے۔ یعنی شالنی نے اپنی ایک ساتھی کی موت کو اسلحے کی ڈیلیوری کے لیے استعمال کرنے کی کوشش کی تھی۔ جو لوگ پکڑے گئے ہیں ان سے اس معاملے میں تفتیش کی جا رہی ہے اور امید ہے کہ خاصے اہم انکشافات ہوں گے۔ شالنی پر البتہ فی الحال ہاتھ نہیں ڈالا گیا ہے اور سختی سے اس کی نگرانی کی جا رہی ہے۔ نواب نوازش علی کو بھی چیک کیا جا رہا ہے کہ اس شخص کی حقیقت کیا ہے۔ وہ اس سارے چکر میں شالنی کا شراکت دار ہے یا شالنی نے کسی طرح اسے اپنا آلۂ کار بنا رکھا ہے۔ بہرحال، یہ ایک بہت اہم معاملہ سامنے آیا ہے جس پر ہم پوری طرح نظر رکھیں گے۔ میں نے جاوید علی کو بھی ہدایت کر دی ہے کہ پوری طرح ہوشیار رہے اور خود کو بچاتے ہوئے جو کچھ معلوم کر سکتا ہے کر ڈالے۔ وہ بہت ذہین اور نڈر نوجوان ہے۔ مجھے امید ہے کہ کامیابی سے اپنے حالات سے نمٹ لے گا۔"

"یہ تو ہوئی ایک خبر جو واقعی شان دار ہے۔ اب موہنی کا قصہ بھی سنا دو۔" توجہ سے اس کی بات سنتے شہریار نے بے تابی سے پوچھا لیکن ذیشان کے جواب دینے سے قبل ملازم چائے کی ٹرے کے ساتھ آ موجود ہوا۔

"تم جاؤ، چائے ہم خود بنا لیں گے۔" ملازم نے ٹرے میز پر رکھی ہی تھی کہ شہریار نے اسے حکم دیا۔ وہ تابع داری سے حکم پر عمل کرتا فوراً باہر نکل گیا۔

"موہنی کا قصہ تو اور بھی دلچسپ اور اہم ہے۔" ذیشان نے خود ہی پیالیوں میں چائے انڈیل کر دودھ، شکر ملانے کا کام شروع کر دیا اور پھر دھیرے دھیرے اسے سارے واقعات سے باخبر کرتا چلا گیا۔

اس کی تیار کردہ چائے کے گھونٹ لیتے شہریار توجہ سے ایک ایک بات سنتا رہا۔ "موہنی کی زبان کھلوانے کے لیے تم نے ترکیب خوب لڑائی۔" ذیشان چیدہ چیدہ واقعات سنا چکا تو اس نے تحسین آمیز تبصرہ کیا۔

"عورت، خصوصاً حسین عورت کی فطرت کو سامنے رکھ کر میں نے تشدد کا وہ طریقہ سوچا تھا جو اتفاق سے کارگر رہا ورنہ یہ تو میں خود اچھی طرح جانتا ہوں کہ کسی بھی خفیہ ادارے کے ایجنٹ کی زبان کھلوانا خاصا مشکل ہوتا ہے۔ اگر میرا آدمی تیزاب سے اس کا چہرہ بگاڑنے کے بجائے ہڈیاں توڑنے بیٹھ جاتا تو وہ اتنی آسانی سے زبان نہیں کھولتی۔ پھر اس صورت میں ہمارے لیے یہ بھی مشکل ہو جاتا کہ اس کے اغوا اور موت کو خفیہ ادارے کے بجائے کسی ہوس پرست کے کھاتے میں ڈال پاتے۔ اس لیے یہ ہماری خوش نصیبی رہی کہ موہنی نے زیادہ محنت کے بغیر زبان کھول دی۔ اس کے ساتھی کی البتہ ٹھیک ٹھاک مرمت کرنی پڑی ہے، تب کہیں جا کر اس نے سچ اگلا ہے۔ اس کی بتائی تفصیلات سے موہنی کی باتوں کی تصدیق ہوئی ہے۔ ہم دو چار دن مزید اسے اپنے پاس مہمان رکھیں گے پھر باڈی ٹھکانے لگا دیں گے۔ کسی ملک دشمن کو معافی یا رعایت دینے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" ذیشان کا لہجہ بہت سخت تھا۔

"میں تم سے متفق ہوں لیکن میرا مشورہ ہے کہ اس بندے کو مروانے میں اتنی جلدی مت کرنا بلکہ کوشش کرو کہ کسی کو اس کے غائب ہونے کی خبر ہی نہ ہو سکے۔ اس کی گاڑی بھی فی الحال اپنے پاس ہی رکھو۔ اگر اس کے بعد موہنی کے ایک ساتھی غائب ہونے کی خبر ان کے اوپر والوں کو ہو گئی تو موہنی کے سلسلے میں تمہارے کری ایٹ کیے ہوئے ڈرامے کے باوجود وہ کھٹک جائیں گے کہ دونوں واقعات کے بیچ میں کوئی لنک ہے۔ اس موقع پر جبکہ دشمن کا سارا منصوبہ ہمارے سامنے ہے، اسے ہوشیار نہیں ہونا چاہیے۔ ورنہ ابھی وہ سب کچھ ختم کر دیں گے اور بعد میں ہم اندھیرے میں تیر چلائیں گے۔" اس نے اچھی طرح سوچتے ہوئے ذیشان کو مشورہ دیا۔

"بات تو تمہاری ٹھیک ہے لیکن اب جبکہ ہم بندہ اٹھا چکے ہیں کیا کیا جا سکتا ہے۔ اس کے ساتھ منسلک لوگوں کو خبر تو ہو جائے گی کہ وہ غائب ہے۔" ذیشان فکرمندی سے بولا۔

"مجھے یقین ہے کہ وہ اپنے آقاؤں سے رابطے کے لیے موبائل کے علاوہ کوئی دوسرا مواصلاتی آلہ بھی استعمال کرتا ہو گا۔ اس کی اس سلسلے میں زبان کھلوا کر آر پیس اپنے قبضے میں لو اور تمام ضروری اور ممکنہ معلومات حاصل کرنے کے بعد اپنے کسی ایسے ماتحت کو جو اس کی آواز کی نقل اتار سکے، اس کا موبائل اور آر پیس سونپ دو۔ تمہارے ماتحت کا کام یہ ہو گا کہ وہ گرفتار بندے کے آقاؤں کو یقین دلا سکے کہ موہنی کی موت کی خبر سن کر وہ خود احتیاطاً قیدیوں کے تبادلے تک منظر سے ہٹ گیا ہے اور اپنا ٹھکانا چھوڑ کر کسی دوسری خفیہ جگہ پر رہ رہا ہے۔ ایک بار قیدیوں کا تبادلہ عمل میں آ جائے تو پھر تم اس بندے کے مستقبل کا فیصلہ کر دینا۔" اس کا مشورہ بڑا صائب تھا جسے سن کر ذیشان کھل اٹھا۔

"تمہارے ساتھ کسی مسئلے کو ڈسکس کرنا کبھی رائگاں نہیں جاتا۔ واقعی ان حالات میں یہ ایک اچھی ترکیب ہے۔ میں ابھی اس سلسلے میں آرڈر کر دیتا ہوں تاکہ جب ہم موہنی کی لاش منظر پر لائیں تو ہماری یہ کارروائی پوری ہو چکی ہو۔" شہریار کی تجویز کو سراہتے ہوئے وہ فوراً ہی اپنے ہیڈ کوارٹر فون کر کے اس ماتحت کو ہدایات دینے لگا جس کے ذمے یہ کیس سونپا تھا۔

"یہ تو ہو گیا ایک کام۔ اب یہ بتاؤ کہ کیا قیدیوں کا تبادلہ خاموشی سے ہو جانے دو گے؟" ذیشان اپنے ماتحت کو ہدایات دے کر فارغ ہوا تو اس نے اس سے دریافت کیا۔

"یہ ضروری ہے۔ اب میں خود یہ چاہتا ہوں کہ سلو پاکستان پہنچ جائے کیونکہ اس وقت وہ پہنچا تو ہماری نظر میں ہو گا۔ بعد میں اگر کسی خفیہ طریقے سے پہنچایا گیا تو ہم مشکل میں پڑ جائیں گے۔"

"اس سے تو مجھے بھی انکار نہیں ہے لیکن جن دو مشکوک بھارتی قیدیوں کو یہاں سے رہا کروایا جا رہا ہے، وہ مناسب نہیں ہے۔ ان کا جانا روک دو۔" اس نے تجویز دی۔

"اس صورت میں وہ ڈیل سے انکار بھی کر سکتے ہیں اور ہمارے لیے ان قیدیوں کو رہا کروانے سے بڑھ کر سلو کو قابو میں کرنا اہم ہے۔ وہ دونوں تو بس نام کے ہی جاسوس

ہیں ورنہ سچ یہ ہے کہ وہ پاکستان کے خلاف کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے اور آتے ہی دھر لیے گئے تھے۔" ذیشان نے اسے اپنی ترجیحات سے آگاہ کیا۔

"اس بات سے تم مجھے پہلے بھی آگاہ کر چکے ہو لیکن میں جو مشورہ دے رہا ہوں، وہ کسی اور نقطہ نظر سے دے رہا ہوں۔ یہ بات سب جانتے ہیں کہ چھوٹے بڑے تمام معاملات پر ہر ملک کے خفیہ اداروں کی نظر رہتی ہے۔ پاکستان اور بھارت کے درمیان قیدیوں کا تبادلہ ہوا اور ہم نے ان کے دونوں مشکوک قیدیوں کو خاموشی سے نکل جانے دیا تو وہ کھٹک جائیں گے کہ اس خاموشی کے پیچھے کیا وجہ ہے اس لیے تھوڑی سی چھیڑ چھاڑ ضروری ہے۔ سو میں تمہیں بتا ہی چکی ہے کہ بھارت کی طرف سے اس معاملے میں رکاوٹ پر تھوڑی سی رد و کد تو ہوگی لیکن ڈیل کینسل نہیں کی جائے گی کیونکہ ان کا اصل مقصد بھی سلو کو یہاں پہنچانا ہے۔" اس نے ذیشان کو سمجھایا تو وہ گویا اچھل پڑا۔

"زبردست یار! یہ پوائنٹ تو میرے ذہن میں آیا ہی نہیں تھا۔ کرنل صاحب نے تمہیں واقعی ایک جوہری کی نظروں سے پرکھ کر منتخب کیا ہے۔ تم تو فطری طور پر خفیہ اداروں کے لیے کام کرنے کی صلاحیت رکھتے ہو۔ خوامخواہ اپنی خاندانی روایات کو برقرار رکھنے کے لیے بیوروکریسی میں چلے گئے تھے۔ تمہاری اصل جگہ تو یہیں ہمارے درمیان تھی۔" اس کی اس تعریف کے جواب میں شہریار فقط مسکرا ہی سکا، ورنہ حقیقت تو یہ تھی کہ وہ جہاں بھی تھا اس کا جذبہ ایک ہی رہا تھا۔ وہ سرتاپا وطن کی محبت سے سرشار تھا اور چاہے جہاں بھی رہتا وطن کے لیے سردھڑ کی بازی لگاتا رہتا۔

"کچھ ادھر کی خبر بھی تو دے دو۔ وہ تمہارا بندہ عمیر آفندی کیا کر رہا ہے؟" پہلے موضوع کو سمٹتے دیکھ کر اس نے ذیشان سے سوال کیا۔

"اس طرف سے تم بے فکر رہو۔ عمیر بہت اچھا جا رہا ہے۔ وہ انشاء اللہ تمہارے نقش قدم پر ہی چلے گا لیکن طریقۂ کار ذرا مختلف ہے۔ اس نے براہ راست طاقتوں سے ٹکر لینے کے بجائے دوستی کی آڑ میں ان کی جڑیں کاٹنے کی پالیسی اختیار کی ہے۔ مشابرم خان کو بھی میں نے سمجھا بجھا کر واپس ڈیوٹی پر بھیج دیا ہے۔ اس طرح اسے تمہارے غم میں گھلنے سے بھی نجات ملے گی اور عمیر کو اچھا مددگار ملنے کے ساتھ ساتھ میں بھروسے کا ایک نگران بھی حاصل رہے گا۔ میں نے مشابرم خان کو اس کی ڈیوٹی سمجھا دی ہے۔ وہ بہت دکھی ہے لیکن میری بات سمجھ کر ڈیوٹی پر چلا گیا ہے۔" ذیشان نے اسے بتایا۔

"مشابرم خان بہت مخلص بندہ ہے۔ مجھے اس کی مجھ سے محبت کا اچھی طرح اندازہ ہے۔ اگر مصلحت نہ ہوتی تو میں کبھی اسے اس دکھ میں مبتلا کرنا پسند نہیں کرتا۔ بہرحال، آہستہ آہستہ سنبھل جائے گا۔ اللہ نے آدمی کے اندر بڑی گنجائش رکھی ہے۔ جس کو وہ اپنے لیے ناقابل برداشت سمجھ رہا ہے، جب اس سے گزر جاتا ہے تو خود بھی حیران رہ جاتا ہے کہ کیسے یہ سب سہہ گیا لیکن یہ قانون قدرت بھی ہے۔ اللہ جس کو دکھ دیتا ہے تو سہنے کا حوصلہ بھی دے دیتا ہے۔ آخر مشابرم خان نے اپنے جوان بھائی کی موت اور ماں کی بیماری کا دکھ بھی تو سہہ ہی لیا تھا۔ میری جدائی کے صدمے سے بھی جلد سنبھل جائے گا۔" اس نے ذیشان کی بات سن کر دل سوزی سے ایک حقیقت پر مبنی تبصرہ کیا۔

"مجھے بھی یہی امید ہے۔ تم بتاؤ رانا صاحب اور ان کی بیگم کو تمہارا کوئی پیغام دینا ہے؟" گفتگو کا رخ خود بخود ہی ملکی معاملات سے ہٹ کر ذاتی معاملات کی طرف ہو گیا۔

"بس سلام کہہ دینا اور میری خیریت بتا دینا۔ ملاقات کی تو مجھے پتا ہے ابھی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔ میں جن تبدیلیوں سے گزر رہا ہوں، ان کی تکمیل سے پہلے خود بھی اپنے کسی آشنا سے سامنا نہیں کرنا چاہتا۔" اس کا اشارہ اپنے تبدیل شدہ حلیے کی طرف تھا۔ ذہنی اور جسمانی تربیت کے ساتھ ساتھ اس کے ظاہری حلیے میں جو مستقل تبدیلیاں کی جارہی تھیں، ان کی وجہ سے وہ خاصا بدلا ہوا لگنے لگا تھا۔ ذیشان کی وہاں مستقل آمدورفت تھی اس کے باوجود وہ تسلیم کرتا تھا کہ اس کے سامنے موجود شہریار ماضی کے شہریار سے بہت مختلف ہے۔

"ٹھیک ہے۔ میں تمہارا پیغام پہنچا دوں گا۔ اب مجھے اجازت دو۔ ابھی بہت سے معاملات اور بھی دیکھنے ہیں۔" چائے کی پیالی تو وہ کب کی خالی کر چکا تھا۔ اس سے کہتا ہوا اٹھا ہوا اور مصافحہ کر کے رخصت ہو گیا۔ اس کے جانے کے بعد بھی شہریار سوچوں میں گم بیٹھا رہا۔ اس مختصر ملاقات میں اس کے اور ذیشان کے درمیان بہت سے اہم معاملات پر گفتگو ہوئی تھی لیکن اس کا ذہن فی الحال پوری طرح سلو میں الجھا ہوا تھا جس کا خمیر اسی وطن کی مٹی سے اٹھا تھا لیکن وہ اس وطن کے لیے ایک عفریت بن کر واپس لوٹنے والا تھا۔

یہ پرپیچ و سنسنی خیز داستان جاری ہے
مزید واقعات آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں

اگر وہ زندہ رہی تو تیرے پیچھے دوسری مصیبتیں چلی آئیں گی اس لیے تیرا اس منظر سے چلے جانا ہی بہتر ہے۔" اس نے نفرت آمیز لہجے میں کہا اور شائی کی کوئی بھی بات سنے بغیر گولی فائر کر ڈالی۔ مشتعل شائی اپنے بچاؤ کے لیے جگہ سے ہل بھی نہیں سکی اور گولی سیدھی اس کے دل میں پیوست ہو گئی۔ اس کی موت کا اطمینان ہو جانے پر وہ نفرت سے تھوکتا ہوا باہر نکل گیا۔

شائی کے قتل کی خبر فوراً ہی ذیشان تک پہنچ گئی تھی۔ اگرچہ شائی اپنی دانست میں بغیر کسی کی نظروں میں آئے وہاں سے ملاقات کے لیے روانہ ہوئی تھی لیکن اس کی نگرانی پر مامور سی ایف پی کا ایک اہلکار مستقل اس کے تعاقب میں لگا رہا تھا۔ شائی کے سارے واقعے کے بعد پہلی بار وہ بھی بہت محتاط انداز میں باہر نکلنے پر وہ سمجھ گیا تھا کہ وہ کسی خاص شخص سے ملاقات کے لیے جا رہی ہے۔ اس نے فوراً دفتر فون کر کے اطلاع دی جہاں سے اس کی مدد کے لیے دوسرا شخص روانہ کرنے کا حکم دے دیا گیا۔ دوسرے شخص کو بھیجنے کا مقصد صرف اتنا تھا کہ شائی جس سے ملاقات کے لیے جا رہی ہے، اس کی بھی نگرانی کی جا سکے لیکن وہاں تو کہانی ہی کچھ اور ہو گئی۔ شائی جس مکان میں داخل ہوئی، وہاں سے باہر ہی نہیں نکلی۔ سی ایف پی کے دونوں اہلکار بے چینی سے صبر سے انتظار کرتے رہے۔ اگر انہیں غیر ضروری مداخلت سے روکا نہ گیا ہوتا تو شاید وہ مکان کے اندر گھس کر صورت حال جاننے کی کوشش کرتے لیکن ہدایات کی روشنی میں انہیں صرف نگرانی تک محدود رہنا پڑا۔ ان کے کان اس وقت کھڑے ہوئے جب انہوں نے مکان کے اندر سے فائر کی آواز سنی۔ آواز زیادہ بلند نہیں تھی لیکن بہرحال وہ اتنی اہلیت رکھتے تھے کہ فائر کی آواز کو درست طور پر شناخت کر سکتے۔

دونوں آپس میں مشورہ کرنے لگے کہ اب انہیں کیا قدم اٹھانا چاہیے۔ دونوں ہی اندر جا کر صورت حال معلوم کرنے کے حق میں تھے لیکن اس کی نوبت نہ آسکی اور ایک کار بڑی تیزی سے مکان سے برآمد ہوئی۔ کار کی اگلی نشست پر باوردی ڈرائیور موجود تھا جبکہ پچھلی نشست اونچی عمر کے خاصے رعب دار چہرے والے شخص نے سنبھال رکھی تھی۔ کار کے منظر پر آتے ہی سی ایف پی کا بعد میں آنے والا اہلکار مکان کے اندر جانے کا خیال بھول کر اس کے تعاقب میں روانہ ہو گیا کیونکہ اس کی اصل ڈیوٹی بھی یہی تھی۔ اسے اسی مقصد کے لیے وہاں بھیجا گیا تھا کہ شائی جس شخص سے ملاقات کے لیے گئی ہے اس کا تعاقب کرے۔

البتہ شائی کے تعاقب میں آنے والے نے کچھ دیر تک باہر رہنے کے بعد اندر جانے کا فیصلہ کر لیا۔

مکان کے اردگرد گھوم کر سن گن لینے سے اسے اندازہ ہو گیا کہ مکان خالی ہے اور شاید ہی وہاں کسی دوسرے شخص کی موجودگی کا امکان ہو۔ اپنے اندازے کے باوجود وہ بہت احتیاط سے مکان کے اندر داخل ہوا۔ مکان کی اندرونی حالت زیادہ اچھی نہیں تھی اور ایسا لگتا تھا کہ وہاں باقاعدگی سے صفائی وغیرہ کا کام نہ ہوتا ہو۔

ایسا اس لیے تھا کہ وہ رما وہاں مستقل نہیں رہتا تھا۔ مہینے میں صرف دو دن ایسے تھے جب وہ یہاں آیا کرتا تھا اور یہ ضروری نہیں تھا کہ وہ ان مخصوص دونوں میں بھی ضرور وہاں آئے۔ اپنی دیگر مصروفیات میں الجھ کر اکثر وہ نہیں بھی آتا تھا۔ بے چاری شائی نے تو صرف قسمت آزمائی کی تھی۔ قسمت کی خرابی سے ہی ماری گئی تھی ورنہ شاید اسے کچھ دن کی مہلت اور مل جاتی۔ عارضی طور پر استعمال ہونے والے اس مکان میں کوئی مستقل ملازم بھی موجود نہیں تھا۔ وہ جب یہاں آتا تو اس کے ساتھ آنے والا ڈرائیور ہی جھاڑ پونچھ اور تھوڑی بہت صفائی کا کام کر دیتا۔ مکان میں داخل ہونے والے سی ایف پی کے اہلکار کو وہاں داخل ہوتے ہی جس ویرانی اور بے سروسامانی کا احساس ہوا تھا، وہ اسی وجہ سے تھا۔ اپنے احساس کے باوجود وہ پھونک پھونک کر قدم اٹھاتا رہا اور بیرونی احاطے کا جائزہ لینے کے بعد اندر داخل ہوا۔ اندر کا حال باہر کی نسبت بہتر تھا۔ اسے ایک کمرا اس حالت میں نظر آیا کہ اسے ایک میز اور کرسیوں کی ترتیب سے دفتر کا تاثر دینے کی کوشش کی گئی تھی لیکن وہاں ٹیلی فون اور کمپیوٹر وغیرہ سمیت دیگر لوازمات موجود نہیں تھے۔ کسی خاتون یا مستقل ایک الماری ضرور تھی لیکن اس کے بھی زیادہ تر خانے خالی پڑے ہوئے تھے۔ آگے دو کمروں میں بھی اسے کچھ نہیں ملا لیکن تیسرا دروازہ کھولتے ہی وہ چونک گیا۔ شائی کی لاش خون کے چھوٹے سے تالاب میں پڑی صاف نظر آ رہی تھی۔ کچھ دیر پہلے اس نے اپنے ساتھی کے ساتھ فائر کی جو آواز سنی تھی وہ یقینی طور پر شائی کی زندگی کا چراغ گل کرنے کے لیے ہی کیا گیا تھا۔

اس نے نظر دوڑائی تو اسے لاش کے اردگرد کچھ نظر نہیں آیا حالانکہ اس کا ہینڈ بیگ جو یہاں آتے وقت اس کے ہاتھ میں تھا، اردگرد کہیں موجود ہونا چاہیے تھا۔ ہینڈ بیگ کی غیر موجودگی سے یہی سمجھا جا سکتا تھا کہ کچھ دیر پہلے یہاں سے فرار ہونے والے اسے بھی اپنے ساتھ لے

گئے۔ اس نے فوراً ہی ذیشان سے رابطہ کر کے اسے واقعے کی خبر دی۔

"تم وہیں رک کر انتظار کرو۔ میں کسی کو تمہاری مدد کے لیے بھیجتا ہوں۔" اس نے خبر سن کر اپنے ماتحت کو حکم دیا اور فوری طور پر دفتر میں موجود اہلکاروں میں سے چند کو ہدایات دینے لگا۔ شائی کی لاش کے پاس موجود اہلکار سے بھی پہلے اس نے اپنے اس ماتحت کی مدد کے لیے بندوبست کیا جو شائی کے قاتل کے تعاقب میں گیا تھا۔ راہنما کی آسانی کے اس دور میں یہ ذرا مشکل نہیں تھا کہ وہ اپنے اس ماتحت کی لوکیشن سے واقف نہ ہو سکے۔ اس کی یہ عقل مندی کام نہیں آئی کیونکہ وہ بہت پہلے ہی چوک گیا تھا۔ اسے شک تھا کہ شائی اپنے پیچھے کسی کو لگا کر اس مکان تک پہنچی ہوگی اس لیے فوری طور پر اس نے اسے چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا اور آج وہ خاص طور پر اس لیے وہاں موجود تھا کہ عنقریب پہنچنے والے کچھ خاص ہتھیاروں کو مکان کے تہ خانے میں بحفاظت رکھنے کے انتظامات کا جائزہ لے سکے۔ یہ کام تو انجام نہ پاسکا البتہ شائی کے وہاں پہنچنے کی وجہ سے اسے کچھ فوری فیصلے کرنے پڑے جن میں شائی کا قتل اور ہمیشہ کے لیے اس مکان سے دستبرداری شامل تھی۔

مکان سے روانہ ہوتے وقت وہ پوری طرح ہوشیار تھا اس لیے سی ایف پی کا اہلکار اپنی بے حد احتیاط کے باوجود اس کی نظروں میں آ گیا۔ اپنے اندازے کی تصدیق اور اس سے جان چھڑانے کی خاطر اس نے ڈرائیور کو گاڑی بے مقصد ادھر ادھر دوڑانے کا حکم دے ڈالا۔ تعاقب کار نے کہیں اس کا پیچھا نہیں چھوڑا لیکن اس دوران اس کا ذیشان سے رابطہ ہو چکا تھا۔ اپنے ساتھی کو اپنی لوکیشن سے لمحہ بہ لمحہ آگاہ کرتے ہوئے وہ اس وقت پیچھے ہٹ گیا جب اس کا ساتھی اس کی جگہ لینے کے لیے آ پہنچا۔ اس کے پیچھے ہٹ جانے نے بوکھلائے ہوئے مجرموں کو مطمئن کر دیا کہ انہوں نے اس سے پیچھا چھڑا لیا ہے اور وہ دوسرے اہلکار کو اپنے ساتھ چپکا کر اپنی اصل رہائش گاہ تک پہنچ گئے۔

ذیشان کو اس کی رہائش گاہ کے پتے سے آگاہ کرنے کے بعد اس کی ہدایت پر کامیاب تعاقب کرنے والا اہلکار بدستور نگرانی کا فریضہ سرانجام دیتا رہا۔ ذیشان کی زبانی اطلاع شہریار تک بھی پہنچ گئی۔ ذیشان کا خیال تھا کہ شائی کے قاتل کسی بڑے مجرم تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے تھے اور اب انہیں مستقل اس کی نگرانی کرنی چاہیے تاکہ اس کے ذریعے اس کے دوسرے ساتھیوں تک پہنچا جا سکے۔

کوٹھی میں کچھ مشکوک سرگرمیاں جاری ہیں۔

"میں نے راتوں کو یہاں اجنبی لوگوں اور گاڑیوں کو آتے جاتے دیکھا ہے۔ کاجل نے بھی اس بات کی تصدیق کی ہے لیکن ان لوگوں کی حقیقت کو وہ بھی نہیں جانتی۔ میں چاہتی تھی کہ وہ بابا کی توجہ اس طرف مبذول کروائے۔ اس نے کوشش بھی کی لیکن بابا نے اسے جھڑک دیا کہ اسے خوامخواہ وہم ہوا ہے۔ وہ خود کوٹھی میں رہتے ہیں اور انہوں نے بھی یہاں راتوں کو کسی کو آتے جاتے نہیں دیکھا۔ بابا کی اس بے خبری پر میں اور کاجل بھی حیران تھے لیکن پھر یہ راز بھی میری سمجھ میں آگیا۔ ایسی کسی بھی مشکوک کارروائی کی رات بابا کے کمرے میں لازماً کوئی نہ کوئی خوب صورت اور طرح دار خواجہ سرا موجود ہوتا ہے اور پھر بابا نشے میں اس بری طرح دھت ملتے ہیں کہ سوچا ہی نہیں جاسکتا کہ ان کے دیکھنے، سننے، سوچنے اور سمجھنے کی کوئی صلاحیت کام بھی کررہی ہوگی۔"

وہ افسردگی سے جاوید علی کو بتاتی چلی گئی جبکہ وہ بہت غور سے اس کا ہر ہر لفظ سن رہا تھا۔

"تم نے یا کاجل نے کبھی کوشش نہیں کی کہ کوٹھی میں آنے والے مشکوک افراد کی سرگرمیوں کا کھوج لگا سکو؟" جاوید علی نے اسے بغور دیکھتے ہوئے سوال کیا اور اسے واضح طور پر محسوس ہوا کہ اس کا سوال سنتے ہی شاذ مین کے چہرے پر سراسیمگی پھیل گئی ہے۔

"میں نے ایک بار کوشش کی تھی۔" وہ تھوک نگل کر خوف زدہ سے لہجے میں بس اتنا ہی بولی اور چپ ہوگئی۔

"پھر... پھر کیا ہوا؟" وہ پرجوش سا ہو کر پوچھنے لگا۔

"اس واقعے کو دہرانا میرے لیے بہت مشکل ہے۔ جب بھی آنکھوں میں وہ منظر آتا ہے، لگتا ہے کوئی مجھے ذبح کررہا ہے۔" اس نے خوف زدہ لہجے میں کہتے ہوئے آنکھیں بند کرلیں۔

"ڈرو مت۔ کوئی تمہیں کچھ نہیں کرسکتا۔ میں تمہارے پاس ہوں نا۔" جاوید علی نے کسی معصوم بچی کی طرح سہمی ہوئی شاذ مین کو حوصلہ دیا تو اس نے کانپتے ہونٹوں کے ساتھ بتانا شروع کیا۔

"یہ جس رات کا واقعہ ہے، اس روز میں دوپہر کے کھانے کے بعد اتنی دیر تک سوتی رہی تھی کہ شام ڈھلے ہی جاگی تھی۔ اتنی طویل نیند لینے کی وجہ سے مجھے رات میں نیند نہیں آرہی تھی۔ میں نے کوشش کی کہ ٹی وی سے دل بہلا سکوں لیکن ہر چینل سے بور قسم کے پروگرام آرہے تھے۔ مجھے کچھ گھبراہٹ سی ہونے لگی تو اٹھ کر نیچے لان میں چلی گئی۔ تم نے دیکھا ہی ہوگا کہ رات کو یہاں زیادہ روشنی نہیں ہوتی اس لیے کسی کو میری وہاں موجودگی کا پتا نہیں چلا لیکن میں نے نوٹ کرلیا کہ کوٹھی میں لوگوں کی آمدورفت جاری ہے۔ آنے والے اپنے حلیے سے خواجہ سرا ہی لگ رہے تھے لیکن ان میں سے کسی کا چہرہ میرے لیے شناسا نہیں تھا۔ میں پہلے بھی کوٹھی میں رات کے وقت کسی کی آمدورفت کو محسوس کرچکی تھی۔ ان خواجہ سراؤں کو آتے دیکھا تو تجسس اور بھی بڑھ گیا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ چھپ کر ان لوگوں کی نگرانی کروں گی تاکہ ان کے کوٹھی آنے کا مقصد جان سکوں۔ میں نے بڑی کامیابی سے یہ کام کیا اور ان لوگوں کے پیچھے کوٹھی کے تہ خانے تک پہنچ گئی۔ ہماری اس کوٹھی کے نیچے بہت بڑا تہ خانہ ہے جس میں پرانا ساز و سامان پڑا ہوا ہے اور بابا نے تہ خانہ ہونے کے باوجود صرف اس وجہ سے نہیں بیچا کہ وہ اسے یادگار تصور کرتے ہیں۔ حالانکہ ان کے پاس اتنی فرصت نہیں ہوتی کہ کبھی وہ اس یادگار سامان کو دیکھنے تہ خانے تک جاسکیں۔ بہرحال، میں تمہیں بتارہی تھی کہ میں ان خواجہ سراؤں کے پیچھے کوٹھی کے تہ خانے میں اتر گئی اور وہاں کا منظر دیکھ کر حیران رہ گئی۔ وہ سب وہاں ایک بڑے کمرے میں جمع تھے اور کمرے کے درمیان میں خوفناک شکل والی عورت کا ایک مجسمہ رکھا ہوا تھا۔ وہاں میں نے تقریباً اپنی عمر کی ایک لڑکی کو دلہن بنے دیکھا جو نیم بے ہوش تھی اور مجسمے کے قدموں میں پڑی ہوئی تھی۔ میں کچھ نہ سمجھتے ہوئے یہ سب دیکھتی رہی۔ وہاں باہر سے آنے والے خواجہ سراؤں کے علاوہ کوٹھی میں ملازم چند خواجہ سرا بھی موجود تھے۔ میں ابھی حیران پریشان اس منظر کو دیکھ ہی رہی تھی کہ مہمان خواجہ سراؤں میں سے ایک اپنی جگہ سے اٹھا اور مجسمے کے قدموں میں پڑی لڑکی کو چھری کی مدد سے ذبح کردیا۔ یہ منظر دیکھ کر میری بہت بری حالت ہوئی۔ ممکن تھا کہ ایسا دہشت ناک منظر دیکھ کر میری چیخیں نکل جاتیں لیکن میں اتنی بری طرح خوف زدہ ہوگئی تھی کہ حلق سے آواز بھی نہیں نکل پارہی تھی۔ مجھے لگتا تھا کہ بے ہوش ہوکر ابھی وہیں گر جاؤں گی لیکن اس وقت اللہ نے میری مدد کی اور مجھے احساس ہوا کہ اگر قاتلوں کے اس ٹولے نے مجھے دیکھ لیا تو وہ اپنا جرم چھپانے کے لیے مجھے بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ میں ہمت اور حوصلہ کرکے تہ خانے سے نکلی اور گرتی پڑتی اپنے کمرے میں پہنچ گئی۔ میری وہ ساری رات نہایت دہشت کے عالم میں گزری اور میں سر سے پیر تک خود کو کمبل میں چھپائے بستر پر لیٹی رہی۔ مجھے کچھ معلوم نہیں ہوسکا کہ کوٹھی

میں آنے والے وہ خواجہ سرا کب واپس گئے۔ صبح ہوئی تو میں نیم بے ہوش تھی اور تیز بخار میں پھنک رہی تھی۔ بہت دنوں تک میرا علاج ہوتا رہا۔ ڈاکٹر نے بھی یہی بتایا کہ دماغ پر کسی بات کا بوجھ ہے۔ سب مجھ سے پوچھتے رہے لیکن میں نے کسی کے سامنے زبان نہ کھولی۔ پھر کاجل نے مجھ سے بڑے اچھے ڈھنگ سے پوچھا تو میں اپنے دل کا بوجھ اس کے ساتھ بانٹنے کے لیے تیار ہوگئی۔ میری زبان سے سب کچھ سن کر وہ ششدر رہ گئی۔ ساتھ ہی اسے یہ بھی یاد آگیا کہ میں جس رات کا ذکر کررہی ہوں، اس رات وہ خلاف معمول رات کے کھانے کے بعد فوراً ہی سوگئی تھی۔ کھانا کھاتے ہی اسے اچانک اتنی گہری نیند آگئی تھی کہ برداشت نہیں ہوسکی تھی۔ غور کرنے پر ہم دونوں سمجھ گئے کہ چند خاص افراد کے علاوہ اس رات کوٹھی میں موجود تمام افراد کو رات کے کھانے میں نیند یا بے ہوشی کی کوئی دوا ملا کر دے دی گئی تھی اس لیے سب رات بھر بے خبر سوتے رہے لیکن میں نے اس رات کھانا کھایا ہی نہیں تھا۔ کھانے کی بجائے میرے کمرے میں جوس کی بوتلیں رکھی رہتی تھیں کیونکہ ضرورت سے زیادہ سو جانے کی وجہ سے مجھے اپنی طبیعت بوجھل محسوس ہورہی تھی اور میں نے باقاعدہ کھانا کھانے کے بجائے ریفریجریٹر میں رکھے پھل اور مشروبات پر گزارہ کرلیا تھا۔

"ہم یہ سب اندازے لگا چکے تو کاجل نے مجھے مشورہ دیا کہ میں کسی سے بھی اس قصے کا ذکر نہ کروں ورنہ میری جان کو خطرہ ہوسکتا ہے۔ میں پہلے ہی چپ تھی۔ اس کے مشورے پر اور بھی محتاط ہوگئی۔ ادھر کاجل نے چپکے چپکے اس واقعے کی چھان بین شروع کردی۔ اس نے مجھے بتایا کہ تہ خانے میں بیچ میں عورت کا ایک خوفناک مجسمہ موجود ہے لیکن اسے ایسے آثار نہیں مل سکے جن سے یہ ثابت ہوسکے کہ وہاں کسی لڑکی کو ذبح بھی کیا گیا ہے۔ ہم دونوں ہی نے فیصلہ کیا کہ کوئی واضح ثبوت ملنے تک اپنی زبانیں بند رکھیں گے۔ ویسے بھی ہم کچھ بتاتے تو بھی کسے؟ بابا نے تو ہماری بات پر یقین ہی نہیں کرنا تھا۔ میں اور کاجل مناسب وقت کا انتظار کرنے لگے لیکن اس واقعے کے بعد میرے اندر بھی اتنی ہمت پیدا نہیں ہوسکی کہ خود اس چھان بین میں حصہ لے سکوں۔ جو کچھ کررہی تھی، کاجل ہی کررہی تھی۔

"اس رات کے بعد اس نے یہ احتیاط شروع کردی تھی کہ کسی بھی طرح نشہ آور دوا ملا کھانا پینا اس کے پیٹ میں نہ جاسکے۔ اس کی اتنی احتیاط اور محنت کا یہ نتیجہ نکلا کہ اس نے معلوم کرلیا کہ کبھی کبھار راتوں کو یہاں کچھ اجنبی لوگ اور گاڑیاں آتی ہیں اور تہ خانے میں یا تو کچھ سامان رکھا جاتا ہے یا نکالا جاتا ہے۔ خاص بات یہ تھی کہ ایسے ہر موقع پر وہی چند خواجہ سرا سرگرم نظر آتے تھے جنہیں میں نے اس رات تہ خانے میں لڑکی کے ذبح ہونے کے وقت دیکھا تھا۔ یہ باتیں علم میں آنے کے بعد ہم دونوں کو یہی اندازہ ہوگیا کہ کوٹھی کو کچھ ناجائز سرگرمیوں کے لیے استعمال کیا جارہا ہے اور یقیناً اس سب کے پیچھے شانی ہی موجود تھی... کیونکہ یہ ساری سرگرمیاں جن افراد کی نگرانی میں جاری تھیں، وہ سب اس کے منظور نظر اور چہیتے تھے۔ اس نے بہت ہوشیاری سے بابا کی کمزوری کو استعمال کرتے ہوئے ان کی کوٹھی پر قبضہ کرلیا تھا اور بابا کو کسی بات کا علم ہی نہیں تھا۔ میں یہ بھی جانتی تھی کہ بابا کو کچھ بتانے کا کوئی فائدہ ہونا بھی مشکل ہے اس لیے کسی قابل بھروسا فرد کی تلاش میں سرگرداں رہنے لگی۔

"اسی عرصے میں تم یہاں آگئے۔ مجھے اور کاجل کو بھی اوروں کی طرح تمہاری اصلیت کا علم نہیں تھا لیکن جس رات تم لوگ رقی کی لاش کو شمشان گھاٹ لے کر گئے، اس رات کاجل نے ایک اور کارنامہ انجام دیا اور یہ جاننے میں کامیاب ہوگئی کہ کوٹھی کے تہ خانے میں رکھی پیٹیوں میں اسلحہ اور بارودی مواد بھرا ہوا ہے۔ اس کی حاصل کردہ ان معلومات کے بعد مجھے اور بھی زیادہ شدت سے ایسے شخص کی تلاش رہنے لگی جسے یہ سب بتانے کا کوئی بہتر نتیجہ نکل سکے۔ لیکن میں ایسا شخص کہاں سے تلاش کرتی؟ بابا کی خراب شہرت کی وجہ سے خاندان والوں سے برسوں سے ہمارا ملنا جلنا نہیں ہے۔ سہیلیاں بنانے کی مجھے اجازت نہیں ہے۔ بس ایک موہوم سی امید پر ہی شہر میں ادھر ادھر گھومتی پھرتی رہتی تھی۔ وہ بھی آشا کے ساتھ جو کہ شانی کی سب سے قریبی ساتھی ہے اور جو ان ساری سرگرمیوں میں ہمیشہ پیش پیش رہتی ہے۔ باہر میں کسی دکاندار سے بھی بات کروں تو مجھے یہی لگتا تھا کہ آشا کی نظریں میری نگرانی کررہی ہیں۔ اس لیے میں چاہنے کے باوجود بھی کسی کو کچھ نہیں بتاسکی اور ایک طرح سے مایوس ہی ہوگئی تھی کہ کل رات اللہ نے اپنی مہربانی سے اچانک تم سے ملوادیا۔ میں حیران رہ گئی کہ جس شخص کی مجھے اتنی شدت سے تلاش تھی، وہ میرے اتنے قریب ہی موجود تھا۔ بس پھر میں نے فیصلہ کرلیا کہ تمہیں سب کچھ بتادوں گی۔ یوں آج تم میرے سامنے موجود ہو اور مجھے امید ہے کہ ہم لوگوں کو اس عذاب سے نجات دلانے میں پوری مدد کرو گے۔"

آغاز ہو رہا تھا۔

"اس حصے کو چھوڑیں صاحب! یہ جگہ ٹھیک نہیں ہے۔" بہرام نے اسے روکنے کی کوشش کی۔

"کیا مطلب جگہ ٹھیک نہیں ہے؟ میرے خیال میں تو ہمارے کام کے لیے یہ سب سے آئیڈیل جگہ ہوگی۔ یہاں ہمیں بالکل مختلف قسم کا میٹیریل اور ڈیٹا مل سکتا ہے۔" اظفر نے فوراً حجت شروع کر دی۔

"میٹیریل اور ڈیٹا تو بعد میں ملے گا، پہلے آپ لوگ ہی غائب ہو جاؤ گے۔" بہرام نے اس کی حجت بازی پر جھنجلا کر جواب دیا۔

"کیا مطلب؟ تم ہمیں دھمکی دے رہے ہو؟" اظفر اچھلا۔

"دھمکی نہیں دے رہا، سمجھا رہا ہوں۔ جنگل کا یہ حصہ خطرناک ہے۔ ہم لوگ خود بھی ادھر کا رخ نہیں کرتے۔" بہرام ہنوز ملائمت سے بولا۔

"کیسا خطرہ؟ میں نے تو سنا ہے کہ یہاں خطرناک قسم کے جانور اور درندے وغیرہ نہیں پائے جاتے۔" وہ پوری معلومات کے ساتھ وہاں آیا تھا اس لیے آسانی سے بے وقوف نہیں بن سکتا تھا۔

"سنی سنائی کا کوئی بھروسا نہیں ہوتا صاحب! میں یہاں کا رہنے والا ہوں اور میں نے خود اپنی آنکھوں سے جنگل میں جانے والوں کی ایسی لاشیں پڑی دیکھی ہیں جنہیں درندوں نے بُری طرح بھنبھوڑ کر رکھ دیا تھا۔" اس کی بات سے یکسر اختلاف کرتے ہوئے بہرام نے اس پر اپنے تجربے کی دھاک بٹھانے کی کوشش کی۔

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو گے لیکن میں ان مسائل سے ڈرنے والا نہیں ہوں۔ ہم اس سے پہلے بھی جنگلوں میں کام کرتے رہے ہیں اور اچھی طرح جانتے ہیں کہ وہاں موجود خطروں سے کیسے نمٹنا ہے۔" اظفر کا انداز بے پروا اور کھلنڈرے لڑکوں جیسا تھا جس سے بہرام کے غصے میں اضافہ ہو رہا تھا۔ وہ جتنا اس بندے کو ڈرانے کی کوشش کر رہا تھا، وہ اتنی ہی بے خوفی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

"میرے خیال میں آپ اپنے پاس موجود اسلحے کی وجہ سے ایسا کہہ رہے ہیں لیکن میں آپ کو پہلے ہی بتا دوں کہ آپ پرمٹ کے بغیر یہاں ایک پرندے یا مچھلی کو بھی ہلاک نہیں کر سکتے۔ خطرناک سے خطرناک درندے کو ہلاک کرنے کی صورت میں بھی آپ کو بھاری جرمانے اور سزا سے نمٹنا پڑے گا۔"

"وہ ہمارا مسئلہ ہے۔ اس کے لیے تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ویسے بھی ہم ایسے لوگ نہیں ہیں جو اپنا اور اپنے دوستوں کا دل بہلانے کے لیے معصوم جانوروں کا خون کرتے پھریں۔ ہم تو ان جانوروں اور پودوں کے تحفظ کے لیے کام کرنے والے لوگ ہیں، اس لیے مجھے یقین ہے کہ ہمیں یہاں ان سے اور انہیں ہم سے کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔" اظفر کسی بھی منطق کا [illegible] اس نے اپنی دلیلوں سے بہرام کو اچھا خاصا زچ کر کے رکھ دیا تھا۔ جب ہی وہ وقت بتاتا ہوا اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا اور غصے سے تیز لہجے میں بولا۔

"ٹھیک ہے صاحب! آپ کی مرضی۔ میں نے آپ کو سب بُرا بھلا سمجھا دیا ہے۔ آپ جنگل کے لیے نہ مانیں تو سارے نفع نقصان کی ذمے داری آپ کے اوپر ہے۔ مجھے آپ اپنی روانگی کا وقت بتا دیجیے گا، میں انتظامات کر دوں گا۔ ویسے اگر خاص طور پر اسی حصے میں جانا ہے تو دو باتیں بھی ذہن میں رکھیے گا۔ ایک یہ کہ میں یا میرا کوئی آدمی ایسی خطرناک جگہ پر آپ کے ساتھ نہیں جائے گا، دوسرے یہ کہ جنگل کے اس حصے میں آپ کا خطرناک ڈاکوؤں سے بھی سامنا ہو سکتا ہے اور ان سے آپ کے جان و مال کی حفاظت کا کوئی بھی ذمہ نہیں لے سکتا۔"

"ہو گیا! اب تم نے ڈاکوؤں کی ایک نئی کہانی نکال کر رکھ دی۔ تم کیا چاہتے ہو کہ ہم ڈر کر یہیں اس جنگل سے واپس چلے جائیں؟" اس بار اظفر نے جھنجلاہٹ کا مظاہرہ کیا تھا، پر بہرام ہنوز مسکرایا۔

"میں ایسا کیوں چاہوں گا جی... لیکن آپ کو سارے خطروں کی خبر دینا بھی تو میرا فرض ہے۔ آپ میری دی ہوئی کسی خبر کو کہانی کہنے کی غلطی نہ کیجیے گا۔ ادھر جنگل میں کئی ڈاکو ہیں۔ آپ کو ادھر کی اتنی معلومات ہیں تو یہ بھی معلوم ہوگا کہ کچھ عرصہ پہلے پولیس نے ادھر آپریشن کر کے ڈاکوؤں کا بہت بڑا گروہ پکڑا تھا لیکن اس گروہ کے سارے لوگ نہیں پکڑے گئے تھے۔ کچھ خطرناک ڈاکو بھاگنے میں کامیاب ہو گئے تھے اور ڈر ہے کہ یہ ڈاکو ابھی بھی جنگل میں ہی موجود ہوں۔" بہرام نے اپنی جھنجلاہٹ پر قابو پا لیا تھا اور ایک بار پھر نرم لہجے میں اسے سمجھا رہا تھا۔

"یہ آدمی ٹھیک کہہ رہا ہے اظفر! یہ یہاں کا رہنے والا ہے اور یہاں کے خطروں کو اچھی طرح جانتا ہے۔ ہمیں اس کی بات کو نظرانداز نہیں کرنا چاہیے۔ ہمیں ریسرچ کرنی ہے، اس کے لیے ضروری نہیں کہ کسی خطرناک علاقے میں ہی جایا

بڑھاتے ہوئے اس نے اس سے پیالہ لے لیا۔

"کاجل کی خیر ہے، جلد ہی معلوم ہو جائے گی لیکن تم پہلے یہ دودھ تو پی لو۔" جاوید علی کو اتنی جلدی ناشتے سے فارغ ہوتے دیکھ کر شاز مین نے اسے ٹوکا۔

"مجھے اس وقت نہیں چاہیے۔" اس نے انکار کیا۔

"دل نہیں بھی چاہ رہا تب بھی پی لو۔ مجھے لگتا ہے کہ تمہارا بھاگ دوڑ والا کام شروع ہونے والا ہے اس لیے تمہارے جسم میں توانائی ہونی چاہیے۔" اس نے دلیل دی جو خاصی معقول تھی۔ جاوید علی نے مسکراتے ہوئے دودھ کا گلاس تھام لیا۔

"میں رات سے یہاں ہوں لیکن میں نے یہاں کوئی چہل پہل محسوس نہیں کی۔ ایسا لگتا ہے تمہارے سوا اس پورشن میں کوئی موجود ہی نہ ہو۔ حالانکہ نواب صاحب کی دونوں بیگمات کو یہاں موجود ہونا چاہیے تھا۔" اس نے بہت دیر سے ذہن میں ابھرتا خیال شاز مین کے سامنے رکھا۔

"یہاں رہتے ہیں وہ دونوں بھی ابھی خاصی بیٹھی ہوگی ہیں اور اپنے کمروں سے نکلنا پسند نہیں کرتیں۔" شاز مین نے بیزاری سے جواب دیا۔

"اس کا مطلب ہے میں تمہارے کمرے میں بالکل محفوظ ہوں اور جب تک چاہوں یہاں آرام سے چھپ کر رہ سکتا ہوں؟"

"ہاں، یہاں تمہیں کوئی خطرہ نہیں ہے اگر مجھے گڑبڑ محسوس ہوئی تو یہاں سے بابا کے بیڈروم میں شفٹ کر دوں گی۔ اس پورشن میں بھی ان کا ایک بیڈروم موجود ہے اور وہاں داخل ہونے کی کوئی جرأت نہیں کرتا۔" شاز مین نے اس کی بات کا جواب دیا۔ اس اثنا میں وہ دونوں ناشتے سے فارغ ہو چکے تھے۔ شاز مین ایک بار پھر انٹرکام کی طرف متوجہ ہو گئی۔

"میں نے ناشتا کر لیا ہے۔ کاجل سے کہو ناشتے کے برتن لے جائے۔" اس نے دوسری طرف موجود شخص سے کہا۔

"بی بی جی! وہ تو ابھی تک سو رہی ہے بی بی! میں آکر برتن لے جاتی ہوں۔" دوسری طرف سے وہی جواب ملا جس کا اندازہ تھا۔

"صرف برتن اٹھانے کی بات نہیں ہے۔ مجھے کاجل سے کچھ اور بھی کام ہے۔ آخر وہ کب تک سوتی رہے گی؟" شاز مین جھنجھلا کر بلند آواز میں بولی۔

"میں نے آپ کو بتایا تھا نا بی بی کہ ان کی طبیعت خراب ہے۔ آپ کو جو بھی کام ہے، مجھے بتا دیں میں کر دوں گی۔" اس کے غصے کا جواب نرمی سے دیا گیا۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے۔ معلوم ہے [illegible] کے علاوہ کسی سے اپنا کام کروانا پسند نہیں [illegible]۔" اس نے ریسیور واپس پٹخ دیا اور جاوید علی کی شکل دیکھنے لگی۔

"گڑبڑ ہے شہزادی... گڑبڑ ہے۔ میں [illegible] سے مشورہ کر کے دیکھتا ہوں کہ کیا کیا جا سکتا ہے۔" وہ [illegible] سیٹ پر مصروف ہو گیا۔

"ہم لوگوں نے کوٹھی کے باہر پوزیشن لے لی ہے۔ کوٹھی کی تلاشی کا وارنٹ بھی لیا جا چکا ہے۔ جاوید علی [illegible] بھی ہوں کہ قانونی طریقے سے اندر داخل ہو [illegible] تھیں لیکن اگر کسی نے مزاحمت کی کوشش کی تو ہم جواب بھی دیا جا سکتا ہے۔ کارروائی کے لیے رات کے وقت کا انتخاب ہوا ہے لیکن تم کوٹھی میں اپنی یا اپنے کسی ساتھی کی جان خطرے میں محسوس کرو تو فوراً اشارہ دے دینا، ہم فوراً دھاوا بول دیں گے۔" اسے جواب دیا گیا۔

"اوکے، تم لوگ تیار رہنا۔ میں تھوڑی دیر میں حالات کا جائزہ لینے کے بعد تمہیں بتاتا ہوں کہ کیا کرنا ہے۔" اس نے رابطہ منقطع کر دیا اور پھر شاز مین کی طرف متوجہ ہوا۔

"تم کہو کہ کیا کیا جائے؟ میرے خیال میں تو سب سے پہلے یہ معلوم کرنا چاہیے کہ کاجل کو کیا ہوا ہے [illegible] میں ہے بھی یا نہیں اس کے لیے ہم دونوں میں سے کسی ایک کو پیچھے جا کر حالات کا جائزہ لینا ہوگا۔ میں گیا تو [illegible] نظر آ جاؤں گا۔ اب تم بتاؤ کہ کیا کسی بہانے پیچھے جا سکتی ہو؟"

"مجھے پیچھے لان کے علاوہ کہیں اور جانے کی اجازت نہیں ہے۔" شاز مین نے ہونٹ چباتے ہوئے اپنی مجبوری بتائی۔

"اس کا مطلب ہے کہ مجھے ہی کوئی نہ کوئی ترکیب سوچنی ہوگی۔" جاوید علی سوچ میں پڑ گیا اور کمرے میں ادھر سے ادھر ٹہلنے لگا۔ ٹہلتے ٹہلتے وہ کمرے کے دروازے کے قریب پہنچا ہی تھا کہ کسی نے یکدم دروازہ کھول دیا۔ اس صورت حال پر شاز مین بُری طرح اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ کھلے دروازے میں کھڑی [illegible] صاف نظر آ رہی تھی۔

شاز مین اسے اس جسارت پر کینہ توز نظروں سے گھورنے لگی۔

بہ ہر پیچ و سنسنی خیز داستان جاری ہے
مزید واقعات آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں

"تمھیں مرضی صاحب! ہم تو تم کے غلام ہیں لیکن بتانا فرض تھا کیونکہ آپ اس جنگل کو مجھ سے بہتر نہیں جانتے۔ جن راستوں سے ہم گزر رہے ہیں، یہ اصل جنگل نہیں ہے۔ یہ بہت صاف جگہ ہے لیکن آگے جا کر گھنا جنگل ہوگا جہاں راستے بھٹکنے کے لیے قطب نما تو سب بیکار ہے۔ ادھر صرف تجربہ چلتا ہے اور وہی شخص جنگل سے سلامت نکلتا ہے جو اس جنگل کو جاننے والے کے تجربے سے فائدہ اٹھاتا ہے۔" اس کے حکم کے مطابق ڈرائیور نے جیپ کی سمت تو بدل دی تھی لیکن ساتھ ہی نہایت فلسفیانہ انداز میں اسے سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"تم ہمیں دھمکی دے رہے ہو؟" اس کی بات سن کر اظفر طیش میں آگیا۔

"دھمکی کیسی صاحب! میں تو آپ کو سمجھا رہا تھا۔ آگے آپ کی مرضی کہ مانو یا نہ مانو۔ میں تو خادم ہوں۔ آپ نے جدھر کہا میں نے گاڑی ادھر موڑ دی۔" ڈرائیور نے اطمینان سے جواب دیا۔ اسے ڈیوٹی پر بھیجتے ہوئے بہرام نے پہلے ہی سمجھا دیا تھا کہ ان لوگوں سے زیادہ الجھنا نہیں ہے اور نظر رکھنی ہے کہ یہ لوگ جنگل میں کیا کر رہے ہیں۔

"یہ بہت اچھی بات ہے کہ تم حکم پر عمل کرنا جانتے ہو۔ آگے بھی اسی طرح عمل کرنا اور اپنی زبان صرف اسی وقت کھولنا جب تم سے کچھ پوچھا جائے۔" اظفر جواباً بگڑ کر بولا تھا اور اس وقت تو وہ صریحاً طور پر ایک ایسے فرد سے مخاطب تھا جو مجرموں کا ساتھی تھا اس لیے کسی مصلحت اور رعایت سے کام لینے کو تیار نہیں تھا۔ ڈرائیور نے بھی اس کا انداز دیکھتے ہوئے خاموشی اختیار کر لی۔ اسے معلوم تھا کہ جیپ میں ٹریکر لگا ہوا ہے اور وہ جہاں بھی جائیں گے بہرام کو اس کی خبر ہو جائے گی اس لیے زیادہ بحث و تکرار کی ضرورت نہیں ہے۔

"یہاں روک لو۔" جنگل کا چھدرا پن ختم ہوا اور جیپ گھنے جنگل میں داخل ہوئی تو اسے چلانا مشکل ہونے لگا۔ درحقیقت ماہر ڈرائیور کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اتنا بھی نہیں کر پاتا اور ہمت ہار بیٹھتا لیکن ان کے ساتھ موجود شخص نے مشکل کے باوجود زبان سے اُف نہیں کیا تھا گویا وہ اظفر کے حکم پر پوری طرح عمل کر رہا تھا۔ خود اظفر نے ہی محسوس کر لیا کہ آگے جیپ میں سفر جاری رکھنا ان کے لیے خطرناک ہو سکتا ہے اس لیے اسے جیپ روک لینے کا حکم دے ڈالا۔ ڈرائیور نے اس حکم کی بھی تعمیل کی۔ خاموش رہنے کے باوجود اس وقت وہ بے حد چوکنا تھا۔ وہ لوگ جنگل کے جس حصے میں پہنچے تھے وہاں سے وہ علاقہ زیادہ دور نہیں تھا جہاں افیون کی کاشت کی جاتی تھی۔ وہ لوگ چاہتے تو پیدل بھی اس جگہ تک پہنچ سکتے تھے لیکن جب [illegible] ڈالنی بھی نہیں دیتا تھا اور صرف نگرانی کرنی تھی۔

"یہاں خیمہ لگالو۔ یہاں رک کر ہم اپنا [illegible] گے۔" جیپ رک گئی تو وہ سب نیچے اتر آئے اور اظفر نے ادھر ادھر گھومنے کے بعد ایک جگہ کی نشاندہی کرتے ہوئے ہدایت دی۔ اس کے ساتھی فوراً ہی حرکت میں آگئے۔ جیپ سے خیمہ نکال کر مطلوبہ جگہ پر پہنچا دیا گیا۔ یہ [illegible] سے بنے ہلکے پھلکے خیمے تھے جنہیں ذرا سی جدوجہد سے اکیلا شخص بھی نصب کر سکتا تھا۔

"تم یہ خیمہ لگا کر ان میں ضرورت کی اشیا [illegible]۔ ذرا ادھر ادھر گھوم کر اپنا کام کرتے ہیں۔" وہ دو خیمے [illegible] چلا دیر گزر چکی تھی جب اظفر نے ڈرائیور کو [illegible] کے یہ نیا حکم دیا اور پھر اپنے ساتھیوں کی طرف متوجہ [illegible] ان کی طرف سے چند ہدایات دیے جانے کے بعد [illegible] متحرک ہو گئے۔ ڈرائیور بظاہر خیموں کے ساتھ الجھا [illegible] ساری کارروائیاں دیکھ رہا تھا۔ انہوں نے اپنے شانوں [illegible] جدید ساخت کی گنیں لٹکا رکھی تھیں اور چند لوگوں کے [illegible] شکاری چاقو بندھے ہوئے تھے۔ ان ہتھیاروں کے [illegible] ان سب کے شانوں کے ساتھ ایک ایک مضبوط تھیلا [illegible] ہوا تھا۔ ان تھیلوں میں کیا تھا، یہ تو ڈرائیور نہیں جانتا تھا لیکن اتنا سمجھ رہا تھا کہ وہ لوگ بڑی تیاری کے ساتھ وہاں آئے ہیں۔ جنگل میں کسی بھی مقصد کے تحت اترنے والوں کو تیاری تو کرنی ہی پڑتی ہے لیکن وہ اندازہ لگا سکتا تھا کہ ان لوگوں کا انداز کسی شکاری یا طالب علم جیسا نہیں ہے۔ وہ اپنی حرکات اور نقل و حرکت سے تربیت یافتہ کمانڈوز کی طرح لگتے تھے۔ وہ خاموشی سے یہ سب کچھ اس وقت تک دیکھتا رہا جب تک وہ دو دو کی ٹولیوں میں وہاں سے روانہ نہیں ہو گئے۔ ان کے روانہ ہوتے ہی اس نے خیمے کی [illegible] کام چھوڑا اور اپنے لباس میں چھپایا ہوا آلہ [illegible] رابطہ ہونے پر دوسری طرف موجود شخص کو اپنی لوکیشن سے آگاہ کرنے لگا۔

"بے فکر رہو۔ ہم نے تمہاری جیپ ٹریس کر لی ہے۔ [illegible] جانتے ہیں کہ اس وقت تم کہاں ہو۔" اسے جواب ملا۔

"لیکن سر! وہ لوگ اب ادھر نہیں ہیں۔ مجھے جیپ [illegible] سامان کے ساتھ چھوڑ کر خود پیدل آگے نکل گئے ہیں۔ مجھے ان کے ارادے ٹھیک نہیں لگتے۔ وہ ضرور اسی طرف جائیں گے جہاں جانے سے ہم انہیں روکنا چاہتے ہیں۔" [illegible]

[illegible] سے [illegible] میں مزید اطلاع فراہم کی۔

"اس طرف آ کر وہ خود اپنے حق میں اچھا نہیں کریں گے [illegible] انہیں ہر حال میں اور آسانی سے روک لیں گے۔"

[illegible] موجود بندے کو اپنے آپ پر بھرپور اعتماد تھا۔ [illegible] مطمئن ہو گیا کہ اس نے اپنا فرض پورا کر دیا ہے [illegible] سے آگے اسے کچھ نہیں کرنا اس لیے آپ کو [illegible] میں چھپا کر اظفر کے سونپے ہوئے کام کو مکمل [illegible] لگ گیا۔ اس کے شک کے برخلاف اگر وہ لوگ [illegible] اس خاص حصے کی طرف نہیں جاتے تو پھر یقیناً ان [illegible] واپس آجانا تھا اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ واپس [illegible] کے بعد اظفر اپنی حکم عدولی پر اسے برا بھلا کہے اس [illegible] سے خیمہ نصب کرنے کے بعد جیپ سے [illegible] منتقل کرنے لگا۔

[illegible] اظفر اور اس کے ساتھی ٹولیوں کی شکل میں آگے [illegible] انہیں کچھ نہیں معلوم تھا کہ انہیں وہاں کس [illegible] لیکن یہ اندازہ لگانے میں کامیاب ہو گئے [illegible] جنگل میں جو بھی راز پوشیدہ ہے، اس کا تعلق جنگل [illegible] سے ہے کیونکہ جب سے وہ لوگ یہاں آئے [illegible] ڈرائیور بہرام نے انہیں جنگل کے [illegible] سے دور رکھنے کی کوشش کی تھی۔ نہایت چابک دستی [illegible] نظریں دوڑاتے وہ لوگ آگے بڑھتے رہے۔ [illegible] وہ مختلف ٹولیوں میں سفر کر رہے تھے اس لیے صاحب سمجھا [illegible] وقت میں زیادہ سے زیادہ ایریا کا جائزہ لیا جا سکے گا۔ [illegible] اپنے ساتھ آنے والے وائلڈ لائف کے ماہر اور [illegible] پروفیسر صاحب کو اپنے ہمراہ رکھا تھا۔ پروفیسر صاحب [illegible] لیے کی غرض سے اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ [illegible] میں گزارا تھا اس لیے وہ خاصے چاق و [illegible] اور جنگل میں پیش آنے والے کسی خطرے سے [illegible] واقف تھے لیکن اظفر انہیں اپنی ذاتی [illegible] بنا لایا تھا اس لیے انہیں اپنے ساتھ رکھ کر خود ان کی [illegible] کرنا چاہتا تھا۔ چلتے چلتے وہ لوگ ایک مقام پر [illegible] رکے کہ جب نظر آنے والا کسی بڑے جانور کا [illegible] پروفیسر صاحب فوراً ہی اس ڈھانچے کی طرف [illegible] گئے۔

"یہاں خون کی بو محسوس ہو رہی ہے۔ اس کا مطلب [illegible] جانور حال ہی میں موت کا شکار ہوا ہے۔" انہوں [illegible] کر فضا کو سونگھا اور ڈھانچے کی طرف بڑھے۔ [illegible] کے قریب پہنچ کر انہوں نے اپنے تھیلے میں ہاتھ ڈال کر اس میں سے طاقتور ٹارچ نکال لی۔ دن کا وقت تھا اور سورج کی روشنی جنگل میں پہنچ رہی تھی لیکن گھنے درختوں کے پتوں سے چھن کر آنے والی یہ روشنی ناکافی تھی اس لیے انہیں ٹارچ روشن کرنے کی ضرورت پیش آگئی۔

"یہ بڑی جسامت والے ہرن کی لاش ہے جسے کئی جانوروں نے مل کر بھنبھوڑا ہے۔ تم دیکھ رہے ہو کہ ڈھانچے کی ساری ہڈیاں سلامت نہیں ہیں اور کئی ادھر ادھر مختلف حصوں میں بکھری ہوئی ہیں۔ میرے اندازے کے مطابق اس ہرن کو کل ہی شکار کیا گیا ہے کیونکہ ہڈیوں کے ساتھ لگے بچے کھچے گوشت میں ابھی تازگی باقی ہے۔" وہ ڈھانچے کا نہایت گہری نظروں سے جائزہ لے رہے تھے۔ جائزہ لیتے لیتے وہ اس کے سر کی طرف متوجہ ہوئے تو بری طرح چونک گئے اور اظفر کو بھی اس طرف متوجہ کیا۔ وہ بھی یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ ہرن کی کھوپڑی میں گولی کا سوراخ موجود ہے۔ یقینی درندوں کے دانتوں اور پنجوں کا نشانہ بننے سے قبل وہ بے چارہ ہرن کسی ظالم کی چلائی ہوئی گولی کا نشانہ بن کر موت سے ہمکنار ہو چکا تھا۔ اگر شکار کرنے والا کوئی پیشہ ور شکاری ہوتا تو لاش کو درندوں کا نشانہ بننے کے لیے یہاں چھوڑ کر نہیں جاتا۔ اس کی کوشش ہوتی کہ اس خوب صورت جانور کا سر اور کھال کسی طرح محفوظ کرے اور ان کاموں سے فارغ ہو کر وہ ہرن کے لذیذ گوشت سے اپنی شکم پری کا بندوبست کرتا۔ لیکن یہاں ملنے والے آثار مختلف تھے۔ ہرن کا سر بھی موجود تھا اور لاش دیکھ کر یہی پتا چل رہا تھا کہ درندوں کے اس لاش پر دعوت اڑانے سے قبل اس سے کھال جدا نہیں کی گئی تھی۔

"اس ہرن کو کتوں نے کھایا ہے۔" ہرن کی ڈھانچا لاش کا جائزہ مکمل کرنے کے بعد پروفیسر صاحب نے چند قدم ادھر ادھر چہل قدمی کرنے کے بعد اعلان کیا تو اظفر پوری طرح ان کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ ایک ماہر تھے اور وہ ان کی کسی بھی رائے کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔

"میں نے لاش پر موجود دانتوں اور پنجوں کے نشان دیکھے ہیں اور اب اس فضلے کو دیکھ کر مجھے پورا یقین ہو گیا ہے کہ اس ہرن پر کتوں نے دعوت اڑائی ہے۔" ان کی ٹارچ کی روشنی نے گھاس پھوس اور پتوں پر پڑے ہوئے فضلے کا احاطہ کیا ہوا تھا۔ فضلے سے ٹارچ کی روشنی ہٹی تو ادھر ادھر گردش کرنے لگی اور وہ اس روشنی میں "حق" خیز انداز میں سر ہلاتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ اظفر ان کے پیچھے پیچھے تھا۔

"میرا اندازہ ہے کہ ان کتوں کی تعداد تین یا چار اس

سے بھی زیادہ تھی اور وہ اس سمت سے آ کر واپس بھی اسی طرف چلے گئے تھے۔" انہوں نے اپنے ٹارچ والے ہاتھ کے ساتھ ساتھ دوسرے ہاتھ کو بھی حرکت دی اور سمت بتانے لگے۔ اختر ان کی فراہم کردہ معلومات سن کر جوش میں آ گیا۔ کتوں کی ضیافت کا نشانہ بنی ہرن کی لاش دیکھ کر اسے یقین ہو چلا تھا کہ وہ کوئی اہم چیز تلاش کر چکا ہے اور اب اس کے لیے اس راز تک پہنچنا زیادہ مشکل نہیں جس تک پہنچنے کے لیے وہ یہاں آیا ہے۔ جوش اور جذبے سے بھرے ہوئے اختر کے لیے کامیابی تک پہنچ جانے کا خیال بہت اہم تھا۔ وہ بنا سوچے سمجھے پروفیسر صاحب کی بتائی ہوئی سمت میں آگے بڑھنے لگا۔ خود پروفیسر صاحب اس کے ساتھ تھے۔ انہوں نے آگے بڑھ کر چند گز کا فاصلہ ہی طے کیا تھا کہ ایک اور ڈھانچا دیکھ کر چونک گئے۔ اس بار پروفیسر صاحب کے بتائے بغیر ہی اختر نے جان لیا کہ اس جانور کو بھی گولی مار کر ہلاک کیا گیا ہے لیکن لاش کافی پرانی تھی کیونکہ وہاں خون کی بو سمیت ہڈیوں پر لگا گوشت بھی غائب تھا اور محسوس ہو رہا تھا کہ ڈھانچا اب گلنے سڑنے کے عمل سے گزر رہا ہے۔ بڑی محویت سے اس جائزے میں مصروف ان دونوں کو احساس ہی نہیں ہوا اور اچانک سمت سے آ کر کوئی شے ان کے جسموں میں پیوست ہو گئی۔ انہوں نے اگر کچھ محسوس کیا تو صرف گردن کی پشت پر پن کی نوک جیسی چبھن اور پھر ہوش و خرد سے بیگانے ہو گئے۔ ان کے بے ہوش ہوتے ہی اطراف سے چند مسلح افراد برآمد ہوئے اور اطمینان کرنے لگے کہ وہ لوگ یقینی طور پر بے ہوش ہو گئے ہیں یا نہیں۔

"ان کے باقی دو ساتھی بھی مل جائیں تو سب کو ایک جگہ ڈال کر ہمارے دوستوں کی دعوت کا بندوبست کر دو۔ اپنا آج کا کھانا دیکھ کر وہ بہت خوش ہوں گے۔" اس دوران ہی ایک اور شخص نمودار ہوا اور تحکمانہ لہجے میں بولا۔

"وہ دونوں بھی نظر میں آ گئے ہیں صاحب! تھوڑی دیر میں وہ بھی یہیں ہوں گے۔ آپ ہمیں بس اتنا بتا دو کہ یہ کام جنگل کے کس حصے میں کرنا ہے؟" مسلح افراد میں سے ایک نے سینہ ٹھونک کر جواب دیا۔

"ان لوگوں کو جیپ سمیت اس طرف سے دور لے جانا اور خالقو سمیت سب کا کام تمام کر دینا۔" نو وارد نے سرد مہری سے جواب دیا۔

"خالقو کیوں صاحب؟ وہ تو اپنا بندہ ہے۔" حکم سننے والے حیران ہو گئے۔

"عقل سے کام لے مغل! اگر خالقو کو چھوڑ دیا تو جو کچھ ہم کرنے جا رہے ہیں، اسے حادثہ کون کہے گا۔ اس … بھیجتے تو ہاتھ دھو کر پیچھے پڑ جانے کے لیے خالقو کے پیچھے لگ جائیں گے اور ایک نہ ایک دن وہ ہمیں مروا دے گا۔ … لیے بہتر ہے کہ ہم خود پہلے اسے ہی مروا دیں۔" اس نے … تحمل بیان کیا۔ وہ اعتراض کرنے والوں کے لیے قابل … تھا اس لیے پھر کسی نے کوئی سوال نہیں کیا اور … لگے کہ اختر کے باقی دونوں ساتھیوں کو بھی یہاں پہنچ … جائے۔ انہیں زیادہ دیر زحمت نہیں اٹھانی پڑی اور چار … آدمی ان دونوں کے بے ہوش جسموں کو اٹھائے وہاں … گئے۔ چاروں مطلوبہ افراد ایک جگہ جمع ہو گئے تو آگے کی کارروائی کی جانے لگی۔ خالقو جیپ سمیت کہاں موجود … یہ انہیں بتا دیا گیا تھا چنانچہ چاروں بے ہوش افراد … وہ پانچ مرد کتوں سمیت اس جگہ تک پہنچنے میں … دشواری پیش نہیں آئی۔ کتے زنجیروں میں بندھے ہوئے تھے اور چاروں بے ہوش افراد کی طرف دیکھ … طرح بھونک رہے تھے جیسے انہیں کا شکار ہوں … بھوجن سامنے ہوتے ہوئے بھی انہیں کھانے کے لیے … نہیں دیا جا رہا۔

"خیمے اور سامان اٹھا کر واپس جیپ میں … خالقو۔ ان کو یہاں سے دور لے جانے کا حکم ہے۔" … کے ساتھ آنے والے مسلح افراد میں سے ایک نے … ڈرائیور سے کہا تو وہ فوراً ہی حرکت میں آ گیا۔ وہ … اس کا ساتھ دینے لگے۔ جلد ہی سارا سامان دوبارہ جیپ میں منتقل ہو گیا اور وہ لوگ ملازم سوار ہو گئے۔ سفر کا … پچھلا وقت تھا۔ وہ لوگ پہلے کے مقابلے میں زیادہ … میں پہنچ کر رک گئے اور بے ہوش افراد کو جیپ سے … نیچے ڈال دیا۔ خالقو بے چارہ سے میں کہنے لگے جیسے … خبر اس کام میں پیش پیش تھا۔ اس کے ساتھ کیا ہونے والا … ہے اس بات کا اندازہ اسے اس وقت ہوا جب … کے مطابق چاروں بے ہوش افراد کو مختلف پوزیشنز میں … ہوئے بٹھا دیا گیا اور اس کے ساتھیوں نے نہایت خاموشی … اس سے الگ ہونے کے بعد خونخوار کتوں کو زنجیروں … سے آزاد کر دیا۔ ایک گرانڈیل کتا برق رفتاری … جھپٹا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟ اسے روکو۔" کتے کے وار سے بچنے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے چیخ کر اپنے ساتھیوں سے …

"ہم اسے نہیں روک سکتے۔ اوپر سے فیصلہ … آج تو بھی ان کے بھوجن کا حصہ بنے گا۔" اسے …

سرد مہری سے جواب دیا گیا۔ وہ سارے کے سارے اپنے ہی تھے۔ سدھائے ہوئے پالتو جانوروں کی طرح ان کی اپنی کوئی سوچ یا پسند ناپسند نہیں تھی۔ وہ بس وہ کرتے تھے جو انہیں کرنے کا حکم ملتا تھا۔ اس حکم کی زد میں ان کا اپنا کوئی ساتھی بھی آ جائے تو انہیں کوئی فکر نہیں ہوتی تھی۔ اس وقت بھی ایسا ہی ہو رہا تھا۔ کتے کے پے در پے حملوں سے بچنے کی کوشش کرتا خالقو بار بار ان سے مدد اور رحم کی درخواست کر رہا تھا لیکن ان کے کان بند تھے۔ وہ نہایت سپاٹ انداز میں کھڑے بے بس انسانوں کو خونخوار کتوں کے ہاتھوں ادھڑتے ہوئے جانے کا منظر دیکھ رہے تھے۔ ان کے لیے یہ منظر ڈیوٹی سے بڑھ کر کچھ نہیں تھا۔ البتہ معصوم چرند پرند تھے جو کتوں کی وحشت ناک غراہٹوں اور دل دوز انسانی چیخوں سے گونجتے جنگل میں خوفزدہ نظر آتے تھے اور بے قراری سے یہاں وہاں اِدھر اُدھر دوڑتے بھاگتے پھر رہے تھے جیسے کسی طرح اس ظلم کو روکنے کی تدبیر سوچ رہے ہوں۔ وہ بے چارے کیا خاک کر پاتے۔ البتہ کتوں کے شکم سیر ہونے کے ساتھ وحشت ناک شور خود ہی ختم ہو گیا اور آہستہ آہستہ سب معمول پر آنے لگا۔ بھرے ہوئے پیٹ کے بھی حلق تک خوش خوراکی کرنے کے بعد سست پڑ کر اپنے رکھوالوں کے پاس واپس پہنچ گئے جنہوں نے ایک بار پھر انہیں زنجیروں میں قید کر دیا اور واپسی کے لیے روانہ ہو گئے۔ ادھر بہرام کو یہاں کی پل پل کی خبر دی جا رہی تھی۔ اختر اور اس کے ساتھیوں کی ہلاکت کی خبر بھی فوراً اس تک پہنچ گئی اور وہ یوں اطمینان سے سانس بحال کر کے کھڑا ہو گیا جیسے کوئی اہم فریضہ انجام دیا ہو۔ اپنے طور پر واقعی اس نے اہم فرض ادا کیا تھا۔ یہ اس کی ڈیوٹی میں شامل تھا کہ لوگوں کو جنگل کے اس مخصوص حصے تک نہ پہنچنے دے جہاں انجمن کے خیمے موجود ہیں۔ اگر اختر اور اس کے ساتھی اس جگہ سے دور ہی رہتے تو اس سمیت چوہدری کے کارندوں کو کوئی اعتراض نہ ہوتا لیکن ان لوگوں نے … ہی کوشش کی تھی اور کسی اور جگہ جانے کا بتا کر ایک ہی رات بدل کر ممنوعہ حصے کی طرف نکل گئے تھے جس کی سزا انہیں دردناک موت کی صورت میں دی جا چکی تھی۔

اس کام کے ختم ہو جانے کے بعد بہرام کئی گھنٹوں کے لیے فارغ تھا۔ اختر نے پہلے ہی اسے سمجھا دیا تھا کہ اگر وہ لوگ مقررہ وقت پر واپس نہ آئیں تو دو گھنٹے کے مزید انتظار کے بعد ان کی تلاش شروع کر دی جائے۔ اس حساب سے بہرام کے پاس خاصا وقت تھا۔ اس نے یہ وقت نہایت اطمینان سے گزارا۔ اسے فکر کرنے کی چنداں ضرورت نہیں تھی کہ اس عرصے میں ان پانچوں لاشوں کا کیا حال ہوا ہوگا۔ کتوں کے بعد اگر کچھ اور جنگلی جانور بھی ان لاشوں سے مستفید ہو جاتے تو یہ اس کے حق میں اور بھی زیادہ بہتر ہوتا۔ شام ڈھلے اس نے اختر کی ہدایت کے مطابق سمیر آفندی سے موبائل کی مدد سے رابطہ کیا۔ جاں آباد میں شہریار کے دور میں ہونے والے ترقیاتی کاموں کے نتیجے میں اتنی سہولت ہو گئی تھی کہ موبائل کے سگنل دور دراز … سمیت جنگل کے کچھ حصے تک مل جاتے تھے اور موبائل سے استفادہ کیا جا سکتا تھا۔

"ہاں بہرام، کیا مسئلہ ہے؟" پی اے کی طرف سے بہرام کی کال کی اطلاع سن کر سمیر فوراً ہی لائن پر آ گیا اور تشویش زدہ لہجے میں دریافت کیا۔ اختر رشتے میں اس کا کزن لگتا تھا اور اس نے ذاتی طور پر اس سے رابطہ کر کے اس دورے کے لیے اجازت دینے کی درخواست کی تھی لیکن بہرحال سمیر جانتا تھا کہ یہ کوئی تفریحی نوعیت کا دورہ نہیں ہے اور اختر کسی خفیہ ایجنسی کے لیے کام کر رہا ہے۔ یقینی طور پر یہ کام حساس نوعیت کا تھا اور ایسے کاموں میں خطرہ بھی ہوتا ہے اس لیے بہرام کی کال موصول ہوتے ہی وہ تشویش میں مبتلا ہو گیا۔

"مسئلہ بڑا پیچیدہ ہے سر جی! وہ جو آپ کے بھائی شہر سے آئے تھے، جنگل میں کچھ تحقیق کرنے کے لیے۔ ان کا اور ان کے ساتھیوں کا کچھ اتا پتا نہیں ہے۔ ساتھ میں میرا بندہ جو ان کی جیپ چلا رہا تھا، وہ بھی غائب ہے۔" بہرام نے اسے اطلاع دی۔

"تو تم کیا کر رہے ہو؟ مجھے اطلاع دینے سے کیا ہوگا؟ فوراً کوئی سرچ پارٹی تیار کر کے جنگل میں بھیجو۔ اتنا وقت ہو گیا ہے اگر وہ لوگ راستہ بھٹک گئے ہیں تو رات کے وقت انہیں وہاں زیادہ پریشانی ہوگی۔" اس کے اندیشوں کے مطابق بہرام سے ملنے والی خبر واقعی بری اور تشویش ناک تھی جسے سنتے ہی وہ بہرام پر برس پڑا۔

"پارٹی تو تیار ہے سر جی اور وہ لوگ بس نکل ہی رہے ہیں۔ میں نے آپ کو اطلاع اس لیے دی ہے کہ اختر بابو جاتے وقت کہہ کر گئے تھے کہ اگر وہ مقررہ وقت گزرنے کے دو گھنٹے بعد بھی واپس نہ آئیں تو آپ کو خبر کر دی جائے۔ ویسے بھی مجھے لگتا ہے کہ ان لوگوں کے ساتھ کوئی بڑی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ میرا بندہ ان کے ساتھ گیا تھا اس کے پاس وائرلیس … تھا۔ میں بہت دیر سے اس سے بات کرنے کی کوشش کر رہا ہوں

لیکن وہ کوئی جواب نہیں دیتا۔ حالانکہ اگر بندہ جنگل میں بھٹک جائے تو خود سب سے پہلے واکی ٹاکی پر رابطہ کر کے خبر دیتا ہے کہ وہ مشکل میں ہے۔" بہرام کے جواب نے حالات کی سنگینی کو کچھ اور بھی بڑھا دیا لیکن ضمیر امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہتا تھا چنانچہ آس بھرے لہجے میں بولا۔

"ہو سکتا ہے واکی ٹاکی خراب ہو گیا ہو یا پھر رینج کا مسئلہ ہو۔"

"ہاں یہ ہونے کو تو کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ ہمیں تو ہر چیز بری کو ذہن میں رکھ کر انہیں تلاش کرنا ہوگا۔ اب آپ اجازت دیں تو میں ادھر کی کارروائی دیکھوں۔" بہرام نے سرسری سا جواب دے کر فون بند کرنے کی اجازت چاہی۔

"ہاں، ٹھیک ہے تم اپنا کام کرو.... لیکن نہیں، دیا سنو.... ایسا کرو کہ چار بندوں پر مشتمل ایک سرچ پارٹی اپنے پیچھے چھوڑ جاؤ۔ میں اپنے ایک بندے کے ساتھ خود وہاں پہنچتا ہوں۔ اس پارٹی کو میں اپنے ساتھ رکھوں گا۔" اس نے اچانک ہی خود اس کام میں شامل ہونے کا فیصلہ کر لیا۔

"جیسی آپ کی مرضی سر لیکن آپ کا خاصا ٹائم لگ جائے گا۔ ہو سکتا ہے جتنی دیر میں آپ ڈاک بنگلے پہنچیں، ہم اپنا کام مکمل کر کے واپس بھی آ جائیں۔" بہرام نے اسے احساس دلایا کہ وہ کتنی دور موجود ہے۔

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن مجھے عجیب سی بے چینی ہو رہی ہے اور میرا دل کہہ رہا ہے کہ اس وقت مجھے وہاں ہونا چاہیے۔ اگر میرے پہنچنے سے پہلے تم اظفر اور اس کے ساتھیوں کو تلاش کر کے لانے میں کامیاب ہو گئے تو یہ اور بھی اچھا ہوگا۔ میں کچھ دیر کے لیے اس سے ملاقات کر کے واپس آ جاؤں گا۔"

"ٹھیک ہے سر! میں اپنے پیچھے چار بندے چھوڑ جاتا ہوں۔ اگر آپ کے پہنچنے تک میں اپنی ٹیم کے ساتھ واپس نہ آؤں تو آپ ان لوگوں کے ساتھ نکل پڑنا۔ باقی آگے اللہ مالک ہے۔" بہرام نے مکاری سے اسے جواب دیا جبکہ اس کے اپنے ذہن میں اب کوئی اور منصوبہ پل رہا تھا۔ اظفر سمیت ان سب کے انجام سے تو وہ واقف ہی تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ ان کی لاشیں اسے جنگل کے کس حصے سے ملیں گی لیکن اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ خود یہ لاشیں دریافت کرنے کے بجائے ان کی دریافت کا سہرا ضمیر کے سر رہے تو زیادہ بہتر ہے۔

ادھر ضمیر نے مشاہرم خان کو بلا کر صورت حال سے آگاہ کر کے گاڑی تیار کرنے کا حکم دیا۔ مشاہرم خان شروع ہی سے ذمے دار اور فرض شناس آدمی تھا اس لیے گاڑی کو ہمیشہ بہترین حالت میں رکھتا تھا۔ اس وقت بھی اس نے صرف احتیاطاً گاڑی کا تیل پانی چیک کیا اور وہ لوگ فوراً ہی وہاں سے روانہ ہو گئے۔ شام تو پہلے ہی ڈھل چکی تھی۔ مشاہرم خان کی تیز رفتاری کے باوجود انہیں ڈاک بنگلے تک پہنچتے پہنچتے اندھیرا پوری طرح پھیل گیا۔ بہرام بنگلے پر موجود نہیں تھا البتہ چار افراد ساز و سامان کے ساتھ تیار ان کے منتظر تھے۔

"نہیں صاحب! کوئی پتا نہیں ملا۔ بہرام ساتھیوں کے ساتھ تلاش میں گیا ہوا ہے۔ تھوڑی دیر پہلے واکی ٹاکی پر اس سے بات ہوئی تھی۔ وہ لوگ کوشش کر رہے ہیں لیکن ابھی کچھ پتا نہیں چل رہا۔" ضمیر کے استفسار پر ایک آدمی نے اسے تازہ حالات سے آگاہ کیا تو اس کی پریشانی میں اضافہ ہو گیا۔

"ہم لوگ آپ کا ہی انتظار کر رہے تھے۔ بہرام اور اس کے ساتھی جدھر گئے ہیں، ہم اس سے ہٹ کر دوسرے علاقے میں اظفر صاحب لوگوں کو ڈھونڈنے کی کوشش کریں گے۔" ضمیر کو خاموش پا کر وہ آدمی ایک بار پھر بولا تو وہ بھی فوراً متحرک ہو گیا کہ یہاں کھڑے ہو کر پریشان ہونے سے تو کچھ بھی حاصل ہونے والا نہیں تھا۔ جو لوگ جنگل میں داخل ہوئے تھے، انہیں ڈھونڈنے کے لیے جنگل میں داخل ہونا ضروری تھا۔ ذرا دیر میں ہی ان کا سفر دوبارہ شروع ہو گیا لیکن اس بار وہ اپنی گاڑی کے بجائے محکمہ جنگلات کی جیپ میں سفر کر رہے تھے۔ ان لوگوں کے پاس طاقتور سرچ لائٹس اور بڑی بڑی ٹارچیں موجود تھیں جن کی روشنی میں وہ اردگرد کا جائزہ لے سکتے تھے۔ جنگل کی دنیا میں اس بے وقت کی انسانی مداخلت نے وہاں موجود مخلوق کو بے چین کر دیا تھا اور روشنی میں وہ ادھر ادھر بھاگتے نظر آ رہے تھے۔ مختلف جانوروں کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں اور باوجود یہ کہ وہ تعداد میں کئی تھے اور ان کے پاس مناسب اسلحے کے ساتھ ساتھ روشنی کا بھی معقول انتظام تھا، خود کو جنگل کی ہولناکی سے بے نیاز محسوس کرنا ممکن نہیں تھا۔ رات ہو جانے کے باوجود جنگل مکمل طور پر سویا ہوا نہیں تھا۔ شب پسند جانوروں کی آوازوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ جنگل کے مکین انسانی مداخلت میں بیدار ہیں اور انہیں اپنے گھر میں ہونے والی مداخلت اچھی نہیں لگ رہی۔ کئی سوئے ہوئے جانور بھی

جاگ گئے تھے اور اپنی اپنی بولیوں میں احتجاج کر رہے تھے۔ اس ہولناک ماحول کے باوجود وہ لوگ واپس جانے کا نہیں سوچ سکتے تھے۔ انہیں جنگل کی ہولناکیوں میں گم ہو جانے والے اپنے ساتھیوں کو تلاش کرنا تھا۔

"وہ دیکھو.... ادھر..... ادھر کچھ ہے۔" جیپ درمیانی رفتار سے آگے بڑھ رہی تھی کہ ایک آدمی ہاتھ سے اشارہ کرتا ہوا چیخا۔ سب کے سب اس طرف متوجہ ہو گئے اور روشنیوں کا رخ اس طرف کر دیا۔ روشنی پڑتے ہی کئی چار پاؤں والے جانور وہاں سے نکل کر بھاگے۔ ڈرائیور نے جیپ روک دی تھی۔ وہ سب تیزی سے جیپ سے نیچے کود گئے۔ منظر ہولناک تھا۔ اترتے ہی وہ ادھڑی ہوئی لاشیں انہیں نظر آ گئی تھیں۔ ضمیر نے فوراً ہی ان لاشوں کو اظفر اور اس کے ساتھی فوٹو گرافر کے طور پر شناخت کر لیا۔ ان کے جائزہ لینے کے دوران باقی لوگ ادھر ادھر پھیل چکے تھے۔ باقی تین افراد کو بھی جلد ہی تلاش کر لیا گیا۔ زمین پر سب تھے اور وہاں موجود ان کی جیپ کو دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا کہ جنگل میں پہنچ کر تھوڑی دیر بعد ان کے ساتھ حادثہ پیش آ گیا تھا۔ لاشوں کی ادھڑی ہوئی حالت دیکھ کر یہی لگتا تھا کہ وہ اچانک درندوں کے کسی غول کے نرغے میں آ گئے تھے اور انہیں اپنے بچاؤ کی مہلت نہیں مل سکی تھی۔

"کیا یہاں خونخوار درندے بھی پائے جاتے ہیں؟" ضمیر نے ستے ہوئے چہرے کے ساتھ سوال کیا۔

"یہاں بھیڑیے اور خونخوار کتے موجود ہیں لیکن وہ عام طور پر دن کی روشنی میں اپنے ٹھکانوں سے نکل کر شکار نہیں کرتے اور ان لاشوں کی حالت دیکھ کر صاف لگ رہا ہے کہ ان کے ساتھ کئی گھنٹے پہلے حادثہ پیش آیا تھا۔" وہ آدمی افسردگی سے ان کے ساتھ گفتگو کرتا ہوا بتانے لگا۔ یہاں پہنچ کر ہی وہ بہرام کو واکی ٹاکی پر واقعے کی اطلاع دے چکے تھے۔ بہرام بھی لوکیشن سے آگاہ کر چکا تھا اور اب اپنے ساتھیوں کو وہاں لا رہا تھا۔

"یہ بندہ مرا نہیں ہے سر..... ابھی اس کی سانس باقی ہے۔" مشاہرم خان جو کہ گروپ کے افراد کے ساتھ لاشوں کو چیک کرنے کے کام میں از خود شامل ہو چکا تھا، اظفر کے ساتھ آنے والے ڈرائیور پر جھکا ہوا چیخا۔ اس کی آواز پر ضمیر اور دوسرے لوگ تیزی سے اس طرف بھاگے۔ ڈرائیور خالقو کا جسم بری طرح زخمی تھا۔ ہاتھ پیروں اور جسم کے دوسرے کئی مقامات پر سے گوشت بالکل غائب تھا اور ہڈیاں نظر آ رہی تھیں۔ یہاں تک کہ اس کی ایک آنکھ کا ڈیلا بھی باہر آ چکا تھا لیکن اس چھتیس گڑھائی کے باوجود یہ حقیقت تھی کہ اس کی سانس چل رہی تھی۔ سانس کی ڈوری بے حد مدھم تھی اور لگتا تھا کہ کسی بھی وقت ڈوب جائے گی لیکن ان پانچ افراد میں سے اس واحد شخص میں زندگی کی رمق پا کر وہ لوگ جوش میں آ گئے۔

"اسے جیپ میں ڈالو خان! اسے فوری طبی امداد ضروری ہے۔" ضمیر نے چلا کر مشاہرم خان کو حکم دیا جس نے اس کے حکم کی تعمیل میں لمحہ بھی نہیں لگایا۔

"تم لوگ یہاں رک کر بہرام کا انتظار کرو۔ میں ڈرائیور کے ساتھ اس بندے کو لے جا رہا ہوں۔ تم لوگ ڈیڈ باڈیز لے کر بہرام کے ساتھ آ جانا۔" ضمیر نے کسی کو کچھ بھی کہنے کا موقع دیے بغیر خود ہی فیصلہ سنایا اور جیپ کی اگلی نشست پر بیٹھ گیا۔ جیپ ڈرائیور کو بھی پھرتی دکھانی پڑی۔ پیچھے مشاہرم خان نیم جان خالقو کو سنبھالے بیٹھا تھا۔

"تمہاری جیپ میں فرسٹ ایڈ باکس تو ہوگا؟" جیپ آگے بڑھی ہی تھی کہ ضمیر نے ڈرائیور سے دریافت کیا۔

"یس سر! پچھلی والی سیٹ کے نیچے ہے۔" اس نے فوراً جواب دیا۔ ضمیر کے کچھ کہنے سے پہلے ہی مشاہرم خان نے سیٹ کے نیچے سے فرسٹ ایڈ باکس نکال لیا لیکن اسے کچھ نہیں آ رہا تھا کہ اس قدر زخمی آدمی کو کس طرح طبی امداد دے۔ اس کا پورا وجود زخمی تھا اور یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ مرہم پٹی کا کام کہاں سے شروع کیا جائے۔ آخر اس نے ہمت کر کے اس کی نہایت بھیانک محسوس ہونے والی آنکھ کے ڈھیلے پر دوا میں ڈوبا روئی کا پھایا رکھ کر پٹی باندھنے کی کوشش کرتے ہوئے اس کام کا آغاز کر دیا۔ ضمیر بھی اس کا ساتھ دینے کے لیے اگلی نشست کو پھلانگ کر پیچھے چلا آیا۔ سب سے پہلے اس نے زخمی خالقو کی نبض چیک کی۔ نبض بہت سست رفتاری سے چل رہی تھی اور ایسا لگ رہا تھا کہ کسی بھی لمحے اس کا زندگی سے رشتہ ٹوٹ جائے گا۔ ضمیر نے بے تابی سے فرسٹ ایڈ باکس کا جائزہ لیا اور ایک ننھی سی شیشی پر نگاہ پڑتے ہی اس کا سرا توڑ کر سرنج میں محلول کو بھرا۔ چلتی گاڑی اور اس کی محدود روشنی میں یہ کام کرنا اتنا آسان نہیں تھا۔ لیکن ایک انسانی زندگی کو بچانے کی لگن ان دونوں کے ہاتھوں کو حرکت دے رہی تھی۔ اس کے زخمی بازو میں دوا انجیکٹ کرتے ہی فوری ردعمل ظاہر ہوا اور اس کی سانس کی رفتار یکدم بڑھ گئی لیکن انداز ایسا تھا جیسے کوئی چراغ بجھنے سے پہلے پھڑپھڑا رہا ہو۔

"اس کے منہ میں پانی ڈالو خان۔" اس نے مشاہرم

خان کو نظر دیا تو اس نے فوراً ہی پانی کی بوتل اس کے منہ سے لگا دی۔ مشکل سے چند قطرے پانی ہی نیم جان خاقو کے حلق سے نیچے اتر سکا۔ باقی دونوں طرف کی باچھوں سے بہہ گیا لیکن چند قطرے پانی نے ہی خاصا کام دکھایا اور خاقو کی باقی بچ جانے والی اکلوتی آنکھ کے پپوٹے میں حرکت محسوس ہونے لگی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ آنکھ کھولنے کی کوشش کر رہا ہو لیکن اس کوشش میں کامیاب نہ ہو پا رہا ہو۔

"آنکھ کھولو مین! دیکھو تم محفوظ جگہ پر ہو۔ ہمیں بتاؤ کہ تمہارے ساتھ کیا ہوا ہے؟" اس کے رخسار پر ہاتھ مارتے ہوئے عمیر دیوانہ وار اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا لیکن خاقو کی آنکھ نہ کھل سکی۔ بس ہونٹوں نے یوں جنبش کی جیسے وہ کچھ کہنا چاہ رہا ہو لیکن اس کے جسم میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ آواز باہر نکل سکتی۔ عمیر نے اپنا کان اس کے ہونٹوں کے ساتھ بالکل چپکا لیا۔

"چ...... چودھ...... ری...... اف...... اف...... یوں۔" بہت ہی دھیمی سرگوشی میں یہ چند ٹوٹے ہوئے لفظ اس کی سماعتوں سے ٹکرائے اور پھر فوراً ہی خاقو کے جسم کو ایک زوردار جھٹکا لگا۔ جھٹکے کے ساتھ ہی اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔ عمیر کوشش کرنے لگا کہ کسی طرح اس کے بے جان وجود میں زندگی کی رمق کو محسوس کر سکے لیکن وہاں نہ تو دھڑکن تھی، نہ سانسوں کی سرسراہٹ۔ زندگی کا احساس دلانے والی نبض بھی مکمل طور پر ڈوب چکی تھی۔

"افسوس، یہ بھی نہیں رہا۔" عمیر پیچھے ہٹ گیا۔ اس شخص کی زندگی بچانے کی خواہش میں وہ اپنے کزن اظفر کی لاش کو نظر انداز کر کے آ گیا تھا لیکن پھر بھی اسے بچانے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ خاقو کی لاش کو تکتے پیچھے مشاہرم خان نے دیکھا کہ اس کی آنکھیں لہو رنگ ہو رہی ہیں۔ آنکھوں کا یہ رنگ دیکھ کر اسے شہریار کی یاد آئی۔ ایسے کسی موقع پر وہ بھی ایسی کیفیات کا شکار نظر آتا تھا۔

"اب کیا کرنا ہے سر؟" پچھلی کار کی نشست پر بیٹھے ڈرائیور کی آواز نے در آنے والے خاموشی کے وقفے کو توڑا۔

"واپس بنگلے چلو۔ پیچھے واپس جانا بیکار ہے۔" عمیر نے اسے جواب دیا۔ حقیقتاً اس وقت وہ بڑی مشکل سے خود کو سنبھالے ہوئے تھا۔ مرتے ہوئے خاقو نے جو آخری دو الفاظ ادا کیے تھے وہ بہت اہم تھے اور اسے یقین تھا کہ ان الفاظ کو ڈرائیور نے تو کیا اس کے قریب بیٹھے مشاہرم خان نے بھی نہیں سنا ہوگا۔

ادھر ڈرائیور اس کا جواب سننے کے بعد دوبارہ ڈرائیونگ میں مصروف ہو گیا۔ پہلے اس نے بہرام کو خاقو کی موت کی خبر سنائی پھر بنگلے پر موجود عملے کے کسی فرد کو آگاہ کرنے لگا کہ وہ لوگ واپس آ رہے ہیں اور ان کے ساتھ لاش موجود ہے۔ اس موقع پر عمیر اور مشاہرم خان بالکل خاموش تھے۔ اسی خاموشی کے ساتھ انہوں نے واپسی کا سفر مکمل کیا۔ وہ لوگ بنگلے پر پہنچے تو وہاں پہلے ہی دو آدمی مستعد تھے۔ انہوں نے فوراً ہی خاقو کی لاش جیپ سے اتار کر ایک طرف رکھی اور اسے ایک چادر سے ڈھانپ دیا۔

"آپ اندر چل کر بیٹھیں سر! بہرام وغیرہ باقی لاشوں کو لے کر واپس آ جائیں تو پھر دیکھتے ہیں آگے کیا کرنا ہے۔" ڈرائیور نے عمیر سے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" اس نے فوراً ہی یہ تجویز قبول کر لی اور مشاہرم خان کو مخاطب کر کے بولا۔ "آؤ خان! اندر چل کر بیٹھتے ہیں۔" مشاہرم خان نے خاموشی سے اس کی بات پر عمل کیا۔

"اس حادثے کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟" دونوں کے نشستیں سنبھال لینے کے بعد عمیر نے دھیمی آواز میں اس سے دریافت کیا۔

"مجھے لگتا ہے کہ یہ کوئی اتفاقی حادثہ نہیں ہے بلکہ باقاعدہ منصوبہ بندی کی گئی ہے۔" مشاہرم خان نے فوراً ہی اسے اپنی رائے سے آگاہ کیا۔

"کیوں...... تم کس بنیاد پر ایسا کہہ رہے ہو؟" عمیر نے اضطراب سے پوچھا۔

"اپنے مشاہدے کی بنیاد پر۔ مرنے والے پانچوں افراد مسلح تھے اور ان کی بہادری اور پھرتی کے بارے میں بھی مجھے کوئی شبہ نہیں ہے۔ لیکن عجیب بات ہے کہ جائے وقوعہ پر کہیں بھی مزاحمت کے آثار نظر نہیں آئے۔ پانچوں میں سے کسی نے بھی اپنا ہتھیار وہاں استعمال کیا نہ ہی خنجر جو اب بھی ان کی پیٹیوں سے بندھے ہوئے ہیں۔ اگر ہم مان لیں کہ ان پر اچانک افتاد ٹوٹی تھی پھر بھی یہ بات بہت غیر فطری لگتی ہے کہ پانچ مسلح افراد میں سے کسی کو بھی اپنے اسلحے کو استعمال کرنے کا خیال نہیں آیا۔ خاص طور پر اس لیے بھی کہ خطرہ ان کے لیے کوئی غیر معمولی چیز نہیں تھی اور جنگل میں داخل ہوتے وقت تو انہیں لازماً ذہنی طور پر کسی بھی برے وقت کے لیے تیار رہنا چاہیے تھا۔" مشاہرم خان نے بلا جھجک اپنا مدلل تجزیہ پیش کر دیا۔

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو، یہ واقعی قتل ہے۔ بالکل ویسا ہی قتل جس طرح پہلے شہزادی کو ہلاک کیا گیا تھا اور اس کی موت کو حادثاتی رنگ دے دیا گیا تھا۔ شاید وہ بھی ایسے کسی راز سے واقف ہو گئی تھی جس کی تلاش میں یہ چاروں یہاں آئے تھے۔ لیکن مجھے یہ سمجھ نہیں آ رہا کہ ان کا اپنا ساتھی کیسے مارا گیا؟" عمیر نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے اپنی الجھن بیان کی۔ وہ دونوں نہایت دھیمی آواز میں اور احتیاط سے گفتگو کر رہے تھے تاکہ کوئی اور ان کی آواز نہ سن سکے۔

"دو باتیں ہو سکتی ہیں، یا تو خاقو غیر اہم اور ناواقف بندہ تھا یا پھر انہوں نے ارادے کو حقیقت کا رنگ دینے کے لیے اپنے ہی ساتھی کو بلی چڑھا دیا ہے۔" مشاہرم خان کے پاس جواب موجود تھا جس سے عمیر نے بھی اتفاق کیا۔ اسی وقت انہوں نے بنگلے کے احاطے میں گاڑیاں رکنے کی آوازیں سنیں۔

"شاید وہ لوگ واپس آ گئے ہیں۔" عمیر بے قراری سے اٹھا۔ مشاہرم خان نے اس کی پیروی کی اور دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے باہر پہنچے۔ باہر لاشیں اتاری جا رہی تھیں۔ ایسی لاشیں جن کی حالت دیکھ کر کوئی بھی انسان جس کے دل میں انسانیت کی رمق باقی ہو، دکھ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ اور عمیر کا تو اظفر سے خونی رشتہ تھا، اس نے اپنے دل میں دکھ کی ایسی انی اترتی محسوس کی جس کا احساس روح تک میں اتر گیا۔

☆☆☆

"ہمیں نواب نوازش علی سے ملنا ہے۔" وہ دو سادہ پوش تھے جن کا ہیئر اسٹائل اور باڈی لینگویج ان کے یونیفارم میں نہ ہونے کے باوجود اس بات کا اعلان کر رہی تھی کہ وہ قانون نافذ کرنے والے کسی ادارے سے تعلق رکھتے ہیں۔ گیٹ پر موجود چوکیدار خواجہ سرا ان دونوں کو دیکھ کر گھبرا گیا۔ پہلے ہی رنجی کے غیاب سے کوٹھی کی فضا خاصی بوجھل تھی۔ آشا نے اس کی جان کھائی تھی کہ اس کے ہوتے ہوئے رنجی کوٹھی سے کیسے غائب ہوئی۔ اس نے قسمیں کھا کھا کر یقین دلایا تھا کہ وہ ساری رات نہایت چاق و چوبند رہ کر ڈیوٹی انجام دیتا رہا ہے اور پوری رات کے دوران کسی انسان کا تو کیا...... اک چڑیا کا بچہ بھی کوٹھی سے باہر نہیں گیا لیکن آشا نے پھر بھی اسے نہیں بخشا تھا اور یہی کہتی رہی تھی کہ وہ غفلت کا مرتکب ہوا ہے۔ ان مخدوش حالات میں سادہ لباس پولیس والوں کا نواب صاحب سے ملنے کے لیے آنا خاصی تشویش ناک خبر تھا۔

"نواب صاحب تو تشریف نہیں رکھتے۔ آپ لوگ اپنا کارڈ وغیرہ دے جائیں۔ وہ آئیں گے تو انہیں آگاہ کر دیا جائے گا۔" اس نے جان بوجھ کر آنے والوں کی پہچان سے تغافل برتتے ہوئے جواب دیا۔ ویسے بھی آج کے لیے آشا کی یہی ہدایت تھی کہ آنے والے ہر ملاقاتی کو باہر سے ہی ٹال دیا جائے۔ کوٹھی میں ان خواجہ سراؤں کا اتنا اثر و رسوخ تھا کہ نواب صاحب کے غیر کو بھی بلا اجازت ایجنسی سے نکل کر کوٹھی کا رخ کرنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔

"نواب صاحب کہاں گئے ہیں؟" آنے والوں نے اس کا جواب سنا تو ضرور لیکن عمل کرنے کے بجائے سخت لہجے میں سوال داغ دیا۔

"مالک کے معاملوں کی نوکر کو بھلا کیا خبر۔ وہ اپنی مرضی کے مالک ہیں۔ جب چاہتے ہیں، جہاں چاہتے ہیں جاتے ہیں اور جب چاہیں واپس آ جاتے ہیں۔ ہم غریبوں کو ان سے سوال کرنے کی جرأت کیسے ہو سکتی ہے۔"

اس نے بڑا سیاسی سا جواب دے کر ایک طرح سے واضح کر دیا کہ اگلا کوئی سوال بھی بیکار ہے اور وہ انہیں اپنے مالک کی مصروفیات سے قطعی آگاہ نہیں کر سکتا۔

"ٹھیک ہے، نواب صاحب موجود نہیں بھی ہیں تو ہمیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہمارے پاس کوٹھی کا سرچ وارنٹ موجود ہے اور ہم یہاں کی تلاشی لینا چاہتے ہیں۔" آنے والوں نے یہ ظاہر کیے بغیر کہ وہ پچھلے کئی گھنٹوں سے کوٹھی کو زیر نگرانی رکھے ہوئے ہیں اور جانتے ہیں کہ نواب صاحب کوٹھی سے باہر نہیں نکلے، اسے اپنی آمد کے مقصد سے آگاہ کیا۔

"معافی چاہتی ہوں صاحب! نواب صاحب کی غیر موجودگی میں کسی کو کوٹھی میں آنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔"

"تم سے اجازت مانگ کون رہا ہے؟ ہم صرف قانون کی اجازت لیتے ہیں اور قانون نے ہمیں یہ اجازت دے دی ہے۔" اس کا جواب سن کر آنے والوں کا غصہ کچھ بڑھ گیا اور انہوں نے ترشی سے جواب دیتے ہوئے اس پر اپنی پوزیشن واضح کی۔ پھر ان میں سے ایک نے فضا میں ہاتھ بلند کر کے ایک خاص قسم کا اشارہ کیا تو جانے کن کونے کھدرے میں چھپے مسلح افراد سامنے آ گئے۔ ان مسلح افراد کو دیکھ کر چوکیدار کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔

"ایک منٹ رکیں صاحب! میں اندر سے منیجر کو بلا لاتی ہوں۔" چوکیدار خواجہ سرا کی گھبراہٹ لازمی تھی۔ وہ اس کوٹھی کے رازوں سے واقف تھا اور جانتا تھا کہ پولیس نے

اگر کوٹھی کے اندر سرچ آپریشن کیا تو نہ صرف نواب صاحب کو دریافت کرے گی بلکہ اسلحے کا وہ ذخیرہ بھی نظروں میں آجائے گا جسے نواب صاحب کی لاعلمی میں کوٹھی کے تہ خانے میں رکھا گیا ہے۔

"ٹھیک ہے بلاؤ منیجر کو...... دیکھتے ہیں وہ کتنا طرم خان ہے اور ہمیں کیسے روک سکتا ہے۔" وہ لوگ سمجھ رہے تھے کہ چوکیدار تاخیری حربے آزما کر کسی طرح انہیں سرچ آپریشن سے روکنا چاہتا ہے لیکن ان کی تیاری بھی مکمل تھی اور انہوں نے کوٹھی کے اطراف میں انتظام بدرست محاصرہ کر رکھا تھا کہ کسی کا بھی یہاں سے بچ کر بھاگ نکلنا مشکل تھا۔

"آشا دیوی! منیجر صاحب کو باہر بھیج دیں۔ باہر پولیس والے آئے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان کے پاس کوٹھی کی تلاشی کا وارنٹ موجود ہے۔" منیجر کو بلانے کا تو محض بہانہ تھا۔ اصل میں اسے اندر کی کمانڈ سنبھالے بیٹھی آشا کو آگاہ کرنا تھا اس لیے بجائے منیجر سے براہ راست رابطہ کرنے کے آشا کو انٹرکام پر اطلاع دی۔

"ٹھیک ہے، انہیں انتظار کرواؤ۔ منیجر ابھی آتا ہے۔" آشا نے گمبھیر لہجے میں اس کی بات کا جواب دیا۔ کچھ منٹ کے انتظار کے بعد سن رسیدہ سا منیجر ہانپتا کانپتا گیٹ پر نمودار ہوا۔

"میں کیا سن رہا ہوں سر! آپ نواب نوازش علی کی کوٹھی کی تلاشی لینا چاہتے ہیں؟" اس نے نہایت حیرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے آنے والوں سے دریافت کیا۔ یہ اور بات کہ اس کی حیرت کے اظہار پر چہرے پر چھایا ہوا خوف غالب تھا۔

"اگر یقین نہیں آتا تو یہ وارنٹ دیکھ لو۔" آفیسر نے اس کی طرف وہ وارنٹ بڑھایا جس کو چوکیدار نے ہاتھ تک نہیں لگایا تھا۔ منیجر نے اس کے ہاتھ سے کاغذ لے کر غور سے پڑھا۔

"سرکاری حکم سے انکار نہیں سر لیکن ذرا سوچیں کہ اگر مسلح افراد نے کوٹھی کی تلاشی لی تو نواب صاحب کی عزت ملیامیٹ ہو جائے گی۔ لوگ کیا کہیں گے کہ نواب نوازش علی کی کوٹھی پر پولیس نے ریڈ کیا ہے۔ آپ کو ان پر جو بھی شبہ ہے، وہ غلط ہے۔ نواب صاحب ایک امن پسند شہری ہیں اس لیے میری آپ سے درخواست ہے کہ ان کی عزت کا خیال کریں اور اگر یہ معاملہ کسی اور طرح سے حل ہو سکتا ہے تو بتا دیں، ہم آپ کی ہر طرح کی خدمت کے لیے تیار ہیں۔" منیجر نہایت عاجزانہ لہجے میں بات کر رہا تھا لیکن اس کی اس عاجزی کا جواب بڑی سختی سے دیا گیا۔

"ہمیں لالچ دے رہا ہے بڈھے! ہم وہ لوگ نہیں ہیں جو چند ٹکوں کی خاطر اپنا ایمان بیچ دیتے ہوں گے۔ ہم جس کام کی تنخواہ لیتے ہیں اسے پورا کرتے ہیں۔ تیرے جیسوں کے بہکانے پر محنت کرنے نہیں بیٹھ جاتے۔ تو اپنے نواب کی عزت کی کیا بات کرتا ہے۔ اس کوٹھی میں لڑکوں کی فوج بھرتی کر کے اس نے بہت عزت کمائی ہے جو ہمارے ریڈ کرنے سے خراب ہو جائے گی۔" ان میں سے ایک نے طیش میں آ کر منیجر کی پتلی سی گردن کو دبوچ لیا۔ منحنی سا منیجر اس کے تیور دیکھ کر بری طرح کانپنے لگا۔

"اسے موبائل میں ڈالو۔ اب ان لوگوں سے کوئی بات کرنا بیکار ہے۔ ہمیں زبردستی کوٹھی کے اندر گھسنا ہوگا۔" دوسرے افسر نے مشورہ دیا تو پکڑنے والے نے منیجر کو اپنی پشت پر کھڑی جیپ کی طرف دھکیل دیا۔ اسی وقت کوٹھی کی طرف سے ایک ہوائی فائر ہوا۔ رد عمل میں فوراً ہی سپاہیوں نے اپنی بندوقیں سیدھی کر لیں اور دونوں افسران نے بھی ہولسٹر میں موجود خودکار پستول کھینچ لیں لیکن پھر بھی ان سے ذرا سی چوک ہو گئی تھی اور منیجر سے نمٹنے کے دوران چوکیدار نے برق رفتاری سے اندر گھس کر گیٹ بند کر لیا تھا۔

"بہتر ہے کہ تم لوگ یہاں سے دور ہٹ جاؤ۔ ہم اپنی جان پر کھیل جائیں گے لیکن کسی کو کوٹھی کے اندر داخل ہونے نہیں دیں گے۔" فائر کی آواز معدوم ہوتے ہی اندر سے کسی نے چیخ کر کہا۔

"قانون کے مقابل آ کر تم لوگ اپنے لیے مشکلات کھڑی کر رہے ہو۔ کوٹھی پوری طرح محاصرے میں ہے اور ہماری نظروں میں آئے بغیر چڑیا کا بچہ بھی باہر نہیں نکل سکتا۔ اس لیے بہتر ہو گا کہ ہمیں اندر آنے کا راستہ دے دو۔ ہم اپنا کام بغیر خون خرابے کے خاموشی سے کرنا چاہتے ہیں۔" ادھر سے جواب دیا گیا۔

"خون خرابا اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ تم لوگ کوٹھی کے آس پاس سے محاصرہ ختم نہ کرو اور ہمیں یہاں سے محفوظ طریقے سے نکلنے سے روکو۔ ہمارے لیے جان دینا اور لینا کوئی مشکل بات نہیں ہے۔ لیکن یاد رکھو کہ اگر تم نے ہماری بات نہیں مانی تو نواب نوازش علی اور اس کی بیگم بے موت ماری جائے گی۔ ہماری بات نہ ماننے کی صورت میں ہم انہیں ایک ایک کر کے ہلاک کر دیں گے۔" اندر سے مزید جارحانہ لہجے میں دھمکی دی گئی۔

"ہم اس دھمکی میں آنے والے نہیں ہیں۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی چوکیدار نے ہمیں بتایا ہے کہ نواب صاحب کوٹھی میں موجود نہیں ہیں۔" ادھر والوں کو بھی سب حقیقت حال سے آگاہی تھی لیکن محض وقت لینے کے لیے یہ جواب دیا۔ اس بات کا خدشہ تو پہلے ہی موجود تھا کہ اندر والوں نے مزاحمت کی تو سب سے پہلا قدم وہ یہی اٹھائیں گے کہ نواب صاحب اور ان کی بیگم کو یرغمال بنانے کی کوشش کریں۔ جاوید علی نے انہیں حالات سے جس حد تک آگاہ کیا تھا، اس کے مطابق نواب نوازش علی کی بیگم محفوظ تھی لیکن خود نواب اور ان کے ایک جاں نثار خواجہ سرا کی حفاظت کے لیے جاوید علی کچھ نہیں کر سکا تھا اور وہ بدستور خطرے میں تھے۔

"تم سے جھوٹ کہا گیا تھا۔ سچ یہ ہے کہ نواب نوازش علی، اس کی بیگم اور اس کی وفادار ملازمہ سب بھی اندر موجود ہیں۔ اگر تم لوگوں نے ہماری بات نہ مانی تو وہ سب اپنی جان سے چلے جائیں گے۔" اندر سے جواب دیا گیا۔

"ہم تمہاری بات کا یقین نہیں کر سکتے۔ تم ثبوت دینے کے لیے نواب صاحب کو کوٹھی کی چھت پر لے آؤ تا کہ ہم انہیں اپنی آنکھ سے دیکھ سکیں۔" ادھر سے مطالبہ کیا گیا۔

"تم نے ہمیں بے وقوف سمجھ رکھا ہے کیا؟ ہمیں معلوم ہے کہ جیسے ہی ہم میں سے کوئی نواب صاحب کو لے کر کوٹھی کی چھت پر پہنچے گا، تمہارے اسنائپرز اسے شوٹ کر دیں گے۔" اندر سے چلاتی ہوئی آواز میں جواب دیا گیا۔ ایک گھنے درخت کی شاخوں میں چھپا بیٹھا جاوید علی اس آواز کو شناخت کر سکتا تھا۔ وہ یقینی طور پر آشا کی تھی جو اس وقت دہشت گردوں کے اس ٹولے کی کمانڈ سنبھالے ہوئے تھی۔

"اس سے کہو کہ نواب صاحب کو چھت کے بجائے اوپری منزل کی سامنے والی کھڑکی میں لے کر آئے۔ کھڑکی میں کھڑے ہو کر چھت کے مقابلے میں خاصا محفوظ رہا جا سکے گا۔ آگے کا کام ہے کہ میں انہیں کس طرح سنبھالتا ہوں۔" اس سچویشن پر جاوید علی نے اپنی خاموشی توڑ کر باہر موجود آفیسر سے رابطہ کر کے اسے مشورہ دیا۔ آفیسر نے فوراً اس مشورے پر عمل کیا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اصل مسئلہ نواب صاحب اور ان کے وفادار خواجہ سرا کا ہے۔ اس خواجہ سرا کے بارے میں یقین سے نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ زندہ بھی ہے یا نہیں۔ خواتین کے بارے میں البتہ معلوم تھا کہ وہ محفوظ ہیں اور انہیں ان کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

"ٹھیک ہے، میں تمہاری یہ بات مان رہی ہوں لیکن یاد رکھنا کہ ہمارے ساتھ کوئی چال چلنے کی کوشش نہ کرنا۔" افسر کے مطالبے کے جواب میں آشا نے ذرا سا توقف کیا پھر دھمکی دیتے ہوئے بولی۔

"دھوکے کی صورت میں، فوراً ہی نواب صاحب کو گولی مار دی جائے گی اور اس کے بعد باقی لوگوں کو بھی۔ ہماری جانیں تمہیں کسی صورت سستی نہیں پڑیں گی اور ہم یہاں سے زندہ نہیں نکل سکے تو کسی اور کی جان بھی نہیں بچے گی۔"

"ٹھیک ہے، ہم نے سب سن لیا ہے۔ پہلے تم نواب صاحب کو تو سامنے لاؤ پھر ہم دوسرے مسئلوں پر بات کریں گے۔" مجاز آفیسر نے اسے جواب دیا۔ آشا کی دھمکیوں کے پیچھے موجود خوف اس سے پوشیدہ نہیں رہا تھا لیکن ابھی معاملے کو نہایت احتیاط سے ہینڈل کرنے کی ضرورت تھی۔ کوٹھی میں محصور مجرم اسی کیفیت سے گزر رہے تھے جس سے کسی بند کمرے میں موجود بلی گزرتی ہے۔ اس محصور و مجبور بلی سے پلٹ کر پنجہ مارنے کا اندیشہ رہتا ہے اور یہاں بھی سب کی نیت تھی کم از کم نواب نوازش علی اور کاجل کی زندگی خطرے میں تھی۔ اخلاقی بے راہ روی کے باوجود ابھی تک اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ملا تھا کہ نواب صاحب ملک دشمن کارروائیوں میں ملوث ہیں بلکہ آثار سے یہی لگتا تھا کہ ان کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کی لاعلمی میں انہیں استعمال کیا جا رہا ہے۔

ادھر درخت پر چھپا جاوید علی پوری طرح ہوشیار تھا۔ اس نے نواب صاحب کو کوٹھی کی بالائی منزل پر بلوانے کی تجویز اسی لیے پیش کی تھی کہ اسے معلوم تھا، وہاں تک پہنچنے کے لیے اسی راستے سے گزرنا پڑے گا جہاں وہ گھات لگائے بیٹھا ہے۔ امکان یہی تھا کہ نواب صاحب کو بالائی منزل پر آشا خود لے کر جائے گی۔ البتہ وہ اپنی معاونت کے لیے ایک دو افراد کو ساتھ رکھ سکتی تھی اور محفوظ پوزیشن پر ہونے کی وجہ سے جاوید علی کے لیے دو تین افراد سے بیک وقت نمٹنا بالکل بھی مشکل نہیں تھا۔ وہ راستے پر آنکھیں جما کر بیٹھ گیا۔ اس کے اندازے کے برخلاف وہاں سے نواب صاحب اور آشا کے نمودار ہونے کے بجائے دو اسلحہ بردار خواجہ سرا بھاگتے ہوئے آئے۔ اس نے ان کے پیچھے دیکھنے کی کوشش کی۔ حد نظر تک کوئی اور موجود نہیں تھا۔ شاید آشا نے خود اوپر جانے سے پہلے ان دونوں کو جائزہ لینے کے لیے بھیجا تھا، یا یہ بھی ممکن تھا کہ وہ لوگ اپنے دعوے کی سچائی ظاہر کرنے کے لیے اوپر موجود خواتین کو اپنی تحویل میں لینے کی خواہش میں اس طرف آئے ہوں۔ جاوید علی چاہتا تو آسانی سے ان دونوں کو نشانہ بنا سکتا تھا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ ان کو زک پہنچتے ہی

آشا ہوشیار ہو جاتی اور خطرے کو بھانپنے کے بعد ادھر کا رخ نہیں کرتی۔ بذریعہ طاقت ان لوگوں کے لیے کوٹھی پر قبضہ کر لینا کچھ مشکل نہیں تھا لیکن وہ وہاں موجود بے گناہ انسانوں کی جانیں کسی صورت ضائع نہیں کر سکتے تھے۔ ان ساری مشکلوں کے پیش نظر اس نے ان دونوں کو ابھی بیچ میں ہونے کے باوجود اوپر جانے سے نہیں روکا۔ اوپر موجود تو تینوں کی طرف سے ویسے بھی اسے اطمینان تھا کہ وہ نواب صاحب کی خواب گاہ میں محفوظ و مامون ہیں۔ خود ایک سے گزرنے پر اس نے خواجہ سراؤں کو شناخت کر لیا تھا۔ وہ مدھو اور تنزلی تھیں۔ سیدھے طور پر معقول شناخت کی وجہ سے وہ اب آشا کی فرمانبردار۔ مدھو اور تنزلی کے وہاں سے جاتے ہی آشا نواب صاحب کے ساتھ کچھ اس طرح منظر پر آئی کہ اس نے نواب صاحب کو پستل کی زد میں لے رکھا تھا اور لڑکھڑاتے ہوئے نواب صاحب ایک دوسرے خواجہ سرا کے سہارے آگے بڑھ رہے تھے۔ پستل کے علاوہ آشا کے شانے سے ایک خوفناک کلاشنکوف بھی لٹک رہی تھی جبکہ اس کی ساتھی بھی پوری طرح مسلح تھی۔ صاف لگتا تھا کہ وہ لوگ مرنے اور مارنے کے لیے پوری طرح تیار ہیں۔ جاوید علی سنبھل گیا اور اس کے بے آواز پستل سے گولی نکل کر آشا کے پستل والے ہاتھ میں پیوست ہو گئی۔ پستل ایک جھٹکے سے اس کے ہاتھ سے نکل کر دور جا گرا اور اس نے کراہتے ہوئے اپنے زخمی ہاتھ کو دوسرے ہاتھ سے تھام لیا۔ جاوید علی اس کا تو پستل دیکھنے کے لیے رکا نہیں تھا بلکہ فوراً ہی دوسرے خواجہ سرا پر گولی داغ دی۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ خواجہ سرا اپنے بچاؤ کے لیے نواب صاحب کو چھوڑ کر نیچے بیٹھ گیا اور وہ گولی جو شاید اس کے پہلے جسم کے کسی حصے پر پیوست ہوتی تھی، اس کے سر میں گھس گئی جس کے جان لیوا ہونے میں کوئی شک ہی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ مدہوش نواب صاحب بھی اس کے سہارے سے محروم ہوتے ہی زمین بوس ہو گئے تھے اور حالات کی سنگینی سے بے خبر خاک چاٹ رہے تھے۔ آشا نے البتہ زخمی ہونے کے باوجود کارکردگی دکھانے کی کوشش کی اور شانے سے لٹکی کلاشنکوف اتارنے کی لیکن اس کی یہ کوشش جاوید علی نے ناکام بنا دی۔ اس بار اس کی چلائی ہوئی گولی نے آشا کے بازو کو نشانہ بنایا تھا۔ دونوں ہاتھ زخمی ہونے کے بعد وہ مجبور تھی اور مقابلہ برداشت نہیں کر سکتی تھی اس لیے شدید تکلیف میں مبتلا ہونے کے باوجود بھاگ کر خود کو محفوظ کرنے کی کوشش کی لیکن یہ کوشش بھی جاوید علی نے ناکام بنا دی۔ وہ درخت سے چھلانگ لگا کر براہ راست آشا کے اوپر کودا تو وہ دونوں اسی طرح زمین بوس ہو گئے کہ آشا جاوید علی کے نیچے دبی ہوئی تھی۔

"تم لوگوں کو یہ حرکت بہت مہنگی پڑے گی۔ میرے ہم دونوں کو زیر کر لینے سے تمہیں کامیابی نہیں ملے گی۔ ہمارے علاوہ اور بھی ہیں جو نواب صاحب اور ان کی فیملی کو مار ڈالیں گے۔" مغلوب ہو جانے کے باوجود اس نے جاوید علی کو دھمکانے کی کوشش کی اور حربہ بولی۔ "اوپر میرے ساتھی موجود ہیں۔ یہ جو کچھ تم نے کیا ہے، اگر انہیں اس کے بارے میں خبر ہو گئی تو نواب صاحب کی بیویاں اور بچی اپنی جان سے جائیں گی۔" اس کے انداز گفتگو سے ظاہر تھا کہ وہ جاوید علی کو کسی کی حیثیت سے شناخت نہیں کر سکی ہے۔ ظاہر ہے ایک ہیجڑے خواجہ سرا اور زنانہ لڑکے میں تمیز تلاش کرنا آسان تھا بھی نہیں۔ اس لیے اس کا دھوکا کھا جانا سمجھ آتا تھا۔ جبکہ اس کے بارے میں وہ بھی اندازہ لگا چکی تھی کہ وہ باہر موجود فورس کا کوئی کارندہ ہے جو کسی طرح کوٹھی میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گیا ہے۔

"نواب صاحب کی فیملی کا ذکر چھوڑو اور اپنی فکر کرو۔ اگر تم نے میری بات نہیں مانی تو میری تیسری گولی سیدھی تمہارے بھیجے میں اترے گی۔" آشا کے منہ پر ایک زوردار تھپڑ لگاتے ہوئے اس نے اسے جواب دیا۔ جواب میں آشا نے اس پر لاتیں چلانے کی کوشش کی۔ وہ چونکہ کوٹھی میں ڈرائیور کے فرائض انجام دیتی تھی اس لیے دیگر خواجہ سراؤں کی طرح زرق برق لباس کے بجائے ڈرائیور کی چست یونیفارم ہی پہنا کرتی تھی۔ اس وقت بھی اس کے جسم پر یونیفارم ہی موجود تھی جو خون آلود ہونے کے باوجود اسے چستی کا مظاہرہ کرنے میں مدد دے رہی تھی اور بھاری بھرکم زنانہ لباس کی طرح حرکت میں مزاحم نہیں تھی۔ بہرحال اس کی مزاحمت جاوید علی کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتی تھی۔ اپنے بدن پر اس کی لاتوں کے وار سہنے کے بعد اس نے آشا کو گھونسوں اور لاتوں پر رکھ لیا۔ چند سیکنڈ کے اندر ہی وہ بے بس نظر آنے لگی۔ ناک سے بہتے خون اور چہرے پر پڑنے والی ضربوں نے اس کے خوب صورت چہرے کو بھیانک بنا دیا تھا۔ جاوید علی نے اسے چھوڑا اور پہلے زمین پر خاک چاٹتے نواب صاحب کو گھسیٹ کر پھولوں کے ایک کنج کے پیچھے اس طرح لٹا دیا کہ وہ کسی کی نظر میں نہ آسکیں ورنہ اگر آشا کے ساتھیوں میں سے کوئی اس طرف آتا تو ایک بار پھر نواب صاحب کو یرغمال بنا کر بچ نکلنے کے لیے مسائل کھڑے کر دیے جاتے۔ نواب صاحب کی

طرف سے مطمئن ہونے کے بعد اس نے آشا کو پسٹل کی زد پر سیڑھی اتر کر کھڑا ہونے پر مجبور کیا۔ زخمی آشا نے بمشکل اس کے حکم کی تعمیل کی۔ اب جاوید علی کا رخ بالائی منزل کی طرف جاتی سیڑھیوں کی طرف اس حال میں تھا کہ آشا کو اس نے ڈھال کے طور پر اپنے آگے لگا رکھا تھا اور آشا کی کلاشنکوف اب اس کے شانے پر لٹکی ہوئی تھی۔ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جاتے ہوئے اسے احساس ہو گیا کہ دمو اور تندرتی نواب صاحب کی اس خواب گاہ کا دروازہ کھولنے کی کوشش میں مصروف تھیں جہاں شاز مین اور نواب صاحب کی بیگمات نے پناہ لے رکھی ہے۔ اس نے آشا کو ٹہوکا لگا کر آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ ان کے قدموں کی واضح آہٹیں سن کر تندرتی اور دمو متوجہ ہوئی تھیں چنانچہ جیسے ہی وہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچے، اس نے دمو کو سامنے کھڑا پایا لیکن یقینی طور پر وہ اس صورت حال کے لیے تیار نہیں تھی۔ اس نے تو آہٹیں سن کر یہی سمجھا ہوگا کہ اس کے اپنے ساتھی نواب صاحب کو لے کر اوپر آ رہے ہیں لیکن وہاں تو منظر ہی قطعی خلاف توقع تھا جسے دیکھ کر دمو کا منہ کھل گیا۔

"تم اور تندرتی اپنے ہتھیار پھینک دو ورنہ یہ اپنی جان سے جائے گی۔" اس کے کچھ کہنے سے پہلے جاوید علی نے اسے حکم دیا۔ اس نے ایک نظر بے بس آشا کو دیکھا اور ہتھیار پھینک دیا۔ باتوں کی آواز سن کر تندرتی بھی وہیں آ گئی تھی اور اسے بھی اس حکم کی تعمیل کرنی پڑی تھی۔

"اب تم دونوں دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑی ہو جاؤ۔" جاوید علی نے دوسرا حکم سنایا۔ ناچار اس کی بھی تعمیل کرنی پڑی۔ جاوید علی آشا سمیت ان کے قریب پہنچا اور پسٹل کا دستہ دونوں کے سروں پر آزما کر انہیں [illegible] کر دیا۔ اس کام سے فارغ ہو کر اس نے نواب صاحب کی خواب گاہ پر مخصوص انداز میں دستک دی۔ فوراً ہی شاز مین نے دروازہ کھول دیا۔ وہ خاصی خوف زدہ محسوس ہو رہی تھی۔ خواب گاہ کے محفوظ ہونے کے باوجود شاید اسے ڈر رہا ہوگا کہ کہیں دمو اور تندرتی اس کا دروازہ کھولنے میں کامیاب نہ ہو جائیں۔

"تم تینوں خواتین مل کر ان دونوں کو کسی کمرے میں بند کر دو اور دوبارہ بیڈروم میں جا کر خود کو بند کر لو۔" جاوید علی نے اسے ہدایت دی اور خود تیزی سے آشا سمیت ایک کھڑکی کی طرف بڑھ گیا۔ اسے احساس تھا کہ اس کے بازو میں دبی آشا زخموں سے مسلسل بہتے خون کے باعث کمزور ہوتی جا رہی ہے۔ اس لیے مزاحمت کے قابل نہیں رہی ہے لیکن اسے آشا کے بے ہوش ہونے سے پہلے ہی کچھ کرنا تھا۔ وہ دشمن کی چال اسی پر الٹنے جا رہا تھا۔

"کوٹھی میں موجود تمام خواجہ سراؤں کو آگاہ کیا جاتا ہے کہ ان کی لیڈر آشا میرے قبضے میں ہے اور اگر تم لوگوں نے ہتھیار نہ ڈالے تو یہ اپنی جان سے جائے گی۔" ایک ایسی کھڑکی کا انتخاب کرنے کے بعد جہاں کم از کم گیٹ پر موجود چوکیدار واضح طور پر آشا کو دیکھ سکے، اس نے بلند آواز میں اعلان کیا۔ اس کا یہ اعلان باہر موجود اپنے ساتھیوں کے لیے بھی اشارہ تھا کہ اندر کے حالات کافی حد تک اس کے کنٹرول میں ہیں اس لیے وہ اپنی کارروائی کر سکتے ہیں۔ فوراً ہی فائرنگ کا آغاز ہوا اور باہر موجود محافظ قانون کے رکھوالوں نے کوٹھی کی طرف پیش قدمی شروع کر دی۔ فضا یکدم ہی مختلف قسم کے ہتھیاروں کی آوازوں سے گونجنے لگی۔ اس گونج میں مخنث چھوٹی آشا کا قہقہہ مترنم اور چونکا دینے والا تھا۔ جاوید علی حیران سا ہو کر اس کی طرف متوجہ ہوا۔

"تم لوگ یہاں سے لاشوں اور ملبے کے ڈھیر کے سوا کچھ حاصل نہیں کر سکو گے۔ یہ تمہاری غلط فہمی ہے کہ باہر موجود میرے ساتھی میری جان بچانے کے لیے ہتھیار ڈال دیں گے۔ میں پہلے ہی انہیں بتا کر آئی تھی کہ انہیں میرے زیر ہونے کی صورت کیا کرنا ہے۔" وہ ابھی اتنا ہی کہہ پائی تھی کہ دھماکے سنائی دینے لگے۔ یہ دھماکے ان آوازوں سے قطعی مختلف تھے جو اب تک مختلف ہتھیاروں کے چلنے کی صورت میں سنائی دے رہے تھے۔ ان دھماکوں نے صرف فضا کو ہی نہیں لرزایا تھا بلکہ کوٹھی کی عمارت کو بھی ہلا کر رکھ دیا تھا۔ لرزتی عمارت کے ساتھ جاوید علی نے خود اپنا وجود بھی ڈگمگاتا ہوا محسوس کیا اور بس یہ آخری احساس تھا اس کے بعد اسے کچھ ہوش نہیں رہا۔ ڈگمگاتی، ریزہ ریزہ ہوتی عمارت کا ملبہ تھا جو اس پر آ گرا تھا اور اس کی سانسوں کا سلسلہ رک سا گیا تھا۔
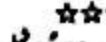
☆☆☆

شہریار بے قراری سے ادھر ادھر ٹہل رہا تھا۔ کراچی میں جو کچھ ہوا تھا، اس کی رپورٹ اسے بھی مل چکی تھی۔ نواب نوازش علی کی کوٹھی پر پولیس کی مدد سے کیے جانے والے ریڈ کے عجیب و غریب نتائج نکلے تھے۔ جاوید علی کی فراہم کردہ معلومات اور حالات کے جائزے سے جو تصویر سامنے آئی تھی، اس کے مطابق نظریاتی اور انتقامی [illegible] کے تحت نواب نوازش علی کو شانی نے جو کہ [illegible] پیدائشی ایجنٹ تھی، بڑی ہی اس طرح سے اپنے جال میں پھانس رکھا تھا

کر ملا، وہ اس کا مطیع ہو کر رہ گیا تھا... لیکن اسے خود بھی اس حقیقت کی خبر نہیں تھی۔ خوب صورت خواجہ سراؤں کے جھرمٹ میں اسے احساس ہی نہیں ہو پاتا تھا کہ اس کی ناک کے نیچے اس کی کوٹھی میں کیا کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ شانی نے کچھ اس طرح سے جال بچھایا تھا کہ نواب کی کوٹھی ایک طرف تو انتہا پسند خواجہ سراؤں کا ٹھکانا بن گئی تھی اور دوسری طرف وہ اسلحے کی ذخیرہ اندوزی جیسے خطرناک کاموں کے لیے اس کوٹھی کو استعمال کر رہے تھے۔ کوٹھی میں موجود تقریباً سارے خواجہ سرا انتہا پسند تنظیم کے رکن تھے۔ صرف چند ایسے تھے جنہیں حقائق کا علم نہیں تھا اور نہایت غیر محسوس طور پر انہیں اس رنگ میں رنگنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ کسی خاص موقع پر جب کوٹھی میں ان انتہا پسند خواجہ سراؤں کا اجتماع ہوتا تو نواب صاحب کو شراب اور کسی خوب صورت خواجہ سرا کے ذریعے مدہوش کر دیا جاتا۔ نواب صاحب کا قیام تو ویسے ہی مستقل طور پر کوٹھی کی پہلی منزل سے کٹا ہوا تھا چنانچہ وہ لوگ مزے سے اپنی کارروائیاں جاری رکھتے۔ کوٹھی کے وسیع و عریض تہ خانے میں انہوں نے اپنی خونی دیوی کا مجسمہ رکھ چھوڑا تھا اور مخصوص تاریخوں پر وہاں اپنی بھیانک رسومات انجام دیتے تھے۔ اس موقع پر باہر سے بھی تنظیم کے کارکن خواجہ سرا شریک ہوتے تھے البتہ کوٹھی میں موجود خواجہ سراؤں کو اس محفل سے دور رکھا جاتا تھا۔

یہ تہ خانہ ہتھیاروں کی ذخیرہ اندوزی کے لیے بھی بے حد موزوں جگہ تھی۔ ہتھیاروں کی آمد و رفت کے لیے بھی ملاقات والی ترکیب استعمال کی جاتی۔ بعد میں پکڑے جانے کا ڈر اس لیے نہیں ہوتا تھا کہ نواب صاحب کو تو تہ خانے میں جھانکنے کی فرصت نہیں تھی اور ملازمین میں سے بھی صرف چند ایک ہی جو محرم راز تھے، اس طرف جا سکتے تھے۔ تہ خانہ مقفل رہتا تھا۔ جاوید علی کے پہنچنے پر جب کوٹھی پر ریڈ کیا گیا تو حالات میں بڑی تبدیلی آ چکی تھی۔ ان تبدیل شدہ حالات کے بارے میں ایک زخمی خواجہ سرا نے معلومات فراہم کیں۔ شانی کی موت کے بعد ورما نے براہ راست آشا سے رابطہ کیا تھا اور اسے حکم دیا تھا کہ رنگین نامی خواجہ سرا پر خصوصی نظر رکھے لیکن کومل کی غفلت سے رنگین غائب ہو گئی۔ آشا نے اس پر بے حد تشدد کیا کہ کسی طرح وہ رنگین کے بارے میں معلومات فراہم کرے لیکن کومل نے زبان نہیں کھولی۔ تشدد کی انتہا پر جب اس کا ضبط جواب دے گیا تو اس نے صرف اتنا اعتراف کیا کہ رنگین کوٹھی میں موجود ہے۔ کہاں؟ اس بارے میں کچھ بتائے بغیر ہی وہ مر گئی۔ ان لوگوں نے اپنے اندازے کے مطابق شاز مین کو رنگین کے غائب ہونے میں ملوث سمجھتے ہوئے اس کے کمرے وغیرہ کی تلاشی لی لیکن وہاں انہیں کوئی نہیں ملا۔ ابھی وہ لوگ غور کر ہی رہے تھے کہ آیا وہ شاز مین پر دوبارہ سختی کر کے رنگین کے بارے میں کچھ اگلوا سکتے ہیں یا نہیں کہ کوٹھی پر پولیس کا ریڈ ہو گیا۔ آشا سمیت چند سرکردہ خواجہ سراؤں نے اپنی دیوی کی قسم کھا کر بہت عرصے پہلے شانی کے سامنے یہ عہد کیا تھا کہ بدترین حالات میں بھی وہ خود کو زندہ قانون کے ہاتھ نہیں لگنے دیں گے اور تہ خانے سے بھی کوئی کچھ حاصل نہیں کر سکے گا چنانچہ جب فورس کے افسر کی طرف سے یہ مطالبہ ہوا کہ آشا نواب صاحب کو لے کر سامنے آئے تو آشا اس بات پر عمل کرنے سے پہلے اپنے دو معاونین کو یہ حکم دے گئی کہ اس کے زیر ہونے کی صورت میں تہ خانے کو تباہ کر دیا جائے۔ نامساعد حالات میں کی جانے والی تباہی کا یہ منصوبہ شانی کی زندگی سے ہی طے شدہ تھا اور اس کے لیے انتظامات بھی کیے گئے تھے اس لیے ان لوگوں کو عمل کرنے میں چند سیکنڈ ہی لگے۔ تباہ ہونے والا اسلحے کا ذخیرہ ہولناک تباہی کا سبب بنا۔ کوٹھی کی عمارت لمحوں میں زمین بوس ہو گئی۔ پہلی منزل پر موجود کوئی شخص زندہ نہیں بچا۔ ملبے کے ڈھیر سے صرف یہی ایک خواجہ سرا شدید زخمی حالت میں زندہ ملا تھا جس نے انہیں یہ معلومات فراہم کی تھیں۔ بعد میں وہ بھی زخموں کی تاب نہ لا کر مر گیا تھا۔

لان میں بے ہوش پڑے ہوئے نواب صاحب اپنی بدقسمتی یا خوش قسمتی سے تباہ ہوتی عمارت سے اڑ کر سر پر لگنے والے ایک بڑے پتھر کی وجہ سے زندگی کی جنگ ہار گئے تھے اور شاید یہ ان کے حق میں اچھا ہی ہوا تھا ورنہ زندہ رہنے کی صورت میں انہیں جس ذلت اور رسوائی سے گزرنا پڑتا، اسے وہ اپنی تمام تر اخلاقی کج روی کے باوجود سہہ نہیں سکتے تھے کیونکہ لاکھ بگڑے ہوئے سہی، تھے تو ایک عزت دار خاندان کے چشم و چراغ جن کے ہاں اپنی تمام تر تنزلی پہنچ کے باوجود وطن سے غداری کا تصور نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ان کی دونوں بیگمات اور بیٹی شاز مین اس تباہی میں بالکل محفوظ رہی تھیں۔ وہ تینوں ترچھے ہو کر گرنے والے چھت کے ایک بڑے حصے کے نیچے اس طرح محفوظ ہو گئی تھیں کہ انہیں ایک خراش تک نہیں آئی تھی البتہ دہشت نے انہیں بے ہوش ضرور کر دیا تھا۔ معمولی سی طبی امداد کے نتیجے میں وہ تینوں ہوش میں آ گئی تھیں اور فی الحال انہیں دارالامان بھجوا دیا گیا تھا۔ کانوینٹ میں زیر تعلیم نواب صاحب کے بیٹے کراچی پہنچ کر تو

ماں بہن کی ذمے داری سمیت جاسم اور کا قبضہ خود لے لیے۔

اس پورے آپریشن میں کلیدی کردار ادا کرنے والا جاوید علی بری طرح متاثر ہوا تھا اور شدید زخمی حالت میں جوائنٹ اسپتال کے انتہائی نگہداشت والے حصے میں زیر علاج تھا۔ کرنل توحید نے بذات خود اس کے علاج کے لیے خصوصی ہدایات دی تھیں اور واضح طور پر کہہ دیا تھا کہ اگر یہاں اس کا علاج ممکن نہیں ہوا تو علاج کے لیے اسے بیرون ملک بھی بھجوایا جا سکتا ہے۔ ملکی سلامتی کے لیے اپنی جان نثار کر دینے کا عزم رکھنے والا یہ انٹیلی جنس کا جوان ان کے نزدیک بہت قیمتی تھا اور وہ ان میں سے کسی کی بھی جان کی خاطر بڑی سے بڑی قیمت ادا کر سکتے تھے۔

اس پورے واقعے نے واضح کر دیا تھا کہ دشمن کی جڑیں وطن عزیز میں کتنی گہری ہو چکی ہیں۔ جاوید علی ہی کی مدد سے وہ لوگ قبرستان کی کھاٹ میں ہونے والی اسلحے کی ایک ڈیلیوری کو بھی پکڑ چکے تھے۔ پکڑے جانے والے مجرموں نے اعتراف کر لیا تھا کہ وہ یہ اسلحہ لسانی، سیاسی اور فرقہ وارانہ فسادات برپا کرنے والے عناصر کو فروخت کرتے ہیں۔ ان کا مقصد چونکہ پاکستان کی جڑوں کو کھوکھلا کرنا تھا اس لیے وہ انتہائی کم نرخ پر ان دہشت گردوں کو وافر اسلحہ فراہم کرتے رہتے تھے۔ اس میں سے زیادہ تر اسلحہ امریکی ساخت کا تھا جو انہوں نے موساد کے تعاون سے حاصل کیا تھا اور یوں دونوں دشمن ملک کی ایجنسیاں مشترکہ ایجنڈے پر کام کر رہی تھیں۔

یہ کوئی نئی باتیں یا حقائق نہیں تھے جن سے شہریار آشنا ہوا ہو۔ اسے اس بات کا بھی علم تھا کہ اس معاملے کے حقائق کو ہمیشہ کی طرح عوام سے چھپا لیا گیا تھا اور میڈیا کو یہ بتایا گیا تھا کہ نواب صاحب کی کوٹھی کے تہ خانے میں گیس کے کچھ سلنڈر رکھے تھے۔ اتفاق سے ان میں سے ایک سلنڈر پھٹ گیا اور اس آتش گیر مادے کو زد میں لے لیا جو کوٹھی میں ملازم خواجہ سراؤں نے آنے والی دیوالی کے لیے ذخیرہ کر رکھا تھا۔ آگ بھڑکی تو باقی ماندہ سلنڈر بھی پھٹ گئے اور یوں ایک ہولناک حادثہ پیش آ گیا۔ کوٹھی کو مکمل طور پر کلیئر کرنے سے قبل میڈیا کے کسی نمائندے کو اندر جانے کی اجازت نہیں دی گئی تھی اور نہایت صفائی سے حقائق کو چھپا لیا گیا تھا۔ ایسا ہائی کمان کے حکم پر ہوا تھا جس کے سامنے سب مجبور تھے۔ سی ایف پی والوں کی مجبوری اور بھی زیادہ اس لیے بڑی تھی کہ وہ اپنے وجود کو مخفی رکھنا چاہتے تھے اور ہائی کمان کو بھی یہی اطلاع دی گئی تھی کہ آپریشن میں خفیہ ایجنسی کے ساتھ دوسرے قانون نافذ کرنے والے ادارے شامل تھے۔ اس رازداری کے پیچھے کیا مصلحت تھی، یہ ہائی کمان کو ہی معلوم ہوگی لیکن اپنی جان کی بازی لگانے والے اس لیے کڑھتے رہے تھے کہ اس کے مقابلے میں اگر بھارت میں دہشت گردی کی کوئی معمولی سی بھی واردات ہوتی تو بھارت کھل کر پاکستان پر الزام لگاتا۔

شہریار نے فی الحال اس بات کو بھی نظر انداز کر دیا تھا لیکن وہ ایک بار پھر سامنے آنے والے ورما کے نام کو نظر انداز نہیں کر پا رہا تھا۔ خصوصاً اس لیے بھی کہ وہ ورما کے موجود ہونے سے واقف تھا اور فوری طور پر اسے گرفت میں لینے کا خواہش مند بھی تھا لیکن یہاں ذیشان اور کرنل صاحب نے اس سے اختلاف کیا تھا اور فی الحال اسے زیر نگرانی رکھنے پر ہی اکتفا کیے ہوئے تھے۔ لیکن شہریار کے صبر کا پیمانہ اب لبریز ہو چکا تھا اور وہ ہر صورت ورما کی گردن ناپنا چاہتا تھا۔ اس کی اس وقت کی بے قراری اسی وجہ سے تھی۔ وہ مذبذب میں مبتلا تھا کہ آیا ذیشان اور کرنل صاحب کی مرضی کے خلاف بھی کوئی قدم اٹھایا جا سکتا ہے یا نہیں۔

آخر کار وہ مذبذب کی اس کیفیت سے نکل آیا۔ اس نے اس دلیل سے خود کو قائل کر لیا کہ وہ جو کچھ کرنے جا رہا ہے، ملکی مفاد میں ہی کر رہا ہے اس لیے اگر ان دونوں کو برا بھی لگا تو یہ ایک وقتی ناراضی ہوگی جسے وہ جلد فراموش کر دیں گے۔ فیصلہ کر لینے کے بعد اس نے ٹہلنا موقوف کیا اور نہایت خاموشی سے تیاری کرنے لگا۔ وہ جس حصے میں مقیم تھا وہاں ملازمین کی آمد اس کی مرضی کے خلاف نہیں ہوتی تھی اور رات کے اس پہر تو کسی کے اس طرف آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا لیکن پھر بھی وہ بہت احتیاط سے کام لے رہا تھا۔ تیاری کے لیے اس نے بلب وغیرہ روشن نہیں کیا تھا بلکہ نائٹ بلب کی روشنی میں ہی کام کر رہا تھا۔ جینز اور ٹی شرٹ پر مشتمل گہرے رنگ کا چست لباس زیب تن کر لینے کے بعد اس نے پیروں میں نرم سول کے جوتے پہنے اور اپنے سامان میں موجود پسٹل کو نکال لینے کے علاوہ تیز دھار والا چھوٹا سا چاقو بھی پنڈلی سے باندھ لیا۔ اس طرف سے مطمئن ہونے کے بعد اس نے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنا جائزہ لیا۔ نائٹ بلب کی مدھم روشنی میں جو شخص اس کے سامنے تھا، اس میں شہریار عادل کی جھلک بہت کم ہی رہ گئی تھی اور بہت مشکل تھا کہ کوئی اسے اس حیثیت سے شناخت کر سکتا۔ خود کو ہر طرح سے کارروائی کے لیے پوری طرح تیار محسوس کرنے کے بعد وہ دبے قدموں کمرے سے باہر نکلا اور پھر پھونک پھونک کر

قدم رکھتا ہوا باہر نکل گیا۔ باہر گیٹ پر چوکیدار موجود ہوتا تھا اس لیے اس طرف سے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ گاڑی بھی لے جانا ممکن نہیں تھا چنانچہ وہ عقبی حصے کی طرف بڑھ گیا۔

اس عمارت کی نگرانی کے لیے چوکیدار کے علاوہ دو تربیت یافتہ کتے بھی موجود تھے جو ساری رات کھلے رہتے تھے لیکن اسے ان کتوں سے اس لیے کوئی خطرہ نہیں تھا کہ طویل قیام کے عرصے میں دونوں کتے اس سے مانوس ہو چکے تھے۔ اس وقت بھی یہی ہوا۔ قدموں کی آہٹ پا کر ایک کتا ذرا سا چونکا لیکن پھر اس نے شہریار کی خوشبو پالی اور بھونکنا ترک کر کے اس کے قریب آ کر اس کی ٹانگ سے اپنی تھوتھنی رگڑنے لگا۔ شہریار نے نرمی سے اس کے سر اور پشت کو سہلایا اور آگے بڑھ گیا۔ دوسرا کتا بھی قریب ہی موجود تھا لیکن اپنے ساتھی کے اطمینان کے بعد اس نے کوئی تعرض نہیں کیا اور شہریار آرام سے آگے بڑھتا گیا۔ اس کا رخ کوٹھی کی عقبی دیوار کی طرف تھا۔ دیوار خاصی بلند تھی لیکن اسے تربیت کے جن مراحل سے گزارا جا رہا تھا، ان سے گزرنے کے بعد اس کے لیے یہ بلندی کوئی معنی نہیں رکھتی تھی۔ وہ نہایت سہولت کے ساتھ دیوار کے اس پار اتر گیا اور تیز تیز قدموں سے آگے بڑھنے لگا۔ اس علاقے میں دن کے وقت بھی سواری آسانی سے نہیں ملتی تھی۔ رات کے وقت تو حصول ہی ناممکن ہوتا تھا چنانچہ خاصا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ ٹیکسی اسٹینڈ تک پہنچ سکتا تھا۔ اس فاصلے کو جلد از جلد طے کر لینے کی خواہش میں وہ بہت تیز چل رہا تھا۔ تیز رفتاری کے باوجود جب وہ ٹیکسی اسٹینڈ تک پہنچا تو نہ ہی سانس پھولا ہوا تھا اور نہ ہی پنڈلیوں نے احتجاج کیا تھا۔ اس بات نے اس کے دل میں خوشی کا احساس جگا دیا۔ یعنی عمر فاروق صاحب کی تربیت نے کام دکھایا تھا اور اس کا اسٹیمنا پہلے کے مقابلے میں اور بھی بہتر ہو گیا تھا۔ دل ہی دل میں ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اس نے ایک ٹیکسی کا انتخاب کیا اور ڈرائیور کو اس علاقے کا نام بتایا جہاں آج کل ورما رہائش پذیر تھا۔ کرائے کے سلسلے میں اس نے ٹیکسی ڈرائیور سے کسی چخ چخ کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ رات کے اس پہر ٹیکسی چلانے والے عموماً ضرورت کے تحت ہی باہر نکلتے ہیں اس لیے ٹیکسی والے بھی منہ مانگے کرائے لینا اپنا حق سمجھتے ہیں۔ ایسی روش کی وہ عمومی حالات میں سختی ہی سے مذمت کرتا لیکن اس وقت اس کے لیے ہر بات سے بڑھ کر ورما تک رسائی اہم تھی اس لیے منہ مانگے کرائے پر خوشی راضی ہو گیا۔

ٹیکسی اس کے مطلوبہ علاقے میں پہنچی تو اس نے ورما کی رہائش گاہ سے خاصے فاصلے پر اسے رکوایا اور کرایہ ادا کرنے کے بعد پیدل ہی اس طرف چل پڑا۔ یہ بات اس کے ذہن پر نقش تھی کہ بدترین دشمن اور بہترین دوست کے متعلق کسی چیز کو بھول جانا انسان کی فطرت کے خلاف ہوتا ہے۔ مطلوبہ پتے پر پہنچ کر اس نے کچھ دیر باہر ہی رک کر جائزہ لیا۔ مکان زیادہ بڑا نہیں تھا اور دیواریں بھی کچھ خاص بلند نہیں تھیں۔ ایسے کوئی آثار بھی نظر نہیں آ رہے تھے کہ گیٹ پر چوکیدار کی موجودگی کا پتا چلتا۔ چوکیدار کے علاوہ حفاظتی انتظامات میں عموماً دو ہی چیزوں کا اہتمام کیا جاتا ہے..... ایک کتے اور دوسرے برقی رو۔ دیواروں پر تار بچھا کر ان میں برقی رو دوڑانا ایک خطرناک حفاظتی طریقہ تھا جس کے استعمال سے بے گناہ جانوں کے نقصان کا اندیشہ بھی رہتا تھا لیکن ورما جیسے بے ضمیر آدمی سے کسی اخلاقی ضابطے کا خیال رکھنے کی امید نہیں تھی۔

دیواروں پر برقی تاروں کی موجودگی کو چیک کرنے کے لیے اس نے اپنی جیب سے نائلون کی پتلی سی رسی نکالی۔ اس رسی کے سرے پر ایک مضبوط دھاتی آنکڑا موجود تھا۔ بلندی پر چڑھنے کے لیے یہ رسی بڑی کارآمد ثابت ہوتی تھی لیکن اس وقت تو اسے دھاتی آنکڑے سے کام لینا تھا۔ اگر دیوار میں کرنٹ موجود ہوتا تو دھاتی آنکڑے سے ٹکرانے کی صورت میں ردعمل ظاہر ہوتا اور ننگے تاروں سے دھاتی آنکڑا ٹکرانے کی صورت میں رات کی تاریکی میں چنگاریاں سی اڑتی صاف نظر آتیں لیکن جب اس نے تجربہ کیا تو ایسا کچھ نہیں ہوا۔ احتیاطاً اس نے تجربے کو ایک بار پھر دہرایا لیکن نتیجہ وہی رہا تو اطمینان سے دیوار پر چڑھ گیا۔ دیوار پر چڑھنے کے بعد اس نے لمحہ بھر کے لیے توقف کیا اور کتوں کی موجودگی کی سن گن لینے کی کوشش کی۔ نیم تاریک احاطے میں اسے کچھ نہیں دکھائی دیا۔ زیادہ دیر دیوار پر رکنا مناسب نہیں تھا اس لیے وہ پنجوں کے بل اندر کود گیا۔ لچک دار چھلانگ کے نتیجے میں بہت ہی مدھم آواز پیدا ہوئی لیکن بہرحال اگر وہاں کتے موجود ہوتے تو ضرور متوجہ ہوتے۔ اسے بے حد حیرت ہوئی کہ ورما حفاظتی اقدامات کی طرف سے اتنا بے فکر کیوں تھا؟ پھر اسے یاد آیا کہ کراچی میں بھی جب اس نے ورما کے اپارٹمنٹ میں گھس کر اسے قابو کیا تھا تو وہاں بھی ایسا کوئی انتظام نہیں تھا۔ شاید ورما کو خود پر حد سے زیادہ اعتماد تھا جو اس قسم کا اہتمام غیر ضروری سمجھتا تھا۔ فی الحال اس کے پاس ورما کی نفسیات سمجھنے کی فرصت نہیں تھی چنانچہ محتاط ہو کر قدم

آگے بڑھ جائے۔

احتیاط کے پیش نظر وہ مکان میں گھستے ہی اپنا پسٹل باہر نکال چکا تھا اور اب اسے تھامے ہوئے آہستگی سے آگے بڑھ رہا تھا۔ سب سے پہلے اس نے دروازے کو چیک کیا۔ حسب توقع وہ اندر سے بند تھا۔ دروازے کے بعد وہ کھڑکیوں پر طبع آزمائی کرنے لگا۔ یہ سلائڈنگ ونڈوز تھیں جن کے اندر گرل موجود نہیں تھی لیکن یہ اہتمام تھا کہ اندر سے لاک ہو سکیں اور کوئی شخص باہر سے انہیں کھول نہ سکے۔ ان کھڑکیوں کا شیشہ تھوڑی سی کوشش سے توڑنا ممکن تھا لیکن ظاہر ہے اس صورت میں شور ہوتا اور اندر موجود ہر شخص متوجہ ہو جاتا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ پہلے ساری کھڑکیاں چیک کرے تاکہ اگر اتفاق سے کوئی کھڑکی کھلی رہ گئی ہو تو اس سے اندر جایا جا سکے۔ دوسری صورت میں اسے یا تو چھت کا راستہ اختیار کرنا پڑتا یا کھڑکی کا شیشہ توڑنے کا رسک لینا پڑتا۔ چھت کے بارے میں اسے علم نہیں تھا کہ وہاں سے نیچے کی طرف سیڑھیاں جاتی بھی ہیں یا نہیں۔ اس لیے حسن اتفاق پر بھروسا کرتے ہوئے سب سے پہلے کھڑکیاں چیک کرنا ہی مناسب سمجھا۔ آخر تیسری کھڑکی پر اس کی امید بر آئی۔ یہ کھڑکی اندر سے لاک نہیں تھی اور ذرا سا زور لگا کر کھولنے پر شیشہ آسانی سے ایک طرف کھسک گیا تھا۔ اس نے بے دھڑک اندر داخل ہونے کے بجائے پہلے جھانک کر اندر دیکھا۔ کمرا سٹنگ روم کا منظر پیش کر رہا تھا اور وہاں جلتی مدھم روشنی میں وہ دیکھ سکتا تھا کہ وہاں کوئی ذی روح موجود نہیں ہے۔ کمرے میں ایک طرف کمپیوٹر بھی رکھا تھا جس کی اسکرین اس وقت تاریک تھی۔ وہ کھڑکی کی چوکھٹ پر ہاتھ جما کر اندر کود گیا۔ یہاں وہ ورما سے دو دو ہاتھ کرنے کے لیے آیا تھا اور امکان یہی تھا کہ اس وقت وہ اپنی خواب گاہ میں محو خواب ہوگا اس لیے اس کمرے میں رکنے کو بیکار جان کر قدم دروازے کی طرف بڑھائے لیکن پھر رکنا پڑا۔ رکنے کی وجہ گردن کی پشت پر محسوس ہونے والی لوہے کی ٹھنڈک تھی اور ویسا ہی ایک ٹکڑا اس کے اپنے ہاتھ میں بھی موجود تھا اس لیے اسے پہچاننے میں مغالطہ نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ پسٹل کی نال ہے جو کسی نے پشت سے اس کی گردن پر دھر دی ہوئی ہے۔

"پسٹل پھینک کر دونوں ہاتھ اوپر اٹھا لو۔" سرد آواز میں حکم دیا گیا جس کی تعمیل کرنے کے سوا اس وقت اس کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔

"اب دیوار سے لگ کر کھڑے ہو جاؤ۔" اسے پسٹل سے محروم کر دینے کے بعد دوسرا حکم دیا گیا۔ گردن پر لگی نال کی موجودگی میں انکار کی گنجائش نہیں تھی چنانچہ اس نے وہی کیا جس کا اسے حکم دیا گیا تھا۔ حکم دینے والا جو کوئی اور نہیں ورما ہی تھا، اس کی جامہ تلاشی لینے لگا۔ شہریار ہونٹ بھینچے بہت مشکل سے یہ سب برداشت کر رہا تھا۔ وہ ورما کو چیر پھاڑ کر رکھ دینے کی خواہش دل میں لے کر یہاں تک آیا تھا لیکن جتنی آسانی سے یہاں تک پہنچا تھا، اتنی ہی آسانی اور تیزی سے زیر کر لیا گیا تھا۔ بالکل ایسا لگ رہا تھا کہ ورما پہلے سے ہی گھات لگائے بیٹھا تھا اور اس کے اندر داخل ہوتے ہی ایکشن میں آ گیا تھا اور اب اپنے نفرت انگیز وجود کے ساتھ اس کی تلاشی لے رہا تھا۔ اس کام کے لیے وہ اپنا صرف ایک ہاتھ استعمال کر رہا تھا۔ دوسرے ہاتھ میں اس نے بدستور پسٹل تھام رکھا تھا اور اوپر سے نیچے تک ہاتھوں کے سرکنے کے ساتھ ساتھ پسٹل کا سفر بھی جاری تھا۔ وہ اس کی جیبوں میں موجود سامان نکال چکا تھا اور اب اس کا ہاتھ اس مقام پر متحرک تھا جس کے ساتھ اس نے تیز دھار والا چاقو باندھ رکھا تھا۔ ہاتھ اس مقام تک پہنچا تو ورما کی مشتاق انگلیوں نے فوراً ہی چاقو کی موجودگی کا اندازہ لگا لیا اور تیزی سے اس کی پنڈلی کو پکڑا اور پھر جھکا کر چاقو کو بے نقاب کر دیا۔ یہ وہ لمحہ تھا جب شہریار کو محسوس ہوا کہ ورما کی توجہ اپنے پسٹل سے زیادہ اس کے چاقو پر مبذول ہے چنانچہ اس نے ورما کی ذرا بھی توقع کے بغیر ایکشن میں آنے کا فیصلہ کیا اور چابک دستی سے ٹانگ کو پھرتی سے حرکت دے کر پیچھے کی طرف اس طرح گھمایا کہ تلاشی لیتا ورما اس کی زد میں اچھی طرح آ جائے۔

اس کے اس غیر متوقع حملے نے ورما کو پیچھے کی طرف اچھال دیا جبکہ شہریار نے اچھل کر فوراً ہی وہ جگہ چھوڑ دی۔ اس کی یہ حکمت عملی اس کے حق میں بہتر ثابت ہوئی۔ اگر اسے لمحے بھر کی بھی دیر ہو جاتی تو ورما کے پسٹل سے نکل کر دیوار سے ٹکرانے والی گولی خود اس کے بدن میں چھید کر گئی ہوتی۔ دیکھا جائے تو اس نے پسٹل بردار ورما پر اس طرح پیچھے جا کے حملہ کر کے بہت بڑا رسک ہی لیا تھا۔ ذرا سی کوتاہی یا قسمت کی خرابی سے اسے بڑا نقصان بھی ہو سکتا تھا۔ حقیقتاً اس نے جو کچھ کیا تھا وہ عالم جنون میں کیا تھا ورنہ کوئی ہوش مند آدمی اس طرح کا رسک لینے سے پہلے دس بار سوچتا ہے۔

اچھل کر اپنی جگہ چھوڑنے کے بعد وہ اگلی جگہ پر بھی ٹھہرا نہیں تھا بلکہ کسی اسپرنگ کی طرح اچھل کر دوبارہ اپنی ٹانگ حرکت میں لایا تھا اور اس بار ورما اپنے پسٹل سے محروم

ہو گیا تھا۔ پسٹل ہاتھ سے نکل کر جانے کہاں گرا تھا۔ ورما نے اسے حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی اور کسی عقاب کی طرح پلٹ کر اس پر حملہ آور ہوا۔ اس کے حملے سے بچنے کے لیے شہریار نے بائیں جانب چھلانگ دی لیکن پوری طرح خود کو محفوظ نہیں رکھ سکا اور ورما کی کھڑی ہتھیلی کا وار اس کے شانے پر لگا۔ اس کا شانہ جھنجھنا اٹھا لیکن اس کی کارکردگی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اس نے ورما کی کلائی کو اپنی فولادی گرفت میں لے کر اس طرح جھٹکا دیا کہ ہڈی ٹوٹنے کی واضح آواز کے ساتھ وہ اڑتا ہوا کمپیوٹر پر جا گرا اور اسے لیے ہوا فرش پر آ گیا۔ نیچے گرنے سے مانیٹر کی اسکرین ٹوٹ گئی اور کرچیاں دور دور تک بکھر گئیں۔ ورما خود ان کرچیوں پر گرا اور بہت سی کرچیاں جسم میں پیوست ہونے کی وجہ سے کراہ اٹھا لیکن اس حالت میں بھی اس نے ہار نہ مانی اور اچھل کر ایک بار پھر کھڑا ہو گیا۔ اس بار اس کی ٹانگ نے شہریار کے پیٹ کی جڑ پکڑی اور وہ زوردار ضرب کے نتیجے میں الٹ کر ایک صوفے پر جا گرا۔ ورما نے اسے مہلت دیے بغیر اس پر چھلانگ لگائی اور دونوں ہاتھوں میں اس کا گلا تھام کر دبانے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کی گرفت خاصی مضبوط تھی شہریار کو اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوا۔ اضطراری ردعمل کے طور پر اس نے اپنی انگلیاں ورما کی بائیں آنکھ میں گھونپ دیں۔ ورما کے لیے یہ چوٹ ناقابل برداشت ثابت ہوئی۔ وہ زور سے چلایا اور اس کے گلے کو اپنے ہاتھوں کی گرفت سے آزاد کر دیا۔

شہریار کے لیے اتنی مہلت کافی تھی۔ اس نے ورما کو نیچے گرایا اور خود اس کے سینے پر چڑھ کر بیٹھنے کے بعد اسے اپنے گھٹنوں کی زد پر رکھ لیا۔ ان فولادی گھٹنوں نے ورما کی کھوپڑی کو چکرا کر رکھ دیا۔ آنکھ کے زخم نے پہلے ہی اسے نڈھال کر دیا تھا۔ گھٹنوں نے برداشت کی حد ختم کر دی اور وہ بے ہوش ہو گیا۔ اس کے بے ہوش ہوتے ہی شہریار اس کے سینے سے اترا اور ایک ڈھیر کی صورت میں ایک جگہ پڑے اپنے سامان میں سے نائلون کی رسی اٹھا کر ورما کے ہاتھ پاؤں کو اس رسی کی مدد سے اچھی طرح باندھ دیا۔ اس کام سے فارغ ہو کر اس نے اپنا سامان واپس اپنی جیبوں میں منتقل کیا اور ساتھ ہی اپنا اور ورما کا پسٹل بھی اٹھا لیا۔ ورما کو قابو میں لا کر اس سے دو دو ہاتھ کرنے سے قبل وہ ایک بار مکان کا جائزہ لے لینا چاہتا تھا۔ ویسے تو یہ سامنے کی بات تھی کہ اگر ورما کے علاوہ کوئی دوسرا شخص مکان میں موجود ہوتا تو اس ہنگامہ آرائی کے نتیجے میں ضرور متوجہ ہو کر ادھر کا رخ کرتا لیکن پھر بھی اسے طور پر تصدیق کرنا ضروری تھا۔ لاؤنج خالی پڑا تھا۔ کچن میں بھی سناٹا تھا۔ البتہ ڈائننگ ٹیبل پر رکھے ایک مشہور ریسٹورنٹ کے برگر کے ڈبوں اور مشروبات کی بوتلوں کو دیکھ کر اندازہ ہو رہا تھا کہ دو افراد اس ڈنر سے مستفید ہوئے ہیں یا پھر شاید اکیلا ورما ہی دو افراد کی خوراک ہضم کر گیا تھا۔ حقیقت کچھ بھی تھی، وہ مکان میں کسی دوسرے شخص کی موجودگی کا امکان محسوس کر کے مزید محتاط ہو گیا۔ جس کمرے میں اس نے ورما کو چھوڑا تھا، اس کے علاوہ مکان میں دو کمرے مزید تھے۔ اس نے پہلے کمرے کا دروازہ کھول کر اس کا جائزہ لیا۔ کمرا کسی ذی نفس سے خالی تھا۔ کوئی قابل ذکر فرنیچر بھی موجود نہیں تھا۔ بس فرش پر کارپٹ بچھا کر چند فلور کشنز وغیرہ رکھ دیے گئے تھے۔ اس نے احتیاطاً پردوں کے پیچھے بھی دیکھ ڈالا لیکن اتنا اطمینان تو وہ کر چکا تھا کہ پہلے کمرے میں جب وہ کھڑکی کے ذریعے داخل ہونے کے بعد اسے خالی سمجھ کر دروازے کی طرف بڑھنے کی غلطی کر بیٹھا تھا، اس وقت ورما پردے کے پیچھے چھپا ہوا تھا اور پیچھے سے باہر نکل کر اسے قابو کر لیا تھا۔

یہ احتیاط پردوں کے پیچھے جھانک لینے کے بعد بھی جب اسے وہاں کوئی نہیں ملا تو وہ اس کمرے سے نکل کر اگلے اور آخری کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ ہینڈل دبا کر دروازہ کھولتے ہی اسے پہلی نظر میں نیلگوں روشنی میں بستر پر محو استراحت نیم عریاں لڑکی نظر آ گئی۔ لڑکی شاید گدھے گھوڑے سب بیچ کر سو رہی تھی اس لیے اسے مکان کے اندر ہونے والے کسی واقعے کی خبر نہیں ہو سکی تھی۔ شہریار بھاری سے اس کے قریب پہنچا اور پسٹل کی نال اس کی کنپٹی پر رکھ دی۔ لڑکی کی طرف سے کوئی ردعمل ظاہر نہ ہوا اور وہ اسی طرح گہری نیند سوتی رہی۔

"اے اٹھو۔" شہریار نے اس کا بازو پکڑ کر جھنجھوڑا۔

"اوں ..... سونے دو نا۔ پہلے ہی تم وعدے سے ڈبل وصول کر چکے ہو اور اب پھر تنگ کر رہے ہو۔ بڑے گندے آدمی ہو۔" اس نے آنکھیں نہیں کھولیں البتہ جھنجھلا کر جو کچھ بولی، اس سے شہریار نے اندازہ لگا لیا کہ وہ کوئی کال گرل ہے جسے ورما شب بسری کے لیے لایا تھا اور خوب اچھی طرح نچوڑ ڈالا تھا۔ اس نے ایک بار پھر لڑکی کا جائزہ لیا۔ اس کے نقش و نگار خوب صورت تھے لیکن ساتھ ہی چہرے پر ایسی رنگینی پائی جاتی تھی جو پیشہ ور عورتوں کا خاصا ہوتی ہے۔ قریب سے دیکھنے پر اس کی عمر کے بارے میں بھی اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کوئی نوعمر لڑکی نہیں بلکہ پچیس سے

چالیس کے درمیان کی ہائسو عمر عورت ہے جس نے اپنے آپ کو اس حد تک سنبھال کر رکھا ہوا ہے کہ کم از کم جسمانی ساخت کے اعتبار سے لڑکی ہی محسوس ہو رہی تھی۔ شہریار نے ایک بار پھر اسے اٹھانے کی کوشش کی۔

''او یار! میں نہیں اٹھ سکتی۔ میں نے انجکشن لگا لیا ہے اب صبح ہی اٹھوں گی۔'' اس نے بند آنکھوں کے ساتھ ہی بڑبڑا کر کروٹ بدل لی تو شہریار کو حقیقت سمجھ میں آئی۔ وہ عورت شاید کسی قسم کے نشے کی عادی تھی اور وہ نشے میں تھی اسی لیے اردگرد سے غافل تھی۔ اس کے اور وریا کے درمیان ہونے والی جھڑپ کی آوازیں اگر اس کے کانوں تک پہنچی بھی ہوں گی تو اس نے نشے میں دھت ہونے کے باعث توجہ دینے کی کوشش نہیں کی ہوگی۔ اس کی طرف سے قدرے مطمئن ہو کر اس نے اردگرد کا جائزہ لیا اور پھر الماری کی طرف بڑھ گیا۔ الماری کھول کر ذرا سا جائزہ لینے پر اسے ایک دراز میں رکھی نائیلون کی ڈوریاں نظر آ گئیں۔ اس نے وہ ڈوریاں نکالیں اور اس کی مدد سے عورت کے ہاتھ پیر باندھ دیے۔ اب وہ اس لائق نہیں رہی تھی کہ بستر سے اٹھ کر اس کے کسی کام میں مداخلت کر سکتی۔ مزید احتیاط کے طور پر اس نے باہر نکل کر کمرے کا دروازہ بھی باہر سے بند کر دیا۔ یہ کمرا جو کہ یقینی طور پر وریا کے لیے بیڈروم کا کام دے رہا تھا، خاصی توجہ کا حق دار تھا اور اسے امید تھی کہ یہاں سے اسے بہت کچھ مل سکتا ہے لیکن فی الحال اس کے پاس کمرے کی باریک بینی سے تلاشی لینے کی فرصت نہیں تھی۔

وریا کے بے ہوش اور بندھے ہوئے ہونے کے باوجود زیادہ دیر اس سے غافل نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ ایک سیکرٹ ایجنٹ تھا جو ہوش میں آ جاتا تو بندھے ہوئے ہاتھوں کے باوجود بہت کچھ کر سکتا تھا چنانچہ پہلے اس سے نمٹنا ضروری تھا۔ وہ واپس اس کمرے میں آ گیا جہاں وریا کو چھوڑا تھا۔ ان دونوں کے ٹکراؤ کے نتیجے میں کمرے کی حالت خاصی خراب ہو گئی تھی اور کئی چیزیں اِدھر اُدھر بکھری ہوئی تھیں جن میں سب سے قابلِ ذکر زمین بوس ہو جانے والے مانیٹر کی اسکرین کی کرچیاں تھیں۔ موٹے تلے کے جوگرز کی وجہ سے وہ مزے سے ان کرچیوں کو روندتا ہوا وریا کے قریب پہنچا اور اس کا جائزہ لینے لگا۔ آنکھ پھوٹ جانے کے باعث بہنے والے خون نے اس کے چہرے کو بھیانک بنا دیا تھا۔ اس خون میں اس کے نتھنوں سے بہنے والا خون بھی شامل ہو گیا تھا اور ٹھوڑی سے بہہ کر یہ فرش تک پہنچ گیا تھا۔ یقیناً اس نے وریا کو بہت بے دردی سے مارا تھا اور ناک کے ساتھ ساتھ اس کا چہرا بھی حماقت زدہ نظر آ رہا تھا لیکن اپنے اس جنون پر اسے کوئی ندامت نہیں تھی۔ اس کے نزدیک وریا ایک ایسا شخص تھا جس کی بوٹی بوٹی بھی الگ کر دی جاتی تو کوئی گناہ نہیں ہوتا کیونکہ یہ وہ شخص تھا جس کے حکم پر لمحوں میں انسانی جسموں کے چیتھڑے اڑا دیے جاتے تھے اور جو معصوم بے گناہ لوگوں کو اپنی خونی دیوی کی بھینٹ چڑھاتے ہوئے ذرا بھی ہچکچاہٹ کا شکار نہیں ہوتا تھا۔

وریا پر ایک نفرت بھری نظر ڈالتا ہوا وہ متصلہ باتھ روم تک گیا اور وہاں سے آدھی بالٹی پانی بھر لایا۔ اس پانی کو اس نے پورا کا پورا وریا پر انڈیل دیا۔ پانی پڑنے پر وہ جھرجھری سی لے کر ہوش میں آیا اور اپنی سلامت رہ جانے والی اکلوتی آنکھ کو کھول کر دیکھا۔

''کون ہو تم ..... اور کیا کرنے آئے ہو؟'' شہریار پر نظر پڑتے ہی اس نے پوچھا۔

''یہ تو مجھے تم سے پوچھنا چاہیے کہ تم کون ہو اور میرے وطن میں کیا کرنے آئے ہو؟'' شہریار نے تلخی سے اسے جواب دیا۔

''اوہ ..... تم کوئی سیکرٹ ایجنٹ ہو۔ میں نے غلطی کی کہ تمہیں کوئی چور اُچکا سمجھا اور آسانی سے اندر آنے دیا ورنہ اس وقت میری جگہ تم یہاں پڑے ہوتے۔'' وریا نے نفرت انگیز لہجے میں جواب دیا۔

''یعنی تم شروع سے جانتے تھے کہ میں تمہارے گھر میں گھسا ہوں؟''

''بالکل۔ اس مکان میں مختلف مقامات پر کلوز سرکٹ کیمرے موجود ہیں اور جیسے ہی کوئی کھلے گیٹ کے علاوہ کسی راستے سے مکان میں داخل ہونے کی کوشش کرتا ہے میری رسٹ واچ میں لگی ایک ڈیوائس اشارہ دینے لگتی ہے۔ تم نے بھی جب عقبی دیوار پر چڑھنے کی کوشش کی تو مجھے اشارہ مل گیا۔ میں سوتے سے اٹھ کر اس کمرے کی طرف دوڑا اور کمپیوٹر اسکرین پر تمہاری ایک ایک حرکت کا جائزہ لیتا رہا۔ تم کھڑکی کے راستے اندر آنے کے خواہش مند تھے۔ میں نے تمہاری خواہش پوری کر دی اور جان بوجھ کر اس کمرے کی کھڑکی کا لاک کھول دیا۔ تم چور کے بجائے کچھ اور ہو، اس بات کا اندازہ اس وقت ہوا جب تم نے خاموشی سے تلاشی دینے کے بجائے اچانک پلٹ کر حملہ کر دیا۔ تمہارے لڑنے کے انداز نے مجھے بتا دیا کہ تم کوئی تربیت یافتہ آدمی ہو اور میں انجانے میں تمہیں ڈھیل دینے کی غلطی کر چکا ہوں۔'' وریا نے اسے جواب دیا۔

''تمہارا یہ جواب ایک طرح سے اعترافی بیان ہے کہ تم بھی سیکرٹ ایجنٹ ہو۔'' شہریار نے اس کی بات سن کر طنزیہ لہجے میں کہا۔

''تم کچھ بھی کہہ لو، کیا فرق پڑتا ہے۔ ویسے بھی اپنی سرزمین پر غیر ملکی سیکرٹ ایجنٹوں کا وجود تمہارے لیے کوئی نئی بات تو نہیں ہے۔ یہاں اتنی بڑی تعداد میں مختلف ممالک کے ایجنٹوں کا جال بچھا ہوا ہے کہ تم اپنے پڑوسی تک کے بارے میں بھی یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ وہ اپنے ملک کا وفادار ہے یا غدار۔'' وریا نے ایک تلخ حقیقت بیان کی تھی۔ یہ اس ملک کا المیہ تھا کہ اس پر بیٹھے لوگ ہی اس کی جڑیں کھوکھلی کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ غیر ملکی ایجنسیوں کا وجود کسی ملک میں ہونا اتنی خطرناک بات نہیں ہوتی جتنا اس ملک کے اپنے باسیوں کا ان ایجنسیوں کے لیے کام کرنا۔ یہاں بے تحاشا پیسے کی چمک لوگوں کے ضمیر اس طرح ڈگمگا دیتی تھی کہ وہ اپنے ضمیر سمیت مادرِ وطن کا سودا کرنے میں کوئی حرج نہیں سمجھتے تھے۔

''غداروں اور دشمنوں کو نیست و نابود کرنا ہی میری کوشش ہے۔ جیسے میں تم تک پہنچا ہوں، ویسے ہی دوسروں تک بھی پہنچ جاؤں گا۔ مجھے طعنے دینے کے بجائے اپنی خیر مناؤ۔'' وریا سے بے تحاشا نفرت تو اپنی جگہ تھی، اس وقت اس کی گفتگو سن کر وہ اور بھی طیش میں آ گیا اور ایک لات گھما کر اسے رسید کی۔

''کیا میں نہیں تم مرو گے۔ تم مجھے زیادہ سے زیادہ اتنا نقصان پہنچا سکتے ہو کہ میری جان لے لو لیکن اس کا خمیازہ تمہیں بھی صحیح سلامت یہاں سے نکلنا نصیب نہیں ہو گا۔'' وریا کے چہرے پر استہزائیہ مسکراہٹ تھی۔ زخمی آنکھ سے لتھڑے چہرے کے ساتھ مسکراتا وہ بہت ہی بھیانک لگ رہا تھا لیکن اصل چیز اس کا اطمینان تھا۔ حالات کے باوجود وہ پریشان نظر نہیں آ رہا تھا بلکہ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ شہریار کے ہاتھوں نہیں بلکہ شہریار اس کے ہاتھوں پھنسا ہوا ہے۔ اس بات نے شہریار کو چونکا دیا۔ وہ اردگرد خطرے کی بو محسوس کرنے لگا۔ اسی احساس نے اس کی وحشت کو اور بھی بڑھا دیا اور اس نے زخمی وریا کو بُری طرح پیٹنا شروع کر دیا۔

''کیا چکر ہے؟ تمہیں کس کی مدد کا آسرا ہے جو مجھے اس طرح دھمکا رہے ہو؟'' وہ وریا کو مارتا جا رہا تھا اور پوچھتا جا رہا تھا۔ وریا کے منہ سے اس مار پیٹ کے نتیجے میں نکلنے والی چیخوں کے سوا ایک لفظ بھی برآمد نہیں ہو رہا تھا۔ اسی اثنا میں فضا میں فائرنگ کی آواز گونجی۔

''لو وہ آ گئے۔'' وریا نے تکلیف کے باوجود سسکنے والی مسکراہٹ کے ساتھ سرگوشی کی۔ شہریار جو فائرنگ کی آواز پر پہلے ہی ٹھٹک گیا تھا، اس جملے کو سن کر سمجھ گیا کہ وریا نے کسی طرح اپنے مددگاروں کو یہاں بلوا لیا ہے اور اب وہ یہاں اس مکان میں کسی چوہے کی طرح پھنس گیا ہے۔ اس چوہے دان سے نکلنے کا راستہ کس طرح نکالا جاتا، یہ تو بعد کی بات تھی ..... فی الحال اسے وریا سے نمٹنا تھا۔ اس موذی سانپ کو وہ کسی بھی طرح ایک بار پھر آزاد ہونے کا موقع نہیں دے سکتا تھا۔ چنانچہ اس کے سینے میں دفن رازوں کو اگلوانے کی خواہش کو پس پشت ڈالتے ہوئے پستول کا رخ اس کے سینے کی طرف کر دیا لیکن اس سے قبل کہ وہ فائر کرتا، باہر سے سنائی دینے والے فائروں کی پے در پے آوازوں نے اس کی ٹریگر پر جمی انگلی کو حرکت دینے سے روک دیا۔ سنائی دینے والی فائرنگ کی آواز بالکل ایسی تھی جیسے دو گروہ آپس میں مقابلہ کر رہے ہوں۔ ان گروہوں میں سے ایک گروہ تو یقینی طور پر وریا کے آدمیوں کا تھا لیکن دوسرے کے بارے میں درست قیاس کرنا ذرا مشکل تھا۔ کیا معلوم تھا کہ وریا کے آدمی اپنے ساتھ اپنے دشمنوں کو پیچھا کرتے لے آئے ہوں یا پولیس کی کوئی گشتی گاڑی ان کی طرف متوجہ ہو گئی ہے۔

معاملہ جو بھی تھا، وہ اپنے لیے بچت کا ایک موقع نکال سکتا تھا۔ اس نے وریا کو فوری طور پر ہلاک کرنے کا ارادہ ترک کیا اور پستول سے ایک زوردار ضرب اس کی کنپٹی پر رسید کر کے اسے بے ہوش کر دیا۔ اب وریا اس کے خلاف کوئی حرکت نہیں کر سکتا تھا اور اس کے پاس موقع تھا کہ وہ اس کو یہاں سے زندہ نکال کر لے جانے کے امکانات کا جائزہ لے سکتا۔ اپنے پاس سواری کی کمی کی موجودگی کا مسئلہ وہ وریا کی گاڑی کے ذریعے حل کر سکتا تھا۔ ذہن میں ابھرنے والا یہ خیال اسے اتنا اچھا لگا کہ فوراً ہی وریا کو اس کی گاڑی میں منتقل کرنے کا فیصلہ کر لیا بلکہ ایک طرح سے اسے افسوس ہی ہوا کہ اس نے یہاں اتنا وقت کیوں ضائع کیا اور پہلے ہی یہ فیصلہ کیوں نہیں کر لیا۔ اس نے بے ہوش وریا کو اپنے کندھے پر لادا اور تیزی سے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ یہاں داخل ہوتے وقت وہ دیکھ چکا تھا کہ وریا کی گاڑی احاطے میں داخلی دروازے کے قریب ہی کھڑی ہوئی ہے۔ وریا کو اس کی گاڑی میں منتقل کرنے کا کام اس نے سہولت سے پورا کر لیا۔ باہر فائرنگ کا سلسلہ ہنوز جاری تھا لیکن اس کی شدت میں کمی آ گئی تھی۔ اس نے ایک خطرناک چانس لینے کا فیصلہ

وغیرہ پر ہی توجہ مبذول رکھی ہوگی۔ حالانکہ ضرورت اس امر کی ہوتی ہے کہ ایسے شخص سے اس کے استعمال کی معمولی سے معمولی شے بھی لے لی جائے۔ رسٹ واچ، کف لنکس، والٹ یا پین کسی بھی شے میں ایسی چھوٹی سی ڈیوائس فٹ کر دینا جس کے ذریعے ضرورت کے وقت اپنے ساتھیوں سے رابطہ کیا جا سکے یا انہیں کوئی اشارہ دیا جا سکے، اب ایک عام سی بات ہو چکی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ہم ورما کے ذاتی سامان کا بغور جائزہ لیں گے تو اس کے پاس سے ایسی کوئی نہ کوئی شے ضرور برآمد ہو جائے گی۔"

"آئی ایم ایکسٹریملی سوری سر! آپ کی باتیں سن کر مجھے اپنی غلطیوں کا بھرپور احساس ہو گیا ہے۔ میں ابھی بس خام ہوں۔ مجھے کندن بننے کے لیے ابھی آپ سے مزید تربیت لینے کی ضرورت ہے۔" شرمندہ سے شہریار نے اس بار کھل کر اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا۔

"نہیں بیٹا نہیں... نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ تمہاری غلطیوں کے پیچھے تمہاری تربیت میں کمی سے زیادہ تمہارے جذبات کے اندھے پن کا زیادہ دخل تھا۔ اگر تم غصے اور طیش میں نہ ہوتے تو اس سے کہیں اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کرتے۔ پھر بھی مجھے خوشی ہے کہ تم نے مشکل حالات کے باوجود ورما کو ڈھیر کر لیا تھا۔" انہوں نے اصل مسئلہ بیان کرتے ہوئے ایک بار پھر اس کی کارکردگی کو سراہا۔

"جو بھی بات ہو لیکن میں آپ سے شرمندہ ہوں۔ اس لیے کہ میرے رونے کو آپ نے سی ایف پی پر بے اختیاری سے تعبیر کیا حالانکہ میرے ذہن میں دور دور تک ایسا کوئی خیال نہیں تھا۔" اس نے ایک بار پھر معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔

"جانے دو۔ یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے لیکن تمہاری جذباتیت نے ایک بڑا نقصان یہ کیا ہے کہ تم سی ایف پی کے چوہدریوں کی نظر میں آ گئے ہو جبکہ ہماری خواہش تھی کہ مکمل طور پر تبدیلی کا عمل پورا ہو جانے پر ہی تم یہاں سے نکلو اور اپنا کام شروع کرو۔" وہ بغیر طیش ظاہر کیے اس کی ایک اور حماقت کو سامنے لائے تو وہ حقیقتاً بے پناہ شرمندگی میں ڈوب گیا۔ اسے اچھی طرح اندازہ تھا کہ اسے تبدیلی کے مراحل سے گزارنے کے لیے کتنا کثیر سرمایہ خرچ کیا جا رہا ہے اور اس کی معمولی سی حماقت اس سرمائے کو ڈبو بھی سکتی ہے۔ شرمندگی اتنی تھی کہ وہ اس بار معذرت بھی نہ کر سکا لیکن دل میں عہد ضرور کیا کہ آئندہ ممکنہ حد تک ان مخلص لوگوں کا تابع دار رہے گا اور کسی بھی حکم یا ہدایت سے روگردانی کرنے کی غلطی نہیں کرے گا۔

"ایک معاملہ بگڑ گیا سو بگڑ گیا۔ ورما کی [illegible] شاید ہم زیادہ فوائد حاصل کر سکتے تھے لیکن اب خیر۔ وہ ہماری گرفت میں ہے تو بھی کچھ نہ کچھ تو اس سے اگلوا ہی لیں گے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے پاس واحد وسائل اور نفری کم ہے لیکن مسائل ہر طرف ہیں۔ اظہر اور اس کی ٹیم نے جو آباد کے ساتھ والے جنگل میں بھیجا تھا اور وہاں ہمیں ان کی لاشیں موصول ہو گئیں۔ بظاہر وہ سب درندے کا شکار ہوئے اور جنگلی جانوروں کا نشانہ بن گئے لیکن پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کچھ اور کہہ رہی ہے۔ ان لوگوں کی موت بے شک جنگلی کتوں کے حملے سے ہی ہوئی ہے لیکن ایسے آثار ملے ہیں جن سے لگتا ہے کہ موت سے قبل ان پر بے ہوش کر دینے والی کسی گیس یا دوا کا استعمال کیا گیا تھا اور ظاہر ہے یہ کام انسان ہی کر سکتے ہیں۔ یعنی اظہر اور اس کے ساتھیوں کے قتل کو جان بوجھ کر حادثاتی رنگ دینے کی کوشش کی گئی ہے ورنہ موت کے وقت وہ سب چاروں بے ہوش تھے۔ بے ہوش ہونے کی وجہ سے وہ لوگ اپنے دفاع کے لیے کچھ نہیں کر پائے اور بے بسی کی موت مر گئے۔ ان کے ساتھ جانے والے ورما نے ... کے آخری الفاظ بھی بہت معنی خیز ہیں۔ چوہدری اور الیاس کے حوالے سے کئی قسم کے اندازے لگائے جا سکتے ہیں۔ ان میں سے ایک اندازہ یہ ہے کہ شاید شہر والی انڈسٹری میں ہونے کے بعد چوہدری نے جنگل میں کچھ سازش کے لیے کوئی ٹھکانہ بنا لیا ہے اور اس ٹھکانے کی حفاظت کے لیے وہ قتل و غارت گری سے کام لے رہے ہیں۔ ہمارے لیے یہ حالات بڑے پیچیدہ ہیں۔ اظہر اور اس کے ساتھ جانے والے اہلکار بہت ہوشیار اور بہادر تھے اور ان کے اتنی آسانی سے نشانہ بن جانے پر ہم سب کو تشویش ہے۔ ہم اب ان جیسی کوئی ٹیم وہاں بھیجنے کی غلطی نہیں کر سکتے کیونکہ یہ صاف ظاہر ہو چکا ہے کہ تحقیقاتی ٹیم کا دورہ انہیں کھٹکا نہیں رہ سکتا۔ اس کے بعد ہمارے پاس دو راستے بچتے ہیں۔ ایک یہ کہ کسی قسم میں لائے بغیر وہاں ایک بڑی ٹیم بھیجیں۔ لیکن ایسی ٹیم کے لیے حالات اس سے زیادہ مخدوش ہوں گے کہ مقامی افراد کی مدد کے بغیر جنگل میں گھسنا خطرے کو دعوت دینا ہے۔ ہمارے لوگوں میں سے فی الحال کوئی ایسا نہیں ہے جو جنگلی حیات کا بھی ماہر ہو اور وہ یہ کام کر سکے اس لیے میں تو کم از کم کسی ٹیم کو وہاں بھیجنے کی حمایت نہیں کر سکتا۔ اب رہ جاتا ہے دوسرا راستہ یعنی جنگل میں باقاعدہ آپریشن کر دو تو یہ اس لیے مشکل ہے کہ ہم کسی واضح ثبوت

تھی پھر بھی وہ دونوں بچپن سے ایک دوسرے کے جذبات سے آگاہ تھے اور اقرار و اظہار کی حدوں سے گزرے بغیر آگے کے مراحل میں داخل ہو گئے تھے جہاں ایک دوسرے کا خیال اور خوشی سب سے مقدم ہو جاتی ہے۔

"میں اب بھی پریشان ہوں اور یہ پریشانی آپ سے ملے بغیر دور نہیں ہوگی۔" اس نے اصرار کیا۔

"ضد نہیں کرو شازمین! اس وقت میں مجبور ہوں۔"

جاوید علی نے اسے رسان سے سمجھایا۔

"میں بھی مجبور ہوں۔ میں خود کو بالکل تنہا محسوس کر رہی ہوں اور میرا دل چاہ رہا ہے کہ دکھ اور تکلیف کے ان لمحات میں کسی اپنے کے قریب ہوں۔ مجھے تمہاری ضرورت بھی ہے اور فکر بھی۔ پلیز جاوید! مجھے اپنے پاس آنے دو۔" لجاجت سے بولتے ہوئے کئی آنسو اس کی آنکھوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر گرے۔ بظاہر اپنے کام میں مگن وارڈن نے ترچھی نظروں سے یہ منظر دیکھا اور کسی تیزی سے سر ہلانے لگی۔ شازمین کے بارے میں تفصیلات کا اسے علم نہیں تھا لیکن وہ عرصے سے اس دارالامان میں ملازمت کر رہی تھی اور اس نے بے شمار لڑکیوں کو اپنے عاشقوں کے لیے آنسو بہاتے دیکھا تھا۔ شازمین کو بھی اس نے ان میں سے ایک تصور کیا تھا۔

"ٹھیک ہے۔ تم تھوڑی دیر انتظار کرو۔ آدھے گھنٹے میں، میں تمہارے لیے گاڑی بھجواتا ہوں۔ تم تھوڑی دیر کے لیے مجھ سے ملنے آ جانا۔ لیکن پلیز اب رونا بند کرو۔ مجھے تمہارے رونے سے تکلیف ہو رہی ہے۔" ادھر جاوید علی نے ہتھیار ڈال دیے تھے۔

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے سویٹ جاوید! تم گاڑی بھیجو، میں تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔" وہ ہتھیلی کی پشت سے آنسو پونچھتے ہوئے تشکرانہ لہجے میں بولی اور ریسیور رکھ کر وارڈن کی طرف متوجہ ہوگئی۔

"میڈم! تھوڑی دیر میں مجھے گاڑی لینے آئے گی۔ پلیز آپ گیٹ پر انتظام کر دیں کہ جیسے ہی گاڑی آئے، مجھے فوراً اطلاع کر دیا جائے۔" اس نے نہایت مہذبانہ لہجے میں درخواست کی۔

"سوری، بی بی! فی الحال تم یہاں سے کہیں نہیں جا سکتیں۔"

وارڈن نے روکھے لہجے میں جواب دیا۔

"کیوں؟ میں کیا کوئی مجرم ہوں جو آپ مجھے یہاں قید کر کے رکھیں گی؟" شازمین کے نوابی خون نے جوش مارا اور اس نے تنک کر وارڈن کو جواب دیا۔

"میرا دماغ مت کھاؤ بی بی! تم یہاں ہماری تحویل میں ہو اور ہمیں آگے تمہارے لیے جواب دہی کرنی ہے۔ کسی ضمانت کے بغیر میں تمہیں یہاں سے کہیں جانے کی ہرگز بھی اجازت نہیں دے سکتی۔" وارڈن کی نگاہ اس کی انگلی میں موجود خوب صورت و بیش قیمت طلائی انگوٹھی پر بھی تھی۔

شازمین نے فوراً ہی اس کی نیت بھانپ لی۔

"ٹھیک ہے۔ آپ ضمانت کے طور پر میری یہ انگوٹھی اپنے پاس رکھ لیں۔ یہ بہت قیمتی ہے اور اسے لینے کے لیے مجھے ہر حال میں آپ کے پاس واپس آنا پڑے گا۔" اس نے انگوٹھی اتار کر وارڈن کے سامنے میز پر رکھ دی۔ اسے معلوم تھا کہ وہ جس انگوٹھی کو بطور ضمانت پیش کر رہی ہے، وہ درحقیقت رشوت کا کام دے گی اور واپس آنے پر کسی صورت اسے واپس نہیں ملے گی۔

"ویسے کوئی خاص قیمتی تو نہیں لگ رہی لیکن تم کہتی ہو تو مان لیتی ہوں۔" وارڈن نے انگوٹھی اٹھا کر اس کا جائزہ لیا اور بظاہر بے نیازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی میز کی دراز میں رکھ لی۔

"ٹھیک ہے، تم جاؤ۔ گاڑی آئے گی تو میں تمہیں اطلاع کروا دوں گی۔" انگوٹھی قبضے میں کر لینے کے بعد اس کا لہجہ ذرا نرم ہو گیا تھا۔ شازمین مطمئن سی ہو کر واپس اپنے کمرے میں چلی گئی۔ انگوٹھی بے شک کافی قیمتی تھی لیکن اسے اس کی پروا نہیں تھی۔ اس کے پاس بیش قیمت زیورات کا بہت بڑا ذخیرہ موجود تھا اور ان میں سے ایک انگوٹھی کم ہو جانے پر اسے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ حالات سنبھلیں گے تو وہ ایک بار پھر اپنی فیملی کے ساتھ آرام دہ اور پرتعیش گھر میں ہوگی۔ آدھے گھنٹے کا وقت بھی آخرکار گزر گیا۔ اس کے پاس فی الحال ملبوسات وغیرہ موجود نہیں تھے اس لیے تیاری تو کیا کرتی۔ بس منہ ہاتھ دھو کر بالوں کو سنوارا اور گاڑی پہنچ جانے کی اطلاع سن کر باہر نکل گئی۔ ڈرائیور نے گاڑی کی پچھلی نشست کا دروازہ کھول دیا اور اس کے بیٹھ جانے کے بعد گاڑی آگے بڑھا دی۔ ان کی گاڑی آگے بڑھی تو کئی گھنٹوں سے دارالامان کے قریب کھڑی ایک سیاہ گاڑی بھی فوراً حرکت میں آ گئی اور شازمین والی گاڑی کے پیچھے دوڑنے لگی۔

یہ پُرپیچ و سنسنی خیز داستان جاری ہے
مزید واقعات آیندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں

ضرورت تھے۔" زیشان نے اسے بتایا۔

"یہ تو بہت افسوس ناک خبر ہے اور اس کے سرے یقینی طور پر اسی سازش سے جا کر ملتے ہیں جو مذہب کے نام پر لوگوں کو بھڑکانے اور بھٹکانے کے لیے بہت منظم طریقے سے کی جا رہی ہے۔" اس نے فوراً رائے دی۔

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ نظریات کا اختلاف کوئی انوکھی بات نہیں ہے لیکن دشمنوں نے بڑی ہوشیاری سے اس اختلاف کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ہمارے ہاں انتہا پسندی کو فروغ دینے کی کوشش کی ہے۔ اس کیس میں بھی اب تک جو حقائق سامنے آئے ہیں، ان سے یہی لگتا ہے کہ اس کارروائی کے پیچھے غیر ملکی دشمنوں کی سازش کارفرما ہے۔" وہ اسے تفصیلات سے آگاہ کرنے لگا کہ کس طرح مشاہرم خان نے اسے اسکردو سے فون کر کے اسے وہاں پیش آنے والے واقعے سے آگاہ کیا اور اس کے بعد اس نے خان کی مدد کے لیے کیا کارروائی کی۔

"تمہارا اندازہ بالکل ٹھیک ہے۔ یہ کارروائی واقعی ملک دشمن عناصر کی کارستانی نظر آتی ہے۔ ہمیں نہیں بھولنا چاہیے کہ دشمن نے ہماری آنکھوں میں دھول جھونکتے ہوئے ان برف پوش پہاڑوں میں اپنا خفیہ اڈا قائم کر رکھا تھا جہاں وہ انتہا پسندوں اور دہشت گردوں کو تربیت دے رہے تھے۔ مشاہرم خان کی جرأت مندی کی وجہ سے ہی ہم ان کا وہ ٹھکانا تباہ کرنے میں کامیاب رہے تھے لیکن اس بات کا تو کوئی ثبوت نہیں ہے کہ اس ٹھکانے کو تباہ کرنے کے بعد ہم سازش کو مکمل طور پر ختم کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ حالات بتا رہے ہیں کہ وہاں اب بھی سازشیں جاری ہیں اور دشمن ایجنٹوں کے ہاتھوں ہمارے لوگوں کو قتل کروانے کا مشن جاری رکھے ہوئے ہے۔ تم اس معاملے کو نظر انداز نہیں کرو بلکہ ایسا کرو کہ اس کیس پر کام کرنے والے افسر کو ہدایت کر دو کہ وہ اس معاملے میں مشاہرم خان سے کام لینے میں کسی ہچکچاہٹ نہ دکھائے۔ مشاہرم خان بہت کام کا بندہ ہے۔ وہ ذمے داری سونپے جانے پر بہت مددگار ثابت ہوگا۔" حالات نے مشاہرم خان کو اس سے الگ کر دیا تھا لیکن وہ آج بھی اس سے خصوصی انسیت رکھتا تھا اور اس کی صلاحیتوں کا دل سے معترف تھا۔

"میں یہ کام پہلے ہی کر چکا ہوں اور مشاہرم خان کو بھی ہدایت کر دی ہے کہ تفتیشی افسر کی طرف سے اجازت ملنے تک وہیں ٹھہرے۔"

"یہ تم نے اچھا کیا لیکن یہ تو بتاؤ کہ مشاہرم خان اچانک اسکردو کیسے پہنچ گیا؟ اسے تو وہ آباد میں ہی دوبارہ آفریدی کی ملازمت کر لی تھی نا....؟" اسے خیال آیا تو اس نے زیشان سے وضاحت چاہی۔

"وہ اپنی والدہ کی تدفین کے لیے اپنے گاؤں گیا تھا۔ وہاں سے واپس آتے ہوئے اسکردو میں ٹھہرا تو یہ واقعہ پیش آ گیا۔"

"اوہ تو اس بے چارے کی والدہ وفات ہو گئیں۔ وہ اس واقعے پر بہت دکھی ہوا ہوگا۔ کاش میں اس کے اس غم میں شریک ہو سکتا۔" زیشان کی زبانی مشاہرم خان کی والدہ کے انتقال کا سن کر وہ خود بھی افسردہ ہو گیا۔ مجبوری تھی کہ وہ ہر دم خود پر جان نچھاور کرنے کے لیے تیار رہنے والے مشاہرم خان کی زندگی کے اس المیے پر اس سے تسلی کے دو حرف بھی نہیں بول سکتا تھا۔

"مجھے تمہارے جذبات کا احساس ہے لیکن تم نے اپنے لیے جو راہ چنی ہے اس پر چلتے ہوئے یہ سب تو برداشت کرنا ہی پڑے گا۔ تمہارے عادل سے عادل خان تک کے سفر میں جذبات کی یہ قربانی ہی سب سے اہم ہے۔ ویسے تم اطمینان رکھو کہ راؤ صاحب نے اس موقع پر مشاہرم خان کا بھرپور خیال رکھا۔ بہت کولا ہو... اس کے گاؤں پہنچے اور تدفین تک کے سارے انتظامات انہی کی طرف سے کیے گئے تھے۔" زیشان نے تمام حقیقت بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اسے تسلی بھی دی۔

"زیشان ٹھیک کہہ رہا ہے شہریار! تمہاری زندگی میں جو تبدیلی آئی ہے اس کے بعد اس طرح کے چھوٹے چھوٹے معاملات میں الجھنے اور افسردہ ہونے کی کوئی گنجائش نہیں نکلتی۔ تم نے اپنی شخصیت مٹا کر ایک بہت بڑی قربانی دی ہے اور یہ قربانی اس لیے ہے کہ تمہیں بہت بڑے بڑے کام انجام دینے ہیں۔ میں نے تم سے کہا تھا: کہ سلو والا کیس تمہارے لیے صرف ایک ٹیسٹ کیس ہے۔ اس ٹیسٹ میں کامیابی کے بعد تمہیں بڑا اور زیادہ اہم کام سونپا جائے گا اور اب وہ وقت آ گیا ہے کہ تمہیں وہ کام سونپ دیا جائے۔" عمر فاروق نے بالکل اچانک وضاحت کرتے ہوئے اس سے کہا تو اس کے پورے وجود میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ آخر کار وہ گھڑی آ ہی گئی تھی جس کے لیے اسے تیار کیا جا رہا تھا۔

یہ خوبصورت سنسنی خیز داستان جاری ہے
مزید واقعات آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں